# TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224137
UNIVERSAL
LIBRARY

**OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY**

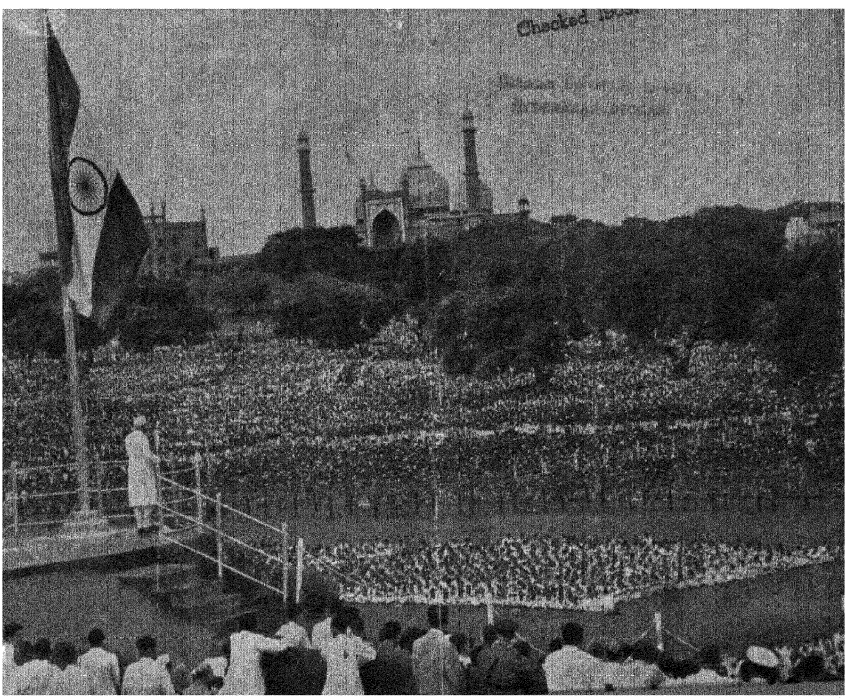
Call No. ٨٩١٥ ج٣ A Accession No. [illegible]

Author [illegible]

Title ١٩٦٢ ١٩٦١ - [illegible]

This book should be returned on or before the date last marked below.

# آج کل



نئی دہلی
اگست ۱۹۶۱ء

۷۰ نئے پیسے



سیلاب کی تباہ کاریاں

# وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو
# کی
# اپیل

برسات کا موسم آگیا ہے اور پھر ہمیں بڑے بڑے سیلاب اور بعض اوقات ایسی تباہیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جن کا شکار ہونے والوں کی فوری امداد کی ضرورت ہے۔

پرائم منسٹرز نیشنل ریلیف فنڈ سے، جس میں بہت سے ہندوستانیوں اور باہر کے لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا ہے، ہندوستان بھر میں ان لوگوں کی بڑی امداد کی جاتی رہی ہے، جو قدرتی مصائب کا شکار ہوتے رہے ہیں۔

یہ فنڈ اب قریب قریب ختم ہو چکا ہے اور اگر فوری طور پر اس میں مزید چندہ نہیں آیا، تو ہمارے لئے ان ضرورتوں کو پورا کرنا ممکن نہ ہوگا خواہ وہ کیسی ہی اہم کیوں نہ ہوں۔ اس وقت کیرل کی ریاست سے فوری امداد کی مانگ آئی ہے، جہاں ایسے سیلاب آئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہ آئے تھے اور جن کی وجہ سے بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی امداد کی ضرورت ہے۔

اس لئے میں پھر اپنے ملک کے عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس نیشنل ریلیف فنڈ میں چندہ دیں تاکہ مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کی جا سکے۔

چندہ اس پتہ پر بھیجا جائے: **سیکرٹری پرائم منسٹرز نیشنل ریلیف فنڈ، پرائم منسٹرز سیکرٹریٹ ساؤتھ بلاک، نئی دلّی۔**

چیک اور منی آرڈر وغیرہ **پرائم منسٹرز نیشنل ریلیف فنڈ** کے نام ہی بھیجے جائیں۔

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

# آج کل دہلی

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| طلسمات | ادارہ | ۲ |
| جگر کی شاعری | محمد حسن | ۳ |
| نیل کنٹھ کی فرد | — | ۷ |
| قابلی تجربے | علی عباس حسینی | ۸ |
| غزل | غلام ربانی تاباں | ۱۲ |
| فرانسس بیکن | ایشن کمار | ۱۳ |
| اورنگ آباد | رشید الدین | ۱۸ |
| باز دید | وحید اختر | ۲۲ |
| اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا پس منظر | منظور الحسن برکاتی | ۲۷ |
| پی۔ ایچ۔ ڈی | راہی | ۳۴ |
| حاصلِ حیات | آمنہ ابوالحسن | ۳۶ |
| کلامِ جوہر | جوہر لکھنوی | ۴۰ |
| انتقاد | نصیر پرواز | ۴۱ |
| ڈال ڈال کے پات | ڈاکٹر مولوی عبدالحق<br>سید محمد جعفری | ۴۲ |
| نئی کتابیں | ح۔م<br>ش۔ح | ۴۳ |


سرورق :- دلی میں یوم آزادی
رسالے کی پشت پر :- مائل پروائی

شمارہ نمبر ۸ سنہ ۱۸۸۳

اگست سنہ ۱۹۶۱ء

جلد ۳۰ - نمبر ۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر 'آج کل' اردو ڈائریکٹریٹ دہلی

شائع کردہ

ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۱۰۷ - دہلی

مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد حبیب | جامعہ ملیہ، دہلی |
| محی الدین قادری زور | حیدرآباد |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| رحمان راہی | سری نگر |

یو۔ ایس مون راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی۔ این۔ ایس راگھون۔ ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی۔ نجفا نائق ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکنڈ)

مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ مظفر شاہ

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپیہ (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ :- ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

# ملاحظات

مطلع عالم پھر ابر آلود ہے کبھی کبھی جنگ کے مہیب بادل چھٹنے لگتے ہیں۔ ابیسکو کرنیں ان سیاہ بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے لگتی ہیں مگر جلد ہی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اندھیرے اور اُجالے کی یہ آنکھ مچولی بہت دنوں سے جاری ہے۔

دنیا کی دو بڑی طاقتیں امریکہ اور روس امن کی مدعی ہیں، دونوں اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ دنیا کو امن و سکون کی ضرورت ہے مگر امن کے حصول کے راستے کیا ہیں اس پر ان کا اتفاق نہیں اور یہی وہ بنیادی چیز ہے جو امن و اماں کی ساری کوششوں کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ مثلاً لاؤس ہی کا مسئلہ ہے۔ روس اور امریکہ دونوں اعلان کر چکے ہیں کہ لاؤس کو بالکل غیر جانبدار بنا دینا چاہیئے۔ مگر کیسے؟ جنیوا میں چودہ طاقتوں کا اجلاس کبھی ملتوی ہو جاتا ہے اور کبھی شروع ہو جاتا ہے۔ تینوں شہزادے سے بھی اپنے اختلافات دور کرنے میں لگے ہوئے ہیں مگر اب تک کوئی اطمینان بخش حل نہیں نکلا ہے۔

کینیڈی خروشچیف ملاقات سے بڑی امیدیں بندھی تھیں مگر جرمنی کے مسئلے پر روس اور امریکہ پھر حریف بن کر میدان میں آ گئے ہیں۔ الزام اور جوابی الزام کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ہر مسئلے پر دو دو زیادہ رائیں پیش کی جاتی ہیں اور دنیا کے ملک باہم متفق نہیں ہو پاتے۔

حال میں مطلع عالم پر کویت کی بجلی چمکی ہے۔ خلیج فارس کی یہ چھوٹی سی ریاست جس کی آبادی شہر دہلی کے دسویں حصے کے برابر ہے، قدرت کے عجیبے سے مالا مال ہے۔ عراق نے اس پر دعویٰ کر دیا ہے اور اپنے صوبہ بصرہ کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ مشرقی وسطیٰ میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے کویت کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ بھی عراق کے حق میں نہیں ہے پھر برطانیہ اور امریکہ بھی کویت کے حکمران شیخ عبداللہ کی امداد کے لئے میدان میں آ گئے ہیں اور کویت کا مسئلہ سیکورٹی کونسل میں پیش ہو چکا ہے عراق کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ کویت کو ایک آزاد اور خود مختار حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ خدا کرے عرب لیگ کی کوششیں بار آور ثابت ہوں اور عربوں کا اختلافات باہمی مفاہمت سے دور ہو جائے۔

دنیا کے امن پسندوں کو کانگو میں مصالحت کی جرزں سے خوشی ہوئی تھی مگر کٹانگا کے صدر مسٹر شومبے نے کٹانگا کی آزادی کا پھر اعلان کر دیا ہے۔ کانگو کی پارلیمنٹ کا اجلاس اگلے ہفتے ہونے والا ہے۔ مسٹر شومبے کی اس قلابازی نے مسئلے کو پیچیدہ بنا دیا ہے اور ایک بار پھر بحران کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

انگولا میں افریقیوں کے قتل عام کی خبروں نے دنیا کو بڑی طرح جھنجھوڑ دیا ہے۔ اقوام متحدہ نے انگولا کے متعلق ایک ریزولیوشن پاس کیا ہے مگر اس کی بعض تجویزیں صرف کاغذوں ہی پر رہ جاتی ہیں۔ جنوبی افریقہ کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ الجیریا کا مسئلہ بھی کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ ضرورت ہے کہ اقوام متحدہ ظالموں کے خلاف مضبوط قدم اٹھائے تاکہ ظلم و جبر کا خاتمہ ہو۔

ہندوستان میں آسام کا لسانی مسئلہ نئے خطروں کی نشان دہی کر رہا ہے۔ کچھار اور ہیلاکنڈی کے واقعات بہت ہی قابل افسوس ہیں زبان اور مذہب، ذات اور فرقے ملک کی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لئے سنگ گراں بنے ہوئے ہیں۔ ہم ہندوستانی ہیں، ملک ایک ہے، جھنڈا ایک ہے مگر ہم نے ان بنیادی باتوں کو پس پشت ڈال دیا ہے اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹتے ہیں اور اپنی ہی بہنوں کو بے عزت کرتے ہیں۔ ہمیں فرقہ پرستی، صوبہ پرستی اور زبان پرستی کے زہر کو ختم کرنا ہی ہوگا۔

محمد حسن

# جگر کی شاعری

رشید احمد صدیقی نے غزل کو "اردو شاعری کی آبرو" کہا ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو جگر مرادآبادی ان شعراء میں سے تھے جو جدید غزل کی آبرو تھے۔ جن شعراء نے غزل کو نئے زمانے کے تقاضوں سے آشنا کیا اور اسے پھر سے مقبولیت بخشی ان میں حسرت موہانی، فانی اور اصغر کے ساتھ جگر کا نام ضرور لیا جائے گا۔ وہ ۱۸۹۰ء میں سرسید کے انتقال سے نو سال پہلے پیدا ہوئے تھے گویا انھوں نے ایک ایسے دور میں ہوش سنبھالا تھا جب غزل کی آبرو لٹ چکی تھی۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس میں ریزہ خیالی اور انتشار پایا جاتا ہے اور غزل گو شاعر تقلید اور روایات کا شکار ہوتا ہے۔ اس کا تصوف برائے شعر گفتن ہوتا ہے۔ اس کا عشق، آرائش بیان اور اس کی رندی و مے خواری زیب داستان کے لئے ہوتی ہیں۔ اس کا شیشہ سستا اور اس کا فکری تانا بانا بڑا اچھڑا ہوتا ہے۔ غزل کے اپنے حدود اور اپنی مجبوریاں ہیں۔ جگر نے غزل کو سب کچھ سمجھا ان کی اس عقیدت سے اتفاق کرنا دشوار ہے مگر اس مختصر دائرے میں وہ کمال نے جو سربلندیاں حاصل کیں ان کا اعتراف ضروری ہے۔

جگر نے بھی غزل کے اسی بدنام کوچے میں پرورش پائی تھی۔ داغ کی شاگردی نے انھیں سستے نشہ کا مزا بھی چکھایا تھا اور محض زبان کے لطف اور بیان کے چٹخارے سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ مگر جگر کی عظمت یہی تھی کہ انھوں نے اس کوچے میں قیام نہ کیا۔ وہ داغ کے شاگرد تھے مگر داغ نہ بن سکے۔ وہ اصغر کے مداح اور عقیدت مند تھے مگر اصغر نہ بن سکے کیوں کہ ان کے اندر نہ ایک لذت پرست کا دل تھا نہ صوفی کا۔ وہ تو ایک ایسے سرمست اور سرشار انسان کا دل لے کر آیا تھا جس کے پاس صرف ایک دولت تھی — خلوص کی دولت، اور ایک قوت تھی — محبت کی قوت۔

مجھے جگر کی شاعری کی جن خصوصیات نے متاثر کیا ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری ذات کا پرتو ہے، سخن کا پردہ نہیں ہے۔ یہاں صرف ان احساسات اور جذبات کی جھلک ملتی ہے جنھوں نے شاعر کو بے چین کیا ہے مضطرب رکھا ہے۔ یہاں وہ مضامین نظم ہوئے ہیں جنھوں نے ذہن شاعر کو مجبور کر کے اپنے کو نظم کرایا ہے۔ یہ آسان بات نہیں ہے اس کے لئے زبردست جرأت اور ہمت کی ضرورت ہے جو ہر مصلحت کو ٹھکرا کر آگے بڑھ سکے۔ دوسروں سے خلوص برتنا آسان ہے اپنے سے خلوص برتنا بہت مشکل ہے۔ جگر کی سب سے بڑی جیت یہی ہے کہ انھوں نے اپنے فن پر کبھی مصلحت کا نقاب نہیں ڈالا۔

جگر نے شراب و شباب کی شاعری کی ہے اور ان کی زندگی کے یہ گوشے بھی کسی کی نظروں سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ شراب کو انھوں نے اپنایا اور اس دھڑلے سے پی کر شاید ہی اتنی سستی اور اتنی زیادہ شراب ہندوستان کے کسی زبان کے کسی شاعر نے پی ہو۔ جب سب کو جگر کے شعر مارے ڈال رہے تھے اس وقت

جگر کو شراب ماڈل رہی تھی، شاہد و شباب سے ان کے ربط و ضبط بھی چھپے نہیں ہیں اور انھوں نے اپنی رندی اور اپنے عشق دونوں کو پاک اور بے لاگ رکھا۔ ایسا رند پارسا اور ایسا پاکیزہ مشرب شاہد باز شاید ہی اردو ادب نے کبھی پیدا کیا ہو۔ لہٰذا جگر کی غزل میں خمریات کا ذکر جگ بیتی نہیں آپ بیتی کا حکم رکھتا ہے۔ عشق اور وارداتِ قلبیہ شاعری نہیں تھی زندگی تھی جس سے تمام شاعری جنم لیتی ہے۔ غزل یہاں تقلیدی غزل نہیں تھی اس میں حقیقی تجربے کا رنگ بھرا گیا وہ ذاتی کیف و درد اور سوز و نشاط کی آواز بن گئی تھی۔

شراب و شباب جگر کے ہاں آلودگی پر ختم نہیں ہوئے۔ واقع ہے جو لذتیت اور حسیات کا مزا انھیں ملا تھا اسے اصغر کے تصوف نے نکھر کر آلودگی سے پاک کر دیا۔ ان کے ہاں عشق وصال کے مزے کا نام نہ رہا ہجر کا کیف بن گیا۔ جگر کی شاعری محبوب کے پانے کی شاعری سے زیادہ محبوب میں کھو جانے کی شاعری ہے۔ وہ گویا محبوب سے زیادہ جذبۂ عشق سے عشق کرتے ہیں۔ وہ جذبۂ عشق جو محبوب سے ملاتا نہیں البتہ اس سے ملنے کی تمنا میں مستقل تڑپاتا ہے اور یہ تڑپ، یہ خلش، یہ غم وہ کلید ہے جو کائنات کے بھید کھولتی چلی جاتی ہے۔ جو یہ بتاتی ہے کہ اصل بصیرت نشاط میں گم ہو جانے میں نہیں ہے بلکہ نشاط سے آگے بڑھ کر غم دو جہاں کے زہر کو شیو کی طرح پی کر کائنات کے وجود کے دائمی گرب کا ہمراز ہو جانے میں ہے۔ انسان دوستی، عالمگیر ہمدردی اور اخوت کے مبارک جذبے صرف غم سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ غم محبوب کا حسین اور ہیجان انگیز حلقہ ہے

پھر سے شاد و صل سے ناشاد ___ کیا طبیعت جگر نے پائی ہے
اک شاہدِ معنی و صورت کے لئے کی تناسب کو ہے

ہم اس کے برعکس یہ بھی فرما لیکن یہ مزاجِ عام نہیں
غم کیا ہے زیورِ صفات و ذات ___ غم نہیں ہے تو آرزو، نہ حیات

یہاں محبوب کا کوئی کم عیار تصور نہیں ہو سکتا۔ جگر کا محبوب نہ شاہد بازاری ہے نہ بے رحم جلاد بلکہ وہ دراصل عاشق کی تکمیل ذات کا ایک ذریعہ ہے وہ خود بھی شاعری کی طرح درد و کیف سے آشنا ہے اور وہ بھی شاعر کی ذات کی سرمستی اور وارفتگی میں شریک ہے۔

ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدتِ غم سے
ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد

ملتا ہے مزاجِ حسن ہی سے رنگِ عشق
شمع گریہ پاک ہے گستاخ پروانہ بھی ہے

جسے خود بھی عشق کی دولت عزیز ہے اور جو عشق کے دل کی بات کو لفظ و معنی کے اشاروں کے بغیر پوچھ سکتا ہے۔

ابھی ہے دل کو مقامِ سپردگی سے گریز
اک اور بھی ہی گیسوئے عنبریں میں شکن

بیٹھے ہیں بزمِ دوست میں گم شدگانِ حسن و دوست
عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

اور اسی لئے حسن کا در جہ ان کے ہاں پرستش کا نہیں رفاقت کا ہے۔ گروہ رفاقت جو پاکیزہ ہے جو اس قدر مقدس ہے کہ میر کے لفظوں میں

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے ___ عشق بن یہ ادب نہیں آتا

کی مصداق ہے۔ اس پاکیزگی کا ذکر جگر نے ان الفاظ میں کیا ہے

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
ترے خاک پا کی قسم تری چھوٹی وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

مری طبیعت کو حسنِ فطرت سے ربطِ باطن نہ جانے کیا ہے
مری نگاہیں بھی نہ اٹھیں طہارتِ چشم تر سے پہلے

غم انسانی زندگی کی بصیرت کی کلید ہے اور غم محبت کا فیضان ہے لہٰذا جگر کے نزدیک محبت ہی زندگی کا آدرش ہے اور اسی مرکز پر انسانی سماج کی تشکیل ہونی چاہئے (میرا پیام محبت ہے جہاں تک پہنچے) اسی لئے وہ ایک انسانی سماج کا تصور کرتے ہیں جس میں افراد اور قومیں خود غرضی اور تعصب کے بجائے محبت، راست کرداری اور خلوص کو نظامِ حیات قرار دے سکیں۔ ان کے نزدیک اصل علم و اصل عرفان یہی ہے اور اگر تہذیب کے سارے علم اور علم و سائنس کی ساری ترقی کے باوجود انسان کی داخلی زندگی میں انقلاب پیدا نہ ہو سکا اور وہ خود غرضی، لالچ، تعصب اور تنگ دلی سے نہ نکل سکا تو ان کے نزدیک انسانیت کی ترقی بے کار ہے

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے مگر ___ دل میں اگر نہیں تو کہیں روشنی نہیں

انسان سے بڑھ کے پہنچے ہیں انسان تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انسان کا نہ تن ساقی نہ من ساقی

جہل خرد نے دن یہ دکھائے ۔۔۔ گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

جگر کے نزدیک انسان کی راست کرداری اور جرأت مندانہ خلوص سب سے اہم خصوصیات ہیں اور اسی لئے جب انھیں اپنے وطن میں راست کرداری، جرأت مندانہ خلوص اور درست نظری کی کمی نظر آتی ہے تو وہ مصلحت پرستی کے بغیر پورے خلوص اور کرب کے ساتھ اس پر تنقید کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے بہت سے مرثیے لکھے گئے لیکن جگر کی چھوٹی سی نظم ان سب پر بھاری ہے کیوں کہ اس میں وہ گاندھی جی کے سیاسی کردار سے زیادہ ان کے خلوص، ان کے پیغام محبت اور راست کرداری ہی پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ جمہوریت کا صحیح معیار فرد ہے۔ جو تہذیب بہتر افراد کو جنم دے سکتی ہے وہی معیاری تہذیب کہلانے کی مستحق ہے جگر ان معنوں میں اپنے دور کے ہندوستان اور اپنے دور کی مہذب دنیا سے ناآسودہ ہیں وہ انھیں مادی آسودگی اور ظاہری چمک دمک کے سامان دیتی ہے مگر انسان کی باطنی آسودگی اور اس کی راست کرداری کا حل اس کے پاس نہیں ہے۔ انسان کی مادی ترقی اور اس کے کردار کے زوال کا یہی تضاد ہے جسے کردار کے بحران سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ دن بدن زیادہ آسائش پسند، زیادہ متمول اور زیادہ طاقتور ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس کی خود غرضی اور اس کی مصلحت پرستی اور اس کی تنگ نظری اور تعصب بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ جگر اس ظیم نفسیاتی اور ذہنی بحران ۔۔۔۔ پر سخت تنقید کرتے ہیں۔

جگر اپنے دور سے مطمئن نہیں ہیں مگر وہ مایوس بھی نہیں ہیں۔ جگر کی شاعری فرد کے لئے بے یقینی کا نہیں عمل اور سوزِ یقین کا پیغام دیتی ہے۔ وہ ماحول کی تاریکی سے تھک کر بیٹھنے والوں میں نہیں خود اپنے "سوزِ باطنی سے غیر فانی مشعل" جلانے والوں میں سے ہیں۔

خود اپنے ہی سوزِ باطنی سے نکال اک مشعلِ غیر فانی
چمکا نہ دیر و حرم تو اے دل جلا کریں گے بجھا کریں گے

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل ۔۔۔ ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا
قسمت تری خود ہے ترے کردار میں مضمر
قسمت کو بنانا ہے تو قسمت سے گذر جا

ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں ہم اپنی کیوں وضعِ خاص بدلیں
کہ انقلابات تو یہ تو ہوا کئے ہیں یہ ہا کریں گے

اپنی اپنی دسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے
جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا

جان فدا اس پہ کہ جس نے جگر ۔۔۔ زیست بسر کی نہ ہمارؤں کے ساتھ

یہ معرکہ کاوشِ تعمیرِ درد و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے
ہر ایک لمحہ ہے درپیشی کارزارِ حیات
سکوں تلاش نہ کر اے دلِ سکوں دشمن
خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع جلنے دو
پرائی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ
جو دشمنی کے لئے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں
دلِ خوباں میں چبھتا ہے انھیں کا باکپن ساقی
ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

یہاں جگر ایک ایسے شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں جسے فرد کی طاقتوں پر بے پناہ اعتماد ہے۔ جسے انسان کی عظمت اور اس کے باطنی منابع پر بے بہا کا احساس ہے

ہر سپہ کائناتِ دو عالم میں اے جگر
انسان ہی ایک چیز ہے انسان مگر انسان

اور ان کی شاعری یہاں اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں وہ سستا نشہ نہیں بنتی، سوزِ یقیں اور جوششِ عمل کی پیغامبر بن جاتی ہے اور غزل میں یہ آہنگ سمو لینا اس دور کے شعراء میں جگر کے علاوہ بہت کم شعراء کے یہاں ملتا ہے۔

ان خیالات کے بارے میں دو باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں۔ یہ خیالات جگر کے ذاتی خلوص سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں نہ تقلید کا

رنگ ہے کہ کسی مخصوص مکتب خیال یا پارٹی سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان کو اپنایا گیا ہے۔ ان پر جگر کی شخصیت کی چھاپ ہے۔ یہ جگر کی ذات کے ریشے ریشے کی پکار ہیں اور اس میں ان کا خلوص معصلت کوشیوں، گروہ بندیوں اور کٹر نظریہ پرستیوں کو للکار کر حقیقت کی نئی دریافت کے درجے تک پہنچتا ہے۔

کہنے کو اہلِ علم کی کوئی کمی نہیں — لیکن خود اپنی فکر خود اپنی نظر کہاں
بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن — جھاڑ کے اُٹھے اپنا دامن

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان خیالات کو جگر نے جذبے کی شکل میں ڈھال کر شعریت بخش دی ہے۔ شاعری کی حدود احساسات کے لطیف ترین ارتعاشات سے شروع ہوتی ہیں اور خیال تک پہنچتی ہیں۔ عظیم شاعری محض احساسات کی شاعری نہیں ہوتی وہ خیالات کو جذبے کی قوت اور رنگینی بخش دیتی ہے اور اسے شعریت کے پیکر میں ڈھال دیتی ہے۔ جگر ان گنے چنے شعراء میں ہیں جنھوں نے حسنِ خیال کو نظم کیا، اسے جذبے کی رنگینی اور شعریت کا حسن بخش دیا۔ ان کے ہاں خیال کی حکمت نہ سہی مگر اس کا حسن اور اس کی صداقت ضرور ہے۔ اعلیٰ مقام ہمارے عظیم تریں شعراء کی صف میں نہ سہی مگر کامیاب اور رنگین فنکار شعراء کی صفِ اوّل میں ضرور ہے۔

غالباً 'دانغ جگر' اور 'شعلۂ طور' کے کلام کے پیشِ نظر جگر کی غزل گوئی کے بارے میں یہ رائے عام طور پر ظاہر کی جاتی ہے کہ ان کی غزل گوئی اساتذہ کی کامیاب تقلید ہے اور اس میں شباب و شراب کی پُرکیف مستیاں ہیں اور اسے سابق تغزلی یا فکری تعمق سے سروکار نہیں لیکن 'آتشِ گل' کے دور کی شاعری کے بارے میں یہ رائے یقیناً نا مناسب ہے۔ یہاں جگر کی قوتِ تغزل اس قدر پُر تاثیر ہے کہ وہ خیال کے براہ راست اظہار کے باوجود شعریت اور تغزل کے انداز کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چند نظموں کے استثناء کے بعد جگر کی شاید ہی کسی غزل کو اس کیف سے خالی قرار دیا جا سکے گا۔

جگر کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی شاعری کا سنگیت ہے۔ ٹیگور کے ڈرامے میں ایک کردار نے کہا تھا 'ہمارے اشلوک بولتے نہیں گاتے ہیں'۔ جگر کے اشلوک بھی بولتے نہیں گاتے ہیں۔ جگر کسی ظاہری اہتمام یا موسیقی کے انتخاب، ان کے معنوی ربط اور ان کی جھنکار اور صوتی تاثیر پر ان کی نظر اس قدر گہری ہے کہ گویا موزوں ترین الفاظ بلا کسی کاوش کے ان کے قلم سے نکلتے معلوم ہوتے ہیں۔ شعریت اور موسیقی جگر کی شخصیت کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار میں وہ جھنکار ہے جس میں صنعت گری کا شائبہ معلوم نہیں ہوتا۔ اندازِ بیان کا وہ سادا نکھرا ہوا روپ ہے جو روح کو وجد میں لاتا ہے اور شاعری کو موسیقی کے کیف و مستی سے مالا مال کر دیتا ہے۔ جگر نے اندازِ بیان کے مختلف انداز اختیار کئے ہیں اور ہر جگہ ان کی ندرتِ ادا، والہانہ پن، بے ساختگی اور سادگی سے معمور اور شعریت سے بھرپور آہنگ ایک نیا عالم پیدا کر دیتا ہے۔ چند نمونے

خرد حقیقت چالاک و چست و سست خرام
جنوں صداقت بے باک و مصلحت دشمن
کہاں کے لالہ و گل، کیا بہار تو بہ شکن
کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن
ارے غضب ارے ستم وہ اک نگاہِ سحر فن
جھکے اگر تو بت کدہ اُٹھے اگر تو بت شکن
وہی دیں وہی زماں وہی مکیں وہی مکاں
مگر سرورِ یک دلی مگر نشاطِ انجمن

کہاں پہلوئے خورشید جہاں تاب — کہاں اک نازنیں دوشیزۂ شبنم
زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے
اے جنوں اور بھی اک لغزشِ مستانہ سہی
اپنی شوریدہ مزاجی کو کہاں لے جاؤں
تیرا ایمانہ سہی تیرا اشارہ نہ سہی

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے — زلف و مژہ کے سایے سایے
کارِ زمانہ جتنا جتنا — بنتا جائے بگڑتا جائے
ہو آتا نہیں پھر کہ مژہ تک — نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا
یک لفظ خوشی کا جب انجام نظر آیا
شبنم کو ہنسی آئی دل غنچوں کا بھر آیا

شعر و نغمہ رنگ و نکہت جام مہیا ہو گیا
زندگی سے حسن نکلا اور رسوا ہو گیا

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

غوض جگر کی غزل شاعرانہ وراثت کا ایک اہم سرمایہ ہے۔ جگر کی سرمستی، ان کا خلوص، ان کی جرأت اور راست کرداری ان کی شخصیت اور تغزل کی توانائی — یہ سب ایسے جوہر ہیں جن سے کیف و بصیرت حاصل کی جاتی رہے گی۔ علی سکندر اب اس دنیا میں نہیں لیکن جگر مراد آبادی کی آواز ایک مدت تک سوزِ یقین اور نورِ بصیرت بخشتی رہے گی جگر نے سچ کہا تھا:۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

---

# نیل کنٹھ کی فتح

نیل کنٹھ کی چوٹی مشہور تیرتھ استھان بدری ناتھ سے ۵ میل دور مغرب میں واقع ہے۔ اس کی بلندی ۲۱۶۴۰ فٹ ہے۔ وسطی ہمالیہ کی یہ چوٹی کوہ پیماؤں کی رائے میں بڑی دشوار گزار سمجھی جاتی ہے۔ اس خوبصورت چوٹی کو "گڑھوال کی ملکہ" کہا جاتا ہے۔

اس صدی کی ابتداء ہی سے اس چوٹی کو سر کرنے کی کوششیں ہونے لگی تھیں۔ پہلی بار ۱۹۳۷ء میں سمتھ کی رہنمائی میں ایک برطانوی ٹیم نے اس پر چڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ دس سال کے بعد ایک دوسری برطانوی ٹیم نے اس چوٹی کو فتح کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر ۱۹۰۰۰ فٹ کی بلندی سے اوپر نہ جا سکی۔ اس سال سوئٹزرلینڈ کے الپائن کلب کی طرف سے اس چوٹی تک پہنچنے کی کوششیں ہوئیں مگر ناکامی ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں ایورسٹ کے فاتح سر ایڈمنڈ ہلاری نیوزی لینڈ کی ایک ٹیم کے ساتھ اس چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کی مگر ۱۸۰۰۰ فٹ کی بلندی سے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ برسات کے بعد انھوں نے دوسری طرف سے چڑھنے کی پھر کوشش کی مگر اس بار بھی کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں مشہور کوہ پیما ٹی۔ ایچ۔ ٹلی کی رہنمائی میں تیسری برطانوی ٹیم نے چوٹی سر کرنے کی کوشش کی مگر اسے بھی ناکام لوٹنا پڑا۔ سب سے آخری کوشش دو سال پہلے انڈین ایر فورس کی ایک ٹیم نے کی تھی مگر اسے بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس طرح ہر بار یہ چوٹی کوہ پیماؤں کو شکست دیتی رہی جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس کو فتح کرنا چاہتے تھے لیکن انسانی عزم اور ارادے کے آگے اس چوٹی کو سر جھکانا ہی پڑا۔ ساتویں بار جب کیپٹن این کمار کی سرکردگی میں ہندوستانی فوج کی ٹیم نے اس پر ہلہ بولا تو اس چوٹی نے بھارتی سورماؤں کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے اور ۱۳۔ جون ۱۹۶۱ء کو سری او۔ پی شرما دو شرپاؤں کے ساتھ چوٹی کی انتہائی بلندیوں پر پہونچ گئے اور یہ ناقابلِ تسخیر چوٹی فتح کر لی گئی۔

علی عبّاس حسینی

# قابیلی تجربے

جمری اپنے دوسرے ساتھیوں سے کچھ زیادہ سُوجھ بُوجھ رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ نئی نئی چیزوں کی کھوج میں لگا رہتا تھا۔ وہ 'بابا' کے بنائے ہوئے آلوں میں برابر ترمیم کرتا رہتا، گول کوچپٹا، چپٹے کو نوکیلا بنا کر دیکھتا کہ ان سے کون کون سے دوسرے کام لئے جا سکتے ہیں۔ ایک دن اس نے سوچا سارے آلے پتھر ہی کے کیوں رہیں۔ کوئی آلہ لکڑی کا کیوں نہ بنایا جائے۔ اس کے دماغ میں ایک کانٹھ کی مونگری کا دھندلا سا خاکہ آیا۔ اس نے ایک چوکور چپٹی لکڑی میں ایک نوکیلی لمبی لکڑی پہنانا چاہی۔ اس نے پتھر کے نوکیلے آلے سے چپٹی لکڑی میں بڑی کوششوں سے ایک چھوٹا سا سوراخ کیا۔ مگر لمبی لکڑی اس سوراخ میں نہ جا پاتی تھی۔ اس نے لمبی لکڑی کی نوک سوراخ پر رکھ کر زور زور سے گھمانا شروع کیا۔ وہ پسینے پسینے ہوگیا۔ مگر گھمانا رہا گھماتا رہا۔ دفعتہً چپٹی لکڑی سے لکڑی کے جال جیسی ایک مہین سی چیز نکلنے لگی۔ جمری نے لمبی لکڑی اور تیزی سے گھمائی۔ لکڑی کا جال کہرے جیسا سیاہی مائل ہوگیا۔ جمری نے کبھی کسی لکڑی کے ٹکڑے سے اس طرح کی چیز نکلتے نہ دیکھی تھی۔ پھر اس نے کہرے میں ایسی بُو سُنگھی کہ اس کا جی متلانے لگا۔ آنکھوں میں بھی مرچیں سی لگیں اور ان سے پانی بہنے لگا۔ وہ ڈر گیا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتا اور تھو تھو کرتا بھاگ کر دور کھڑا ہوگیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس لکڑی میں کوئی پُرست چھپا ہوا ہے۔ وہ کسی بھالو یا بھیڑیئے کی شکل میں نکلنے والا ہی ہے۔ وہ گردن بڑھائے ہوئے بڑے بڑے دیدے نکالے وہیں سے لکڑی کے ٹکڑوں کو گھورتا رہا۔ مگر لکڑی کا کہرا ہوا میں غائب ہوگیا اور وہ پھر جیسی کی تیسی دکھائی دینے لگی۔

جمری سوچنے لگا۔ یہ کیا بات ہے۔ پھر اسے خیال آیا لکڑی میں چھپا پریت باہر نکل کر چلا گیا ہوگا جب ہی وہ اپنے پیٹ سے کچھ نہیں نکالتی۔ وہ ڈرتا، سہمتا، جھجکتا، ٹھٹکتا پھر اس طرف بڑھا۔ اس نے قریب آکر وہ دونوں ٹکڑوں کو پھر غور سے دیکھا اور ہلکی سی ٹھوکر ماری۔ لمبی لکڑی چپٹی لکڑی سے الگ ہوکر گر گئی۔ اس نے گردن جھکا کر انھیں غور سے دیکھا۔ وہ بے ضرر معلوم ہوئیں۔ اس نے اب ڈرتے ڈرتے انھیں چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے چپٹی لکڑی کو ایک اُنگلی سے چھوتے ہی جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جہاں سے کہرا نکلا تھا وہ حصّہ سیاہی مائل بھی تھا اور گرم بھی۔ اس نے اُسے اُٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے سونگھا، پھر چکھنے لگا، پھر ڈرنے لگا۔ مگر کھوج لگانے والی خواہش بڑھتی ہی گئی۔ وہ جی کڑا کر کے اکڑوں بیٹھ گیا اور اس نے چپٹی لکڑی کو پاؤں کے انگوٹھوں سے دبالیا۔ اور لمبی لکڑی کی نوک سوراخ پر رکھ کر زور زور سے گھمانے لگا۔ اب کے جو دھواں نکلا تو اس نے پروا نہ کی۔ وہ برابر گردن ٹیڑھی کئے لکڑی پر لکڑی رگڑتا ہی چلا گیا۔ دفعتہً دھوئیں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ ایک گرم رو اس کی انگلیوں میں آ لگی۔ ان میں ایک جلن سی پیدا ہوئی۔ اس نے لمبی لکڑی ہاتھ سے چھوڑ دی اور چپٹی میں سے نکلتی ہوئی چمک کو

بجھانے کے لئے اس کے پاؤں کے پاس جو سوکھی پتیاں پڑی تھیں مٹھی بھر اٹھا کر اس پر ڈال دیں اور وہ خود اچھل کر دُور کھڑا ہو گیا۔ مگر ان سوکھی پتیوں نے تو اس لال لال چمکتی چیز کو اور بھی بڑھاوا دیا۔ اب تو پٹے دھوئیں کے پیچھے ہر طرف لمبی لمبی زبانیں نکالے وہ چیز دوڑنے لگی۔ یہ زبانیں پتیوں ہی کو نہ کھا گئیں بلکہ اس پاس کی سوکھی شاخوں کو بھی چٹخارے لے کر کھانے لگیں۔ اور ہوا کا جو بھی جھونکا ادھر سے جھری کی طرف آتا محسوس ہوتا اُسے یوں لگتا جیسے وہ بھی جل اُٹھے گا۔

اسی پریشانی میں اسے یاد آیا کہ اس کے بھائی سنگی نے ایک خاص طرح کے دھوئیں کا ذکر کیا تھا جو نذر والے پتھر سے نکلتا تھا "بابا! سال میں ہر فصل کی پیداوار کا ایک حصّہ یا بھیڑوں کے گلے میں سے سب سے اچھا میمنہ اس پتھر پر رکھ دیتے۔ دُھوئیں کا ایک حلقہ سا پیدا ہوتا اور اپنے ساتھ ان چیزوں کو اُڑا کر لے جاتا۔ مگر کبھی کسی نے اس چیز کا ذکر نہ کیا تھا جو مینہ کے کوڑے جیسی چمکتی ہوئی ہے اور جو آسمان پر دھاڑنے چنگھاڑنے کی جگہ زمین پر رینگتی، شاخوں پر چڑھتی، لال لال زبان سے پتیوں، گھاسوں، لکڑیوں، پتھروں کو چٹ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے وہ بھاگا ہوا سنگی کے پاس ان کھیتوں میں گیا جہاں وہ کھڑا اپنے خطے کی زرد زرد بالیاں توڑ رہا تھا۔ سنگی بھائی سے یہ انوکھی روداد سن کر زیادہ نہ گھبرایا۔ اس نے ایک بار مینہ کے کوڑے کو کالے بادلوں میں سے نکل کر ایک درخت میں لپٹ جاتے دیکھا تھا۔ اس پیڑ سے بھی اسی طرح کی لال لال زبانیں پھوٹ نکلی تھیں اور اس کی ڈالیوں کو چبانے لگی تھیں۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بادلوں نے اس سینکڑوں زبان والے پریت پر اتنے تیر برسائے تھے کہ وہ سرد آہیں بھرتا جلد ہی روپوش ہو گیا تھا۔ اس لئے جری کے ساتھ آتے ہی سنگی نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور پاس ہی جو چشمہ تھا اس میں سے دونوں چلوؤں میں پانی بھر بھر کر اس لال پریت پر چڑھانا شروع کر دیا۔ پانی جہاں پڑتا پریت ٹھنڈی سانسیں بھر کر غائب ہو جاتا۔ جری بھی بھائی کا ساتھ دینے لگا۔ اس نے دیکھا اس کی دونوں ٹکڑیاں اپنی صورت بدل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی ہیں۔ آس پاس پڑی ہوئی سوکھی پتیوں اور ٹہنیوں کا بھی یہی حال ہے جس چیز پر پانی پڑتا وہ چھن چھن کو کے راکھ ہو جاتی یا لال کی جگہ کالی ہو جاتی۔ اس لئے میں اس کی نظر باشت بھر لمبی ایک چیز پر پڑی جو لال بھبوکا ہو رہی تھی مگر زبان نکال کر کسی کو کھاتی نہ تھی۔ جری نے اس پر بھی پانی ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ پتھر کے نیچے اس طرح چھپی بیٹھی تھی کہ اس تک پانی نہ پہنچتا تھا۔ جری نے درخت کے تنے سے لگے ہوئے پتھر والے گرز کو اُٹھا لیا اور زور کر کے اسے چٹان کے نیچے گھسایا اور اس دبے ہوئے ٹکڑے کے پاس لے گیا۔ پھر اس نے ایک جٹکا دیا۔ باشت بھر کا لال ٹکڑا اُچھل کر چٹان پر جا پڑا اور اس کے جسم بھر سے چنگاریاں اڑیں۔ جری ذرا جھنجھلایا۔ یہ ٹکڑا تو کچھ عجیب حرکتیں کر رہا ہے اس نے اس پر گرز کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ وہ پھر اُچھلا۔ اس نے پھر چنگاریاں اڑائیں اور قد میں پہلے سے کچھ بڑھ گیا۔ جری اسے غور سے دیکھنے کے لئے پاس ہی اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنے گرز سے آہستہ آہستہ چوٹیں دینے لگا۔ اس نے دیکھا ہر چوٹ پر وہ چیز پہلے کی نسبت کچھ نہ کچھ پھیل جاتی ہے، بڑھ جاتی ہے۔ اس نے ایک پتھر اُٹھا کر اس انوکھی چیز کا ایک کونہ دبا لیا اور بقیہ حصّے کو گرز سے وہ آہستہ آہستہ پیٹنے لگا۔ وہ چیز برابر بڑھتی، پھیلتی پتلی ہوتی چلی گئی۔

سنگی جو لال پریت کو پانی ڈال ڈال کر وہاں سے بھگا چکا تھا، بھائی کے پاس اس آخری لال ٹکڑے کو دیکھ کر لپکا ہوا آیا۔ اس نے دیکھا مگر مچھ کے بچے کے برابر یہ ٹکڑا جری کے ہاتھوں کے نیچے دبا ہوا پھڑک رہا ہے اور ہر بار اس کے ہاتھ پر وار کرنے کی کوشش کر رہا ہے گرز پر گرز اس کی پیٹھ پر پڑتے جاتے ہیں مگر نہ وہ مرتا ہے اور نہ بھاگ جاتا ہے۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کر وہ واقعی جری کو کاٹ کھائے۔ اس نے دوڑ کر چشمے سے اوک بھر پانی لیا اور اس پر بھی ڈال دیا۔ چھن چھن آواز ہوئی دھواں اُٹھا اور وہ چیز لال کی جگہ کالی ہو گئی۔

سنگی تو پریت بھگا کر چلا گیا، مگر جری اب بھی بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ ہاتھ میں پتھر کے نیچے دبے ہوئے کالے ٹکڑے کو آہستہ آہستہ

چوٹیں دیتا رہا، مگر اب نہ وہ بڑھا، نہ پھیلا۔ اس نے اسے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا اس میں نوک پیدا ہو گئی تھی اور وہ ایک پہلو سے زیادہ چپٹا ہو گیا تھا۔ جری نے چپٹے حصے کو پانی سے گیلے پتھر پر گھسنا، رگڑنا شروع کیا۔ اس کی سیاہی کم ہوتی گئی اور اس میں چمک سی پیدا ہو گئی مگر وہ سوت بھر بھی نہ بڑھا۔ جری نے کچھ سوچ کر پہلے جیسے لکڑی کے دو ٹکڑے لئے۔ چپٹی لکڑی میں اس نئے آلے کی نوک سے سوراخ کرنے کی کوشش کی۔ وہ پتھر والے آلے سے زیادہ جلد لکڑی میں گھس گیا۔ جری ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے مسکرا دیا۔ اس نے سوراخ کے منہ پر نوکیلی لکڑی رکھ کر اسے زور زور سے گھمانا شروع کیا۔ جیسے ہی اس میں سے دھواں نکلا اور چمک پیدا ہوئی۔ اس نے اسے سوکھی پتیاں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھلانا شروع کر دئے۔ پھر لال لال زبانیں آس پاس کی چیزوں کو کھانے کے لئے نکل پڑیں۔ اس نے اپنے نئے آلے کو ان پر رکھ کر بہت سی سوکھی پتیاں اور گھاس پونچ کر اس پر ڈال دیں۔ کالا ٹکڑا پھر لال لال ہو گیا۔ جری نے پھر اسے گزرے سے اٹھا لی چٹان تک پہنچایا اور پھر اسے پتھر سے دبا کر وہ اسے پیٹنے لگا۔ وہ بڑھتا گیا، پھیلتا گیا اور اس کے چپٹے حصے میں دھار سی پیدا ہو گئی۔ گدلال زبانیں اس تک بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ جو ہوا کا جھونکا ادھر سے آتا اسے محسوس ہوتا وہ جھلس جائے گا، بھن جائے گا۔ جری نے اس پریت کو بھگانے کے لئے بھائی کے طریقے پر عمل کیا۔ اس نے چلوؤں میں پانی بھر بھر کر ان زبانوں پر لا کر چھوڑا۔ یوں اس پریت کو اپنے اوک سے پانی پلانے پر وہ منہ چھپا کر چلا گیا، لڑی ٹھنڈک میں بدل گئی اور لال آلہ پھر کالو ہا بن گیا۔ اب وہ اس کالو ہے کو پھر پتھر پر رگڑنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس کی کالک دور ہو گئی اور وہ نوک اور دھار کے پاس چم چم چمکنے لگا۔ جری اس کی یہ چمک جھلک دیکھ کر خوش ہو گیا۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر گھمانے لگا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جتنے، پودے، بھی گھاس یا پتے تنے والے درخت بیچ میں آئے وہ سب کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے سارے موجود آلوں سے بہتر کاٹنے والا آلہ بنا لیا۔ مگر سارا دن ہی دل میں خیال آیا اسے کسی جاندار پر آزما کر دیکھنا چاہیئے۔ جاندار کے اندر جو پریت چھپا ہوا ہے ممکن ہے وہ انہیں اس صفائی سے کاٹنے نہ دے۔ اس نے جلدی جلدی ادھر اُدھر نظر ڈالی تھوڑے فاصلے پر ایک جھاڑی میں ایک بوڑھی، لنگڑی بھیڑ کے بال اس طرح پھنس گئے تھے کہ وہ اس سے نکل نہ سکتی تھی اور بڑی بے بسی سے کھڑی "میں! میں!" کر رہی تھی۔ اس کے مالک کا کہیں پتہ نہ تھا البتہ دو چار گدھ ابھی سے منڈلاتے دکھائی دے رہے تھے۔ جری کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ لپکتا ہوا بھیڑ کے پاس پہنچا اور اس نے اپنے نئے تیشے کا بھرپور ہاتھ اس کی گردن پر مارا۔ سر کٹ کر دھڑ سے دُور گر پڑا۔ جری خوشی سے اُچھل پڑا اور اس نے خون بھرے تیشے کو چوم لیا۔ ساتھ ہی خیال آیا لاؤ تیشے کے اس پہلے شکار کو نذر والے پتھر پر چڑھا دیں۔ مفت مفت کی نذر بھی ہو جائے گی اور پتھر سے کیونکر دھواں نکلتا ہے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے تیشہ بغل میں دبایا اور بھیڑ کا سر اور دھڑ دونوں ہاتھوں میں اٹھائے وہ نذر والے پتھر کی طرف چلا۔

راہ میں اس نے دیکھا کہ اس کا بھائی سنگی بھی اپنے غلے کی بالیوں کا ایک موٹا سا گٹھا سر پر رکھے چلا آ رہا ہے۔ جری ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑے فخر سے سنگی کو اپنے تیشے کا پہلا شکار دکھایا۔ پھر وہ اکڑ کر بولا "آؤ ہم تم دونوں اپنی اپنی نذر چڑھائیں، دیکھیں کس کی قبول ہوتی ہے!"

دونوں نے پتھر کے الگ الگ کونے پر اپنی اپنی نذر رکھ دی۔ سنگی گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر نذر کے قبول کئے جانے کی دعا مانگنے لگا۔ مگر جری ہاتھ میں تیشہ لئے اکڑا کھڑا رہا۔ دفعتہً جس حصے پر گیہوں کی سنہری سنہری بالیاں رکھی تھیں وہاں سے دھواں نکلنے لگا اور آنکھ جھپکتے ہی اتنا گہرا اور گھنا ہو گیا کہ اس کے

اندر کی کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ چند منٹ بعد جب یہ دھواں غائب ہوا تو سنگی کی نذر کا ایک ایک دانہ ساتھ لیتا چلا گیا مگر جری کی بھیڑ اسی طرح پڑی رہی۔ جری کی آنکھیں غصے سے چمکنے لگیں۔ اس نے سنگی کو مڑ کر دیکھا اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ وہ تو لگائے تھوڑی دیر بیٹھتا جھومتا رہا۔ پھر وہ "شکر! شکر!" کہتا "بابا" کی طرح سجدے میں گر پڑا۔ جری کا غصہ بھڑک اٹھا۔ جی چاہتا تھا سنگی کی نذر قبول کرنے والا سامنے ہوتا تو اس پر وار کر کے دیکھتا کہ وہ بھی کٹتا ہے یا نہیں۔ پھر اس نے سوچا، لاؤ اس سجدے میں جھکی ہوئی گردن پر تیشے کا وار آزما کر دیکھوں وہ کٹتی ہے کہ نہیں!

اس نے بھائی کی گردن پر تیشے کا بھرپور ہاتھ مار دیا۔ بھیڑ کے سر کی طرح سنگی کا سر بھی دھڑ سے الگ ہو کر دور گرا پڑا اور اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑ کر زمین پر پھیلنے لگی ——!

بوڑھے 'بابا' کو جب سب سے پہلے اس خونی تجربے کی خبر دی گئی تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جریوں سے کہا: "آج سے تمہارے قبیلے والا جب بھی کوئی کام نئے، مارنے والا آلہ ایجاد کرے گا تو وہ اسے اپنے بھائیوں ہی پر ضرور آزمائے گا۔"

مقدس کتابوں کی زبان سے ہم نے 'بابا' کا نام آدم، جری کا قابیل اور سنگی کا ہابیل سنا ہے۔ اور ہم جو اپنے کو آدمی کہتے ہیں یہ برابر دیکھ رہے ہیں کہ کوئی 'قابیل' جب بھی کوئی نئی آلہ ایجاد کرتا ہے تو وہ پہنچتے ہی ہابیلوں کی تاک میں لگ جاتا ہے کہ کوئی بہانہ ہاتھ آجائے اور وہ اسے اپنے بھائی پر آزما ڈالے!

---

## فروغِ تعلیم کو اعلیٰ ترجیح دینے کی ضرورت

### نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل کے اجلاس میں پنڈت نہرو کی تقریر

تیسرے پنجسالہ پلان کے مسودے میں ملک کی آئندہ ترقیات کے لئے اندازِ فکر، طریقِ کار اور ترجیحات وغیرہ سب درج ہیں لیکن ان سب کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کے ہر خاص و عام میں ایک جذبہ ہو۔ ایک ایسا جذبہ جو تاخیر کو برداشت نہ کرے، کسی فرد سے اپنا فرض ادا نہ کرنے پر برہم ہو جائے اور ایک مکمل کامیابی سے کوتاہی برتنے کے خلاف حرکت میں آجائے۔

پلان کے مسودے کے شروع میں ہی اس کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں لیکن وہ تو پورا ایک باب ہے۔ مختصر طور پر یہ مقاصد ایک جملے میں بیان کئے جا سکتے ہیں یعنی بھارت کے ہر باشندے کو اچھی زندگی کا موقع مہیا کیا جائے۔ اب یہ کس طرح کیا جائے یہ سب کچھ آپ کو ڈھونڈھ نکالنا ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ ذہن نشین رہے کہ ہمارے پیشِ نظر پورے ملک کی آبادی ہے۔ ۴۳ کروڑ ۸۰ لاکھ لوگ ہیں۔ ان لوگوں کے معیارِ زندگی کی اصلاح کرنے والی تدبیروں کے لئے ہم سب کو قوتِ فکر، قوتِ عمل اور قوتِ تخلیق سے کام لینا چاہیئے۔

غلام ربانی تاباں

# غزل

نہ ترے دورِ ناز میں زندگی بہ صد اعتبار گزر گئی
تری راہگزار سے ربط تھا سرِ رہگزار گزر گئی

غمِ سازگار ملا ہمیں غمِ سازگار کے آسرے
شبِ انتظار گزر گئی شبِ انتظار گزر گئی

سرِ بزم جلوہ فروش تھا بہ ہزار تمکنت و ادا
اُسے کیا خبر ہے کہ تجھ پہ کیا دلِ بے قرار گزر گئی

بہ گمانِ سازگزاردی بہ یقینِ سوزگزاردی
کسی نامراد کی زندگی بھی مآلِ کار گزر گئی

تو نہ مل سکا ترے غم ملے ہمیں دل نواز ستم ملے
جسے زندگی کی خزاں کہیں بڑی پُر بہار گزر گئی

ابھی ربط اتنا بہار سے کسی بے نوائے چمن کو ہے
کوئی موج آئی اگر کبھی تو شمارہ وار گزر گئی

وہی محتسب کی سیاستیں، وہی تشنگی کی اذیتیں
کسی بادہ کش پہ قیامتِ غمِ روزگار گزر گئی

الیش کمار

# فرانسس بیکن

الزبتھ کا عہد انگلستان کے لئے ویسا ہی ہے جیسا پیریکلیز کا ایتھنز کے لئے یا چندر گپت کا ہندوستان کے لئے۔ انگلستان دنیا کی طاقتوں میں سرتاج تھا۔ اسپین، ہالینڈ اور فرانس یکے بعد دیگرے مقابلہ میں آئے لیکن پچھڑ نہ سکے۔ اسی سنہری عہد نے انگلستان کا سب سے بڑا شاعر ورڈزورتھ، شیکسپیئر پیدا کیا اور یورپ کے جدید فلسفہ اور سائنس کا بانی بیکن۔

بیکن ایک امیر گھرانے میں ۱۵۶۱ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سر نکولس بیکن عہد الزبتھ کے ابتدائی بیس سال ایک نہایت ممتاز عہدے پر سرفراز رہا۔ اس کی ماں شاہ ایڈورڈ ششم کے استاد کی بیٹی اور لارڈ برکلے کی سالی تھی جو الزبتھ کا فنانس خزانہ اور اس کے چیدہ مدبروں میں سے تھا۔ خود وہ ایک نہایت ہوشیار اور قابل عورت تھی۔ کئی زبانیں جانتی تھی۔ یونانی میں خط و کتابت کرتی تھی۔ اس نے بیکن کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بارہ سال کی عمر میں بیکن کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ تین سال وہاں رہا۔ اسے وہاں کی تعلیم اور ضابطہ سے سخت نفرت ہوگئی، خاص کر ارسطو کے فلسفہ سے جس کا اس وقت کیمبرج میں بہت زور تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بڑا ہو کر فلسفے کو خشک اور غیر مفید موشگافی کے راستے سے نکال کر عملی اور زرخیز راستے کی طرف لے جائے گا۔ لیکن ایک سیاسی خاندان کے لڑکے کے لئے اس چھوٹی سی عمر میں سیاسی راستے کھل گئے اور اس نے کچھ وقت کے لئے فلسفہ کو بالائے طاق رکھ دیا۔ سولہ سال کی عمر میں ہی اسے فرانس میں انگریزی سفیر کے عملے میں ایک اسامی مل گئی۔ اسامی قبول کرتے وقت اس کے دل میں فلسفہ اور سیاست کی ترغیبوں میں ایک کھینچا تانی سے ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں اسے یقین ہوگیا کہ "میں بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔" لیکن ابھی اس خدمت کو انجام دینے میں کچھ دیر تھی۔

۱۵۷۹ء میں اچانک اس کے باپ کا انتقال ہوگیا اور اُسے واپس انگلستان آنا پڑا۔ عیش و آرام میں پلا ہوا بیکن اٹھارہ سال کی عمر میں ہی یتیم اور مفلس ہوگیا اور اُسے جبراً سادہ زندگی اختیار کرنی پڑی۔ ایک طرف تو اس نے وکالت شروع کر دی اور دوسری طرف اپنے بارسوخ رشتہ داروں سے التجا کرتا رہا کہ وہ اُسے کوئی اچھا عہدہ دلا دیں جو اُسے مالی مشکلات سے نجات دلائے۔ اس کے خطوط خوشامد اور چاپلوسی سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر ان کا کوئی تسلی بخش نتیجہ نہ نکلا۔ بیکن کو اپنی ہی کوششوں پر انحصار کرنا پڑا۔ اس میں اس کے کئی سال لگ گئے۔

۱۵۸۳ء میں وہ پارلیمنٹ کا ممبر چنا گیا۔ ۱۵۹۵ء میں لارڈ ایسکس نے جس سے ملکہ ناکام محبت کرتی تھی اُسے ایک معقول جائداد بطور تحفہ دے دی۔ لیکن بیکن شکر گزاری کو کوئی اہم جذبہ خیال نہیں کرتا تھا۔ ایسکس نے کچھ سال بعد الزبتھ کو تخت

سے آثار نے اور قید کرنے کے لئے سازش شروع کر دی۔ بیکن نے ایسی بغاوت کے خلاف پہلے تو اسے کئی خط لکھے مگر جب ایسیکس باز نہ آیا تو بیکن اس کے خلاف ہو گیا اور اس کے خلاف مقدمے میں سرگرم حصہ لیا۔ ایسیکس کو پھانسی کی سزا ملی۔

فلسفی بیکن حرص کو دبا نہ سکا۔ ہمیشہ غیر مطمئن رہتا۔ عیش پرستی اُسے پیسہ سے لی تھی۔ آمدنی سے خرچ کئی گنا زیادہ تھا۔ تماشن کو وہ سیاسی زندگی کا ایک اہم جزو سمجھتا تھا۔ قرض کی وجہ سے قید بھی ہو گیا مگر اس کی ترقی برابر جاری رہی۔ ۱۶۰۶ء میں وہ سالسٹر جنرل اور ۱۶۱۳ء میں ہی آثارنی جنرل بنایا گیا اور آخر کار ۱۶۱۸ء میں وہ لارڈ چانسلر کے عہدے پر مقرر ہوا۔

جوں جوں بیکن سیاست میں ترقی کے زینے پر چڑھتا گیا، توں توں وہ فلسفہ میں بھی کمال حاصل کرتا گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس زمانے کا بہترین فلسفی بہترین مدبر بھی بنے گا اور افلاطون کے فلسفی بادشاہ کا نمونہ۔ فکری اور عملی زندگی میں دونوں کو ملا دے گا۔ رتبے کی معروفیات اور ترغیبیں اس کی علم دوستی کو کم نہ کر سکیں۔ وہ بار بار لکھتا ہے کہ میں سیاسی زندگی میں اپنے رجحان کے خلاف بہا جا رہا ہوں۔" مجھے فلسفے کے بغیر جینے کی پروا نہیں۔" میں کسی اور شے کی نسبت ادب کے لئے زیادہ موزوں ہوں۔" ذہن انسان ہے اور علم ذہن ہے۔ ایک انسان صرف اس حد تک انسان ہوتا ہے جس حد تک کہ وہ علم رکھتا ہے۔"

بیکن کی سب سے مشہور اور بہترین ادبی تصنیف "آبے سیز" (مضامین) ہیں جن میں وہ ایک دنیاوار فلسفی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اُسے فلسفے سے سیاست کی نسبت محبت تو مزور زیادہ ہے لیکن وہ فلسفے کو سیاست کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے اور اسی فلسفے کی قدر کرتا ہے جس کا سیاسی اور عاملی زندگی میں فائدہ اٹھایا جا سکے۔ کہیں کہیں تو وہ خود غرضی اور چالاکی کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس کے مضامین ایک سیاست دان کے تجربے کا نچوڑ ہیں۔ اور سیاست دان بھی وہ جو نیکی کو نیکی کے لئے عمل میں نہ لائے بلکہ مفاد کے لئے۔ بلیک تو بیکن کو منکر سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر بیکن کا کہنا صحیح ہے تو حضرت مسیح کا کہنا غلط ہے۔ بیکن کا نقطۂ نگاہ انسانی فطرت پر مبنی ہے۔ اس بات پر نہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے بلکہ اس بات پر کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ اس کو غرض نیکی سے نہیں سچائی سے ہے۔ "انسانی فطرت میں دانائی کی نسبت بے وقوفی کا عنصر زیادہ ہے۔" بیکن اٹلی کے مشہور مدبر میکیاولی کی جس کا فلسفہ خود غرضی اور مکاری کے لئے مشہور ہے، جا بجا تعریف کرتا ہے۔ "ہم میکیاولی کے ممنون احسان ہیں کہ اس نے کھلم کھلا اور بلا دریغ ہم پر واضح کر دیا ہے کہ انسان کی خصلت کیا ہے۔" — "ہمیں حد سے زیادہ خوش اخلاق اور نیک نہیں ہونا چاہیئے میاداً لوگ ہم سے نفرت کریں اور ہمیں ایذا پہنچائیں —" "دنیا میں تھوڑا بہت فریب لازمی ہے —" "اس طرح محبت کرو کہ شاید تمہیں کبھی نفرت کرنی پڑ جائے اور اس طرح نفرت کرو کہ شاید تمہیں کبھی محبت کرنی پڑ جائے —" "جھوٹ کی ملاوٹ سونے اور چاندی کے سکوں میں دھات کی ملاوٹ کے موافق ہے جو ان سکوں کو زیادہ کارگر بناتی ہے —" "انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے اطوار اور کمزوریوں کا مطالعہ کرے تاکہ وہ انہیں اپنے مطلب کے لئے استعمال کر سکے —" "محبت بے وقوفی ہے جسے دور ہی رکھنا چاہیئے —" "ناکامی سے بچو، ہمسر کے برخلاف فتحمند مت چلاؤ۔ بڑے آدمیوں کے اطوار کے مطابق اپنے آپ کو بدل لو۔" یہ ہے بیکن کا اخلاقی نقطۂ نگاہ — یہ ایک ابن الوقت سیاست دان کا نقطۂ نگاہ ہے جس میں وجدانیت کی اکساہٹ اور محبت کی پاکیزگی کا دخل نہیں۔ جذبات اور احساسات کو بیکن دبانا چاہتا ہے۔ ایک ناقد کا کہنا ہے کہ اس نے مضامین لکھتے وقت دل کو مقفل کر دیا اور دماغ سے کام لیا۔ انسان کو بیکن ایک مشین تصور کرتا ہے جو مقررہ قانون کے مطابق کام کرے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک سیاست دان کے لئے رشک اور دھوکہ بہانہ تک کہ بداخلاقی بھی ضروری ہے۔ دوستی خود غرضی پر مبنی ہے۔ ایسی محبت اور دوستی جو دو روحوں کے درمیان ایک خوش کن اور دل پذیر رشتہ ہے بیکن کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایک

دھوکہ باز اور مکار شخص تھا بلکہ جو کچھ اس نے لکھا اپنے مشاہدے اور تجربے سے لکھا۔ اور اس کا تجربہ جمہورِ اوّل کے خوشامدی سیاست دان اور چاپلوس درباریوں تک محدود تھا۔ اپنی زندگی میں اسے اپنی بیوی اور نوکروں نے دھوکا دیا جس سے اس کے دل میں انسانی فطرت کے لئے حقارت سی پیدا ہو گئی۔ انسان کی اخلاقی زندگی سے وہ کچھ مایوس سا تھا۔ لیکن انسان کی دماغی قابلیت کا مدّاح۔ "ذہین انسان ہے اور علم ذہن ہے۔ ایک انسان صرف اس حد تک انسان ہے جس حد تک وہ علم رکھتا ہے۔" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت میں اخلاق کا کچھ حصّہ نہیں۔ "کتابوں میں ہم عقل مند لوگوں سے اس طرح بات چیت کرتے ہیں جس طرح عملی زندگی میں احمقوں سے۔"

بیکن کے مضامین علمیت اور عقل کا بہترین نچوڑ ہیں۔ سمندر کوزے میں بند ہے۔ لفاظی سے بیکن کو نفرت ہے۔ وہ ایک لفظ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ صفحے دو صفحے میں وہ زندگی کے اہم ترین مسائل کو مکمل اور پُر لطف طریقے سے واضح کر دیتا ہے۔ اس کی تشبیہات موزوں اور پُر معنی ہیں۔ اس کے ایک ایک فقرے پر ایک لمبا مضمون اور ——— ایک ایک مضمون پر ایک لمبی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

بیکن کا فلسفہ واقعات کی نسبت اپنی قوتوں سے زیادہ نزدیک ہے۔ خواہشات دبانے سے دب نہیں سکتیں اور طاقت ور ہو جاتی ہیں۔ انسان کی فطرت کچھ دیر کے لئے چھپائی جا سکتی ہے مٹائی نہیں جا سکتی۔ رغبت کے وقت بھی فطرت نمودار ہوتی ہے اس بلّی کی طرح جو ایک خوب صورت پری کی شکل اختیار کر کے میز پر بڑے قرینے سے بیٹھی تھی۔ جب چوہا پاس سے گزرا جھٹ بلی بن کر اس پر جھپٹ پڑی۔ جسم کو ضبط اور بے اعتدالی دونوں کا عادی کرنا چاہیئے۔

بیکن شیکسپیر کی طرح انسانی فطرت کا مطالعہ اور ترجمانی کرتا ہے اور کبھی ملٹن نہیں کرتا۔ "شادی کے پہلے دن آدمی اپنے خیالات میں سات سال بوڑھا ہو جاتا ہے۔" "اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے آدمیوں کی اچھی بیویاں ہوتی ہیں۔" "دنیا میں دوستی بہت کم ہے اور برابر والوں میں اور بھی کم۔ اگر کہیں ہے بھی تو اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان جن کی قسمتیں ایک دوسرے سے وابستہ رہ سکتی ہیں ..... وہ لوگ جن کو اپنے دل کا حال بیان کرنے کے لئے دوست میسّر نہیں اپنے دلوں کو کھا تے رہتے ہیں۔" "آدمی ایک گھنٹے کی گفتگو سے ایک دن کے غور و فکر کی نسبت زیادہ دانش مند ہو جاتا ہے۔"

سیاست میں بیکن قدامت پسند ہے اور طاقت ور مرکزی حکومت کا حامی۔ بادشاہت حکومت کی بہترین عملی شکل ہے۔ جنگ کی وہ کھلم کھلا حمایت کرتا ہے۔ "جنگ ایک صحت مند قوم کے لئے قدرتی ورزش ہے۔" "صنعت و حرفت کی ترقی جنگی آویزوں کے لئے غیر موزوں ہے۔" "طویل امن انسان کے جنگی جذبے کو سُلا دیتا ہے۔" لیکن بیکن انقلاب کے خلاف ہے۔ انقلاب کو دبانے کی نسبت اس کے اسباب کو دور کرنا بہتر ہے۔ انقلاب کے دو اسباب ہوتے ہیں، ایک غریبی دوسرے بے اطمینانی۔ انقلاب سے بچنے کا ایک بہتر نسخہ یہ ہے کہ دولت کو انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔ روپیہ کھاد کی طرح ہے۔ یہ اس وقت تک اچھا نہیں ہے جب تک اسے پھیلایا نہ جائے۔" لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیکن جمہوریت یا اشتراکیت کا حامی ہے۔ وہ عوام پر اعتماد نہیں کرتا۔ وہ فاسیس کو ٹھیک سمجھتا ہے جس نے یہ دیکھ کر کہ عوام اس کی تعریف کر رہے ہیں یہ پوچھا کہ کیا میں نے کوئی غلطی کی ہے؟ بیکن زمینداروں کی قوم کو پسند کرتا ہے جس پر شرفا حکومت کریں اور حکمران عالم ہوں اور ایسے حکمرانوں میں سینیکا اور مارکس ایلیس کی مثالیں دیتا ہے۔ وہ خود بھی ایسا ہی حکمران بننے کا خواہش مند تھا۔

حکمرانی کے ارکان میں بھی اس کی علم دوستی قائم ہے۔ اسے یہ دیکھ کر رنج ہوتا تھا کہ مدّتوں سے فلسفہ اور سائنس ساکن حالت میں ہیں اور ان میں کچھ اضافہ نہیں ہو رہا۔ اسے ہر وقت یہی فکر تھا کہ کس طرح فلسفے کو کسی نئے سرے سے تعمیر کیا جائے اور دنیا کو نئی موشگافی سے نکال کر عملی راستے پر لگایا جائے۔ "علم ایک رائے نہیں جس کو قائم کر لیا جائے بلکہ ایک کام ہے جس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ میں کسی فرقے یا عقیدے کی بنیاد رکھنے کی کوشش

نہیں کر رہا ہوں بلکہ مفاد اور طاقت حاصل کرنے کی ۔" اسی مقصد کے لئے اس نے "ترقی علم" نامی کتاب لکھی ۔ وہ لکھتا ہے کہ "میرا ارادہ ہے کہ علم کی دنیا کا دورہ کروں اور مجھوں کہ کون سے حصے بنجر اور غیر مزروعہ ہیں جن کو انسان کی محنت نے چھوڑ رکھا ہے تاکہ ویران قطعوں کے صحیح نقشے بنا کر ان کی اصلاح کے لئے شخصی اور جماعتی قوتوں کو استعمال کیا جائے ۔" اس نے برکلے کو ۱۵۹۲ء میں ہی لکھ دیا تھا کہ میں نے تمام علوم کو اپنے حلقے میں لے لیا ہے ۔ یہ ایک نئی قسم کی آواز تھی جس نے جدید علوم کی بنیاد کا اعلان کر دیا ۔

اس کتاب میں وہ باری باری ہر ایک علم کا جائزہ لیتا ہے کہ اس میں کتنی ترقی اب تک ہوئی ہے ۔ کتنا اس میں توہمات کا عنصر ہے اور کس طرف ترقی ہونا باقی ہے ۔ مثال کے طور پر وہ علم طب کی بابت کہتا ہے کہ حکمت کا فرض ہے کہ جسم کے باجے کو سر اور تال میں رکھے ۔ طبیب اکثر پیچ لسنے استعمال کرتے ہیں ۔ اپنے اظہاری وہم پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔ طب کے تجربات کے لئے بڑی بڑی لیبارٹریاں ہونی چاہئیں جن میں وسیع پیمانے پر بیماریوں کی کھوج ہو ۔ انسانی جسم کا کاٹ کر مطالعہ کرنا چاہیئے ، انھیں نہ صرف انسان کی عمر کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیئے بلکہ موت کے درد کو بھی کم کرنا چاہیئے ۔" آج کل یہ تمام باتیں معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن آج سے تین سو سال پہلے علم طب یورپ میں سائنس کے اصولوں پر مبنی نہیں تھا ۔ جادوگر طبیب خیال کئے جاتے تھے اور بہت سی بیماریوں کا علاج جادو سے کر لیا جاتا تھا اگر آج علم طب سائنس کے اصولوں کے مطابق ترقی کر رہا ہے تو اس کے لئے ہمیں بہت حد تک بیکن کا ممنون احسان ہونا چاہیئے جس نے خود تو کوئی تجربہ نہ کیا مگر اطباء کو ٹھیک راستہ دکھایا ۔

اسی طرح بیکن تمام علوم کی چھان بین کرتا ہے ۔ اُن کی موجودہ حالت کے نقائص نکالتا ہے اور ان کے لئے ٹھیک راستہ تلاش کرتا ہے ۔ وہ ہر ایک سائنس کو علت اور معلول یعنی وجہ اور اس کے نتیجے کے اصول پر چلانا چاہتا ہے اور اتفاق کے عنصر کو سائنس کی لغت سے نکال دینا چاہتا ہے ۔ "اتفاق ایک ایسی چیز کا نام ہے جس کا وجود نہیں ہے"۔ اسی طرح وہ انسان کی زندگی میں ارادے کی ہستی کو نہیں مانتا ۔" کائنات میں جو حیثیت اتفاق کی ہے انسان میں وہی ارادے کی ہے ۔" انسان میں عقل ہی حکمرانی کرتی ہے ارادہ کچھ نہیں ۔

سائنس کے تمام حصوں کا ذکر کر کے بیکن دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی سائنس کا ذکر کرتا ہے ۔ اس کے لئے سب سے زیادہ ضرورت علم کی ہے یعنی اپنے آپ کو جاننا اور دوسروں کو جاننا ۔ یونان کے حکماء خاص کر ارسطو نے لکھا تھا کہ اپنے آپ کو جانو ۔ بیکن اس کا کچھ خاص فائدہ نہیں سمجھتا ۔ اپنے آپ کو جاننے کے علاوہ اپنے ہمسایوں اور لواحقین وغیرہ کو جاننا ضروری ہے جن سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے ۔ ان کی خوبیوں کے علاوہ ان کی کمزوریوں ، ان کے دوستوں اور دشمنوں ، ان کے مزاجوں ، ارادوں اور مقاصد کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے ۔ کرشت سے دوست بنانے چاہئیں لیکن حد سے زیادہ شیریں اور خوش مزاجی سے اپنے آپ کو غیر مسلح نہیں کر لینا چاہیئے ۔ ہتھنی کی مکھی کی طرح مٹھاس کے ساتھ ڈنک بھی رکھنا چاہیئے ۔ دوستوں کو تمام راز نہیں بتانے چاہئیں ۔ اپنے دوستوں سے اس طرح محبت کرو گویا کہ وہ تمہارے دشمن بننے والے ہیں اور دشمنوں سے اس طرح سلوک کرو گویا کہ وہ تمہارے دوست بننے والے ہیں ۔" ترقی کے لئے کسی حد تک غرور بھی لازمی ہے ۔" نمائش اخلاقیات کی رو سے نقص ہو تو ہو ، سیاسیات کی رُو سے نہیں ۔ نمائش سے ہمت بڑھتی ہے جو دنیاوی کامیابی کے لئے ضروری ہے ۔"

سائنس میں ایک نئے طریقے کی ضرورت ہے جو اُسے پرانی غلطیوں سے نکال کر ترقی کے راستے پر گامزن کرے ۔ یہ طریقہ سمجھانے کے لئے بیکن نے اپنی سب سے بڑی کتاب لکھی جس کا نام "نووم آرگینم" یعنی نیا طریقہ ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ یونانیوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ انھوں نے تصور پر زیادہ زور دیا اور مشاہدے یا تجربے پر کم ۔ اسی واسطے ارسطو کے زمانے سے آج تک بہت کم ترقی ہوئی ہے بیکن کا نیا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان کو اپنی عقل کی صفائی کرنی چاہیئے یعنی اپنے ذہن کے تمام توہمات اور تعصبات مٹا دینے

چاہئیں۔ ان تعصبات کے لئے بیکن "بت" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اُو چار قسم کے بُتوں کی تشریح کرتا ہے۔ "جب تک ہم اپنے تعصبات سے نجات نہیں پاتے سائنس کے راستے پر نہیں چل سکتے۔ کسی چیز کو ماننے سے پہلے پوری تحقیق کرنی چاہیئے۔ اگر ہم یقین سے شروع کریں گے تو شک تک پہنچیں گے اور اگر شک سے شروع کریں گے تو یقین تک پہنچ جائیں گے۔

سائنس کے لئے بیکن نے انڈکشن کے طریقے کی اشاعت کی۔ یعنی پہلے اچھی طرح تمام پہلوؤں کو دیکھو، جانچو، تجزیہ کرو اور پھر نتیجہ نکالو۔ یہ کوئی نیا طریقہ نہیں تھا۔ ہم اس طریقے کو اپنی زندگی میں روزمرہ استعمال کرتے ہیں لیکن بیکن نے سائنس دانوں کی اس طرف پہلی بار توجہ دلائی اور اعتقاد و توہمات کی دنیا سے نکال کر تجربے کے راستے پر چلایا۔ اسی راستے پر چل کر سائنس نے ترقی کی ہے۔ یہ بیکن کا اہم ترین کام تھا۔

بیکن اب دنیاوی ترقی کے تمام زینے طے کر چکا تھا۔ اسے لارڈ کا خطاب ملا۔ اب وہ جیمز اوّل کے داہنے بازو کے مانند تھا لیکن مشہور ہے کہ کسی شخص کو اس کی موت سے پہلے خوش نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ جج صاحبان ان لوگوں سے جن کے مقدمے ان کی عدالتوں میں چلتے تھے، تحائف لیا کرتے تھے۔ بیکن بھی تحائف لیتا رہا۔ اس کے دشمنوں کو موقع مل گیا۔ ۱۶۲۱ء میں اس پر الزام لگایا گیا۔ کہ اس نے ایک مقدمے کے فیصلہ کے لئے روپیہ لیا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ بیکن نے جرم کا اعتراف کر لیا اور معافی مانگی۔ اسے قید کر دیا گیا لیکن دو دن کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا اور اس کا جرمانہ بھی معاف کر دیا گیا

اس نے اپنی زندگی کے باقی سال گوشہ نشینی میں گزارے۔ وہ تین کتابیں اور لکھیں۔ اب اسے افسوس ہونے لگا کہ میں نے سیاسیات کو پہلے کیوں نہ چھوڑ دیا اور اپنا تمام وقت ادب و فلسفہ میں کیوں نہ لگایا۔ مارچ ۱۶۲۶ء میں وہ گھوڑے پر جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ برف میں ڈھک دینے سے گوشت کو کس حد تک سڑنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اسی وقت اس نے ایک مرغ خریدا اور اسے برف میں ڈھک دیا۔ سردی سے وہ خود بیمار ہو گیا اور اُسے قریب ہی ایک دوست کے مکان پر پہنچایا گیا۔ اس کا تجربہ جاری رہا اور آخر کار کامیاب ہوا۔ لیکن یہ اس کا آخری تجربہ تھا۔ اس کی بیماری مہلک ثابت ہوئی۔ ۹۔ اپریل ۱۶۲۶ء کو وہ چل بسا۔ تمام عمر سائنس کے لئے جیا اور آخر کار سائنس ہی کے لئے جان دے دی۔

---

## بھارت میں خام لوہے کی پیداوار میں اضافہ

انڈین بیورو آف مائنز کی اطلاع کے مطابق مارچ ۱۹۶۱ء کے دوران میں خام لوہے کی پیداوار ۹۶۱۰۰۰ میٹرک ٹن رہی۔ جنوری سے مارچ ۱۹۶۱ء تک بھارت میں خام لوہے کی پیداوار ۲۸۱۵۰۰۰ میٹرک ٹن رہی جو گزشتہ سال کی اسی مدت کی پیداوار سے تقریباً ۶ فی صدی زیادہ تھی۔

خام لوہا پیدا کرنے والی ریاستوں میں اڑیسہ سب سے آگے رہا۔ اس کی پیداوار ۳۳۵۰۰۰ میٹرک ٹن تھی اس کے بعد ریاست بہار کا نمبر رہا۔ اس کی پیداوار ۲۳۰۰۰۰ میٹرک ٹن رہی جبکہ مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر کی پیداوار علی الترتیب ۲۱۷۰۰۰ میٹرک ٹن، ۱۲۰۰۰۰ میٹرک ٹن اور ۴۰۰۰۰ میٹرک ٹن تھی۔

مارچ ۱۹۶۱ء میں لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں کھپت کے لئے ۶۵۴۰۰۰ میٹرک ٹن خام لوہا بھیجا گیا جبکہ غیر ملکوں میں برآمد ہونے والے خام لوہے کی مقدار ۱۹۵۰۰۰ میٹرک ٹن تھی۔

رشید الدین

# اورنگ آباد

## (مرٹھواڑہ کا قدیم تاریخی و ادبی شہر)

یوں تو مرٹھواڑہ میں کئی ریک تاریخی مقامات (بشمول غار ہائے ایلورا و اجنٹا) ہیں جو آج بھی زبانِ حال سے اپنے زمانے کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور معاشرت کا حال بیان کر رہے ہیں، لیکن اورنگ آباد شہر ان تاریخی مقامات میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس شہر نے کئی زمانے دیکھے، کئی حکومتیں دیکھیں اور ہر ایک کا اثر قبول کیا۔ چنانچہ آج کا اورنگ آباد ہندو مسلم تہذیب کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

دہلی کی طرح اورنگ آباد کی تاریخ بھی بڑی طویل ہے اور اس میں بڑے مدوجزر پائے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں دولت آباد میں یادو خاندان کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی (بارھویں صدی عیسوی) اورنگ آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کا نام 'کھڑکی' تھا۔ لیکن ملک عنبر کی قسمت کے ساتھ ہی اورنگ آباد کی قسمت بھی پلٹی۔ احمد نگر کی حکومت کے زوال کے بعد ۱۶۰۰ء میں اس کے سپہ سالار ملک عنبر نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے اورنگ آباد کا نام کھڑکی سے بدل کر فتح نگر رکھا اور اس کو اپنی حکومت کا پایۂ تخت بنایا۔ ملک عنبر نے اس شہر کی ترقی میں بہت حصہ لیا اور اسے ہر طرح آراستہ و پیراستہ کیا۔ ملک عنبر نے اس کی آبادی اپنے زمانے میں تقریباً دو لاکھ تک پہنچا دی تھی۔ ملک عنبر کا اورنگ آباد کے تعلق سے جو سب سے اہم کام ہے وہ پانی کا عمدہ بندوبست ہے۔ ملک عنبر اپنے اس کارنامے کی وجہ سے تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس نے اس زمانے میں اورنگ آباد میں نہر کے جو نل جاری کروائے تھے اس کی مثال دنیا آج تک نہ پیش کر سکی۔ اس کی وجہ سے پانی کی اتنی افراط ہو گئی تھی کہ گھر گھر باغ نظر آنے لگے تھے اور اگر بعض انگریزوں کو تحقیق کا شوق نہ چراتا تو کوئی عجب تھا کہ آج بھی اورنگ آباد کے باشندے ملک عنبر کی اس دماغی اختراع سے فائدہ اٹھاتے، مگر افسوس کہ بعض انگریزوں نے تحقیق کی دھن میں سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ پھر بھی ان دنوں کی ایک بیتی جاگتی مثال آج بھی 'پن چکی' نامی ایک مشہور مقام پہ دیکھی جا سکتی ہے جو آگے آئے گی) موجود ہے جہاں رات دن ہر موسم میں ایک بلند مقام سے آبشار کے مانند پانی کی چادر گرتی رہتی ہے۔ یہ پانی ان ہی مٹی کے پائپوں کے ذریعے آتا ہے۔ لیکن یہ اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ پانی کہاں سے آتا ہے اور اس کا کیا انتظام ہے۔

ملک عنبر کے بعد اس کے کمزور جانشینوں کی وجہ سے دکن پر مغلوں نے قبضہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۶۵۳ء میں اورنگ زیب اپنے باپ شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں یہاں کا صوبے دار مقرر ہوا۔ اورنگ زیب کو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر یہ مقام بہت پسند آیا اور اس نے اپنے نام کی مناسبت سے اس کا

نام اورنگ آباد رکھا۔ جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

شاہ جہاں کے بعد جب اورنگ زیب اس زمانے کی عظیم مشرقی مملکت کا شہنشاہ ہوا تو اس نے اورنگ آباد کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور دکن میں دو ایسی سلطنتیں تھیں جنھیں مغلوب کئے بغیر دکن میں مغل سلطنت مستحکم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ ان سلطنتوں کو مغلوب کرنے کے لئے مستقل طور پر اورنگ آباد میں رہنے لگا۔ اور ایک طرح سے مغل سلطنت کا پائے تخت اورنگ آباد ہی ہو گیا۔ یہ زمانہ اورنگ آباد کی ترقی کا انتہائی زمانہ ہے۔ اورنگ زیب کی وجہ سے شاہی خاندان کے بہت سے افراد، امراء اور حکام یہاں چلے آئے اور یہ ایک بارونق اور مہذب شہر بن گیا۔ اس زمانے میں اورنگ آباد کی آبادی پانچ لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ اورنگ زیب نے اس زمانے میں یہاں بڑی اچھی اچھی عمارتیں اور مسجدیں وغیرہ تعمیر کرائیں جو آج کل تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔

اورنگ زیب کے بعد اس کے کمزور جانشینوں کی وجہ سے مغل سلطنت کو زوال آنا شروع ہوا اور مشرق کی یہ عظیم الشان مملکت پارہ پارہ ہو گئی۔ خود غرضوں اور مفاد پرستوں نے اس کی تباہی میں دل کھول کر حصہ لیا۔ چنانچہ اکثر و بیشتر صوبے خود مختار ہو گئے۔ نظام الملک نے جو اس زمانے کے بہت ہی قابل اور ذہین سیاست داں تھے، اس بات کی بہت کوشش کی کہ مرکز میں رہ کر ایک بار پھر ہندوستان بھر میں ویسی ہی مغل تنظیم قائم کی جائے مگر خود غرض اور مفاد پرست امراء کی وجہ سے وہ اپنی اس اسکیم میں ناکام رہے۔ اور جیسا کہ ایسے موقعوں پر اکثر ہوتا ہے ان کی مخالفت شروع کر دی گئی۔

چنانچہ مجبور ہو کر نظام الملک نے دلی چھوڑ دی اور دکن میں آ کر ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اورنگ آباد کی قسمت ایک بار پھر چمک اٹھی جب کہ اسے نئی ریاست آصف جاہی سلطنت کا پائے تخت بنایا گیا۔ اورنگ آباد کی پرانی اورنگ زیبی شان و شوکت پھر عود کر آئی اور یہاں وہی چہل پہل اور گہما گہمی نظر آنے لگی۔ نظام الملک اول کے انتقال کے بعد ان کے دو جانشینوں نے بھی اورنگ آباد ہی کو آصفیہ سلطنت کا پائے تخت رکھا لیکن ان کے تیسرے جانشین نظام سوم نے چند انتظامی مجبوریوں کی بناء پر اورنگ آباد کو خیرباد کہا اور حیدرآباد کو آصف جاہی سلطنت کا پائے تخت قرار دیا اور اورنگ آباد کو اس کا ایک صوبہ بنا دیا گیا جس کے تحت مرہٹواڑہ کے چار اضلاع ناندیڑ، بیڑ، پربھنی اور عثمان آباد تھے۔

یہاں سے اورنگ آباد کے بڑے دن شروع ہوتے ہیں۔ پائے تخت کی اس منتقلی نے اورنگ آباد پر بہت برا اثر ڈالا اور اس کی جو شاہی شان و شوکت تھی وہ جاتی رہی۔ بادشاہ اور حکومت کے ساتھ تمام اعلیٰ افسران اور شاہی خاندان کے اکثر و بیشتر لوگ اورنگ آباد چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے۔ جس کی وجہ سے یہاں کی آبادی بہت کم ہو گئی۔ ادھر ادھر کھنڈر نظر آنے لگے لیکن پھر بھی آصفیہ سلطنت میں اورنگ آباد کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔

اورنگ آباد آج کل ریاست مہاراشٹر کے ایک ڈویژن مرہٹواڑہ کا صدر مقام ہے اور نئے ماحول میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ یہ اورنگ آباد شہر کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے آج کے نئے زمانے میں بھی اسے مہاراشٹر میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

ہندوستان میں جتنے تاریخی مقامات ہیں ان میں اورنگ آباد کو بھی ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور ہر موسم میں یہاں سیاحوں کا جمگھٹا رہتا ہے، خصوصاً سرما کے موسم میں تو یہاں سیاحوں کا ایک تانتا بندھا رہتا ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے لوگ سرما کے موسم میں اس شہر میں دیکھے جا سکتے ہیں خصوصاً ایلورا، اجنٹا اور دولت آباد کو یہیں سے راستہ ہونے کی وجہ سے اس شہر کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ یوں تو اس شہر میں قدم قدم پر تاریخی یادگاریں ملتی ہیں لیکن ان میں خاص خاص تاریخی چیزیں جو سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہوتی ہیں بی بی کا مقبرہ، قلعہ ارک اور فوجی کنڈہ وغیرہ ہیں۔

اورنگ آباد شہر کے چاروں طرف مضبوط فصیل ہے جسے اورنگ زیب نے اپنے زمانے میں مرہٹوں کے حملے سے بچاؤ کے لئے

بنوایا تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے لئے چاروں طرف چار بڑے بڑے دروازے ہیں جو دلّی دروازہ، لاہوری دروازہ، کابل دروازہ اور اجمیری دروازہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان دروازوں کے ناموں کے پیچھے بھی ایک پس منظر ہے جس کے پیش نظر یہ نام رکھے گئے ہیں۔ دلّی دروازہ وہ دروازہ ہے جو اجمیر شریف کے رُخ پر ہے۔ کہتے ہیں جب محمد تغلق نے دلّی سے اپنا پائے تخت دولت آباد منتقل کیا تھا اُس وقت یہ دروازہ راستے میں پڑتا تھا۔ اس وجہ سے اس کا نام دلّی دروازہ پڑ گیا جو ہندوستان کی راجدھانی دلّی کے رُخ پر واقع ہے۔ کابل دروازہ دکن کا بہت مقدس مقام ہے اور چونکہ کابل دروازہ اس رُخ پر واقع ہے اس لئے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ لاہوری دروازہ مکّہ معظمہ کے رُخ پر ہے اور پہلے زمانے میں حج کے لئے لوگ اسی دروازے سے جاتے تھے اسی مناسبت سے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ اورنگ زیب بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں فتح کر کے ظفر دروازے سے شہر میں داخل ہوا تھا اس لئے چوتھے دروازے کا نام ظفر دروازہ ہے۔

رابعہ درانی کا مقبرہ جسے عرف عام میں بی بی کا مقبرہ کہا جاتا ہے اورنگ آباد کی سب سے اہم اور سب سے خوبصورت تاریخی یادگار ہے۔ رابعہ درانی اورنگ زیب کی بیوی تھی۔ اورنگ زیب کے سب سے بڑے بیٹے شہزادے اعظم نے اپنی ماں کی یاد میں یہ مقبرہ بنوایا تھا۔ اس کی بناوٹ، سجاوٹ، نقشہ اور پلاٹ بالکل تاج محل سے ملتے جلتے ہیں اسی لئے اکثر لوگ اسے دکن کا تاج محل کہتے ہیں۔ تاج محل آگرے کی طرح یہاں بھی ایک اونچے چبوترے پر واقع ہے چاروں طرف چار اونچے مینار اور اطراف دالکنات باغات ہیں اس کے علاوہ اس کے متصل بھی ایک ندی بہتی ہے اور پیچھے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جنھوں نے اس کی خوب صورتی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ تاج محل کی طرح اسے بھی چاندنی راتوں میں آتا ہے۔ تاج محل میں اور اس میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ وہ پورا کا پورا سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور یہ معمولی پتھروں کا۔ اس میں صرف تربت اور اس کی جالی وغیرہ سنگ مرمر کی ہے۔ اس کے علاوہ تاج محل میں صناعی کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں اور یہاں وہ بات نہیں۔ پھر بھی ہم اسے تاج محل کا سادہ خاکہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُسے دادا نے بنوایا تھا اور اسے پوتے نے، اس لئے قدرت نے اس میں دادا اور پوتے کے فرق کو باقی رکھا ہے۔ بہرحال اورنگ آباد کا رابعہ درانی کا مقبرہ بہت عمدہ تاریخی یادگار ہے جس میں آگرے کے تاج محل کا پرتو موجود ہے اور جس نے تاج محل نہیں دیکھا اُسے یہ عمارت بہت بھاتی ہے۔

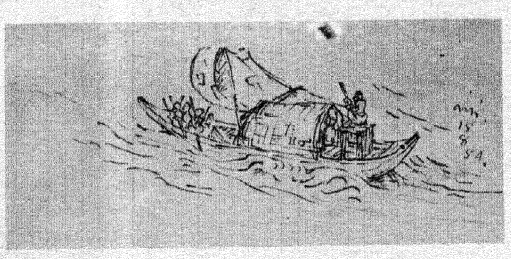
رابعہ درانی کے مقبرے کے بعد اورنگ آباد میں جو دوسری اہم تاریخی یادگار ہے وہ "پن چکّی" ہے۔ یہاں مشہور ولی بابا سلونشاہ کی درگاہ ہے۔ یہاں پہلے ایک پن چکّی تھی جو پانی کے زور سے چلتی تھی۔ اسی مناسبت سے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ یہاں درگاہ کے علاوہ ایک مسجد ہے۔ دو تین بڑے بڑے ہال ہیں جو مغل فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ باہر کے حصّے میں ایک بڑا حوض ہے جس میں ایک بلند دیوار سے چادر کی شکل میں پانی گرتا ہے۔ اس کا انتظام ملک عنبر کے زمانے سے لے کر آج تک ویسا ہی ہے۔ ملک عنبر کے مٹی کے نلوں کی یہی ایک آخری یادگار ہے۔ اس زمانے میں اس پانی کے زور سے ایک پن چکّی چلتی تھی۔ اس سے بالکل متصل کھام ندی بہتی ہے۔ یہ مقام اتنا خوبصورت ہے کہ اکثر فلموں کے لئے یہاں سے مناظر لئے جاتے ہیں۔

قلعہ ارک اورنگ آباد کی وہ تاریخی یادگار ہے جہاں خود اورنگ زیب مدّتوں اپنے اہل و عیال رہتا تھا۔ اسے اورنگ زیب نے ۱۶۹۲ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ارک کے معنی عربی زبان میں تخت کے ہوتے ہیں۔ یہاں بادشاہ رہتا تھا اس لئے اسے قلعہ ارک کہا جاتا تھا جس کے معنی ہیں کہ ایسا قلعہ جہاں بادشاہ کا تخت ہو یعنی جہاں بادشاہ سکونت پذیر ہو۔ یہ بہت بڑی عمارت ہے جس میں زنانہ محل، مردانہ محل اور کئی دیوان خانے، ہال کمرے، حمام اور برآمدے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں باغات اور حوض وغیرہ بھی بکثرت ہیں۔ یہاں ایک مسجد بھی ہے جس میں بیٹھ کر اورنگ زیب قرآن شریف لکھا کرتا تھا یا ٹوپیاں وغیرہ بنا کر روزی پیدا کرتا تھا اور اپنے خرچے میں لاتا تھا آج کل اس عمارت میں گورنمنٹ کالج ہے۔ ان عمارتوں اور تاریخی یادگاروں کے علاوہ

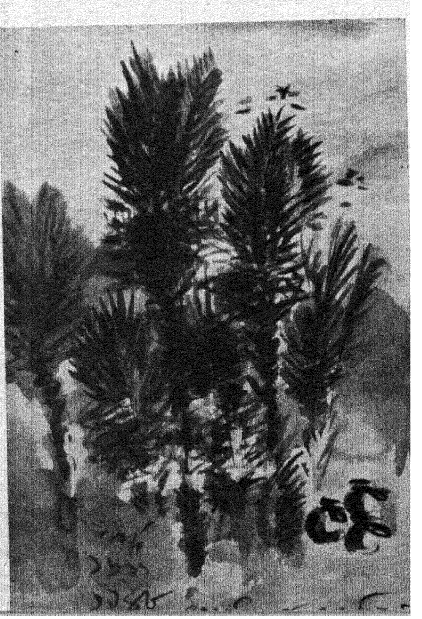
## نندلال بوس کے اسکیچ

کمارل سوامی کے نام خطوں میں

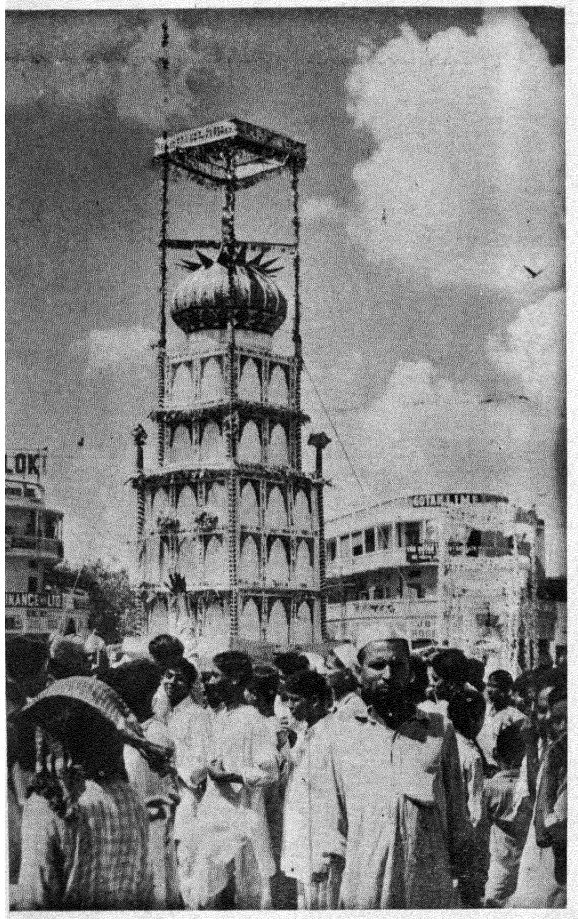


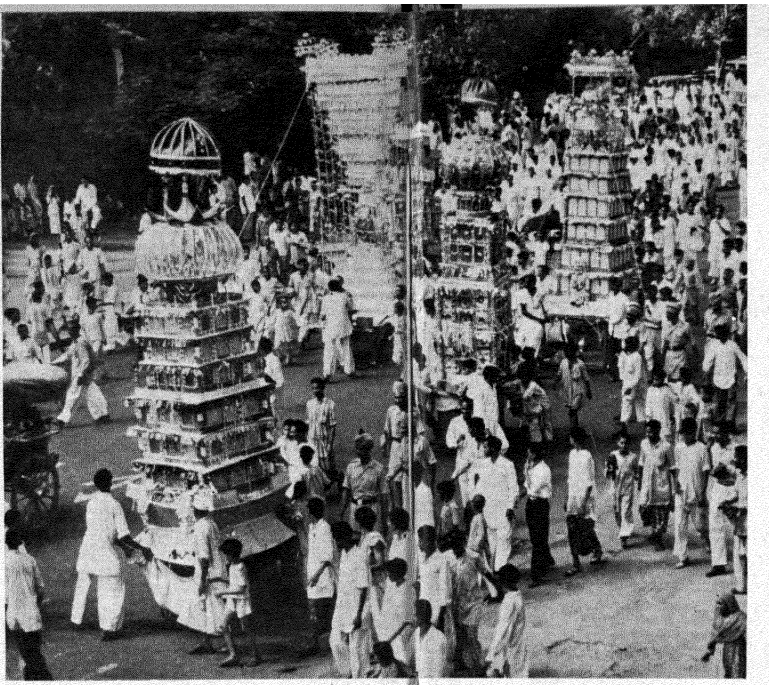





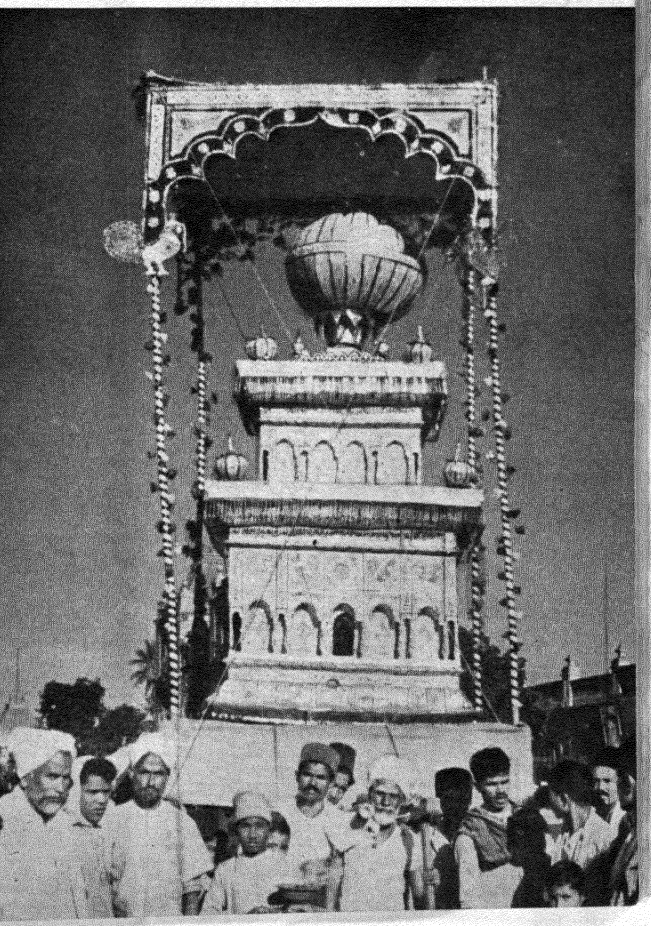


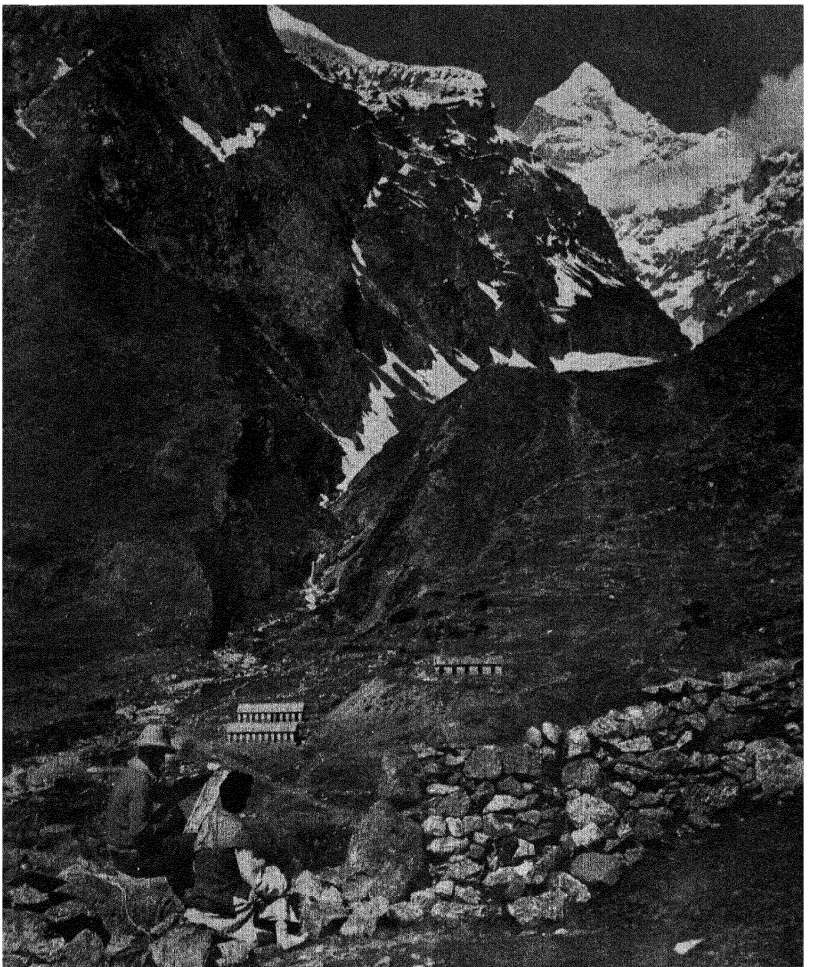
# دِلّی میں محرّم











بدری ناتھ کے قریب برفانی چوٹی نیل کنٹھ

متعلقہ مضمون صفحہ ۷ پر ملاحظہ فرمائیں

منظور الحسن برکاتی

# اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا پس منظر

اختر مرحوم کو جدید شاعری میں جو بلند اور ارفع مقام حاصل ہوا ہے، اور اردو شعر و ادب نے ان کی ذات سے جو عروج و فروغ پایا ہے وہ کسی تعارف و تبصرہ کا محتاج نہیں ہے۔ وہ رومانی شاعری کے خالق تھے۔ ان کے افکار عالیہ میں رومانیت اور حسن و نغمہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اور شاعری میں انھوں نے جو ترانے گنگنائے اور رومان و محبت کے بربط سے جو دل آویز نغمے بکھیرے وہ کیف و سرشاری کی ایک نئی فضا پیدا کر گئے اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداق بنے۔

"رومان" کے وہ رازہائے سربستہ جو اب تک نہاں خانۂ دل میں پوشیدہ تھے۔ اختر کی زبان اور ان کے بیان سے ان کی ترجمانی جس تراسے اور انوکھے انداز سے ہوئی ہے اس کا لطف اور مزہ وہ بلاکشانِ محبت ہی لے سکتے ہیں جو "کوئے یار" کے "پکر کاٹ چکے ہوں" اور "ان دو چار سخت مقامات" سے گزر چکے ہوں، جو اس راہ میں آتے ہیں۔ کیونکہ

ذوقے است دریں یادہ کو مستاں دانند

اختر کی شاعری اور ان کی رومانیت کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر اور اس ماحول کو سمجھنا ضروری ہے جس میں اختر کی تخلیق ہوئی اور ان کی شاعری نے جنم لیا، یوں تو ان کی پوری زندگی ہی ان کی شاعری کے پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن وہ عوامل جنھوں نے اختر کو شاعرِ رومان بنایا اور ان میں وہ لطیف و حسین جذبات پیدا کئے جو آگے چل کر رومانی شاعری کی صورت میں جلوہ گر ہوئے، وہ بیشتر اس سرزمین کی پیداوار تھے جس کو اختر کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے — اور جس کو خود اختر "ارضِ حسن و شباب" کہا کرتے تھے۔

ٹونک کی وہ رومان انگیز وادیاں، وہ حسین مقامات، وہ شاداب باغ، وہ سبزہ پوش کہسار، وہ رعنا نہریاں، وہ پُر رونق پیلے اور وہ رنگین صبح و شام، جو آج زمانہ کے انقلاب کے ہاتھوں اپنا حسن، اپنی رونق، اپنی بہار، اپنی رعنائی، اپنی رنگینی اور لطافت کھو چکے ہیں اور تباہ حال، خزاں رسیدہ و ویران نظر آرہے ہیں "دیدۂ عبرت نگاہ" کو "دعوتِ نظارہ" دے رہے ہیں اور "گوشِ حقیقت نیوش" کو اپنی بہارِ رفتہ اور عظمتِ پارینہ کی کہانیاں سنا رہے ہیں۔ یہی اختر کی شاعری اور ان کی رومانی زندگی کی تعمیر میں خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہیں ان کے مرغِ تخیل نے پرِ پرواز نکالے، یہاں ہی ان کی کشتِ فکر کی بنیاد پڑی، اور ان ہی کے ذریعہ تخیلِ اختر میں ہزاروں جنتیں آباد ہوئیں۔

اختر نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو گرد و پیش علم و فضل کے ساتھ ساتھ حسن و نغمہ کو بھی جلوہ گر پایا۔ ٹونک جہاں ایک طرف علم و فضل کا گہوارہ بنا ہوا تھا وہیں ع

کچ کلاہوں کا دلکش اور زہرہ جبینوں کا دیار

بھی تھا۔ حسن کے جادو چلتے تھے اور عشق کی گھاتیں ہوا کرتی تھیں

ہمہ شہر پُر انار خوباں کا مصداق تھا، اور سندی باغ سے لے کر "گوتی باغ" "گلستانِ سعدی کا باب پنجم صفحۂ قرطاس سے سطحِ ارض پر منتقل ہو کر جاندار ہوتا چلا گیا تھا۔" یہاں کے گلی کوچوں میں حافظ و سعدی کی غزلیں گونج رہی تھیں اور محفلوں میں پڑھی اور گائی جاتی تھیں جو محبت کا مارا ٹونک میں رم جاتا تھا، اس کا دل پھر اس کو چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مولانا احمد علی صاحب بیتاب نے اسی وجہ سے کہا تھا ؎

خاطر از ٹونک نخواہد کرد آید بیروں
جلوۂ حسن بہر کوچہ و باب است ایں جا
بزچہ بیچ نگزرد خیلِ حسیناں بنگر
چشمۂ ہر دمہ و چشمۂ آب است ایں جا

اور مولانا نورالحق صاحب خستہ، باوجود یکہ اس بنارس میں صبح و شام گزار رہے تھے جس کے لئے علی حزیں نے کہا تھا،

از بنارس نرود ہمت عام است ایں جا
ہر برہمن بسرے لچھمی و رام است ایں جا

لیکن وہ جب چشمِ تصور میں ٹونک اور بنارس کا مقابلہ کرتے ہیں تو بنارس کے تقدس اور حسن کو بھول جاتے ہیں اور بے خود انہ ان کی زبان سے حسینانِ ٹونک کی مدح اس طرح نکل جاتی ہے

ہر بنارس از جمالیکہ در آدمی است
کہ غولِ بیابانی بشکل پری است
زن و مرد ہر دو در آں تندرست
نہ زن چیست چوں کاشی و مرمست
شکم پست و سینہ بلند آور د
نہ ہم چو بنارس شکم پر د ر د

غرض کہ اس روحانی انگیز و حید آگیں ماحول اور فضا نے اختر رومانی کو جنم دیا، اور جب وہ کم سنی کی منزل سے عہدِ شباب میں داخل ہوئے تو

بلبلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا

والا معاملہ تھا، وہ محبتوں کا محور و مرکز بن گئے۔ چاہنے والی اور حسرت دآرزو سے پُر نگاہیں ان کے گرد منڈلانے لگیں۔ ہر طرف محبت و رومان کے سدا بہار پھول اپنی مہک سے دماغ کو معطر کرنے لگے۔ رشک و رقابت کی داستانیں موضوعِ سخن بننے لگیں اور "یہ کم سنی کا زمانہ ابتدائے شباب" غارت گرِ صبر و قرار بن گیا۔

بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان تمام چاہتوں اور محبتوں سے اختر کا حساس دل متاثر نہ ہوتا۔ وہ اپنے گرد و پیش حسین ماحول دیکھ کر عجیب متضاد کیفیتوں میں مبتلا ہو گئے، خود بھی کسی کو "چاہنے لگے اور دوسروں کو بھی اس کا موقعہ دیا کہ وہ انھیں چاہیں، پوجیں اور پیار کریں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ "اس انجمن گاہ میں شے بھی ہیں شبنم بھی" اور "لطفِ خرامِ ساقی بھی ہے اور ذوقِ صدائے چنگ" بھی۔ یہ "جنتِ نگاہ" ہے تو وہ "فردوسِ گوش" ۔ ۔ ۔ ۔

۱۹۲۱ء میں جب وہ اس رومان پرور اور محبت بیز سرزمین سے نکل کر لاہور پہنچے تو وہاں بھی اس "نوجوان" گل رو کو جو ذہین اور ہنر آشنا بھی تھا، بڑے چاؤ سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور تھوڑے ہی دن کے بعد اختر نے لاہور کی رومانی دنیا میں بھی اپنا مقام الگ پیدا کر لیا۔

اختر کم عمری ہی میں ٹونک سے شعر کہتے ہوئے نکلے تھے، لاہور جیسے شہر کے رسالوں اور اخباروں نے ٹونک کے اس خنجر کو چمکا دیا۔ ان کی شاعری نے ہمیشہ اپنے پس منظر میں "سرو قدانِ سیم تناں" اور "مہ رویانِ شیریں دہناں" کو چھپائے رکھا ہے۔ آپ اسے کچھ بھی نام دے لیجئے، اختر کی زبان میں "سلمیٰ، عذرا، لیلیٰ" جو چاہے سمجھ لیجئے اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اختر کے پرستار اس کے کلام پر تنقید و تبصرہ کرنے والے، آج تک اختر کے محبوب کو صرف لاہور، گجرات اور لکھنؤ ہی کی فضا میں ڈھونڈھتے رہے ہیں۔ انھوں نے اختر کی اس اولین جولانگاہِ محبت ٹونک کو اپنی تحقیق و جستجو کا کبھی مطمحِ نظر نہیں بنایا۔ حالانکہ 'نذرِ وطن' کے نام سے لاہور سے ٹونک آتے ہوئے اختر نے جو نظم لکھی ہے اس میں خود اختر نے کہا ہے ؎

بخشا تھا جس نے پہلے پہل، دل کو درد و عشق
پھر اس کے در پہ سجدۂ شکرانہ چاہیئے

مدت کے بعد سامنے ہو گی وہ شمع رُو
پھر دل کو سوزشِ پرِ پروانہ چاہیئے

لیکن یہ بات کہ "وہ بتِ طنّاز اور وہ "شمع رو" کون تھی، آج تک پردۂ راز ہی میں ہے۔ اختر باوجود طبیعت کی رفاز شوخی کے ٹونک کے مذہبی گھرکی تربیت کے زیرِ اثر ایک حیا پرور نوجوان تھے اس لئے انھوں نے اس کی نقاب کشائی کبھی نہیں کی اور دل کی بات زبان پر جب آئی تو "حدیثِ دیگراں" کے طور پر آئی، یا ایک سینہ سے نکل کر دوسرے سینہ میں محفوظ ہو گئی، یہ سینہ بہ سینہ راز اب بھی منظرِ عام پر نہ آ سکے گا، اس لئے کہ اصلی راز کا واقف یا تو خود اختر تھا یا اس کے بعض خاص ہمراز و دمساز، ان میں سے ایک ہمراز کا تو حال ہی میں وصال ہو چکا ہے۔ دوسری شخصیت اس وقت ہمارے درمیان البتہ موجود ہے لیکن یہ ایک ایسا بحرِ بے کراں ہے جس کے "ساحل" کا پتہ آج تک نہ لگایا جا سکا اس لئے یہ حقیقت ابُ فضائی "ہی بن کر رہ گئی ہے۔

بہرحال اختر لاہور کی جنّتِ ارضی میں رہے ہوں یا دہلی کی روحانی فضاؤں میں ان کا ذوقِ شعری ترقی پذیر ہوا ہو اور ان کو شہرت و عزت ملی ہو ٹونک کی وادیاں، اس کے باغ، اس کی ویرانیوں میں ان کا دل ہمیشہ لگا رہا ہے اور وہ اپنی اس محبت خیز اور عشق تیز سرزمین کو لمحہ بھر کے لئے بھی نہ بھلا سکے تھے۔

مجھا سا رہتا ہے دل جب سے ٹونک چھوٹا ہے
وہ صحن باغ نہیں، سیرِ ماہتاب نہیں
بسے ہوئے ہیں نگاہوں میں وہ حسیں کوچے
ہر ایک ذرہ جہاں کم ز آفتاب نہیں
وہ باغ اور وہ باغوں کے دل نشیں منظر
کہ جن کے ہوتے ہوئے خلد مثلِ خواب نہیں
وہ سرد اور معطّا بناس کا پانی
شراب سے نہیں کچھ کم اگر شراب نہیں
بہ رنگِ زلفِ پریشاں وہ موجہائے رواں
کہ جن کی یاد میں راتوں کو فکرِ خواب نہیں

وطن کا چھیڑ دیا کس نے تذکرہ اختر
کہ چشمِ ذوق کو پھر آرزوئے خواب نہیں

اس کے علاوہ ان کی مشہور نظم "اودیس سے آنے والے بتا" بھی ان ہی جذباتِ وطنیت کی ترجمان ہے اور حبّ وطن کی نہ صرف ایک شاہکار مثال ہے بلکہ "حبّ الوطن من الایمان" کے جذبۂ صادق کی آئینہ دار بھی ہے۔

یہ نظم بقول مولانا نضائی صاحب مرحوم "اردو کے تمام منظوم لڑیچر میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ بچپن کے معصوم دور کی مخصوص روایتیں، وہ واہمانہ شاہزادگی کے زمانہ کی نئی نئی پیش آنے والی کیفیتیں، جب کہ آدمی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہیں جنّت سے نکالا گیا ہوں یا جنّت کی طرف لے جایا جا رہا ہوں، ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کس قدر شیریں اور پُر کیف ہوتی ہیں"

اختر نے خود اس نظم کو اپنی پسندیدہ نظموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ قرار دیا ہے۔ وہ اپنے ایک خط بنام ممتاز سکندر آزیش کو لکھتے ہیں:-

"یہ بتانا کہ اپنی نظموں میں کون سب سے زیادہ عزیز ہے بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر مجھے ایک بیک جواب دینے پر مجبور کیا جائے تو شاید "اودیس سے آنے والے بتا" کا نام لوں گا اس کی شانِ نزول کیا ہے؟ صرف وہ تاثرات جو ایک دیس سے آنے والے سے برسوں کے بعد مل کر کسی غریب الوطن کے دل میں مترتب ہوتے ہیں اور آنسو یا مشترین کر چھلک پڑتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ جہاں بچپن گزرا ہو، اس مقام کی یاد تو ہر ایک کے گوشۂ دل میں چھپی رہتی ہے لیکن جس شخص کو اس مقام سے جدا ہوئے ۱۵ سال گزر چکے ہوں، اس کی نفسی جذبات اور شدّتِ احساس ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ میرا بھی ایسا ہی حال تھا۔"

(ماخوذ از مکاتیب نمبر سالنامہ نقوش لاہور صفحہ ۱۰۴۵)

اس نظم کی شانِ نزول کے سلسلہ میں اختر نے جو اس خط میں اشارہ کیا ہے اس کی تشریح و توضیح اسی کی زبان سے سُن لیجئے جو دیس سے گیا تھا اور اس نظم کا مخاطب تھا۔ میری مراد استاد محترم ابوالعرفان مولانا محمد حبیب اللہ خاں قضائی مرحوم سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"یہ نظم بزمِ خیال ۱۹۳۴ء کے سالنامہ 'فلستان' لاہور کے افسانہ نمبر میں اور فلستان ملتان میں سب سے پہلے شائع ہوئی اور پھر ہندوستان کے دوسرے رسالوں نے اس کو نقل کیا۔ مئی ۱۹۳۴ء میں جب میں لاہور پہنچا تو یہ نظم پنجاب کے ادبی اور شعری حلقوں میں سب سے زیادہ مرتفع سطح پر رقص کر رہی تھی اور نازک خیالیاں سر دُھن رہی تھیں کہ اس نظم کی نگارش میں گو ئے سبقت لے جانے کا سہرا ہمارے سر کیوں نہ رہا۔ اور یقین ہے کہ اس نظم کے جواب میں کئی اور عمدہ نظمیں اردو ادب میں داخل ہو جائیں گی۔

ایک دیس سے آنے والے کی ملاقات پردیس میں زندگی گزارنے والے دوست کے ساتھ خلوصِ محبت کی مسند پر معراجی کیفیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اب سے کئی سال پہلے وہ دیس سے آنے والا میں ہی تھا جس کی آمد و ملاقات نے اختر صاحب کے جذباتِ غربت و مسافر کو گدگدایا تھا، اب ان دنوں جب میں کئی سال کے بعد پھر لاہور پہنچا تو ان گذشتہ جذبات کو اس عنوان کے ماتحت منظوم پایا۔"

(ماخوذ از مضمون 'او دیس سے آنے والے' کی تصریحات)

(رسالہ رومان جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۳۵)

اس نظم کی اشاعت کے بعد اس دور کی اردو دنیا میں ایک ہل چل سی مچ گئی اور اس کی رومانی فضا کو دیکھ کر تو بعض ناقدین نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ نظم تخیلی نظم ہے۔ حقائق و واقعات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

لیکن محرمانِ اسرار اور واقفانِ راز جانتے ہیں کہ اختر نے حقائق کو کس قدر کامیاب افسانوی رنگ دیا تھا۔ لیکن حقیقت پھر بھی حقیقت ہی ہے اور ٹونک کا ذرّہ ذرّہ اس حقیقت کی واقعیت و صداقت کی گواہی دیتا رہا ہے۔

اختر کی یہ شاہکار نظم، کیونکر ان کے وطن ٹونک کی قدیم معاشرت، تہذیب، تمدن اور وہاں کے یادگار مقامات کی عکاس اور ترجمان ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس نظم کے بعض بندوں کی وہ تصریحات بھی نقل کر دی جائیں جو اس کے مخاطب مولانا قضائی مرحوم کے قلم کی رہینِ منت ہیں:۔

"راجپوتانہ میں ٹونک ایک چھوٹے سے پہاڑ رسیا کے دامن میں آباد ہے۔ شہر سے دو ڈھائی میل دُور ایک ندی ناس کے نام سے شمال سے جنوب کی طرف بہتی ہے۔ ٹونک کے کھلے ہوئے میدانوں میں برسات کے موسم میں بہار کا لشکر اس طرح آپڑتا ہے کہ یہ دارالاسلام عالمِ نباتات کی کافرانہ بہاروں کے اعتبار سے دارالحرب بن جاتا ہے۔ دریائے ناس ہر بارشی کے آغاز میں جب پہلی مرتبہ طغیانی پر آتا ہے تو اس کے پُر جوش نظارے کے لئے خانہ نشین اور تکلف تک بیتابِ بدست نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

جنگلوں اور کھیتوں میں جب سبزہ کا تخمیں فرش بچھ جاتا ہے تو مسلمانوں کے بیلے 'لوگڑے' پر اور ہندوؤں کے بیلے 'ان پورنا' کی پہاڑی پر جہاں قدیم عمارتیں ہیں اور ایک شوالہ بنا ہوا ہے شروع ہو جاتے ہیں۔ نوروزی کے دنوں میں جسے ان علاقوں میں 'گوٹ کرنا' کہتے ہیں، یا ران بے تکلف کے جھنڈ، لگدونوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر بیس بیس تیس تیس کی تعداد میں سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور شاد اب و فرخ بخت منا فرمیں رات رات بھر جشن رہتے ہیں۔ ایک طرف خود ساختہ چولھوں پر بریانی پکوان پکتے رہتے ہیں

اور دوسری طرف "چاربیت"، جو ٹونک اور رام پور کے شعراء کی مخصوص صنفِ سخن ہے، دائرہ اور طبلوں پر ایک ساتھ آواز ملا کر گلے کی پوری طاقت سے کانوں پر ہاتھ رکھ کر گائی جاتی ہے۔ اس صنفِ سخن میں حمد و نعت بھی ہوتی ہے گردشِ روزگار کے گلے بھی، بے وفا پیری رویوں پر طعن و طنز بھی ہوتی ہے اور فوجیز و سادہ رو معشوقوں کے لئے ترغیب اور ان کے خط و خال کی تعریف بھی مثلاً ؎

آؤ سینہ سے لپٹ جاؤ بہانہ نہ کرو
وقت قسمت سے ملا ہے یہ کہا مان بھی لو

کون آتا ہے وہ، ہر بار یہ کہہ کر نہ ڈرو
ہوش میں آؤ، کہاں ہو، کوئی آیا نہ گیا

ایسے ہی دل دوز اور فرحت بیز افسانوں کی رومانی انگیز یادوں تصوروں نے اس نظم کا پلاٹ تیار کیا ہے اور اختر صاحب نے اس صوری اور ظاہری ٹونک کے بالمقابل لطیف حیات کے عالم میں ایک معنوی ٹونک آباد کر کے رکھ دیا ہے۔

اس نظم کو پڑھ کر دل کے کوہِ آلو سے آنسوؤں کی ایک رو بتاس بل کھاتی ہوئی نکلتی ہے اور آنکھوں میں طوفان امنڈ آتا ہے۔ یہیں قلبیہ جذبات و تاثرات کی وجہ سے بیک وقت مسلسل اب تک اس نظم کو نہیں پڑھ سکا ہوں ؎

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو آکاش پہ تارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

گویا یہ دیس ہیں نہ سر پہ آسمان ہے، نہ آسمان پہ ستارے، نہ یہ دیس کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں نہ غریب الوطنی میں پریت پہ گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں بلکہ شفق کے سایوں میں دن رات کے دامن بھی نہیں ملتے، شامِ غربت ہر چند کہ مشہور ہے لیکن شاعر کے نزدیک وطن سے نکلنے کے بعد گویا کہ شام ہی نہیں ہوئی، اس نے پردیس میں پھول تک نہیں سونگھے، اسی لئے تو وہ شامِ وطن اور صبحِ وطن کی یاد میں سرمست و بے خود بیٹھا ہوا ہے ؎

کیا اب بھی شفق کے سایوں میں دن رات کے دامن ملتے ہیں؟
کیا اب بھی چمن میں پیڑ پہ ویسے ہی خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں؟
برساتی ہوا کی لہروں سے بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

ذیل کے اشعار میں ٹونک کی مخصوص معاشرت کی تصویر سے وہ باریک نقاب سرکائی ہے جس سے صرف وہی شخص لذت گیر ہو سکتا ہے جس نے کبھی ٹونک کو دیکھا ہو ؎

کیا اب بھی وہاں ویسی ہی جواں اور مدبھری راتیں ہوتی ہیں؟
کیا رات بھر اب بھی گیتوں کی اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں؟
وہ حسن کے جادو چلتے ہیں، وہ عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شام پڑے سڑکوں پہ وہی دل چسپ اندھیرا ہوتا ہے؟
اور گلیوں کی دھندلی شمعوں پر سایوں کا بسیرا ہوتا ہے؟
یا جاگی ہوئی آنکھوں کو خمار اور خواب نے گھیرا ہوتا ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

اس بند کو دیکھئے کہ ٹونک کی معاشرتی تصویر کے اس پہلو کو اس سے زیادہ خوبصورت رنگ نہیں دیا جا سکتا ہے ؎

وہ اجڑا ہوا، وہ نکھرا ہوا آباد ہے بازار اب کہ نہیں؟
تلواریں بغل میں دبے ہوئے پھرتے ہیں طرح دار اب کہ نہیں؟
اور بہلیوں میں بیٹھ کے جاتے ہیں تماشا کار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

ٹونک کی مذہبیت اور دارالاسلامیت پر جہاں اسلامی حکمران کے زیرِ سایہ اذان اور ناقوس میں کبھی آویزش نہیں ہوتی کس لطیف پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے ؎

کیا اب بھی مہکتے مندر سے ناقوس کی آواز آتی ہے؟
کیا اب بھی مقدس مسجد پر مستانہ اذاں تھراتی ہے؟
اور شام کے دھندلے سایوں پر اک عظمت سی چھا جاتی ہے
او دیس سے آنے والے بتا!

گلزار کے باغ، تالاب اور بنگلے سے بہتوں کی عموماً اور اختر صاحب کی خصوصاً بہت سی محبت آمیز داستانیں متعلق ہوں گی، کیونکہ سو برس منانے کے لئے یہ ایک بہترین اور پُرفضا مقام ہے۔ کیا ذیل کا نما کاتی بند ان تمام افسانوں کا ترجمان نہیں ہے ؎

گلزار کا خواب آلود سا گھاٹ اور اس کی فضائیں کیسی ہیں؟
وہ باغ وہ بنگلہ وہ تالاب اور اس کی ہوائیں کیسی ہیں؟
وہ کھیت وہ کاؤں وہ چڑیاں اور ان کی صدائیں کیسی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!.....

آخر میں مولانا فضائی صاحب اپنا تعارف اور اپنے اور اختر کے تعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"میں کون؟ — وہ ہیں جو اس نظم پر خصوصیت کے ساتھ اور اختر کی زندگی کے تمام حالات پر سب سے زیادہ کچھ لکھنے کا حق رکھتا ہوں، کیونکہ میرا اور اختر صاحب کا دلی ارتباط اور مخلصانہ تعلقات اس زمانہ سے قائم ہیں جب یہ صرف ابن محمود تھے اور ہنوز اختر نہیں ہوئے تھے۔ جب ان کی معصومانہ شوخیاں بزرگوں کے سینوں میں دل بن کر رہا کرتی تھیں۔ یعنی ان کی عمر نو دس سال سے زیادہ نہ تھی، جب ہم ساتھ کھیلتے تھے۔ اس وقت کے معلوم تھا کہ یہ شوخ و شنگ بچہ حضرت اختر شیرانی کے نام سے ہندوستان کی فضائے سخن و ادب پر اپنے شباب انگیز رنگِ تغزل کے معجزات تاباں سے دلوں کو بیدار اور دماغوں کو منور کر دے گا۔

نظم کے مندرجہ ذیل بند ہیں ؎

کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر تاریخ کی عبرت طاری ہے؟
اُن پورنا کے اُجڑے مندر پر مایوسی و حسرت طاری ہے؟
سنسان گھروں پر چھاؤنی کے ویرانی و وحشت طاری ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

اختر صاحب نے "چھاؤنی" کے جن سنسان گھروں کا ذکر کیا ہے وہ مجھ سعادت مند قسمت کی جائے سکونت تھی اور میرے عم محترم مولانا محمد صابر شاکر مرحوم کا محلہ ہے جو اختر صاحب کے ٹیوٹر تھے اور جنھوں نے شعر و سخن، اور علم و ادب کے پاکیزہ ذوق کا وہ تخم اختر کی گل زمینِ ذہانت میں بویا جو آج ایک پھلا پھولا گل ریز اور ثمر بار درخت ہے۔"

(ماخوذ از مضمون "او دیس سے آنے والے" کی تنصیحات شائع شدہ رسالہ رومان لاہور جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۳۶ تا ۳۹)

یہ تو تھا اختر کی رومانی شاعری اور رومانی زندگی کے پس منظر کا ایک ابتدائی اور ہلکا سا عکس، اب رہ گئے وہ عوامل اور اسباب جن کو اختر کی شخصیت کی تعمیر میں دخل تھا ؎

گر آں جملہ را سعدی اللہ کند
مگر دفتر دیگر انشا کند

البتہ مضمون ختم کرنے سے پہلے نامناسب نہ ہوگا اگر اس تاریخی اور ادبی دستاویز کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو اختر کے بچپن اور ان کی ابتدائی شاعری سے متعلق ہے۔

حسنِ اتفاق سے مجھے قابلِ احترام مولانا حکیم سید ظہیر احمد صاحب برکاتی (جو اختر مرحوم کے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں) کی بیاض میں اختر کے قلم کی لکھی ہوئی ایک 'غزل' ملی ہے جو اُن کے بچپن

کی یادگار ہے۔ اس غزل پر اختر ہی کے ہمدم کا لکھا ہوا ایک نوٹ بھی مندرج ہے۔

اختر اپنے ہمدم طفولیت کو یاد کرتے ہوئے کس حسرت سے لکھتے ہیں:۔

یہ غزل، اس پیارے زمانہ اور ان خوش گوار ایام کی ہے جن کو بزرگوں کی زبان میں بچپن کہا جاتا ہے۔ یعنی میرے بارہ سال کی عمر میں دماغ ناتواں سے نکلی تھی، گذشتہ زمانہ کی یاد دل کو بہت گدگداتی ہے اور یہ احتیاط زبان سے نکل جاتا ہے کاش ہم بچے ہوتے، مزے سے مزے اور فارغ البالی سے دن کاٹتے، لیکن آہ زندگی اک حباب ہے جو ایک دم زور و شور سے سیماب کی طرح اٹھتی اور نقش پا کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ وقت کبھی ٹھہرتا نہیں، اسے ذرا سکوت نہیں۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کوئی نہ کوئی قابل یادگار نقش چھوڑ جاتا ہے۔ بچپن آہ بچپن! وہ دلآویز سین تھا جس کے دیکھنے کو آنکھیں ابھی تک بے قرارانہ منتظر ہیں، مگر آہ جو کبھی نہ آئے گا۔ کسی حسرت نصیب نوجوان کی زبان سے ایک آہ سرد کے ساتھ کس طرح بے چوٹی سے نکل جاتا ہے ع

دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن

کوئی مضطرب عاشق ایک ٹھنڈی سانس بھر کر پکار اٹھتا ہے

اسیر پنجۂ عشق شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

انھیں ایام پیشینہ کی یاد میں مندرجہ ذیل غزل لکھی جاتی ہے ـــــ اختر "

## غزل

نہ بن دشمن بت پُر فن کسی کا
کرے گی کیا تری چتون کسی کا

کوئی ہے ساتھ محشر میں کسی کے
کسی کا ہاتھ ہے دامن کسی کا

بنایا سب نے اپنا اپنا مسکن
کسی کا دشت ہے گلشن کسی کا

ارادہ ہے ابھی سے لوٹنے کا
ابھی تو دور ہے مدفن کسی کا

تمھیں دل دے کے کیا ہاتھ آیا اختر
کسی کو کیا کہوں دشمن کسی کا

اختر کا یہ قلمی نوٹ اور یہ غزل چوں کہ اب تک کہیں شائع نہیں ہوئی ہے اس لئے ایک ادبی اور تاریخی تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔


سرِ پتا ماہنامہ
سماجی تعمیرِ نو کا ترجمان

● سماجی اور گھریلو زندگی کی صحیح عکاسی کرنے والی کہانیاں
● اہم اور پے چیدہ سیاسی اور انفرادی مسائل پر خیال انگیز مضامین
● دل نشیں نظمیں اور جذباتی غزلیں
● طنز و مزاح
● عورتوں کے سلجھے ہوئے مضامین

فی شمارہ ۷۵ نئے پیسے
زرِ سالانہ ایک سال ۶ روپئے  دو سال ۱۱ روپئے

مینیجر، سرِ پتا اردو۔ جنڈے والان، رانی جھانسی روڈ۔ نئی دلّی۔
مجھے اگلے شمارہ سے ایک سال کر دو سال کے لئے خریدار بنا لیجئے۔ زرِ چندہ کے لئے وہ شمارہ وی۔ پی۔ پی سے روانہ کیجئے۔
نام _____
پتہ _____

# پی ایچ۔ڈی

جو لوگ ایم۔اے کر کے بھی بے روزگار ہیں
اور اپنے والدین کے کاندھوں پہ بار ہیں

اُن سے ہے میری عرض کہ کُل فکر چھوڑ دیں
اور آج ہی سے شغل میں تحقیق کے لگیں

جی لگ گیا تو کام بڑا سود مند ہے
کھل جائے گا دریچۂ قسمت جو بند ہے

ترکیب لکھ رہا ہوں عمل آپ کیجئے
دم بھریں، بیچ ڈالئے، پھل توڑ لیجئے

دیکھے تو سینکڑوں مواد ہیں تحقیق کے لئے
جیسے، لحد پہ درد کے جلتے تھے کے دئے

یا میر کی چٹائی کا تھا طول و عرض کیا
غالب کو قید خانے میں کھبل جو تھا ملا

بال اس کے کھردرے تھے کہ اون اس کا تھا نفیس
چیلڑ تھے اس میں بیس نپیں کہ کھٹمل تھے اس میں تیس

یا آج کل جو شاعر و مضمون نگار ہیں
لکھتے ہیں خود کہ دوسروں کے قرض دار ہیں

لیکن یہ سارے کام ہیں محنت طلب ذرا
اس کے علاوہ وقت بھی لگ جائے گا سوا

میرے کہے پہ آپ عمل کیجئے اگر
کم وقت میں تمام ہو تحقیق کا سفر

اک دن کسی کباڑی کی دوکاں پہ جائیے
قلمی کوئی کتاب وہاں سے اڑا لیجئے

کوشش رہے کہ ہو کسی شاعر کا وہ کلام
گر مل گیا تو آپ کا ہے ختم نصف کام

تخئیل کی مدد سے فسانے تراشئے
ہر اک ورق پہ ٹانکئے دو چار حاشئے

شاعر کو فرض کیجئے شاگرد میر تھا
یا ہمعصر و حلقہ بگوشِ نظیر تھا

یونہیں وطن بھی اس کا کہیں فرض کیجئے
جو آئے جی میں باپ کا نام اس کے دیجئے

حالات زندگی کے بھی لکھ جائیے یونہیں
اس کو نکال دیجئے، اگر جھول ہو کہیں

پچھلے محققین کی دو اک کتاب سے
تمہید نقل کیجئے لیکن حساب سے

ان کا مواد ہو مگر اپنا بیاں رہے
اقوال دوسروں کے ہوں اپنی زبان ہے

پہونچے جو یوں صحیفۂ نو تا بہ اختتام
ہے اس کے بعد مرحلۂ سجدہ و سلام

یعنی کہ پنج میں ہوں جو ارباب حل و عقد
جھک جھک کے سجدے کیجئے پیش ان کو نقد نقد

بچوں کو ان کے جا کے سنیما دکھا سیئے
باتیں ہوں ان کی خشک تو کھی لگائیے

تیور کو ان کے تولئے اپنی نگاہ میں
پیچھے پٹائیوں کی طرح ان کی راہ میں

خدمت میں ان کی خون جگر پانی کیجئے
ہر روز تھوڑی دیر مگس رانی کیجئے

مکھی کو ان کی ناک پہ جانے نہ دیجئے
جوتے تلک ان کے اگرد کو آنے نہ دیجئے

عقل معاشرت سے ذرا کام لیجئے
دانش کدہ سے اپنے پھر انعام لیجئے

کیوں مغز صرف کیجئے اندیشہ جات میں
پی ۔ ایچ ۔ ڈی لوگ بنتے ہیں اب بات بات میں

ہر فرق علم و جہل کا معدوم ہو گیا
کیں جس نے خدمتیں وہی محذوم ہو گیا

---

# آل انڈیا ریڈیو

۱۹۲۷ء میں بمبئی اور کلکتہ میں انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروس کا اجراء ہوا۔ یہ ایک غیر سرکاری نظام تھا۔
۸ جون ۱۹۳۶ء سے اسے کل ہند مرکزی سروس قرار دے کر آل انڈیا ریڈیو کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں نو اسٹیشن کام کر رہے تھے اور بیرونی نشریاتی سروس کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد صرف چھ اسٹیشن ہندوستان میں رہ گئے۔ اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے ۶۰ ٹرانسمیٹر ہیں اور ۲۸ ریڈیو اسٹیشن ہیں کے ساتھ ۱۳۵ اسٹوڈیو، چار ساؤنڈ اسٹوڈیو، ۲۸ ریسیونگ سنیٹر نا اور ایک تعلیمی ٹیلی ویژن مرکز ہے۔ ملکی نشریات کا دائرہ بڑھانے کے لئے ۵ ٹرانسمیٹر اور نصب کئے جانے والے ہیں تاکہ تقریباً ۶۱ فی صدی رقبے اور ۷۵ فی صدی آبادی تک یہ نشریات پہنچ سکیں۔

آل انڈیا ریڈیو نے اپنے وجود کے ۲۵ سالوں میں عوامی مذاق کو سمجھنے اور ظاہر کرنے، مطمئن کرنے اور بہتر کرنے اور کسی حد تک اس کی رہنمائی کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور ہماری قومی زندگی کی اندرونی تحریک کو پیش کرنے کی ہمت کی۔ اس نے اس کا نصب العین ہے "عوام کی بہتری کے لئے، ان کی خوشی کے واسطے"۔

آمنہ ابوالحسن

# حاصلِ حیات

ڈرائے بھرتی ہوئی دیوان صاحب کی موٹر میں شہر سے اپنے گھر لوٹتے ہوئے سنتوش رہ رہ کے یہی سوچ رہا تھا — یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ درخت، یہ کنج — یہ سب کتنے مہربان ہیں جنھوں نے اسے زندگی کا گداز بخشا، فن کی گویائی، اس کی نمو، اس کی قوت بخشی۔

پھر تمولیت کے ایک جاں گسل احساس نے اس کی رگ رگ میں کڑواہٹ دوڑا دی۔ ماں کا خیال بڑا موہوم تھا۔ خدوخال اُسے یاد نہ تھے، صرف ان کا ایک ہیولا سا اس کے ذہن میں رہ گیا تھا اور اس کے سہارے وہ خیالات کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ جانے اب اس کی ماں کیسی ہوگی۔ دیوان صاحب کے پاس آنے سے قبل کی اگر کوئی یاد اس کے ذہن میں تھی تو وہ تلخ اور نوش حقیقتوں کی وہ کریہ ناک یاد تھی جو اس کی ماں کے طعنوں کی صورت میں اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ پڑھنے لکھنے کے بجائے جب وہ آڑی ترچھی بے مقصد لکیریں کھینچتا تو جانے کیوں ماں اسے مارتی اور لمبا وقت کوسا بھی کرتی۔

"میں کہوں جان مار تو اسکول جائے گا بھی یا درختوں کے نیچے بیٹھا یونہی لکیریں کھینچتا رہے گا۔" ماں سلیٹ اور پنسل کھینچ لیتی۔ کبھی گہری گہری خوفناک آنکھوں سے گھورتی، کبھی اس کی دزیدہ نگاہی پر ایک آدھ طمانچہ بھی لگا دیتی۔ آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ کبھی ماں کو نہ بتا سکا کہ اسکول ماسٹر کی اول فول بکواس سننے سے کہیں زیادہ لطف اور لذت رنگ برنگی چڑیوں کے چہچہوں، ہرے بھرے درختوں کی چھاؤں اور چھل چھل بہتے پانی کی روانی میں ہے۔ وہ کبھی ماں کو نہ بتا سکا کہ نیلا آسمان یونہی خاموش چپ چاپ نہیں کھڑا بلکہ غور سے دیکھنے پر شوکت و عظمت کے صدہا اسرار بھی اپنے آپ کھول رہا ہے۔ اور جو کچھ اطراف میں پھیلا ہوا ہے وہ محض ایک بے وقعت، بے ربط واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اپنے آپ میں کائنات محفوظ رکھے ہوئے ہے اور جانے کتنے احساس اردگرد پھیلی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے۔ رجائیت کے کتنے شگفتہ جھنجو کی کتنی آگ بھڑکتی، لیکن اس کی آنچ وہ کبھی دوسروں کو محسوس نہ کرا سکا۔ چپ چاپ مار کھا کے وہ چند منٹ اسکول جانے والے راستے پر چل پڑتا پر کہیں نہ کہیں راہ میں بیٹھ کر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگتا۔ اس شغل میں ایک سکون تھا۔ ایک ایسا احساس جو ہر جذبے کی تسکین کا باعث بنتا — پھر وہی گھر، وہی ماں باپ کی سختیاں — لڑکے کی پیدائش پر ماں باپ کی یہ خواہش فطری تھی کہ وہ جلدی جلدی پڑھ لکھ کر ان کی مصیبتوں کا حل بنے — ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن وہ ان پابندیوں سے عاجز آ گیا تھا۔ ان سے فرار کی کوئی صورت اس کے ذہن میں نہ آتی۔ محلے کی عورتیں جب اس کی شکایت ماں سے کرتیں اس کی نا خلفی پر لعنے دیتیں تو اس کا وجود ایک زخم بن کر رہ جاتا ان کی باتیں ان کے قہقہے

اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح اتر جاتے اور وہاں کا غصہ تیز تر ہو جاتا۔

عاجز آ کر اس کے باپ نے اُسے دیوان صاحب کے پاس چھوڑ دیا۔ دیوان صاحب عزیز رشتہ دار تھے لیکن تھے خاندانی رئیس اور بڑے غریب پرور۔ نادار طرفا کے اکثر لڑکے انھیں کے خرچ سے لکھ پڑھ کر روزی کما رہے تھے، لائق ہو رہے تھے۔

لائق اسے بھی بننا تھا اس لئے کہ بغیر لائق بنے روٹی نہیں مل سکتی۔ سوسنتبتی کی حفاظت کی خاطر کبھی دیواروں کے غیر محفوظ گھر میں دبی دبی سانسیں لینے والا سنتوش جب اپنی اونچی آسمان کو چھوتی ہوئی دیواروں میں اُٹھ آیا تو ان کی سجاوٹ اور آرائش دیکھ کر کچھ ایسا بوکھلایا کہ کچھ دنوں تک اپنا دل چسپ مشغلہ ترچھی ترچھی لکیریں کھینچنے کے بجائے دیواروں پر آویزاں ایک ایک تصویر کے ایک ایک نقش کو اپنی کپکپاتی انگلیوں سے چھو چھو کر دیکھتا رہا کہ یہ رنگ اور نقش ہی ہیں یا کوئی اور مجوبہ۔ اور جب کئی دن کی توجہ اور کھوج کے بعد اسے یقین آیا کہ یہ ساری تصویریں یہ سارے نقوش لکیروں کا مجموعہ ہی ہیں تو اس کے ذہن میں ایک نیا خیال بجلی کی طرح کوند کر رہ گیا۔ کس نے یہ تصویریں بنائی ہیں؟ کس طرح انھیں جیتے جاگتے رنگ کاغذ اور کپڑوں پر منتقل کر دیئے گئے ہیں؟

بہت دنوں تک وہ اس اُلجھن میں مبتلا رہا حتیٰ کہ دیوان صاحب نے پوچھا "یہ ہر دم بیٹھے کیا سوچا کرتے ہو؟"

سنتوش پوکھلا گیا۔ رک رک کر بولا۔ "بچپن میں پریوں کی کہانیاں سنا کرتا تھا اُن پریوں کو اُن کے ہرے بھرے باغ بیچیوں کو اُن کے خوب صورت گھروں کو اپنی آنکھوں سے آپ کے گھر مجسم دیکھ لیا۔"

دیوان صاحب مسکرائے، عقل مسکرائی، فراست مسکرائی۔ بولے "اور تم انھیں جان بھی سکتے ہو، بشرطیکہ....."

وہ اپنی کرسی سے اُچھل پڑا "میں دیوان صاحب میں..." اسے یقین نہ آیا۔ شاید یہ بھی ایک خواب ہی ہو۔

لیکن سچے خوابوں کی طرح اس کی تعبیر بھی اٹھی ہو کر رہ گئی۔

دوسرے دن اپنے کمرے میں عجیب و غریب چیزیں دیکھ کر وہ بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ کس طرح اپنے مٹی کے کچے گھروندے کو واپس جا گئے۔ ان عجیب چیزوں نے اس کی ہستی کو بالکل ڈاؤن ٹو ارتھ کر دیا... بے قراری، بے چینی، اضطراب!!!

اچانک ایک مسکراتے چہرے نے اس کے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کی سلوٹیں دیکھ کر فراخ دلی سے بولا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہر ذی روح ماں کے پیٹ سے یکتا نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے لئے ریاض کی ضرورت ہے..."

اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ حیران و پریشان انھیں کھولے ان روزنوں کو دیکھتا رہا جن سے سورج کی شعاعیں ایک ایک کمرے میں اجالا پھیلا رہی تھیں۔ نہیں معلوم کتنا وقفہ، کتنی ساعتیں خاموشی میں گزر گئیں۔ وہ بالکل ساکت و جامد رہا اور اجنبی آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹتا، سلیقے سے رکھتا رہا۔ حتیٰ کہ ان کی طبلی ہوئی۔

دیوان صاحب خفیف سا مسکرائے، چہروں کے تاثرات کو نیچی نگاہ سے جانچا، پھر ذرا بے تکلف ہو کر بولے، "کیوں میاں سنتوش یہ نئے دوست تمھیں پسند آئے۔" سنتوش ہکلا کر رہ گیا۔

دوستی — جس شے سے وہ آج تک ناآشنا تھا۔

جانے دوستی میں کیا کچھ کرنا پڑے۔

وہ مسکرایا "دیوان صاحب آپ کی نگاہِ انتخاب کی داد دیتا ہوں۔" وہ قدرے جھکا اور پھر سنتوش نے اچانک دیوان صاحب کی خاموش لیکن بولتی ہوئی نگاہوں میں وہ سارے اسرار پڑھ لئے جو آج تک اس سے پوشیدہ تھے۔

نوکیلی پنسلیں اور رنگ برنگی کوڑیاں مسرت کی ایک لہر بن کر اس کے جسم و جان میں دوڑ گئیں۔

اس روز پہلی بار اس نے بے مقصد لکیروں کے بجائے نئی نئی چیزوں کی تصویریں بنائیں۔ دماغ میں بسی ہوئی جستجو کی خوشبو کو سونگھا اور سرسبز درختوں، لنڈمنڈ پیڑوں، اڑتی تتلیوں منڈلاتے بھونروں کی ہزار ہا شکلیں ان نوک دار پنسلوں سے بنا ڈالیں اس کی ہر دم کپکپاتی انگلیاں کاغذ اور قلم پر اس طرح جم گئیں جیسے پتھر

کی انمٹ لکیر۔ اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے، دیوان صاحب کی آنکھوں کا رچاؤ، وران کا گہرا انہماک اس کی انگلیوں میں قوت بن کر دوڑنے لگا۔ بیزار نگوں کے استعمال کے اس نے ایسے ایسے مناظر محض پنسل کی نوک سے صفحۂ قرطاس پر کھینچے کہ انھیں دیکھ کر یہ نہ کہہ سکا کہ یہ کسی مبتدی کا نقشِ اوّلین ہے۔ ان میں ایک پختہ کار ذہن کا پورا سجاؤ اور بانکپن تھا — نمنی نمنی جزئیات، ان کا تنوع، ان کی گہرائی، ان کی فطری سوجھ بوجھ۔

دیر نے جلد ہی دیوان صاحب کو آگاہ کر دیا کہ اس مشاق کے لئے کسی رہبری کی نے الفور کوئی ضرورت نہیں۔ یوں وہ کبھی کبھی اس کا کام ضرور دیکھ جایا کرے گا۔ سو اس دن سے سنتوش تنہا بیٹھا دنیا جہان کی رنگینیاں کاغذ پر سمیٹا کرتا اور دیوان صاحب ہر شام ان تصویروں کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے اور تعجب کرتے۔

ایک شام لان میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے سنتوش سے پوچھا "تم ہمیشہ جھاڑ پہاڑ ہی کیوں اتارا کرتے ہو کبھی انسانی نقش کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔"

سنتوش کو گیلری میں لگی وہ بہت سی تصویریں یاد آگئیں جن کے نقوش اتنے بولتے ہوئے اور اتنے جان دار تھے کہ اسے اکثر ان پر زندگی کا گمان ہونے لگتا۔ وہ یکایک پژمردہ ہوگیا۔ وہ کیسے اتنی بڑی جرأت کر ڈالے جبکہ زندگی میں کبھی اس نے اس حسن اس حقیقت کو نہیں دیکھا۔۔۔۔

سچائی اس وقت تک کتنی ادھوری رہتی ہے جب تک کہ وہ حقیقت کا روپ نہ دھار لے۔

تخیل کی عظمتوں پر وہ سارے نقش دھبوں کی طرح سمٹنے لگے۔ تصوّر لاکھ رنگین سہی حقیقت سے کم اثر انگیز ہوتا ہے۔ اور اس شام اندھیروں، اُجالوں کے سہ مہوت جب اس نے بہت سے انسانی نقش اپنے ذہن میں مرتب کئے اور روشنی میں انھیں کاغذ پر اُتارنا چاہا تو بار بار قلم چھک کر رہ گیا۔

کئی دنوں تک اس خلش نے اُسے بے قرار کیا۔ ایک شام آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ بڑی محنت سے اس چہرے کو کاغذ پر منتقل کیا، پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُسے پُرزے پُرزے کر ڈالا — خود نمائی — خود نمائی فن کو طبیعت کر دیتی ہے۔ پاکیزگی۔ دل و دماغ، خواب و خیال، جذبات و تصوّرات کی پاکیزگی بہرحال ضروری ہے اور پھر بھی اس نے یہ کوشش نہ کی۔ ابر آیا، بارش ہوئی، جل ترنگ بجا، آنکھوں سے ہر چیز اوجھل ہوگئی اور جب مطلع چمکا تو یکایک وہ سورج روشن ہوگیا جس نے ایک فن کار کی گھپ اندھیری دنیا کو بقعۂ نور بنا دیا۔

شیفالی کو پہلی بار دیکھ کر وہ مارے اضطراب کے دوڑا دوڑا کوریڈور میں جا پہنچا۔ دیواروں پر آویزاں دو بہ دو تصاویر تک غور سے دیکھتا رہا۔ کیا بنانے والوں نے یہ ساری تصویریں اس کے حسن سے متاثر ہو کر بنائی ہیں۔ کیا ان ساری تصویروں میں اس بے مثال حسن کا جلوہ نہیں۔ جھکی ہوئی آنکھیں، تنے ہوئے ابرو تمتمائے ہوئے رخسار، پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک ہونٹ۔

اس نے بہت سے رنگ ایک دوسرے سے ملائے۔ بڑی محنت اور عرق ریزی سے ان کا مرکب تیار کیا۔ پھر اس رات اپنی تنہائیوں میں اس نے بڑے تزک و احتشام سے، بڑی محبت و رجحان سے ایک تصویر بنائی — پہلی انسانی تصویر — پہلا زندہ پیکر — جس کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اپنے حواس سے محسوس کیا، اپنی روح کی گہرائیوں سے پسند کیا۔ مگر وہ اس تصویر کے بارے میں کوشش اور خواہش کے باوجود دیوان صاحب کو نہ بتا سکا۔ اگر وہ ناراض ہو جائیں تو ..... وہ برہم ہو کر اسے معتوب کر دیں تو.....

اس کے طول دل میں بہت سے خیالات خوفناک جانوروں کی طرح چنگھاڑتے رہے اور اس ہلچل میں ایک نرم و نازک کومل سا جذبہ رہ رہ کے اسے اکساتا رہا۔ وہ چپکے چپکے تصویریں بناتا رہا — بناتا اور بگاڑتا رہا..... کہ فن میں اگر کھوٹ ملا دی جائے تو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس جذبے کو دل کی گہرائیوں میں دفن کر کے اس نے فن کو زندگی بخشی۔

بات کرنے کے لئے ترستی ہوئی اس کی زبان، دیکھنے کے لئے ترستی ہوئی اس کی آنکھیں، اتصال کے لئے بے چین اس کا جسم، سکون کے لئے بے قرار اس کی روح رنگوں اور لکیروں میں ڈھلتی رہی — ڈھلتی رہی — یہاں تک کہ ان کی پیاس ایک مستقل حزن بن کر اس کی آنکھوں میں چھلک پڑی۔

اس شام جب شیپالی نے دیوان صاحب سے پوچھا: "ڈیڈی! یہ کون لڑکا ہے جو کبھی کبھی نظر آجاتا ہے۔" تو وہ قرأت کی ایک لہر میں کرسکت ہوگیا "مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ ان میں گہرائی، فسوں اور ارتعاش ہے۔ جیسے جیسے ....."

دیوان صاحب نے کرسی پر پہلو بدلا۔ بیٹی کی آنکھوں سے رُخ بچا کر بولے۔ "وہ ایک آرٹسٹ ہے بٹیا۔ اپنے فن کا دیوانہ۔ اس کی آنکھوں کی تڑپ، اس کے فن کا فسوں، اس کی جستجو کا خزانہ صرف اس کی آنکھیں ہیں۔"

انھوں نے سنتوش کی طرف بھرپور التفات سے دیکھا اور بولے "یہ میری شیپالی ہے۔ تمھیں اس سے مل کر خوشی ہوگی سنتوش!"

سنتوش نے نظریں نہ اٹھائیں نیچے ہی نیچے دبی سی کہتا ہوا بولا — "مجھے بے حد مسرت ہے کہ یہ — یہ آپ کی صاحبزادی ہیں۔" اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

شیپالی اپنے پورے حسن، رعب و جلال، وقار و دبدبے کے ساتھ اس کے آگے مجسم تھی۔

"ان سے کہئے کہ میری ایک تصویر بنائیں۔" شیپالی بولی۔

"میں — میں انسانی تصویریں نہیں بناتا، خاتون" وہ پھڑپھڑایا۔

"تو اب آپ کو بنانی ہوگی۔" اس کے حکم میں التجا تھی۔

"میں آج آپ کی ساری تصویریں دیکھوں گی۔" اور بڑے ناز، بڑی چاہت سے شیپالی نے اپنی دو انگلیوں کے سہارے دیوان صاحب کی ٹھوڑی اونچی اٹھائی۔ "ڈیڈی۔"

دیوان صاحب موم کی طرح پگھل گئے۔

کوشش کرو سنتوش کوشش کرو کہ اس کی تصویر بن جائے یہ بن ماں کی لڑکی ہے۔ میں نے اس کا کہا کبھی نہیں ٹالا۔ یہ گھر، اس کی دیواریں، اس کی ہر چیز شیپالی کے حسن، اس کے سلیقے، اس کی آرزوؤں کی آئینہ دار ہیں۔ ٹوٹے ہوئے دل باسلیقہ اور باشعور ہوتے ہیں، انھیں سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اور اس لمحہ سنتوش نے محسوس کیا کہ وہ زمین سے اٹھ کر فلک پر پہونچ چکا ہے۔ خلد کی پنہائیوں میں لپٹا حور و ملائک سے محو گفتگو ہے۔ اس کا چھوٹا پن، کمتری کا احساس، پستی، سب کچھ دیوان صاحب کی عظمت کا شکار ہو کر بکھرے ہوئے پلندے کی طرح تاپید ہو گئے۔

انسانی عزم، انسانی وقار نے پہلی بار اس کے دل میں انگڑائی لی۔ وہ خود بھی اس قابل ہے کہ کسی کو سمجھے، کسی کو سمجھائے اور اس نے بڑے دھیمے لیکن بڑے تبحر سے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ "میں کوشش کروں گا دیوان صاحب، کہ یہ میری پہلی اور آخری کامیاب تصویر ہو۔"

شیپالی کو ماڈل بنا کر اس کے قلم کی رفعتوں نے جن زاویوں کو چھوا، وہ تار کے چھلنے کی طرح اس کی سوئی ہوئی روح کو بھی جھنجھوڑ گئیں۔ اس کی ساری حسیات ایک ایک کر کے جاگ اٹھیں۔ زندگی کے جو معمے، اس کی آنچ، اس کی شانِ دل ربائی۔ اور جب تصویر دیوان صاحب نے دیکھی تو دیر تک دیکھتے رہ گئے۔ اپنی بیٹی کا یہ حسن، یہ رنگ تو انھوں کبھی جیتی جاگتی آنکھوں سے بھی نہ دیکھا تھا۔

لطف و اچھنبا اور سرور کے نشے سے چور انھوں نے اٹھ کے بے ساختہ سنتوش کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ مٹی کا کچا گھروندا اونچی اونچی فلک بوس دیواروں میں مدغم ہو گیا .....

مقامی نمائش میں منتخب ہو کر تصویر بیرونی ممالک گئی اور ہر جگہ کم و بیش پہلا انعام حاصل کیا۔

اور آج اٹھارہ سال بعد دیوان صاحب کی فراٹے بھرتی ہوئی موٹر میں شہر سے اپنے گھر واپس لوٹتے ہوئے سنتوش رہ رہ کے یہی سوچ رہا تھا کہ ایک ماں کو اس کی سہارا مل رہا ہے یا ایک بیٹے کو اس کا حاصلِ حیات....

# کلامِ جوہر

ہائے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے اشک
جیسے تاروں کو پسینے آگئے

آنکھ نے اشکوں کی چادر اوڑھ لی
دل کی دنیا پر دھندلکے چھا گئے

ٹوٹ کر کانٹے نہ نکلے پاؤں سے
ہم سفر تھے تا بمنزل آگئے

کھلتے کھلتے پڑ گئی پھولوں پہ اوس
مسکرائے تھے کہ آنسو آگئے

جب ہوا ویران دامانِ بہار
دیدہ ہائے شوق گل برسا گئے

جاذبِ ساحل بنا سیلابِ غم
تا بہ کشتی خود کنارے آگئے

ذرہ ذرہ ہے یہاں گرمِ سفر
یہ کہاں اے ہم سفر ہم آگئے

جوہر اُن آنکھوں کا رکھنا تھا بھرم
اس لئے دانستہ دھوکا کھا گئے

---

سکوں برباد کر لوں حسرت و ارماں کا خوں کر لوں
جو وہ بیداد گر یوں شاد ہو جائے تو یوں کر لوں

الم سے شادمانی درد سے پیدا سکوں کر لوں
ز سر تا پا جنوں ہو کر مداوائے جنوں کر لوں

گراں گذرے تو گذرے بیخودی میری زمانے کو
میں آخر ہوش میں کیوں آ کے توہینِ جنوں کر لوں

عنادل سے چمن میں داد لے لوں ہم مذاقی کی
گلوں کی چاک دامانی سے تسکینِ جنوں کر لوں

نگاہِ واپسیں سے دیکھ لوں اپنے نشیمن کو
اجازت ہو تو اے صیاد نظریں یوں سے یوں کر لوں

سناؤں زندگیٔ عشق کی کیا کشمکش جوہر
کبھی کہتا ہوں یوں کر لوں، کبھی کہتا ہوں یوں کر لوں

نصیر پرواز

# انتظار

بہت گراں ہیں ترے انتظار کی گھڑیاں
نفس نفس تری آہٹ، نظر نظر تری دید

قریبِ مرگ ہیں ماہ و نجوم کی شمعیں
یہ دشت و کوہ و بیاباں یہ دم بخود اشجار

غمِ فراق کے اشکوں سے دُھلتا جاتا ہے
نڈھال ہو چکی اب تھک کے شب کی رقاصہ

ستارے نور کی کلیاں لٹانے بیٹھے ہیں
عروسِ شب نے سجالی ہے سیج پھولوں کی

ہر ایک سمت اندھیرے کا پہرہ چھایا ہے
فضا کا دل جو دھڑک جائے ایک لمحے کو

بھٹک رہی ہے خلاؤں میں بے قرار نظر
کمالِ شوق سے رہ دیکھتی ہے راہ گذر

اداس رات کھڑی ہے ادب سے چشم براہ
بچھی ہوئی ہے تری راہ میں ہراک کی نگاہ

اندھیری رات کی آنکھوں سے نیند کا کاجل
فضا اداس، صبا مضمحل، نظر بوجھل

کھڑے ہیں ساکت و جامد اندھیرے سہمے ہوئے
کریں گے لمحے نچھاور ترے قدم پہ دیئے

صبا جو سنکے تو لمحات چونک پڑتے ہیں
اسیرِ خواب خیالات چونک پڑتے ہیں

نگاہ کب سے تری دید کو ترستی ہے
تری تلاش میں دل سوگوار ہے کب سے
صدا رہے نہ غمِ دل کی خوش گوار سحر
گذر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے"

# ڈال ڈال کے پات

## اردو شاعری میں ایہام گوئی ——— ڈاکٹر مولوی عبدالحق

ایہام گوئی کا سارا دارومدار ذو معنے لفظ پر ہے اور یہ کھیل اسی سے کھیلا جاتا ہے۔ فارسی میں لطافت کی کچھ کمی نہیں خصوصاً ستا خرین نے اس معاملے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی لیکن باوجود اس کے فارسی شعراء نے غزل میں صنائع کے استعمال میں احتیاط سے کام لیا ہے اور اس کا استعمال اس حد تک نہیں کیا کہ وہ گراں گزرے۔ اس لئے یہ خیال قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے کہ اردو ایہام گوئی پر زیادہ تر ہندی شاعری کا اثر ہوا ہے اور ہندی میں یہ چیز سنسکرت سے پہنچی ہے۔

سنسکرت میں اس صنعت کا نام ہے شلیش۔ شلیش ایسے لفظ کو کہتے ہیں جس کے کئی معنی ہوں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں لیکن خاص تین دو ہیں۔ سبھنگ اور ابھنگ۔ سبھنگ وہ حالت ہے جب کہ لفظ سالم رہتا ہے اور ابھنگ وہ ہے جب کہ لفظ کے ٹکڑے کرکے یہ صنعت پیدا کی جاتی ہے۔

ہندی میں اس صنعت کو بہت فروغ ہوا اور اس کی لے یہاں تک بڑھی کہ بعض جدّت پسند عاشقوں نے بہاری کے کلام سے بھی نئے نکالے ہیں۔ ہندی میں اکثر شاعروں نے اس صنعت کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً رحیم کہتا ہے

جیون رحیم گئی دیپ کی کل کپوت گئی سوئے
بارے اجیارو گئے بڑھے اندھیرو ہوئے

جیسے چراغ کی حالت ہے ایسے ہی خاندان میں کپوت کی حالت ہے۔ جلانے پر اُجالا ہوتا ہے اور بڑھانے پر اندھیرا۔

یہاں بارا کا لفظ ذو معنی ہے ایک معنے بچپن کے اور دوسرے جلانے کے۔ اسی طرح بڑھنا کے بھی دو معنے ہیں یعنی نیچے کا بڑھنا اور چراغ کا بڑھانا یعنی بجھنا۔ آخری مصرعے کے دو سرے معنی یہ ہوئے کہ بچپن میں بچہ اُجالا ہوتا ہے اور جوں جوں بڑھتا جاتا ہے تو وہ اندھیرا ہو جاتا ہے۔

(ذہنِ قلم کراچی)

## مردم شماری ——— سید محمد جعفری

ہے چمن میں آج کل مردم شماری کی بہار
CENSUS گھوڑوں گدھوں کا ہو چکا ہے پہلی بار
اس لئے حیوانِ ناطق ہو رہے ہیں اب شمار
رہ نہ جائے تو کہیں اے مردِ عاقل ہوشیار
اس جہاں میں آنجہانی ورنہ پھلائے گا تو
جدولِ مردم شماری سے نکل جائے گا تو

پوچھے جانے چاہئیں اس وقت کچھ ایسے سوال
جی رہے ہو کب سے اور کیوں اور کب ہوگا وصال
ہے مکاں اپنا کہ بے گانہ ہوا کب انتقال
آج تک پیدا کیا کس چیز میں تم نے کمال
بڑھ گئیں کتنی گھر والو ضعیفیں دس سال میں
آدمی کس حال میں ہیں جانور کس حال میں

مولوی کی طرح کھاتے ہو کہ ہے پینا پسند!
خاندانی طور پر کتنے ہو تم منصوبہ بند!
کتنے منصوبے ہیں چھوٹے کتنے منصوبے بلند
اور اگر منصوبیاں ہیں کچھ تو کتنی ہوشمند
صاحبِ اولاد ہو یا زائد ایمعاد ہو؟
تم غزل گوئی میں کس استاد کی اولاد ہو؟

آدمیت کس قدر ہے، والدیت کس قدر؟
خارجیت کس قدر ہے، داخلیت کس قدر؟
قابلیت کس قدر ہے، جاہلیت کس قدر؟
ذہنیت کس قدر ہے، مولویت کس قدر؟
کیا زبانیں بولتے ہو یا ہو بالکل بے زباں
یا زباں ایسی ہے شکر کہ جس کو کر لیں بند کاں

(انتخاب)

(لقمۂ کراچی)

ع-م
ش-ح

# نئی کتابیں

## اُردو غزل دلّی تک

مرتب ڈاکٹر تنویر صیاالدین مدنی اسماعیل یوسف یونیورسٹی بمبئی ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پریس بلڈنگ بمبئی ۳ قیمت تین روپے تقطیع ۲۲½×۱۸، صفحات ۱۲۸، کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، جلد پوشش عمدہ

ڈاکٹر مدنی اردو میں متعدد تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دلّی کے بعد کی غزل تو بہت منظر عام پر آچکی ہے۔ دلّی سے پہلے کی غزل گوئی کو ایک جگہ منظر عام پر لاکر ڈاکٹر مدنی نے اردو شاعری کی تاریخ کے ایک اہم باب کو مکمل کیا ہے۔

## انتخاب کلام داغ

مرتب۔ ڈاکٹر محمد عقیل۔ ناشر ہندستانی اکیڈیمی اتر پردیش الٰہ آباد۔ تقطیع ۲۰×۳۰ صفحات ۲۸۸ کتابت اوسط، طباعت عمدہ، کتاب مجلّد ہے اور جلد پوشش کی حامل۔ قیمت ۶ روپیہ۔ داغ کیا اب تو بیسویں صدی کے شعراء کے مجموعے نایاب ہوتے ہیں۔ اس دور میں داغ کا یہ انتخاب بڑا اچھا کام ہے۔ کتاب کے شروع میں مرتب نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں داغ کے محاسنِ شعری پر طویل بحث کی ہے۔

(ع-م)

## اجنبی

جناب وشوا ناتھ درد کی نظموں، غزلوں اور قطعات کا مجموعہ قیمت پانچ روپے۔ صفحات ۲۱۶، کتابت، طباعت، کاغذ، ڈسٹ کور عمدہ، ملنے کا پتہ:۔ انٹل پبلیکیشنز، نئی دلّی ۵

وشوا ناتھ درد کے الفاظ میں ان کی شاعری کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہے گویا اس کا عالم نوجوانی ہے مگر اس میں بوڑھوں کی سی سنجیدگی اور پختگی ہے۔ شروع میں مصنف نے اپنی زندگی اور اپنے فن کا بڑا اچھا محاکمہ کیا ہے جس سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے درد کی نظمیں، غزلیں اور قطعات بھی گہرے جذبات اور حسنِ افکار کے حامل ہیں خصوصاً ان کی نظم "کھوٹا سکّہ" سماج پر ایک بھرپور طنز ہے۔ یہ مجموعہ سراہنے کے لائق ہے۔

## آوازیں

مصنف اسرار اکبر آبادی۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔ صفحات ۱۴۴، کتابت، طباعت، کاغذ اوسط، رنگین جلد پوش۔ ملنے کا پتہ:۔ فردوس پبلشنگ ہاؤس، ہیپنگ منڈی آگرہ۔ اس مجموعے میں بارہ افسانے اور دو ڈرامے ہیں۔ افسانوں میں اصلاحی رنگ غالب ہے "ہم سب ایک ہیں" میں فرقہ وارانہ اتحاد پر زور دیا گیا ہے۔ اسرار اکبر آبادی صاحب شاعر بھی ہیں مگر بقول خود پہلے افسانہ نگار ہیں۔ یہ افسانے ان کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہیں مگر انھیں سعی نامشکور نہیں کہا جا سکتا۔

## فردوسِ وطن

مصنف کشن سیل پوری، صفحات ۱۱۲۔ قیمت تین روپے ناشر۔ ڈگری ساہتیہ مندر جموں، کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، مجلد مع ڈسٹ کور۔

زیرِ نظر کتاب جناب کشن سیل پوری کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے اپنے وطن جموں و کشمیر کے حسن و دلکشی، عظمت و عزت

اور اپنے جذبۂ حبّ الوطنی کے گیت گائے ہیں۔ کشن صاحب قادر الکلام شاعر ہیں اور مؤثر انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ نظمیں اہلِ کشمیر کے علاوہ دوسروں کو بھی متاثر کریں گی۔

## دھرتی کا کال

مصنف۔ جوگندر پال۔ صفحات ۱۴۰۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط۔ مجلد مع ڈسٹ کور پبلشر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

جوگندر پال نیا افسانے لکھنے والے ہیں۔ ان کے یہ تمام افسانے افریقہ اور افریقی زندگی کے بارے میں ہیں۔ مصنف خود افریقہ میں رہتے ہیں اور انھوں نے ان کی زندگی کا بڑا قریب سے مطالعہ کیا ہے اسی لئے ان میں صداقت بھی ہے اور اثر بھی۔ تعارف میں کرشن چندر نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

"..... وہ اردو کا پہلا افسانہ نگار ہے جس نے افریقی زندگی کو اس شدت اور خوبی سے ہم سے روشناس کرایا ہے۔"

کرشن چندر کے علاوہ دیوندر ستیارتھی نے بھی مصنف اور تصنیف کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے اُمید ہے یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔

## نروان

"لائٹ آف ایشیا" مصنفہ ایڈون آرنلڈ کا منظوم ترجمہ مترجم فاروق جنوں۔ قیمت دو روپے صفحات ۱۱۰۔

"لائٹ آف ایشیا" میں پروفیسر ایڈون آرنلڈ نے گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات کو انگریزی میں نظم کیا ہے۔ ان کی نظم بڑی مشہور و معروف ہے۔ فاروق جنوں صاحب نے اس کو اردو کا جامہ پہنا کر ایک بڑی مستحسن کوشش کی ہے۔ غزل گوئی کے اس دور میں ایسی کاوشیں اور کوششیں فال نیک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ترجمہ بھی رواں، صاف اور شستہ اوصاف کا حامل ہے۔ امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کتاب کی پذیرائی کریں گے۔

## شاعرِ آتش نوا

قاضی نذیر الاسلام کی سوانح حیات، شخصیت اور شاعری سے متعلق مقالوں کا مجموعہ اور منتخب کلام کا اردو ترجمہ، مرتب اجمل اجملی صفحات ۲۸۸۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ مجلد مع گرد پوش۔

اردو میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات، ان کی تصنیفات کے ترجمے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اجمل اجملی صاحب لائقِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے نذر الاسلام کی حیات، شخصیت اور شاعری سے متعلق معلومات افزا مقالوں اور ان کی بہترین نظموں کے ترجموں کو یکجا کیا ہے۔ ترجمے کی اچھائی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ فراق گورکھپوری معترف ہیں:۔

"..... ان ترجموں کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ بنگلہ شاعری کے طرزِ احساس، طرزِ فکر اور طرزِ بیان سے ہم اردو والے بہت خوش گوار اور دل نشیں طریقے سے ماقفتم ہو جاتے ہیں۔ ترجمے بہت نازک اور سبک انداز سے کئے گئے ہیں....."

مقالہ نگاروں میں اجمل اجملی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، وفا راشدی اور یونس احمر قابلِ ذکر ہیں۔

## یادِ ایام

مصنف ضیاء الحسن علوی۔ صفحات ۸۴۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔

"مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کاکوری ضلع لکھنؤ کے مشہور علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ندوے کے عالم اور علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ زیرِ نظر مقالہ ۱۹۱۴ء میں "الندوہ" کے دو نمبروں میں شائع ہوا تھا۔" ادارۂ ادبیاتِ اردو نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ شروع میں مرحوم کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے مطابق "یہ گویا ان کی آپ بیتی ہے جس میں جگ بیتی کے بہت سے دل چسپ مناظر مل ہیں۔ اس مضمون میں لکھنؤ کی زبان کا مزہ اور روزمرہ کا چٹخارہ ایسا تھا کہ سبھی اہلِ ذوق نے اس کو بے حد پسند کیا تھا....." اور کوئی وجہ نہیں کہ اب بھی پسند نہ کیا جائے کیونکہ اب ایسی پیاری زبان لکھنے والے کہاں؟

## ۱۔ تنقید اور تنقیدی شعور ۲۔ جائزے

ان دونوں کتابوں کے مصنف ناظر کاکوروی ہیں۔ پہلی کتاب "صدسالہ ادب کا ادبی تجزیہ" ہے اور دوسری کتاب "صدسالہ ادب کا شعوری اور تنقیدی تجزیہ" ہے۔

پہلی کتاب کا نام تو ہے تنقید اور تنقیدی شعور مگر ساری کتاب میں شعوری تو کیا غیر شعوری طور پر بھی تنقید کا پتہ نہیں۔ مقدمہ میں رفٹ نوٹ کی مدد سے جو دوسرے مصنفوں کے طویل اقتباسات پیش کئے ہیں) اردو زبان کی پیدائش و ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیشتر باتیں محلِ نظر اور بالکل سطحی ہیں۔ دوسرا باب تنقید اور شعوری تنقید کا ہے اس میں تنقید کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ "تنقید تخلیق و تفریح سے علٰحدہ چیز ہے اس میں ہم عقلمندانہ طور پر سوال و جواب کرتے ہیں" دوسرا باب "تنقید جدید کی تشکیل" کے عنوان سے ہے۔ تیسرا باب تجزیۂ ادبی ہے جس کا پہلا ذیلی عنوان غالب، دوسرا مغربی ممالک اور اردو اور تیسرا سودیشی یونین میں اردو کی مقبولیت ہے۔ غرضیکہ مذاہین میں ربط و تسلسل بالکل نہیں ہے خیالات کا انتشار نمایاں ہے تنقید کا یہ حال ہے کہ سوائے سطحی رائیں اور وہ بھی زیادہ تر دوسروں کی (قدم قدم پر بقول فلاں) کی تکرار ہے) نقل کی گئی ہیں۔ صفحہ ۱۲۶ پر ایک ذیلی عنوان ہے "ممتاز صدیقی، نامور کاظمی، قیوم نظر اور جعفر علی اثر۔ پھر لکھا ہے "نوجوان شعراء کی غزل میں ....." اسی پیراگراف کی اگلی سطر ہے "ممتاز صدیقی اور اثر تیر کے انداز کو اپنانے کی سعی کرتے ہیں۔" لطف تو یہ ہے کہ جعفر علی خاں نوجوان شعراء کی صف میں کھڑے کئے گئے ہیں۔ مگر اس صف میں صرف وہی اکیلے نہیں ہیں۔ دوسری کتاب 'جائزے' کے صفحہ ۹۳ پر ذیلی عنوان ہے "نوجوان شعراء" آگے لکھا ہے "اس دور کے نوجوان شعراء میں عمر انصاری، شوکت تھانوی کا مقام بے حد روشن اور بلند ہے۔ اس طرح ابو محمد ثاقب، سراج الدین بابری سراج لکھنوی، اظہار رام پوری، محشر مرزا پوری، جلیل قدوائی، اشفاق حسین بے خود، صدق جائسی، مانی جائسی ....." معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مختلف رسالوں اور پرچوں کی مدد سے شعراء اور مصنفین کے نام اکٹھے کر لئے ہیں اور دونوں کتابوں میں متعدد عنوانات سے ان کی فہرست نقل کی ہے زیادہ تر نام انھوں نے محض اپنے حسنِ ظن یا لاعلمی سے شامل کئے ہیں۔ 'جائزے' میں کتابوں، ادیبوں و شاعروں، لائبریریوں، رسالوں اور مملکت یونی ورسٹیوں میں تحقیقی کام کرنے والوں کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ فہرست کسی اصول یا قاعدے کے مطابق تیار نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی مکمل ہے۔ مثلاً تنقیدی ادب کے تحت کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں کلیم الدین کی کتاب سخن ہائے گفتنی 'تو درج ہے مگر 'اردو شاعری پر ایک نظر' 'اردو تنقید پر ایک نظر اور فن داستان گوئی' جو مصنف کی مشہور و معروف کتابیں ہیں، ان کا ذکر نہیں۔ ہر قدم پر اغلاط کی بھرمار ہے۔ بڑی عجیب و غریب رائیں اور زیادہ تر دوستوں کے ذریعے سنی سنائی غیر ذمہ داری سے درج کی گئی ہیں۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ورنہ بے شمار شاہد پیش کی جا سکتی ہیں۔

مصنف نے دیباچوں میں دوستوں کے اصرار اور اپنی مصروفیت کا ذکر کیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کتابوں کی تصنیف کو اتنا آسان کیوں سمجھ لیا گیا ہے۔ جو کچھ صحیح یا غلط جمع ہو جائے اس کا چھپوا لیا ضروری ہے۔ 'تنقید اور تنقیدی شعور' کی قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے اور ضخامت ۱۸۲ صفحات اور 'جائزے' کی قیمت ڈیڑھ روپیہ اور صفحات ۱۲۸ ہیں۔

مندرجہ بالا پانچوں کتابیں ادارۂ ادبیات اردو الہ آباد نے شائع کی ہیں اور سوائے 'یادِ ایام' کے ہر کتاب کی لکھائی اور چھپائی اچھی ہے۔

### ریاست میسور میں اردو (جلد اول)

مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون اور محمد خان۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ ملنے کا پتہ۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نمبر ۲۳ ۵ ۵ ۴، این، سواجی روڈ، سہما راج محلہ۔ میسور۔

ڈاکٹر آمنہ خاتون پروفیسر مہارانی کالج میسور ہماری مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے میسور جیسی دور افتادہ جگہ کے بارے میں اردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق ایک تحقیقی کتاب مرتب کی ہے اور بعض نادر مخطوطوں کی اشاعت کی ہے میسور کی زبان پر دکن کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ تحقیقی کتاب ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے کیونکہ بہت سے گمنام گوشوں کو روشن کرتی ہے۔ امید ہے اہلِ ذوق اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ (ش ح)

# 'ٹیگور نمبر' کے باب میں

### پروفیسر اخشام حسین

'آج کل' کے عام نمبر ہی دل چسپ اور قابلِ مطالعہ ہوتے ہیں پھر خاص نمبروں کا کیا پوچھنا! 'ٹیگور نمبر' بہت خوب ہے۔ یوں تو ٹیگور پر انگریزی میں اتنے اچھے اچھے مضامین دیکھنے کو مل جاتے ہیں کہ جی چاہتا ہے اردو میں بھی ایسے ہی مقالے دیکھنے کو ملیں۔ لیکن اس کی طرف ہمارے تھوڑے ہی سے لکھنے والے توجہ کرتے ہیں، تاہم آپ نے کئی اچھے مضامین یکجا کر دئے ہیں اور ٹیگور کی زندگی اور فکر پر کئی پہلوؤں سے معقول مواد یکجا ہو گیا ہے۔ تصاویر نے اس میں اور چار چاند لگا دئے ہیں۔ یقین ہے کہ یہ نمبر بھی گذشتہ خاص نمبروں کی طرح مقبول ہو گا۔

### جناب آثر لکھنوی

'آج کل' کا ٹیگور نمبر' ہر لحاظ سے حسین، دلکش اور خیال انگیز ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ میری مبارکباد قبول کیجئے۔

### پروفیسر تلوک چند محروم

شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کی شخصیت، شاعری، ڈراما، افسانہ نویسی، سیاست اور روحانیت کا جس خوبی سے 'آج کل' نے اپنے 'ٹیگور نمبر' میں احاطہ کر لیا ہے وہ لائقِ ہزار تحسین ہے۔ ادارہ نے ٹیگور پر یہ ضخیم نمبر نکال کر ہندوستانی ادب و ثقافت کی بے بہا خدمت کی ہے۔

### جناب میکش اکبرآبادی

'آج کل' کا 'ٹیگور نمبر' ٹیگور کی تمام ادبی اور فنی خصوصیات کمالات اور سوانح پر ایک مکمل و مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نمبر سے ٹیگور کی مقبولیت کے ساتھ ان کے کام اور پیام سے عوام کی واقفیت بڑھے گی اور ہزاروں ایسے لوگ جو ٹیگور کا صرف نام جانتے تھے ٹیگور کے پیغام سے روشناس ہو کر ان کے فنون اور کمالات سے معرفت اور فیض حاصل کر سکیں گے۔

### جناب علی عباس حسینی

'آج کل' کا 'ٹیگور نمبر' گذشتہ خاص نمبروں سے بھی بہتر ہے۔ صوری اور معنوی حیثیت سے اس کی ترجیح میں آپ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ 'شانتی نکیتن' پر اجمل خاں صاحب کا مضمون فاضلانہ ہے۔ فراق صاحب نے اس عظیم فن کار کی شاعری پر جو نظر ڈالی ہے وہ طمانیت بخش ہونے پر بھی بصیرت افروز ہے۔ بی گوپال ریڈی، ابوالکلام زہرہ سہگل، سعید انصاری، واتسائن، شانتی دیوی گھوش نے جن پہلوؤں پر تبصرہ فرمایا ہے ان کے وہ خود بھی ماہر ہیں اور انھیں جیسے لوگ اس ہمہ گیر شخصیت کے کمالات پر روشنی ڈالنے کا حق بھی رکھتے تھے۔ آپ کا ادارہ مستحقِ مبارک باد ہے کہ اس نے آرٹ اور ادب کے اس دیوقد فن کار کو اردو دان پبلک سے متعارف کرانے کے لئے اتنے بڑے ماہرینِ فنون تلاش کر لئے۔ میری طرف سے لکھنے والوں اور ترتیب دینے والوں، دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش ہے۔

### 'ہماری زبان' علی گڑھ

ٹیگور کی صد سالہ سال گرہ کے موقع پر ماہنامہ 'آج کل' دہلی نے ضخامت کے اعتبار سے مختصر لیکن مواد کے اعتبار سے جامع نمبر شائع کیا ہے۔ اس خاص نمبر میں ٹیگور کی عظمت اور شخصیت کے مختلف اہم پہلوؤں پر اہم مضامین شامل ہیں۔ زاق گورکھپوری کے منتخب ترجمے اور مضمون قرۃ العین کا مضمون اور ٹیگور کی تصویریں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی ترتیب کے لئے ایڈیٹر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

# جھنجھٹ بنا
# لین دین

میٹرک باٹوں کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ بیشتر
بھی میٹرک اکائیوں میں ظاہر کی جاتی ہیں۔ لیکن
لین دین کے حساب کتاب میں اب بھی بڑی دماغ سوزی
کرنی پڑتی ہے۔ آخر کیوں؟

محض اس لئے کہ میٹرک کے طریقے پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اشیاء یا تو
پرانے باٹوں کے حساب سے خریدی جاتی ہیں یا پھر اُن کے مساوی
اوزان کے حساب سے، مثلاً

ایک پاؤ کے لئے ـــــ ۲۳۳ گرام
ایک پونڈ کے لئے ـــــ ۴۵۴ گرام

ایسی صورت میں ظاہر ہے، اس اصلاح سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا
جا سکتا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اب آپ ۲۳۳ گرام کی جگہ ۲ سو یا ۳ سو
گرام اور ۴۵۴ گرام کے بجائے ۴ سو یا ۵ سو گرام چیز خریدیں۔

اس طرح آپ اس اصلاح سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ یہی نہیں،
عشری سکوں کی بدولت لین دین کے حساب کتاب میں بھی آپ کو آسانی
رہے گی۔

اپنی ضروریات کی چیزیں

## مکمل میٹرک اکائیوں

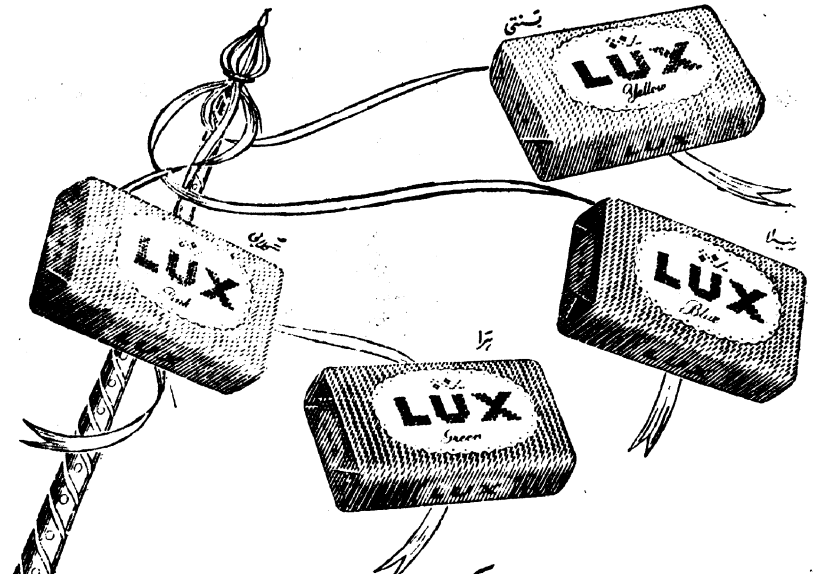
میں خریدیئے



اسی میں آپ کی اور دوکاندار کی سہولت ہے

جاری کردہ بھارت سرکار

DA 61/188

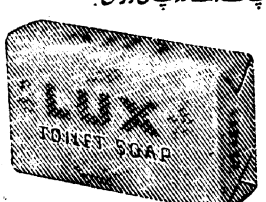



خالص، مُلائیم جھاگ والا لکس

## دَھنک کے ۴ رنگوں میں

اور آپ کا دلپسند سفید بھی

دیکھئے! لکس کے چھبیلے رنگ اور اُنہی رنگوں کے چھبیلے سَرورق!
اور سفید بھی! رنگ کئی، صابن وہی — آپ کا
پسندیدہ خالص لکس — آپ کے رنگ رُوپ کی رونق!




"آرائشِ جمال کے لئے اچھوتا خیال...
میرا پسندیدہ لکس رنگوں میں!"
سادھنا کہتی ہیں



فلمی ستاروں کا خالص، مُلائیم جھاگ والا حُسن بخش صابن
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

LTS 81-X52 UD

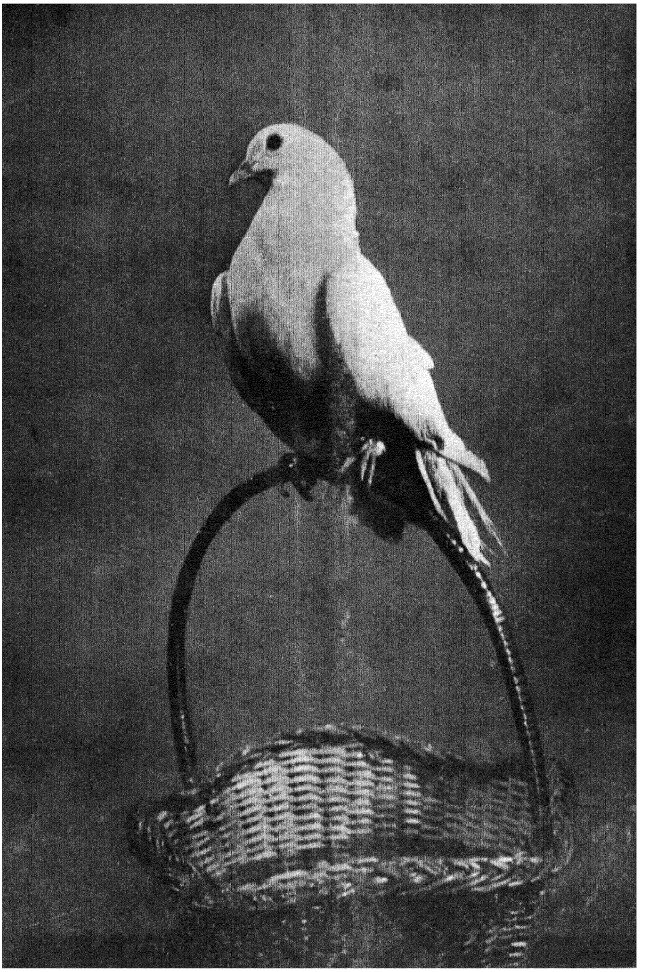
# ہماری کتابیں



| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پنڈت نہرو سے بات چیت ٹیبر منڈی | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| تیسرا پنج سالہ پلان | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ۴۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ۳۵ نئے پیسے | ۱۰ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں | ۱۰ نئے پیسے | ۸ نئے پیسے |
| نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ | (فی نمبر) | (فی نمبر) |

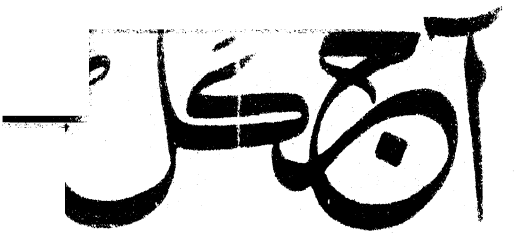
ملنے کا پتہ

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**



# ہماری کتابیں



| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پنڈت نہرو سے بات چیت ٹیبر منڈی | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| تیسرا پنج سالہ پلان | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ۴۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ۳۵ نئے پیسے | ۱۰ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں | ۱۰ نئے پیسے | ۸ نئے پیسے |
| نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ | (فی نمبر) | (فی نمبر) |

ملنے کا پتہ

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| سوامی مارہروی | گوپی چند نارنگ | ۳ |
| غزل | محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء | ۸ |
| پہلگام | عرش ملسیانی | ۹ |
| غالب کے شریک غالب | وجاہت علی سندیلوی | ۱۱ |
| لحمہ کی شکست | عابد سہیل | ۱۷ |
| جدید فن مصوری کی بین الاقوامی نمائش | ابدر جیت لال | ۲۷ |
| غزل | شمیم کرہانی | ۳۱ |
| فن تلمیذ گوئی | احمد جمال پاشا | ۳۲ |
| غزل | ساقی لکھنوی | ۳۹ |
| قطعاتِ تاریخ وفات جگر مراد آبادی | ذاکر بنگلوری | ۴۰ |
| کشمیری ادب میں دیگر زبانوں کے تراجم | غلام نبی خیال | ۴۱ |


سرورق :- پہلگام کا ایک منظر

رسالے کی پشت پر :- جنوبی ہند کی ایک دوشیزہ


بھدرا شک سمت ۱۸۸۳

ستمبر ۱۹۶۱ء

جلد ۲۰ - نمبر ۲


مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی، ایڈیٹر 'آج کل' اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی


اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آج کل دہلی

مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد مجیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | حیدرآباد |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| رحمان راہی | سری نگر |

یو - ایس - موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

جی - این - ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)

جی نجا نا تھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبہ اردو سیکرٹری)

مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- مظفر شاہ

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)

غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۲۰ سنٹ

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۱۰۳۰ دہلی

# ملاحظات

اب جبکہ ہم اپنی آزادی کے پندرھویں سال میں داخل ہو چکے ہیں اور ملک کی تعمیر و ترقی کی جد جہد اور دیگر اندرونی اور بیرونی مسائل سے دوچار ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ملک کی سالمیت اور جذباتی ہم آہنگی کو تمام باتوں پر ترجیح دیں اور سماجی پس ماندگی سے نکل کر اتحاد اور قوم پرستی کے جذبہ کے ساتھ اپنے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ ملک کی ترقی رواداری اور اشتراک عمل میں ہے جیسا کہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے متنبہ کیا ہے، اگر ہندوستان نے ذات پات، فرقہ واریت اور رواجی خیالات کے جنجال سے پیچھا نہیں چھڑایا تو وہ نہ کوئی جمہوری ڈھانچہ کھڑا کر سکتا ہے اور نہ قومیت اور سوشلزم کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ ہم نے ملک میں سوشلسٹ سماج قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر قسم کی کمزوریوں اور چھوٹی باتوں سے اوپر اٹھ کر ہم اتحاد و تعاون کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہوں اور سیکولر نظام حکومت کی جڑیں مضبوط کریں۔

دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کی باہمی کشمکش شروع ہی سے امن عالم کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہے۔ ایک طرف تخفیف اسلحہ اور ایٹمی دھماکوں کو بند کرنے کی بات چیت ہوتی ہے تو دوسری طرف فوجی اخراجات میں اضافہ اور رام بندی کی بھی خبریں آتی ہیں اور امن پسند دنیا سہم جاتی ہے۔ حال ہی میں برلن کے معاملے نے نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ روس نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس سال کے آخر تک مشرقی جرمنی سے صلح کا معاہدہ کرے گا۔ یہ صورت حال مغربی ممالک کے لئے قابل قبول نہیں، اس لئے کشمکش بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ امریکہ نے بھی اس معاملے میں سخت رویہ اختیار کر لیا ہے اور وہ بھی اپنی فوجی قوت بڑھانے کی طرف رجوع ہو گیا ہے۔

کویت کے تنازعہ کی شدت میں بڑی حد تک کمی آ چکی تھی کہ ادھر تیونیشیا اور فرانس کے درمیان لڑائی چھڑ گئی ——— فرانس نے بیزرتا کے شہر پر بم باری کر کے جو ظلم ڈھایا ہے اس سے پورے افریقہ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ تنازعہ بیزرتا کے ہوائی اور سمندری اڈے پر ہے جس پر فرانس کا قبضہ ہے اور تیونیشیا جس کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کے حالات میں کوئی ملک بھی اپنی سرزمین پر غیر ملکی قبضہ برداشت نہیں کر سکتا۔

افسوس کہ ۱۶۔ جولائی کو لکھنؤ میں خان بہادر ظفر حسین خاں کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم بڑے علمی آدمی تھے۔ یورپی کے شعبۂ تعلیمات میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ساہتیہ اکادمی کے ممبر تھے۔ تعلیمات و فلسفہ سے آپ کو خاص شغف تھا۔ ان موضوعات پر آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ آپ کی کتاب "مال و شیشت" پر ساہتیہ اکادمی نے پانچ ہزار روپیہ کا انعام بھی دیا تھا۔ ان خدمات کی بدولت علمی و ادبی حلقوں میں آپ کی یاد ہمیشہ قائم رہے گی۔

# سوامی مارہروی

گیت کی زبان اور اس کے فنی رموز و نکات سے اردو کے جن جدید شاعروں نے پوری واقفیت کا ثبوت دیا ہے ان میں سوامی مارہروی کا نام سرِ فہرست ہے۔ افسوس ہے کہ ۱۰۔ نومبر ۱۹۶۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اردو میں گیتوں کی کمی ہے نہ گیت کاروں کی لیکن ہمارے بیشتر شاعر جب غزل یا نظم سے اکتا جاتے ہیں تو گیت سے جی بہلاتے ہیں۔ اس کے برعکس سوامی مارہروی ان اِنے گنے شاعروں میں تھے، جنھوں نے اپنے فن کو کلی یکسوئی اور سنجیدگی سے گیت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں وہ دوسروں سے بہت آگے رہے۔

سوامی مارہروی کا تعلق بلگرام کے اس مردم خیز خطے سے تھا جو صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ اتر پردیش کے ضلع ہردوئی کا ایک قصبہ ہے جسے نخلِ بھی کہتے ہیں۔ اس کی خاک پاک سے ایسی ایسی ہستیاں وجود میں آتی رہی ہیں جو فقر و تصوف اور شرو ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں۔ بلگرام کی علمی و ادبی خدمات کا کچھ اندازہ میر غلام علی آزاد کے ضخیم تذکرہ مآثر الکرام سے لگایا جا سکتا ہے، جس کی پہلی جلد بلگرام کے فقرا و فضلا سے متعلق ہے اور دوسری میں جو "سرو آزاد" کے نام سے موسوم ہے، ۱۵۱ شعرائے فارسی اور ہندی کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ ان میں شیخ شاہ محمد بن شیخ معروف فتی سید نظام الدین "مدھنا یک"، میر عبدالجلیل بلگرامی، سید غلام نبی بلگرامی اور سید برکت اللہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہی سید برکت اللہ جدِ امجد تھے سوامی مارہروی کے۔ آزاد بلگرامی نے انھیں "صفی حلقۂ فقرا" لکھا ہے۔ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں تخلص "عشقی" اور ہندی میں "پیمی" تھا۔ ان کے دوہرہ و کبت کا مجموعہ "پیم پرکاس" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ بیٹے تھے "سید اویس بن میر عبدالجلیل بن میر عبدالواحد بلگرامی" کے اور "صاحب البرکات" کے لقب سے مشہور تھے[1] چند پشتوں میں درگاہ کاکینہ (سرکار خورد) کے سجادہ نشین حضرت شاہ صاحب عالم تخلص بہ صاحب ہوئے (المتوفی ۱۲۸۸ھ) یہ غالب کے خاص دوست تھے اور غالب کے خطوط کے مجموعہ عود ہندی کی ترتیب انھیں کے ایک ہم مشرب چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کے سپرد ہوئی تھی[2] ان کے منجھلے بیٹے سید شاہ عالم مارہروی، شائق غالب سے اصلاح لیتے تھے[3] اور شائق کے بھانجے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مصنف تذکرۂ جلوۂ خضر بھی غالب

[1] غلام علی آزاد بلگرامی، سرو آزاد (حیدرآباد، ۱۹۱۳ء) ص ۲۴۴ اور ۳۹۴
نیز ملاحظہ ہو: سبل اور نیشل بائوگرافی کل ڈکشنری، کلکتہ ۱۸۸۱ء ص ۶۹ -
نظامی بدایونی، فاتوس المشاہیر بدایوں ۱۹۲۶ء جلد ۲ ص ۳۵

[2] مہر، خطوط غالب، لاہور ۱۹۵۱ء جلد دوم ص ۲۴۵

[3] مالک رام، تلامذۂ غالب، دہلی ۱۹۵۸ء ص ۱۵۰ اور ۱۶۶

ہی کے شاگرد تھے[1] نیز یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شاہ علی احسن، احسی مارہروی مرحوم بھی انھیں سید شاہ صاحب عالم، صاحب کے پروتے تھے۔ شائق کے علاوہ حضرت صاحب عالم کے دو اور بیٹے تھے سید عالم اور مقبول عالم۔ مقبول عالم نے بھی دو فرزند اپنی یادگار چھوڑے: سید محذوم عالم آخر اور سید افتخار عالم آزاد۔ انھیں افتخار عالم کے بیٹے کا نام سرور عالم تھا جو اردو حلقوں میں سوامی کے تخلص سے مشہور ہوئے۔ بلگرام کے سادات کی جو شاخ مارہرہ ضلع ایٹہ میں بس گئی تھی، سوامی کا تعلق اسی سے تھا۔ وہ اگست ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں لکھنیاں، پہیلیاں اور دوہے کہنے کا رواج تھا ان کی طبیعت بھی اسی رنگ پر آ گئی اور بڑے ہو کر گیت وغیرہ کہنے لگے۔ گذر اوقات کے لیے موروثی جائداد کافی تھی لیکن کچھ مدت نگریا شوگر مل سے بھی وابستہ رہے۔ مارہرہ میں اپنے مکان کے سامنے ایک کٹیا بنوائی تھی جو اُن کے تخلص کی رعایت سے سوامی جی کی کٹیا کہلاتی تھی۔ اپنے عقیدت مندوں سے یہیں ملتے اور کلام سنا کر انھیں محظوظ کیا کرتے تھے۔ لیکن آخر عمر میں اعصابی امراض کا شکار ہو گئے اور ان کی ایک بچی کلام پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ بالآخر فالج سے ۱۰۔ نومبر ۱۹۶۰ء کو ماہرہ ہی میں انتقال فرمایا۔ افسوس:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

سوامی مارہروی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی سے ایک ایک لڑکا اور دو لڑکیاں اور دوسری سے دو لڑکیاں حیات ہیں[2]۔

سوامی نے شاعری گھریا ورثہ میں پائی تھی۔ دادھیالی اور ناخیالی دونوں طرف کے اجداد میں شعر و سخن کا ذوق پشتوں سے چلا آتا تھا۔ چناں چہ سوامی نے باقاعدہ طور پر کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ شعر و شاعری سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ لیکن گیتوں کی شکل میں انھوں نے جو سرمایہ اردو کو دیا، بڑا وقیع ہے۔ ان کی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ "سوامی درشن" کے نام سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا اور اتر پردیش سرکار نے اس پر انھیں انعام بھی دیا تھا۔

ان کے گیتوں کا مطالعہ کرتے ہوئے سب سے پہلی چیز جو متاثر کرتی ہے، زبان و بیان پر ان کی غیر معمولی قدرت ہے۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو ایسی بے تکلفی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں گویا کوئی سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ ان کی زبان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اردو آمیز ہندی ہے یا ہندی آمیز اردو ہے، الفاظ کے ساتھ کھیلنا ہوگا۔ ان کی زبان بس گیت کی زبان ہے۔ نرم رواں، میٹھی اور دیہاتی زندگی کی سانسوں میں بسی ہوئی زبان! اس میں کہیں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کہیں پھیکی سیٹھی یا زوردار اور مشکل بھی نہیں۔ بس سادہ، سہل اور رسیلی، جیسے لوک گیتوں کی زبان ہوتی ہے، جس میں کسی صناعی یا ذہنی کاوش کو دخل نہیں اور جو جذبات کا سہارا پا کر دل کے بھر نے سے پانی کی دھار کی طرح خود بخود چھوٹ نکلتی ہے۔

ان کے گیتوں کا دامن وسیع ہے ان کی نظر گاؤں کے کھیت کھلیان اور تال تلیوں سے لے کر شہر کے کارخانوں اور مزدوروں کے جھونپڑوں تک گئی ہے یکجا ہر جگہ یہی احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے پامال راستے سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی ہے۔ گیتوں کا ازلی اور ابدی موضوع پریم رس ہے۔ سوامی مارہروی نے بھی برہن کے آنسو گیتوں میں پروئے ہیں۔ پپیہے سے دکھ درد بانٹا ہے، برکھا کے چھینٹے اڑائے ہیں، چیت چور کی گھاتوں کا گلہ کیا ہے لیکن مخصوص سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ۔ پریم رس سے متعلق ان کا گیت "کس کی ہے آواز" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس میں ایک برہن کی آدھی رات کے وقت کی ذہنی کیفیت بیان کی گئی ہے اور جرأت دلگشتگی کا وہ منظر دکھایا گیا ہے جب خود، غیر خود کی کشمکش میں اس حد تک محو ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات ایک نقطہ پر مرکوز معلوم ہونے لگتی ہے "عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا" ہر لحاظ سے یہ گیت "بلائے جاں" ہے،

دیکھ تو آدھی رات کے مارے
کون کھڑا ہے تیرے دوارے؟

---

[1] مالک رام، تلامذۂ غالب، دہلی ۱۹۵۵ء، ص ۱۹۳ اور ۱۹۶

[2] سوامی مارہڑی کے بنی حالات راقم الحروف کی فرمائش پر اُن کے بھانجے جناب سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے عنایت فرمائے، جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

کس کی ہے آواز ؟
کون یہ بولا پیار کی بانی ؟ تڑپ اٹھی ہیں آدھی رات
پیاروں کی جوالائیں چھوٹیں
پگلے من آشائیں جاگیں
دھک دھک جیرا ہل چل ڈارے پیل اٹھی آنسو کی دھار
آکاش اڑی
پاتال سمائی
پون بنی .... بدراسی چھائی
دشا دشا میں ڈھونڈ پھری چت چور
دیکھ تو او مدھ ماتے ہردے !
کون کھڑا ہے تیرے دوار سے ؟
کس کی ہے آواز ! ؟

خود کلامی کا یہ نغمہ روح کی گہرائیوں سے نکلا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے جمالیاتی احساس کی اس وجدانی کیفیت کو جو حواس کے ماورا ہے، الفاظ کے شیشے میں اتار لیا ہے یہی وجہ ہے کہ گو اس گیت کا موضوع پریم رس ہے لیکن اس میں شانت رس کی بالیدگی بھی ملتی ہے۔ اپنی انھیں خوبیوں کی بدولت ہمارے نزدیک یہ سوامی کا بہترین رمزیہ گیت ہے۔ لیکن ان کا فن رمزیہ گیتوں تک محدود نہیں، انھوں نے بعض اچھے بیانیہ گیت بھی لکھے ہیں "سندر کھڑائی" میں انھوں نے پنگھٹ کو جانے والی ناری کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں ان کی قادر الکلامی پوری طرح ظاہر ہے۔ طرز ادا کی ندرت، مصرعوں کی برجستگی اور لہجے کی شگفتگی نے سارے منظر میں جان ڈال دی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی نوبہار نازنین کی آمد سے زندگی خود بخود گنگنانے لگی ہے :

اک نار انیلی، البیلی، ات سندر روپ، لٹیں لٹکی
جیوں شیش جھانکے جھل مل بدلی، تیوں اوٹ لیے گھونگھٹ پٹ کی
کچھ ہکی سی گت گاتن کی، انگ پھول کھلے، کلیاں چٹکی
کر سائیں نینن تیر بھرے، اترات چلے، بھکی بھٹکی
تیس ہاتھ کی ہاتھ میں سیج لے اور شیش دھر کوری مٹکی
ابھمان گمان سوں جاوت متی وہ پنگھٹ نے دھر پن گھٹ کی

آکاش پری کی جھلکی سوں، پاتال کی جسل پریاں ٹھٹکی
پاتال میں اک بھو چال اٹھی، جیوں جل میں مٹکی ٹے پٹکی
موری پیاس میں آدھے پیاس اٹھی، کوئی امرت گھنٹ ترشا ناکی
نیک پریم جلی سے گھونٹ پیا، موری اگن بجھا ہر دے تٹ کی
سمتی بنڑی، جھجکی، جھڑکی، وہ دیکھ موہے من میں کھٹکی
پھر موہ کے جار میں پھانس موہے، منات بھئو گھر کو سٹکی

انھوں نے وطن کی محبت سے سرشار ہو کر بھی گیت لکھے ہیں پھر پھر اڑے ترنگا " میں انھوں نے آزادی کا سواگت کیا ہے لیکن وطن کی موجودہ حالت سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ ان کی شاعری میں پچھلے بیس پچیس برس کے ہندستان کی سیاسی جد وجہد اور سماجی کشمکش کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ وہ گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر رہے۔ ان کی شہادت پر انھوں نے ایک پُر درد نوحہ بھی لکھا لیکن غالباً وہ گاندھی واد کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکے۔ انھوں نے جذباتی سطح پر اشتراکیت سے بھی اثر قبول کیا ہے۔ "مٹکے کا یہ مزدور" " شانت سندیش" اور " ایسے ہیں ہم لوگ " اسی قسم کے گیت ہیں۔ مگر یہ ان کی ذہنی افتاد سے مطابقت نہیں رکھتے، اس لیے ان میں خلوص کے باوجود شعریت نہیں پیدا ہو سکی۔ ان کا رنگِ سخن دراصل سماجی گیتوں میں نکھر کے سامنے آتا ہے یہی ان کا خاص میدان ہے، جس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ سوامی کے سماجی گیت ہندستانی زندگی کے شہری اور دیہاتی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ ان میں متوسط طبقے کی بے بسی، سرمایہ داروں کی بے مہری اور عوام کی مظلومیت اور رجعت کی داستان نئے عنوان سے بیان کی گئی ہے۔ انھوں نے گاؤں کے لوگوں کی سادہ لوحی، معصومیت اور سریع الاعتقادی کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ مذہب کی اجارہ داری اور ظاہر پرستی کا پردہ چاک کیا ہے۔ وہ اس مذہب کے خلاف ہیں جس کے نام پر ملا اور پنڈت عوام کو دھوکا دیتے ہیں اور جو ظلم اور ریاکاری میں سرمایہ داری کا سب سے بڑا معاون ہے :

مسجد بھیجے اللہ بند اور الیشر قید شوالوں میں
سورگ پہ قبضہ پنڈت جی کا، جنت اللہ والوں میں

پڑگئی رام کی اپنے آنی، رام بھینے بنجاروں میں
شکتی کے یہ ٹھاٹھ بھی دیکھے سورکھ دھرتی داسوں میں

کون کسی کا ایشر اللہ، کون کسی کا بندا ہے
کون یہ اوچپا پھندا ڈالے، دھرم کا جھوٹا دھندا ہے،

لیکن مذہب پران کی تنقید محض معاشی یا اقتصادی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اس کی بنیاد اخلاقی قدروں پر بھی ہے۔ ان کے نزدیک اصل مذہب نام ہے عرفانِ نفس کا:

مسجد سونی، مندر ویراں، کوئی گھر آباد نہیں
پنڈت بے کل اپنی دُھن میں، ملا بھی دل شاد نہیں
آن جانا اک بھید بتادوں، بات یہ بے بنیاد نہیں
دونوں ہیں جڑ مول سے کھوکھل، سُورگ کی بنیاد نہیں

الٹے سیدھے بندوں سے تو الٹا سیدھا کام نہ لے
اپنے آپ کو جن پہچانے رام کا سورکھ نام نہ لے

سرمایہ و محنت کا تضاد ان کے سماجی گیتوں کا مرکزی موضوع ہے۔ زرداروں کی فریب دہی، بے ایمانی اور ستم پروری کو انھوں نے شاعر کے دل سے محسوس کیا اور مصور کے موقلم سے صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے۔ "کرشک بنتی" "بھگوان تو ان میں کوئی نہیں" اور "سوالگت پتر" میں وہ سماجی بے انصافیوں کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "دورنگی متا" میں وہ بھارت ماں سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کوئی ماں بھی اونچ نیچ کے فرق سے کسی کو پوت اور کسی کو کپوت سمجھ کر جنتی ہے:

سن سن ری او بھارت ماتا! تو کیوں جنی کپوت
کوکھ میں تیری او متوارن! کہاں سے آئے چھوت اچھوت
چھل کھیلت تو بے لاج نہ آئی گھر انگنائے دورنگی
گورے گورے ٹھاکر بینا، کالے کالے سب بھنگی
واہ رے تیری متا ماتا! واہ رے تیری آدر بات
کاہو کا ہو کپی کپی، کاہو دودھ بلیدا بھات

ان کی سماجی حقیقت نگاری کا شاہکار "دھوبن کا گیت" ہے۔ اس میں الفاظ کے رس اور خیال کی لطافت نے مل کر ایک پُرکیف خناثیت پیدا کردی ہے۔ اس کے ہلکے سروں میں محنت کش لوگوں کے لئے الطرپن، ان کی معصومیت، فاقہ مستی، جگر داری اور تسکین و توکل کی عادت کو ایسے پُرتاثیر لہجے میں بیان کیا گیا ہے کہ بالواسطہ طور پر اونچے محلوں والوں کی لذت کوشی، عیش پسندی اور ہوس پرستی سے نفرت ہونے لگتی ہے اور دل میں محنت کی عظمت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے تین بند روزمرّہ زندگی سے متعلق ہیں ان میں سوآتی کی فن کارانہ منظر کشی بھی ملاحظہ طلب ہے۔

ہر ہر بایا ہر ہی وام — کیسا پیسا اور چھدام
رام سمرو سے من کو تھام — ہر ہی بٹائے بگڑے کام
چادروں کھونٹ ہے ایک نام — بھج لے بھئی ہر کا نام

چھیو رام ..... چھیو رام

باندھی لادی، لادا بیل — دھونے چلی ہوں میل کچیل
کرمن کھونڈی دھوپ کی ٹیل — چل رے ناویا اپنی گیل
پیٹ کرائے کیا کیا کام — بھج لے بھئی ہر کا نام

چھیو رام ..... چھیو رام

بھیگی بھیگی کالی رتیاں — جگر مگر آکاش تریّاں
ٹھنڈے جل کی تال تلیاں — گیلے کپڑے گوری بہیاں
دو زیبی ہے اپنا کام — بھج لے بھئی ہر کا نام

چھیو رام ..... چھیو رام

آگے چل کر چشم سخن سے عرشِ معلیٰ پر رہنے والوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اجگر اجگر سیٹھ سٹھانی — راجوں کے رنواسوں کی رانی
لاکھوں سیانے پیدا موں گیانی — سب کی دیکھی الٹی بانی
شوبھ کریے سو رام کا نام — بھج لے بھئی ہر کا نام

چھیو رام ..... چھیو رام

مندر مندر بیٹھے پجاری — دھرم آشرم بیڑا دھاری
دھوآں دھوآں پریم بھکاری — ایک ہی بن کے سب ہیں شکاری
من میں پاپ اور منہ پر رام — بھج لے بھئی ہر کا نام

چھیو رام ..... چھیو رام

خاکدان ارضی کی سب سے نچلی سطح پر رہنے والی دھوبن اپنی محنت میں تسکین کا پہلو تلاش کرتے ہوئے کہتی ہے:

موہنی مورت چھیل چھبیلے　　آنکھ میں جادو ہونٹ رسیلے
بانکے ترچھے رنگ رنگیلے　　دامن سب کے داغ گیلے
اُجل کرنا اپنا کام　　بھج لے سجنی ہر کا نام

چھیو رام ..... چھیو رام

مفلس اور نادار کی اصل پونجی محبت، خلوص اور ایثار ہے جس کی قیمت پر بھی وہ ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں :

ان گیری کی سیکھ نہ لیجو　　اپنی پرائی لیکھ نہ دیجو
پریم کی پونجی جیک نہ دیجو　　پت پوچھن میں جیکھ نہ دیجو
من کے شوالے بتیا شیام　　بھج لے سجنی ہر کا نام

چھیو رام ..... چھیو رام

سوامی کی نظر ہندستانی عورت کی بے بسی اور گھر گرہستی کی بے رحم اور فرسودہ روایات پر بھی گئی ہے اور اسے بھی انھوں نے اپنی سماجی حقیقت نگاری کا نشانہ بنایا ہے۔ مشترکہ خاندان میں جہیز دیوں سے ساس کے ہر وقت غضب کا شکار رہتی ہے۔ ملاحظہ ہو، سوامی نے ہندستانی ساس کے لچھن کیسے شاعرانہ کمال سے بیان کئے ہیں :

بہکائے یو للنا کو اپنے گجب بھری ساسلیا موری
ہنسنی بجری، بولنا جادو، گھٹ گھٹ میں چترائی
گورے چام چمکتی ناگن، لبس مدھ میں لہرائی
پورب گرجے، پچھم برسے، چپال چلے پروائی
ات کے میٹھے بول میں ساسل پاچھے سے کڑوائی
جھنڈ لائے یو للنا کو مورے گجب بھری ساسلیا موری

پھیر چھوٹا، ناتے ٹوٹے، چھوٹے مورے بھاگ
ساسل گھر سانولیا چھوٹے، داگ پہ لاگو داگ
آپ ہی جالو چھونس بٹوریں، آپ لگاویں آگ
چورسے کہہ دئی چوری کرے، ساہ سے کہہ دئی جاگ
دیکھائے یو سجنا کو مورے گجب بھری ساسلیا موری
بہکائے یو للنا کو اپنے گجب بھری ساسلیا موری

ایک اور گیت "ستو کی ماری ایک دوانی" میں انھوں نے ساس کے علاوہ نند اور دیورانی کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے :

گھونگھٹ پٹ کی لاج لگائے، چار دنا بھئے ساسرے آئے
نندل بیرن بولے بولے، دھرو ھرساسل دانت پیسائے
جیٹھی نندیا بڑی درانی، کمنوے لے رار مچائے
آدے کا آدا ایسا بگڑا، کوڈ نہ میری دھیر بندھائے

سوامی نے کچھ دوہے بھی لکھے ہیں۔ ان کا لطف انھیں بلا تبصرہ پڑھنے میں ہے :

پانی نینا بدھنا جانے، پیری ہیں کہ پچور
آپ ہی دھیرا گ لگاویں، آپ بجھاوت شور
مورکھ بیرا نار ی لکھے، منا پانچے پو تھی
ہردے بیچ کو ڈ نہ جانے، وِدیا سب کی تھوتھی
نین روگ اچیرن لاگو، ہردے لاگی پھانس
روم روم بلکت نائے بنے دی، لاج کی لاگی دھانس
پریم کا دیوا، پریم کی باتی، پریم کا لاگو تیل
پریم کی اگنی، پریمی پھونکے، پریم کا دیکھو کھیل
بھنور گپھیری رین اندھیری، آس کی ہلتی ڈور
دھیرے دھیرے آری نندیا، سنگ لگی ہے بھور
ارے باورے مدھ ملتے ہرے! اب تو مورکھ جاگ
دیکھ تو، ٹھ کے کس بیری نے، گھر میں دے دئی آگ
گھونگھٹ اوٹ کروں میں گت لنگ کن کو یسوں تھام
اک لنگ موہے پریتم ٹھاڑے، اک لنگ ٹھاڑے رام
پیا پیا کی سمرن ہووے پپیہو پیہو کی کوک
اپنی اپنی اگن ہے یہ اپنی اپنی ہوک

سوامی نے ہندی قطعوں کا تجربہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ قطعہ اپنی جنم بھومی مارہرہ سے متعلق نہایت دل چسپ ہے :

سوامی ناؤں بچار کے جنم لیو ُ وا گاؤں
رشیوں کا جو دیش ہے مارہرہ ہے ناؤں
واہی سشچھ استھان میں سودت شاہ برکات
اُسی بروا کی ڈار ہم چپکے چپکے پات

مور لگا یُوگیان کوں، لابھ بھیو بھرپور
سو وُو اب آنند سوں، برسے چھاجوں نور

غرض قطعہ ہو، دوہا ہو، گیت ہو، سوامی مادھوداس نے جس صنف میں بھی قلم اٹھایا، اسی کا حق ادا کر دیا۔ جدید دور میں گیت کی بازیافت کا سہرا عظمت اللہ خاں کے سر ہے، لیکن اردو میں گیت کی روایت اتنی ہی قدیم ہے، جتنا امیر خسرو، خواجہ بہاء الدین اور سید برکت اللہ بیتی بگرامی کا کلام۔ سرزمینِ بلگرام سے ایک سے ایک بڑھ کر ہندی شاعر اٹھا ہے۔ اور سوامی مادھوداس بھی علم و ادب کے اسی قدیم سرچشمے سے فیض یاب ہوئے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اردو شاعری کی دنیا میں کیسے کیسے انقلاب آئے اور تقریر و ترقی کے نام پر کیا کیا دھوم مچائی گئیں۔ لیکن سوامی مادھوداس نے ان آندھیوں میں بھی اپنے چراغِ فکر کو برابر روشن رکھا اور نہایت خاموشی، یکسوئی اور دل سوزی سے گیت لکھتے رہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے اپنے ذہن کے دریچوں کو کھولا ہی نہیں۔ ان کے کلام میں جدید نظریوں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن کوئی بھی تحریک یا نظریہ ان کے قدم اکھیڑ نہ سکا۔ انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد روایت پر رکھی ہے۔ ان کے گیتوں میں شانت رس کی پراسرار ماورائیت، چاندنی کے سائے، پریم رس کی پھوہار اور برہ کی پکار سبھی کچھ ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے حال کی پیچیدگی اور مستقبل کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انھوں نے خوبیوں سے دکھ درد بانٹا، سماج کے ناسوروں پر انگلی رکھی اور محنت کش عوام کے دل کی دھڑکنوں کو گیتوں کی زبان بخشی۔ سوامی کے گیت اردو شاعری کا عزیز ورثہ ہیں۔ اور جب تک اردو میں گیت کی اہمیت محسوس کی جاتی رہے گی، سوامی مادھوداس کے گیتوں کی مہک سے مشامِ جاں معطر رہیں گے۔

---

مضمون نگار حضرات سے التماس

از راہِ کرم کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھئے

# غزل

اشکِ خونیں آنکھ سے ڈھلکا — شاید دل کا ساغر چھلکا
شاہدِ رنگیں حسن سراپا — جیسے مطلع میری غزل کا
اصل میں تو اے جانِ بہاراں — شہ پارہ ہے حسنِ ازل کا
رنگ چرایا ہے بادل نے — تیرے نینوں نے کاجل کا
اُجلا رُخ اور شعلۂ عارض — آگ میں جیسے پھول کنول کا
قوسِ قزح میں کچھ ملتا ہے — چہرہ رنگ بھرے آنچل کا
تجھ کو دیکھے عرصہ بیتا — نشہ ہے اب تک ہلکا ہلکا
زیست ہے کانٹوں کا اک جنگل — فرش نہیں ہے یہ محفل کا،
جو پتھر سے گھبراتا ہو — خواب نہ دیکھے شیش محل کا
آج کے غم سے جب نہیں فرصت — کون کرے غم گذرے کل کا
حسنِ قسمت کہتے جس کو — نام ہے اپنے ذوقِ عمل کا
نورِ سحر روپوش تھا جس میں — چھٹنے لگا ہے اب وہ دھندلکا
مشربِ اردو مجموعہ ہے — آبِ زمزم و گنگا جل کا

اس میں ہر شے ملتی ہے منشا
کتنا کھلا دامن ہے غزل کا

# پہلگام

رنگین سحر اور حسیں شام کا منظر　　اسپانِ سبک سیر و سبک گام کا منظر
خاموش مکانوں کے در و بام کا منظر　　ٹھہری ہوئی اک گردشِ ایام کا منظر
سرمایۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر

یہ وادیٔ لدّر ہے کہ اک شاہدِ رنگیں　　اک قصۂ صد ناز اک افسانۂ تمکیں
رہنے نہیں دیتا غمِ دنیا و غمِ دیں　　اس لعبتِ گل پوش و گل اندام کا منظر
سرمایۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر

لدّر ہے کہ مرد نگ ہے فطرت کی پری کا　　کیا نغمہ خوش آہنگ ہے فطرت کی پری کا
جلوہ ہے کہ نیرنگ ہے فطرت کی پری کا　　گرد اس کے ہے دیوانِ سیہ فام کا منظر
سرمایۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر

دنیا سے الگ شام و سحر دیکھ رہے ہیں　　اس حسن کو اربابِ نظر دیکھ رہے ہیں

ہر گوشۂ عالم کے بشر دیکھ رہے ہیں　　سیّاحوں کی اس رہگزرِ عام کا منظر

سرمایۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر

اک سمت میں خیمے ہیں تو اک سمت میں اشجار　　ہے بیچ میں لِلّہ طرب افزا و طرب کار

اک شاعرِ دیوانہ ہے مستِ مئے اشعار　　یا مے کدۂ حافظ و خیام کا منظر

سرمایۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر

سیٹی سی ہواؤں میں وہ جھرنوں کی چھما چھم　　بالائے سرِ کوہ وہ اشجار کے پرچم

اک نقطے پہ ملتے ہوئے دو سلسلے باہم　　آغاز سے بھی خوب ہے انجام کا منظر

سرمایۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر

دل میں تھا مرے ہمہمۂ جذب و اثر جب　　مہ طلعت و مہ پارہ تھی اک پیشِ نظر جب

پل پر تھا کھڑا عرشؔ میں با دیدۂ تر جب　　بھولے گا نہ ہرگز مجھے اس شام کا منظر

سرمایۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر

وجاہت علی سندیلوی

# غالب کے شریک غالب

اِدھر کئی مہینوں سے مکان کی تلاش میں شہر کے بہت سے حصّوں اور گوشوں کی خاک چھانی تھی اور کئی محلّوں کی آب و ہوا کو نمونے کے طور پر چکھنے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ جس طرح ہر گلی کے لئے کم سے کم ایک کم تول پنساری، ایک گھر کا شیر کتّا، ایک لڑاکا ساس، ایک بدزبان بہو، ایک نصیحت کرنے والے بزرگ، ایک فیضجت پی جانے والا رند، اور حواجۂ ضروری سے فارغ ہوتے ہوئے بہت سے بچّوں کا ہونا لازمی ہے اُسی طرح کسی نہ کسی بھیس میں ایک ماہرِ غالبیات کا ہونا بھی لازمی ہوتا ہے اور بغیر اس کے گرد و پیش کا جغرافیہ کچھ ادھورا رہ جاتا ہے۔

اچھا بھلا ایک مکان مل گیا تھا لیکن ابھی اس میں منجملہ اسبابِ پیرانی میرا پٹّا ہوا بستر بھی ٹھیک سے کھلنے نہ پایا تھا کہ محلے کے ماہرِ غالبیات نے نہیں معلوم کیسے سونگھ لیا کہ میں سخن فہم نہ سہی غالب کا طرفدار ضرور ہوں اور مجھے اپنی "غائبانہ گرفت" میں ایک "عیدِ نو" کی طرح جکڑ لیا۔ آتے ہی آتے انھوں نے غالب کے متعلق دو چار حیرت انگیز انکشافات کے بعد مجھے پھانسنے کے لئے ایک آدھ ہلکا پھلکا سوال کر دیا۔ اب میری حماقت ملاحظہ ہو — کہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو بہت بڑا غالب فہم سمجھتا — میں نے ان کو نرم چارہ سمجھ کر اُن پر دو چار منھ مار دئے یا یوں سمجھ لیجئے اُن کی دُم پر پیر رکھ دیا یعنی اُن کے سامنے غالب کو اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے پیش کرنے کی سعیِ لاحاصل کر بیٹھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں کسی بارود کے خزانے کے قریب دیا سلائی جلانے کی کوشش کر رہا ہوں؟ پھر کیا تھا "آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں" "یہ کیا کہہ ماہرِ غالبیات چھٹ ہی تو پڑے مجھ پر! اور میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے فنِ غالبیات کی ایسی ایسی توپوں اور آتشی فشانوں کے دہانے کھول دئے کہ میں سراسیمہ، مبہوت اور ششدر ہو کر ہمیشہ کے لئے جھک کر بیٹھا کہ آئندہ کسی اجنبی بزرگ کے سامنے حضرت غالب کا نام اپنی زبان بے لگام سے ہرگز ہرگز نکلنے نہ دوں گا۔

دوسرے ہی دن سے ماہرِ غالبیات نے "آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں" کے عنوان سے میری باقاعدہ تعلیم شروع کر دی۔ سویرے میں بستر ہی پر ہوتا کہ وہ "لذتِ خوابِ سحر" پر دھاوا بولتے "آپ ہو نہ چکے تو پہلے غالب کے کچھ انتہائی سنگلاخ اشعار پڑھ کر ان کے معنی مجھ سے پوچھتے گویا میرا آموختہ سنتے اور پھر قبل اس کے کہ میں ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نکال پاؤں وہ "آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں" فرما کر ان کے معنی اور مطالب خود بیان کرنا شروع کر دیتے اور پھر اپنی "گل افشانیِ گفتار" سے جدّت آفرینی، حسنِ تخیّل، لطفِ بیان، شکوہِ الفاظ بلند پروازیِ، ندرتِ کلام بلکہ پھانس کو یاس اور رائی کو پہاڑ بنانے کے ایسے ایسے "گل کرتے" کہ میرے لئے "صاعقہ و شعلہ و سیماب" کا عالم ہو جاتا اور وہ خود اس شعر کی مجسّم تفسیر بن کر رہ جاتے ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اور پھر نوبت یہاں تک پہونچتی کہ میں داڑھی بنا رہا ہوں اور وہ غالب کا فلسفۂ حسن سمجھا رہے ہیں - میں کنگھا کر رہا ہوں اور وہ آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہوتے' میں مسلۂ ارتقاء و پیدائش پڑھتے دیکھ رہے ہیں - میں کپڑے بدل رہا ہوں اور وہ ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا' پڑھ پڑھ کر اور گا رہے ہیں کہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا لگا کر غالب کو ہندوستان کا سب سے پہلا انقلابی ثابت کر رہے ہیں - میں جوتے کی ڈوریاں باندھ رہا ہوں اور وہ 'بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے' والے مصرع سے فضائے آسمانی پر اسپٹنک چھوڑ رہے ہیں - میں ناشتہ کر رہا ہوں اور وہ "مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو" کہہ کر غالب کے علم الغذا پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں کہ میرے منہ کا نوالہ حلق میں جانے سے انکار کر بیٹھتا ہے - میں دفتر جانے کے لئے سائیکل نکال رہا ہوں اور وہ غالب کا فلسفۂ عمرانیات بیان کر رہے ہیں - میں سائیکل پر بیٹھ چکا ہوں اور وہ شام کو دفتر سے میری واپسی پر غالب اور ضبطِ تولید کے موضوع پر اپنے تازہ ترین الہامات کو مجھ پر نازل کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں -

شام کو ظہور پذیر ہوتے تو غالب اور دوسرے شعراء کا موازنہ شروع فرما دیتے اور غالب کے منہ لگے والے دیگر تمام شعراء کو گردن زدنی قرار دے کر بھی جب تسلی نہ ہوتی تو غالب کے مختلف شارحین کا پہلے سرکس پھر کشتی شروع کرا دیتے اور کافی دھر پٹخ کے بعد جب ہر شارح کافی پست ہو چکتا تو خود بھی اکھاڑے میں کود پڑتے اور فرداً فرداً ہر شارح کو پچھاڑتے اور پھر ہر شرح کے منطق اپنی ایک انوکھی، اچھوتی اور عجوبۂ روزگار شرح کا آغاز کر دیتے جس کا انجام غالباً اس وقت تک نہ ہوتا جب تک میں اپنے ہوش و حواس کی قید و بند سے نجات پاکر وہاں نہ پہونچ جاتا جہاں سے خود مجھ کو میری خبر نہ آتی، یعنی بالکل ہی بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر نہ جاتا -

میں اکثر خواب میں دیکھتا کہ حضرتِ غالبؔ اپنا دیوان بغل میں دبائے بے تحاشہ چیختے ہوئے بھاگ رہے ہیں "بچاؤ! بچاؤ! مجھے میرے شارحین اور ماہرین سے بچاؤ" اور ان کے پیچھے شارحین، ماہرین اور پرستاروں کا ایک غولِ بیابانی ان کا تعاقب کر رہا ہے جس کی قیادت ایک ڈنڈا لئے میرے محلے کے ماہرِ غالبیات کر رہے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے بھی ایک زنجیر میں باندھے گھسیٹ رہے ہیں -

کئی دفعہ تکلف برطرف کر کے ان کی منت سماجت کی، ہاتھ جوڑے، داڑھی میں ہاتھ دیا، کان پکڑ کر اُٹھا بیٹھا اور حرفِ مطلب یوں زبان پر لایا کہ اے ماہرِ غالبیات آپ کو آپ کے حضرت غالب مبارک! مجھ مغلوب کو میرے ہی حال پر چھوڑ دیجئے تو آپ کی غالبیت میں کون سا بٹہ لگ جائے گا؟ میں ایک گدائے بے نوا ہوں، احمق، جاہل اور بیمار ہوں - میرے ایسے ذرۂ ناچیز کو غالب ایسے آفتابِ عالم تاب سے کیا نسبت؟ میں حضرت غالب کا صرف اس قدر گنہگار ہوں کہ عالمِ طفولیت میں ایک مولوی صاحب نے اسکول میں کورس کی کتاب سے ان کی چند غزلیں زبردستی پڑھا دی تھیں - اس کے علاوہ مجھ سے قسم لے لیجئے جو میں نے کبھی انھیں ہاتھ بھی لگایا ہو اور ہاتھ لگاتا بھی خاک - ہاتھ آئیں تو ہاتھ لگائے نہ بنے! غالب کو میں کیا میری سات پشتیں بھی نہیں سمجھ سکتیں - میں نہ انھیں سمجھا ہوں نہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں - آپ بے کار میرے ہوش و حواس پر چاند ماری گویا بنجر زمین میں تخم ریزی اور آبیاری کرتے ہیں - نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا اور میرے بیوی اور بچے آپ کو اور مرزا غالب کو کوستے پھریں گے -

لیکن ماہرِ غالبیات بھلا کب ماننے والے تھے؟ میرے اظہارِ بے چارگی سے ان کی ہمدردی میں اور بھی چار چاند لگ جاتے اور فرطِ تمکنت سے ان کے گلے کی رگیں پہلے سے بھی زیادہ پھولنے لگتیں" ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے؟ دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور! آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں! اے ولیفاوہ رنفر شاہد باز! " اور یہ فرمانے کے بعد وہ غالب کے متعلق اپنی تحقیق اور دریافت کی گولہ باری مجھ پر

کچھ اور تیز کر دیتے مجھے کبھی اگر اونگھتا یا حواس باختہ دیکھتے تو چونکا کرنے کے لئے مجھ پر دو چار انتہائی زلزلہ انگیز سوالات داغ دیتے۔ "غالب کے نظریۂ فلکیات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کے ماتحت 'مہ نخشب' کے ساتھ 'دستِ قضا' نے کیا برتاؤ کیا تھا؟" "غالب نے قدرتی مناظر سے جو نفسیاتی موشگافیاں کی ہیں اس سے ان کے تحت الشعور کی کس بلندی کا پتہ چلتا ہے؟" "غالب کے سماجی شعور میں سیاسی اور اقتصادی بلوغیت کب اور کیسے پیدا ہوئی؟" وغیرہ وغیرہ۔ میں بجائے ان سوالات کا جواب کیا دیتا؟ میں مجبوراً ماہرِ غالبیات کی طمانیتِ قلب کے لئے آنکھیں پھاڑ کر منھ کھول دیتا اور ان کی خواہش کے مطابق انھیں اپنے حیرت زدہ ہونے کا پورا پورا یقین دلا دیتا لیکن دل ہی دل میں سوچتا کہ اگر میں اپنی سماجی بلوغیت کو کام میں لاتے ہوئے اپنا وزنی قلمدان ماہرِ غالبیات کے تحت الشعور پر پوری قوت سے پٹخ دوں تو یقیناً ان پر فلکیات کے بہت سے طبق روشن ہو جائیں گے۔

بس کیا عرض کیا جائے کہ کس طرح عاجز اور پریشان کر رکھا تھا ان ماہرِ غالبیات نے؟ ان سے جان چھڑانے کے لئے بیسیوں ترکیبیں کیں۔ محلے کے بااثر لوگوں کا دباؤ ڈلوایا۔ گمنام خطوط لکھے۔ ایک انسپکٹر پولیس سے ان کے خلاف کوئی فرضی مقدمہ چلانے کی فرمائش کی، بیماری کا ڈھونگ بنایا۔ بہرے بنے (تو اتفاق دو نا ہو گیا) دوستوں کے گھر جا کر پناہ لی، گھر کے دروازے بند کرائے۔ ذکر کو ہدایت کی کہ "ہر چیز کہیں کہہ ہی نہیں ہے!" لیکن اجی تو یہ بھجے ——

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں! ماہرِ غالبیات مجھے نہ پاتے تو گھنٹوں غالب کا کوئی شعر اور اس سے متعلق ایک نئی داستانِ ہوشربا اپنے اوپر طاری کئے ہوئے میرے دروازے کے سامنے گلی میں ٹہلا کرتے اور جب تک مجھے گھر جاتے یا گھر سے نکلتے گرفتار کر کے مجھ پر یہ شعر صادق نہ کر دیتے دم ہی نہ لیتے ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

ان حالات میں اسے چاہے میری بدذوقی کہیے یا چاہے

اقدامِ قتل سے گریز۔ کہ جیسے ہی مجھے ایک دوسرا مکان ملا جو اگرچہ میرے پہلے مکان کا صرف نصف بہتر معلوم ہوتا میں رسیاں تڑا کر بھاگا۔ ماہرِ غالبیات سے میں نے کہہ دیا کہ میں شہر کیا صوبہ چھوڑ رہا ہوں اور وہ مجھے آبدیدہ ہو کر رخصت کرنے آئے تو بڑے رقت انگیز لہجے میں فرمایا "آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں۔" اور اگر میں "شرم تم کو مگر نہیں آتی" یا چیخیتا اور طعلی سے تانگے والا اس کا مخاطب اپنے آپ کو سمجھ کر فوراً تانگہ بانک نہ دیتا تو یقیناً ماہرِ غالبیات مجھے ایک فی البدیہہ الوداعی جلاب دئے بغیر ہرگز نہ مانتے!

اپنے ان جان لیوا ماہرِ غالبیات سے چھٹکارا پا کر مجھے جو مسرتِ بے پایاں حاصل ہوئی اس کا اظہار غالباً بغیر ضروری ہے

ع مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

مکان تبدیل کرنے کے سلسلے میں اپنا ایک مکان سے انتہائی بدحواسی اور سراسیمگی سے باندھا ہوا سامان جب دوسرے مکان میں کھولا جاتا ہے تو کہیں سے ٹوٹ کر لائے ہوئے مالِ غنیمت کا لطف آ جاتا ہے اور اس میں سے ایسے ایسے حیرت انگیز انکشافات نمودار ہونے لگتے ہیں کہ ناطقہ سر بگریباں ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرا وہ آئینہ جس کو میں نے یقیناً کسی بہت محفوظ جگہ بڑی احتیاط سے چھپا دیا تھا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ ان تھک تلاش و جستجو کے بعد بھی ہاتھ نہیں لگتا ہے لیکن نگار کا وہ جوتا جس کے متعلق یقینِ کامل تھا کہ دو ہفتے ہوئے کھو چکا ہے، چنانچہ اس کے جوڑی دار کو میں نے چلتے چلاتے ماہرِ غالبیات کے مکان کی طرف اچھال دیا تھا، ایک ڈبے سے بے سابقہ نکل پڑتا ہے۔ میں اپنے سامان سے کشتی لڑ لڑ کر اس قسم کے حوادث سے دوچار تھا کہ دفعتاً کسی نے باہر کا دروازہ بھڑ بھڑانا شروع کر دیا۔ مجھے اس وقت پیچ پر پیچ تو ملک الموت سے ملنے کی فرصت نہ تھی لیکن طوعاً و کرہاً لاحول پڑھتا ہوا لپکا اور دروازہ کھول دیا۔

داڑھی بڑھائے اور صرف بنیان اور تہمد پہنے ایک بزرگ نمودار ہوئے اور بڑی بے تکلفی سے 'سلام علیکم' کہتے ہوئے بیٹھک

ہیں داخل ہو کر ایک کرسی گھسیٹی اور اس پر اکڑوں بیٹھ گئے اور کچھ جھوم کر یہ شعر پڑھا ؎

" ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے ؟
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا ! "

مجھے مجبوراً "وعلیکم السلام" کہہ کر ایک مونڈھے پر بیٹھ جانا پڑی۔

" اسے مکان کے نئے کرائے دار آپ ہی ہیں ؟ ع
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ؟ مطلب یہ کہ "ع" آدمے نہ کیوں پسند کر ٹھنڈا مکان ہے ! "

مرزا غالب کا نابڑ توڑ کلام سننے کے بعد غصے یا مستقبل کے خوف سے میرے کان خود بخود ہلنے لگے اور بڑی مشکل سے میرے منہ سے فقط ایک "جی" نکل سکی۔

ابھی ابھی مرزا کبن صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں تشریف لانے سے قبل آپ دہلی میں رہتے تھے ع

" کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے "

" جی ہاں دو تین ماہ دلّی بھی رہا ہوں۔ کیا میرے خلاف خفیہ پولیس کی کوئی تحقیقات آپ کے سپرد ہوئی ہے ؟ "

مسکرا کر بیچ اٹھے ؎

" ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے "

میں نے ہمت کر کے دبی زبان سے عرض کیا۔ " آپ نے ابھی تک مجھے خود اپنے آپ سے متعارف ہونے کا مشرف نہیں بخشا۔"

اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولے۔

" پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟ "

اب میری بدحواسی مکمل ہو چکی تھی۔ " جی۔ آپ ؟ حضرت غالب ! "

" جی ہاں حضرت غالب ! ع ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا

میں اس وقت صرف یہ پوچھنے حاضر ہوا تھا کہ آپ دہلی میں رہے ہیں تو شہنشاہِ اقلیمِ سخن حضرت غالب سے تو ضرور ہی واقف ہوں گے۔"

مجھے جھرجھری سی محسوس ہونے لگی اور میں نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔ " جی ہاں سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار دہلی ہی میں ہے ع جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں ابھی آپ کو یہ بھی توفیق نہیں ہوئی کہ آپ اس بارگاہِ خلائق منزلت پر ع

رتبہ میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں ۔ سر عقیدت خم کر کے کم سے کم شرفِ قدم بوسی تو حاصل ہی کر لیتے۔ وہی مثل بارہ برس دلّی میں رہے اور ع سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر، بھاڑ ہی جھونکتے رہے ؟ "

میں نے بھی کچھ اس جھلاہٹ سے جواب دیا جیسے اگر میرا بس چلتا تو غالب کو ان کی خواہش کے مطابق "غرقِ دریا" ہو جانے دیتا اور کچھ نہیں تو دلّی میں ان کا مزار ہرگز بننے نہ دیتا۔ " میں مزار پر حاضر بھی ہوتا تو مرحوم تو قبر کے اندر تھے نہ کہ اوپر، میں شرف قدم بوسی کیسے حاصل کر پاتا ؟ "

کلیجہ پکڑ کے بولے " ہے ہے ! ع رکھتا ہے صدر سے کھنچ کر بلا گلے کے پاؤں ابھی آپ کو کیا خبر ؎

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی ! "

میں خاموش رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئے " کم سے کم از راہِ تعزیت آپ کو مرحوم کے بیوی۔ بچوں کے پاس تو چلا ہی جانا چاہئے تھا ع بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور "

" اب کسی روز آپ کو ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔"

میرے جواب کو سُنا ان سنا کر کے اچانک ہڑبڑائے اور میری کتابوں کے گٹھر پر جو ابھی میز پر بڑی بے ترتیبی سے رکھا ہوا تھا جھپٹے اور سب سے اوپر کی کتاب جو اتفاق سے دیوانِ غالب تھی اٹھا کر "بوسۂ بہار جلوہ" بنتے ہوئے بولے " یہ عنایت آپ کو کہاں سے

سے دستیاب ہوا ؛ ع یادگارِ نالۂ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا۔
مدت کے بعد آج ایک مسلّم دیوانِ غالب ہاتھ آیا ہے جو کسی طرح بھی مجھے مرغِ مسلّم سے کم عزیز نہیں ع
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
" بازار سے "
" بازار سے ؟ " ع اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا !
کیا بازار میں اس قسم کا بھی کلام بکتا ہے ؟ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ستر ہ اٹھارہ سال ہوئے میرے پاس بھی ایک مسلّم دیوانِ غالب تھا جو میرے ایک رشتے کے نانا میرے گھر پر بھول گئے تھے ع
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے ایک روز برخوردار جمی کی والدہ جو آگ جلانے بیٹھی ع
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے ۔ تو اس صحیفۂ دلربائی کو کچھ اس طرح پھاڑا کہ بس ع دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی ۔ یعنی دیوان کا قریب قریب ہر مصرع اولیٰ اپنے مصرعِ ثانی سے جدا ہو گیا۔
وہ تو کہئے کہ بروقت میری نظر پڑ گئی ورنہ ع
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا ۔ کا مضمون درپیش آجاتا۔
کیوں صاحب یہ لفظ خوش قسمتی پر آپ چونکے کیوں ؟ جی ہاں ع اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔"
میں نے اپنا پیٹ پکڑتے اور منہ بناتے ہوئے عرض کیا
"اس وقت پیٹ میں کچھ درد ہو رہا ہے ۔ اگر یہ گفتگو آپ کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کر دیں ....."
ناظر شاہی حکم دیا ؎
"درد منّت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جی ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اب جو والدہ محترمہ مطلب یہ کہ جن کی والدہ محترمہ ان اوراق پریشاں کو جو کسی عاشق کا گریباں ہو چکے تھے جوڑنے بیٹھیں تو ان کو کچھ ایسا جوڑ دیا کہ فنِ غالبیات میں ایک نئے دور کا آغاز بلکہ اضافہ ہو گیا اور جس پرنا چیز اپنی عمرِ عزیز کے بارہ سال صرف کر چکا ہے اور اب بہت جلد دیوانِ غالب حسبِ ترتیب باقی منظرِ عام پر جلوہ افروز ہو کر مشتاقانِ غالب اور قدر شناسانِ باقی کے لئے جنت نگاہ اور فردوسِ گوش بننے والا ہے ۔ محض معرعوں کی تھوڑی سی الٹ پلٹ سے کلام کی لطافت، ظرافت اور صداقت نہیں معلوم کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے ۔ اور یقیناً اب مرزا غالب کو فرمانے کا ع
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی ۔ کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے ۔ کاش کہ وہ خود اس کو دیکھتے تو عش عش کر کے کفِ افسوس ملتے کہ ہائے خود مجھے یہ کیوں نہ سوجھی اور بلا اعداد باقی میں نے یہ پہیلی کیوں بوجھی ۔"
سلسلۂ کلام یک طرفہ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا " نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔ دیکھئے کس طرح در یا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ؟ ایک روز مجنوں اسکول سے روتا ہوا لوٹا تو اس نے اپنے گارجین مرزا غالب سے شکایت کی کہ اس کو ماسٹر نے بے قصور مارا ہے ۔ مرزا غالب کا اقرا سیاہی خون جوش میں آگیا اور وہ ماسٹر کے پرزے اڑانے " اسکول پہونچے تو عین موقع واردات پر شاعر مل گیا اور وہ انہیں سمجھاتا ہے کہ ماسٹر نے برخوردار مجنوں کو جو سزا دی وہ بالکل حق بجانب تھی کیوں کہ یہ صاحبزادے کوٹھے سے اسکول کی دیوار پر خراب کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے ؎
نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
ذرا خدا لگتی کہئے گا کہ اب شعر کی اخلاقی حیثیت کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے ؟ عاشق کی عزتِ نفس کے متعلق غالب نے بہت سے اشعار کہے ہیں لیکن خدارا اس سفر کے تیور ملاحظہ فرمائیے ۔ ایک دفتر میں کلرک ہو جانے کے بعد عاشق کے لہجے میں کیسی خود اعتمادی آجاتی ہے ؟
دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
دہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں
کون کہتا ہے کہ مرزا صاحب ناعاقبت اندیش تھے ۔ دیکھئے کس طرح اپنے چھوٹے بھائی مستر کو مشورہ لینے کے بہانے نصیحت کرتے ہیں
لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اور غالباً یہ آپ کے مذاق کا شعر ہو۔ ذرا معشوق کی جلد بازی تو ملاحظہ فرمایئے ؎

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اور معشوق کی تیز رفتاری تو غالباً اس سے بہتر کبھی بیان ہی نہیں کی جا سکتی

نخلِ ماں سے وہ غیرتِ مہر کھلا
کس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا

اور غالباً یہ شعر تو داد سے مستغنی ہے۔ ساقی اس سے بڑھ کر مرزا صاحب پر اور احسان ہی کیا کر سکتا تھا ؎

میں اور حظِ وصلِ خدا ساز بات ہے
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اور پھر معشوق کے بڑھاپے کی جب وہ کئی بچوں کی ماں بن کر اپنے شوہر یعنی غالب کے پرانے رقیب کے ساتھ "سب خیریت ہے" قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے کیا خوب تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے ؎

یعنی ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے

دیکھئے ع ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد! یہ سب معرکے حضرت غالب ہی کے ہیں اور میں نے ان میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں کی ہے صرف ذرا چابک دستی سے ان کی ترتیب میں تھوڑی سی الٹ پلٹ کر دی ہے"

میں نقشِ حیرت بنا یہ سب سن رہا تھا لیکن نہیں معلوم میرے ہاتھوں میں ایک خاص قسم کی تشنجی کیفیت کیوں پیدا ہو رہی تھی۔

بار صاحب کی روانی بیچ کچھ اور تیز ہو چلی "دیکھئے مرزا صاحب معشوق کو بہلا پھسلا کر اسے چھپ چھپ کر ملنے کے کیسے کیسے مقامات بتاتے ہیں؟ گرگِ باراں دیدہ تھے کہ نہیں! ؎

مجھ کو بھی پوچھتا رہے تو کیا گناہ ہو
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اور یہ شعر تو حاصلِ دیوان ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے شعر سن لیجئے پھر میں اس کے تفصیلات ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں ؎

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے
موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اس کے بعد کیا ہوا؟ تفصیلات بر طرف ایک تہمد اور ایک بنیان کی کچھ دھجیاں میرے حصے میں آئیں اور میرا پرانا رفیق دیوانِ غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔

فی الحال میں اسپتال میں ہوں اور بیوی بچے ہوٹل میں۔ الاٹمنٹ افسر کو درخواست دے رکھی ہے کہ مجھے کوئی ایسا مکان الاٹ کیجئے جس میں چاہے روشن دان، تابدان بلکہ چھتیں اور دیواریں تک نہ ہوں لیکن اس سے ایک میل کے قطر میں کوئی ماہرِ غالبیات نہ پایا جاتا ہو۔ ابھی تک تو ایسا کوئی مکان مل نہیں پایا ہے۔

واضح رہے کہ غالب اب بھی میرا محبوب ترین شاعر ہے بلکہ ماہرین اور شارحین کے ہاتھوں اس کی درگت بنتے دیکھ کر وہ مجھے پہلے سے بھی کہیں زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ بحمداللہ میں نے دیوانِ غالب کا ایک نسخہ خرید لیا ہے اور غسل خانے میں جب بھی پانی ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو میں اس کے اور صرف اس کے اشعار گنگنایا کرتا ہوں اور اکثر اس کی مظلومیت کا تصور کر کے یہ مصرع بھی پڑھ لیتا ہوں ع

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

عابد سہیل

# لمحہ کی شکست

شوکت بیگم نے مغرب کی نماز پڑھ کر اپنی جیٹھانی حمزا اور بھاینے تسلیم کو بلا کر پھونک ڈالی اور بیٹی نگارشن کو 'ہوں' کر کے اشارہ کیا تو نگارشن جو ابھی ابھی نماز پڑھ کر پیچھے مصری پر آ کے بیٹھی تھی اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔ انھوں نے اس کے دودھ سے دُھلے سفید چہرہ کو ایک نظر دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر کی طرف بڑھا دئے۔ ان کی انگلیوں نے پہلے اس کی کنپٹیاں چھوئیں، پھر کان، پھر آنکھیں اور پھر منہ کے دہانے کے بیچوں بیچ، ناک کی سیدھ میں آ کر ان کے دونوں ہاتھ مل کر رک گئے۔ انھوں نے اسی طرح اس کے چہرہ پر پھونک ڈالی اور پھر ان کے ساتھ دھیرے دھیرے واپس لوٹ گئے۔ کنپٹیوں کے قریب پہونچ کر دونوں ہاتھوں نے اس کے چہرہ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ لوگ ٹھیک ہی تو کہتے تھے کہ ماں بیٹیاں بس بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہی سیدھی ستواں ناک، چھوٹا سا دہانہ ایسا کہ جیسے کبھی بول ہی نہ پھوٹے ہوں، ذرا سے غصہ میں لال ہو جانے والی لویں، گورا رنگ، خوبصورت آنکھیں اور کشادہ پیشانی ـــــ ان آنکھوں نے یہ سب کچھ ایک ہی بار دیکھ لیا اور پھر ان کی آنکھیں بیچ پیشانی پر مانگ کے قریب آ کے ٹک گئیں۔ اے اللہ ایسی مشابہت بھی کیا! نگارشن بھی اپنی ماں کی طرح بالکل سیدھی مانگ نہ نکال پاتی۔ بیچ بیچ بھنور تھا اور ننھی کنگھی کتنی ہی دبا کے کیوں نہ کی جائے مانگ ذرا سی ٹیڑھی ہو ہی جاتی۔

شوکت بیگم نے اسی طرح چہرہ ہاتھ میں تھامے تھامے ایک بار پھر بیٹی کی طرف دیکھا۔ انھیں ایسا لگا جیسے پچیس چھبیس سال ادھر آئینہ دیکھ رہی ہوں۔ اور پھر اس آئینہ نے بہت سے عکس دکھائے۔

گرمیوں کی ایک خوشگوار شام کو جب وہ دونوں طرف پنکھے لگے ہونے کے باوجود پسینہ سے شرابور ہو رہی تھیں بیاہ دی گئی تھیں شوہر خوشحال خلاق منکسر المزاج، خاصا وجیہہ اور رئیس۔ بس ایک بات ذرا ایسی ویسی تھی۔ لیکن اس سے تو وہ پہلے سے ہی واقف تھیں اور خود انھوں نے ہی پہلی ہی ملاقات میں شاید گفتگو کا آغاز اس طرح کیا تھا۔

"بیگم اتنا بڑا اتنا وقیع مکان ہے، اسے دیکھنے والا بھی کوئی نہیں، خدا کا دیا گھر میں سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں۔ بس میں مقروض ہوں اور یہ قرض آپ ہی پورا کر سکتی ہیں۔"

اور وہ خاموش رہی تھی۔

"بولئے اس قرض کی ادائگی میں آپ میری مدد کیجئے گا نا؟"

اب کے بھی شوکت بیگم کے منہ سے جو اس وقت شوخ اخلاق تھیں ایک لفظ نہ پھوٹا تھا۔

"بولئے نا ـــ کیا میں سمجھوں کہ آپ کو میری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

وہ بڑی مشکل سے بول سکی تھیں "ہے کیوں نہیں۔"

"تو پھر بتایئے کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گی؟"

"آپ اور مقروض ـــ؟"

"جی ہاں بیگم میں مقروض ہوں ـــ عرصہ سے جانتے جانتے

وصیت کی تھی، وصیت کیا مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں فرخندہ کو اس بات کا کبھی احساس بھی نہ ہونے دوں گا کہ اس کی ماں مرگئی ہے۔ مرحومہ کی اس خواہش کی تکمیل میرے اوپر فرض ہے اور یہ فرض آپ ہی ادا کرسکتے ہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن انھوں نے 'شوکت بیگم' اور 'بیگم' سے کم کسی اور لفظ سے خطاب ہی نہیں کیا: 'شکو' یا اس قسم کا کوئی اور لفظ سننے کے لئے اس کے کان ترس گئے۔

آئینے نے ذرا سا رُخ بدلا اور اب سامنے ایک اور تصویر تھی۔ فرخندہ نے ساتواں درجہ پاس کرلیا ہے۔ اب اس کا داخلہ دوسرے اسکول میں ہو رہا ہے۔ جاڑے کی چھٹیوں کے بعد اس نئے اسکول میں وہ پہلی بار جا رہا ہے۔ بستہ میں کتابیں، پنسل اور کاپیاں شوکت بیگم نے خود اپنے ہاتھ سے رکھی ہیں۔ یہی بستہ گھر میں ٹانگے فرخندہ مہری کے ساتھ کھڑا ہے۔ ماں نے ایک بوسہ لیا، فرخندہ نے اس کی پیشانی کو چوما، تمی ٹاٹا — تمی ٹاٹا — ان چھ سات برسوں میں اسے اپنی مرحوم ماں کا شاید ایک بار بھی خیال نہیں آیا۔

شادی کے بعد آٹھ برسا ئیں گزرنے پر نگارش اس دنیا میں آئی۔ اب نگارش ہی اس کی سب کچھ بن کر رہ گئی ہے۔ شوہر کی ذمہ داریاں ویسے ہی کیا تھیں۔ صبح صبح اٹھ کر دوکان چلے جانے۔ شادی کے بعد کچھ دنوں تک تو دوپہر کا کھانا گھر پر کھانے آتے رہے۔ پھر کبھی کبھی دوکان پر منگانے لگے اور پھر دھیرے دھیرے دوپہر کو گھر آنا ہی ختم ہوگیا۔ شام کو دوکان سے واپس آئے تو تھکے تھکائے، انڈمال' تجوری کی چابی اور نوٹوں کی تھیلی بیوی کے حوالہ کر دیتے اور وہ روپے تجوری میں رکھ دیتی۔ ویسے ایک چابی اس کے پاس بھی رہتی، کتنا کس کو دیا، کیا کیا خرچ کیا، یہ شوہر نے ایک بار بھی نہ پوچھا تھا۔

اور اب تو وہ اوپر کوٹھے پر سوتے، بچی رات کو دو ایک بار ضرور روتی، آنکھ کھل جاتی تو گھنٹوں نیند نہ آتی اور دن کو دوکان کے کام میں خلل پڑتا۔ اب ملاقات کے بس دو ایک ہی مواقع رہ گئے تھے صبح چائے کی میز پر، شام کو کھانے پر یا جمعرات کو جب دوکانیں بند ہوتیں۔ یہ ذمہ داریاں تھیں ہی کیا کہ ان میں کمی ہوتی۔ البتہ نگارش نے فرخندہ کے لاڈ پیار کا تھوڑا سا حصہ بٹا لیا تھا۔ اب وہ اسکول سے لوٹ کے آتا اور شوکت بیگم نگارش کو دودھ پلا رہی ہوتیں تو کرین بوا کھانا لاکر میز پر لگا دیتیں۔ شروع میں تو فرخندہ نے اس تبدیلی کو خاصا محسوس کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے عادی ہوگیا۔ کھانے کے بعد جھولے کے پاس کھڑا ہو جاتا اور سیٹی بجاتا تو نگارش، غوں غوں کرکے ہاتھ پیر مارتی اور مسکراتی ——— اب ایک اور تصویر تھی۔

گرمیوں کی ایک دوپہر تھی کہ ایک تانگہ گھر کے سامنے آکر رکا اور نوکر نے اطلاع دی کہ جاوید صاحب آئے ہیں۔ جاوید حبیم صاحب کے رشتہ کا بھائی تھا اور چونکہ شوکت بیگم کے گھرانے اور جاوید کے گھرانے سے دیرینہ تعلقات تھے اس لئے وہ پہلے ہی پردہ نہ کرتی تھیں شادی کے بعد البتہ سامنے آنے کی نوبت نہ آئی تھی اس لئے پہلے تو جھجکیں پھر جلدی سے دوپٹہ سر پر ڈال کر باہر کے دالان میں مہمان کے استقبال کے لئے جا کھڑی ہوئیں۔

جاوید بھائی اندر داخل ہوئے۔ ایک عرصہ سے بلکہ شادی کے بعد سے بھابی کو نہیں دیکھا تھا لیکن رشتہ ہی مذاق کا تھا، مسکراتے گرد و غبار سے اٹے ہوئے جاوید بھائی تھوڑی دیر میں ہاتھ منھ دھو کر کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ شوہر کا کھانا پہلے ہی دوکان جا چکا تھا، اس لئے انتظار کا کوئی سوال ہی نہ تھا وہ بھی مہمان کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئیں۔ کھانے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شوکت بیگم نے دُور دُور کے رشتہ داروں کی خیر خیریت پوچھ ڈالی۔ منیرہ بی بی کیسی ہیں، کیا اب بھی کام کرنے آتی ہیں۔ اب تو ان کے بال سن سفید ہوگئے ہوں گے۔ کنوئیں کے پاس والے کوارٹر کے درخت کے نیچے بچے مکان میں جو سنار رہتا تھا اس کی لڑکی تو اب بڑی ہوگئی ہوگی لڑکیوں کے اسکول میں کون کون سی پرانی استانیاں رہ گئی ہیں اور اس طرح کے نہ جانے کتنے سوالات۔

بوا نے میز پر سے برتن اٹھائے اور مڑکے باہر والے دروازے سلفچی رکھ کر جاوید بھائی کے ہاتھ دھلائے اور ٹاٹ کے پردے گرائے جب سے نگارش کو لوگی تھی دس بجے سے ہی دالان کے پردے گرا دئے جاتے لیکن آج نہ جانے کیسے اب تک کسی کو خیال نہ آیا تھا۔ جاوید بھائی

نے تو بیہ سے ہاتھ پونچھے اور کونے میں رکھے ہوئے ریڈیو پر فرخندہ کی رنگین تصویر دیکھنے لگے۔ ابھی وہ تصویر دیکھنے ہی میں محو تھے کہ اندر کمرے میں چھوٹے پر نگارشن روئی۔ وہ اس وقت بمشکل سال بھر کی ہوگی۔ جاوید بھائی نے کان کھڑے کئے۔ شرارت بھرے انداز میں مسکرائے پھر بولے۔ "واہ بھابھی یہ کارنامہ آپ نے کب کر ڈالا؟"

جاوید بھائی بھی عجیب لاابالی انسان تھے۔ شادی کے نام سے رسی تڑاتے۔ باپ جب تک زندہ رہے اسی امید پر جئے کہ بیٹے کا سہرا دیکھیں گے۔ مرے تو سہرا دیکھنے کی تمنا اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ اب بس ماں رہ گئی تھی۔ اس دکھیاری نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن جاوید بھائی نے ہاں نہ کر کے دی۔ جب بات چلتی ٹال جاتے۔ آخر ماں غریب نے بھی ہار مان لی۔ باپ نے اچھی خاصی جائداد چھوڑی تھی، نقد روپیہ بھی تھا۔ اکلوتی اولاد تھے، پیسے کی کبھی تنگی نہ ہوتی۔ لکھنؤ میں رہتے، دن بھر ہوٹلوں اور کافی ہاؤس کے چکر لگاتے، شام کو کسی دوست یار کے یہاں پڑ کے سو رہتے۔ دوست آدمی تھے، جس محفل میں بیٹھتے جانِ محفل بن جاتے، جس دوست کے یہاں رہتے یا رشتہ داروں کے رہتے جب پیسے کم پڑتے گھر جاتے اور لے آتے۔ ان کی اس طرح کی زندگی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا جوانی میں کسی کو دل دے دیا تھا وہ بے وفائی کر گئی اور وہ اب تک اس غم کو سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں، کوئی کہتا کسی رنڈی کو بٹھا لیا ہے، کوئی کچھ، غرض جتنے منہ اتنی باتیں لیکن ایسا لگتا کہ جاوید بھائی ان باتوں پر ذرا کان نہ دھرتے۔ ابھی کافی ہاؤس کی اس ٹیبل پر بیٹھے قہقہے لگا رہے ہیں تو ابھی اس ٹیبل پر۔ غرض دن یوں ہی گزرتا بلکہ کہنے والے تو مذاقاً یہاں تک کہتے کہ صبح آکے کافی ہاؤس کھلواتے ہیں اور شام کو بند کرا کے جاتے ہیں۔

شوکت بیگم بس مسکرا کر رہ گئیں تو جاوید بھائی نے اپنا سوال دہرایا۔ "آپ تو خوب خفیہ ہی خفیہ کارنامے کر ڈالتی ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی" اور کہہ کر ایک ہی جست میں اندر کمرہ میں چلے گئے۔ اور نگارشن کو گود میں لے کر باہر دالان میں آگئے۔ بچی تھی کہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتی۔ گود میں لے کے ہلایا، طرح طرح سے چمکارا پیار کیا، منجھنا بجایا۔ پر اُسے چپ نہ ہونا تھا نہ ہوئی۔ شوکت بیگم نے اصرار بھی کیا لیکن جاوید بھائی نے اسے گود سے نہ چھوڑا "ایسا ہی بچہ کھلانے کا شوق ہے تو شادی کیوں نہیں کر ڈالتے؟" شوکت بیگم نے کہا۔ پھر دوپٹہ کو سینہ پر سنبھالتے ہوئے بولیں "شادی کر ڈالئے پھر دو سے تین ہوتے کتنے دن لگتے ہیں۔"

جاوید بھائی پہلے تو مسکرائے، پھر ہنسے، پھر زور سے قہقہہ لگایا، پھر ایک دم چپ ہو گئے۔ بولے "کیا کہا بھابھی شادی کر ڈالوں"

"کیوں، کیا بُری بات کہی؟" بھابھی مسکرائیں۔ "اب کب تک جہاں تہاں گھر پھرو گے، بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، دن بھر ہوٹلوں کے چکر کاٹے رات کو کسی کے یہاں لمبر ٹکا لی۔"

جاوید بھائی خالی خالی نظروں سے بھابھی کی طرف دیکھتے رہے، پھر نگارشن کو چمکارا تو اس نے ماں کی طرف دیکھ کے ایک ہچکی لی۔ جاوید بھائی نے اس کے منہ میں سیدھے ہاتھ کی ایک انگلی ڈالی تو وہ چوسنے لگی۔ خود بولے "اب کیا شادی کروں۔ کرنا ہوتی تو کب کا کر چکے ہوتا۔"

"کیوں اب کیا ہوا۔ کیا بوڑھے ہو گئے۔؟"

یہ بات شوکت بیگم نے یونہی کہہ دی تھی لیکن اس کے پیچھے لاشعور میں ان کی پوری زندگی تھی۔ جاوید بھائی اب بھی چالیس کے پیٹے میں ہوں گے جبکہ دس سال قبل ان کی شادی حکیم صاحب سے ہوئی تھی تو وہ کسی طرح ۲۵ سے کم نہ تھے پھر بھی ان کی شادی شدہ زندگی کامیاب ہی تھی۔ ان دس برسوں میں ان کی ایک بار بھی شوہر سے لڑائی نہ ہوئی تھی۔ لڑائی تو دور کی بات کسی بات پر اختلاف کی نوبت تک نہ آئی تھی اور لڑائی ہوتی بھی تو کیسے، دونوں کے راستے اتنے الگ الگ بلکہ متضاد تھے کہ ان میں کسی ٹکراؤ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جو حکیم صاحب کے پاس تھا اسے دینے میں انھوں نے کبھی آنا کانی نہ کی تھی، جو ان کے پاس نہ تھا اس کی شوکت بیگم نے بھی چاہ نہ کی تھی۔ انھوں نے انگارے سے ہاتھ سینکے نہ تھے لیکن دوسروں کو سینکتے سنا اور دیکھا تو تھا، یہاں آگ ہی نہ تھی تو انگارے کیا ہوتے اور جھلسل کے سامنے خواہ مخواہ ہاتھ پھیلانے سے حاصل — ؟ جہاں طلب ہی نہ ہو وہاں حسنِ طلب

کیا ہوگی؟ لیکن اس وقت یہ باتیں شعوری طور پر شوکت بیگم کے ذہن میں نہ آئی تھیں اور انھوں نے اس طرح اس مسئلہ پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ لیکن بے زبان احساسات کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ وہ ہمارے اور آپ کے طور طریقوں کے پابند نہیں ہوتے۔

اپنے سوال کے جواب میں جاوید بھائی کو خاموش پا کر شوکت بیگم بول اٹھیں:

"شادی تو اب بھی ہو سکتی ہے، ویسے اُس وقت کیسے کیسے رشتے آ رہے تھے لیکن جناب کے مزاج ہی نہ ملتے تھے۔"

"اُس وقت کی بات چھوڑو بھابھی، اب مجھ بوڑھے سے کون شادی کرے گا۔" جاوید بھائی کی آواز جیسے کسی خالی ڈبے سے نکل رہی تھی۔

"کیوں، کرے گا کیوں نہیں — کوئی بھی کرے گا۔" بھابھی نے مسکرا کے جواب دیا۔

"آپ کر لیجئے گا — ؟"

شوکت بیگم کو ہوش آیا تو انھوں نے خود کو جاوید بھائی کے بالکل قریب کھڑا پایا۔ نگارش کو گود سے لینے کی کوشش کرتے وقت ان کا ہاتھ جاوید بھائی کی مضبوط مچھلیوں کے پاس ٹک گیا تھا۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی اور کان کی لووں میں جیسے چیونٹیاں کاٹ رہی تھیں۔

گرم ہوا کا تھپیڑا آیا اور منھ پر ایک چانٹا رسید کر کے چلا گیا — کان کے پاس سے ایک گولی سن سے نکل گئی —

کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجئے گا — کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجئے گا — کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجئے گا — شوکت بیگم پاس ہی پڑی ہوئی مہری پر گر پڑیں۔ خاموش، بے سُدھ، سرخ بستہ۔ جاوید بھائی بھی اسی جگہ کھڑے تھے، ساکت و سامت، گم سم، چپ چاپ۔ نگارش جو تھوڑی دیر قبل جاوید بھائی کی گود میں درد کے ہلکان ہوئی جا رہی تھی نہ جانے کب کی خاموش ہو چکی تھی — شوکت بیگم کچھ دیر تو اسی طرح بے سُدھ پڑی رہیں پھر اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اندر کمرے میں جا کر مہری پر گر پڑیں اور تکیہ میں چہرہ آڑس لیا۔

باہر آنگن میں مُنّی جون کی توصیل رہی تھی۔ نوکرانی کھانا پکا کے جانے کب کی اپنی کوٹھری میں پڑ رہی تھی۔ نوکر لڑکا بھی کہیں کودنے کھدرے میں سو رہا ہوگا۔ فرنٹ مشروع گھروں میں اپنی خالہ کے پاس شملہ چلا گیا تھا۔ جاوید بھائی کچھ دیر تو اسی طرح کھڑے رہے، پھر انھوں نے آہستہ سے نگارش کو مہری پر لٹا دیا۔ نگارش پہلے تو کلبلائی پھر خاموش ہو گئی اور وہ خود دالان میں دھیرے دھیرے ٹہلنے لگے۔ گھر میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی اندر سے ہچکیوں کی آوازیں مزدور سنائی دیتیں۔

تھوڑی دیر بعد جاوید بھائی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی ۳ بجکر ۴۰ منٹ ہوئے تھے۔ سوا چار بجے میل کان پور جاتا تھا۔ انھوں نے کمرے کا رُخ کیا۔ دہلیز کے پاس جا کر کچھ سوچا، پلٹے، پھر اندر چلے ہی گئے۔ شوکت بیگم اسی طرح بے سُدھ پڑی تھیں۔ جاوید بھائی پلنگ کے سرہانے کچھ دیر کھڑے رہے پھر بولے

"بھابھی —"

کوئی جواب نہ ملا۔

"بھابھی سنئے تو —"

شوکت بیگم نے ایک ہچکی لی۔

"بھابھی مجھے معاف کر دیجئے، میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ویسے میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا — اچھا اب جا رہا ہوں خدا حافظ —"

قدموں کی بھاری چاپ، پھر ذرا ہلکی، پھر جیسے کسی نے سٹوکیس اٹھایا — ابھی جاوید بھائی دروازے تک ہی پہونچے تھے کہ کوئی پیچھے کھڑا تھا۔ مڑ کے دیکھا تو شوکت بیگم تھیں۔ ننگے سر ننگے پیر۔ سینہ سے دوپٹہ غائب، آنکھیں سُرخ اور بال بکھرے ہوئے —

دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کے دیکھا۔ شوکت بیگم ایک دم پھوٹ پڑیں۔ "جاوید بھیّا اب کبھی یہاں نہ آنا۔ ویسے ہی تم خط کب لکھتے تھے اب اور بھی نہ لکھنا۔ میں تمھاری کوئی خاطر تواضع بھی نہ کر سکی اچھا خدا حافظ —" شوکت بیگم نے ایک بار پھر جاوید بھائی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں کے درمیان جیسے سورج تھا۔ دونوں نے نظریں

جھکالیں۔ پھر جاوید بھائی نے اپنا ہاتھ شوکت بیگم کے سر پر رکھا اور 'خدا حافظ' کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئے۔ شوکت بیگم نے دھیمے سے کہا 'خدا حافظ'۔ لیکن جیسے الفاظ ان کے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئے۔ پھر خود ہی دروازہ بند کیا اور زمین پر چڑھا دی۔ کچھ دیر اسی طرح دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی رہیں اور نہ جانے کب اندر آ گئیں۔

سیٹھ حکیم الدین شام کو جب دوکان سے لوٹے تو وہ بخار میں پھنک رہی تھیں۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ تین چار دن میں بخار اترا تو شوکت بیگم بالکل بدل گئی تھیں۔ ویسے گھر میں پہلے ہی کون تھا جس سے باتیں کیا کرتیں۔ پر اب بالکل ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ صبح شام تلاوتِ کلام پاک ہوتی، پانچوں وقت کی نماز کے علاوہ تہجد اور وظیفے پڑھتیں ـــ وہ دن اور آج کا دن کسی وقت کی نماز قضا نہ ہوئی، کوئی روزہ نہ چھوٹا۔

یہ تصویر بڑی اُجاگر اور مفصل تھی۔ جاوید بھائی کی بڑی بڑی لیکن خاموش آنکھیں۔ ان آنکھوں پر چھجے کی طرح چھائی ہوئی گہری سیاہ بھنویں، بے تحاشہ ہتھوڑے مارنے، زندگی کو کھلواڑ سمجھنے لیکن ذرا سی بات پر پریشان ہو جانے کی عادت ـــ پھر اس وقت کی اپنی زندگی، شوہر، دو سال کی نگارش ـــ سارے نقش ایک ایک کر کے سامنے سے گزر گئے۔ شوکت بیگم کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور نگارش جو ماں کے اس برتاؤ سے حیرت زدہ سی تھی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شوکت بیگم نے جذبات سے دعائے گنج العرش نکالی، پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا تب جا کر کہیں سکون نصیب ہوا۔

جب سے نگارش کے رشتہ کی بات چلی تھی وہ ماں باپ کے سامنے ذرا کم ہی آتی۔ رات کا کھانا عام طور سے سب ساتھ ہی کھاتے تھے لیکن اب نگارش اسے بھی ٹال جاتی اور پرسوں جب شوکت بیگم نے یہ غور کرنے کے لئے کہ کسی چیز کی کمی تو نہیں رہ گئی ہے اس کے جہیز کے سارے زیور نکالے اور سلے اور بغیر سلے کپڑے بڑی بڑی مہریوں پر جانے تو نگارش دن بھر کمرے سے باہر نہ نکلی۔

یوں تو بات چیت کئی گھرانوں سے چل رہی تھی۔ دو ایک لڑکے پاکستان کے بھی زیرِ غور تھے لیکن ماں باپ اکلوتی بیٹی کو دور دیس بھیجنے کے خیال ہی سے کانپ کانپ جاتے۔ یہاں جن گھرانوں سے بات چیت چل رہی تھی ان میں سے کچھ کی مالی حالت ایسی تھی کہ نازوں پلی بیٹی کو پلے باندھنے کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا۔ کچھ کھاتے پیتے تھے تو ان کی ذات کا پتہ نہ خاندان کا، غرض میاں بیوی دونوں اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ شوکت بیگم کی نند سروری بیگم نے مشکل آسان کر دی۔

باہر کا ڈرائینگ روم خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھا گیا۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پردے تبدیل کئے گئے اور اوپر کا کمرہ مہمان کے لئے آراستہ کر دیا گیا۔ سروری بیگم خود ہی لڑکے کو ساتھ لے کے آئیں۔ گھر میں کون تھا جو اسٹیشن پیشوائی کے لئے جاتا۔ فرخندہ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا لیکن مہمان جب اسٹیشن سے باہر نکلے تو سفر خر ضرور موجود تھا۔

ہونے والی سسرال کی خاطر مدارات، اونچی قلعہ نما کوٹھی سلیقہ مند اور خوش اخلاق ساس، سیٹھ حکیم الدین کی دولت، بڑا نام بڑا کام اور پھر نگارش ایسی لڑکی جس کی تصویر سروری بیگم پہلے ہی دکھا چکی تھیں اندر میاں ریشہ خطمی ہو گئے۔ ادھر سیٹھ حکیم الدین کو بھی لڑکے میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ لاکھوں میں نہ سہی ہزاروں میں ایک تو تھا ہی، پڑھا لکھا، قبول صورت، شریف خاندان اور وکالت بھی اچھی خاصی چلتی۔ انھوں نے پہلی ہی نظر دیکھ کر فیصلہ کر لیا اور پھر اندر آ کر بیگم سے بولے۔

"لو اللہ نے خود سے انتظام کر دیا، میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ جو سروری بیگم کی پسند ہے وہی میری بھی، اور پھر لڑکا بھی گھر ہی کا ہے حامد بھائی کا بھائی ہے، وہی خلوص، ویسی ہی سنجیدگی اور خاموش طبیعت۔"

"جیسی آپ کی مرضی ـــ" شوکت بیگم نے کسی جوش و خروش کا اظہار کئے بغیر جواب دیا۔

بیوی کے منہ سے 'ہوں ہاں' سن کر انھیں کچھ تشفی نہ ہوئی کہاں تو اتنا جوش و خروش تھا۔ دن بھر کھڑے کھڑے کمرہ صاف کروایا تھا، اوپر کا کمرہ سجایا تھا۔ بیٹے کو دیکھنے کا ایسا چاؤ تھا اور کہاں اب 'جیسی آپ کی مرضی'۔ بولے "کیا تمھیں پسند نہیں آیا؟" شوکت بیگم نے سروتہ پاندان میں رکھا اور کلوری موڑ کر منہ

میں دبائی اور بولیں" ارے آپ ایسی باتیں کرتے ہیں، کیا خوشی میں اُچھلوں، کودوں، سروری بیگم لاکھ آپ کی بہن سہی پر اب تو ہیں پرائے گھر کی، اور آخر میاں ان کے دیور ہی تو ہیں۔ کوئی سمدھیانے والوں کے سامنے رشتہ پکا ہونے سے پہلے ایسی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ سن لیں گی تو سوچیں گی لڑکی بھاری ہو رہی تھی۔"

بات سیٹھ جی کی سمجھ میں آگئی۔ انھوں نے اپنے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی پیدا کی۔ لیکن خوشی تھی کہ ہنستی کھیل کے باہر نکلی آتی تھی۔ تھوڑی دیر جیب رہے، پھر بولے "بھئی اور چاہے کچھ کہو لیکن اب تک جتنے لڑکے دیکھے ان میں تو سب سے اچھا ہے۔ بس ذرا عمر زیادہ ہے۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ ایسا کوئی فرق بھی نہیں۔" انھوں نے مسکرا کر بیگم کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی "اور پھر ہم دونوں کی عمروں میں بھی تو کتنا فرق تھا۔ میں تو سروری سے ہاں کہے دیتا ہوں۔"

"آپ کی یہ عمر آئی لیکن جلد بازی نہ گئی" شوکت بیگم نے دوپٹہ سر پر ڈالا "کوئی پرانا زمانہ تو اب ہے نہیں کہ ماں باپ نے جس کو چاہا لڑکی کا ہاتھ تھما دیا۔ نگارشن کو پڑھایا لکھایا ہے، یونیورسٹی سے بی۔ اے کرایا ہے، تو اس کا بھی عندیہ معلوم ہی کر لیا جائے۔"

"واہ بیگم تم رہیں نری بچی کی بچی۔" جسیم صاحب اس وقت بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ "اب تم جاؤ گی نگارشن سے پوچھنے کہ تجھے لڑکا پسند ہے یا نہیں، دیکھا نہیں کل جب سے انور میاں آئے ہیں کمرے سے باہر نکلی ہی نہیں۔"

شوکت بیگم نے شوہر کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "وہ شرمیلی ہے، اور خود سے کچھ نہ کہہ پائے تو ہم اسے جس کے چاہیں حوالہ کر دیں اور میں بھلا پوچھنے جاؤں گی، شام کو اس کی سہیلی عذرا آئے گی تو اس سے پھجوا لوں گی، انھیں ہاں نہ کرنا۔"

سروری بیگم سے ابھی بھائی گیا بھاوج نے ہاں تو نہیں کہی تھی لیکن بھائی کے برتاؤ اور پھر کل صبح سے اس وقت تک کی خاطرداری سے یہ مزور سمجھ گئی تھیں کہ رشتہ منظور ہے۔ انھیں یقین تھا کہ کل صبح جب واپس جانے لگیں گی تو انور میاں کی ماں کی طرف سے

امام ضامن نگارشن کے بازو میں باندھ دیں گی اور یا قوت کی انگوٹھی جو ان کے بکس کے اوپری خانہ میں ایک ڈبیہ کے اندر محفوظ ہے نگارشن کی انگلی میں سرک چکی ہوگی۔

سروری بیگم اوپر کوٹھے پر سے انور کے پاس سے اُتریں تو بے حد مسرور تھیں۔ اتنی رات گئے تک بھابھی کا جانا نہ پسند کرتیں انھیں کچھ حیرت ضرور ہوئی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ لڑکی کا رشتہ پکا کرنا ہے کچھ پڑھ ڈھا رہی ہوں گی وہ اپنی سہری پر جا کر دراز ہو گئیں۔ شوکت بیگم نے بوا سے نگارشن کو ایک بار پھر اپنے پاس بلایا اور گھنٹے کے قریب جانماز پر ہی بیٹھا لیا۔ ایک لمبی سی دعا پڑھ کے اس کی پیشانی پر دم کیا۔ دونوں ہاتھوں سے بیٹی کی چٹا چٹ بلائیں لیں۔ اسے سینہ سے لگایا اور پھر ان کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے۔ وہ کیا دعا مانگ رہی تھیں یہ نگارشن کی خاک سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے، گلا رندھا ہوا تھا اور سینہ پر اس کے سر کے بوجھ سے آواز دبی دبی نکل رہی تھی۔ پر اس نے اتنا ضرور سنا "اللہ میرے گنہ ہوں کو معاف کیجئو سوچتی ہوں کس منہ سے سامنا کروں گی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ اور میری بیٹی کی زندگی میں ایسا کوئی لمحہ نہ لائیو، اسے آزمائش میں نہ ڈالیو۔"

نگارشن تھوڑی دیر تک تو اسی طرح ماں کے سینہ سے سر ٹکائے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھیں پر ماں کے سامنے لاکر انھیں اور غمزدہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ اُٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات گئے تک میاں بیوی کمرہ میں نہ جانے کیا کھسر پھسر کرتے رہے لیکن صبح جب سیٹھ جسیم الدین ناشتہ کی میز پر آئے تو غصہ سے ان کا منہ بھولا ہوا تھا۔ انھوں نے بہن کے رخصت ہونے کا انتظار بھی نہ کیا اور باہر کے کمرہ سے ہی دوکان چلے گئے اور نہ کو رخصت کرتے وقت شوکت بیگم نے ان سے جس مفصل خط بھیجنے کا وعدہ کیا وہ کبھی نہ بھیجا گیا۔

---

اندرجیت لال

# جدید فنِ مصوّری کی بین الاقوامی نمائش

مصوّری ایک ایسا فن ہے جو دنیا کے ہر ملک میں سیکڑوں برسوں سے ماہرینِ فن کے ہاتھوں ارتقاء پذیر رہا۔ ہمارے ہاں فن کی تاریخ میں بودھی، راجستھانی، پالی، مغل اور پہاڑی اسکولوں کے کمالِ فن کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح یورپ کے ممالک میں بھی یہ فن مختلف اسالیب کی صورت میں پرانے وقتوں میں نشو و نما پاتا رہا۔ لیکن جوں جوں انسان کا جمالیاتی ذوق اور فنی شعور بدلتا رہا فنِ مصوّری میں بھی انقلاب رُونما ہوتے رہے یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جدید آرٹ کا آغاز ہوا۔ اس کی ابتدا یورپ کی سرزمین سے ہوئی اور وہیں سے رفتہ رفتہ چار دانگِ عالم میں پھیلا۔ آج حالت یہ ہے کہ جدید آرٹ کی خصوصیات کے حامل مصوّری کے شاہکار یورپ کے سبھی ممالک پیش کر رہے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے آخری دَور سے پہلے مصوّری کلاسکی عیینت کا دوسرا نام سمجھا جاتا تھا۔ فن کار جو شاہکار پیش کرتے تھے اُن میں ان کا مقصد جاگیرداروں اور رئیس زادوں کی خوشنودی ہوا کرتا تھا۔ عوام نہ تو اس فن سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہ ہی ان کے شعور یا تنقید کی کوئی قدر و قیمت ہوتی تھی۔ لیکن دورِ نشاۃ ثانیہ کے خاتمہ کے بعد یورپ کے سماج نے ایک نئی کروٹ لی لوگوں کا مذاق بدلا اور نئی قدریں پیدا ہوئیں۔ جمہوریت اور شخصی آزادی نے مصوّری کو عوام کے مذاق اور خوشی کا سامان بنا دیا۔ انسان کے دل میں علم و دانش کے حصول کا جذبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ مشینی انقلاب اور سائنس کی روز افزوں ترقی نے عوام میں تجسس کا مادہ پیدا کر دیا علم و ادب کی دنیا میں نئے نئے خیالات پیش کئے جانے لگے اور سچ تو یہ ہے کہ جب ادب میں اتنا انقلاب آیا تو اس کا اثر آرٹ پر بھی پڑا اور اس طرح ایک نئے یعنی جدید آرٹ کی ابتداء ہوئی۔

لگ بھگ دو سو برس تک یورپ کے مصوّر رومانیت اور اصلیت پسندی کی طرف راغب رہے۔ یہاں تک کہ تخلیقی فن محض نقالی بن کر رہ گیا۔ لیکن جدید فن کی خصوصیات نے مصوّری کے رنگ روپ کو یکسر بدل ڈالا۔ اس سے پیشتر لوگ مناظر کی عکاسی سے بہت کم دلچسپی رکھتے تھے لیکن جدید فن میں اس صنف کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مناظرِ قدرت کا تقدس باقی نہ رہا۔ اس کا درجہ انسان کے مساوی تھا۔ محض رنگوں کی لپائی سے بیرونی سطحوں کو اُجاگر کر کے مصوّری زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ بیرونی جذبات نگاری کے مقابلہ میں گہرائی اور گیرائی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جدید آرٹ بھی محض چند خصوصیات کے سہارے زندہ نہیں۔ اس کی ہیئت و جزئیات میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اور جوں جوں اس کا ارتقاء ہوتا گیا نئے نئے اسلوب اس میں داخل ہوتے گئے اور آج کل یہ حالت ہے کہ جدید فنِ مصوّری کے مختلف رجحانات بیک وقت پورے فن پر چھائے ہوئے ہیں۔

کلائو مونٹ اور آگسٹ ری نائر نے اثر پرستی کے رجحان کو جدید فن میں داخل کیا اور یہ آج کے فن کا ایک ضروری جزو قرار دیا جاتا

ہے۔ اسی طرح انگلستان کے کچھ فن کاروں اور شاعروں نے جان رسکن کی تحریروں میں ایک تحریک بنام Pre-Raphelite کو جنم دیا۔ جنھوں نے فن کی خوبصورتی میں بڑا اضافہ کر دیا۔ اسی طرح فن جدید میں پکاسو نے Cubism کی داغ بیل رکھی جس کی روشنی میں کسی شے کی عکاسی محض آنکھ ہی کے اشارے پر نہیں کی جاتی تھی بلکہ علم کی حقیقت فن کار کی معاون ثابت ہوتی تھی۔ یہ خصوصیت جدید فن میں خوب کامیاب رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فن کار کو جتنی آزادی کیوبزم میں میسر ہوئی اتنی اور کسی طرز میں نہیں۔ اس میں اس کی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار کا بڑا موقع ملا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں 'فن برائے فن' کا نعرہ بلند ہوا اور بیشتر فن کار جمالیاتی خصوصیات اور حسن و جمال کو دوسری خصوصیات پر ترجیح دینے لگے اور اس رجحان کے اتباع میں بھی بڑے سے شاہکار منظر عام پر آئے۔ اس رجحان کے مخالفوں نے جن میں فنڈم لیوس کا نام قابل ذکر ہے 'جمالیات' کو ایک بوسیدہ اسلوب قرار دیا۔ چناں چہ ایسے متضاد رجحانات نے بھی جدید فن پر بھاری اثر ڈالا۔

آج کا فن مصوری ان سب رجحانات کا حامل ہے۔ کچھ فن کار ایسے بھی ہیں جو اپنے شاہکاروں کی تخلیق میں بیک وقت کئی رجحانات کا اتباع کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا شاہکار صرف ایک رجحان کا علمبردار نہیں رہتا اور ایسی مثالیں عام طور سے ملتی ہیں۔ دراصل آج کے مصور کو جتنی آزادی نفس موضوع یا اسلوب کے اعتبار سے حاصل ہے وہ کسی دور میں کسی فن کار کو نصیب نہ ہو سکی ہوگی۔ آج کا فن کار کسی جذبہ یا احساس کو کسی بھی رنگ یا اسلوب میں پیش کر سکتا ہے اس پر کوئی قید یا پابندی نہیں۔ انفرادیت اور ذاتی احساس آج کے فن میں نمایاں نظر آتا ہے مشہور ادیب آسکر وائلڈ کے قول کے مطابق "کوئی بڑا فنی کام کسی چیز کو اس طرح سے نہیں دیکھتا کہ وہ جوں کی توں نظر آئے اور اگر وہ اس طرح سے ہی دیکھتا ہے تو اسے عظیم فن کار کہلانے کا کوئی حق نہیں۔" اسی عظمت کو حاصل کرنے کے لئے آج کا فن کار یا مصور کبھی اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور روایت کی پابندی کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت کو اُجاگر رکھتا ہے تاکہ اس کا فن ممتاز رہے۔

ان سب رجحانات اور انفرادی زنگوں سے بھرپور کچھ تصاویر پچھلے دنوں آرٹ کی بین الاقوامی نمائش کی زینت بنیں۔ یہ نمائش اپنے طرز کی واحد نمائش تھی جو دہلی میں منعقد ہوئی جس میں آسٹریلیا، بلغاریہ، چین، کیوبا، چیکو سلاویکیہ، ڈینیش نام، جمہوریہ جرمنی، فن لینڈ، فرانس، گھانا، ہنگری، انڈونیشیا، اٹلی، جاپان، ملایا، منگولیا، نیدرلینڈ، پولینڈ، سویڈن، انگلستان، متحدہ عرب جمہوریہ، امریکہ، رومانیہ، پاکستان، کوریا اور لنکا سے موصول شدہ مرتعے نمائش کی خاطر پیش کئے گئے۔ ان ممالک سے کل ۲۳۹ تصاویر موصول ہوئیں، جن میں سے ہر ملک کے ایک ایک شاہکار کو اعزازی سند عطا کی گئی۔ چونکہ کیوبا، پاکستان، کوریا، ایران اور لنکا کی تصاویر مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہوئیں اس لئے انھیں اعزازی اشاعت دی جا سکیں۔

اس سے پہلے ایسی ہی تین نمائشیں بالترتیب ۱۹۴۶، ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۷ء میں منعقد ہوئیں۔ لیکن اس سال کی نمائش خصوصاً قابل ذکر ہے کیونکہ معیاری اعتبار سے یہ پچھلی نمائشوں سے بہتر تھی۔ ہندوستان خود جدید فن مصوری کا مرکز نہیں اور نہ ہی اس نے اب تک یورپین ممالک کی نسبت زیادہ کمال حاصل کیا ہے۔ بہرحال یہ نمائش ہمارے ذوق و شوق اور قدر فن کا ایک مسلم ثبوت ہے کہ بین الاقوامی درجہ پر ایک بھاری نمائش کا اہتمام ہمارے ملک نے کیا۔ راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنے پیغام میں نمائش کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان کے الفاظ میں "کسی قوم کی بیداری میں فنون لطیفہ کا بیشتر ہاتھ ہوتا ہے۔ چناں چہ ہمیں اپنے ملک کے دیگر تعمیری کاموں کی طرح اس پر بھی پوری توجہ دینی چاہیئے" پنڈت نہرو نے فنون لطیفہ سے دلچسپی کو قوم کی ترقی سے مناسبت دی ہے — نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے نمائش کا افتتاح فرمایا تھا۔

نمائش میں لگ بھگ پانچ پشتوں کے رنگ، خاکے، تاثریے اور تصاویر کسی نہ کسی جذبہ یا احساس کے مظہر دکھائی دیتے تھے۔ جدید سطح سے لے کر آج تک مختلف اسلوب جو مصوری کے دائرہ میں پروان چڑھے، ان سب کی نمائندگی کی گئی تھی۔ تخلیقات میں جدت اور روایت

کو نہایت خوب صورتی سے سمویا گیا تھا۔ فنِ جدید کے رجحانات کے ساتھ ساتھ ہر ملک کی اپنی اپنی روایت بھی ان مرقعوں میں نمایاں تھی دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا رجحان، کوئی قدر یا موضوع ہوگا جو ان تصاویر کا موضوع نہ بنا ہو۔ دنیا کی بے چینی، یا سیّت، جنگ کا خوف نفسیاتی اُلجھن بیشتر شاہکاروں کے پس منظر سے عیاں تھی خصوصاً فراریت کا رنگ کئی مرقعوں پر غالب تھا۔ یوں جان پڑتا ہے کہ فن کار کو اُلجھن اور پریشانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا چناں چہ وہ تخیل کا سہارا لیتا ہے اور محض رنگ و خاکوں سے اپنے فن میں کوئی تخیّل پیش کر دیتا ہے لیکن کوئی ایسا تخیل وہ پیش کرنے سے معذور ہے جس میں فراریت حاوی نہ ہو۔ کسی حد تک وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہے۔ جب یہ تاثر خود آج کے ماحول میں موجود ہے تو شعوری یا لاشعوری طور پر فن کار بھی اس سے بچ نہیں سکتا۔ ایسے مرقعوں میں زیادہ اشتراکی ممالک کے شاہکار شامل تھے۔ چین سے لے کر ہنگری تک سب ہی ملکوں کے مرقعے اس رنگ کے حامل تھے۔ کسی کسی خاکے سے بورژوا قدروں کے خلاف نفرت کا اور کسی کسی سے نظامِ نو کی تابندگی کا اظہار ہوتا تھا فن کار کی نفسیاتی گہرائی کا مطالعہ کرنے سے اس کی تخلیق کو زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

چین کے شاہکاروں میں زیادہ تر درختوں، آبشاروں، باغوں اور پرندوں کی عکاسی کی گئی تھی۔ ایسے شاہکار کچھ پرانی طرز کے جان پڑتے تھے۔ جدید نمونوں میں "لوہے اور فولاد کے لئے جنگ" چین کی دسویں سالگرہ کی "قابلِ ذکر ہیں۔ الفائی تصویر "مور اور پھول" ایک رنگین اور خوب صورت پیش کش ہے۔

ہنگری کے فنی نمونوں میں "ماں اور بچہ" اور "سرکس" قابلِ ذکر ہیں۔ پولینڈ کے مرقعے غیر متوقع طور پر عام نوعیت کے تھے صرف دو فن کاروں کے شاہکار شاملِ نمائش تھے ان مرقعوں پر اثر پرستی کا غلبہ تھا الفائی مرقع The landscape from witkowice ایک حسین و جمیل نمونہ ہے۔ دوسری تصاویر میں "ایک آدمی کی تصویر" اور "پیلے پھول" خوب صورت نمونے تھے۔

فرانس کے شاہکار سب سے زیادہ دل فریب ہیں۔ ۳۳ برس کے ایک نوجوان بفٹ کا Torero نمائش کے بہترین نمونوں میں شامل تھا۔ اس فن کار نے اتنی چھوٹی عمر میں ہی اتنا اعلیٰ شاہکار پیش کیا ہے جو بڑے بڑے شاہکاروں پر بھاری ہے۔ اس نمونۂ فن میں جان بھی ہے اور ایک بے پناہ جاذبیت بھی۔ اسی طرح Le Corbusier جس نے چندی گڑھ کا نقشہ مرتب کیا تھا کا شاہکار "سمندری دیوتا" قابلِ تعریف ہے۔ کاربوزیر فرانس کا ایک مستند فن کار ہے۔ اس نے اپنے شاہکار میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ فرانس کے دو اور نمونے "کمپوزیشن" اور "پینٹنگ" قابلِ تحسین ہیں۔

اٹلی کی مصوری کے نمونے بہت اعلیٰ پایہ کے تھے۔

Reclining figure in interior ایک دل چسپ اور قابلِ قدر رومنی تصویر (آئیل پینٹنگ) ہے جس میں ایک حسین عورت آرام کرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ حقیقت پسندی، جاذبیت اور لطافت اس مرقع کی خصوصیات ہیں۔ دوسری تصاویر میں The landing ایک خوب صورت پیش کش ہے۔ تصویر شاعری اور موسیقی کا مرکب معلوم ہوتی ہے۔ اٹلی کا ایک شاہکار جو سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ Spatial Concept ہے یہ جدید فنِ مصوری کا ایک ایسا نمونہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ایک لمبے چوڑے کینوس پر چاقو سے چھدے ہوئے ۱۱۷ سوراخ ہیں۔ پس منظر کیا ہے، سوراخ علامتی طور پر کیا ظاہر کرتے ہیں یہ کچھ واضح نہیں ہوتا۔ تجریدی اور تقا جدید فنِ مصوری کا ایک خاصہ ہے اور اس اعتبار سے یہ شاہکار تدریج کا ایک نمونہ ہے۔

برطانیہ اور امریکہ کی تصاویر زیادہ تر گرافوں کی بنی ہوئی تھیں۔ معیاری اعتبار سے یہ شاہکار دل چسپ بھی ہیں اور جاذبِ نظر بھی۔ برطانیہ کی تصاویر میں Hera اور Standing figure قابلِ ذکر ہیں اور امریکی شاہکاروں میں "کالا اور نیلا" اور "سمندر کی آواز" قابلِ داد ہیں۔ خصوصاً مؤخر الذکر ایک طبع زاد اور خوب صورت گرافک کشیدہ تصویر ہے۔ اسی طرح ایک اور شاہکار Tobias and the Angel ہے جس کو دیکھ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ فن کار برتنے میں معنویت بھر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ملایا کے شاہکار نہایت خوب صورت اور لطیف ہیں - اور جدید فن کے مظہر ہیں ان میں قابلِ ذکر ہے The Bait جو تدریجی موضوع کا شاہکار ہے لیکن جاذبیت کا حامل ضرور ہے - منگولیا کے فن کے نمونے موجودہ دَور کے ترجمان نہیں - وہ یا تو روایتی طرز کی مصوّری کے نمونے ہیں - جن پر کچھ نہ کچھ مقامی رنگ اور تاویۂ نگاہ حاوی ہے، یا پھر منگولی فن کاروں نے مغربی فن کاروں کی حقیقت پسندی کو اپنے فن میں خوش اسلوبی سے سمویا ہے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی خاکہ کشی کا معیار بہت اونچا ہو گیا ہے "منگیت کار عورت" رنگینی کا اور Catching horse with lasso حرکت کا بہترین مرقع ہیں۔

جاپان کے شاہکاروں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے جدید فن مصوّری میں بہت ترقی حاصل کر لی ہے - 'شہید' ایک قابلِ داد مرقع ہے جس میں فن کار کی انفرادیت نمایاں ہے - دوسرے نمونوں میں 'باپ بیٹا' 'پھول' اور 'لہر' شامل ہیں - خصوصاً 'لہر' جس میں فن کار نے مغربیت کو اپنے فن میں خوب سمویا ہے - یہ شاہکار جاپانی اور مغربی فن کا ملا جلا نمونہ ہے - ایک اور مرقع "کچھ نہیں" ایک تدریجی نمونہ ہے - رنگوں کی پوتا پاتی کے سوا اس میں کسی اعلیٰ تخیل کا خلصہ نہیں۔

آسٹریلیا کے مرقعے جذبات نگاری کے نمونے ہیں - پختگی اور انقلابی رنگ مرقعوں کے حامل ہیں - 'بارکش کا رقص' کی مرقع نگاری کُلی نہیں معلوم ہوتی پھر بھی اس سے زورِ تخلیق نمایاں ہوتا ہے -

انڈونیشیا کے شاہکار جدید رجحانات کے ترجمان ہیں - واٹر کلر میں Masks ایک دل فریب تصویر ہے اسی طرح 'ایک لڑکی' جدید طرز کا مرقع ہے جس کی خوب صورتی اور دل کشی سے ہم فرد محظوظ ہو سکتے ہیں - سویڈن کی مصوّری میں 'خشکی اور تری' میں قابلِ قدر تخلہ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ایک نمونہ 'ایٹم کا دَور' ہے جو نفسیاتی اعتبار سے اس تباہی و بربادی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایٹم سے پیدا ہو سکتی ہے - آج کے دَور میں سائنس کے کرشمے بھی ہماری مصوّری کا موضوع بن رہے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن کار اپنے گرد و پیش کی زندگی اور سماجی اقدار سے بخوبی استفادہ کرتے ہوئے انھیں اپنے فن کا محرک بنا لیتے ہیں۔

"ایٹم کے دَور" سے ملتی جلتی ایک اور تصویر مشرقی جرمنی کے کمالِ فن کا نمونہ ہے۔ "دو جنگیں" - دو بیوائیں" ایک مزبوطی تصویر ہے جو جدیدیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے - حقیقت پسندی اس مرقع کی خصوصیت ہے جنگ کی تباہی کو جس رمزیہ طریقے پر پیش کیا ہے اس کا جواب نہیں - شاہکار میں دو بیوائیں — ایک پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم کا شکار ہیں اور دونوں مغموم و ہراساں شانہ بہ شانہ کھڑی ہوئی موضوعِ فن کی ترجمانی کر رہی ہیں -

ویت نام کے Lacquer کے شاہکار خوب صورتی اور دل کشی کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں - خطوں اور رنگوں کی تکنیک اور اُبھار میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے - یہ شاہکار بالعموم امیروں کے ذوقِ سلیم کو ظاہر کرتے ہیں - ان میں تخلیقی قوت کا اظہار نہیں ہاں اسلوب تو خوب صورتی کو بڑھا دیا ہے - "موسمِ بہار میں کھیت کو پانی دیتے ہوئے" قابلِ ذکر مرقع ہے -

بہ حیثیت مجموعی نمائش دل کشی اور فن کاری کا بھرپور نمونہ تھی - جن میں دنیا کے چیدہ چیدہ مصوّری کے شاہکار نمونے کر کے یکجا کر دئے گئے تھے - مرقعوں کی گہرائی اور گیرائی ان کی اہمیت کی ضامن تھی - دوسرے ان شاہکاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کا فن کار کسی مخصوص قدر، نظام یا اصول سے اپنے آپ کو باندھ کر نہیں رکھ سکتا - نمائش غور و فکر اور فلسفیانہ رموز کی نمائندگی بھی کرتی تھی - اس سے نہ صرف جدید فنِ مصوّری سے محظوظ ہونے کا موقع ملا بلکہ دعوتِ فکر بھی -

شمیم کرہانی

# غزل

شرابِ و شعر کے سانچے میں ڈھل کے آئی ہے
یہ شام کس کی گلی سے نکل کے آئی ہے

سمجھ رہا ہوں سحر کے فریبِ رنگیں کو
نیا لباس شبِ غم بدل کے آئی ہے

ترے قدم کی مہک ہے، تری قبا کی مہک
نسیم تیرے شبستاں سے چل کے آئی ہے

وفا پہ آنچ نہ آتی اگر، تو کہہ دیتے
زباں تک آج جو اک بات جل کے آئی ہے

سحر تک آ تو گئی شمع تابِ پروانہ
مگر حرارتِ غم سے پگھل کے آئی ہے

سجی ہوئی ہے ستاروں سے مے کدے کی فضا
کہ رات تیرے تصور میں ڈھل کے آئی ہے

ہماری آہ ہمارے ہی دل کی آہ نہیں
نہ جانے کتنے دلوں سے نکل کے آئی ہے

باحتیاط ہماری طرف اٹھی ہے نگاہ
لبوں پہ موجِ تبسم سنبھل کے آئی ہے

مری نگاہِ تمنا کا عکس ہو نہ شمیم
کسی کے رُخ پہ جو سُرخی مچل کے آئی ہے

احمد جمال پاشا

# فنِ لطیفہ گوئی

محفلِ تزئین واقعہ کو جس میں مزاح کی چاشنی ہو عمدہ اور لطیف پیرایہ میں اس انداز سے بیان کیا جائے کہ ان الفاظ یا فقروں کے سننے والے کو ہنسی آجائے لطیفہ کہیں گے۔ اس کے لئے حسنِ بیان و حسنِ ادا کی پابندی ضروری ہے۔ واقعہ کی دلچسپی ندرتِ بیان کے ساتھ اعتدال لئے ہوئے ہو سنانے والے میں اور سننے والے میں ذہنی ہم آہنگی تشبیہہ و استعارہ کے ربط کے ذریعہ ہو جو لطیفے کی جان ہیں اور جن کی مدد سے ہمارے جذبات ہماری تخیل سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

لطیفے کا حسن اس کے اختصار میں ہے ادھر مقرر کے منہ سے پھول جھڑنا شروع ہوں ادھر محفل میں قہقہوں کے جگنو چمکنے لگیں، اسی لئے اس کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

لمحاتی طور پر یہ ذہنی کھیل ایک ہنگامی فرار ہے اس مشینی دور کی اکتا دینے والی سنجیدہ مصروفیات و مسائل، غمِ جاناں و غمِ دوراں اور فکرِ فردا سے مشینی دور نے زندگی کے تقاضے زیادہ سنگین، سنجیدہ اور اہم بنا دئے ہیں۔ اب فرد کی حیثیت محض تماشائی کی نہیں وہ خود اس مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ لطیفے کے وقفے تک انسان سنجیدگی کے خول سے باہر آجاتا ہے اور جو وقت لطیفہ کہنے اور سننے میں کٹتا ہے وہ روزمرہ کے غم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اتنی دیر کے لئے سب آپس کے اختلافات کو بھول کر ایک دوسرے کے ہم آواز ہو جاتے ہیں۔

کچھ مشینی دور ہی پر موقوف نہیں ہر دور اپنے مصائب و مسائل اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مگر انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں اس نے ہمیشہ اپنی راہ میں کانٹے بچھائے اور بلائے ہیں وہاں اس نے کانٹوں میں پھول کھلانے کی جدوجہد بھی جاری رکھی ہے۔ اس حیوانِ ظریف کی یہی خوش طبعی ہمارے موضوع سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

لطیفے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مذاقِ سلیم پر بار نہ ہو، سماعت پر گراں نہ گزرے، اسی لئے لطیفے کو روحِ فصاحت اور نشاطِ روح کا درجہ دیا گیا ہے۔ لطیفہ ایک نہایت ہی لطیف شے ہے جس کے بیان کے لئے ایک خاص قسم کی ذہانت، حاضر جوابی اور بے ساختہ پن کی ضرورت ہے۔ اگر لطیفہ بحرِ طویل میں چلا گیا تو وہ حکایت، داستان، قصہ، افسانہ غرض کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر لطیفے کے ذیل میں ہرگز اس کا شمار نہ ہوگا۔ پھر اس میں پانی میں اٹھنے والے بلبلے کی سی جھاگ کی کیفیت نہ رہے گی اسے خندۂ قلقل نہ کہا جا سکے گا۔ اس کے انوکھے پن کا خمار نہ جاتا رہے گا۔

لطیفہ اچھا ہے لیکن سنانے والا اس کے فن سے ناواقف، جذبات تاثرات و لہجہ کے اتار چڑھاؤ پر قدرت نہیں رکھتا۔ دورانِ بیان اصل نکتہ سے ہٹ جاتا ہے۔ ہتھیلیوں کو ملنا دے دیتا ہے، کھانسنے اور کھنکھارنے لگتا ہے۔ درمیان میں بقیہ لطیفہ بھول جاتا ہے تو پھر لطیفے کی نزاکت تجسس و لطف رخصت ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ نازک مسئلہ لطیفہ لکھنے کا ہے۔ مخصوص واقعات، حالات اور ماحول سے متعلق لطیفہ ہو سکتا ہے کہ صفحۂ قرطاس پر آکر بے روح و بے جان ہو جائے پھر اس میں وہ کشش بھی باقی نہ رہ جائے جسے ہم کاغذ کے پھولوں

ہی سے تشبیہ دے سکیں اور لبھ لطیفے تو ایسے ہوتے ہیں جنہیں خود بیان یا ادا ہی کیا جا سکتا ہے۔ بہت کم لطیفے ایسے ہوتے ہیں جو کاغذ پر اترنے کے بعد بھی اسی قدر تازہ اور سدا بہار رہ جائیں۔

لطیفے کی ابتداء انسانیت کے آغاز کی داستان ہے۔ انسان جوں جوں تہذیب سے آشنا ہوتا گیا اس کا یہ جوہر نکھرتا گیا۔ جیسے جیسے اس کی اقامتی زندگی میں ٹھہراؤ آتا گیا وہ عام انسانی فطری ترقی میں زیادہ گہری دلچسپی لیتا گیا۔ اس کی یہی دلچسپی وہ نکتہ ہے جہاں سے لطیفے کے آغاز اور فنونِ لطیفہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس کو شروع میں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ رونے کی طرح ہنسنے کے لئے بھی پابند و مجبور ہے۔ اس کے نفسیاتی و فطری جواز سے وہ کبھی لاشعوری طور پر بھی بے خبر و منکر نہ ہو سکا۔ ہنسی کے عضویاتی عمل سے قطع نظر وہ بذلہ سنجی کا ملکہ قدرت کی جانب سے لے کر آیا تھا جس نے اُسے ثابت قدمی مسلسل جد و جہد، عمل اور حرکت پر قائم رکھا۔ اس کے انھیں عزائم نے زندگی، زندہ دلی اور شوخیوں کے سائے میں قدرت اور اس کے مظاہر پر فتح پائی۔ غاروں اور پیڑوں پر رہنے والے نیم وحشی انسان نے اپنی حس کا اظہار درختوں کی کھال اُتار کر اور اس کے سر کو قلم کر کے کیا۔ اس میں عصبیت تھی، جھنجھلاہٹ اور جہالت تھی۔ یہ وحشیانہ جذبہ تہذیب کے عروج نے دبا تو نہیں دیا مگر کم ضرور کر دیا۔ آج بھی غصے سے پاگل ہو جانے اور عقل سے ہاتھ دھو لینے والے انسان کی دیوانگی اور بچوں میں یہ جذبہ مل جاتا ہے جس میں تکلیف دے کر لطف اُٹھانے کی آرزو ملتی ہے۔ کیلے کے چھلکے سے پھسل کر گرنے والے کسی موٹے آدمی پر ہنسنے، کسی نیم پاگل انسان کو ستانے و شکار کرنے کی صورت میں اس کا اظہار آج بھی عام ہے۔ اس عملی مذاق کے پردے میں بنیادی طور پر وہ انسانی جذبہ پس پشت رہ جاتا ہے جو کسی بیمار، بے کس و بے زبان سے ہمدردی و مدد کرنے پر اکساتا ہے۔ وہ مجبوریاں اور خامیاں جو آج بھی انسان کے بس میں نہیں اور جن کے لئے وہ قدرت کے آگے بے دست و پا ہے اس کو لطیفے میں الوداع ایک ایسا لطیفہ ہے جس میں کوئی جان، کوئی مدح اور کوئی آمد نہیں جہاں طنز کا [illegible]

اس سے بعض ذہنی پستی و کج روی کا اظہار بھی ہوتا ہے جس میں آوردہی آورد ہے۔ عملی مذاق یا لطیفے کی انتہائی نا زیبندہ و نا پختہ شکل نے رفتہ رفتہ ارتقائی منازل طے کر کے اب یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی ذہانت کی اپیل کے اوپر ہنستا ہے۔ کون متکلم ایسا ہے جو اپنے ہم مجلسوں و ہم زبانوں کو خوش کرنا ناپسند کرے گا اور جو بذلہ سنجی اس قابلیت کا مالک ہوتا ہے بالعموم وہ ہر دل عزیز بھی ہوتا ہے۔ بذلہ سنجی کے سائے کی لطافت و نزاکت نے اہلِ علم کو بہت جلد اس کی جانب متوجہ کر لیا۔ علم و اخلاق کے معلمین نے اس کے پردے میں ناآشناؤں کو آشنائے راز کیا۔ جہالت، ظلم اور سماجی انصاف کے طوفان پر عقل و ذکاوت کے بند باندھے اور لطیفہ بالواسطہ طور پر اصلاح و تربیت کا ذریعہ بن گیا۔

ہمدردی و انسانیت کی جھلکیوں کے ساتھ گہری وابستگی نے تقریر، تحریر، عمل، صوت، حرکات و سکنات کے ذریعہ اس کا اظہار عام تر کر دیا۔ فنونِ لطیفہ کی یہ شکل رفتہ رفتہ عوام و خواص میں سب سے زیادہ مقبول و معروف ہوئی۔ ان کے لطافت نے زندہ دل بزرگوں کے جیسے مکالموں کی شیرازہ بندی میں وہی حیثیت اختیار کر لی جو قومی اور ملکی ادب میں لوک گیتوں کی ہو سکتی ہے۔

فیر شائستہ، خلافِ قیاس و اخلاق لطائف ہنوز علم سینہ ہی کی پہنائیوں میں غرق رہے۔ خواص اور اہلِ علم تو درکنار عوام کے با شعور و سنجیدہ طبقے میں بھی کبھی انھیں قبولِ عام کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی نفی ایک طرف تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے نے کی تو دوسری جانب مذہبی و اخلاقی حلقے بھی ان کی کھلم کھلا مذمت کرتے رہے اسی وجہ سے پست و اخلاق سوز لطائف مجلس و محفل کی کبھی زینت نہ بن سکے اور اس طرح یہ بلا کا گرا ہوا مال کبھی گلے کی زینت و زیور نہ بن سکا۔ گھروں میں وہی صاف ستھرے اور پاکیزہ لطائف مقبول رہے جو ذکاوت و ذہانت کا مرقع تھے اور جن کے انوکھے پن میں مسکراہٹوں کی جھلملیاں اور قہقہوں کے انار تھے۔

چونکہ لطیفہ گوئی قاری اور سامع دونوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور سبھی کی دلپسند چیز ہے اس لئے اس کے بارے میں ہر گز دو رائیں نہیں ہو سکتیں لہٰذا اچھا مبلغ، معلم، مقرر و سیاست دان بھی وہی سمجھا گیا جو ساتھ ہی اچھا لطیفہ گو بھی ہو۔ جو نفسِ مضمون، مطلب اور حصولِ خواہش کی خشکی

اپنی بذلہ سنجی سے دُور کرکے اپنی حاضر جوابی کی سامح وقاری سے فی البدیہہ داد حاصل کرسکے۔

یہ بحث بہت پرانی ہے کہ ہم کس چیز کو خلافِ تہذیب کہیں گے اور کس کو تہذیب کے دائرے میں لائیں گے۔ فحش وغیر فحش کے الفاظ بھی نسبتی ہیں۔ کل تک جو معیوب نہ تھا وہ آج سراپا عیب سمجھا جاسکتا ہے اور آج جو مستحسن ہے ہوسکتا ہے کل اس کا شمار گناہ کبیرہ میں کیا جانے لگے۔ قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ انھیں کے ساتھ فکر و نظر کے پیمانے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم لکھنؤ کے شرفاء بے تکلفی سے سرِ بازار ضلع جگت کرتے، پھبتی کستے، فقرے چست کرتے تھے مگر آج کی تہذیب اس کی روادار نہیں بلکہ یہ بات اپنی جگہ پر رہے کہ گو شستہ لکھنؤ کی پرانی تہذیب آج کے مقابلے میں بہت بلند تھی اس کے میار شائستگی کی آج بھی ہم قسم کھا سکتے ہیں۔ یورپ میں سرِ بازار کسی حسینہ کا بوسہ لے لینا یا اس سے بغل گیر ہونا حسن میں داخل ہے اور اس کو نظر انداز کرنا بداخلاقی۔ مگر آج بھی ہماری مشرقی تہذیب میں یہ انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے کی کوشش کرنے والا اخلاقی و قانونی گرفت میں آجاتا ہے۔

کسی کو خوش کرنا عقلاً و اخلاقاً ایک مستحسن فعل ہے۔ اہلِ ایمان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ "ان کے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے"۔ لطیفے کو مزاح المومنین کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور مومن کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ وہ "مزاح کی کوشش کرتا ہے اور شیریں سخن ہوتا ہے"۔ خود حضرت علیؓ نے اسے "حکمت کے نکتوں کا تحفہ" کہا اور "اشرف المخلوقات کی پہچان" قرار دیا ہے کیونکہ بذلہ سنجی سے عقل پر جلا ہوتی ہے۔

لطیفے کی چار قسمیں ہوتی ہیں:-

۱۔ تبسم آفریں
۲۔ خندۂ دندان نما
۳۔ قہقہے
۴۔ کشتنے

تبسم آفریں کا شمار مزاح یا سنجیدہ ظرافت میں ہے۔ یہ لطیفے کی سب سے اعلیٰ قسم ہے اس کا تعلق دل سے نکلے ہوئے کسی برجستہ فقرے، اچانک واقعے یا خوش گوار حادثے سے ہوتا ہے۔ اس کی تحریک بذلہ سنجی خوش مذاقی، رمز، طباعی یا کسی تلمیح کے پردے میں ہوتی ہے۔ یہ ظریف لطائف مخصوص شخصیات، واقعات، فضا اور ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس میں جذبات کی تسکین، مسرت حاصل کرنے اور دوسرے کی ذہانت پر ہنسنے اور ہنسانے پر مبنی ہوتی ہے۔ غیر معمولی تاریخی شخصیتوں بے حد ہیبت اور فہیم انسانوں، رہنماؤں، فلسفیوں، سیاست دانوں، معلّموں، مبلغوں، صحافیوں اور دیوپیکر شخصیتوں کے حالات و واقعات اس قسم کے دل کش لطائف سے پُر ہیں یہ قطعی بے ضرر ہوتے ہیں اور ساحرؔ کی حد تک انسان کو مسور کرکے اس کے بچپن کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس طرح عام زندگی بسر کرنے کی قوت ہنسی کی صورت میں نکل کر بچ جاتی ہے مثلاً:

شاہ عراق جس وقت گیارہ سال کے تھے اور لندن میں زیرِ تعلیم تھے ایک دفعہ ایک ماہر نفسیات نے ان سے کہا "جب میں بائیسکل پر سوار ہوتا ہوں تو میرے سوچنے کی رفتار دگنی ہو جاتی ہے۔" شاہ نے جواب دیا "پھر تو آپ کو موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سوچنا چاہیے۔"

لطیفے کی دوسری قسم خندۂ دندان نما ہے۔ اس کا شمار مذاق کے ذیل میں آتا ہے یعنی چھیڑ چھاڑ، چوٹ کرنے، جملہ چپکانے، فقرہ یا پھبتی کسنے، ضلع جگت کرنے یا طنز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں افادیت ہوتی ہے اور خواہش کی تسکین کے لئے کسی پر حربہ کیا جاتا ہے اس میں عدم تسکین کی بچپت ہنسی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً:

"اسکروائلڈ کا ایک ڈرامہ پہلی ہی رات کو فیل ہوگیا دوسرے دن اس کے دوست نے پوچھا: "کہو یار تمہارا ڈراما کیسا رہا؟" "اسکروائلڈ نے جواب دیا" ڈراما بے حد کامیاب رہا لیکن دیکھنے والے فیل ہوگئے۔"

لطیفے کی تیسری قسم قہقہہ ہے یہ تمسخر کی فہرست میں داخل ہے اور لطیفے کی سب سے خالص قسم ہے جو ظرافت، خوش مذاقی اور طباعی کی پیداوار ہے۔ اس میں خاص چیز اس کا بے ساختہ پن اور انوکھی سادگی ہے جس سے سامح وقاری بے اختیار اور اچانک ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگتا ہے اور یہ ہنسی دراصل شکل ہے اس بچپت کی جو ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً،

ایک تھیٹر کے مالک نے ایک طوطا پال رکھا تھا جو تھیٹر کے باہر پنجرے میں لٹکا رہتا تھا۔ جب لوگ ٹکٹ لینے آتے تو طوطا کہتا "باری باری آیئے مہربان — باری باری — لائن بنایئے مہربان۔" اس پر لوگ لائن میں لگ جاتے۔ ایک دن پنجرے کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے طوطا اڑ گیا۔ طوطے کا مالک اسے ڈھونڈتا ہوا ایک دن جنگل سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا اس کا طوطا بہت سے کوؤں میں پھنسا ہوا ہے اور کوے اس کے چونچیں مار رہے ہیں اور طوطا کہہ رہا تھا۔ "باری باری آیئے مہربان — باری باری — لائن بنایئے مہربان، لائن بنایئے۔"

لطیفہ کی چوتھی قسم کشیدہ ہے۔ دنیا کے لطائف خاص طور پر اور لطائف عام طور پر اس سے معمور ہیں۔ یہ لطائف کی مکروہ شکل ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ عموماً یہ لطائف اچھی صحبتوں، پاکیزہ محفلوں اور گھروں میں نہیں سنے یا سنائے جا سکتے۔ ان کا تعلق علم سینہ سے زیادہ ہے۔ ان کی بنیاد ہیجڑا، ہیجو، فحش جگت، عریانی، فحش اور صحبتی پر ہے۔ اس کا اظہار عموماً ہر سال اپریل کو علی الاعلان کی صورت میں بھی ہوتا ہے جس میں لطیفے کم ہوتے ہیں مگر بنائے اور گڑھے زیادہ جاتے ہیں کثیفے و خبیثانہ جذبات و خیالات کے اظہار سے زیادہ قریب ہیں۔ ان میں لطافت کم اور آورد زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً:-

ایک دن ایک طوائف ایک مجلس میں گئی اور اپنا جوتا رومال میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک امیر نے دریافت کیا۔ "آپ کا جوڑا بھی آپ کے ساتھ ہی رہتا ہے؟" طوائف نے جواب دیا "جی ہاں حضور میرا جوڑا تو میرے پاس ہے مگر آپ جیسے امیروں کا جوڑا نوکروں کی بغل میں رہتا ہے۔"

اکثر بے وقوف شخص یا معصوم بچے بھی لاشعوری طور پر ایسا لطیفہ سرکر دیتا ہے جو ہمیشہ کے لئے ذہن و تاریخ میں محفوظ ہو جاتا ہے لیکن اگر اس بات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو اس واقعہ کے تانے بانے کسی ایسے شخص، غیر معمولی واقعے، حال یا خیال سے لاشعوری طور پر مل جائیں گے جس نے اس معمولی ذہن کو حرکت دے کر ایسا غیر معمولی نمونہ پیش کیا۔ ضروری نہیں کہ آپ میرے خیالات سے متفق ہوں۔ مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ زیادہ تر لطائف غیر معمولی شخصیات، واقعات و حالات سے جنم لیتے ہیں یا منسوب ہیں۔ یوں بھی ہمارے آپ کے حلقۂ احباب میں ایسی باغ و بہار شخصیتیں خال خال نظر آ جاتی ہیں جن کی آمد باد نسیم سے زیادہ لطیف اور یاد خواب سے زیادہ نشاط آور ہوتی ہے۔ جن کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی ہے اور باوجود اپنی سنجیدگی، متانت و وقار کے محفل کو دم بھر میں زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ اس قسم کی شخصیتیں ہر عہد اور ہر دور میں مل جاتی ہیں۔ یہی وہ طاقت ور دماغ ہیں جو لطیفے کے موجد و سرچشمہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان کے ذہنی ارتقاء و اختراع کا مطالعہ دراصل لطیفے کی تاریخ کا جائزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی باغ و بہار ٹھوس شخصیتیں اعلیٰ سطح پر جا کر فلسفی، راہنما، مبلغ بھی ہو سکتی ہیں۔ واقعاتی طور پر کسی خاص واقعہ کو کسی خاص تشبیہ، استعارے یا کنایے کے ذریعہ دوسرے واقعہ سے اس طرح جوڑ کر عام واقعات سے مختلف انوکھا اس کے مماثل یا برعکس ہو جائے اور اصل واقعہ کی تحریف کرے، لطیفے کی اقسام میں داخل ہو جاتا ہے۔ مخصوص ماحول یا فضا سے بھی لطیفہ جنم پا سکتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ہمارا موضوع انسان ہے۔ اس کے حادثات، حالات، واقعات، ماحول، سماج اور ان کے آپس کے ٹکراؤ سے عدم توازن کی صورت میں جو مختلف واقعات رونما ہوتے ہیں وہ اپنے انوکھے پن کی وجہ سے لطیفہ کہلاتے ہیں۔ ہمارا تعلق جمادات و نباتات سے نہیں۔ لطیفے کا کسی نہ کسی صورت میں انسان اور اس کے لوازم سے تعلق از بسکہ ضروری و لازمی ہے۔ غیر جاندار اشیا ہمارے موضوع سے خارج ہیں کیونکہ لطیفے کا زندگی سے بہت ہی گہرا تعلق ہے اس کو کسی بھی صورت میں اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جو لطیفہ جتنا زیادہ مشہور اور اچھا ہوگا اتنا ہی سماج کی بڑی سے بڑی اکائی یا عالمی انسانی برادری سے متعلق ہوگا اور اس کی جڑیں سماج اور تہذیب کے باغ میں اتنی ہی زیادہ گہری ہوں گی۔

لطیفے کے بیج اسی زمین میں پھوٹتے ہیں اس کی بیل انھیں حالات

واقعات و ماحول کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ وقت اور حالات موسم کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ ان بدلتے ہوئے خیالات کا ٹکراؤ جدید و قدیم کی شکل میں کسی دور یا کسی بھی زمانے میں سادہ و معصوم جذبات کے سہارے شگوفے کھلاتا رہتا ہے۔

لطیفے کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اس کے پلاٹ اور مکالمات کا اتنا جذبہ عمل اپنے ایجاز کی مدد سے مزاحیہ فضا کی تعمیر کرتا ہے۔ تاثراتی وحدت و اندرونی تنظیم کی تکمیل اس اختصار کے ساتھ عمل میں آئے کہ اس کی منزل اتنی مختصر ہو جائے کہ اد ھر تار دیا جا اُدھر لاگ بُوجھا۔ جملوں کی تراش خراش اور برجستگی بھی ابلاغ کے عمل کو تیز تر کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے محاکاتی جملوں میں حسنِ ادا و حسنِ بیان کی پرچھائیاں بھی ہوں تاکہ جملوں کا رکھ رکھاؤ بچتے ہوئے الفاظ میں ہنسی کے بلبلوں کی صورت میں ظاہر ہو سکے۔ انداز بیان، طرزِ ادا، اسلوب و خیال کے عمومی سانچے، سماجی افراد کی ذہنی ساخت و رجحانات سے ہم آہنگ ہوں تاکہ ان لطائف کا تاثر کچھ اور شدید گہرا اور دیرپا ثابت ہو سکے۔ لطیفہ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی دنیا میں جہاں حسن و دل کشی سرور و سرخوشی و رقصاں نظر آئے وہاں سماج کے جن افراد کے لئے یہ پیش کیا گیا ہو وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اٹھا سکیں۔

لطیفہ سنتے ہی ہم بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں اس لئے اس کا براہِ راست تعلق لطیفہ و مزاح سے ہے۔ لطیفہ و مزاح کسی مزاحیہ کردار، مزاحیہ صورت واقعہ، لفظی بازی گری، موازنہ یا تحریف کے رنگ و روپ میں ابھر کر سامنے آتا ہے اور اس کا تعلق کسی بھی لطیفے میں اس کی کسی نہ کسی شکل یا صورت سے ضرور ہوتا ہے جن کے لطیفے سے بہت ہی نازک تعلق و لطیف فرق ہے۔ اس لئے اس کو ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ کیفیتیں ہیں جن میں لطیفہ بالعموم جنم پاتا ہے مثلاً:

لطیفہ و مزاح، ظرافت، رمز، فقرہ، طباعی، بذلہ سنجی
حاضر جوابی، مذاق، عملی مذاق، خوش مذاقی، اداکاری
تحریف، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تکرار، رعایت لفظی
ضلع جگت، معمہ، ہجو، پھکڑ، عریانی، ہزل، نرتل،
فحش، پھبتی، آوازہ، طعنہ، فقرہ، فقرہ بازی،
جملہ بازی، چوٹ، جلی کٹ

لطیفہ گو عموماً ظریف ہوتے تھے جو خوب صورت، خوش سیرت خوش قیافہ، خوش بیان، ذہین، دانا اور معتدل ہوتے تھے۔ وہ چہرہ اُتارنے کے فن سے بھی واقف ہوتے تھے۔ وہ لطائف کے پردے میں تاریخی معلومات اور نصیحتوں کے ساتھ گردی ہوئی زندگی کے اعلیٰ نمونوں سے بھی روشناس کروانے چلتے۔ مثال کے طور پر درویشوں اور داناؤں کی عقل مندی، خود داری، فیاضی، حق پرستی، جرات اور عدل کی مثالیں پیش کرتے اور حکایتیں سناتے کیونکہ ان کا سب سے اہم فریضہ تفہیم کو موم کرنا ہوتا تھا اور عرض کرنے سے پیشتر جان کی امان پانے کے باوجود جان سخت خطرے میں رہتی تھی۔ مطلق العنان حکمرانوں کے ندیم و وزیر کی حیثیت سے ان کے اندر روشن خیالی اور توازن پیدا کرنا انھیں عدل کی سیدھی لکیر سے نہ ہٹنے دینا اور لطیفے کی رنگی کے ذریعہ رعایا کے ان گلہ بانوں کو غیر شعوری طور پر ہانک کر دوبارہ راہِ عدل پر لگا دینا ہوتا تھا۔ خارجی و بیرونی معززات، عدم توازن بے ڈھنگے پن اور عدم تکمیل پر طنز کر کے وہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ ان کا مقصد اس کے پردے میں عمل جراحی کر کے فساد و فشار دور کرنا بھی ہوتا تھا۔ سولی پر چڑھتے وقت بھی لطیفہ سنانا اسی جرات و عظمت کی داستان ہے۔

ظریف حاضر جوابیوں کا آئینہ تھے۔ ان کے درمیان جو نازک کلامیاں ہوتیں وہ شاہانِ وقت کو اتنی دیر کے لئے جنگی مہمات، پیچیدہ ملکی مسائل، سیاست اور تفکرات کے عالم سے اٹھا کر ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتیں جہاں بذلہ سنجی کے مرہم چھونے سے مسرت و شادمانی کے سوتے پھوٹتے۔ علم و حکمت کے یہ مہذب جملے بلاکسی منطقی امداد کے سامعین کو خود بخود اس ذہنی سطح پر لے جاتے جہاں سچی ظرافت اپنے جوہر دکھاتی ہے اور ایسی ہر صحبت یادگار ہو جاتی ہے۔

ہر دربار اور ریاست سے وابستہ لطیفہ گو یا ظریف ہوا کرتے تھے جن کا کام تھکے ہارے حکمران کو اپنے باغ و بہار لطائف کے ذریعے تازہ کر دینا ہوتا تھا۔ ان درباروں میں جب تعیش کی لہر آئی انھوں نے

میدانِ جنگ کے مقابلے میں حسنِ سراپا اور جلوت کے مقابلہ میں خلوت کو ترجیح دی تو نہ صرف لطیفہ گوئی کا پیشہ عام ہوا بلکہ ظرفاء کی کثرت نے اس پیشے کو اس کی سطح سے بہت پست کر دیا عام درستہ مذاق، پھکڑ، ٹھٹھول اور ابتذال کی کھلی چھوٹ نے ظریف کو مسخرہ، بھانڈ اور لطیفے کو کثیف بنا دیا ورنہ لطیفہ گو نہایت کڑھا کڑھایا، ترشا ترشایا ماہر فن ہوا کرتا تھا جس کی ذہانت، ذکاوت، علمیت اور سوجھ بوجھ حاضر جوابی و بذلہ سنجی اُسے دوسروں سے داد دلواتی تھی۔ یا لواسطہ طور پر وہ آئینہ، نگران یا مشیر کار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ جیسے بیربل اور ملا دوپیازہ۔ جو محض ظریف نہ تھے بلکہ دربارِ اکبری کے نورتن اور وزیر با تدبیر بھی تھے۔ وہ ملکی معاملات پر ایک ماہر سیاست کی حیثیت سے بھی نظر رکھتے تھے۔

لطیفہ گویوں نے بہت سے جرموں کی خطائیں و سزائیں معاف کرائیں سلاطینِ وقت کی کایا پلٹ کی۔ بے قصوروں کو محفوظ کیا۔ مخلوب مقرر ہوئے۔ جلاوطن حبِّ وطن کے دامن سے ہم کنار ہوئے۔ بدکرداروں کو نیک بنایا۔ معزول بادشاہوں کو ان کے ملک واپس لوائے۔ خستہ حالوں کو دم بھر میں آسودہ کیا۔ ان گنت جھگڑے بے فیصل کرائے۔ شاہانِ وقت سے بیش بہا صلے پائے۔

تحریر کا فن ایجاد ہونے سے قبل لطائف سینہ بہ سینہ نسل در نسل چلتے رہے۔ ان کی حد بس زبان تک رہی۔ تحریر کا فن ایجاد ہونے کے بعد بھی عرصہ تک لطائف پر توجہ نہیں کی گئی۔ پھر سلاطین و مشاہیر کے حالات و تصانیف میں ان کی جھلک ملنے لگی۔ قدیم ترین کتاب "حکیم ایسپ کی کہانیاں" ہے جو اس نے بچوں کے درسِ اخلاق کے لئے جانوروں کی زبان سے بیان کی ہیں۔ عربی میں سب سے پہلے علامہ جاحظ (۱۵۰ھ تا ۲۵۵ھ) اس کی تصنیف "خود اپنی بات" کے لطائف قابلِ ذکر ہیں جن کی تقلید میں دوسرے قابلِ ذکر کارنامے وجود میں آئے۔ عربی سے یہ ذوق فارسی میں آیا۔ نظامی سمرقندی نے ۵۵۰ھ میں "جہار المقالات" لکھ کر فارسی ادب میں لطائف قلمبند کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ مگر سب سے زیادہ مقبولیت "مجمع الحکایات" کو ہوئی اور فارسی میں یہ رواج اتنا جڑ پکڑ گیا کہ ہر تذکرہ و بیاض نگار شعر و ادب کے ساتھ لطائف بھی نقل کرنے لگا۔ "نفائس الحکایات"۔ "مضحکات" اور "مطائباتِ سعدی" وغیرہ اسی سلسلے کی بے حد اہم کڑیاں ہیں۔ اردو کو یہ مذاق فارسی سے ورثے میں ملا۔ شروع میں لطائف منظم ہوتے رہے۔ تیرنے فارسی میں لطائف پر ایک مختصر رسالہ لکھا۔ انشا نے لطافت کے دریا بہائے مگر ادبی لطائف کی باقاعدہ ابتداء مرزا غالب سے ہوئی۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں انکے لطائف کو ایک باب کی صورت دی اور مرزا کو حیوان ظریف کہا۔ اس وقت سے اردو میں مشاہیر کی سوانح عمریوں میں لطائف کو بھی جگہ دی جانے لگی۔ اسی زمانے میں "پیامِ یار لکھنؤ" اور "پیامِ عاشق تمونج" نامی گلدستے شائع ہوتے تھے جو اپنے لطائف کے لئے مشہور ہیں۔ یہی اہتمام بعد میں "فتنہ" "اودھ پنچ" اور "اودھ اخبار" میں بھی ملتا ہے۔

دنیا کی ہر زبان میں لطیفوں کی دنیا آباد ہے جس میں اس کے اپنے لطیفے کم اور دوسری زبانوں کے زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر زبان میں اکثر ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کا مترادف دوسری زبانوں میں نہیں ملتا۔ اسی لئے عموماً ان کا ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا۔ لطیفہ دراصل عربی کا لفظ ہے جس سے یہ فارسی اور اردو میں آیا۔ انگریزی زبان میں لطیفے کے لئے ہم کو کوئی ایک مخصوص لفظ نہیں ملتا بلکہ Pleasentry, Wit, Wot, Jest, Joke, Humour, Quip, Pun, Irony اور Satire وغیرہ ملتے ہیں۔ دراصل ان سب کا لطیفے سے بہت ہی قریب کا تعلق ہے۔ مگر پھر بھی ان سے لطیفے کا مفہوم صحیح طریقے پر نہیں ادا کیا جا سکتا۔ مغربی لطائف کو ہم اسی عنوان کے تحت تسلیم کر لیتے ہیں جس سرخی کے ساتھ وہ ہم تک پہنچے ہیں۔

لطیفے کی ابتدائی شکل حکایتوں کی صورت میں ملتی ہے جس میں لطیفے کے پردے میں فلسفہ، بزرگ، درویش، صوفیائے کرام اور وزیر دانا شاہانِ وقت اور مریدوں کو ان حکمت اور نصیحت آمیز حکایتوں کے ذریعے راہِ حق پر لگانے کی سعی کرتے۔ اس کی مثال حکیم ایسپ، لقمان، بقراط، ارسطو، افلاطون، دیوجانس کلبی،

بزرگ ہمدرد، دید، بھان، برہمن، جعفر بر کی، شیخ سعدی، شیکسپیئر، ڈاکٹر جانسن ابوالفضل، بیربل، ملا دوپیازہ اور نعمت خان عالی محض ظریف اور لطیفہ گو ہی نہ تھے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان مفکروں مبلغوں اور وزیروں کے حکیمانہ نکتوں نے لطیفے کو دربار سے لے کر کتب وخانقاہ تک برابر تراشا خراشا، سنوارا اور نکھارا۔ انھیں کی بنیاد پر اخلاق وتہذیب نے گلستان بوستان اور انوار سہیلی جیسے فلک بوس قصر تعمیر کئے۔

راج دربار کے ساتھ یہ فن بھی رخصت ہوا۔ اب کوئی سعادت علی خاں نہیں جو انشا کے لطیفے سنے، کوئی بہادر شاہ ظفر نہیں جو مرزا کو ان کے حسب طلب کی داد دے۔ وہ باغ و بہار شخصیتیں اب اس قدر عام نہیں کیوں کہ ان کے اب قدرداں نہیں۔ یہ سب فراغت کی باتیں تھیں جو بادشاہت، جاگیرداری اور زمینداری کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ ارباب نشاط کے ساتھ لطیفہ گو اور لطیفہ گو کے ساتھ لطیفے بھی رخصت ہوئے۔ 'رنگیلے پیا' اور ان کے جانشینوں کی سرپرستی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ محمود و ایاز جیسے سرپرستوں کے ساتھ فردوسی، سعدی، ابوالفضل اور بیربل جیسے ظریفوں کا دور بھی ختم ہوا۔ وزیر اور ندیم کی جگہ مسخرے بھانڈ اور مفت خورے زیادہ دن نہ رہ سکے۔ انھوں نے آتے ہی اس قدر دھول اڑائی کہ لطیفے کا دامن گرد و غبار سے اٹ گیا۔ اس کی آب اتر گئی۔ "آپ" سے "تم" — "تم سے تو" — تو تو میں میں اور اس کے بعد عضویاتی مظاہرے ہونے لگے۔ شیخ چلی کی جگہ شیخ سرو آئے مگر اسماک کھا کے انھوں نے منہ کا مزا خراب کر کے ہی دم لیا۔ لطیفہ دربار سے بازار میں نکل آیا۔ فحش جگت اور پھبتیاں اس پر حاوی ہوگئیں۔ ان نوازشات کا یہ اثر ہوا کہ لطیفہ گوئی کا بلند معیار گرنے لگا۔ علماء کی جگہ جہلا نے سنبھال لی۔ اجنبی ہاتھ اسے سنبھال نہ سکے۔ ردِ عمل کے طور پر خواص وعوام کی ذہنی سطح بھی پست ہونے لگی۔ اس کی روشنی میں اگر ہم دہلی اور لکھنؤ کی حکومتوں کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ معاشی اور سیاسی زوال نے اس تہذیبی زوال کو اور بھی تیز تر کر دیا۔ دوسری دیسی ریاستیں بھی اس تاریخی بہاؤ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکیں حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب۔ غیر ملکی حکمرانی اور دیسی حکومتوں کے خاتمے نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ لطیفہ گوئی کی روشنی میں دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی جد کا کیا مذاق تھا۔

بادشاہت کے ساتھ لطیفہ گوئی کا جد رخصت ہوا۔ لطیفہ بازاں سے دربار میں واپس نہ جا سکا اب تک عام انسان تاج وتخت سے علاحدہ کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا لیکن اندرونی آزادی اور جمہوریت اپنے ساتھ آزادی کا پیغام لائی۔ مملوکیت رخصت ہوئی۔ فرد کی اہمیت سماج میں بڑھ گئی۔ انفرادی حیثیت سے پھلنے پھولنے کے مساوی حقوق نے شخصی آزادی کو سرسبز ہونے کا موقع دیا۔ شخصی آزادی کے ساتھ ادب وصحافت نے پھر سنبھالا لیا۔ جس کے دامن میں ظرافت نے پناہ لی۔ بہت جلد ملن عزیز پھر 'اودھ پنچ' کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ اودھ پنچ لطائف کا سرچشمہ ہے۔ اب ظریف اور داستان گو کی جگہ کتب ورسائل نے سنبھال لی۔ ملا نصرالدین کو اردو والوں نے شیخ چلی کے روپ میں پیش کیا۔ عربی والوں کے پاس جاحظ اور فارسی والوں کے پاس ملا کا کردار تھا مگر اردو ادب اس میدان میں کوئی نمایاں کردار نہ پیش کر سکا۔ شیخ چلی، ملا جی، حافظ جی، پنڈت جی، لال بجھکڑ، شیخ جی، خانصاحب نواب صاحب، افیمی، میاں جی کے پردے میں لطائف سماج کی خامیوں پر طنز کرتے رہے۔ کچھ شخصیتیں بھی سامنے آئیں اور کچھ لطائف کتابی صورت میں سامنے آئے۔ عہد جدید کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ لطائف کتب ورسائل کی صورت میں محفوظ ہونے لگے۔

اردو ادب میں کلاسیکی لطائف کا ذخیرہ بہت کم ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ خس وخاشاک کا ایک پہاڑ ہے جس میں کہیں کہیں طنز ومزاح کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ ورنہ زیادہ تر ان کثافت کی آورد وثقالت وعریانیت مذاق سلیم پر بار گزرتی ہے۔ ان میں 'گلدستۂ پنج، قتنۂ خندۂ گل، مذاق کا پٹارہ، ہنسی کا گول گپ، دیوانِ قہقہہ، لاحول، شیطان، بیربل، ملا دوپیازہ، شیخ چلی، لطائف ظرافت، رنگ ظرافت، غالب کے لطیفے، آب حیات کے لطیفے، لاد چٹکیاں اور گدگدیاں، ادیبوں کے لطائف، لطائف الشعراء، اکبر کے لطیفے سیاہ حاشیے اور مجاز کے لطیفے اردو ادب کا ایک ایسا گلدستہ ہیں۔

جس میں گُل بھی ہیں اور گِل بھی۔ بیشتر لطائف آپ کے مذاق و معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان مجموعوں کے ساتھ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ عموماً بیشتر کتب میں تقریباً ایک ہی سے لطیفے معمولی ردو بدل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کا چہرہ ماند و مسخ کر دیا ہے۔ دفتر کے دفتر اکٹھے پڑھ بھی لیا اوقات ایک لطیفہ بھی ایسا نہیں ملتا جو اعلیٰ علمی و ادبی معیار پر پورا اتر سکے۔ بعض کتب میں خال خال ایسے بھی لطائف مل جاتے ہیں جو روح کو پھڑکا دیتے ہیں۔ ذہانت کو حرکت دیتے اور ہمارے لئے مسرت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

دورِ حاضر اردو لطائف کی تاریخ میں اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں اسے اپنا کھویا ہوا درجہ اور وقار رفتہ رفتہ واپس مل رہا ہے۔ اچھے ادبی انتخاب سامنے آ رہے ہیں۔ ادبی رسائل، منتخب رسائل اور بچوں کے رسائل خاص طور پر اچھے اور معیاری لطائف کو زیادہ سے زیادہ اپنے دامن میں جگہ دے رہے ہیں۔

لطیفہ گوئی کی موجودہ صورت حال سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ اس کا مستقبل خاصا واضح اور روشن ہے۔ اس میں اصلاح اضافہ اور ترقی کے امکانات بہت صاف ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی فطری دلازمی ہے۔ زبان کے پھیلاؤ، گہرائی و گیرائی کے ساتھ اس میں جو اضافے ہوئے ہیں ان کا معیار آئندہ اور بھی ستھرا اور بلند ہوگا۔

---

ساقی لکھنوی

# غزل

جہاں نفاق کے شعلے ملیں بجھا کے چلو
چراغ امن و محبت کا تم جلا کے چلو

تمہارے بعد بھی آئیں گے قافلے یارو
ملیں جو راہ میں کانٹے انھیں ہٹا کے چلو

نہ میکدے سے کبھی کوئی تشنہ کام پھرے
نظامِ مے کدہ ایسا تو کچھ بنا کے چلو

تھکے ہوؤں کو ملے جن کی چھاؤں میں آرام
شجر کچھ ایسے سرِ رہگذر لگا کے چلو

ابھی تو کام انھیں بھی بہت سے باقی ہیں
نمودِ صبح ہے سوتوں کو بھی جگا کے چلو

اشارہ وقت کا یہ ہے کہ اے جہاں والو
نیاز و ناز کی تفریق کو مٹا کے چلو

مزہ تو ہنسنے کا جب ہے کہ اپنے ساتھ ذرا
غمِ زمانہ کے ماروں کو بھی ہنسا کے چلو

بھٹک رہے ہیں جو راہوں میں دیوگے تم کو دعا
بجھے چراغ سرِ رہگذر جلا کے چلو

ملے ہیں ہوش و خرد اس لئے تمہیں ساقی
جنوں کی راہ میں ہوش و خرد لٹا کے چلو

# قطعاتِ تاریخِ وفاتِ جگرؔ مرادآبادی

(درصنعتِ تخمیر ج)

آہ صد افسوس رحلت کرگئے حضرتِ جگرؔ
کیوں نہ اک ماتم کدہ آئے نظر ہندوستاں
دورِ حاضر کے تھے یہ اک نکتہ سنج باکمال
کر رہا تھا ناز ان کی ذات پر ہندوستاں
حلقۂ اربابِ فن میں آج ہے ان کی کمی
جس قدر بھی ہو تو کم ہے تو حہ گر ہندوستاں
نام آور ہستیوں نے پائی اس میں پرورش
ہے سبھی کہوارۂ اہلِ ہنر ہندوستاں
تخمیج میں یوں کہا ذاؔنق نے سالِ انتقال
چرخِ نیرؔ جاہ لے مہ، لے جگر ہندوستاں

| | | | |
|---|---|---|---|
| | ۸۰ | ھ | ۱۳ |
| چرخ نیرؔ جاہ | ۱۰۷۲ | ہندوستاں | ۵۷۶ ۱۰۲۷ |
| مہ | ۴۵ | جگر | ۲۲۳ ۳۵۳ |
| | ۱۰۲۷ | | ۳۵۳ جملہ ۱۳۸۰ |

(درصنعتِ تخمیر ج)

ہزار افسوس، کی جہاں سے علی سکندر جگرؔ نے رحلت
غزل سرائی کی انجمن پر فسردگی چھا رہی ہے دیکھو
کلیم سینائے نکتہ دانی فہیم صہبائے خوش بیانی
سمٹ کر اس کو قضا خود اپنے کئے پہ پچھتا رہی ہے دیکھو
ربیع اوّل کی ہفدہم اور جمعہ کی صبح تھی قیامت
اگرچہ ہم میں جگرؔ نہیں ان کی یاد تڑپا رہی ہے دیکھو
جگرؔ نے پائی عجب طبیعت جگرؔ میں دیکھی بلا کی جدت
یہ جام چھلکا رہی ہے دیکھو وہ کیف برسا رہی ہے دیکھو
کہا ہے ذاؔنق نے تخمیر میں سنِ وفات اس طرح سے کہ
جگرؔ سے خالی زمینِ ہندوستاں نظر آ رہی ہے دیکھو

| | | | |
|---|---|---|---|
| | ۸۰ | ھ | ۱۳ |
| زمینِ ہندوستاں | ۶۸۳ | | ۴۶۰ |
| جگرؔ | ۲۲۳ | | ۴۶۰ |
| | ۴۶۰ | | ۸۰ ۱۳ |

(درصنعتِ تخمیر و تلمیح)

اک حشر ہے برپا چمنستانِ سخن میں
نغموں کے عوض آتی ہے آوازِ فغاں آج
اربابِ ادب ہم سے بچھڑنے لگے افسوس
بیساب کہاں آج ہے حسرت ہے کہاں آج
کس بزم میں کس دل میں نہیں یادِ جگرؔ کی
ہے سوگ یہاں آج تو ماتم ہے وہاں آج
ذاؔنق نے کہا تلمیح و تخمیر میں سال
ہے خاک بسر لہجہ غزل اشک فشاں آج

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| | ۸۰ | | ھ | | ۱۳ |
| لہجہ | ۴۳ | غزل | ۱۰۳۷ | | ۶۶۴ |
| خاک | ۶۲۱ | اشک | ۳۲۱ | وضح | جملہ ۷۱۶ |
| | ۶۶۴ | | ۷۱۶ | | ۱۳۸۰ |

غلام نبی خیال

# کشمیری ادب میں دیگر زبانوں کے تراجم

کسی ملک اور قوم کے ادبی خزانے بھی مالا مال کہلائے جا سکتے ہیں کہ ان کا دامن دوسری زبانوں کے ادب عالیہ سے خالی نہ ہو۔ مہذب دنیا کی تمام بڑی زبانوں کی گہرائی اور گیرائی بہت حد تک اسی بات کی مرہون منت ہے کہ انھوں نے اپنے دامن کو عالمی ادب کے گنج ہائے گراں مایہ سے بھر لیا۔ ہر قسم کے ادب میں طبع زاد تخلیقوں کے ہوتے ہوئے بھی دنیائے ادب کے عظیم ادبی شاہکاروں کے تراجم ہی دراصل اس کے ذخیرہ میں وسعت اور پہنائی پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ تاریخ ادب ہمیں بتاتی ہے کہ جن زبانوں کا ادب آج سرمایہ دار ہے انھوں نے وقتاً فوقتاً دوسری زبانوں کے ادب سے اپنے کو متمول بنایا۔

ایک زبان کا ادب دوسری زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس کی بدولت جہاں کسی قوم اور ملت کی ثقافتی دنیا میں خطرناک انتشار پیدا ہو جاتا ہے وہاں اس ملک قوم کے افراد دوسری جگہوں کی سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی کے جزوی یا کلی کیفیات سے آگاہ ہوتے ہیں۔

ترجمہ کرنے کا کام جہاں مترجم سے اس کی فنی صلاحیتوں کا متقاضی ہوتا ہے وہاں اس بات کو بھی ناگزیر قرار دیا جانا چاہیئے کہ مترجم دونوں زبانوں یعنی جس سے ترجمہ کرنا مقصود ہو اور جس میں ترجمہ کیا جائے پوری دسترس رکھتے ہوئے ان زبانوں کے تلازمے و تراکیب کو معنوی و صوری دونوں خوبیوں کے ساتھ استعمال کرنے میں طاق ہو۔ کامیاب ترجمہ وہی کہلایا جا سکتا ہے جسے پڑھ کر نہ صرف اصل کا گمان ہو بلکہ اس کی اصلی لطافت اور شیرینی میں بھی اضافہ کا باعث ہے۔ انھیں باتوں کے پیش نظر علماء نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ترجمہ کرنا بسا اوقات اصل متن کہنے سے زیادہ مشکل صورت اختیار کر تا ہے۔ مہدی حسن اس بارے میں فرماتے ہیں،

"ہر زبان کے خصائص نوعی مختلف ہیں۔ جس طرح ایک روزمرہ یا محاورہ، استعارہ تا تلمیح میں ایک خیال کو ادا کر سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ دوسری زبانوں میں بھی اسی قبیل کے الفاظ موجود ہوں۔ اس سے بھی زیادہ مشکل اصطلاحات کی ہے۔"

منظوم چیز کو محض منظوم سانچے میں ڈھالنا اور وہ بھی اس طریقے پر کہ نہ تو اصل کے ساتھ انصاف ہو سکے اور نہ ہی ترجمہ سے کوئی مقصد حل ہو۔ ایک طرف اگر مصنف کی عرق ریزی کو مترجم کی تفریح طبع پر قربان کرنے کا ثبوت دیتا ہے وہاں بجائے خود مترجم کی فنی خامیوں کی قلعی کھول دیتا ہے۔ کشمیری ادب کے اکثر و بیشتر تراجم اسی قبیح کا شکار نظر آتے ہیں۔ تفصیل کے ساتھ آگے بحث ہوگی فی الحال ہم ذیل کی دو مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ فارسی کا ایک مشہور مصرع ہے ع

بیا ساقی کہ چوں میرم کفنی از برگ تاکم کن

اور ہمارے کئی ٹک بند شاعر نے اسی مصرع کو اپنی زبان میں یوں ڈھالا ہے ع

دہ لو ہا سا یقومرہ یکمن کرئے زیم دُ چھے پنہ کوئی

اسی طرح ع

عاشقی چیست بگو بندۂ جانان بودن

کا بے جان سا لفظی ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے ع

عاشقی کیاہ چھُ وُنِ بندۂ جاناں آسُن

کشمیری ادب کے شعری خزینے فی الحقیقت فارسی شاعری کے خرمن کی خوشہ چینی سے ہی مالا مال ہوئے ہیں۔ فارسی مدتوں تک بادشاہانِ کشمیر کی درباری زبان رہی ہے اور اس زبان کے پھیلاؤ نے یہاں کے باشعور طبقہ کو بھی فارسی علم و ادب کی طرف راغب کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ہمارے شاعروں نے فارسی کا اثر قبول کیا اور ان کے کلام پر فارسیت کی چھاپ نظر آنے لگی۔ اس چیز نے جہاں ہماری زبان کے دامن کو اور بھی وسعت بخشی وہاں ہمارا ادب اسی کی بدولت پروان چڑھتا گیا۔ محمود گامی، رسول میر، مہتول، حقانی اور وہاب کھنی ہمارے ان سخن وروں کے سرِ فہرست ہیں جن کی شاعری کے چشمے براہ راست فارسی کے سوتوں سے پھوٹے ہیں۔ مانا کہ بعض جگہ انھوں نے فارسی زبان و ادب کو بے جا تقلید کی حد تک اپنایا لیکن ٹھوس پہلو کی طرف ایک چٹکی سی نظر ڈالنا سراسر ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ اسی اتباع اور تقلید کی بدولت ہمارے ادب میں شاہنامہ فردوسی جیسے عظیم ترین شاہکار اور گل رعنا جیسی مقبول عام مثنوی کا اضافہ ہوا۔

فارسی مثنوی کا ہمارے ادب میں داخل ہونا یا الفصوص ہمارے ادبی ارتقاء کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن گیا۔ فارسی مثنویوں کو کشمیری میں منتقل کرنے کی وجہ سے ہی شیریں خسرو، وامق عذرا، لیلیٰ مجنوں اور شاہنامہ کی داستانوں کے اکثر کردار ہماری زندگی کے اتنے قریب آگئے ہیں کہ ہم آج بھی اپنی محفلوں میں ان کے کارناموں کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔

محمود گامی اٹھارھویں صدی میں منظر عام پر آیا۔ اس نے اگرچہ شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی لیکن اس کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی داستانوں کا منظوم کشمیری ترجمہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں جا بجا فارسی ادب کے بھرپور اثر کے ساتھ فارسیت کا اژدہام نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ ان تراجم نے ہمارے ادب میں خاطر خواہ اضافے کئے۔ محمود نے لیلیٰ مجنوں، شیریں خسرو، یوسف زلیخا سلطان محمود غزنوی، قصۂ ہارون الرشید، شیخ صنعان اور شیخ منصور جیسی فارسی مثنویوں کو کشمیری زبان میں نظم کیا۔ محمود کی لیلیٰ مجنوں اگرچہ عبارت کے لحاظ سے نظامی گنجوی کی لیلیٰ مجنوں سے مختلف دکھائی دیتی ہے لیکن پھر بھی محمود اس میں نظامی کے خرمن کا ہی خوشہ چین رہا ہے قصۂ ہارون الرشید بھی نظامی ہی کے ایک قصے سے ماخوذ ہے۔ مثنوی یوسف زلیخا اور شیریں خسرو بالترتیب مولانا جامی اور نظامی کی فارسی مثنویات کے تراجم ہیں جن میں بعض جگہوں پر اگر چہ مترجم نے ایجاز و اختصار سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن داستانوں کی دلچسپی اور معنوں کے تسلسل میں محمود کے قلم نے کوئی فرق نہ آنے دیا ہے۔ ان مثنویوں کے آخیر میں مترجم مصنفین کو ان الفاظ میں عقیدت پیش کرتا ہے ؎

درزلیخاؤن یہ حضرت جامیں وؤن یہ کاشرعۍ پٹھ محمود گامیں (یوسف زلیخا)

ہزاراں رحمت حق بر نظامی غلام درگہش محمود گامی! (شیریں خسرو)

مثنوی یوسف زلیخا میں اختصار سے کام لیتے وقت محمود نے اپنی اخلاقی روایتوں کے پیش نظر جامی کے کچھ ایسے حصے حذف کر دیے ہیں جو کسی بھی صورت میں کشمیر کے ایک سنجیدہ قاری کے حسن ذوق کو ٹھیس پہنچاتے۔

مثنوی کے آخیر میں جو مرثیہ "نادلایہ میانۍ یوسوفن وون لو" یوسف کے مرنے پر زلیخا کی زبان سے کہلوایا گیا ہے وہ آج بھی کشمیر میں زبان زد عوام و خواص ہے۔

مقبول کرالہ واری ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر کے اہل علم طبقہ میں خاص طور سے فارسی زبان کا فی مروج تھی۔ چنانچہ اس صدی کے مشہور شعراء محمود اور رسول میر کے کلام پر بھی فارسی زبان کا گہرا اثر ہے۔ مقبول خود فارسی علم و ادب سے آشنا تھا وہ بھی اس اثر سے بچ نہ سکا۔ گل رعنا کا کشمیری ترجمہ بھی درحقیقت اسی قدر و منزلت کے ردِ عمل کا لازمی نتیجہ ہے جو اس دور میں فارسی زبان و ادب نے سرزمین کشمیر میں حاصل کی تھی۔ یہ ترجمہ مقبول نے

۱۸۶۳ء یعنی اپنی عمر کے اس حصے میں کیا جبکہ اس کا شعور پختگی کے لحاظ سے معراجِ کمال پر تھا۔ یہ تالیف ۱۲۸۶ھ میں بہار کے دنوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی جیسا کہ تاریخِ اختتام کے بارے میں خود مقبول نے لکھا ہے ؎

سنہ باہ مشیتہ نبیے پیچو شیتن برابر
بہار س منزیہ نسخہ دوت تاسر

ہمارے یہاں بزمیہ مثنویوں کی اگرچہ کوئی کمی نہیں لیکن گل ریز نے اپنی سلاست اور شاعرانہ قوتِ تخیل کی وجہ سے ان سب پر سبقت لی ہے۔ واقع رہے کہ کشمیری ادب میں گل ریز سے زیادہ کسی مثنوی کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا اور اس کے اشعار ہمارے عوام کی زبان پر یہی جیسے طربیہ محفلوں اور اجتماعوں میں آج بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ قطع نظر ان اوصاف کے مقبول کے یہاں بھی یہیں فارسی کی اس قدر بہتات نظر آتی ہے کہ اُسے "تقلید بے جا" کا نام دینا مبالغہ نہ ہوگا۔ ترجمہ میں وہ بھی بغیر کسی پس و پیش کے فارسی الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے چلے جاتے ہیں جو کانوں کو بوجھل معلوم ہوتی ہیں اور مثنوی کی ابتدا تو خالص فارسی کے اشعار سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

خدایا چہرہ امید بنا سئے — درے از حکمت جاوید بکشاے
چراغ فکرت و طبعم برافروز — زبانم در سخن دُر سفتن آموز
مبدّل حنظلم را بار طب کن — زبانم پُر شکر از نوشش لب کن
درود بے شمار و نعمت بے حد — مدام باد از ما بر محمدؐ
سرم باد انثار پے چار یارش — فدائے آل و اصحاب کبارش

شاہنامہ کلاسیکی ادب کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس نے فردوسی کو ملک الشعراء بنا کر رشکِ زمین کے سخن فہموں سے خراجِ تحسین وصول کیا

وہاب پرے نے شاہنامہ کو کشمیری میں منتقل کر کے دل گرفتہ کا ایک قابلِ داد ثبوت دیا ہے۔ اس ترجمہ کی بدولت کشمیری ادب میں رزمیہ شاعری پہلی بار نظر آتی ہے۔ اپنی بیباروزیسی کی وجہ سے وہاب اگرچہ کشمیری مصنفین میں اپنی نظیر نہیں رکھتے مگر جس کارنامے نے ان کی ادبی شخصیت کو ہمارے سامنے اُجاگر کر دیا ہے وہ یہی ترجمہ ہے۔

وہاب ابھی سنِ بلوغت میں قدم ہی رکھ چکے تھے کہ انھوں نے شاہنامہ کا ذکر سنا جو انھیں دنوں بمبئی کے ایک مطبع سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ حاجن کی وساطت سے یہ نسخہ وہاب کو دستیاب ہوا لیکن مالک نسخہ کے واپس کرنے کے اصرار نے وہاب کو اس کے ترجمہ پہ محرک کیا اور اسی نے لکھا ؎

تر بُوز تھ بزیت سیٹھاہ خارم گوم — ازاں کینہ زن ہے دُے تار مسوم
سیب یُتھ چُھ از خارہ بازی بتن — گیم راے شاہنامہ کا اثر ہُوتھ

ہر چند وہاب کا فردوسی کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اس کا سارا کلام دروغ گوئی اور من گھڑت افسانوں کا ذخیرہ ہے ؎

چُھ سوُر دی کلام دروغ و خراب — چُھ رادی تمیک لیا دتان آ صواب
کہ ہرگز نہ نظم آرا استم — بُگفتم دروغ ہر چہ خود خوا استم

لیکن وہاب کا یہ دعویٰ ان کی مبالغہ آمیزی کے سوا اور کچھ نہیں کہ

پُنے داوہ دُردانہ تھادم جرُ تھ

کیونکہ فردوسی نے اپنے آتش بیان اور جادو نگار قلم سے افسانے کو زندۂ جاوید روپ عطا کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کے فن کی عظمت رفعتوں کی آخری منزلوں کو روند چکی ہے۔

وہاب کو نسخۂ شاہنامہ کے حاصل ہونے کے واقعہ کے پیشِ نظر شبہ ہے کہ وہاب نے کسی ادبی مقصد یا طبعی امنگ کے تحت ترجمہ کرنے کا کام ہاتھ میں نہیں لیا تھا بلکہ اس میں 'غیرت' یا 'رشک' کا جذبہ کارفرما تھا۔ ظاہر ہے کہ جذبۂ ثانی کے مطابق کوئی ادبی کارنامہ صحیح معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ وہاب چونکہ اس 'دردِ سر' سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے نتیجہ کے طور پر ان کا شاہنامہ قارئین میں وہ جوش و خروش کلیتاً پیدا نہیں کر سکا ہے جس کی وجہ سے فردوسی کا لوہا مانا جاتا ہے جس شاہنامہ نے فردوسی کی رگوں سے خون کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔ اس کے قلم برداشتہ ترجمہ میں (جو بجائے خود محلیات میں مکمل ہو سکتا ہے) تکمیل کی طلب اس بات کی آئینہ دار ہے کہ وہاب نے یہ

کھیل شوقیہ شروع کیا تھا لیکن بعد میں انھوں نے اپنے آپ کو یہ چیلنج دینے سے باز رکھنا ہی مناسب سمجھا اور ساڑھے ہزار اشعار کو تیئس ۲۳ ہزار اشعار میں 'تبدیل' کرکے دم لیا۔

وہاب پیرے نے فارسی کے ہفت قصۂ مکرزن، قصۂ چہار درویش، بہرام گور اور حمید اللہ اسلام آبادی کے اکبر نامہ کو بھی منظوم کشمیری میں تالیف کیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اردو کی ایک عشقیہ داستان 'نونہال گلبدن' کو کشمیری لباس پہنا دیا ہے۔ ان تراجم کا تفصیلی ذکر زیادہ اہم نہیں۔

مولوی صدیق اللہ حاجنی نے نظامی کے سکندر نامہ کا کشمیری میں ترجمہ کیا ہے جو حد سے زیادہ اختصار کی وجہ سے اصل کا ایک خلاصہ معلوم ہوتا ہے۔

پیر عزیز اللہ حقانی کشمیری زبان کے ایک صوفی شاعر گزرے ہیں جنھوں نے ابتداء سے ہی فارسی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے فارسی کی چند مشہور و معروف مثنویوں کو کشمیری میں منتقل کیا جن میں جوہر عشق، قصۂ ممتاز بے نظیر، گلدستہ بے نظیر، مثنوی چندر بدن، مہر و وفا، انذام، گلبن عشق اور جنگ عراق اور روضۃ الشہداء وغیرہ شامل ہیں۔

حقانی کی ان جملہ تالیفات میں قصۂ ممتاز بے نظیر ایک دلچسپ اور رنگین رومانی داستان ہے جسے مترجم نے چھ جلدوں میں نظم کیا ہے۔ مجموعی طور پر حقانی نے جو داد غزل کے میدان میں حاصل کی ہے وہ انھیں تراجم میں نصیب نہ ہو سکی۔

گلستان سعدی کی چند ابتدائی حکایات کا کسی مرزا محمود نے کشمیری میں ترجمہ کیا ہے لیکن اس میں وہ فصاحت و بلاغت نام کو نہیں جو سعدی کے اس شاہکار کا خاصہ ہے اور مترجم اپنی زبان میں اس کی تصنع اور مسجع عبارت کا احاطہ کرنے سے کوسوں دور رہے ہیں۔ مثلاً ؎

اَذَا یُسِّرَ الْاِنْسَانُ طَالَ لِسَانُہٗ
کَسَبْزَمْ مَغْلُوْبٌ لَعُوْلٌ عَلَی الْکَلْبِ

ترجمہ یوں ہے:

یَلہ عاجز گژھ کانژھاہ زیٹھ زیو چھو عرسو ہران
تنگ گژھس بزور ہونس شب دوون تے چھو زلان

اسی طرح اس قرآنی آیہ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ کا ترجمہ ژٹھ ژاپو تہ لکن کرو عفو کیا ہے جو معنوی لحاظ سے سراسر نادرست ہے۔

مدّس حالی کو کشمیری نظم میں ڈھالنے کا بڑا پروفیسر محی الدین حاجنی نے اٹھایا تھا جو گل ریز کے صفحات پر باقساط شائع بھی ہو چکا ہے۔ حاجنی صاحب کے حسن ذوق میں جو داہلا نہ کھردرا پن موجود ہے اس کے پیش نظر اس بات کا مشکل سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کی لطیف و نازک صنف کا بار بھی اٹھا سکتے ہیں۔ ترجمہ مدّس پڑھنے کے بعد قاری بلا مبالغہ کہہ سکتا ہے کہ حاجنی صاحب کا قلم تک بندی کی حدود سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ اکثر بندوں کے لفظی ترجمہ نے جہاں ترجمہ میں غیر شعریت کا انعقاد کر دیا ہے وہاں کشمیری محاورات و تلمیح کی اصل روح بھی مسخ ہو کے رہ گئی ہے۔ چند ایک مثالوں سے وضاحت کی جاتی ہے ؎

ڈرایا تعصب سے ان کو یہ کہہ کر
کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
سوا وہ ہماری جماعت سے باہر
وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اس کے یار

نہیں حق سے کچھ اس عجمت کو بہرا
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

ترجمہ یوں ہے ؎

ڈرأوِن تے قصبہ نشی وُنیتہ لی
لیٹی مودیا زندہ روزی وژھیت لی
الگ میانہ اُمژنخ سوی الگ گھوئی
چھنہ سوی زاندہ نہ تمنہ وا ہئی چھی

خدا یہ لوک حصہ دار چھنہ
کریو زوزنہ اون لیس تی ہے چلونہ

حق تو یہ ہے کہ ترجمہ میں اس سے زیادہ بے ڈھنگے پن کی اور کیا مثال مل سکتی ہے۔

ع - کیا دینِ حق کو جو بد نام اُنھوں نے (حالی)

ع - یہ ٹرس کو روی دینکس پاک شینس (حاجی)

دین کو برف سے تشبیہ دینا کسی بھی صورت میں برمحل اور زیبا نہیں ہے۔

اصل - دگر نہ ہماری رگوں میں لہو میں
ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں

ترجمہ - نتہ خُو نہ منزُو یا کہ سائین رگن منز
ارادن بنے جستجو چنین پکھن منز۔

مولانا حالی مرحوم کا اس بند سے یہ مطلب ہے کہ ہماری حرکات و سکنات اور طبیعت و فطرت میں نجابت کا کوئی ذرّہ باقی نہیں رہا ہے اور اگر ہو بھی تو محض اتفاق کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ حاجی صاحب کا پہلا ہی شعر کیا معنی دیتا ہے نتہ خُو نہ منزُو کوئی مفہوم ادا نہیں کرتا۔ دوسرے مصرع میں انھوں نے ارادوں کے پَر لگا کر حالی مرحوم سے بھی دو قدم آگے جانے کا شرف حاصل کیا ہے۔ مولانا مرحوم کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ ہم مسلمان اپنی ماضی کی تمام روایات کو بھول کر اپنی عظمتِ گذشتہ کا کوئی احترام نہیں کرتے۔ یہاں انھوں نے ارادہ، جستجو، دلِ زبان، طبیعت فطرت وغیرہ استعمال کئے ہیں۔ بھلا یہ ارادوں کے پروں میں بھی نجابت کا ذرّہ باقی نہ رہنا چہ معنی دارد؟ ارادوں میں کیوں نہیں۔

حاجی صاحب کئی جگہوں پر ترنگ میں آکر ردیف و قافیہ سے بھی باہر ہو بیٹھے ہیں جیسے ؎

شرلیت بھچان گے یا قرا تمن نشِ
تمولٹ بہر کا نہ حقیقت تمن نشِ
دینوئیت یمن اوس تم کہتے تمن نشِ
شو مگتھ اوس پُس تحوُدُن ہیو چھ تمن نشِ

محو آئین بچھ کے بقول حاجی کا ترجمہ اس لئے کامیاب ہے کہ پروفیسر کے دل پر مسلمانوں کی ذہنی حالی دیکھ کر وہی چوٹ لگی ہے جو مسدس لکھتے وقت مولانا کے دل پر لگی تھی۔ مولانا حالی کے دل سے بات نکل گئی اس لئے پُر اثر تھی۔ پروفیسر کے دل کا بھی وہی حال ہوا اس لئے مسدس پڑھ کر انھوں نے از خود مسدس کے طرز میں اپنی بولی میں اشعار لکھے گویا توارد ہوا۔ اس لئے ترجمہ کامیاب رہا جس میں سادگی، روانی، زورِ بیان، بندشوں کی چستی اور اثر نمایاں ہے اور مسدسِ حالی سے کسی طرح کم نہیں۔ حالانکہ پروفیسر صاحب شاعر نہیں ہیں

کچھ عرصہ پہلے اپنی تنقید کو جس طرح خود ہی رد کر دیا ہے اس کی مثال میں نے نقد و نظر کے باب میں شاید پہلی بار دیکھی ہے۔ خط کشیدہ جملہ ان باتوں کا مکمل جواب خود دے رہا ہے۔

تراجم میں ہمارے یہاں شاعرانہ پیرایہ روی کی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے شعراء نے بالخصوص فارسی کی تقلید کو اس حد تک اپنایا کہ وہ قلم برداشتہ تراجم کرتے چلے گئے اور اس طرح بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔ بعض اوقات انھوں نے فارسی اور کشمیری میں کوئی امتیاز نہ رکھا اور کشمیری کے ساتھ ساتھ بے تحاشا فارسی کے خالص اشعار نقل کرتے چلے گئے۔ اس ضمن میں محمود گامی، رسول میر اور وہاب حاجی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جن کا کلام فارسی تراکیب، محاورات و اصطلاحات اور پورے اشعار سے بھرا پڑا ہے اس طرح سے ہمارے ادب میں لفظی تراجم کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوا ہے۔ ہم یہاں صرف دو ایک اشعار کی مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں ؎

خالِ سیہ گوشۂ چشمِ تو مرا کشت
خون کردن مردم نہ سزد گوشہ نشیں را

ناظم کا ترجمہ ہے ؎

طرفہ خالِ گوشۂ چشم تو قتلِ عام کرد خونِ مردم گوشہ گیرن چھُوی نہ روا دلبر (چھُوی نہ) کے علاوہ ترجمہ میں کوئی لفظ کشیری نہیں۔

ع نہ طبیب چارہ سازد نہ فسون گر دعا را

ع کیا ہادِ فیز سس تہ طبیبس بہ دل زار (رسول میر)

اب چند ایک اچھی مثالیں بھی ملاحظہ کیجئے:

گر کارِ دل بگیرد میسر شدے ز دوست
صد سال خوشش بودے نہ تنہا گریستن (عرفی)

وُدنِ وِتیو تاثیر گرِفتھ ہے یتھو تمُس سنگین وِلس

رات دوہ پنیٹر اُچھُ لُوٹ خوں باران ہارہ لا (مجروح)

خدائی اہتمام خشک وتر ہے عداوند اخدائی دوسر ہے

ولیکن بندگی استغفراللہ یہ درد سر نہیں درد جگر ہے (اقبال)

چھُس بوہ زاناں خدایی چھُ توڈُ کر درد سَراہ

بندگی خرِن جگر چون چھُ جناب غالی (آزاد)

۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے ادب نے ایک نئی کروٹ لی جگہ پہلی بار کشمیری مصنفین نے سنجیدگی کے ساتھ نثر کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ فی الحقیقت گذشتہ چند سال ہی ہمارے ادبی ارتقاء میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہارون نے جیولس فیوچک کی شہرہ آفاق کتاب Notes from gallows (پھانسی کے سائے میں) جو فیوچک نے پھانسی کی کوٹھڑی میں لکھی ہے کو اختصار کے ساتھ کشمیری زبان میں پیش کیا۔ اس طرح علی محمد لون، حبیب کامران، نرنتشی اور ارجن دیو مجبور نے چند اچھے ترجمے پیش کئے۔

"کایہ مزارس پنیٹھ" تھامس گرے کے مشہور مرثیے کا ترجمہ غلام احمد مہجور کشمیری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ گیتا نجلی کی چند نظموں کا ملکن لال سکیس نے ترجمہ کیا ہے اور پوری کتاب کا ترجمہ کلچرل اکادمی کی دعوت پر دینا ناتھ نادم کر رہے ہیں۔ ہردے کول بھارتی اور لون نے پرچ تنتر کی کچھ کہانیوں کو کشمیری زبان میں ڈھالا ہے۔ لون نے اینڈرسن اور گرم برادران کی چند کہانیاں بھی اپنی زبان میں منتقل کی ہیں۔ لہائی نے ناظم حکمت کی ساکچ و ایک شیخی بندی کو مشورہ اور کرشنو فرمارلو کے ڈاکٹر فاسٹس کے آخری سین کا دل نشین اور پُراثر کشمیری ترجمہ کیا ہے۔ نادم کا کیا ہوا او تھیلو کے ایک حصّے کا ترجمہ تعمیر میں شائع ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نادم اس شاہکار کو پوری طرح کشمیری میں منتقل کریں۔

غلام نبی فراق نے انگریزی زبان کے چیدہ فنی پارے کشمیری میں پیش کرنے کی طرف دوسرے ہم عصروں کی بہ نسبت خاصی توجہ دی ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ فراق کے ترجموں میں ہمیں اس فنی چابک دستی اور شعوری پختگی کا کسی حد تک فقدان بھی ملتا ہے جو ترجموں کے لئے ایک لازمی چیز کا درجہ رکھتی ہے ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس نے جن چیزوں کا ترجمہ کیا ہے وہ بجائے خود ایسی چیزیں ہیں کہ کشمیری زبان کے اغاظ کما حقہٗ ان کے مطالب کا حامل نہیں کر سکتے لیکن تاثر کی موجودگی کو فراق نے کوئی زک نہیں ہونے دی ہے اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ فراق کے ان تراجم میں کیٹس کا قصیدۂ بلبل اور خزاں سے خطاب، ٹینی سن کا یولس، آسکر وائلڈ کا ایک مرثیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے 'حرفِ اوّل' کے عنوان سے سردار جعفری کے ایک اردو مضمون کا بھی کشمیری میں ترجمہ کیا ہے۔

ساہتیہ اکادمی کی طرف سے منتخب ادبِ عالیہ کو علاقائی زبانوں میں پیش کرنے کا جو قابلِ تحسین سلسلہ شروع کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل قریب میں ہماری زبان عظیم کلاسیکی ادب سے مالا مال ہو سکے گی۔ اس سلسلے میں اب تک ابسن کی گوسٹ اور وایلڈ ڈک، ٹیگور کی کمُنہ دھارا اور ڈاک گھر کو کشمیری میں منتقل کیا گیا ہے۔ اکادمی کے آئندہ پروگرام میں الف لیلیٰ، والٹ وٹمین کی گھاس کی پتیاں اور شیکسپیئر کے چند ایک ڈراموں کے کشمیری تراجم شامل ہیں۔

---

## قطعۂ تاریخ وفات جگر مرادآبادی

(در صنعتِ صنع الصنع)

بست صد افسوس زیں عالم جگر رخت حیات
آنکہ از مکہ سرایاں ساحرِ گفتار بود
سال ترحیلش بصنع الصنع ذاکیؔ زد رقم
یک ہزار و سہ صد و ہشتاد دل آزار بود

۱۳ ۸۰ ۱۰۰

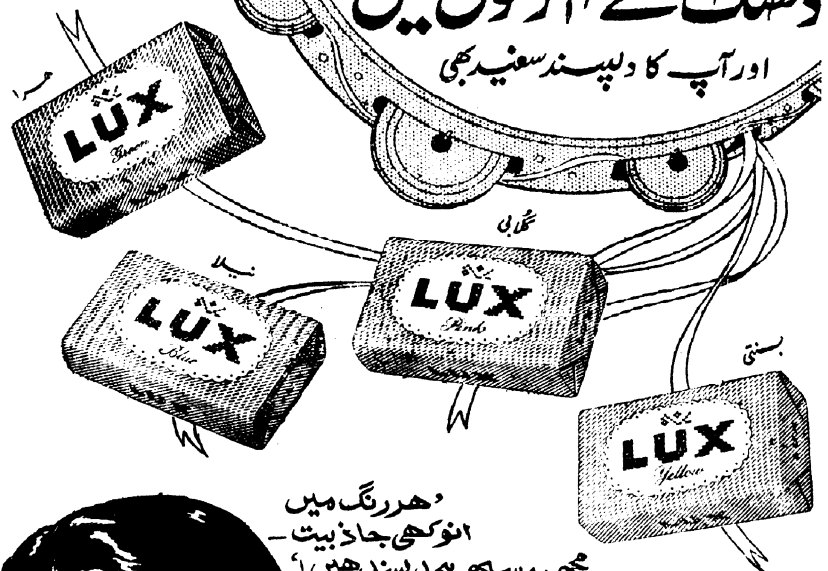
الف صدلوہ کے ۲ عدد لے گئے ہیں۔ اکابر فن نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔
(ذاکیؔ بنگلوری)

خالص، ملائم جھاگ والا

# لکس

## دھنک کے ۴ رنگوں میں

اور آپ کا دلپسند سفید بھی




'ہر رنگ میں
انوکھی جاذبیت —
مجھے یہ سبھی بیحد پسند ہیں!'
وجینتی مالا کہتی ہیں



دیکھئے! نہانے رنگوں میں لکس! اور انہی رنگوں کے دلفریب سروتی!
اور سفید بھی! رنگ کتی صابن دہی — آپکا دلپسند خالص لکس —
آپکے رنگ و روپ کی رونق!




فلمی ستاروں کا خاص
ملائم جھاگ والا
حسن بخش
صابن

1 TS. 86-X52 UD

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

# ضروری
# ضروری
# ضروری

کوئی بیمار ہے .....
ضروری خبر بھیجنی ہے!
اسے "پرائرٹی" تار سے بھیجئے

بیماری، حادثہ یا صحت پر پیغام پرائرٹی تار سروس سے بھیجا جاسکتا ہے۔
پرائرٹی تار کو ارجنٹ یا ایکسپریس تار پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے فیس
ایکسپریس تار جتنی ہی لی جاتی ہے۔
اس طرح کا تار بھیجتے وقت لفظ "پرائرٹی" ضرور لکھنا چاہئے

## ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمہ ڈاک و تار

DA 6a/533

# باہر کے مُلکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹ - اسٹریٹ نمبر ۳۴ - پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲ - رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵ - بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا۔ ۳۱ گرینج روڈ، سنگاپور

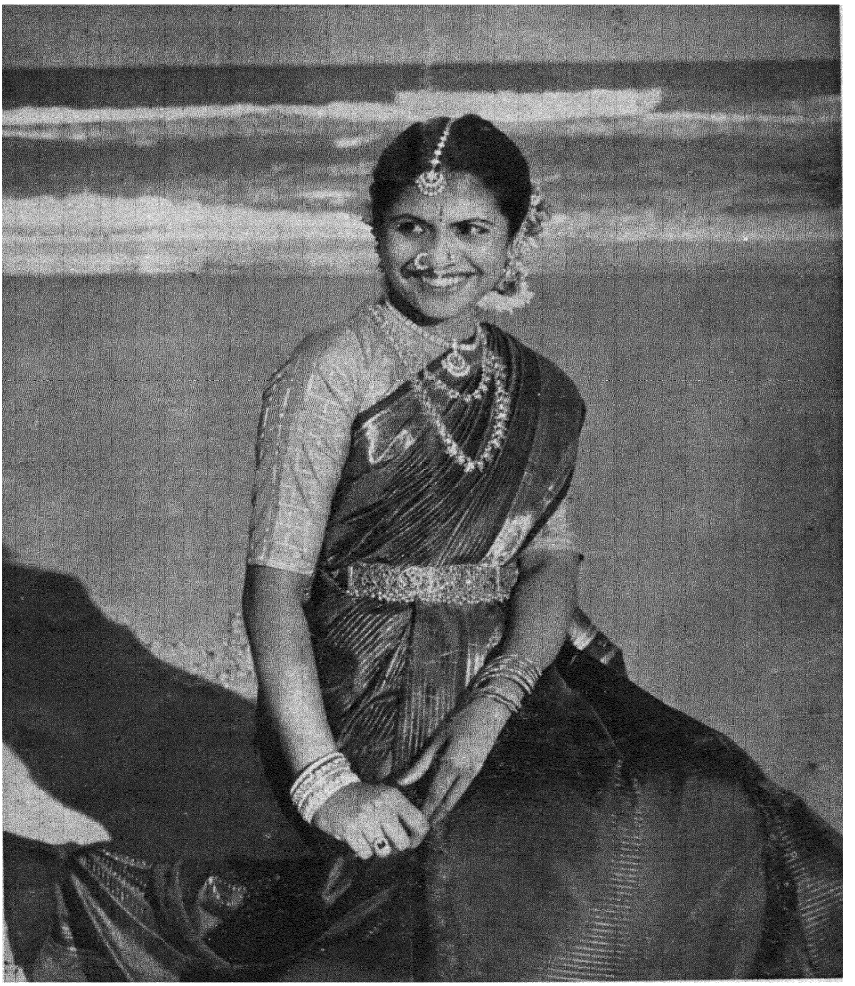
**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی**

# آج کل کے خریداران نوٹ فرمائیں

ہندوستان میں 'آج کل' کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ چندہ ختم ہونے سے پہلے ہی آئندہ سال کا چندہ بھیج دیں تاکہ رسالہ ان کے نام بدستور جاری رہے۔ خریداروں کی سہولت کے لئے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ان کا چندہ ختم ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے ہی انھیں اطلاع دے دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک 'بزنس ریمائنڈر کارڈ' بھی بھیجا جائے گا جس کی خانہ پُری کرکے بیرنگ ڈاک کر دیں۔ اگر کوئی جواب نہ ملا تو رسالہ بھیجنا بند کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے وی۔ پی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کے لئے ان کی طرف سے کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی ہو۔

ازراہِ کرم چندہ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

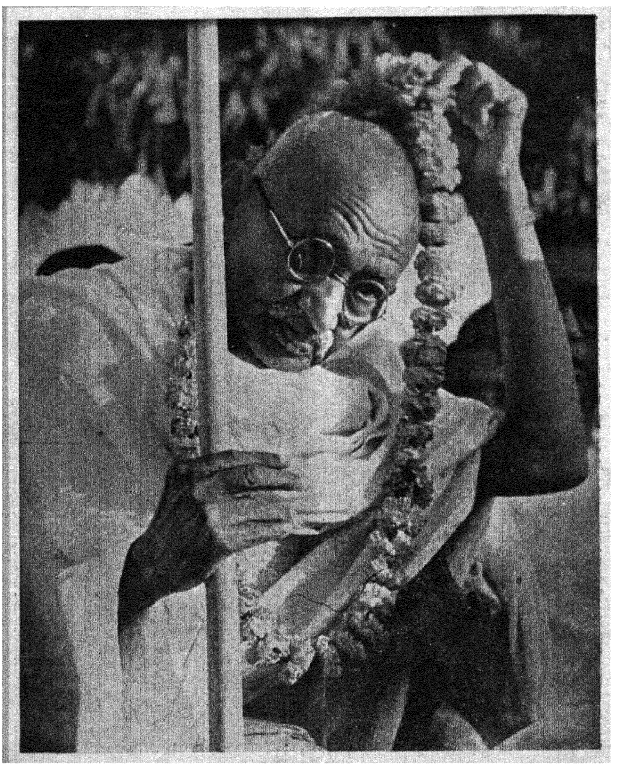
**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi 6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**

# آج کل



اسوان شک سمت ۱۸۸۳
اکتوبر ۱۹۶۱ء

۶ نئے پیسے

# ہماری کتابیں



| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پنڈت نہرو سے بات چیت | ٹیبر منڈی دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| تیسرا پنج سالہ پلان | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ۳۵ نئے پیسے | ۱۰ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں | ۱۰ نئے پیسے | ۸ نئے پیسے |
| نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ | (فی نمبر) | (فی نمبر) |

ملنے کا پتہ

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| جشنِ جمہور | نازش پرتاپگڑھی | ۳ |
| رباعی | سکندر علی وجد | ۵ |
| گاندھی جی، سیاست اور اخلاقیات | عابد سہیل | ۶ |
| مجموعۂ سخن | نادم سیتاپوری | ۹ |
| بڑے چھوٹے | واجدہ تبسم | ۱۴ |
| شکستِ آدم | شیر افضل جعفری | ۱۷ |
| قومی یکجہتی اور جذباتی اتحاد | — | ۱۸ |
| دو چراغ اور بجھے | عرشی طیبانی | ۲۲ |
| عزیز لکھنوی | منور لکھنوی | ۲۷ |
| ترقیاتی منصوبہ بندی | ارشد صدیقی | ۳۲ |
| بیسویں | سخاوت مرزا | ۳۳ |
| بالائی خلاء میں انسان کا سفر | محمد امین | ۳۸ |
| من و تو | کاوش بدری | ۴۳ |
| غزل | عبدالحمید حیرت | ۴۳ |
| نئی کتابیں اور رسالے | م۔ش۔ش۔ح | ۴۴ |
| ڈال ڈال کے پات | بیباک مرحوم شاہجہانپوری<br>احساز نقوی | ۴۷ |


سرورق:۔ ہما تما گاندھی، جن کا یوم پیدائش ۲۔ اکتوبر کو منایا جاتا ہے۔
رسالے کی پشت پر:۔ گاندھی جی کی کٹیا (سیواگرام، وردھا)


اسوان شک سمت ۱۸۸۳
اکتوبر ۱۹۶۱ء

جلد ۲۰۔ نمبر ۳


مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرشی طیبانی ایڈیٹر 'آج کل' اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

اُردو کا مقبولِ عوام مصور ماہنامہ

# آج کل دہلی


مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد مجیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | حیدرآباد |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| رحمان راہی | سری نگر |

یو۔ ایس۔ موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی۔ این۔ ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نجنا تھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرشی ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)
مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ مظفر شاہ



سالانہ چندہ:۔
ہندوستان میں:۔ سات روپے
پاکستان میں:۔ سات روپیہ (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ:۔
ہندوستان میں:۔ ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں:۔ ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ اشلنگ یا ۱۵ اینٹ

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۱۰۲ دہلی

# ملاحظات

ہر سال ۲ - اکتوبر کو ہم اس عظیم المرتبت انسان کا یوم پیدائش مناتے ہیں جس نے ہمیں نیکی اور بھلائی کا راستہ دکھایا اور جس کی قیادت میں ہم نے ایک پُرامن انقلاب برپا کر کے آزادی حاصل کی۔ یہ ایسا انقلاب تھا، جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ہمارا فرض ہے کہ اس موقع پر اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور جہاں تک گاندھی کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لیں، اور ایک مرتبہ پھر صمیم قلب کے ساتھ عہد کریں کہ گاندھی جی کے راستہ پر چل کر ملک کے اتحاد و اتفاق اور تعمیر و ترقی کے لئے ان تھک کوشش کریں گے اور اپنے مثالی کردار سے یہ ثابت کر دیں گے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود، اہنسا، امن و سلامتی اور باہمی محبت اور رواداری میں ہے۔

اس سال ۱۵- اگست کو یوم آزادی کی تقریب ملک بھر میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی۔ حسب دستور وزیر اعظم پنڈت نہرو نے دلی کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ اس موقع پر انھوں نے پوری قوم سے متحد ہو جانے کی اپیل کی اور کہا کہ دل و دماغ کا ایسا اتحاد قائم ہو جو کبھی نہ ٹوٹ سکے۔ ہم جو سماج بنا رہے ہیں وہ نہ ہندو سماج ہے نہ مسلم سماج نہ سکھ نہ عیسائی، بلکہ وہ صرف ہندوستانی سماج ہے۔ بلاشبہ وقت کی سب سے اہم ضرورت یہی ہے کہ ہم ذات، پات، رنگ و نسل کی تفریق کو یکسر ختم کر دیں اور قومی اتحاد اور منظم وحدت کو ٹھوس بنیادوں پر قائم کریں۔ ملک کے مستقبل کے بارے میں کُل اعتماد ہو اور ہر لمحہ خود کو نئے حالات کے مطابق بنانے کے اہل ہوں۔

پارلیمنٹ نے تیسرے پنجسالہ پلان کی منظوری دے دی۔ اس پلان میں ایک کھرب ۷۰ ارب روپے کے خرچ کا تخمینہ رکھا گیا ہے۔ سرکاری حلقے میں ۷۵ ارب اور نجی حلقے میں ۱۴ ارب روپیہ کے پروگرام شامل ہیں۔ ان پروگراموں کی بدولت قومی آمدنی میں تیس فی صدی اور فی کس آمدنی میں سولہ فی صدی اضافے کی توقع ہے۔ پلان میں غریبی دور کرنے کے لئے فوری تدبیریں تجویز کی گئی ہیں تاکہ ایک ایسا نظام قائم ہو جس میں عوام کو ترقی کے مساوی مواقع حاصل ہوں اور اس کے ساتھ ہی جدید ٹیکنالوجی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ گویا یہ پلان جمہوریت اور سوشلزم کا آئینہ دار ہے اور ایک قومی پروگرام ہے۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے، جس کو ہمیں قبول کرنا ہے۔

۶- اگست کو روس نے اپنا دوسرا انسان بردار خلائی جہاز بھیج کر خلائی پرواز میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ جہاز ۲۵ گھنٹہ ۱۸ منٹ خلاء میں رہا اور اس نے زمین کے گرد ۱۷ چکر لگائے اور پھر مقررہ جگہ پر واپس اتار لیا گیا۔ جہاز کے مسافر بجز تینوف تھے۔ روس کا یہ کارنامہ انسانی تاریخ میں بے نظیر اور عالم انسانیت کے لئے قابل فخر ہے۔ بقول پنڈت نہرو اس سے ایک نیا نقطۂ نظر ملے گا اور ہم پر اس چھوٹی سی دنیا میں لڑائی کی حماقت اور واضح ہو جائے گی۔

اس سال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریہ نے جن پانچ عالموں کو اعزازی سندیں عطا کی ہیں ان میں جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی بھی شامل ہیں جنھیں فارسی کے عالم کی حیثیت سے یہ اعزاز ملا ہے۔ آپ نے فارسی اور عربی زبانوں کے ادب، تالیف لغت اور زبانوں کے تقابلی مطالعے وغیرہ پر بیش قیمت تحقیقی کام کیا ہے۔ ادارۂ آج کل آپ کو اس اعزاز پر پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہے۔

# جشنِ جمہور

ساغرِ جو دور میں ہے تو گردش میں جام ہے — یعنی وہی حیات کا رقصِ دوام ہے
یوں تو یہ جشنِ تازہ یہ نامِ عوام ہے — جمہور کا جمال مگر نا تمام ہے

خوابوں میں پل رہی تھی جو تصویر کیا ہوئی
کیوں دوستو وہ قوتِ تعمیر کیا ہوئی

خونِ جگر سے پھول کھلاتے رہے ہیں ہم — ہر دور میں زمیں کو سجاتے رہے ہیں ہم
وقتِ رواں کو راہ دکھاتے رہے ہیں ہم — تاریخ زندگی کی بناتے رہے ہیں ہم

ہٹکے وہاں گلاب تو پھولی شفق وہاں
ماتھوں سے ہم نے پونچھ کے چھیڑا عرقِ جہاں

عزم و عمل کی راہ سے کانٹے نکل گئے — تیشے نے دی وہ آنچ کہ پتھر پگھل گئے
سخت و سیہ چٹانوں کے نقشے بدل گئے — ایک ایک ضرب میں کئی اصنام ڈھل گئے

محنت کشوں نے یہ بھی تماشہ دکھا دیا
چیرا پہاڑ کو تو ایلورا بنا دیا

مٹی کو جام و ساغر و مینا میں ڈھال کر — ذرّوں کو کر دیا ہے ثریّا اُچھال کر
اُٹھے جو اپنے ہاتھوں میں تیشہ سنبھال کر — دھرتی نے دے دیا ہے کلیجہ نکال کر

یوں ہم نے کوہسار کے سینے میں بل دیا
پتھر اکے پتھروں نے اجنتا اُگل دیا

جب بھی عقیدتوں نے ہمیں حوصلہ دیا — دھرتی پہ سارناتھ کا نقشہ جما دیا
اُٹھے تو کوئی ساچی کا اسٹوپ اُٹھا دیا — مندر کہیں پہ بودھ گیا کا بنا دیا

شعلوں کو مے کے ہاتھوں میں ملتے رہے ہیں ہم
پربت کی چوٹیوں کو پگھلتے رہے ہیں ہم

تہذیب و حادثات کے گوسلے رہے　　تعمیرِ زندگی کے گلستاں کھلے رہے
یوں اپنی جسارتوں کے رواں قافلے رہے　　بن کر قلب کی لاٹ جواں حوصلے رہے

ہمت کی جب نگاہ جگر دار اُٹھ گئی
دلّی میں لال قلعے کی دیوار اُٹھ گئی

یہ معجزے ہیں ولولۂ کامگار کے　　پھوٹے دلِ خزاں سے شگوفے بہار کے
جلوے لئے جلو میں رُخِ شالیمار کے　　لائے ہیں ہم زمین پہ جنّت اُتار کے

روئے وفا میں رنگِ عمل بھر دیا گیا
مرمر کو چُن کے تاج محل کر دیا گیا

اس معجزے کو پھر سے دکھانا ہے ساتھیو　　جنّت کو پھر زمین پہ لانا ہے ساتھیو
ہر دشت و کہسار پہ چھانا ہے ساتھیو　　تعمیرِ نو کا حُسن بڑھانا ہے ساتھیو

بنیاد ڈالنی ہے نئے دور کی ہمیں
پھر انقلابِ وقت نے آواز دی ہمیں

پھر عزمِ تازہ کار کو بڑھ کر پکار لو　　چپہ دوں پہ راہِ جہد و عمل کا غبار لو
زہرِ حیات پی کے بھی کچھ دن گذار لو　　شنکر بنو جٹاؤں میں گنگا اتار لو

دھرتی پہ اس ادا سے کرو راج دوستو
دے دو ہر آگرے کو کوئی تاج دوستو

فطرت چلے اُدھر کو روانہ ہو تم جدھر　　بجلی رہے تمہاری نگاہوں کی منتظر
فولاد سے کہو کہ گلے اک اشارے پر　　پانی کو حکم دو کہ بہے تم سے پوچھ کر

ہر سمت روڈ کیسلا، بھلائی بلند ہوں
ندیاں ہوں جتنی اُتنے ہی رہیا تڈ بند ہوں

آبِ رواں کو قید میں لاکر جھنجھوڑ دو　　سارا طلسمِ فطرتِ آزاد توڑ دو
ہر موڑ پر بیاس پروجکٹ چھوڑ دو　　دریا کی موج موج کا پنجہ مروڑ دو

جنگل کے گوشے گوشے میں منگل کی بات ہو
صرف ایک ہی نہیں، کئی منگل کی بات ہو

تیشے ہیں اور کوہ ہیں پھر کوئی جنگ ہو　　کاٹو وہ بے ستون کہ فرہاد دنگ ہو
ہیرے کی طرح ترشا ہوا ہو جو سنگ ہو　　سینے میں ہر پہاڑ کے ہنرؔ سرنگ ہو

ذرّوں کو ہمسرِ مہ و کاہ کر کے چلو
خلدِ وطن کو خلد سے برتر کئے چلو

---

لہ کشمیر کی ایک نئی سرنگ جس کا اصل نام جواہر ٹنل ہے۔ نازش

گاؤں کو لاکھوں گنبد و مینار بخش دو　　شہروں کو کارخانوں کا انبار بخش دو
گل مرگ کو نئے سنگار بخش دو　　باغ نشاط اور بھی دو چار بخش دو
ہر برگ ہو بہار کی تصویر تو سہی
سارا وطن ہو وادیٔ کشمیر تو سہی

ہمسار ہوں دو نیم، چٹانیں تراش دو　　آبِ حیات پردۂ ظلمت سے ڈھونڈ لو
زندہ کرو وطن میں نئے کالی داس کو　　جھونکا ادھر جو آئے وہی میگھ دوت ہو
عزم و عمل کے جوش سے بھرپور، جاگ اٹھو
راہِ جنوں کے سرمد و منصور جاگ اٹھو

ہاتھوں میں زندگی کے نیا ساز دیں گے ہم　　جس میں عوامیت ہو وہ انداز دیں گے ہم
تخئیل کو قوتِ پرواز دیں گے ہم　　غالب کے فکر و فن کو پھر آواز دیں گے ہم
وقت آئے یوں شکفتنِ گل ہائے ناز کا
محمود سے بلند ہو رتبہ ایاز کا

---

# رُباعی

شب کی وادی میں چاند خاموش گیا
آہستہ بہا کاہکشاں کا دریا
اے رخشِ حیات صبح کی پلکوں پر
آنسو کی طرح لرز رہی ہے دُنیا

سکندر علی وجد

عابد سہیل

# گاندھی جی، سیاست اور اخلاقیات

گاندھی جی کے فلسفۂ اخلاقیات پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے قدیم فلسفہ کی روایت کو ایک لمحہ کے لئے بھی ذہن سے محو نہ ہونے دیا جائے۔ یورپ میں فلسفی جس معنی میں استعمال ہوتا ہے اس طرح تو گاندھی جی فلسفی نہیں تھے نہ تو انھوں نے نظامِ عالم کی حقیقت اور عدم وجود کے بارے میں کوئی بسیط نظریہ پیش کیا اور نہ مبادیاتِ علم ہی سے بحث کی۔ لیکن ہندستان میں فلسفہ کے معنی بالکل مختلف رہے ہیں۔ یہاں فلسفہ کے لئے 'درشن' کا لفظ استعمال ہوتا رہا ہے جو 'درش' سے ماخوذ ہے۔ درش کے معنی ہیں دیکھنا، روح کی آنکھ سے اشیاء میں اُتر جانا۔ یورپ کے فلسفہ نے بھی وہاں کے نظامِ حیات پر اثر ضرور ڈالا ہے لیکن ہندستان میں فلسفہ کا زندگی سے براہ راست تعلق رہا ہے۔ ہندستان میں فلسفہ نے قدم قدم پر طرزِ حیات، طریقِ فکر، کلچر اور سماجی قدروں کی رہنمائی کی ہے۔

ہندستان کے قدیم فلاسفر شنکر اچاریہ نے جو سانکھیہ اور یوگا جس فلسفہ کو صحیح سمجھتے تھے نہ صرف اس کی تبلیغ کرتے بلکہ اپنی ساری زندگی اس فلسفہ کے اصولوں کے تحت ڈھال بھی لیتے۔ اسی طرح ملک کے کلچر، طرزِ حیات اور اخلاقی اقدار سے گاندھی جی کے فلسفہ کا تعلق نہ صرف اتنا گہرا ہے بلکہ انھیں کی آغوش میں پلا اور پروان چڑھا ہے۔ گاندھی جی نے بھی اپنی زندگی نہ صرف ان اصولوں کے تحت ڈھالی جنھیں وہ صحیح سمجھتے تھے بلکہ ان کی تبلیغ بھی کی۔ اس نقطۂ نظر سے گاندھی جی کے فلسفی ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

ہیراکلائٹس، نیتشے، ہیگل اور گرین نے جنگ و جدال کو انسانی سماج کی بقا کے لئے ضروری قرار دیا ہے مشہور Pragmatist فلسفی ولیم جیمس نے بھی جنگ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جنگ قوموں میں احساسِ ذمہ داری، ضبط و نظم، رفاقت اور جرأت پیدا کرتی ہے لیکن انسانی فطرت کو تسخیر فطرت میں لگا دینے سے بھی یہی مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ بات اس حد تک ضرور صحیح ہے کہ وقتی مہم کے حصول اور مقصد کی تکمیل کے لئے اکثر لوگ بے حد بنیادی اخلاقیات بھول کر یا انھیں پسِ پشت ڈال کر متحد ہو جاتے ہیں، لیکن اس مقصد کے حصول کے بعد وہ اخلاقیات پھر اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں اور شاید زیادہ شد و مد کے ساتھ۔ ایسی حالت میں کسی خارجی مقصد کے حصول کے لئے قائم ہونے والا اتحاد محض عارضی اور وقتی ہوگا، اس میں وہ پائیداری نہ ہوگی جو انسانی تعلقات اور رشتوں کو استوار کر کے دائمی امن یا سماجی ہم آہنگی کی منزل تک پہنچا دے۔ اسی لئے گاندھی جی کے نزدیک جنگ کا بدل انسانی صلاحیتوں کو تسخیر فطرت کی طرف موڑ دینا نہیں بلکہ روحانی قوت کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں عدم تشدد، دوسروں کے لئے مصائب برداشت کرنے اور سچے علم کے حصول کو اعلیٰ اقدار میں شامل کیا گیا ہے۔

ہندستان کا قدیم فلسفۂ حیات اگر عدم تشدد پر مبنی نہ ہوتا اور

گاندھی جی کو اتنی طویل روایت ورثہ میں ملی ہوتی تو اُن کو اپنے آدرشوں کی تبلیغ میں کہیں زیادہ وقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ گاندھی جی نے انسان کی سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی انفرادی اور روحانی ترقی پر بھی زور دیا اور کہا کہ انسان کا فلسفۂ حیات اور اس فلسفے کا تقدس ہی سماج سے مطابقت رکھنے والے فضا یا کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ چھ ہزار گیر انٹیشنر میں بھی ساری زندگی قربانی، اصولِ علم کی کوشش اور خود کو پہچاننا آتا اور انٹیوٹ کی ذات میں، جو بذاتِ خود علم کل ہے، ضم کر دینے کی تلقین کی گئی ہے۔

گاندھی جی کا خیال ہے کہ انسانی زندگی خوشی، مسرت اور پاکیزگی سے گزارنے کے لئے اخلاقیات کے اصولوں پر کاربند ہونا ضروری ہے۔ یہ اصول صحت کے اصولوں کی طرح متعین، طے شدہ اور غیر متزلزل ہیں صحت کے اصولوں کی طرح ان کی خلاف ورزی بھی ممکن تو ہے لیکن ایسا کرنے سے ردِ عمل کا سکون اور ذہنی اختتم ہو جائے گا۔

## سیاست اور اخلاقیات

گاندھی جی سے پہلے سیاست میں اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سیاسی رہنماؤں کا کام حکومت حاصل کرنا اور اس سے متعلق دوسرے کاموں کو انجام دینا ہے، عوام کی اخلاقی حالت سدھارنا نہیں۔ انفرادی طور سے تو لوگوں کا با اخلاق ہونا اور اخلاقیات کے اصولوں پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ لیکن سیاست کے میدان میں جہاں حکومتوں کے مفادات کے تضاد کا سوال ہوتا ہے اخلاقیات کے اصولوں پر عمل کرنا ضروری نہیں اور سیاسی رہنماؤں کے لئے خود کو اخلاقی اصولوں کا پابند بنا لینا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ ان کو ملک اور قوم کے کہیں زیادہ اہم اور ضروری مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔

اس نظریہ کے خلاف گاندھی جی کے دو اعتراضات ہیں:۔

(۱) ملک اور قوم کے سیاسی مسائل کی اہمیت مسلّم لیکن انھیں اخلاقی اقدار سے زیادہ اہمیت دینا غلط ہے۔ زندگی کی اعلیٰ ترین قدر ایک با اخلاق اور پاکیزہ زندگی کے علاوہ کچھ نہیں۔ بنی نوع انسان کی مسرت کا انحصار دولت اور طاقت پر نہیں بلکہ خود کو بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے وقف کر دینے پر ہے اور یہی سب سے بڑی مسرت اور اخلاقی قدر ہے۔ اس طرح کے اعمال صرف اس شخص سے ممکن ہیں جو کسی فائدہ کے بغیر دوسروں کی خدمت کو اپنا شیوہ بنالے۔ انسان کی اعلیٰ مسرت، اس کی روحانی تکمیل اور ترقی میں ممکن ہے۔ سماجی اور انفرادی ترقی کا راز اسی جوہر کے اصول میں مضمر ہے۔ فرد واحد یا سماج دونوں کی شکست دے کر ترقی کرنے کی کوشش کرے گا ایک نہ ایک دن برباد ہو جائے گا۔

(۲) اگر دولت اور طاقت کو قدر اعلیٰ تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ ان کا حصول صرف غلط اور غیر اخلاقی طریقوں سے ہی ممکن ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر غیر اخلاقی طریقے اپنائے جائیں تو ان کا حصول قطعاً ناممکن ہو جائے گا گاندھی جی کا یہ استدلال ہمیں کانٹ کی یاد دلاتا ہے جس نے کہا تھا کہ کسی غیر اخلاقی فعل سے فائدہ صرف اس صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے جب اُسے صرف چند لوگ برتیں اور باقی اس سے گریز کریں۔ کیونکہ اگر اسے وسیع پیمانہ پر اپنایا جائے گا تو وہ خود اپنی ضد بن جائے گا۔ مثال کے طور پر وعدہ خلافی یا جھوٹ ہی کو لے لیجئے۔ ظاہر ہے کچھ لوگ جھوٹ بول کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہر شخص جھوٹ بولنے لگے تو ظاہر ہے اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا کیوں کہ کوئی کسی پر اعتبار ہی نہیں کرے گا۔ اسی طرح گاندھی جی کا خیال ہے کہ اگر دولت اور طاقت کے لئے سب نے غیر اخلاقی ذرائع استعمال کئے تو ظاہر ہے ان کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ اسی لئے گاندھی جی نے انسانی اور سماجی تعلقات کی استواری کے لئے سچائی اور عدم تشدد کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے روحانی سکون اور دائمی مسرت پر زور دیا۔

تشدد کے استعمال کے خلاف گاندھی جی نے دو اہم استدلال پیش کئے ہیں

(۱) مقصد خواہ کتنا ہی نیک اور جائز کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کے حصول کے لئے غلط طریقے استعمال کئے گئے ہوں تو وہ اچھا مقصد بھی بڑی حد تک برائیوں اور خرابیوں سے ملوث ہو جاتا ہے اور فاتح اپنی کامیابی کے زعم میں اپنی کامیابیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

(۲) برخلاف اس کے عدم تشدد اور عدم تعاون کے ذریعہ حاصل کی ہوئی کامیابی کے بعد مفتوح فاتح کے رحم و کرم پر نہیں ہوتا بلکہ دونوں اپنی اپنی غلطیاں سمجھتے ہیں اور سماجی اور اقتصادی نابرابری کے سماج کی جگہ ایمانداری اور انصاف کی بنیادوں پر ایک اچھے سماج کی تشکیل کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

## اخلاقیات اور دولت

گاندھی جی نے ضرورت سے زیادہ دولت کے حصول کو ایک نہایت

غیر اخلاقی فعل قرار دیا ہے۔ ایک ایسے سماج میں جہاں لوٹ کھسوٹ عام ہو، محبت کے قانون کی حکمرانی آسان نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ استحصال اور محبت دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایک جگہ گاندھی جی لکھتے ہیں :-

"ضروری ضرورت سے زیادہ چیز یں حاصل کرنا ایک طرح کی چوری ہے۔ قدرت نے انسان کے استعمال کے لئے چیزیں اس قدر بنائی ہیں کہ وہ اس کی ضرورت بھر کے لئے کافی ہیں اور اگر ہر انسان ضروری ضرورت سے زیادہ چیزیں جمع نہ کرے تو دنیا سے غریبی اور افلاس کا نام و نشان تک مٹ جائے۔"

دولت کا بے جا حصول نہ صرف سماجی بلکہ اخلاقی گناہ بھی ہے لیکن اس گناہ کو تشدد کے ذریعہ ختم کرنا بھی غلط ہے کیونکہ تشدد کا استعمال بذاتِ خود ایک نہایت غیر اخلاقی فعل ہے۔ اس طرح کی نابرابری ختم کرنے کے لئے عدم تشدد اور سفید گرہ کا استعمال ہی جائز ہے۔ اگر کسی کو مجبور کر کے اس سے کچھ افعال کرا بھی لئے جائیں تو اس سے کیا فائدہ ؟ اخلاقیات کی بنیاد تو مکمل آزادی، ارادہ اور رضا کا راز تضایا پر قائم ہے۔ ایک مشین کی طرح کام کر کے حالات تھوڑی دیر کے لئے سدھارے تو جا سکتے ہیں لیکن پھر اخلاقیات کی اعلیٰ قدروں پر کاربند ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تضایا کے اخلاقی ہونے کے لئے ان کا شعوری اور رضا کارانہ طور پر سرزد ہونا ضروری ہے۔

گاندھی جی ایک جگہ کہتے ہیں :-

"میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی اہم کام کو انجام دینے کے لئے صرف دماغ کو مطمئن کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ دل کو مطمئن کرنا بھی ضروری ہے۔" ضمیر اور دل کا یہ اطمینان گاندھی جی کے فلسفۂ حیات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہندستان کے قدیم فلسفہ کے لحاظ سے انسان کی زندگی کا واحد مقصد خود کو برہما کی ذات میں ضم کر دینا ہے۔ گاندھی جی کے یہاں بھی اس خیال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن انھوں نے اس کی توضیح ذرا مختلف طریقے سے کی ہے۔ ان کے خیال میں برہما، خدا اور سچائی ایک ہی چیز کے الگ الگ نام ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "میں اکثر اپنے مذہب کو سچائی اور راستبازی کا مذہب کہتا ہوں۔ ایک عرصہ سے میں نے "خدا ہی سچائی ہے" کے بجائے "سچائی ہی خدا ہے" کہنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے وجود سے انکار تو اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن اب تک سچائی سے انکار کرتے کسی کو نہیں سنا۔ مقصدِ حیات سچائی ہو یا خدا اس کے حصول کے طریقے ہمیشہ ایک ہی رہتے ہیں اور خود کو خدا کی ذات میں ضم کر دینے کا واحد طریقہ عدم تشدد، محبت یا بغیر کسی عناد کے بنی نوع انسان کی خدمت ہے۔ خدا کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ اس کی مخلوق کی زیادہ سے زیادہ خدمت ہے۔"

راماین میں ایک جگہ لکھا ہے :-

"جنگ و جدال کرنے والے کی طاقت قابلِ ستائش نہیں بلکہ قابلِ نفرت ہے، صرف سادھو اور فقیر کی قوت ہی اصل قوت ہے۔"

گاندھی جی نے بھی انسان کی روحانی ترقی پر زور دیا ہے۔ عدم تشدد کو کمزوری اور بزدلی کی علامت تصور کرنا غلط ہے۔ دراصل وہی لوگ عدم تشدد پر عمل کر سکتے ہیں جنھیں اپنے اوپر مکمل کنٹرول اور دل و دماغ کی مکمل ہم آہنگی حاصل ہو چکی ہو۔

گاندھی جی کے فلسفۂ حیات پر شنکر اچاریہ اور رامانج کے فلسفہ کی گہری چھاپ ہے۔ ویدانت کی طرح ان کا بھی یہی خیال ہے کہ انسان غیر شعوری طور پر خود کو برہما سے ہم آہنگ کر دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن گاندھی جی کا کہنا ہے کہ انسان کو اس ہم آہنگی کے لئے شعوری کوشش کرنا چاہیئے اس لئے کہ یہی زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے اور دوسری تمام اقدار مثلاً صحت، دولت، مسرت وغیرہ محض ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ گاندھی جی کے خیال میں کوئی بھی ایسی چیز جو انسان کے اعلیٰ مقاصد میں آڑے آئے غیر اخلاقی اور بری ہے۔ دولت صرف اس لئے بری ہے کہ اس سے انسان اور انسان کے درمیان دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔

آدرشن وادی ہونے کے باوجود گاندھی جی کے فلسفۂ حیات میں عمل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک با عمل انسان تھے اور انھوں نے فلسفۂ عدم تشدد پر نہ صرف خود عمل کیا بلکہ اسے جنگِ آزادی میں عوام کے ہاتھوں ایک مضبوط اور طاقت ور ہتھیار بنا دیا۔ انھوں نے ایک ایسی قوم کے کردار اور اخلاق کو سدھارا جو ایک صدی سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔

---

نادم سیتاپوری

# مجموعۂ سخن

اردو زبان و ادب کے جو بکھرے ہوئے اوراق اب تک زمانے کی دست برد سے محفوظ ہیں، مجموعۂ سخن بھی انھیں میں سے ایک ہے جسے جناب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب (سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) کا گراں بہا کتب خانہ اپنے سینے سے اس طرح لگائے ہوئے ہے جیسے کسی مامتا بھری ماں کی آغوش اپنے لختِ دل کو سمیٹ لیتی ہے۔

چار سو اکیاسی ورق کا یہ مجموعۂ سخن، اردو زبان کی وہ بیش قیمت قلمی بیاض ہے جو اس زمانے میں ترتیب دی گئی تھی جب لکھنؤ اور اس کے مضافات میں کوئی ایسا اردو کا پریس قائم نہیں ہوا تھا جس میں پُر نگاری کتابوں کی اشاعت و طباعت کا کوئی انتظام کیا گیا ہو۔ نواب نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے زمانے میں جو "سرکاری مطبع" قائم کیا گیا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ قائم ہو چکا ہو۔ لیکن وہ محض 'سرکاری پریس' تھا عوامی نہیں اس لئے اس قلمی بیاض میں جن شعراء کا انتخاب شامل کیا گیا ہے اس کے بارے میں یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ زیادہ تر براہِ راست حاصل کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس مجموعے کی ترتیب و تدوین میں بعض شعراء کے قلمی دیوانوں سے بھی مدد لی گئی ہو لیکن یہ دیوان بھی زیادہ تر انھیں شاعروں کے ہوں گے جو اس زمانے تک خود زندہ تھے۔

جب تک پریس اور مطابع کا رواج قائم نہیں ہوا تھا شعری ادب میں قلمی بیاضوں کی ترتیب و تدوین کا عام رواج تھا۔ قدیم کتب خانوں میں آج بھی فارسی اور اردو کے 'کشکول' اور بیاضوں کا کافی بڑا ذخیرہ محفوظ ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ اس قسم کے انتخابات اکثر 'مجموعۂ سخن' ہی کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے۔ چناں چہ طباعت کے ابتدائی دور میں اس نام کے بے شمار مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ خود لکھنؤ ہی کے مطبع نولکشور نے ۱۸۷۲ء میں ایک مجموعۂ سخن، دو حصوں میں شائع کیا تھا جس میں مختلف عنوانات کے تحت شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام شامل ہے۔ یہ مجموعۂ سخن 'ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن (اودھ)' کا من لے آمد براؤننگ' کے ایماء پر پنڈت شیو نرائن (ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول ضلع لکھنؤ) سید غلام حیدر قدر بلگرامی (ہیڈ ماسٹر ہونہار اسکول ضلع لکھنؤ) اور منشی محمد حکیم الدین (ہیڈ ماسٹر چوک اسکول لکھنؤ) نے ترتیب دیا تھا۔ جس قلمی 'مجموعۂ سخن' کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ ۱۳۰۷ھ میں بہ عہد نواب نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ 'غلام مہدی لکھنوی' نے مرتب کیا تھا جو سرائے معالی خاں (لکھنؤ) میں رہتے تھے۔ ابتداء میں جناب مسعود حسن صاحب ادیب نے چند تعارفی سطور بھی تحریر فرمائی ہیں:۔

> "مجموعۂ سخن" ـــــ جس کو غلام مہدی لکھنوی نے نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہدِ سلطنت میں مرتب کیا اور خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر یکم صفر ۱۲۷۴ھ کو تمام کیا۔ مؤلف کتاب (غلام مہدی) جو نیل اقبال الدولہ قطب الملک محمد عباس، مبارز علی خاں بہادر مظفر جنگ کی سرکار میں داستان گوئی اور بذلہ سنجی کی خدمت پر مامور تھا۔ یہ باتیں خود مؤلف مجموعہ نے کتاب کے آخر میں لکھی ہیں۔

مؤلف کتاب نے ذیل کے قطعہ سے اپنا سالِ ولادت ۱۱۸۹ھ نکالا ہے

یارب غلام مہدی یا برسنِ طبیبی — بہرِ امام ہادی، بہرِ امام مہدی
ایں پیرِ فضل سیرت چوں در وجود آمد — تاریخ گفت! تلقنا! ہدیٰ غلام مہدی

۱۱۸۹ھ

یہ قطعہ بھی اس کتاب کے آخر میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو ختم کرتے وقت مؤلف کی عمر تقریباً اٹھاون سال کی تھی۔ " (سید مسعود حسن رضوی)

آخری ورق پر غلام مہدی لکھنوی نے خود خاتمہ کتاب کی عبارت لکھی تھی۔

" الحمدللہ ایں نسخہ دل پسند مجموعۂ سخن، از دستِ بندۂ درگاہ ایزدی غلام مہدی ساکن سرائے معالی خان در عہد دولت و سلطنت حضرت ظل سبحانی خلیفہ رحمانی خورشید اشتہار ثریا اقتدار قرعزم فلک حشم، ظل اللہ، انجم سپاہ، رعیت نواز ظلمت گداز، قامع بنیان بدعت و عدوان شیدا ارکان نصفت و ایمان السلطان ابن سلطان ابو نصر قطب الدین سلیمان جاہ سلطان عادل نوشیروان زمان نصیر الدین حیدر شاہ جہان بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کہ در جناب فیوض آیات مسند نشین و سادہ امارت منتکی صدر ایوان حکومت انیس خاص حضرت سلطان مشیر مہمات رموز بادشاہ، دوران جرنیل افواج ظفر طراز شاہی کارفرمائی کارگذاران حضرت جہان پناہی فسدوی خاص جرنیل اقبال الدولہ قطب الملک محمد عباس مبارز علی خان بہادر مظفر جنگ حاضر بودم ..... افتاد سخنی در بند لہ گوئی کہ خاطر والا بایں چیز با کمال التفات داشت شبانہ روزے در صحف غال نشیان اختصاص داشتم تاریخ غزہ صفر المظفر ۱۲۴۷ھ۔"

کتاب کے شروع میں جناب پروفیسر مسعود حسن ادیب کی ترتیب دی ہوئی ایک تفصیلی فہرست بھی شامل ہے جس سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس شاعر کی کتنی غزلیں مجموعۂ سخن میں شامل ہیں اور ان غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد کتنی ہے؟ یہ فہرست جس سلیقے سے مرتب کی گئی ہے اس سے کتاب کی خصوصیات کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اتنی مکمل فہرست اس کتاب کا جزو نہ بنادی جاتی تو سرسری طور پر مجموعۂ سخن، کی اہمیت کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ یہ فہرست من وعن نقل کی جاتی ہے:-

| نمبر شمار | (نام) شاعر | تعداد غزلیات | تعداد اشعار |
|---|---|---|---|
| ۱- | آتش (خواجہ حیدر علی) | ۵۰ | ۵۸۹ |
| ۲- | اسیر (مظفر علی خاں) | ایک | ۱۲ |
| ۳- | آشفتہ | ایک | ۷ |
| ۴- | آصف (نواب آصف الدولہ) | ایک | ۵ |
| ۵- | افسوس (میر شیر علی) | ایک | ۵ |
| ۶- | اقبال | ۷ | ۹۷ |
| ۷- | الہٰی | ۵ | ۵۱ |
| ۸- | امیر | ایک | ۷ |
| ۹- | انشاء (انشاء اللہ خان) | ۵۰ | ۴۳۳ |
| ۱۰- | بادشہ (نصیر الدین حیدر) | ۱ | ۶ |
| ۱۱- | بقاء (شیخ بقاء اللہ خاں) | | |
| ۱۲- | پارسا | ۱ | ۱۰ |
| ۱۳ | تصور | ۱ | ۸ |
| ۱۴- | جرأت (قلندر بخش) | ۹۸ | ۷۷۶ |
| ۱۵- | چرکیں (یار علی) | ۱ | ۷ |
| ۱۶- | حاذق | ۱ | ۶ |
| ۱۷- | حریف | ۳ | ۲۳ |
| ۱۸- | حسرت[1] (میر جعفر علی) | ۵۴ | ۳۳۷ |
| ۱۹ | حسن (میر حسن) | ۱۴۵ | ۱۰۵۰ |
| ۲۰- | خسرو (امیر خسرو) | ۱ | ۵ |
| ۲۱- | خلیق (میر مستحسن) | ۱۴ | ۱۰۴ |
| ۲۲- | درد (خواجہ میر درد) | ۵۲ | ۳۰۰ |
| ۲۳- | رشک | ۱ | ۳۱ |

[1] جرأت کے استاد تھے ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی (ص ۲۰۱ تذکرۂ آب بقا)

| نمبر شمار | (نام) شاعر | تعداد غزلیات | تعداد اشعار |
|---|---|---|---|
| ۲۴- | رشید | ۲ | ۲۰ |
| ۲۵- | رنگین (سعادت یار خاں) | ۱ | ۵ |
| ۲۶ | سامان | ۶ | ۵۶ |
| ۲۷- | سعدی | ۱ | ۱۲ |
| ۲۸- | سودا (مرزا رفیع) | ۳۳ | ۲۹۱ |
| ۲۹- | سوز (میر محمدی) | ۱۰ | ۶۳ |
| ۳۰- | سیّد | ۵ | ۲۷ |
| ۳۱- | شاہ | ۱ | ۱۰ |
| ۳۲- | شاہد | ۱ | ۹ |
| ۳۳- | شمیم | ۱ | ۱۰ |
| ۳۴- | صادق | ۲ | ۲۲ |
| ۳۵- | عاجز | ۱ | ۹ |
| ۳۶ | عزا | ۱ | ۱۰ |
| ۳۷- | عشرت | ۱ | ۵ |
| ۳۸- | عشق | ۱ | ۴ |
| ۳۹- | عیشی (طالب علی) | ۵۷ | ۵۶۲ |
| ۴۰- | غافلی | ۴ | ۲۸ |
| ۴۱- | غضنفر | ۱ | ۹ |
| ۴۲- | قائم | ۱ | ۷ |
| ۴۳- | قدرت | ۱ | ۱۲ |
| ۴۴- | قمر | ۱ | ۲۷ |
| ۴۵- | قیس | ۲ | ۲۰ |
| ۴۶- | گویا (فقیر محمد خاں) | ۱۶ | ۲۵۸ |
| ۴۷- | لطف | ۱ | ۱۴ |
| ۴۸- | مبارز | ۴ | ۴۴ |
| ۴۹- | محفی | ۱ | ۸ |
| ۵۰- | محمور | ۱ | ۵ |
| ۵۱- | مروت | ۲ | ۱۶ |
| ۵۲- | مشہور | ۱ | ۷ |
| ۵۳- | مصحفی | ۳۱۰ | ۲۶۱۷ |
| ۵۴- | منتظر (شیخ نور الاسلام) | ۱ | ۶ |
| ۵۵- | ہدی (غلام ہدی) | ۶ | ۴۳ (۵ منبلیہ) |
| ۵۶- | میر (میر تقی) | ۸۵ | ۶۰۶ |
| ۵۷- | ناجی (محمد شاکر) | ۱۱ | ۱۷۰ |
| ۵۸- | ناسخ (شیخ امام بخش) | ۷۳ | ۷۷۰ |
| ۵۹- | نسبت | ۱ | ۱۰ |
| ۶۰- | نصیر | ۱ | ۶ |
| ۶۱- | نظیر (ولی محمد نظیر) | ۱۱ | ۱۱۳ |
| ۶۲- | نظر | ۱ | ۵ |
| ۶۳- | واقف | ۱ | ۶ |
| ۶۴- | وحشت | ۱ | ۹ |
| ۶۵ | وحشی | ۲ | ۳۱ |
| ۶۶- | ہوس (مرزا تقی ہوس) | ۱۳۴ | ۸۰۷ |

شعراء کی اس طویل فہرست میں شاہیر کے علاوہ کچھ ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جن کے لئے بہت زیادہ تذکروں کی چھان بین کرنا پڑے گی — اور اس کد و کاوش کے بعد بھی اس کا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ مستند افراد کے حالاتِ زندگی کا صحیح پتہ نہ چل سکے۔ اس مجموعے میں سب سے زیادہ غزلیں مصحفی کی ہیں جن کے متعلق عام طور پر یہی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے آٹھ غیر مطبوعہ دیوان اب سے کچھ دنوں پہلے تک موجود تھے۔ میری نظر سے ان کا ایک قلمی دیوان گزرا ہے۔ اس کے علاوہ ایک غیر مطبوعہ دیوان کتب خانہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں بھی محفوظ ہے۔ چند نامکمل دیوان اور بھی موجود ہیں جن کی تفصیلات سے شاید ہی کبھی اربابِ ذوق باخبر ہو سکیں۔ مصحفی کی یہ تین سو سے غزلیں بجائے خود ایک دیوان کا درجہ رکھتی ہیں اسی طرح میر حسن کی غزلیں ڈیڑھ سو کے قریب اور اس کے بعد سما سو غزلیں مرزا محمد تقی ہوس کی ہیں ہوس، میر و میرزا کے جلو کے نامور شعراء میں تھے لیکن ان کا دیوان اب تک

لہ امروہہ کے رہنے والے اور مصحفی کے شاگرد تھے (ص ۲۱۳ تذکرہ آبِ بقا)

شائع نہیں ہوا ہے۔ ان غزلوں کے علاوہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب ادیب کے کتب خانے میں 'ہوس' کا ایک غیر مطبوعہ دیوان بھی موجود ہے۔ ہوس کی طرح ان کے ایک دوسرے ہم عصر طالب علی عیشی بھی ان بدنصیب اربابِ کمال میں ہیں جن کا ذکر کبھی کبھی تذکروں میں تو ضرور مل جاتا ہے لیکن دیوان آج تک شائع نہیں ہوا۔ ادیب صاحب کی لائبریری میں ان کے دیوان کا بھی ایک نایاب مخطوطہ محفوظ موجود ہے۔

'مجموعۂ سخن' میں سودا، میر، جرأت، انشا اور آتش کی جو غزلیں شامل ہیں وہ اتنی ضرور ہیں کہ اگر ان کا گہری نظر سے بجزیہ کیا جائے تو یقیناً کچھ نہ کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سرسری طور پر میں نے اِدھر اُدھر سے دیکھا تو بعض مقامات پر مروجہ دیوانوں میں اور اس مجموعہ میں کہیں کہیں فرق بھی ملا اور یہ فرق' اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ غزلیں ایک ایسے شخص کی انتخاب کردہ ہیں جو ان شعراء میں سے اکثر و بیشتر لوگوں کا ہم عصر تھا۔ ممکن ہے کہ ان غزلوں کا بڑا حصہ براہ راست 'انتخاب نگار' کے خود حاصل کیا ہو کیوں کہ اس وقت تک ان شعراء میں سے کسی کا دیوان شائع نہیں ہوا تھا۔

'مجموعۂ سخن' تاجدارِ اودھ نواب نصیرالدین حیدر کے عہدِ حکومت (۱۸۲۷ء/۱۲۴۳ھ تا ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ) میں مکمل کیا گیا۔ شاہانِ اودھ میں نصیرالدین حیدر اور واجد علی شاہ دو ایسے بدنصیب فرمانروا گزرے ہیں جنھیں تاریخ نے کبھی چین نہیں لینے دیا۔ انگریزوں نے ان دونوں کے خلاف جو 'من گھڑت' افسانے تراشے تھے ان کی 'زنگینیاں' آج تک دامنِ تاریخ کو داغدار بنائے ہوئے ہیں اور نصیرالدین حیدر کے بارے میں تو شاید کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ صرف اودھ کا ایک بدنصیب تاجدار ہی نہیں تھا بلکہ اپنے دور کا ایک باکمال اور زود گو شاعر بھی تھا جس کی متعرق و منتشر غزلیں اب بھی کہیں کہیں نظر آ جاتی ہیں۔ اردو کے وہ جملے سے مصرعے اور اشعار جو مذہب الامثال اور کہاوتوں میں تحلیل ہو چکے ہیں ان میں ایک یہ مصرعہ بھی زبان زدِ خاص و عام ہے

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

مگر یہ بتانے والے شاید چند ہی باقی رہ گئے ہوں کہ یہ مشہور مصرعہ انھیں 'نصیرالدین حیدر' کی ایک غیر معروف غزل کا مصرعہ ثانی ہے۔ گیارہ شعر کی پوری غزل ایک قلمی بیاض میں لکھی ہوئی ہے جو میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ان کے دو تخلص تھے بادشاہ اور بادشہ! ابھی تک کوئی قلمی یا مطبوعہ دیوان میری نظر سے نہیں گزرا۔ تین غزلیں 'مجموعۂ سخن' میں ہیں اور ایک اس 'قلمی بیاض' میں جو میرے پاس ہے۔ قلمی بیاض کی غزل درج ذیل ہے:-

یہ آنے کی کس مست کی آرزو ہے — کہ ساقی لئے ساغرِ مشکبو ہے
سمایا ہے جب سے تو آنکھوں میں میری — جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
بتاؤں میں کیا حالِ زلفِ پریشاں — عیاں زلف و دلدار کی مو بمو ہے
چلو قبرِ شاہ پر فاتحے کو — مگر آبِ شیریں سے لازم وضو ہے
نکل جائے جان تیرے قدموں کے نیچے — یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا — نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے
ستایا ہے ناحق ہمیں تو نے ظالم — یہ انصاف اللہ کے روبرو ہے
کیا چاک وحشت نے ایسا گریباں — کہ سینے کے قابل نہ جائے رفو ہے
شفق بن کے گردوں پہ ہوتا ہے ظاہر — یہ کس کشتۂ بے گنہ کا لہو ہے
عبث مجھ کو ہنس ہنس کے دیتے ہو گالی — زباں کو سنبھالو یہ کیا گفتگو ہے
شبِ وصل میں اب کی باری جو بولا — چھبیلی اور مرغِ سحر کا گلو ہے

رہے سایۂ پنجۂ باد تشنہ پر
خدا و ندِ عالم نگہبان تو ہے

'مجموعۂ سخن' میں ان کی تین غزلیں شامل ہیں جو اس سے پہلے مجھے کہیں نظر نہیں آئیں — اور ان کے غیر مطبوعہ ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔

صورت نظر آ گئی کسی کی — کس سے کہوں آہ اپنے جی کی
یہ بات ہے ایک عاشقی کی — کہئے نہ کسی سے اپنے جی کی
اس دل کو بغل میں ہم نے پالا — دشمن سے بھی ہم نے دوستی کی
کیونکر نہ بنے خدنگ سیدھا — مژگاں سے تیرے ہمسری کی
آیا جو خیالِ چشم و عارض — گلزار میں ہم نے مے کشی کی

ہے حسن کا دور دور جب سے
اک دھوم ہے اپنی عاشقی کی

پہونچایا بہاکے نامۂ شوق
اشکوں نے ہماری قاصدی کی

غنچہ کو صبا نے دی ہے تعزیر
تو نے کس منہ سے ہمسری کی

یاد آئی دہن کو جب چمن میں
غنچوں سے ہم نے دل لگی کی

ناخوش وہ رہا مرا مسیحا
ہم نے مر مر کے زندگی کی

اس پر بھی خفا ہے تو، تو خوش رہ
اپنی سی ہزار اے پری کی

ابرو کا پڑا ہے عکس آ کر
یا ہونٹوں پہ ہے دھڑی مسی کی

اس نے کہا یہ ہم سے ہنس کر
دیکھیں چلو سیر چاندنی کی

وہ دادیٔ عشق طے کیا ہے
اکثر مجنوں کی رہبری کی

دل میں رہتی ہے یاد تیری
گو لب پہ ہے ہمیشہ خاموشی کی

پائی مرے دل سے جب رہائی
غم نے مدت تلک خوشی کی

کچھ نکہتِ خلد سے نہیں کم
آتی ہے ہوا جو اس گلی کی

آیا ہے مرے گھر میں آپ سے وہ
تقدیر نے میری یاوری کی

کیا دیں گے جواب روزِ محشر
کچھ اس کی نہ ہم نے بندگی کی

چاند سی شکل اگر تو نے دکھائی ہوتی
چھٹتی مہتاب کے منہ پر بھی ہوائی ہوتی

ہوتی آگاہ جو پروانے کے سوزِ دل سے
شمع فانوس سے یا ہر نکل آئی ہوتی

آسماں نے جو نہ قدرت دی اسے، خوب کیا!
ورنہ انساں نے زمیں سر پہ اٹھائی ہوتی

شیشۂ دل کو جو کرتے نہ کدورت سے صفا
آئینہ رویوں سے کس طرح صفائی ہوتی

ظلم کرتے حق و ناحق نہ اگر بندوں پر
اے بتو گھر میں تمہارے بھی جدائی ہوتی

دل ہی آزادی کو چاہا نہ ہمارا ورنہ
ایک جھٹکے میں یہ زنجیر تو ڑائی ہوتی

بادشہ فضل الٰہی جو نہ (ہوتا) ہم پر
کس طرح زیرِ نگیں ساری خدائی ہوتی

اس مجموعہ کے یہ سبھی خدوخال ہیں۔ اگر ارباب نظر اس کی چھان بین کریں تو یقیناً اس تاریخی مخطوطہ کے اوراق شعر و ادب میں قابلِ ذکر اضافہ ہی کریں گے! کیا عجب ہے کہ اس مجموعہ میں تلاش و جستجو کرنے سے مصحفی، میر، انشاء، جرأت اور آتش وغیرہ کی ایسی غزلیں بھی مل جائیں جو مطبوعہ دیوانوں میں شامل نہ ہوں۔

دوسری غزل کے چند شعر یہ ہیں:-

اے فلک ایک تو شب ایسی بھی آئی ہوتی
زیرِ سر دستِ نگاریں کی کلائی ہوتی

دل سے ہوں میں بادشاہ، عاشق
سمرن ہے محمد کو یا علیؑ کی

---

## قومی آمدنی میں ۵ء۶ فی صد کا اضافہ

۶۰-۱۹۵۹ء کے مقابلے ۶۱-۱۹۶۰ء کے دوران میں بھارت کی قومی آمدنی میں ایک سرسری تخمینے کے مطابق جو مرکزی اعداد و شمار کے ادارے نے بیشتر شدہ تازہ معلومات کی روشنی میں کیا ہے، ۵ء۶ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔

اس جملہ اضافے میں کم از کم ۲ء۷ فی صد زراعت کے سبب اضافہ ہوا ہے۔ یہ عارضی تخمینہ ہے کیونکہ یہ جزوی معلومات کی بنیاد پر ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ سال کے اوائل میں قومی آمدنی پر جو سالانہ رپورٹ شائع کی جائے گی اس میں یہ تخمینہ کافی بدل جائے۔

دوسرے پلان کے دوران میں قومی آمدنی میں حقیقی اضافہ ۱۹ء۶ تھا۔ پہلے پلان میں یہی ۱۸ء۴ فی صد تھا۔ ۶۱-۱۹۶۰ء کا ۵ء۶ فی صد اضافہ سالانہ اوسط اضافے کی شرح سے کافی زیادہ ہے جو کہ دوسرے پلان کے دوران میں ۹ء۳ فی صد رہی ہے۔

واجدہ تبسم

# بڑے چھوٹے

میں حیدرآباد سے بی۔ اے کا امتحان دے کر اپنے گاؤں شادنگر لوٹ رہی تھی — میں نے سارے مسافروں کو گاؤں سے باہر ہی چھوڑ دیا تھا، پتاجی نے میرے لئے سواری کو گھوڑا اور دو نوکر بھجوا دیئے تھے (آخر زمیندار کی بیٹی تھی نا؟) سفر کی تھکن سے میرا چہرہ مضمحل ہو رہا تھا، میرا کندن جیسا رنگ دھوپ کی تپش سہتے سہتے سرخ پڑ گیا تھا اپنے سنہرے بالوں کو میں نے ایک ہرے رنگ کے رومال سے باندھ کر، رومال کی گرہ ٹھوڑی کے نیچے دے رکھی تھی۔ ہوا کے ہلکوروں سے میرے بال، رومال کی گرفت سے نکل نکل پڑتے، رکاب میں میرے پاؤں ڈولنے لگتے — میں ہر لمحہ یہ سوچ رہی تھی کہ کب گھر تک پہونچتی ہوں۔

جیسے ہم پکی پگڈنڈی سے ہٹ کر کھیتوں کی طرف والی پگڈنڈی کی طرف مڑنے لگے تو میری آنکھیں کچھ نامانوس سے منظر پر جم گئیں —

"ارے یہ کھیت؟ اور اس کھیت میں یہ کام کرنے والے ....."

کلو میرا بوڑھا ملازم میری نظروں سے میرا مطلب بھانپ گیا۔ مسکرا کر، کچھ طنز سے بولا —

"مالکن یہ شمبھونا تھ جی کے بڑے بیٹے کا کھیت ہے، وہی جو حیدرآباد سے زراعت کا کالج میں پڑھ لکھ کر آیا ہے اور ہر گھڑی گاؤں والوں سے کہتا پھرتا ہے کہ نئے طریقے سے کھیتی باڑی کرو — حکومت کا ساتھ دو — اپنے خیالات بدلو ....." اور کلو زور سے ہنس پڑا۔

"شمبھونا تھ جی کا بیٹا — یعنی سورج —" میں کھیت کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"جی ہاں جی ہاں، وہی سورج — اب دیکھیں کون بڑا سورج بن کر گاؤں کو جگمگاتے ہیں مہاراج —"

کلو کے مہاراج کہنے میں بڑا تیکھا طنز موجود تھا، کیونکہ شمبھونا تھ جی بے چارے ہماری طرح اونچی ذات کے برہمن نہ تھے، بلکہ ہریجن تھے، جن کی آج کے سماج میں کوئی عزت ہوتو ہو، ہمارے گاؤں میں بالکل پوچھ نہیں — جی ہاں میں اپنے عیب چھپانے والوں میں سے نہیں ہوں، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارے اس چھوٹے سے گاؤں شادنگر میں (جس نے پتہ نہیں کتنوں کے دل رنجیدہ بھی کئے ہوں گے، مگر کہلاتا شادنگر ہی ہے) طرح طرح کے لوگ آباد ہیں، چھوٹے بھی بڑے بھی، مگر آج تک یہ نہ ہوا کہ بڑوں نے چھوٹوں کا دل رکھنے کی خاطر انھیں بھی اپنی طرح انسان سمجھا ہو — !!

مجھے اچھی طرح یاد ہے شمبھونا تھ جی کے ہاں ایک بار بہت بڑے دن آئے تھے۔ گاؤں کا یہ دستور تو ہمیشہ سے ہے کہ جیت زمیندار کی ہوتی ہے اور بے چارے چھوٹے کاشتکار ہمیشہ زمیندار کے مظالم سے اس طرح پس جاتے ہیں جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان گیہوں — اس بار بھی ایسا ہی ہوا، شمبھونا تھ میرے اپنے پتاجی کے قول دار تھے (یعنی پتاجی کی چکی میں پسنے والا گیہوں کا بے بس دانہ!!) پتاجی کی زمین پر کاشت کرتے تھے اور فکری طور پر ان سے دبتے تھے۔ اس سال فصلیں ایسی تباہ ہوئیں کہ کسانوں کی جان پر بن گئی۔ حد یہ کہ وہ سال بھر کے لئے جو اناج گھروں میں سنیت کر رکھ لیا کرتے تھے، وہ تک نہ رکھ سکے —

ایسے ہی بُرے دنوں میں ایک ایسا دن بھی آیا کہ اسی اناج نے ان کی ننھی لڑکی کو ان سے چھین لیا — میری آنکھوں دیکھی بات نہیں ہے کیونکہ میں تو اپنی تعلیم کی خاطر شہر گئی ہوئی تھی، ماں چھٹیوں میں گھر آنے پر مجھے پتہ چلا تھا کہ شبھونا تھپی کے ماں فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ نیچی ذات کے لوگوں میں بھی کئی لوگ خود غرض ہوتے ہیں، ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں — آس پڑوس کے لوگوں نے پتاجی سے آکر کہا ضرور مگر پتاجی بھی آخر زمیندار تھے، کسی کی اونچی ناک کیسے دیکھتے۔ پتاجی کا کہنا بس یہ تھا کہ شبھونا تھپی خود آکر مانگے تو میں اور اپنے منہ سے مانگیں، اپنی بھولی ان کے آگے پھیلائیں — نہ پتاجی نے اپنی بات جانے دی نہ شبھونا تھپی نے — ہاں اس اونچی ناک کے جھگڑے میں ننھی لتا نے ضرور دم توڑ دیا — کہتے ہیں جس دن لتا نے دم توڑا اسی دن سورج نے ماتھے میں مٹھی اٹھا کر سوگند کھائی کہ "میں دھرتی ماتا کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ جس گیہوں کے والے کے لئے آج میری بہن نے تڑپ تڑپ کر دم توڑا ہے، جب تک اس کے ڈھیر اپنے آنگن میں نہ لگاؤں چین سے سانس تک نہ لوں گا — " تب تک سورج کا یہ حال تھا کہ شاذ و نادر کے دوسرے کسانوں کے لڑکے باؤں کے ساتھ مل جل کر دن بھر غلیلیں بنایا کرتا اور دوسروں کے کھیتوں سے چڑیاں اڑا کر موسم کے پھل کھایا کرتا لیکن جس دن سے اس نے یہ فیصلہ کیا بالکل بدل کر رہ گیا۔ اس وقت بھی اس کی عمر کچھ کم نہ تھی، اپنے پتا کے پاس پڑھنا لکھنا تو سیکھ ہی چکا تھا، لیکن اس فیصلے کے بعد اس نے باقاعدہ شہر جا کر پڑھنے کی رٹ لگا دی۔ شبھونا تھپی کی نیچی کے جو زیور پتاجی کے پاس رہن تھے وہ اس نے ضد کر کے سب کو ا ٹھا لے اور شہر چل دیا۔

دن ہوا کے دوش پر سوار ہو کر گذرتے گئے اور دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے اور ایک دن وہ بھی آیا کہ جب سورج شہر سے پلٹا تو ایک خوبرو جوان بن چکا تھا اور انگریزی میں باتیں کرتا تھا، وہ اپنے ساتھ زراعت کے نئے نئے طریقے لایا تھا مگر رہا پھر بھی ہر معین کا ہمدرد ہی — (یہ حیرت پتاجی نے فرمایا تھا!!)

گاؤں واپس آ کر اس نے سب سے پہلے اپنے پتا کو زمیندار کے دباؤ سے آزاد کیا اور فیصلہ کیا کہ اب اپنا ذاتی کھیت اور ذاتی کاشت ہوگی۔ شبھونا تھپی بیٹے کو دیکھ کر اور اس کے ارادوں کے بارے میں جان کر خوشی تو ضرور ہوئے مگر اصل سوال روپے کا تھا۔ الگ سے کھیتی باڑی کرنے بیٹھتے تو روپیہ کہاں سے لاتے — اس مشکل کو خود سورج نے یوں حل کیا کہ شہر جا کر اپنے بھروسے کے دوست سے روپیہ ادھار لیا اور اپنے ارادوں کی تکمیل میں جُٹ گیا!

دن بدلنے کیا دیر لگتی ہے؟ کل تک جہاں خاک اڑتی تھی اب لہلہاتے ہوئے کھیت اور ڈھیروں اناج تھا۔ زندگی خوش و خرم اور ہنستے گاتے بسر ہوتی تھی۔ سورج کا گاؤں والوں کے لئے ہیرو بن گیا۔ اس کی خوش مزاجی، اس کا نرم لب و لہجہ، اس کا کھیتی باڑی کرنے کا جدید طریقہ — اس نے گویا سب کا دل موہ لیا، مگر پتاجی جہاں کے تہاں رہے بلکہ سورج کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر پہلے سے کچھ زیادہ ہی اونچی ذات اور نیچی ذات کے قائل ہو گئے — وہ اپنی جلی مٹانے کے لئے کہا کرتے — "ارے یہ چھوٹے لوگ کم بخت — ان کے باپ نے بھی کبھی زمینداری کی ہوگی" مگر خود سورج اپنے آپ کو زمیندار کہلوانا پسند بھی کب کرتا تھا۔ وہ تو زمرہ سجاد میں ہر ایک سے بڑی خوش مزاجی سے کہا کرتا — "میں تو آپ کا خادم ہوں — آپ کا سیوک ہوں۔"

چلتے چلتے ایک گڑھا آیا اور میں اپنا دزن قسمت نہ رکھ سکی۔ رکاب میں سے میرے پاؤں نکل پڑے اور کلو اور رام داس بھی "بھگوان" کہتے ہوئے پک ہی رہے تھے کہ سامنے کے کھیت سے ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

"چندا دیوی۔ آپ زمینداری....."

ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ دونوں نوکر تیزی سے آگے بڑھے اور بدتمیزی سے بولے۔ "پتہ ہے زمینداری کی بیٹیاں ایسے چلا رہے پتاجی کا نمک بھی تو کھاتے تھے نا!) سورج کے چہرے کا رنگ اڑ گیا — وہ منہ سے کچھ بھی نہ بول سکا، ایسی آنکھوں سے مجھے دیکھا کہ میرا انگ انگ، تھرا گیا — رکاب میں ایک سینڈل ابھی تک اٹکی ہوئی تھی۔ ایک گڑھے میں گر پڑی تھی۔ وہ تیزی سے گڑھے میں اترا اور سینڈل میرے پیروں کے قریب رکھ کر بڑی دھیمی، بڑی نگینوں سی آواز سے بولا۔

"انسانیت سے مجبور ہو کر میں نے آپ کو گرنے سے بچا تو لیا، مگر

بالکل بھول گیا تھا کہ آپ بڑے لوگ ہیں اور ہم چھوٹے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور جس تیزی سے وہ آیا تھا، اسی تیزی سے چلا بھی گیا۔

میں نے اُسے دُور تک جاتے ہوئے دیکھا اور پھر اُچک کر گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ چلتے چلتے جب ہم تینوں اس کے کھیت کے پاس پہنچے تو وہ سر جھکائے ہوئے ایک مینڈھ کے پاس ہماری طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"ابھی ابھی تم نے کہا تھا آپ بڑے لوگ ہیں، ہم چھوٹے۔ لیکن اس چھوٹا ئی بڑائی کی خلیج کو ہم کبھی پاٹ بھی سکیں گے یا نہیں۔"

اس نے بڑی طرح چونک کر پلٹ کر دیکھا اور حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ "چندا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میں گھوڑے سے کود پڑی ۔ بڑی مشکل سے وہ بول سکا ۔ "شاید کبھی نہیں۔"

جیسے اپنے آنسو پیتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ گھاؤں جس کا نام شادنگر ہے، حقیقت میں شادکرنے والا نہیں۔ اس نے تو سدا ہم چھوٹوں کو آنسو ہی دئے ہیں۔ ہم یہ خلیج کبھی نہ پاٹ سکیں گے۔"

میں پورے وشواس کے ساتھ بڑھی اور مسکرا کر بولی ۔ "یکھی سورج تم نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ میرا نام چندا ہے اور چاند اپنی روشنی سدا سورج سے مستعار لیتا ہے۔"

اس نے چونک کر مسرت سے تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے جگنو چمکنے لگے۔ میں نے شرما کر اس کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے میں زمین پر پڑی ہوئی کدال اٹھا کر سوندھی سوندھی دھرتی کا سینہ چیرنے لگی!!

---

## شہری و دیہاتی آبادی کا تناسب

شہری اور دیہی آبادی کا تناسب آج بھی وہی ہے جو آج سے دس سال قبل تھا۔ ۱۹۵۱ء میں شہری آبادی ۱۷٫۳۸ فی صد تھی۔ یعنی جملہ آبادی ۳۵ کروڑ ۹۲ لاکھ ۱۶ ہزار نو سو پانچ تھی اور شہری آبادی ۶ کروڑ ۱۸ لاکھ ۶۵ ہزار ۳ سو ۹۲ تھی۔ ۱۹۶۱ء میں شہری آبادی ۱۷٫۹۴ فی صد ہے۔ یعنی جملہ آبادی ۴۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ۲۰ ہزار ۴ سو ۲۹ ہے تو شہری آبادی ۷ کروڑ ۷۸ لاکھ ۳۹ ہزار ۹ سو ہے۔ اسی طرح دیہی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۶۲٫۸۲ فی صد یعنی ۳۹ کروڑ ۷۰ لاکھ ۲۵ ہزار ۶ سو ۶۶ تھی اور ۱۹۶۱ء میں ۳۵ کروڑ ۸۵ لاکھ ۶۴ ہزار ۵ سو ۳۹ ۔ یعنی ۸۲٫۱۶ فی صد ہے۔

گزشتہ دس سالوں میں شہری آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ آسام میں ہوا ہے یعنی ۱۱۶٫۶۹ فی صد۔ اس کے بعد اڑیسہ (۸۷٫۰۲ فی صد) بہار (۹۴٫۰۸ فی صد)، مدھیہ پردیش ۷۴٫۷۶ فی صد اور آخر میں کیرالا (۴۲٫۴۴ فی صد) کا نمبر آتا ہے۔

دوسری ریاستوں میں شہری آبادی میں فی صد اضافے کی رفتار حسب ذیل رہی ہے:۔

پنجاب (۳۳٫۰۲) مغربی بنگال (۲۸٫۸۸) مدراس (۲۲٫۹۱) مہاراشٹر (۱۹٫۵۹) گجرات (۱۹٫۲۵) میسور (۱۶٫۴۱) آندھرا پردیش (۱۵٫۱۳) راجستھان (۹٫۴۰) اور اتر پردیش (۹٫۸۶)۔

شیر افضل جعفری

# شکستِ آدم

رُخِ دوراں جُھلستا جا رہا ہے
سُوا نیزے پہ سُورج آ رہا ہے
بیابانِ جہاں کا بادگولا
قیامت کی طرح بَل کھا رہا ہے
تمدّن وقت کو کنگن کے بدلے
سُنہری ہتھکڑی پہنا رہا ہے
ہوس کی آندھیاں پُھنکارتی ہیں
مزاجِ عشق بجھتا جا رہا ہے
وہ آدم جو کبھی عُنقا رہا تھا
وہی اب زیست کو اُلجھا رہا ہے
فلک سے گرم تانیں جھڑ رہی ہیں
کہ جیسے کوئی دیپک گا رہا ہے
ستارے ٹوٹ کر گرنے لگے ہیں
خُدا خود اب زمیں پر آ رہا ہے

# قومی یک جہتی اور جذباتی اتحاد

۱۰، ۱۱ اور ۱۲ - اگست ۱۹۶۱ء کو نئی دہلی میں وزیر اعظم کے زیر صدارت ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس ہوئی تھی، جس میں قومی یک جہتی کے مسئلہ پر غور و خوض کیا گیا۔ وزیر اعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں قومی یک جہتی سے متعلق تہذیبی، تعلیمی اور انتظامی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرقہ واریت اور لسانی جھگڑوں سے متعلق مسائل کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے میمورنڈم میں کیا طریقۂ کار تجویز کیا ہے۔ وزیر اعظم نے حکومت ہند کے میمورنڈم مجریہ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کا بھی ذکر کیا جو لسانی اقلیتوں کے تحفظات سے متعلق ریاستی حد بندی کمیشن کی سفارشات پر غور کرنے کے بعد تیار کیا گیا تھا اور جس کو ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے اصلاح مشورہ کرنے کے بعد شائع کیا گیا تھا۔ یہ میمورنڈم ایک کل ہند خاکہ کی صورت میں ہے جس میں سبھی ریاستوں کی لسانی اقلیتوں کو دیئے جانے والے تحفظات کا ذکر ہے۔

کانفرنس میں اس میمورنڈم کے عام اصولوں کی توثیق کر دی گئی اور اتفاق رائے سے بعض تجویزیں منظور کی گئیں جو یہ ہیں:-

(ا) ابتدائی تعلیم: لسانی اقلیتوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا کہ وہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں حاصل کریں۔ دستور کی دفعہ ۳۵۰ الف کی رُو سے اس حق کی توثیق بھی ہو گئی ہے اور صدر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں جب ضرورت ہدایات جاری کر سکتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم سے متعلق جنوبی منطقہ کی ریاستوں کے فیصلوں کو اصولی طور پر منظور کر لیا گیا۔ چونکہ یہ فیصلے ریاستی حد بندی کمیشن کی بعض سفارشوں کے پیش نظر کئے گئے تھے اس لئے وہ اُس وقت کے مخصوص حالات سے متعلق ہیں اور دوسری ریاستوں میں ان پر پوری طرح عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اصول مان لیا گیا ہے، البتہ اس میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ خاص مقصد یہ ہے کہ پہلے سے جو سہولتیں مہیا ہیں، انھیں کم نہ کیا جائے بلکہ جہاں کہیں ممکن ہو مزید سہولتیں دی جائیں۔

(ب) ثانوی تعلیم: یہاں بھی ۱۹۵۶ء کے میمورنڈم میں مذکورہ عام انتظامات کی توثیق کی گئی۔ کانفرنس نے اصولی طور پر جنوبی منطقے کی ریاستوں کے فیصلوں کو بھی قبول کر لیا۔ ان اصولوں پر ریاستوں کے تعلیمی محکموں کو اس لحاظ سے غور کرنا چاہیئے کہ اپنی اپنی ریاستوں کے موجودہ حالات کے مطابق اُن پر عمل کیا جائے۔ جہاں تک ثانوی مدارج میں ذریعۂ تعلیم کا تعلق ہے مادری زبان کے فارمولا پر پوری طرح عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا۔ اس سطح پر طلباء کو زیادہ وسیع تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ اسکول کی تعلیم کے بعد کوئی پیشہ اختیار کر سکیں اور اس سطح پر انھیں یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی تیار کیا جاتا ہے۔ یہاں دستور کے آٹھویں جدول میں دی ہوئی جدید ہندوستانی زبانوں اور انگریزی سے کام لینا چاہیئے۔ لیکن آسام کے پہاڑی اضلاع اور مشرقی بنگال کے دارجلنگ ضلع کو اس مستثنیٰ قرار دیا جائے اور وہاں کے لئے خصوصی انتظام کئے جائیں۔

کانفرنس میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے لئے مناسب نصابی کتابوں کی تیاری کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ عام طور سے یہ نصابی کتابیں ریاستی حکومتوں کو ہی تیار کرنی چاہئیں۔ یہ کام نجی ہاتھوں میں نہیں چھوڑنا

چاہیئے۔ نصابی کتابیں اس ڈھنگ سے تیار کی جائیں کہ طلباء کے ذہن میں ہندوستان کی وحدت، اجتماعی نقطۂ نظر اور ہندوستان کے بنیادی ثقافتی پس منظر کا احساس پیدا ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان اور دیگر ممالک کے موجودہ حالات سے بھی واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ ان نصابی کتابوں کی تیاری کا کام قابل لوگوں کو سونپا جائے۔ مرکزی حکومت کو چاہیئے کہ وہ ابتدائی اور ثانوی دونوں مدارج کے لئے نمونے کی نصابی کتابیں تیار کرے۔

ہندوستان کی علاقائی زبانوں کی ترقی اور تعلیم میں ان کے تدریسی استعمال کے پیش نظر ضرورت ہو گیا ہے کہ بین الریاستی رشتہ کے لئے ایک عام ہند زبان کو تیزی سے ترقی دی جائے۔ یہ کام اب تک انگریزی سے لیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ انگریزی ابھی کچھ عرصے تک اس مقصد کے لئے استعمال ہوتی رہے گی، مگر ظاہر ہے کہ ہندی کی ترقی کے لئے ضروری اقدامات کئے جانے چاہئیں تاکہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اس مقصد کو پورا کرنے لگے۔ ورنہ اس بات کا خطرہ ہے کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے مختلف ریاستوں میں کوئی معقول یا بھی رشتہ نہ رہے۔

بین الاقوامی رابطہ اور جدید علوم خاص کر سائنس، صنعت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہندوستان میں کسی بین الاقوامی زبان کی واقفیت زیادہ سے زیادہ ہو۔ اگرچہ یہ زبان کوئی بھی اہم یورپی زبان ہو سکتی ہے لیکن انگریزی اس مقصد کو زیادہ آسانی سے پورا کر سکتی ہے کیونکہ یہ ہندوستان میں خوب سمجھی جاتی ہے اس لئے انگریزی پڑھانے کی اہمیت ظاہر ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر زبانوں کی اچھی طرح تعلیم دینا ہے تو انھیں ابتدائی عمر میں ہی سکھانا چاہیئے کیونکہ اسی عمر میں بچہ آسانی سے زبانیں سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں کی تعلیم ابتدائی عمر میں ہونی چاہیئے۔

کانفرنس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوستان گیر زبانوں کے لئے ایک مشترکہ رسم خط نہ صرف ضروری ہے بلکہ اس کے ذریعہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ایک قومی رشتہ قائم رہے گا اور اس سے یک جہتی پیدا کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ موجودہ حالات کے تحت ہندوستان میں ایسا مشترکہ رسم خط صرف دیوناگری رسم خط ہی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ مستقبل قریب میں کوئی مشترکہ رسم خط اپنانا مشکل ہوگا۔ لیکن اس مقصد کو پیش نظر رکھنا اور اس کے لئے برابر کام کرنا چاہیئے۔

حکومت ہند نے ریاستی حکومتوں کے مشورے سے ایک سہ لسانی فارمولا تیار کیا تھا کہ ثانوی مدارج میں لسانی مضامین کی تعلیم کے لئے اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ اس فارمولا کو آسان بنایا جائے اور ثانوی درجہ پر زبانوں کی تعلیم کا انتظام اس نہج سے کیا جائے:

(ا) علاقائی زبان اور مادری زبان جبکہ مادری زبان علاقائی زبان سے مختلف ہو۔

(ب) ہندی یا ہندی بولنے والے علاقوں میں کوئی اور ہندوستانی زبان۔ اور

(ج) انگریزی یا کوئی دوسری جدید یورپی زبان۔

جن اسکولوں یا کالجوں میں اقلیتی زبانیں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کے ریاست سے باہر کی یونیورسٹیوں یا دیگر اداروں سے الحاق کا مسئلہ بھی زیر غور آیا۔ اس بات پر اتفاق ظاہر کیا گیا کہ زیادہ تر ایسے اداروں کا ریاست کے اندر ہی یونیورسٹیوں اور بورڈوں سے الحاق کا انتظام ممکن ہونا چاہیئے لیکن جہاں کہیں ریاست کے اندر ایسے الحاق کا انتظام کرنے میں ناقابل عبور مشکلیں پیش آئیں، وہاں ان کا الحاق ریاست کے باہر کی یونیورسٹیوں اور بورڈوں سے کیا جا سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کسی ریاست میں سرکاری کاموں کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ زبانیں استعمال ہوتی ہوں لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی بھی ریاست پورے طور پر یک لسانی ریاست نہیں ہے۔ اس بات کے پیش نظر تعلیم وغیرہ کے لئے اقلیتی زبانوں کے استعمال کے انتظامات تجویز کئے گئے ہیں۔ سرکاری زبان عام طور سے سرکاری کاموں کے لئے ہوتی ہے لیکن عوام سے رابطہ پیدا کرنے میں یہ مقصد پیش نظر ہونا چاہیئے کہ عوام کی بھاری اکثریت جو کچھ ان سے کہا جائے اس کو سمجھ پائے۔ اس لئے جہاں بھی پبلسٹی کی ضرورت ہو سرکاری زبان کے علاوہ اس علاقے کی مروجہ دیگر زبانوں سے بھی کام لیا جانا چاہیئے۔

اگر کسی ضلع کی کم سے کم ساٹھ فی صدی آبادی ریاست کی سرکاری

زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان یونین یا استعمال کرتی ہے تو اس ضلع میں ریاستی سرکاری زبان کے علاوہ اقلیتی گروپ کی اس زبان کو بھی سرکاری زبان مان لینا چاہیئے لیکن اس مقصد کے لئے عام طور سے حرف انھیں بڑی بڑی زبانوں کو منظور کرنا چاہیئے جو دستور کے آٹھویں جدول میں دی گئی ہیں۔ لیکن آسام کے پہاڑی اضلاع اور مغربی بنگال کے دارجیلنگ ضلع کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے کیونکہ وہاں آٹھویں جدول کی مذکورہ زبانوں کے علاوہ دوسری زبانیں مروج ہیں۔

اگر کسی ضلع یا اس سے چھوٹے علاقہ مثلاً میونسپلٹی یا تحصیل میں لسانی اقلیت کل آبادی کا ۱۵ یا ۲۰ فی صدی حصہ ہو وہاں یہ مناسب ہوگا کہ اہم سرکاری اشتہارات، قاعدے، قوانین کسی دوسری زبان یا زبانوں کے علاوہ اقلیت کی زبان میں بھی شائع کئے جائیں۔

انتظامیہ کے اندرونی کام یعنی فائلوں پر نوٹ، مختلف سرکاری دفتروں کے مابین خط وکتابت عام طور سے ریاست کی سرکاری زبان میں ہی ہونی چاہیئے۔ لیکن جہاں تک انتظامیہ کا عوام سے تعلق ہے ان کی درخواستیں وغیرہ دوسری زبانوں میں بھی قبول کرنی چاہئیں اور اس بات کا بھی انتظام کرنا چاہیئے کہ جہاں بھی ممکن ہو عوام سے موصول ہونے والے خطوط کا جواب انھیں زبانوں میں دیا جائے۔ یہ بھی انتظام ہونا چاہیئے کہ دیہاتوں یا قصبوں میں یا جہاں کہیں لسانی اقلیت کی آبادی ۱۵ سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ہو، اہم قوانین، قواعد اور احکام کی موٹی موٹی باتوں کا ترجمہ اقلیتی زبانوں میں شائع کیا جائے۔ اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ اس مقصد کے لئے ریاستوں کی طرف اپنے صدر دفاتر میں ٹرانسلیشن بیورو (دارالترجمہ) قائم کرنا مناسب ہوگا۔ جب کوئی گنجان آباد ریاستی حکومت کا کوئی حکم یا اشتہار عوام کی اطلاع کے لئے شائع ہو تو ضلع کے افسران کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے ضلع یا میونسپل علاقہ کی مقامی زبان میں ان کا ترجمہ کروالیں۔

ریاست کے صدر دفتر اور ضلعوں کے مابین خط وکتابت کا کام اندرونی انتظامیہ کے تحت آتا ہے۔ چنانچہ عام طور سے یہ مناسب ہوگا کہ ریاست اور ضلع کے دفاتر کے مابین خط وکتابت ریاست کی سرکاری زبان میں ہی کی جائے۔ اس مقصد کے لئے ریاست کی سرکاری زبان کے بجائے یونین کی سرکاری زبان کے استعمال کی بھی اجازت ہونی چاہیئے۔

یونین کی یہ سرکاری زبان انگریزی ہوگی یا ہندی۔

ریاستی حکومت کے تحت ملازمتوں میں بھرتی کے لئے زبان کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے۔ اس لئے ریاست کی سرکاری زبان کے علاوہ امتحانات میں انگریزی یا ہندی کے استعمال کی اجازت بھی دینا چاہیئے۔ ریاست کی سرکاری زبان سے واقفیت کا امتحان انتخاب کے بعد اور آزمائشی دور کے اختتام سے پہلے لینا چاہیئے۔

یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم کے مسئلہ پر تفصیل سے غور کیا گیا۔ یونیورسٹی میں علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا رجحان بیشتر اعتبار سے مناسب ہے، لیکن اس طرح ایسی یونیورسٹیاں بقیہ ہندوستان سے الگ تھلگ ہوکر رہ جائیں گی۔ ایک کلی ہند زبان کی صورت میں ان کے مابین کوئی مشترک رشتہ قائم نہ رہے گا۔ اساتذہ اور طلباء آسانی سے ایک یونیورسٹی سے دوسری یونیورسٹی میں جا سکیں گے اور مختلف لسانی علاقوں کے مابین مشترک رابطہ ہونے کی صورت میں تعلیم کے مقصد کو نقصان پہونچے گا۔ یونیورسٹیوں کے مابین اس مشترک لسانی رشتہ کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ یہ مشترک لسانی رشتہ انگریزی یا ہندی کے ذریعہ قائم ہوسکتا ہے بالآخر ہندی ہی یہ رشتہ قائم کرے گی۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہندی کو اس کا اہل بنانے کے لئے ہر طرح کوشش کی جائے۔ ہندی اور عام طور سے کسی علاقائی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا اس وقت مفید ہوسکتا ہے جبکہ یہ زبان جدید تعلیم اور خاص کر سائنسی اور ٹیکنیکل مضامین کی تعلیم کا ذریعہ بننے کے لئے اچھی طرح ترقی کرے۔ اس مقصد کے لئے ہندی اور دوسری زبانوں کو ترقی دینے کی ہر طرح کوشش کرنا چاہیئے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، انگریزی بدستور قائم رہے گی۔ انگریزی کی جگہ ہندی یا کسی علاقائی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا کام تدریجی ہو یا مضامین کے اعتبار سے اس کی تقسیم کردی جائے۔ یعنی جب تک ضروری ہو سائنسی اور ٹیکنیکل مضامین انگریزی میں پڑھائے جائیں اور دوسرے مضامین ہندی یا کسی علاقائی زبان میں۔ ہر صورت میں اسکولوں اور کالجوں میں ہندی اور انگریزی میں تعلیم کا معیار بہتر کیا جائے اور بلند سطح پر قائم رکھا جائے۔

جیسا کہ مرکزی حکومت نے فیصلہ کیا ہے تمام سائنسی اور ٹیکنیکل

اصطلاحات مروجہ بین الاقوامی اصطلاحات کی بنیاد پر وضع کی جائیں اور وہ سب ہندوستانی زبانوں میں یکساں طور پر استعمال ہوں۔

کانفرنس میں مرکزی حکومت کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا گیا کہ ہندی کے کل ہند سرکاری زبان بن جانے کے بعد بھی کل ہند سرکاری مقاصد کے لئے ہندی کے ساتھ ساتھ انگریزی کا استعمال جاری رہے گا۔ یونین کی سرکاری زبان سے متعلق صدر کے حکمنامہ میں بھی اس کی مزید تصدیق کر دی گئی ہے۔

اس امر سے اتفاق کیا گیا ہے کہ لسانی اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ سے متعلق پالیسی پر عمل درآمد کرنے اور قومی یک جہتی پیدا کرنے کا کام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دستور کی دفعہ ۳۵۰ (ب) میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کے فرائض درج ہیں۔ ظاہر ہے کہ کمشنر کو ان تحفظات کو بڑے کار لانے کا انتظامی کام نہیں سونپا جا سکتا۔ مگر اس بات پر زور دیا گیا کہ کمشنر کے ساتھ ساری ریاستیں پوری طرح تعاون کریں۔

لسانی اقلیتوں کا کمشنر نہ صرف سالانہ رپورٹیں ہی تیار کرے بلکہ اہم باتوں سے متعلق وقتاً فوقتاً اور رپورٹیں بھی تیار کرتا رہے۔ جنہیں متعلقہ وزرائے اعلیٰ اور وزارت داخلہ کو پیش کیا جائے۔ اسی کے ذریعہ تمام وزرائے اعلیٰ کو یہ رپورٹیں بھیجی جائیں۔

منطقاتی کونسلوں کو اپنے علاقوں میں اس پالیسی پر عمل درآمد کرانے کی طرف خاص توجہ دینی چاہیئے۔ مرکزی وزیر داخلہ کے زیر صدارت منطقاتی کونسلوں کے نائبین صدر پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کرنا چاہیئے۔ اگر ضروری ہو تو مرکزی وزیر داخلہ، دوسرے وزرائے اعلیٰ اور وزیروں کو اس کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کی دعوت دے سکتے ہیں۔ کمیٹی لسانی اقلیتوں کے مختلف تحفظات پر عمل درآمد اور قومی یک جہتی بڑھانے کے کام پر نظر رکھے گی۔

قومی یک جہتی بڑھانے کی اہمیت کے پیش نظر وزرائے اعلیٰ اور مرکزی وزیروں کی مزید کانفرنسیں ہونی چاہئیں تاکہ یہ کچھ کام کا جائزہ لیں اور حسب ضرورت مزید اقدامات تجویز کریں۔ اس مقصد کے حصول میں کامیابی کا انحصار مستقل نگرانی اور تمام ریاستوں اور مرکزی حکومت کے مابین تعاون پر ہے۔

کانفرنس میں طے کیا گیا کہ قومی اور جذباتی یک جہتی بڑھانے کے لئے زیادہ اچھی طرح وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کی جائے۔ مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات اس موضوع پر ایک نوٹ تیار کر کے وزرائے اعلیٰ کو بھیجے گی جس پر آئندہ اجلاس میں غور کیا جائے گا۔

قومی یک جہتی کی اہمیت کے پیش نظر یہ قرار پایا کہ اس کے لئے قومی پیمانے پر کام کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک وسیع تر کانفرنس ہونی چاہیئے جس میں وزرائے اعلیٰ، مرکزی وزراء کے علاوہ پارلیمنٹ کی مختلف پارٹیوں کے نمائندہ ممبر اور دوسرے ممتاز لوگ، ماہرین تعلیم، سائنس دان اور کاروباری لوگ شامل ہوں۔

---

## ضروری گزارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے۔

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ اُن کے ہمراہ ہوں گے۔

(ادارہ)

# دو چراغ اور بجھے

## مولوی عبدالحق

۱۶- اگست ۱۹۶۱ء کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کا کراچی میں ۹۱ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مولوی صاحب ۱۹۱۲ء سے انجمن ترقی اردو سے وابستہ تھے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہی اس کے بانی تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے متعدد گوشوں میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کیں اور اردو کے ادیبوں اور کارکنوں کی رہنمائی کی۔ وہ خود بھی اردو کے بہت بڑے ادیب اور انشاپرداز ہوئے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہوا ہو جس نے اتنی لمبی مدت تک ایک مجاہد کی طرح اردو کی خدمت کی ہو۔ مولوی صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے اور ان کی زندگی بڑی باقاعدہ تھی۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ اردو کی خدمت کے جنون میں بعض ایسی باتیں بھی کیں جن سے ہمیں اتفاق نہیں۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ اردو کے خادموں میں ان کی ہستی بے مثال تھی اور جب تک اردو زندہ ہے ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔

---

## سید عطاءاللہ شاہ بخاری

سید عطاءاللہ شاہ بخاری جنھیں ان کے عقیدت مند شاہ جی کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ ۲۱- اگست ۱۹۶۱ء کو ملتان میں انتقال کر گئے۔ شاہ صاحب مرحوم نے اپنی زندگی ایک مجاہد کی حیثیت سے گزاری۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں آپ نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ انھیں خدمتِ وطن کے انعام میں اپنی سُدھ بُدھ بھی نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا ہے ---"میں نے تمام عمر اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے۔ ایک زندگی مستعار لایا تھا کچھ جیل میں کٹی کچھ ریل میں کٹ گئی ---" شاہ صاحب ادب اور خطابت کا ایک نادر مجموعہ تھے۔ ان کے عقیدت مند انھیں امیرِ شریعت کہا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ امیرِ خطابت بھی تھے۔ اردو کا ایسا فصیح مقرر اور خطیب شاید ہی کسی زمانے میں پیدا ہوا ہو۔ وطن پرستی ان کا مزاج تھا اور بدیشی راج سے نفرت ان کی گھٹی میں تھی۔ انھیں جذبات کو لے کر وہ ہزاروں آدمیوں کے مجمعوں پر چھا جایا کرتے تھے۔ قرآنی آیات کی قرأت اور برمحل اشعار کے پڑھنے سے تقریروں میں جان ڈال دیا کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان میں دُکھی تھے۔ یہ زمانہ بھی انھوں نے خوش و قتی سے نہیں گزارا بلکہ فقر و فاقہ ان کے شاملِ حال رہے۔

عرش ملسیانی

منوّر لکھنوی

# عزیز لکھنوی

۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ اردو زبان کے تحفظ اور ترقی کے سلسلے میں لکھنؤ کے ادباء و شعراء نے ایک انجمن قائم کی تھی۔ انجمن کی نشستیں امین آباد کے ایک بالائی کمرے میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ یہ یاد نہیں کہ اس کمرے میں کسی اخبار یا رسالے کا دفتر تھا یا اراکینِ انجمن میں سے کوئی صاحب اس میں رہتے تھے۔ بہرحال انجمن نے میرے رہنمائے سخن مرحوم منشی ہدایت رائے نظر لکھنوی سے اشتراک و تعاون کے لئے درخواست کی۔ بیماری کے باعث وہ بذاتِ خود انجمن کی مجلسوں میں شرکت سے معذور تھے لہٰذا مجھے حکم ہوا کہ میں ان مجلسوں میں شرکت کیا کروں۔ چنانچہ جب پہلی نشست میں شریک ہوا تو اس میں کئی کالج فن ادیبوں اور شاعروں نیز لکھنؤ یونیورسٹی کے کچھ پروفیسروں کو موجود پایا۔ انھیں ادباء و شعراء میں مولانا محمد ہادی عزیز لکھنوی بھی شریک تھے۔ غالباً میں نے پہلی مرتبہ انھیں اسی نشست میں دیکھا ان کے علاوہ مرحوم حضرت یگانہ، حضرت بہار، سکریٹری بزم بہار ادب نیز کچھ اور مقتدر ارباب ادب بھی شامل تھے۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں میں ڈاکٹر بذل الرحمان اور پروفیسر کمال الدین تھے۔

مولینا عزیز سے میرا پہلا براہ راست تعارف اسی نشست میں ہوا۔ مولینا شروع ہی سے بڑے متین تھے اگر گفتگو کے دوران میں کبھی کوئی موقع تبسّم کا آ جاتا تو صرف ملکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر دوڑ جاتی تھی۔ ہر شخص سے کھل کر بات نہیں کرتے تھے شاید حفظِ مراتب کا خیال رہتا تھا۔ مولنا کے چہرے سے رعب و جلال ٹپکتا تھا۔ ان کی وضع و قطع اور اُن کی اونچی کوٹھی کی پیشانی دری ٹوپی سے اس رعب و جلال میں اور بھی اضافہ ہوتا تھا۔

اس کے بعد مولنا سے ملاقات کے اکثر موقعے ملتے رہتے۔ زیادہ تفصیلی ملاقات تو اس یکے پر ہوتی تھی جو دکھنڈریہ گنج سے انھیں امین آباد اور مجھے حضرت گنج لے جایا کرتا تھا۔ نظر صاحب کے ساتھ میرے سلسلۂ تلمذ کے باعث وہ مجھے برادرانہ شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہِ ایران کا سفرنامہ یکے پر بیٹھے بیٹھے مطالعہ ہو رہا تھا دفعتاً دورانِ مطالعہ میں اس مقام پر پہنچے جہاں شاہِ ایران کی کسی گھوڑ دوڑ میں شرکت کا ذکر تھا۔ عبارت پڑھتے ہی بھڑک اٹھے اور فرمایا "دیکھئے گھوڑ دوڑ کی سیر کے لئے کیسا حسین لفظ فارسی زبان میں شاہ ایران نے استعمال کیا ہے شاہ نے تقریر فرمایا تھا: امروز بہ سیر اسپ دوانی رفتیم

اس لفظ "سیر اسپ دوانی" پر مولنا لٹو ہو گئے۔ پارس ریس کے لئے گھوڑ دوڑ کے انداز کا نعم البدل فارسی زبان میں 'اسپ دوانی' سے زیادہ بہتر کوئی لفظ ہو سکتا ہے۔

فرمانے لگے 'زبان' اس کو کہتے ہیں۔

مولنا عزیز کو میں نے مشاعرہ پڑھتے سنا ہے۔ مخصوص لکھنوی ترنم میں پڑھتے تھے۔ اسی ترنم میں قبلہ مولنا صفی مرحوم بھی کلام فرماتے اور یہی انداز حضرت ثاقب مرحوم کا بھی تھا۔ ثاقب جب پڑھتے معلوم ہوتا تھا ایک چین بجوم رہا ہے۔ اللہ اللہ کیا بزرگ تھے۔ ان تینوں باکمالوں کے اندازِ شعر خوانی میں عجیب کیفیت تھی۔ ترنم کا ترنم اور متانت

کی متانت۔ آواز میں بھی سوز تھا، کلام میں بھی گداز تھا۔ میں نے مولٰنا صفی کے دربار میں بھی کئی مرتبہ حاضری دی ہے۔ اتنی محبت سے پیش آتے گویا ایک شفیق باپ اپنے بیٹے سے پیار کی باتیں کر رہا ہے۔

۱۹۲۸ء میں بسلسلۂ ملازمت میرا تبادلہ لکھنؤ سے پہلے لاہور اور پھر دتی ہو گیا لیکن مولٰنا عزیز سے ربط و ضبط بڑھتا ہی گیا۔ اب اس سلسلے کی ایک کڑی مولٰنا کے محبوب شاگرد اور اناؤ کے مرحوم باکمال شاعر، ادیب اور فلسفی جگت موہن لال رواں بھی بن گئے تھے۔ رواں مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات نے بھی بہت جلد خصوصی شکل اختیار کر لی تھی۔

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے میں لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ حسب دستور مولٰنا عزیز کے دولت کدہ پر حاضری دی۔ اسی ملاقات کے دوران میں نے عرض کیا "قبلہ میرا خیال ہے کہ خواجہ آتش کے بعد صرف ایک آپ کی ہستی مجھے ایسی خوش نصیب نظر آتی ہے جس کو اتنے باکمال اور عالم و فاضل شاگرد میسر ہوئے ہیں مثلاً حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت جعفر علی خاں اثر لکھنوی، حضرت تسکین سورتوی، حضرت شام موہن لال جگر بریلوی نیز حضرت جگت موہن لال رواں۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ اپنے تمام شاگردوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ کس کو اپنا بہترین شاگرد سمجھتے ہیں۔"

مولٰنا مسکرائے۔ حضرت جوش ملیح آبادی کے متعلق انھوں نے کسی قسم کی بھی رائے دینے سے احتراز کیا۔ صرف اشارے سے اتنا ظاہر کیا کہ جوش صحیح جادۂ شاعری سے بھٹک گئے ہیں۔ غالباً مولٰنا مرحوم حضرت جوش کی اجتہادی روش، بانیانہ فطرت اور ان کی رومانیت پسندی کے باعث ان سے خوش نہیں تھے۔ دونوں کے تعلقات میں کسی قسم کی بُعد واقع ہو چکا تھا۔ انھوں نے صرف جعفر علی خاں اثر اور حضرت رواں کا ذکر خاص طور پر کیا اور فرمایا:

"آتش و ماغ کے شاعر ہیں اور رواں کے یہاں دل و داغ ہوتے ہیں۔" وہ رواں کے بڑے مداح تھے اور ان کے حسن سلوک کے بھی گرویدہ تھے۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ منشی گوپی ناتھ امن، ان کے چھوٹے بھائی گورسرن لال ادیب اور حضرت سحر عشق آبادی بھی مولٰنا کے تلامذہ میں تھے۔

ایک مرتبہ میں نے دریافت کرنے کی جرأت کی کہ مولٰنا اتنے کمالات کے باوجود آپ محض امین آباد ہائی اسکول کی معلمی پر کیوں قانع ہیں آخر آپ کو حصول معاشی کے لئے اس درہ سری کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے تلامذہ ہی آپ کی اتنی خدمت کر سکتے ہیں کہ آپ کو کسب معاش کھونے فکر و کاوش کی ضرورت نہیں پیش آ سکتی۔

رواں اپنی ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ قبلہ کا جواب کچھ اس طرح تھا:۔

"بھئی رواں بھی کئی مرتبہ یہی بات کہہ چکے ہیں لیکن کیا آپ لوگ مجھے اتنی تھوڑی سی بہت آمدنی سے بھی محروم کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعہ میں خاموشی اور عزت و آبرو کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ان تمام سعادت مند شاگردوں کی استعداد بھی دقتی چیز ہوگی۔ کتنے دنوں تک اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے دی ہمسایہ در بہشت

بات ٹھیک ہی تھی۔

مولٰنا عزیز نے کسی زمانے میں حضرت صفی سے استفادہ سخن کیا تھا۔ بعد ازاں یہ سلسلہ منقطع سا ہو گیا۔ میں نے اس بارے میں بھی استفسار کی جرأت کی۔ اس سوال کا جواب بھی انھوں نے روایتی مسکراہٹ کے ساتھ دیا اور حضرت صفی سے قطع تعلقات کی بنا فقط 'غمزۂ عشوہ' کے لفظ کو قرار دیا جس کے بارے میں وہ دونوں بزرگوں کے درمیان اختلاف رائے تھا۔

مولٰنا نہایت خوددار تھے۔ عربی اور فارسی میں ان کی قابلیت مسلّم تھی۔ میرے خسر علامہ منشی محمد یٰسین پرشاد صدر لکھنوی بھی ان کے قائل تھے۔ اگرچہ وہ ہر کس و ناکس کو نظر میں نہ لاتے تھے۔ مولٰنا عزیز بھی جناب صدر کی علمیت تسلیم کرتے تھے۔ صدر صاحب فارسی میں پہلے حضرت آغا سخن کے شاگرد تھے بعد ہٗ مولٰنا عزیز الدین عزیز کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ لیکن وہ خود اپنی جگہ استاد تھے۔ اردو اور فارسی گوئی میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ جب مولٰنا عزیز نے محلہ اشرف آباد میں اپنا مکان بنوایا تو جناب صدر ہی سے اس کی تاریخ کے لئے درخواست کی۔

صدر صاحب نے کئی تاریخیں نکالیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

عشرت گہِ میرزا محمد ہادی — تعمیر شد است و نیز آباد شد است
بے ساختہ صدر لکھنوی سال نوشت — دولت کدۂ عزیز آباد شد است

۱۳۳۵ھ

—

مکان عزیز است فرحت فزا — کہ تعمیر شد از برائے عزیز
بہ بحری سنبیش بنا کلک صدر — رقم کرد عشرت سرائے عزیز

۱۳۳۵ھ

ایضاً

عزیزاں میرزائے نکتہ پیرا — محمد ہادی اشرف ولی نشین ست
مکانے خوش بنا فرمود فی الحال — کہ در خوبی چوں فردوس برین ست
بگیتی نیک خو، دل کش مکانے — مکاں را صد شرف زیباں کمیں ست
بفرمایش نمود م فکر تاریخ — کہ آئیں صفی سنجاں چنیں ست
ندا از آسماں آمد کہ اے صدر — بگو فردوس برڑے زمیں ست

۱۳۳۵ھ

اور مولٰنا کے اس مکان کی تعمیر کے تین سال بعد ہی صدر مرحوم کو مولٰنا کی اہلیہ محترمہ کی تاریخ وفات بھی نکالنا پڑی۔

ان کی زوجہ ہوئیں جنت کو رواں — کیوں نہ سنسان ہو ایوانِ عزیز
صدر لکھ روح الم سے تاریخ — کہ بھی شیخ شبستانِ عزیز

۱۳۳۸ھ

چونکہ میں خود بھی مشاعروں میں کم آتا جاتا تھا۔ میں نے حضرت عزیز کو مشاعرہ پڑھتے شاید ہی ایک دو مرتبہ دیکھا ہے۔ مرزا یگانہ اور مولٰنا عزیز کے باہمی تعلقات آخر دم تک درست نہیں ہوئے۔ دونوں ہستیاں اپنی اپنی جگہ کامل فن اور یگانۂ روزگار تھیں۔ ہم نے پڑھ جو اٹھایا تو قتیل مرحوم کی مولٰنا عزیز کے اس مصرع والی غزل پر مرزا یگانہ نے مولٰنا کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے مولٰنا نے براہ راست کبھی مرزا یگانہ کے خلاف قلم نہیں اٹھایا۔ مرزا یگانہ نے یوں تو تمام اہل لکھنؤ کے خلاف علم اجتہاد بلند کر رکھا تھا لیکن ان کا خاص نشانہ مولٰنا محمد ہادی عزیز ہی رہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولٰنا عزیز مرزا غالب کے پرستاروں میں تھے اور مرزا یگانہ بیعنہٖ غالب نشکن رہے۔

مولٰنا عزیز سے جب کبھی حضرت یگانہ کے سلسلے میں کوئی ذکر آیا آپ کبھی ان کے متعلق ایک لفظ بھی ایسا زبان پر نہ لائے جو تہذیب و ادب کے دائرے سے خارج ہو۔ ان کی ایک روایتی مسکراہٹ اپنے پہلو میں لاکھوں جواب رکھتی تھی۔

اردو شاعری کے دو جدید اسکول بھی جس کے خاص نمایندے حضرت اصغر گونڈوی اور حضرت جگر مرادآبادی تھے۔ شخصیات کے خلاف تو نہیں البتہ لکھنوی مدرسۂ فکر کے خلاف ضرور تھے۔ جگر مرحوم نے ایک مرتبہ ۱۹۳۰ء میں جب وہ بھوپال ہاؤس واقع حضرت گنج لکھنؤ میں حضرت رضا کے مہمان تھے خود مجھ سے فرمایا کہ تمہارے کلام کو لکھنؤ کے رنگ غزل سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ لکھنؤ والوں نے مرثیہ کہتے کہتے غزل کو بھی مرثیہ بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد ہادی عزیز کا یہ شعر اور اسی نوعیت کے دوسرے اشعار عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ ابرو باد یہ تیرہ
تمہیں اے سونے والو کس طرح آرام آتا ہے

جدید نظریہ تو یہ تھا کہ ہماری شاعری سے زندگی کا ہر طرح حزنیہ پہلو نمایاں ہوتا ہے اس کو نشاطیہ پہلو کا بھی نمائندہ ہونا چاہیئے۔ اہل لکھنؤ کے کلام میں بیشتر حزنیہ رنگ پایا جاتا ہے اور کیا صفی کیا عزیز کیا محشر کیا شاقب کیا استاذی مرحوم منتہی نوبت رائے نظر ان سب بزرگوں کے کلام سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ اہل لکھنؤ کے کلام میں حزنیہ رنگ کیوں غالب ہے اس مسئلے پر مدتوں بحث رہی ہے اور میں نے اپنے اس دیباچے میں جو دیوانوں کے دیباچہ پر شاد کے مرتبہ حالات و کمالات نظر کے لئے حال میں لکھا ہے۔ نفسیاتی طور پر اس حزنیہ رنگ کا فلسفیانہ جواز پیش کیا ہے۔ لکھنؤ اسکول کا یہ نظریہ کافی اہمیت رکھتا ہے اور آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سوز و گداز ہی زندگی کی روح ہے یا سطحی جس شاعری میں سوز و گداز کے عناصر مفقود ہوں وہ حقیقی شاعری نہیں کہی جا سکتی۔

مدتوں میں مولٰنا کی غزلیات ہی سے محظوظ و مستفید ہوا ہوں۔ ان کے بعض اشعار کو تو میں اردو شاعری کے سرمایۂ ناز سمجھتا ہوں مثلاً

وہ سوئے تو تھا بہت ادا کی گو سے طور کو
ہوش اڑ گئے ہیں ایک سنہری لکیر سے

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن

## بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

مقدیرو غالب جناب حکیم سید علی محسن خاں آبرو لکھنوی کسی زمانے میں رسالہ معیار نکالتے تھے جس میں ایک حصّہ غزلیات کا بہ تقابل تو انی شامل ہوتا تھا اور اس زمانے کے اکثر اساتذہ لکھنؤ مثلاً مولٹا صفی، آرزو، انور، بلیغ، ثروت، حامد، سحر، شفق، شمیم، عزیز، اکبر، محب، محشر، نظر (فتح نوبت رائے) وصفت اور دہلی وغیرہ کے اشعار ہر قافیے میں یک جا درج ہوتے تھے۔ ذیل کے اشعار مولٹا عزیز مرحوم کے ارشاد گرامی ہیں۔ بوجہ طوالت تمام اساتذہ کے مقابل اشعار درج نہیں کیے جا سکتے ہیں۔

جب تک رہی ہیں عجیب کی راتیں زمانے میں
کتنی تھی صبح حشر مرے آشیانے میں
ہر پھر کے آ رہا ہے زمانہ کشاں کشاں
کیا مرکزی کشش ہے ترے آستانے میں
مجبور ہوں کہ وعدہ خلافی پہ خوش رہوں
پہلو سکوں دل کا ہے ان کے بہانے میں
لو وہ بھی سر جھکائے ہوئے ساتھ ہیں
یوں بھی کسی کی لاش اٹھی ہے زمانے میں
طولِ شبِ فراق کو ایسے ہیں دیکھ لو
اُلجھی ہوئی ہے زلفِ دلآویز شانے میں
دل میرا کیا ہے سرنیٔ مضمونِ عشق ہے
دو حرف یہ ہو سے لکھے ہیں فسانے میں
مانا کہ ہے حضور کی چشمک بجھی ہوئی
دل بے خطا ہے، ہوگی خطا اس نشانے میں

لیکن میری نگاہ میں ان کی جس قدر عظمت تھی اس میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوا جب میں نے ان کے قصائد کا مطالعہ کیا مجھے مولٹا کی شخصیت غزل میں اتنی اجاگر نہیں نظر آئی جتنی صحیفہ دلا میں نظر آئی صحیفہ دلا میں ایک بحرِ بیکراں کا تلاطم آمیز توج پایا جاتا ہے۔ اس کا لفظ لفظ اپنی جگہ ادب کا ایک بلوریں نقش نظر آتا ہے۔ سچ پوچھئے تو مجھے مولٹا کے جسدِ شعری کی اصلی روح ان کے قصائد میں نظر آئی اور انھیں قصائد کے مطالعہ سے میں نے مولٹا عزیز کو بھی اسی سدرۃ المنتہیٰ پر فائز و متمکن پایا جو ڈاکٹر اقبال کے حصے میں آ چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ قصائد دلا کا عزیز غزل کے عزیز سے کہیں زیادہ بلند اور کامیاب ہے۔ اب کوئی مجھ سے اس بارے میں متفق ہو یا نہ ہو یہ اور بات ہے۔

مولٹا عزیز کی غزلوں کا ما بہ الامتیاز ان کا سوز و گداز ہی ہے سوز و گداز کے بغیر حضرت عزیز کی کوئی غزل نہیں۔ ان تمام تاثرات کا خاتمہ مولٹا مرحوم کے کچھ مزید اشعار پر ہونا چاہیئے۔

نزع میں چلتے ہیں میرے ہونٹ سنئے غور سے
یہ مری آواز ہے یا آپ کی آواز ہے
کر چکے برباد دل کو فکر کیا انجام کی
اب ہمیں دے دو یہ مٹی ہے ہمارے کام کی
دل جلا ڈالا ہو پی کر نگاہِ ناز نے
بے گمنہ سوزی تو دیکھو برق خوں آشام کی

شاعری کے بارے میں مولٹا کے یہ الفاظ سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہیں

ہو گئی باز یچۂ یارانِ بے ذوق و شعور
شاعری جو تھی مرادف معنوٗ الہام کی
پختگی سمجھے ہوئے ہیں جو تناسب کو فقط
چاہیئے اصلاح ان کو اس خیالِ خام کی
ہے یہ نازک فن جو شایانِ تہی مغزی نہیں
دورِ مجلس میں ضرورت کیا ہے خالی جام کی

---

شامِ فراق ذکرِ جوانی میں کٹ گئی
کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی
اب انتظار کیا ہے تجھے اے حریصِ عیش
پیری بھی انتظار جوانی میں کٹ گئی
دل چپ و دل فریب ہے کیا عیش بے ثبات
دنیا کی عمر ایک کہانی میں کٹ گئی

آنکھوں کو شغلِ گریہ ہمیشہ رہا عزیز
دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی
یہ ہجر کے سرہانے سے وہ بیمار کے اُٹھے
صد شکر کہ مجھ پر کوئی الزام نہ آیا
کوئی مریضِ غم کا دامِ واپسیں نہیں
اک جان ہے سو وہ بھی کہیں ہے کہیں نہیں
ہاتھوں سے مرے دامنِ رحمت چھڑا تو لے
ہاں ہاں میں جانتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی
پہلے کچھ قدر نہ کی عشق کے بیماروں کی
سرنگوں بیٹھے ہیں اب صف میں عزاداروں کی
بے جز عشق کے آثارِ قدیمہ نہ مٹا
جوشِ کہتا ہے بھونیو میں دیواروں کی

شانہ زلفوں میں کر آہستہ سنورنے والے
سانس اکھڑی ہوئی ہے دیر سے بیماروں کی
میں تو میں کاوشِ غم ہے وہ بری چیز عزیز
شکلیں دیکھی نہیں جاتیں مرے غم خواروں کی

مولانا عزیز جہاں اپنے نجی طرزِ عمل میں تعصب سے بالاتر تھے وہاں انھوں نے اپنی نظموں میں بھی مذہبی رواداری سے کام لیا ہے۔ 'شادی' کے عنوان سے ان کی ایک نظم جنوری ۱۹۲۶ء کے زمانہ میں چھپی تھی۔ وہ بالکل ہندوستانی فضا میں ڈوب کر کہی ہے۔ عرب اور فارس کے تمدن سے علیحدہ ہو کر مولانا نے اس نظم میں جہاں نور جہاں اور جہانگیر کا ذکر کیا ہے وہاں ہریش چندر اور سیتا ویا، نل اور دمن۔ سیتا اور رام، شراوتی اور پاربتی، ستیہ وان اور ساوتری، کرشن اور رکمنی کی معیاری بھگتی کے بھی نقوش نہایت پاکیزگی کے ساتھ کھینچے ہیں۔

---

## ۱۹۵۹-۶۰ء میں اناج کی فصلِ خریف و ربیع پر اعزاز

ہماچل پردیش مدھیہ پردیش نے ۱۹۵۹-۶۰ء کی بالترتیب خریف و ربیع کی اناج کی پیداواری مہموں کے سلسلے میں 'راشٹرپتی کلش' کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ فصلِ خریف کی پیداواری مہم میں ریاستوں اور مرکزی علاقوں نے حصہ لیا تھا جن میں ہماچل پردیش میں اناج کی پیداوار میں سب سے زیادہ یعنی ۳۰ فی صد اضافہ ہوا جبکہ مدھیہ پردیش میں فصلِ ربیع میں ۲۵ فی صد زیادہ اناج پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ ان دونوں ریاستوں نے ۵۰-۵۰ ہزار روپیہ کی مالیت کے اجتماعی انعامات بھی جیتے ہیں۔

اجتماعی انعامات کی اسکیم پیداوار بڑھانے کی غرض سے ۱۹۵۸-۵۹ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے تحت خریف و ربیع کی فصلوں میں ۱۵ فی صد یا اس سے زیادہ اضافہ کرنے والی ریاستیں پچاس پچاس ہزار روپیہ کا اعزاز حاصل کرنے کی مستحق سمجھی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ فیصد اضافہ والی ریاست کو چاندی کی ٹرافی 'راشٹرپتی کلش' ملتی ہے۔ جن ضلعوں میں پیداوار میں ۱۵ فی صد یا اس سے زیادہ اضافہ ہو، ان میں سے ہر ایک کو دس ہزار روپیہ دیا جاتا ہے اور جس ضلع میں سب سے زیادہ اضافہ ہو اُسے 'راجیہ کلش' کا اعزاز ملتا ہے۔ ۱۹۵۹-۶۰ء کی فصلِ خریف کے لئے ہماچل پردیش کے علاوہ بہار، پنجاب، راجستھان، دہلی اور جزائر انڈمان و نکوبار کو بھی پچاس پچاس ہزار روپے کے انعامات ملے۔

ارشد صدیقی

# ترقیاتی منصوبہ بندی

مرا وطن ہے کہ زندگانی دلھن بنی ہے سنگھار کر کے

حسین ماتھے پہ تاج جیسا حسین جھومر چمک رہا ہے
نقوشِ اجنتا کے ہنس رہے ہیں کہ حسنِ فطرت جھلک رہا ہے
فضائے کشمیر ہے کہ گویا فضا میں آنچل لہک رہا ہے

شعور بیدار ہو گئے ہیں کہ زلفِ مشکیں سنور گئی ہے
چراغ روشن ہیں علم و فن کے کہ مانگ تاروں سے بھر گئی ہے
ملا ہے صنعت نے رخ پہ غازہ تو اور رنگت نکھر گئی ہے

یہ بھاکڑا کی شگفتہ موجیں کہ پائلیں چھن چھنا رہی ہیں
یہ نہرِ چنبل کی گنگناہٹ کہ دیویاں گیت گا رہی ہیں
یہ کھیتیاں لہلہا رہی ہیں کہ جنتیں مسکرا رہی ہیں

یہ شوخ چشموں کی جگمگاہٹ کہ دیدۂ دل نکھر گئے ہیں
عمارتوں کی قطار ہے یا نقوشِ فطرت ابھر گئے ہیں
یہ چمنیوں کا دھواں کہ جیسے فضا میں آنچل بکھر گئے ہیں

نئی مشینیں کھنک رہی ہیں جدید انجن گرج رہے ہیں
یہ گلشن آرائی کے سلسلے کہ دشت و صحرا بھی سج رہے ہیں
اناج کی بالیوں کی لے پر فضا میں گھنگرو سے بج رہے ہیں

یہ سیوی ایکٹرک کے سانچے یہ قومی جذبات کی نظیریں
بھلائی کی صنعتِ درخشاں کہ آہنی عزم کی لکیریں
ہزار خورشید جگمگائیں جو ایک ذرّے کے دل کو چیریں

یہ صاف سڑکیں حسین پنگھٹ یہ نہر تالاب پیارے پیارے
یہ برق سے گاؤں گاؤں روشن یہ شہر و قصبات کے نظارے
یہ قمقمے ہیں کہ آسماں سے اتر پڑے ہیں زمیں پہ تارے

یہ ریل کی پٹریاں کہ جیسے زمیں پہ رخشندہ کہکشاں ہے
یہ جال نہروں کے جن سے رگ رگ میں زندگی کا لہو رواں ہے
یہ پیار کی سرزمیں کہ جس پہ شبابِ فردوس کا گماں ہے

مرا وطن ہے کہ زندگانی دلھن بنی ہے سنگھار کر کے

# بیدر

(دکن کا ایک تاریخی شہر)

سرزمین دکن ہندوستان کا قدیم ترین حصّہ ہے جو جغرافیہ دانوں کے قول کے مطابق زلزلوں کی سرزمین رہی ہے۔ علاقہ تلنگانہ میں تو زلزلہ کے اثرات نمایاں ہیں۔ یعنی لاوا بڑے بڑے پتھروں کی شکل میں ایک پر ایک اس طرح رکھا ہوا ہے جیسے کسی دیو یا جن، مافوق الفطرت ہستی نے اُٹھا کر رکھ دیا ہے۔ یہ سب آتش فشانی مادہ کا ظہور ہے۔

سطح مرتفع دکن، جس کا ایک حصّہ برار یا ودربھ کہلاتا ہے یہاں ایک قدیم سلطنت تھی جس کو 'ودربھ' کہتے تھے اس کا پایۂ تخت 'ودبد' موجودہ 'بیدر' تھا۔ سلطنت ودربھا موجودہ صوبہ برار سے وسیع تر تھی۔ بیدر اپنے وقوع کے اعتبار سے ایک بلند مقام ہے اور سیاسی اعتبار سے بھی ایک اہم مقام رہ چکا ہے۔ کیونکہ مختلف ملکوں کی سرحدیں یہاں ملتی تھیں۔ بیدر کے چاروں سمت میں چار مختلف زبانیں فصیح بولی جاتی ہیں۔ سمت قلعہ گلبرگہ (تلنگھاٹ) میں تلگو، مکان دروازہ بیدر سمت مکہ معظمہ یعنی مغربی سمت میں مراٹھی اور نورس دروازہ موجودہ فتح دروازہ گویا جنوبی سمت میں کنڑی بولی جاتی ہے۔ موجودہ لسانی صوبوں کی تقسیم کی وجہ سے ضلع بیدر اب مختلف علاقوں میں بٹ گیا۔

بیدر کے مغرب میں چھ کوس قصبہ خانہ پور تک اور جنوب میں بارہ کوس تک جس میں قصبہ بلی کھیڑ (۱۶ میل) ہمنا باد وقار آباد کوہ انت گیری جہاں اب سیمنٹ فیکٹری ہے، بیدر سے ۵۰ میل تک سُرخ شیرنی زمین پھیلی ہوئی ہے جو نہایت زرخیز، جاندار اور گیہوں کی پیداوار اور ہر قسم کے میوہ جات کے لئے نہایت موزوں ہے۔ خصوصاً بیدر کے تخمی آم (چوسنے والے) بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ خاص کر بیدر کی آمنی، جبشی آم نہایت مشہور ہوتے ہیں۔ گلاب کی طرح خوشبودار اور ہشت سے زیادہ میٹھے ہوتے ہیں کہا جاتا ہے کہ سلطنت بہمنیہ بیدر کے مشہور وزیر خواجہ محمود گاواں نے زعفران کی کاشت بھی کرائی تھی۔ اہل ہنود کی قدیم کتابوں میں اس سرزمین کو جہاں تک سُرخ مٹی ہے بسند رجیت، یعنی رجپوت کہتے تھے جس کا طول عرض ۶۰ میل ہے۔ اس مٹی کی حالت یہ ہے کہ ایک مرتبہ صرف بیدر ہی کے کوچہ و بازار میں چلے جائیے، واپسی پر آپ کے کپڑے سُرخ گرد سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔ بیدر کے من چلے شوخ لچے لوگ کہا کرتے ہیں کہ ع خاکِ بیدر را بخونِ عاشقاں گل کردہ اند مگر افسوس ہے کہ خواجہ محمود گاواں جیسے مدبّر وزیر کے بے گناہ قتل نے اس کو 'بخونِ مظلوماں گل کردہ اند' بنا دیا ہے، جس کو تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔

بیدر کے قدیم راجگان راجہ شیوراج ماحر راجہ بلجر ماجیت (ہمعصر منوچہر شاہ ایران) کے آبا و اجداد تھے جس نے کیخسرو فوج کے ساتھ اپنے سپہ سالار کشن رائے کو تسخیر دکن کے لئے بھیجا تھا جس نے شیوراج کو مغلوب کیا اور راجہ ہوا۔ اس کی اولاد نے یہاں ڈیڑھ ہزار سال حکومت کی (سیر و گلگشت دکن) فرشتہ کا بیان ہے کہ راجہ بیدر نامی ایک شخص پانڈوؤں کی اولاد میں تھا چونکہ ملک بیدر میں اس کا بھی حصّہ تھا اس لئے بیدر کو اپنے نام سے آباد کیا (سیر ہند قادر خاں) مگر پانڈو پانچ بھائی تھے اس میں بیدر کسی کا نام نہیں۔ ممکن ہے پانڈوؤں کی اولاد

ہیں کوئی شخص ہو۔ قیام سلطنت بہمنیہ سے قبل بیدر راجگان خاندان کیکتیا (ورنگل) آندھرا اور چالوکیہ میں شامل رہا۔ آخر علاؤ الدین گرکا پائے تخت چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں کلیانی تھا جو بیدر سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے دکن کے راجگان زمانۂ ما بعد میں علاؤ الدین خلجی اور سلطان محمد تغلق کے باجگزار رہے اور جونا برار و بیدر کا حاکم محمد تغلق کا دامادِ عماد الملک تھا۔

اس کے بعد بیدر سلطان حسن گنگو بہمنی (۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء) کی سلطنت میں شامل رہا اور سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) ساتویں سلطان نے بیدر کی خوش گوار آب و ہوا کے پیش نظر اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ۹۳۴ھ تک سلاطین بہمنیہ جس کا آخری سلطان کلیم اللہ بہمنی تھا، کی حکومت رہی۔ اس کے بعد بریدیوں اور سلاطین عادل شاہیوں کی حکومت میں شامل رہا اور بالآخر شہنشاہ عالمگیر نے ۱۰۶۶ھ میں اس کو فتح کیا اور سب سے آخر میں سلاطین آصفیہ ہی کی مملکت میں شامل تھا۔ اور اب یہ ضلع کچھ علاقہ میسور میں اور کچھ علاقہ تلنگانہ آندھرا اسٹیٹ میں شامل ہے۔

## آثارِ قدیمہ

**قلعہ بیدر:** قلعہ بیدر سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) کا بنایا ہوا ہے سنہ تعمیر ۸۳۰ھ/۱۴۲۶ء قلعہ کا دور ۴ ہزار گز، دیواروں کی بلندی ۵۰ فٹ۔ اطراف پے در پے تین خندقیں چوپٹان میں کھدی ہوئی ہیں اور قلعہ کے دروازوں سے جا ملی ہیں۔

**قلعے کے دروازے:** قلعہ میں داخل ہوتے وقت پے در پے تین دروازے ہیں جن میں سب سے پہلا شرزہ دروازہ (باب الداخلہ) ہے۔ اس دروازے تک پہنچنے کے لئے درمیان میں خندق واقع ہے جس پر ایک مضبوط پل بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ایک لکڑی کا شرزہ ہے جس کی سواری جلوس کے ساتھ عشرہ محرم میں نکلتی ہے۔ اس دروازہ میں دونوں جانب شان دار کمرے بنے ہوئے ہیں جو قلعہ کے محافظ دستہ کارڈ کے لئے بنائے گئے تھے۔ اب اس میں جوانان قلعہ احتشام رہتے ہیں۔ اس میں بعض سلاطین بہمنیہ کی تصاویر آویزاں ہیں۔ اس دروازہ سے گزرنے کے بعد دوسرا گجند نما دروازہ آتا ہے جس کی فصیل پر دو شیر پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور دیواریں منقش اور رنگین ہیں اور خط نستعلیق میں ایک کتبہ بہت بلندی پر کندہ ہے جس کا پڑھنا دشوار ہے۔ تیسرا دروازہ 'گجند دروازہ' کہلاتا ہے جو بہت بڑا ہے۔ جس کا گنبد سادہ ہے۔ اس کے ختم پر قلعہ کے خاص شاہی محلات شروع ہو جاتے ہیں۔ شوخ رنگین محل دیزہ ۔۔۔ شرزہ دروازہ پر عالمگیر کے زمانہ کا ایک گجند ہے جس کی عبارت یہ ہے:-

"سنہ جلوس ۳۶، رجب چہار شنبہ مختار خان الحسینی سبزواری ایلچی"

**تخت محل:** سب سے پہلی اور قدیم عالی شان عمارت بنا کردہ سلطان احمد شاہ بہمنی ہے۔ بڑے بڑے دالان اور ستون خوبصورت سیاہ پتھر کے تھے۔ دیواروں پر چینی کا کام تھا۔ چھت میں اعلیٰ درجے کے طلائی نقش و نگار تھے۔ مرہٹوں نے جب بیدر کو تاراج کیا تو بڑی بڑی شہتیریں مرہٹہ پائے تخت ستارا اور پونا کے محلات میں کام آئیں۔ اس محل کا عالیشان دروازہ اب بھی موجود ہے۔ اس کے متصل بعض برج اور جھروکے ایسے ہیں جن کے متصل ایک تالاب تھا جس کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

**ترکش محل:** ہمایوں شاہ بہمنی کا بنایا ہوا ہے اس کے جھروکہ میں مشک وغیرہ کے گلدستے آویزاں کئے جاتے تھے۔ خوشبو مہکتی رہتی تھی اوپر کا حصہ خراب و شکستہ حالت میں ہے۔ دور سے ایک بڑی برج کمان نظر آتی ہے۔ اس وقت اس میں کلکٹری کا ریکارڈ محفوظ ہے۔

**گگن محل:** بانی خواجہ محمود گاواں وزیر اعظم بہمنیہ (تاریخ خافی خاں پر وزیر ہارون خاں) اس میں سلاطین بہمنیہ کا دیوان خاص تھا۔

محل سلطان محمد شاہ المشہور بہ لشکری (۸۶۷ھ/۱۴۶۲ء) عالی شان عمارت تھی جس میں پانی کی نہریں، آبشار، فوارے موجود تھے۔

**رنگین محل:** تعمیر کردہ سلطان علی بریدِ اول (۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء) اس میں سیپی کی منبت کاری ہے اور خاص قابل دید چیز، علی بریدشاہ کا شہ نشین ہے۔ ٹائوں پر طلائی کا کام ہے۔ خوش نما کتبے سیپی کے چمک دار حروف میں بخط نستعلیق بڑے دل کش ہیں۔ ہلکے گلابی اور اودے پچوں نے طلائی کام میں دوسرے رنگوں کو مات کر دیا ہے بشہ نشین کے قریب ایک سنگ مرمر کی کشتی ہے جس میں موسم گرما میں گلاب کے پھول بھرے رہتے تھے۔ کھڑکیوں اور کانوں پر سیاہ سنگ موسلی کا حاشیہ ہے اور اس کی زمین پر فارسی اشعار سیپی کے

حروف میں کندہ ہیں ؎

شاہ نشین چشم من تکیہ گہ شمائے تو
جائے دعاست شاہ من بے تو مباد جائے تو

باب الداخلہ پر لکھا ہے ' یا مفتح الابواب' اور اس کے دائیں و بائیں جانب یہ اشعار کندہ ہیں ؎

دائیں جانب :- عاشق شود آنکس کہ در آید ز در دست
گویا ز در و بام تو می بارد عشق

بائیں جانب :- ہر در ثمنیں کہ صد ف دارد عشق
از بہر نثار در گہت آرد عشق

اور عربی خط میں نیچے لکھا ہے :-

"المستعین باللہ الملک المالک المجلس المکرم والمعالی اکرم برید علی"

مسجد سوطھا کھمبا : اندرون قلعہ بیدر، عاشور خانہ کے جاذبی مغرب جانب واقع ہے جو خوبصورت اور وسیع ہے۔ یہ مسجد ایک ہی خاندان شاہی کی نماز کے لئے تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے اندرونی و بیرونی دالان سولہ قیم گول ستونوں پر قائم ہیں۔ مسجد کا طول و عرض ۲۹۵ × ۷۷ فٹ ہے جو مربع حصوں پر منقسم ہے۔ ہر ایک مربع حصہ پر ایک گنبد بنایا گیا ہے جو گلبرگہ شریف کی قلعہ مسجد کی طرح جو مسجد قرطبہ کا نمونہ ہے بنائی گئی ہے۔ بعض درمیانی گنبد منہدم ہو گئے ہیں۔ اس مسجد میں ایک کتبہ بھی نصب ہے جو دراصل ایک سائبان سے متعلق ہے جس کو بیدر کے ایک عامل سکندر خان نے بنوایا تھا :- مسجد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مسجد کی چھت کے اوپر ایک حوض ہے اور اس کے عقب میں ایک باؤلی ہے جس سے پانی حوض میں بھرا جاتا ہے اور پھر وہاں سے نیچے مسجد کے حوض میں آتا ہے۔

مدرسہ محمود گاواں :- یہ بڑی شان دار تین منزلہ عمارت ہے۔ اس کا بانی سلطنت بہمنیہ کا مشہور وزیر خواجہ محمود گاواں تھا۔ ترکی، عرب اور ایرانی طرز تعمیر ہے۔ یہ مدرسہ ایک مرعوب کن تین منزلہ عمارت ہے جس کا رقبہ عرض و طول ۲۰۵ × ۱۸۰ بلندی ۵۸ فٹ ہے۔ شمالی حصہ میں مسجد ہے۔ جنوبی حصہ کتب خانہ کے لئے مخصوص تھا۔ بیرونی حصہ کی دیواروں اور میناروں پر رنگین چینی کا کام تھا اور قرآنی آیتیں کندہ تھیں، جس کا کچھ نمونہ اب بھی مینار اور مسجد پر موجود ہے۔ اندرونی حصہ میں کافی بڑے اور چوڑے پکھر ال، عمارت کے کونوں پر بہشت پہلو اساتذہ کے چیمبر، طلبا کے رہائشی کمرے مکتب دان ہیں اور درمیان میں وسیع صحن سو مربع فٹ موجود ہے۔ پکھر کے کمروں کی دو منزلہ قطع یہ ہے کہ ہر ایک کمرہ میں ایک نیم قطری جھروکہ ہے جس کے تین طرف اونچی دیواریں اور اوپر گنبد بنا ہوا ہے۔ ان کمروں میں ہوا اور روشنی کا معقول انتظام تھا جن میں موجودہ عمارتوں کی طرح دن میں بجلی کی روشنی کی ضرورت ہی نہ تھی۔

عمارت کے سامنے کے حصہ میں صدر دروازہ کے وسط میں سیدھی جانب مسجد اور دوسری جانب بائیں طرف کتب خانہ تھا۔ میناروں کی بلندی ۸۰ فٹ تھی۔ اب ایک سامنے کا مینار اور شمالی حصہ کا مینار باقی ہے۔ اس کے کتاب خانہ میں تین ہزار عربی فارسی کی قلمی نایاب کتابیں موجود تھیں۔ سلاطین بہمنیہ کے کتب خانہ سے متعلق تعمیر کشاف کا ایک قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا تھا جو مولوی سید محمود مدرس کے کتب خانہ میں تھا۔ یہاں ایران، توران و ہندوستان کے مشہور علما و امور تھے۔

قطعۂ تاریخ تعمیر مدرسہ محمود گاواں ؎

| | |
|---|---|
| ایں مدرسہ رفیع و محمود بنا | تعمیر شدہ است قبلۂ اہل صفا |
| آثار قبول ہیں کہ تاریخش | از آیت "ربنا تقبل منا" |

۸۷۶

گویا یہ عمارت ۱۴۷۱ء میں آج سے چار سو نو سال قبل تکمیل کو پہنچی تھی۔

حصار قلعہ اور حصار شہر پر بہت سے برج ہیں جن میں بعض بڑے شان دار ہیں۔ ان پر پانچ تا سات گزی توپیں رکھی ہوئی ہیں۔ مگر یہ سب توپیں سلاطین بریدیہ کے زمانہ کی ہیں۔ شاہان بہمنیہ کی کوئی توپ موجود نہیں۔

ورنگپا کے مندر کے عقب میں ایک نو گزی توپ ہے جس کا قطر ۱½ فٹ گز کا ہے۔ توپ قاسم برید (وفات ۹۱۰ھ) یہ حصار شہر کے تونڈلہ برج یا برج پر رکھی ہوئی ہے۔ عوام اب اس کو

منڈے برج کہتے ہیں۔ یہ وہ برج ہے جہاں شہنشاہ عالمگیر نے گولہ اندازی کی تھی۔ ملک مرجان نائب سلطان ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری نے اس میں بارود بھر رکھی تھی۔ اثنائے محاصرہ میں جب گولہ اندازی ہوئی تو ایک گولے کی ضرب سے اس میں دھماکہ ہوا۔ ملک مرجان سخت زخمی ہوا اور جاں بر نہ ہوسکا۔ لفظ "سوخت" سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ۱۰۶۶ھ

(تاریخ فاروخاں بیدری المرقوم امیر ہند و گلگشت دکن قلمی)

**توپ محمودی:** (قاسم برید کی توپ) پر حسب ذیل اشعار کندہ ہیں:۔

جدا توپ پُر آتش ہے کہ زآوازے بلند — کر کند گوش فلک را برکند کوہ از دہن

شاہ کسریٰ مملکت قاسم برید — بادشاہ ہند و سند و مالک ملک کُن

اختتام توپ در شہر محرم بودہ است — توپ محمودی کہ ناحق شد زشاہ صف شکن

فصلی می گفت تاریخش سُرش خوش گفت — توپ بے شش بود تعریف او در ہر فن

یا حافظ

ایں توپ را در امان خود نگاہ دارد بہ محمد و آلہ الامجاد، بالنون و العماد نحن من اللہ فتح قریب و بشر المومنین فا للہ خیر حافظاً و ھو ارحم الراحمین

**توپ سات گزی:** واقع برج اندرون قلعہ ارک۔ بہ جانب شمال۔ طول و قطر ۳۱ × ۲۳ انچ۔ حسب ذیل سنہ و عبارت کندہ ہے۔

فی التاریخ ۹۶۵ھ یکے از عجایب علامات کارخانہ توپ الٰہی وضع خاصۂ حضرت ہمایوں اکرم علی بریدشاہی:۔

فلولدہ من یتم دارد / دومن دیتم اگر خواہد

ازیں زیادہ کندہ مانی کند دہ آثار زیادہ اندازد

**توپ برج فتح لشکر اندرون قلعہ ارک:۔** بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد حسب ذیل عبارت کندہ ہے:۔

فولد یتم من یتم سیر دارد۔ یک من دہ سیر اگر خواہد کہ ازیں زیادہ بیندازد صانی کند و دیگر دو سیر زیادہ کند..... آیات قرآنی:

انا فتحنا لک فتحاً مبینا الخ

درمیانی حصہ پر حسب ذیل عبارت ہے:۔ توپ ظفر پیکر مسمّی بہ فتح لشکر در زمان دولت اعلیٰ حضرت عالی جاہ میرزا شاہ محمود الحسینی طلب بہ ہمایوں اکرم بریدشاہ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، فی التاریخ ۹۸۸ھ ہ

فتح لشکر کہ ز ہیبش دل اعدا چوں برق — فرو آمد بر دو زمین

قذ چوں در دہن اژدر پئے جنگ بود — اژدہائے کہ سرخصم فرو برد بگیں

حسب ذیل حروف مقطعات قرآن نقش ہیں:۔

الرا - المص، کھٰیٰعص، طٰہٰ - طسم، طسم طسم، الرا - الرا - یٰسین - ص، حٰمٓ - ق، ن، - (کنتہ بد اللہ)

نصر من اللہ فتح قریب و بشر المومنین ان اللہ خیر حافظین و ھو ارحم الراحمین۔

آخر میں نادعلی نقش ہے یظہر العجائب تجدہ عوناً لک فی النوائب الخ

یا علی، یا علی، یا علی

قلعہ کے اندر کل اڑتیس توپیں ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔ ۲۰ غیر قالب ۱۲ قالب ریختہ۔ ۱۱ پیچسی ۳ رہکلہ اور دو ریزہ۔

حصار بیدر پر چالیس توپیں ہیں۔

**مشہور مقابر بیدر:** سب سے اہم اور خوب صورت مقبرہ جو اس وقت اچھی حالت میں ہے وہ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی (وفات ۸۳۹ھ) بانی شہر بیدر کا ہے جو بیدر کے نیشنل حیدیوں مشرقی جانب موضع اشٹور میں واقع ہے۔ وہ خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہ (۸۲۵ھ) کا مرید تھا۔ اس کے بعد وفات شاہ خلیل اللہ بن حضرت شاہ نعمت اللہ کرمانی رح کا مرید ہوا تھا۔ مقبرہ کا اندرونی حصہ ایرانی رنگین اور گل بوٹوں سے آراستہ پیراستہ ہے اور چھت کے اندرونی حصہ میں بچوں خلافت بخط نسخ و بخط طغرا وغیرہ ہے۔ جو طریقۂ قادریہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے متعلق ہے۔ سی۔ ایس بروک نے اس کو غلطی نسبی سادات بہمنی تصور کیا ہے جو غلط ہے۔ بہمنی سلاطین سادات نہیں تھے۔ دیواریں سرتاپا مختلف رنگین پتھروں اور سیپی دلائی کام سے مرصع ہیں۔ اس کے چار دروازے ہیں۔ جنوبی دروازہ پر تاریخ جلوس اور مشرقی دروازہ پر عربی میں تاریخ وفات کندہ ہے:۔

فاش فی دنیا حمید اُو رجع الی اللہ فی بلدۃ اشتیں سعید اُمبارکاً القاصع و العشرین من شہر الملک العلام سنہ تسع و ثلاثین و ثمانمایۃ من ہجرۃ النبی صلعم الخ

خاص بات یہ ہے کہ سلطان کا عرس بھی سالانہ ۲۸ رجب کو دھوم دھام سے ہوتا ہے اور ایک ہندو قوم کا ساجھ ہے۔ جو

مہ دونیں سو حویلیوں اور متعلقین کے بڑی شان و شوکت سے لوازم شاہی ماہی مراتب ۔ جھنڈوں اور باجوں کے ساتھ آتا اور پھول چڑھاتا ہے ۔ یہ قدیم رسم ہے ۔ تاریخ سے اس کی اصلیت کا پتہ نہیں چلتا ۔ البتہ سلطان کی ایک عام رواداری جو اپنی رعایا کے ساتھ تھی اور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ بعض کہتے کھڑی زبان میں اسی کے قرب و جوار کی باولیوں میں پائے جاتے ہیں ۔

گنبد سلطان علی بربیدہ: د ۹۴۹ھ / ۹۸۷ھ ) عالی شان اور قابل دید ہے تاریخ تعمیر ۹۸۹ھ ہے ۔ ایک بہت بڑے اونچے چبوترے پر واقع ہے ۔ خصوصیت یہ ہے کہ یہ گنبد برخلاف قدیم گنبدوں کے چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے ۔ چاروں طرف سے ہوا سب خس و خاشاک کو اڑا لے جاتی ہے ۔ فرش کا تعویذ سنگ موسیٰ ( سنگ کھیر ) کا بنا ہوا ہے اور کلمہ طیبہ خط نسخ منقوش ہے ۔ اس کے باہر چبوترے پر مغربی جانب ۵۷ زنانی قبریں محلات کی ہیں ۔ مقبرے کی اندرونی دیواروں پر نیلگوں زمین پر سفید حروف میں سات فارسی رباعیات عبرت انگیز کندہ ہیں ۔

گنبد کے پائیں میں ایک عالی شان عمارت ہے جو کتب خانہ کے نام سے مشہور ہے اور اس کے متصل ایک مسجد اور مسافر خانہ بھی ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ سلاطین بربیدیہ کا کتب خانہ ہو ۔ اور اسی قرب جوار میں دوسرے سلاطین بربیدیہ کے گنبد ہیں جو ایسے شاندار نہیں ۔ یہ مقام گورجویلی کہلاتا ہے جو کہا جاتا ہے کہ الفاظ حویلی کی رویاں کی خرابی ہے ۔

مشہور اولیاء اللہ کے مقبرے :- اندرون آبادی خانقاہ صوفیہ حضرت چندا شاہ صاحب رح کے متصل، حضرت شیخ المشائخ شیخ محمد ملتانی بیدری کا مقبرہ ہے ۔ اسی کے متصل آپ کے والد ماجد شیخ ابراہیم ملتانی کا مقبرہ بھی ہے جن کا سلسلۂ طریقت کا فیض علماء و فرنگی محل تک پہنچا ہے ۔ بڑا عالم فاضل خاندان تھا ۔ شیخ ابراہیم ملتان سے بزمانۂ سلطان علاؤ الدین ثانی بہمنی تشریف لائے تھے اور قاضی القضاء کے عہدہ پر مامور رہے ۔ سلاطین قطب شاہیہ ابراہیم قطب شاہ و محمد قلی قطب شاہ کو بھی آپ سے اور آپ کی اولاد سے عقیدت تھی ۔ آپ کی اولاد کے مقبروں میں شیخ ابراہیم محذوم جی قادری کا عالی شان مقبرہ اور شیخ بدالدین ملتانی کا معمولی حصار چوکھنڈی ہے ۔ شہر کے باہر حضرت خواجہ الفیض قدس سرہٗ اور آپ کی اولاد و اخلاف کے عالی شان مقبرے ہیں جن میں حضرت قطب علی ثانی نبیرہ ابوالفیض کا مقبرہ مشہور ہے ۔

حصار شہر کے جنوب مشرقی جانب حضرت شیخ نور سمنانی اور ان کے سجادگان کے مزارات ہیں ۔ کوئی گنبد نہیں انھوں نے فقہ حنفی کو رواج دیا تھا اور شرع کے سخت پابند تھے ۔ ان کا سلسلۂ طریقت حضرت میراشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ کچھوچھہ شریف تک پہنچا ہے بشاندان میں ایک بہت بڑا جتھہ موجود ہے ۔ اسی خاندان کے دوسرے بزرگ شیخ عبدالمالک علوی تھے جن کا مزار شہر سے باہر حبشی کوٹ میں واقع ہے

مغرب جانب بیت السادات سید محمد حنیف قدس سرہٗ کا عالیشان مقبرہ ہے جو بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ مسعود بک چشتی بلدوا سلد حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے خلیفہ تھے اور اس کے متصل آپ کے صاحبزادہ کا مقبرہ ہے ایک گرم پانی کا چشمہ یہاں مشہور ہے جو چشمۂ سادات کہلاتا ہے ۔ اس کے علاوہ اور بھی چشمے قدرتی مشہور ہیں مثلاً پاٹ پاس، نرسمہا سدر کا چشمہ فرح باغ ۔

مشہور مقبرہ : سید شاہ زین الدین کنج نشین حنیدی البغدادی کا عالی شان مقبرہ ہے جو سلطان علاؤ الدین ثانی کے زمانہ میں آئے تھے ۔

شہر کے جنوب مشرق میں بمقام شربت تالاب مشہور وزیر اور صدر سلطنت بہمنیہ خواجہ محمود گاواں صاحب مولانا جامی رح اور بعض علماء بہمنیہ کے مزارات ہیں جو اس وقت ایک چوکھنڈی میں واقع ہیں ۔ گنبد نیست و نابود ہو گیا ۔ ہمارا جو سرکشن پرشاد نے ایک نفیس کتبہ اس کے مزار پر نصب کرا دیا تھا جس پر یہ شعر کندہ ہے ؎

سال فوتش گر کسے پرسد بگو ۔۔۔ بے گنبد محمود گاواں شد شہید

۸۸۶

ریاضی الانشاء اس کی مشہور تصنیف ہے جو شائع ہو چکی ہے یہ اس کی انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔

بیدر کی خاص صنعت ظروف بیدری ہیں جن کی مانگ ممالک مغرب امریکہ وغیرہ میں بھی ہے — بیدری حقہ، پاندان، ڈبیاں، اگالدان وغیرہ بڑے خوبصورت ہوتے ہیں ۔

محمد امین

# بالائی خلاء میں انسان کا سفر

۴ - اکتوبر ۱۹۵۷ء کو یہ خبر پڑھ کر تمام دنیا حیران رہ گئی کہ روس نے اپنا پہلا مصنوعی چاند فضا میں اڑا دیا ہے - جب اس کے سگنل کی پیپ پیپ کی آواز آئی تو لوگ حیران ہو کر پکار اُٹھے کہ "یہ سائنسی کہانی تو سچی ہو گئی"

ابھی دنیا کے سائنس دان اور عوام پہلے اسپتنک کے متعلق غور ہی کر رہے تھے کہ ۳ - نومبر ۱۹۵۷ء کو روس نے اسپتنک نمبر ۲ اڑا دیا - یہ خبر اور بھی حیران کن تھی اس لئے کہ یہ اسپتنک پہلے اسپتنک سے بہت مختلف تھا - اس میں ایک چھوٹی، سوکھی سی لیکن مضبوط کتیا لائکا تھی - یہ کتیا اسپتنک نمبر ۲ کے پورے ۵۴ چکروں کے بعد بھی زندہ رہی - اڑان کے ۱۰۰ گھنٹے بعد بیٹریاں ختم ہو جانے پر وہ کسی تکلیف کی وجہ سے مر گئی -

۲ - جنوری ۱۹۵۸ء کو روس نے ایک نیا راکٹ فضا میں اڑایا - اس کے اندر جو مصنوعی چاند رکھا تھا وہ اڑ کر خلا میں بہت اوپر پہنچ گیا اور پھر وہ نظامِ شمسی کا مصنوعی سیارہ بن کر سورج کے اردگرد چکر لگانے لگا -

۳۱ - جنوری ۱۹۵۸ء کو امریکہ نے اپنا پہلا مصنوعی چاند فضا میں اڑایا - اس کا نام ایکسپلورر تھا لیکن یہ روس کے مصنوعی چاند کے مقابلے میں بہت چھوٹا اور معمولی حیثیت کا تھا -

۱۲ - ستمبر ۱۹۵۹ء کو روس نے اپنا دوسرا راکٹ اڑایا - اب کی بار منزلِ مقصود چاند تھی - یہ راکٹ دن کے ۱۲ بجے روس نے اپنی سرزمین سے اڑایا اور مسلسل خلا میں یہ چاند کی طرف حرکت کرتا رہا - اس کی رفتار ایک سیکنڈ میں ۱ میل اور ایک گھنٹے میں ۲۵ ہزار میل تھی - اس رفتار سے اڑنے کے بعد یہ راکٹ ۱۴ ستمبر ۱۹۵۹ء کو رات کے بارہ بجے چاند پر پہنچ گیا - یہ راکٹ نہ صرف کامیاب ثابت ہوا بلکہ اپنے متعین راستے سے یہ صرف دو سیکنڈ اِدھر اُدھر ٹھاہ ور نہ سیدھا پورا ذکر تا رہا اور چاند پر پہنچ کر ٹھیک اس جگہ اترا جہاں روس کے سائنس دان اُسے اتارنا چاہتے تھے -

اس راکٹ نے ثابت کر دیا کہ چاند تک سفر کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ قریب قریب اب یقینی ہے -

۴ - اکتوبر ۱۹۵۹ء کو پہلے اسپتنک کی سالگرہ کے دن روس نے تیسرا راکٹ چھوڑ کر دنیا کو اور بھی حیرت زدہ کر دیا - یہ راکٹ چاند کے اردگرد گردش کرنے کے لئے اڑایا گیا تھا - پروگرام کے مطابق یہ راکٹ چاند کے چاروں طرف گھومنے لگا اور اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس راکٹ نے چاند کے اُس حصّے کا فوٹو اُتار لیا جو زمین سے کبھی دکھائی نہیں دیتا - یہ فوٹو ٹی وی شن سے زمین تک آگیا اور روس نے اسے چھاپ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا - اس طرح چاند کی اس صدی تصویر جو ہم کبھی نہیں دیکھتے روسی سائنس دانوں نے ہم کو دکھا دی -

۱۵ - مئی ۱۹۶۰ء کو روس نے اپنا ایک بہت ہی وزنی راکٹ اڑایا - اس میں کئی کتے تھے - اس جہاز کو ۲۰۰ میل کی بلندی تک لے جانے کے بعد کامیابی سے نیچے اُتار لیا گیا - کتے زندہ تھے اور بالکل صحت مند

۱۹-اگست ۱۹۶۰ء کو روس نے دوسرا وزنی جہاز فضا میں اڑایا۔ اس میں اسٹریل کا اور بیل کا نام کے دو کتے اڑائے گئے ہیں، بہت سے سنیر چوہے، کھٹمل، پودے یہ سب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس جہاز نے زمین کے ۱۸ چکر لگائے اور پھر اسے نیچے اتار لیا گیا۔ اس میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی۔

امریکہ نے پہلا کیپسول واپس لانے کے بعد کئی اور کیپسول اڑائے ہیں۔ اسے بھی اچھی خاصی کامیابی ہوئی ہے۔

۱۹۶۱ء کے شروع میں روس نے پھر ایک راکٹ اڑایا۔ اس کا نام وسٹوک (زہرہ سیارہ کے نام پر) تھا۔

راکٹ کے ذریعے خلائی جہاز رانی میں روس مسلسل کامیابی حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اس کامیابی کے پیش نظر ستمبر ۱۹۶۰ء میں یہ خبر گرم ہوئی تھی کہ راکٹ میں دو آدمیوں کو بٹھا کر روس نے خلا میں اڑا دیا ہے لیکن یہ خبر صحیح نہیں تھی۔

مارچ ۱۹۶۱ء میں روس نے دو بالکل نئی قسم کی اڑان کی مشق کی۔ ان پروازوں کے دوران میں پائلٹ کی سیٹ پر ایک پتلا اور اس کے علاوہ کیبن میں دو آزمائشی جانور چونشکا اور زیرہ دو بھیجے گئے تھے۔ تجربہ بالکل کامیاب ثابت ہوا۔ اس بات کی اب تقریباً مکمل تیاری ہو چکی تھی کہ انسان پہلی بار خلا میں جانے والا ہے۔

۱۲-اپریل ۱۹۶۱ء کو روس نے انسان کو خلا میں بھیج دیا۔ یہ خبر ایک بم کی حیثیت رکھتی تھی اور بہت ہی حیران کن تھی۔ دنیا کے بہت سے سائنس دانوں اور انجینئروں نے روس کی کامیابی کو سراہا اور اس کے کارناموں پر اسے مبارک باد دی۔

خلائی پرواز کے ہیرو کا نام گگارین ہے جس نے ۱۰۸ منٹ میں زمین کے چاروں طرف واستوک نام کے راکٹ میں بیٹھ کر پورا ایک چکر لگایا۔ اس راکٹ کی زیادہ سے زیادہ اونچائی ۳۲۷ کلو میٹر اور کم سے کم ۱۸۱ کلو میٹر تھی۔ گگارین اسکو کے وقت کے مطابق ٹھیک ۹ بجکر منٹ پر اڑا اور ٹھیک دس بجکر ۵۵ منٹ پر ایک سو تین جگہ پر روس ہی کی سرزمین میں بالکل محفوظ اتر آئے۔

یہ پوری گگارین کا کائناتی جہاز اڑکر جیسے ہی اپنے مدار پر گردش کرنے لگا انھوں نے بے وزنی کی حالت محسوس کی۔ شروع میں حالات غیر معمولی تھے لیکن جلد ہی وہ ان سے مانوس ہو گئے۔ بے وزنی کی حالت میں بھی گگارین بالکل ٹھیک رہے اور ان کے ہوش و حواس قابو میں رہے۔ ان کے سپرد جو کام کیا گیا تھا اور پرواز کا جو پروگرام تھا اس کے مطابق انھوں نے خلائی جہاز کے آلات کی کارکردگی پر نظر رکھی۔ انھوں نے روشن دان میں سے مشاہدے کئے۔ ۳۰۰ کلو میٹر کی بلندی سے ان کو زمین صاف دکھائی دیتی تھی۔ سمندر کے ساحل، بڑے دریا، اونچے نیچے جنگل، بادل اور ان کے سائے اچھی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان بالکل سیاہ تھا اور اس کے پس منظر میں ستارے اس سے زیادہ صاف اور روشن نظر آتے تھے جتنے کہ زمین سے نظر آتے ہیں۔ زمین کے گرد آسمانی رنگ کا بہت ہی خوب صورت ہالہ ہے۔ افق پر رنگ بدلتے ہیں، الطیمت ہلکے نیلے سے گہرے آسمانی پھر گہرے نیلے، بنفشی اور پھر سیاہ آسمان۔ سائے میں سے نکلتی ہوئی ایک روشن نارنجی دمک جو کہ توس قزح کے تمام رنگوں سے گزرتی ہے زمین کے اُفق پر دیکھی جا سکتی ہے۔

دنیا کے عوام یوری گگارین کی کامیابی اور ان کے کارناموں پر خوشیاں منا رہے تھے اور روسی سائنس دان اس پر نازاں تھے کہ وہ اسپٹنک کی طرح انسان کو بھی خلا میں بھیجنے میں کامیاب ہو گئے۔ امریکہ بھی خلا کی اڑان کے مسلسل تجربے کر رہا تھا۔ چھوٹے بڑے پچاس سے زیادہ مصنوعی چاند اور راکٹ وہ اڑا چکا تھا اور انھیں بھی تھوڑی بہت کامیابی ہوتی رہی۔ آخر کار ۵-مئی ۱۹۶۱ء کو امریکی سائنس دانوں نے بھی ایک آدمی کو ریڈ اسٹون نام کے راکٹ میں بٹھا کر خلا میں بھیج دیا۔ یہ پہلا شیپرڈ کے سر تھا۔ شیپرڈ نے ۱۵- منٹ میں ۱۱۵ میل کی اونچائی تک پرواز کی وہ خلیج کنزاورل سے اڑائے گئے تھے اور وہاں سے ۳۰۲ میل کی دوری پر بحر اطلانٹک میں ہی اپنے مرکزی کیپسول کے گرپڑے تھے۔ چند منٹ میں ایک ہیلی کوپٹر نے شیپرڈ کو پانی سے اٹھا کر ایک بڑے جہاز میں بٹھا دیا جو پہلے ہی سے ان کا منتظر تھا۔ اس طرح گگارین کی طرح شیپرڈ بھی اپنی خلائی پرواز میں کامیاب رہے۔ امریکی سائنس دان خوش تھے کہ دوسرا انسان خلا میں بھیج کر انھوں نے

بھی زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ دنیا نے ان کی کوششوں کو سراہا اور کمانڈر الن شیپرڈ کی تعریف کی۔ یقیناً وہ دوسرے انسان تھے جنھوں نے خلا کا سفر کیا اور گگارین کی طرح انھوں نے بھی اوپر سے زمین کا مشاہدہ کیا۔ سمندر دیکھا، جزیرے دیکھے اور انھوں نے بادل اور اپنے ملک کا ساحل بھی دیکھا لیکن چونکہ وہ صبح سویرے کے بجائے ۹ بجکر ۳۴ منٹ پر اڑے تھے اس لئے وہ آسمان کا مشاہدہ نہ کر سکے۔ تارے، سیارے اور چاند ان میں سے کسی کو بھی وہ نہ دیکھ سکے اور ان کا سفر بھی گگارین کے مقابلے میں مختصر تھا مسافت بھی کم تھی اور ایک جگہ سے اڑ کر صرف ۱۵ میل وہ اوپر گئے اور ایک دائرہ بناتے ہوئے ۳۰۰ میل کے فاصلہ پر وہ سمندر میں گر گئے[1]

بہرحال روس اور امریکہ کی کوششوں سے خلائی سفر کا آغاز ہوگیا۔ یہ طے ہوگیا کہ بے وزنی کی کیفیت انسان برداشت کر لیتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اس حالت میں وہ دقیق، نیم رقیق اور ٹھوس غذا کھا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ہوش و حواس ٹھکانے رکھ کر لکھ پڑھ بھی سکتا ہے اور ریڈیو اور روس و رسائل کا سلسلہ بھی قائم رکھ سکتا ہے۔ سوچ سمجھ کر اپنی آواز کو نشر بھی کر سکتا ہے اور خلائی جہاز کو جدھر چاہے گھما پھرا سکتا ہے۔ اب یہ توقع ہے کہ مستقبل قریب ہی میں بہت سے عملی مسائل کو حل کرنے کے لئے خلائی جہازوں کو استعمال کیا جائے گا۔

مجموعی طور سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روس اور امریکہ نے بیرونی فضا اور بالائی خلا میں سفر کرنے کا راستہ ہموار کر لیا ہے۔ آخر وہ کون سا عنصر ہے جس کی بنا پر امریکہ یا روس مسلسل کامیاب ہوتا جا رہا ہے؟

---

[1] اب ۶۔ اگست ۱۹۶۱ء کو روس نے دوسرا انسان بردار جہاز خلا میں بھیجا جس کا وزن ۴ ٹن تھا۔ اس خلائی جہاز کا نام وستوک ۲ تھا اور یہ مجرّب تیوف اس میں سوار تھے۔ وہ ۲۵ گھنٹہ ۱۸ منٹ تک خلا میں رہے اور انھوں نے زمین کے گرد ۱۷ چکر لگائے۔ وہ اپنے جہاز کو جدھر چاہتے گھما پھرا سکتے تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی ویژن کے ذریعہ زمین سے ان کا رابطہ قائم رہا اور وہ برابر پیغام بھیجتے رہے۔ انھوں نے کھانا کھایا اور سوئے بھی۔ پرواز کے دوران میں بڑی دیر تک ان پر بے وزنی کی کیفیت رہی لیکن اس سے ان کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی۔ (ادارہ)

روس نے اپنا ایک راکٹ چاند پر کیسے اتار دیا تھا؟ راکٹ اڑانے سے پہلے اس کے سائنس دانوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ زمین کی قوتِ کشش سے آزاد ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ راکٹ کو ۳۶۷۰۰ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے اڑایا جائے۔ اگر اسے میلوں میں ظاہر کیا جائے تو یہ رفتار ۷ میل فی سیکنڈ سے ذرا ہی کم ہوگی۔

اس طرح جب روس کا راکٹ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء کو کرۂ ہوائی سے اوپر ۲۵۰ میل کی بلندی پر پہنچ گیا تو اسے چاند تک جانے کے لئے ۳۶۵۰۰ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار کی ضرورت تھی لیکن ۲۵۰ میل کی بلندی پر بھی زمین کی کشش خاصی قوی تھی۔ وہ راکٹ کو ۲۹ فٹ فی سیکنڈ کے حساب سے نیچے کی طرف کھینچتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ راکٹ کا ایندھن ختم ہو جانے کے ایک سیکنڈ بعد راکٹ ۳۶۴۷۱ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے اوپر بڑھتا تھا۔ اس کے بعد دوسرے سیکنڈ میں اس کی رفتار ۳۶۴۴۲ فٹ ہوگئی تھی اور پھر سیکنڈ میں وہ ۳۶۴۱۳ فٹ رہ گئی تھی۔ مختصر یہ کہ راکٹ کی رفتار گھٹتی جاتی تھی اور دو سیکنڈ بھی یکساں نہیں رہتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راکٹ اور زمین کے درمیان فاصلہ گھٹتا گیا اور زمین کی قوتِ کشش بھی کم ہوتی گئی۔ ۳۰۰۰۰۰ سیکنڈ یعنی تقریباً ۸ گھنٹے ۳۳ منٹ کے بعد راکٹ کی رفتار سست ہو کر صرف ۱۲ فٹ فی سیکنڈ رہ گئی تھی مگر اس وقت راکٹ چاند کی سطح سے ۲۳۶۰۰ میل کی دوری پر تھا۔ یہ فاصلہ زمین اور چاند کے درمیان کے فاصلے کا قریب قریب ۶/۵ حصہ ہے۔ یہ بہت کم ہے لیکن اس کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ اس جگہ زمین اور چاند کی کشش کا زور برابر برابر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ زمین اور چاند کی قوتِ کشش لمزوری کی وجہ سے یکساں ہے اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے اثر کو مٹا دیتی ہیں۔ راکٹ اس حد پر پہونچکر چند فٹ جدھر کو چلا ادھر کو ہی کھنچ جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر راکٹ میں اتنی رفتار باقی رہ گئی ہوگی کہ وہ رینگتا ہوا بھی مذکورہ حد کو عبور کر گیا ہوگا تو وہ چاند کی قوتِ کشش کی گرفت میں آ گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے فاصلے پر چاند کی قوتِ کشش بہت کمزور ہو لیکن ہے ضرور۔ ایسا ہی لیکن بہرحال کشش تو قائم رہتی ہے۔ پس راکٹ چاند کی طرف بڑھتا گیا ہوگا اور مذکورہ حد کو پار کرنے کے ۵۰۰۰۰ سیکنڈ کے بعد وہ چاند

کی سطح پر یقیناً اتر گیا ہوگا۔

اس تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم چاند پر یقیناً پہنچ سکتے ہیں اور راکٹ میں بیٹھ کر سفر کرنا ممکن ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ چاند پر جانے کے بعد انسان کی سے زمین تک واپس آنا بھی ہیں تو آسکیں گے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں روس اور امریکہ کے سائنس دان برابر تحقیق اور تجربہ کر رہے ہیں۔

۱۲-اپریل ۱۹۶۱ء سے پہلے یہی سمجھا جاتا تھا کہ پرواز کے دوران میں طویل بے وزنی کے اثر سے عضویاتی عمل کی اعصابی تنظیم میں خصوصاً دوران خون اور جسمانی حرکت میں سخت خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن یوری گگارین اور ٹائٹن شیپرڈ نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کے اعصاب کا فعل بلندی پر برقرار رہا اور انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ شیپرڈ صرف پانچ منٹ بے وزنی کی حالت میں رہے لیکن گگارین نے ایک گھنٹہ سے زیادہ بے وزنی کی حالت میں گزارا اور ان کے دوران خون کے قلبی نظام یا تنفس پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ شروع میں خون کی گردش تیز ہوئی تھی، اس کا دباؤ بھی بڑھا تھا اور نبض بہت تیز چلنے لگی تھی۔ سانس بھی تیز لینا پڑا تھا۔ خلا میں تیز سفر کرنے کی وجہ سے ایسا ہونا قدرتی بات ہے لیکن بے وزنی کی حالت میں کوئی منٹ کی پرواز کے بعد یہ افعال معمول پر آ گئے تھے۔ پرواز کے بعد گگارین کا طبی معائنہ کیا گیا اور کئی دنوں تک ان کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ وہ بالکل معمولی حالت میں ہیں۔

پہلے اڑان کے دوران میں زمین کی طرف واپس آنے والا راکٹ اور اس میں بیٹھے ہوئے کتوں کو بچانا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ یہ مسئلہ دو طریقوں سے حل کیا گیا۔ ایک طریقہ یہ کہ خاص پیراشوٹ کی مدد سے کیپسول یا کیبن کے ساتھ جانور بھی زمین پر اتر آئے۔ دوسرا طریقہ یہ آزمایا گیا کہ پرواز کی مختلف بلندی پر جب راکٹ زمین کی طرف واپس آ رہا تھا جانوروں کو راکٹ سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔ خلا میں سفر کرنے کے لئے ان کے لباس کے ساتھ پیراشوٹ بندھے ہوئے تھے۔ یہ خود بخود کتوں کے نیچے آتے ہی کھل گئے تھے اور وہ آسانی سے نیچے اتر آئے تھے۔ یوری گگارین کو جس طرح اطمینان سے نیچے اتارا گیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ روسی سائنس دانوں نے پرواز کے بعد نیچے اترنے کا مسئلہ بالکل حل کر لیا ہے[1]۔

کرۂ ہوائی کی بالائی تہوں میں ہوا کا دباؤ زمین کی سطح کے دباؤ کے مقابلے میں صرف $\frac{1}{1000000}$ رہ جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی پرواز صرف ایک ایرکنڈیشن کیبن ہی میں ممکن تھی۔ گگارین اور شیپرڈ نے ایسے ہی ایرکنڈیشنی کیبن یا کیپسول میں اپنا سفر مکمل کیا۔

گگارین اور شیپرڈ کے تجربے سے پہلے بعض سائنس دان اس بات سے ڈرتے تھے کہ بہت سے ٹوٹنے والے تارے جو آسمان سے زمین پر گرتے ہیں وہ کہیں پرواز کرنے والے راکٹ سے ٹکرا جائیں۔

تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ٹوٹنے والے تارے جو زمین پر گرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر بہت باریک ذرّے ہوتے ہیں۔ ایسے ٹوٹنے والے تاروں کا مجموعی وزن ایک اونس ہوتا ہے بشرطیکہ وہ بہت روشن ہوں لیکن اگر وہ مدھم ہیں تو ہزاروں تارے مل کر ایک اونس ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر مصنوعی سیارہ سے کوئی ٹوٹنے والا تارہ ٹکرائے گا تو وہ بہت باریک ذرہ ہوگا لیکن اس کی رفتار ۴۰ میل فی سیکنڈ سے کم نہیں ہوگی۔ اس لئے جب یہ سیارے کی دھات سے بنی ہوئی پلیٹ پر لگے گا تو اچانک رُک جانے کی وجہ سے انرجات بن کر اڑ جائے گا اور ٹکرانے کی جگہ پر راکٹ میں بھی سوراخ کر جائے گا۔ اس طرح راکٹ کے اندر کی بند ہوا خراب ہو جائے گی۔ اس صورت میں انسانی جسم کو بڑا خطرہ ہے اور ممکن ہے کہ زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ لیکن بہت سے راکٹوں کی اڑان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ٹوٹنے والے تارے ان سے نہیں ٹکراتے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر روز $\frac{1}{2}$ ایچ کی جسامت کے دس لاکھ ٹوٹنے والے تارے زمین پر آ کر گرتے ہیں لیکن زمین بھی چھوٹی نہیں ہے اس کا قطر ۸۰۰۰ میل ہے اور محیط ۲۵۰۰۰ میل ہے۔ اس لئے تارے اِدھر اُدھر فضا میں بکھر جاتے ہیں اور شاذ و نادر ہی ان سے کوئی نقصان پہنچتا ہے۔

کائناتی شعاع ریزی کے امکانی اثرات سے بھی خاص طور سے پیچیدہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اسپتنک، راکٹ، مصنوعی چاند اور

---

[1] اور اب بحیرۂ تیتوف کو طے شدہ مقام پر واپس اُتار کر اپنے تجربے کی کامیابی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ (ادارہ)

کائناتی جہاز خلا میں بھیج کر بے وزنی اور کائناتی شعاع ریزی کے تجربے کئے جا چکے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان خلاء کے حالات میں اپنے آپ کو ڈھال لے گا اور شعاع ریزی کے اثر کو لباس کی مدد سے برداشت کرے گا۔

غذا کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ جو آدمی کائناتی جہاز میں بیٹھ کر خلاء کا سفر کرے گا اس کے لئے غذا، پانی اور ہوا کا انتظام کافی مقدار میں کیوں کر کیا جا سکے گا؟ حساب لگا کر معلوم کیا گیا ہے کہ تین سے لے کر پانچ افراد تک اگر ایک مہینے کے لئے خلاء میں سفر کرنے جائیں تو ان کو غذا، پانی اور آکسیجن کی مقدار ایک ٹن لے جانی پڑے گی۔ اس کی وجہ سے جہاز کے اندر وزن کتنا بڑھ جائے گا جب کہ سیاروں کو اور بہت سے آلات کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ تاکہ سہولت ہو۔ لیکن حالیہ تجربات سے یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا ہے۔

چاند پر جانے کے سلسلے میں تین منزلیں تھیں۔ پہلی منزل وہ تھی جب کہ مصنوعی سیارے اور راکٹ اڑائے گئے۔ دوسری منزل وہ تھی جب کہ روس نے اپنا راکٹ ۱۴ ستمبر ۱۹۵۹ء کو چاند کی سطح پر اتار دیا تھا لیکن اس میں ٹیلی ویژن کیمرے اور دوسرے آلے ایسے نہ تھے جو وہاں کی تفصیلات زمین تک بھیجتے۔ اس دوران میں جانوروں کو بھی خلا میں بھیجا گیا۔ انسانوں کو بھی خلاء میں بھیج کر کامیابی سے نیچے اتار لیا گیا۔ اب تیسری منزل چاند پر پہنچنے کی ہے۔ امریکہ نے اعلان کیا ہے کہ ۱۹۶۷ء تک وہ چاند پر سائنسی مرکز قائم کرے گا۔ روس نے کوئی اعلان نہیں کیا ہے لیکن بہت سے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ وہ امریکہ سے بہت پہلے چاند پر انسان بھیج کر اپنی تجربہ گاہ بنا لے گا۔ بہرحال جیسے ہی وہ سائنسی مرکز کھل جائے گا چاند سے دوسرے سیاروں پر جانے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے اور انسان عام طور سے خلا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کیا کرے گا۔ اس کے بعد انسان سب سے پہلے مریخ پر جائے گا اس کے بعد زہرہ، مشتری اور زحل پر قدم رکھے گا اور کائنات کا سیاح بن جائے گا۔

مریخ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اس کی فضا بالکل خشک ہے اور اس کی تہہ پتلی ہے اس لئے اس پر جانا مشکل ہے۔ لیکن ایک سائنس دان نے تجویز پیش کی ہے کہ نیوکلیر انرجی (ایٹم کی طاقت) سے ہم مشتری کا ایک چھوٹا چاند اس طرح اس کے مدار سے ہٹا کر نیچے لے آئیں کہ آخر میں وہ مریخ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ اس چاند کی تین گیسیں اور امونیا کے کیمیائی اجزاء منجمد صورت میں ہیں۔ بجلی کی مدد سے ان کیمیائی مرکبات کو آکسیجن، ہائیڈروجن اور نائٹروجن کی گیسوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اس طرح مریخ کی فضا بدل دی جائے گی اور وہاں ہوا، پانی اور موافق فضا پیدا ہو جائے گی، پھر مریخ پر جا کر انسان آباد ہو سکے گا۔

ایک دوسرے سائنس دان ڈاکٹر فرٹز زوئیکی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ نہ صرف چاندوں کو بلکہ سیاروں کو بھی اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہٹایا جا سکتا ہے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ مشتری اور زحل جو کہ سورج سے بہت دور ہیں ان کے سائز کو گھٹا کر ایک سیمیے کے برابر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان کو کھسکا کر سورج کے ذرا قریب ایسی جگہ لے جا کر رکھ دیا جائے جہاں سے سورج کی دھوپ ان سیاروں پر اچھی طرح پڑے گی اور زندگی کی نشوونما ہو سکے گی۔ اس کے بعد نیوکلیر انرجی (ایٹم کی طاقت) سے ان کے سائز کو بڑھا کر زمین کے برابر کر دیا جائے گا اور ان کے کرۂ ہوا کی کو بھی بدل کر زمین کی فضا کے مانند بنایا جا سکے گا۔ پھر انسان مشتری اور زحل پر بھی جا کر آباد ہو سکے گا۔

ڈاکٹر زوئیکی نے کائنات میں ستاروں کو بنتے بگڑتے خود دیکھا ہے اور دوربین سے خود ان کا مشاہدہ کیا ہے اس لئے وہ ایٹمی قوت کی مدد سے سیاروں کی جسامت کو گھٹانا بڑھانا بالکل ممکن سمجھتے ہیں۔

الغرض سیاروں کو قابو میں کر لینے کے بعد ان کے درمیان خلائی سفر عام ہو جائے گا اس وقت انسان کائنات کو مسخر کرنے کا پروگرام شروع کرے گا اور اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھ کر پھولا نہ سمائے گا۔

---

## من وتو

سے کتنی بلندی پہ مرے پیار کا معیار — خود حسنِ ازل ہے مرے جلووں کا خریدار

ہے ناز ہوں یہ اس جذبِ جنوں جذبۂ پیدا — دیوانے کا دیوانہ ہوں ہشیار کا ہشیار

خود گوشِ برآواز ہے دوشیزۂ فطرت — میری رگِ احساس کی للہ سے جھنکار

محرابِ حرم میں مرے افکار کے اصنام — میخانۂ عالم میں مری مستیٔ کردار

میں رہگذرِ عشق میں کیا گرمِ سفر ہوں — صدیوں سے تعاقب میں ہے یزدانِ پیمبر

ہر سانس مری تیشۂ فرہاد کا حاصل — آہ مری گویا شررِ بادیۂ کہسار

مسلک ہے مرا عظمتِ آدم کا تحفظ — یہ فخر ہے حاصل کہ ہیں کافر ہوں نہ دیندار

تیرے لئے ہر ذرہ بھی اک رنگ ہے رنگ — اور میرے مقدر میں ہے اک دشتِ پرخار

تیرے لبِ روشن پہ یہ ابروئے جمیدہ — یا صفحۂ خوش رنگ پہ نیرنگیٔ پرکار

یہ ساری فضا کیا ہے ترا نغمۂ جاوید — یہ سارا چمن کیا ہے ترا پرتوِ رخسار

قامت ہے کہ رنگوں میں نہائی ہوئی جنت — مکھڑا ہے کہ یمن و بہزاد کا شہکار

بکتی ہے فقط ایک تبسم میں جوانی — یہ انجمنِ ناز ہے یا مصر کا بازار

کاوشؔ مرا جلوہ تھا سراج اور ولی میں
ہیں ارضِ دکن کا ہوں اُبھرتا ہوا فنکار

## غزل

کیوں نہ پینے سے لگائیں غم کو — اک یہی چیز ملی ہے ہم کو

کون پہنچا ہے کسی کے دل تک — کون سمجھائے کسی کے غم کو

ہم پہ اکثر جو گزر جاتا ہے — دیکھتا کون ہے اس عالم کو

تازگی پھول کو دی شبنم نے — پھول کچھ دے نہ سکا شبنم کو

اس کے باوصف کہ حاضر تھے طبیب — زخم ترسا ہی کئے مرہم کو

کس قدر ان کو گراں گزرا ہے — اپنا تو یاد نہ کہنا تم کو

مس جسے کچھ بھی سخن سے ہوگا — مدح ہرگز نہ کہے گا ذم کو

اور آگے تو نہ جاتے سر سے — ہاتھ اُٹھتے بھی اگر ماتم کو

وقت کے وقت کوئی کام کی بات — کم ہی سوجھی ہے کسی ہمدم کو

الاماں، یہ غمِ دنیا، حیرتؔ
جس سے فرصت ہی نہیں ہے ہم کو

م ش
ش ح

# نئی کتابیں اور رسالے

## اندازے

مصنفہ فراق گورکھپوری۔ صفحات ۲۰۶۔ کتابت، طباعت، جلد جلد پوش عمدہ۔ قیمت پانچ روپے ۷۵ نئے پیسے۔

یہ فراق گورکھپوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ فراق صاحب ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ تنقید میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے اور اردو تنقید میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کرکے تنقیدی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کی تنقید کوئی میکانکی عمل نہیں اس میں جذبات اور تخیل کی نیرنگیاں بھی ہیں جس کی وجہ سے تخلیق کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ "پیش لفظ میں اس کتاب کی تصنیف کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ——" جو جمالیاتی، وجدانی، اضطراری اور مجمل اثرات قدما کے کلام کے میرے کان، دماغ، دل اور شعور کی تہوں پر پڑے ہیں انھیں دوسروں تک پہنچا دوں کہ ان اثرات میں حیات کی حرارت و تازگی قائم رہے ——" بلاشبہ یہ کتاب اردو کے تنقیدی ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

## ادب اور ادیب

مصنفہ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ صفحات ۲۷۹۔ کتابت، طباعت جلد، جلد پوش عمدہ۔ قیمت چار روپے۔

اس مجموعہ میں ڈاکٹر اعجاز حسین کے ۱۶ مضامین شامل ہیں جو قریب قریب سب ہی مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی اردو کے قدیم اور جدید ادب پر یکساں نظر ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بڑا سلجھا ہوا ہے اور وہ کبھی بھی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے۔ یہ مضامین انھیں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان مضامین کو یکجا شائع کرکے ایک ادبی خدمت انجام دی گئی ہے۔

## فیضِ مشرق

از ڈاکٹر محمد احمد صدیقی۔ صفحات ۱۹۵۔ کتابت، طباعت، جلد جلد پوش عمدہ۔ قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔

یہ مجموعہ ان چار مضامین پر مشتمل ہے: اسلامی علوم و فلسفہ کا اثر یورپ کے علوم اور فلسفہ پر، عربی شاعری و خیالات کا اثر۔ بر دفساد الطائیہ کی شاعری پر، ابو العلاء معری اور اس کا فلسفہ، ابن خلدون اور اس کا مقدمہ۔ چاروں مضامین فاضل مصنف کے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے مظہر ہیں اور ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ عربی علوم و فنون سے اہل مغرب نے کہاں تک استفادہ کیا ہے۔

## اُردو سے ہندوؤں کا تعلق

مصنفہ اجل اجلی۔ صفحات ۱۰۸۔ کتابت، طباعت اوسط۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔

شروع میں علامہ عبدالحلیم شرر کا مقالہ بعنوان 'ہندوؤں کا تعلق اردو' شامل ہے۔ اور اس کے بعد مصنف نے سرشار، پریم چند، کرشن چندر، دیا شنکر نسیم، چکبست اور فراق کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف سے ان کا منشا یہ ظاہر کرنا ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی میں ہندوؤں نے بھی برابر کا حصہ لیا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے یہ مختصر کتاب قابلِ قدر ہے۔

## تعلیم اور زندگی

مصنفہ سے کرشنا مورتی۔ مترجم ڈاکٹر اقبال نرائن گرٹو۔ صفحات ۱۸۴۔ کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔

زیرِ نظر کتاب میں تعلیم اور زندگی کے باہمی تعلق اور اس کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں مترجم کا بصیرت افروز مقدمہ بھی شامل ہے۔ یقیناً فاضل مترجم کی یہ خدمت قابلِ تحسین ہے۔

## چترلیکھا (ناول)

مصنف بھگوتی چرن ورما۔ ترجمہ سید سجاد ظہیر۔ صفحات ۲۴۰۔ کتابت، طباعت اوسط۔ قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔

'چترلیکھا' ہندی کا مشہور ناول ہے اور ہندی کے افسانوی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مترجم نے اس کو اردو میں ترجمہ کرکے بڑی خدمت انجام دی ہے جو بلاشبہ قابلِ تحسین سمجھی جائے گی۔

## قصیدۂ عطار

از محمد سراج الحق مچھلی شہری۔ صفحات ۷۹۔ کتابت، طباعت جلد، جلد پوشش عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔

یہ شیخ فریدالدین عطار رح نیشاپوری کے ایک فارسی قصیدے کا منظوم ترجمہ ہے جس کے ساتھ ساتھ فٹ نوٹ میں تلمیحات اور نکات کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ اس قصیدے میں وحدۃ الوجود سے متعلق اسرار و رموز بیان کئے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا ساتوں کتابیں ادارۂ انیس اردو الہ آباد نے شائع کی ہیں۔

## جیتا جاگتا

مؤلف و مترجم ڈاکٹر سید محمد یوسف۔ صفحات ۱۶۱۔ کتابت طباعت، جلد، جلد پوشش عمدہ قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے ملنے کا پتہ۔ اردو اکیڈیمی سندھ، بندر روڈ کراچی۔

یہ اندلس کے مشہور مسلم فلسفی ابن طفیل کی تصنیف "حیّ بن یقظان" کا اردو ترجمہ ہے جس میں مترجم کا پیش لفظ اور تبصرہ بھی شامل ہے۔ اسلامی فکر اور فلسفہ کے طالب علموں کے لئے کتاب مفید مطالعہ ہے۔

## گاما گلک

مؤلف آغا اختر لکھنوی۔ ۴۸ صفحات کا یہ کتابچہ رستم زماں گاماں پہلوان کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں کشتی کے فن سے متعلق مفید معلومات درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ قسم اوّل اور قسم دوم کی قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ متین بک ڈپو امین آباد لکھنؤ

(م۔ش)

## چاندنی اور انگارے

اسلام رونی کے تین ڈراموں کا مجموعہ۔ ضخامت ۱۰۶ صفحات۔ قیمت دو روپے۔ کتابت، طباعت اوسط۔ مجلد مع گرد پوشش۔

رونی صاحب کے یہ تینوں ڈرامے صرف اس لئے ڈرامے کہے گئے ہیں کہ ان میں ڈائیلاگ (مکالمہ) ہے۔ موضوع میں کوئی انوکھا پن نہیں۔ پہلا ڈراما 'چاندنی اور انگارے' ایک ہوا باز کی زندگی کے خطرات کے بارے میں ہے۔ دوسرا ڈراما 'فاصلہ' ایک طوائف کی لڑکی سے متعلق ہے اور تیسرا ڈراما 'لو میرج' ایک فیشن زدہ لڑکی سے شادی اور ناکامی کی داستان ہے۔ ڈراموں میں 'ڈرامائیت' بالکل نہیں اور مکالمے بھی بالکل سپاٹ ہیں۔

## یوحنا

مصنف کلیم عرفی۔ ہنگام و رود دل (چنگیز خان) اور چراغ شب آخر (یوحنا) اور نگار خانۂ دل (شاہجہاں) یہ تین ڈرامے کتاب میں شامل ہیں۔ زبان مصنوعی اور کچھ ایسی ہے جو خام ترجموں میں ملتی ہے۔ جیسے "وہ اپنے منہ کے چوموں سے مجھے چوسے تیرا نام عطر ریختہ ہے۔ مجھے کھینچ لے ہم نیزے پیچھے دوڑ دیں گی۔ ہم تجھ میں شادماں اور مسرور ہوں گی۔" (صفحہ ۷۲)

"قاہر قرابیں و ژوبیں و شمشیر خنجر سے آراستہ نیلم عاج، پکھراج، لعل اور یاقوت، سنگینم اور موتی کے محلوں میں چھپے ہوئے شگفتہ جسموں کے خاموش شب خیز بھرپور ہفت رنگ نغموں کے آس پاس گریزاں، رقصاں رقصاں، رواں اور دواں (صفحہ ۱۳۰) ایک جگہ "شرر کلاب" بھی لکھا ہے۔

ڈرامے کے فنی لوازم کو برتنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی ہے۔

کتاب کی قیمت دو روپے اور ضخامت ۱۶۶ صفحات۔ کتابت طباعت اوسط ہے۔

## بھرتری ہری

مترجم: کرشن چودھری۔ ضخامت ۱۰۷ صفحات۔ قیمت ۵ روپے۔

بھرتری ہری سنسکرت کا مشہور شاعر گزرا ہے۔ جے کرشن چودھری صاحب نے اس کے کلام کا اردو ترجمہ کرکے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ ترجمہ رواں اور عمدہ ہے کہیں کہیں تلوک چند محروم کا منظوم ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ چودھری صاحب نے اکثر صفحات میں فارسی اور اردو شعراء کا مناسب جانا کلام بھی درج کر دیا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

ضرورت ہے کہ سنسکرت کے ادب عالیہ کا اردو میں زیادہ سے زیادہ ترجمہ کیا جائے۔ چودھری صاحب اس کام کے اہل ہیں۔ خدا کرے کہ وہ آئندہ بھی ایسی کوششیں جاری رکھیں۔

## ادبی جھلکیاں

مصنفہ:۔ صالحہ عابد حسین۔ صفحات ۲۱۴۔ قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔ کتابت طباعت اچھی ہے۔

زیر نظر کتاب محترمہ صالحہ عابد حسین کے دس مضامین کا مجموعہ ہے (حالانکہ فہرست مضامین میں تعداد ۱۱ درج ہے) جو وقتاً فوقتاً ادبی رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ محترمہ ملک کی نامور ادیبہ ہیں اور ان کے مضامین ہمیشہ قدر اور پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے گئے ہیں۔ دو مضامین غالب اور تین مضامین حالی سے متعلق ہیں بقیہ کے عنوان یہ ہیں:۔ اردو شاعری پر ایک نظر، نذیر احمد کے ناولوں میں دلی کی جھلک، شاہ کار سرشار، فیضانہ آئے صدا کر چلے۔ امید ہے یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

## ایک معمولی لڑکی (ناول)

مصنفہ: بلونت سنگھ۔ قیمت چار روپے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ کتابت، طباعت عمدہ۔

بلونت سنگھ اردو کے صف اوّل کے افسانہ نگار ہیں مگر ناول نگاری میں وہ پوری طرح کامیاب نظر نہیں آتے۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں کی اکثریت کا یہی حال ہے کہ ان کے ناولوں میں وہ تیکھا پن، فن کاری اور صناعی نہیں ہوتی جو ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔

'ایک معمولی لڑکی' ایک سیدھا سادا ناول ہے۔ مگر پھر بھی بلونت سنگھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے کہیں کہیں چونکا دینے والے ٹکڑے مل جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام کتابیں ادارۂ ادبیات اردو الہ آباد سے شائع کی ہیں۔

## رسالے

ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر۔ سید سجاد حیدر یلدرم نمبر۔ قیمت چار روپے۔ ضخامت ۲۹۸ صفحات۔ مرتبہ:۔ سید مبارز الدین رفعت۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اردو ٹال بازار امرتسر۔ سید سجاد حیدر یلدرم اردو کے بڑے ممتاز ادیب تھے۔ رسالہ پگڈنڈی نے ان سے متعلق ایک خاص نمبر شائع کر کے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے اور مرتب کی کوشش ہر لحاظ سے مستحسن ہے۔ (ش۔ ح)


سریتا ماہنامہ
سماجی تعمیر نو کا ترجمان

● سماجی اور گھریلو زندگی کی صحیح عکاسی کرنے والی کہانیاں
● اہم اور پے چیدہ سیاسی اور انفرادی مسائل پر خیال انگیز مضامین
● دل نشیں نظمیں اور جذباتی غزلیں
● طنز و مزاح
● عورتوں کے سلجھے ہوئے مضامین

فی شمارہ ۷۵ نئے پیسے
زر سالانہ ایک سال ۶ روپئے — دو سال ۱۱ روپئے

منیجر۔ سریتا اردو۔ جھنڈے والان، رانی جھانسی روڈ۔ نئی دلی۔
مجھے اگلے شمارہ سے ایک سال/دو سال کے لئے خریدار بنا لیجئے۔ زر چندہ کے لئے وہ شمارہ وی۔ پی۔ پی سے روانہ کیجئے۔
نام _____
پتہ _____

# ڈال ڈال کے پات

## اُردو کا سب سے پہلا ماہنامہ ——— احراز نقوی

اختر شہنشاہی کی وساطت سے اردو کا پہلا ماہنامہ کلکتہ میں 'خیر خواہ ہند' کے نام سے ۱۸۲۷ء میں نکلا جب اردو صحافت کا ارتقائی دور تھا۔ مالک اس کے پادری جنرمن صاحب اور مہتمم پادری تھامس تھے اور بابتیس مشن پریس سے نکلتا تھا۔ قیمت سالانہ دو روپے چار آنے تھی۔ چھاپہ خانہ آہنی تھا حرف پرچہ چار ورق کا تھا۔ اس سے زیادہ اس ماہنامہ کے بارے میں ہمارا علم نہیں ہے محض قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسالہ پادریوں کا تو ضرور تھا اور جس پریس سے طبع ہوتا تھا وہ عیسائیوں کی اشاعت اور تبلیغ کا مرجع تھا۔ اس تبلیغی مشن نے مذہب کی اشاعت کی خاطر کافی روپیہ خرچ کر ڈالا۔ بابتیس مشن کا نصب العین عیسائیوں کے مذہب کو ہندوستان کی زبان میں عام کرنا اور ہند میں عیسائی معاشرہ بنانا اور ہندوستانی عیسائیوں کو فروغ دینا تھا۔ اس مدعا اور مقصد کے پیش نظر 'خیر خواہ ہند' کے چار دوروں میں چھوٹے چھوٹے پروپیگنڈہ کے مضامین ضرور ہوتے ہوں گے اور باقی خبریں ہوتی ہوں گی۔ بس اسی طرح 'خیر خواہ ہند' کے مسلک کا تقاضا تھا ہو سکتا ہے اور اسی روشنی میں یہ انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ماہنامہ کم اخبار زیادہ تھا۔ پھر چار ورق کا ماہنامہ یوں بھی ماہنامہ کی فہرست میں نہیں آتا۔ اگرچہ میعادی حیثیت سے یہ ماہوار پرچہ تھا۔ اگر ہمولت کے طور پر ہم اس کو اردو کا بے قاعدہ ماہنامہ کہیں تو بہتر ہوگا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کا باقاعدہ ماہنامہ کون ہے؟ اس کی ذمیت اور حیثیت کیا ہے؟

ڈاکٹر گارساں دتاسی کی تحقیق کے مطابق اردو کے پہلے ماہنامے کا تعین ایک اور دوسرے 'خیر خواہ ہند' سے ہوتا ہے اس کا نام بھی خیر خواہ ہند تھا اور یہ پرچہ بھی ماہواری تھا۔ ڈاکٹر گارساں کا اس پرچہ کے سلسلہ میں اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

"یہ پروفیسر (یعنی رام چندر داسی معلم دہلی کالج) دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں ان میں سے ایک خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کا نام 'محبوب ہند' ہے۔ یہ ایک ماہنامہ پرچہ ہے جس میں اہم معاملات وسائل وقت پر اہل ہند کی تعلیمی حالت پر اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔" (مقالات گارساں تاسی)

اسی تحقیقی اساس پر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنے کتابچے میں ڈاکٹر گارساں تاسی کے ایک تسامح کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:۔

"یہی پروفیسر رام چندر ایک اور رسالہ 'محب ہند' کے نام سے نکالا کرتے تھے۔ ڈاکٹر گارساں نے اپنے مقالات میں اس کا نام کسی غلط فہمی کی وجہ سے 'محبوب ہند' لکھا۔" (سید حسن حیدر آباد)

## غزل ——— حضرت بیباک مرحوم شاہجہانپوری تلمیذ داغ

نہ وہ لطف گریہ و خوں رہا نہ وہ یاد رشک پری رہی
نہ وہ ہم رہے نہ وہ دل رہا نہ وہ غم سے نوحہ گری رہی

نہ ریاض خلد میں جی لگا نہ وصال حور سے کچھ ہوا
وہی جوش وحشت دل رہا وہی اپنی جامہ دری رہی

شب وصل خلوت خاص میں جو حجاب بیچ سے اٹھ گیا
تو ہمیں رہے نہ وہی رہے جو وہی تو بے خبری رہی

کبھی آب گریہ سے تر کیا کبھی خون دل سے بھرا کیا
مگر اپنے نخل مراد کی، اک وہی سی بے ثمری رہی

کیا مست بادۂ ہجر سے مجھے ہائے ساقی دہر نے
جو شراب وصل کے خم میں تھی وہ الگ دھری کی دھری ہی

جو کیا ہے یاس نے حال دل کہیں کس سے جا کے حسینؑ ہم
یہ وہ شیشہ ہے کہ شراب عشق مدام جس میں بھری رہی

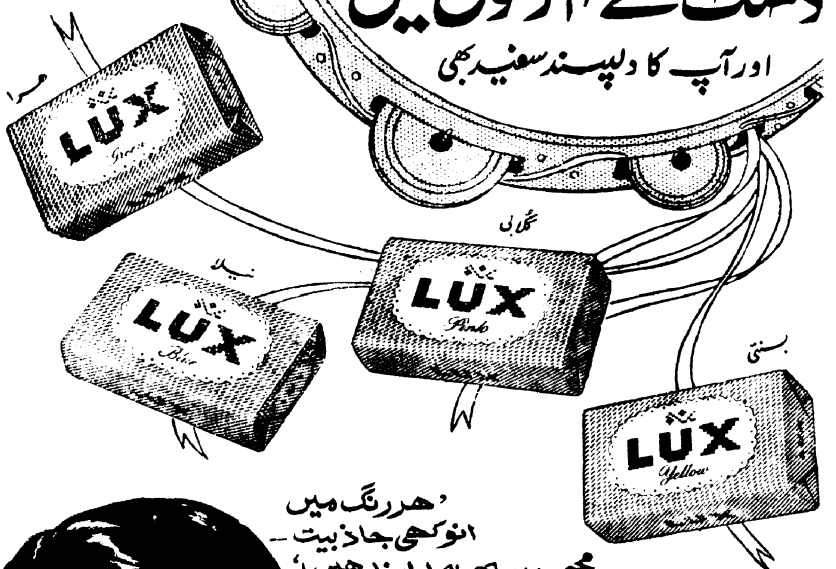
لے بعض غزلوں میں مرحوم نے قافیہ سے بیباک کے بجائے حسینؑ تخلص رکھا ہے (معارف)

خالص، مُلائم جھاگ والا

# لکس

## دھنک کے ۴ رنگوں میں

اور آپ کا دلپسند سفید بھی




'ہر رنگ میں انوکھی جاذبیت —
مجھے یہ سبھی بیحد پسند ہیں!'
وجینتی مالا کہتی ہیں



دیکھئے! سُہانے رنگوں میں لکس! اور اُنہی رنگوں کے دلفریب سروتی!
اور سفید بھی! ارے کیسی، صابن دیبی — آپکا دلپسند خالص لکس —
آپکے رنگ رُوپ کی رونق!




نئی ستاروں کا خالص،
مُلائم جھاگ والا
حُسن بخش
صابن

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

173 86-X52 UD

# باہر کے مُلکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمدؐ ۱۳۹ - اسٹریٹ نمبر ۳۴ - پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲ - رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵ - بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا - ۳۱ گرینج روڈ، سنگاپور

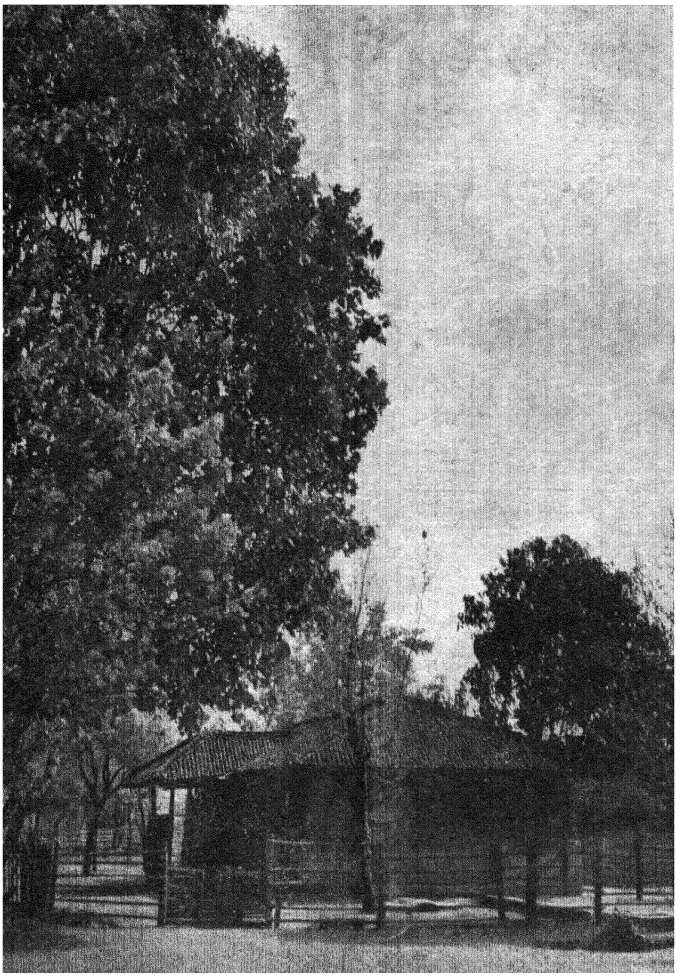
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

# آج کل کے خریداران نوٹ فرمائیں

ہندوستان میں 'آج کل' کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ چندہ ختم ہونے سے پہلے ہی آئندہ سال کا چندہ بھیج دیں تاکہ رسالہ ان کے نام بدستور جاری رہے۔ خریداروں کی سہولت کے لئے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ان کا چندہ ختم ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے ہی انھیں اطلاع دے دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک 'بزنس ریمائنڈر کارڈ' بھی بھیجا جائے گا جس کی خانہ پُری کرکے سپرد ڈاک کر دیں۔ اگر کوئی جواب نہ ملا تو رسالہ بھیجنا بند کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے وی۔ پی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کے لئے ان کی طرف سے کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی ہو۔

ازراہِ کرم چندہ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

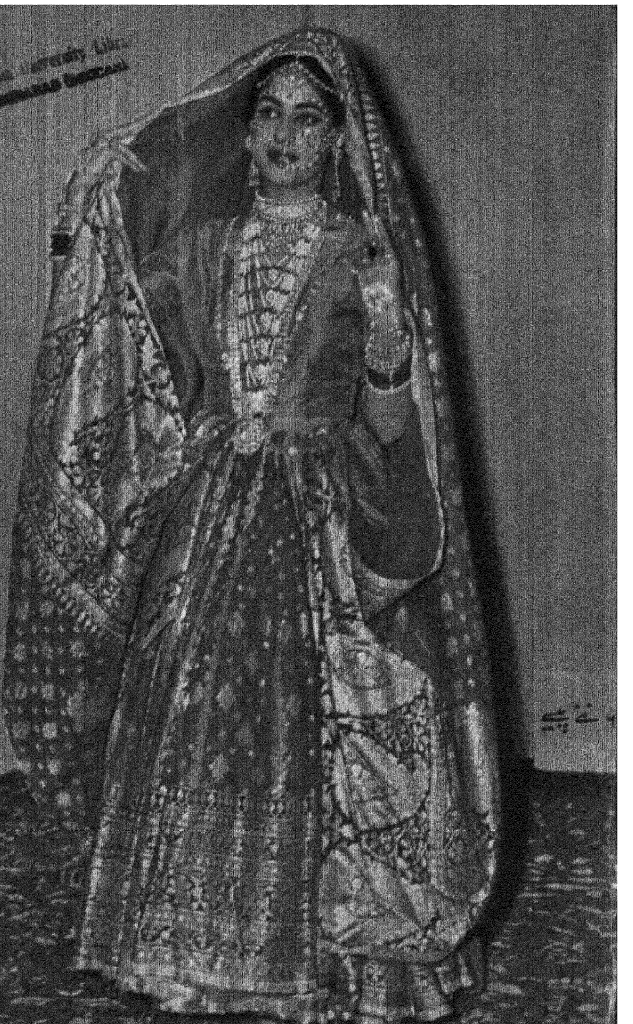


Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**

Punjab University Library
Periodicals Section

# آج کل



کاپی رائٹ شدہ سنہ ۱۹۵۳ء
نومبر سنہ ۱۹۵۶ء

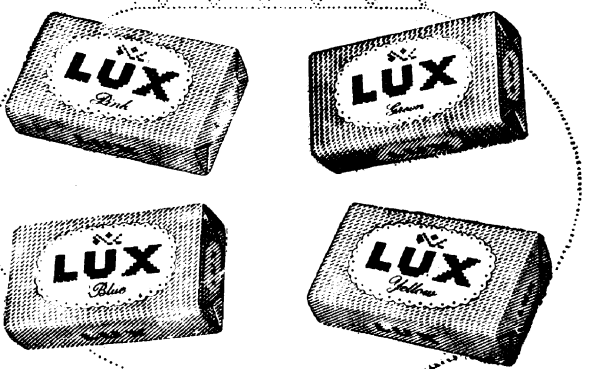
# ہماری کتابیں



| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پنڈت نہرو سے بات چیت ٹیبر منڈی | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| تیسرا پنج سالہ پلان | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ۴۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ۳۵ نئے پیسے | ۱۰ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں | ۱۰ نئے پیسے | ۸ نئے پیسے |
| نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ | (فی نمبر) | (فی نمبر) |

ملنے کا پتہ

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶




# دِیوالی!

"میرا دِلپسند لکس
دَھنک کے
۴ رنگوں میں
اور سفید بھی"
اَشاپارِکھ کہتی ہیں



فِلمی ستاروں کا خالص، مُلائم جھاگ والا
حُسن بخش صابن




ہندوستان لیور کا تیار کردہ

LTS.105-X52 UD

# میلے میں

تامل زبان کا یہ لوک گیت دل کی ننھی ننھی خوشیوں اور خواہشوں کا آئینہ ہے۔ نوجوان اپنی محبوبہ سے کہتا ہے "سیلم کے میلے میں، میں نے ایک بڑی خوبصورت، بڑی خوشرنگ ساڑھی دیکھی۔ ساڑھی بیچنے والی وہ چھبیلی نار بڑے فخر کے ساتھ کہہ رہی تھی، میلے میں نے اپنے کرگھے پر بُنا ہے۔"

"சேலத்துச் சந்தையிலே — பட்டு
"சிங்கார சேலை கண்டேன்.
"எங்கள் நறிச்சேலை என்றாள்..
"பொங்கும் களிப்புடனே."



ஹாத்கர்கா

ہاتھ کھڈی

ہمارا قومی ورثہ

DA-61/229

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۴ |
| غزل | فراق گورکھپوری | ۵ |
| اردو کے جڑواں معمّے | گیان چند | ۶ |
| قومی اتحاد، آزادی سے پہلے | گوپی ناتھ امن | ۱۳ |
| غزل | حرمت الاکرام | ۱۶ |
| حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان | عبدالقادر سروری | ۱۷ |
| نفرت | جیلانی بانو | ۲۷ |
| گیارھویں اور بارھویں صدی میں ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی حالت | محبوب اللہ مجیب | ۳۴ |
| غزل | مظہر امام | ۳۸ |
| غزل | تبسم نظامی | ۳۸ |
| تیسرا پنج سالہ پلان | — | ۳۹ |
| داستانِ حسن | قاضی مزاج دھولپوری | ۴۳ |
| شکستِ خواب | چندر کرن سون رکسا | ۴۴ |


سرورق :- ایک دوشیزہ راجستھانی لباس میں
رسالے کی پشت پر :- آئی دیوالی


کارتک شک سمہ ۱۸۸۳
نومبر ۱۹۶۱ء

جلد ۲۰ - نمبر ۴



مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
بال کمند عرشی طیبانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶



اردو کا مقبولِ عوام مصور ماہنامہ

# آج کل دہلی

مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد مجیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | حیدرآباد |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| رحمان راہی | سری نگر |

یو - ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی - این - ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نیتا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال کمند عرشی ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)
مدیرِ مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- مظہر شاہ

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- اشلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- اشلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۱۰۰۲ دہلی

# ملاحظات

پچھلے دنوں یوگوسلاویہ کی راجدھانی بلغراد میں ۲۵ غیر جانب دار ملکوں کے سربراہوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں ہندوستان کی یہ تجویز منظور کر لی گئی کہ صدر کینیڈی اور وزیر اعظم خروشچیف امن کے مسئلہ پر گفتگو کریں۔ اس کے علاوہ کانفرنس کے اعلان میں نو آبادیاتی نظام کو ختم کرنے پر بھی زور دیا گیا اور عالمی امن کی ضرورت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا گیا کہ جنگ کی تیاریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اگر انھیں روکا نہ گیا تو امن کا تحفظ ناممکن ہو جائے گا۔ جنگ اور سرد جنگ کے بیچ لے پڑا امن بقائے باہم کے اصول کو اپنانے اور بین الاقوامی تعلقات میں حق خود ارادیت کو بنیاد قرار دینے کی ضرورت ہے۔ کانفرنس نے امن کے حق میں جو آواز اٹھائی ہے اس کا اچھا اثر پڑ رہا ہے۔ روس نے کہہ دیا ہے کہ وہ جنگ کو ناگزیر نہیں سمجھتا اور مغربی طاقتیں بھی جھگڑے چکانے کا واحد ذریعہ جنگ کو نہیں گردانتیں۔ آج دنیا میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ عالمی امن و سلامتی کو کیسے مستحکم کیا جائے اور جنگ کے خطرے کو کیسے ختم کیا جائے۔ ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ بڑی بڑی طاقتیں سہولت کے ساتھ اپنے جھگڑے طے کر کے عالم انسانیت کو جنگ کے خطرے سے نجات دلائیں گی۔

حال ہی میں نئی دہلی میں وزیر اعظم پنڈت نہرو کے زیر صدارت قومی یک جہتی کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی جس میں ملک کے مختلف الخیال ممتاز لوگوں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں سیاسی لیڈر، سائنس دان، ماہرین تعلیم، ادیب، مصنف، شاعر مرکزی و زراء اور ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ شامل ہوئے۔ کانفرنس میں قومی یک جہتی سے متعلق مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا اور بہت سی تجاویز زیر غور آئیں۔ اس بات پر زور دیا گیا کہ تعلیم کے ذریعہ قومی یک جہتی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ فرقہ واریت، ذات پات، مذہبی اور لسانی تعصبات کا مقابلہ کیا جائے۔ کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ وسیع بنیاد پر نیشنل انٹیگریشن کونسل قائم کی جائے۔ کمیٹی ۳۷ ممبران پر مشتمل ہوگی، اور قومی یک جہتی سے متعلق مسائل کا جائزہ لے کر ضروری سفارشیں کیا کرے گی۔ کانفرنس نے سیاسی جماعتوں کے لئے ضابطۂ اخلاق منظور کیا جس کے مطابق سیاسی پارٹیوں سے اپیل کی گئی کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے اختلافات بڑھیں یا مختلف مذہبی یا لسانی فرقوں اور مختلف ذاتوں میں نفرت پیدا ہو۔ آج ہم قومی ترقی کی اس منزل پر پہونچ گئے ہیں جہاں لوگوں کے دماغوں کو ایک متعین راہ پر لگایا جائے۔ یقینی ہے کہ کانفرنس کی مساعی کامیاب ثابت ہوں گی، ملک میں تنگ نظری اور دیگر تعصبات کے لئے کوئی جگہ نہ رہے گی اور قومی اتحاد مضبوط بنیادوں پر استوار ہو جائے گا۔

۱۸۔ ستمبر کو ہوائی جہاز کے حادثہ میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر ہیمر شولڈ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت پُراسرار حالات میں ہوئی جبکہ وہ کانگو کے مسائل کو سلجھانے میں مصروف تھے اور کٹنگا کے لیڈر مسٹر شومبے سے ملنے جا رہے تھے۔ ان کی موت سے دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ وہ بڑے دیانت دار کارکن اور گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے اور ہمیشہ اتحاد و اتفاق اور امن و سلامتی کے لئے کوشاں رہے۔

افسوس کہ مشہور ظرافت نگار حاجی لق لق ۷۵ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کا نام ابوالحلا چشتی تھا، مگر حاجی لق لق کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے سابق مرحوم کے ساتھ رسالہ "فانوس خیال" نکالا۔ اس کے بعد مختلف رسائل اور اخبارات سے وابستہ رہے۔ اپنی مخصوص طریقہ طرز نگارش کے باعث حاجی لق لق کا نام اردو ادب میں جاودانی ہے۔

# غزل

کبھی جب تری یاد آجائے ہے
دلوں پر گھٹا بن کے چھا جائے ہے

شبِ یاس میں کون چھپ کر ندیم
مرے حال پر مسکرا جائے ہے

کوئی لاکھ اسے روکے ٹوکے، مگر
دل اس کی گلی میں چلا جائے ہے

محبت میں اے موت، اے زندگی
مرا جائے ہے یا جیا جائے ہے

پلک پر لپس ترکِ غم، گاہ گاہ
ستارہ کوئی جھلملا جائے ہے

کرم پر ترے خوش تو ہوں کیا کروں
کہ آنسو بھی آنکھوں میں آجائے ہے

بنے بات چشمِ فسوں گر سے کیا
کہ وہ بھی تو باتیں بنا جائے ہے

تری یاد شب ہائے بے خواب میں
ستاروں کی دنیا بسا جائے ہے

جو بے خواب رکھے ہے، تا زندگی
وہی غم کسی دن سلا جائے ہے

نہ کہہ مجھ سے ہمدم مراحالِ زار
دلِ ناتواں سنا جائے ہے

غزل میری کھینچے ہے غم کی شراب
پیے ہے وہ جس سے پیا جائے ہے

مری شاعری گو ہے جانِ نشاط
غموں کے خزانے لٹا جائے ہے

مجھے چھوڑ کر جائے ہے تیری یاد
کہ جینے کا اک آسرا جائے ہے

غمِ عشق یکسر ہے گم گشتگی
مگر نبضِ کونین پا جائے ہے

وہ آواز ہو یا کوئی خامشی
تری ہی کہانی سنا جائے ہے

مجھے گمرہی کا نہیں کوئی خوف
ترے گھر کو ہر راستا جائے ہے

سنائیں تمہیں داستانِ فراق
مگر کب کسی سے سنا جائے ہے

گیان چند

# اُردو کے جڑواں مصوّتے

جڑواں مصوّتے سے مراد DIPHTHONG ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے 'زبان اور علم زبان' میں جڑواں مصوتے کی اصطلاح ہی استعمال کی ہے۔ چودھری محمد نعیم صاحب نے اس کا ترجمہ 'مخلوط یا مخلوط مصوتہ' کیا ہے۔ سر سوتی سرن صاحب کیفی کے مطابق جامع الاظہر میں اس کے لئے 'موصلی مصوتہ' کی اصطلاح رائج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'مخلوط مصوتہ' سے مصوتوں کا وہ انضمام ظاہر نہیں ہوتا جو DIPHTHONG کی خصوصیت ہے۔ 'موصلی مصوتے' میں اس کی طرف اشارہ ہے لیکن اسے ہسل کرکے 'وصلی مصوتہ' کیوں نہ کر لیا جائے۔ DIPHTHONG کا ایک اہم عنصر دو مصوتوں کا جوڑ ہے۔ انگریزی سابقہ 'ٹرائی' ثنویت پر دال ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں تین مصوتوں کے میل کو TRIPHTHONG کہتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ اردو اصطلاح میں دو کے عدد کی طرف بھی کچھ اشارہ ہو۔ 'جڑواں مصوتے' میں 'جڑ' سے کا شعور بھی ہے اور 'دو' کا بھی، اس لئے جب تک کوئی بہتر اصطلاح وضع نہ ہو میں اسی کا استعمال کروں گا۔

جڑواں مصوتوں پر لکھنے سے پہلے لازم ہے کہ اردو مصوتوں کی صحیح تعداد کی شرح کر دی جائے۔ عام طور سے اردو میں دس مصوتوں پر اتفاق رائے ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں اردو میں تین مصوتے اور ہیں[1]۔

خفیف اِ ے — مثال :- سہرا - چہرہ - محنت - حوض - دردِ دل واقعہ - جامعہ

خفیف اَ ے - مثال : فعل - کہنا - محل - بہن - جہد - اہل

خفیف اُو " تحفہ - محسن - کہرام - محرّم - محمد معظّی چہلیں - بہت

ان تینوں مصوتوں کے لئے I. P. A. چارٹ میں علامات نہیں ملتیں، اس لئے ان کے لئے ہم امریکی چارٹ سے علامات مستعار لیں گے۔ بقیہ دس مصوتے I. P. A کے مطابق رقم کئے جائیں گے۔ یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ فعم اردو میں اَے اور اَو کو واحد مصوتہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اردو میں انھیں جڑواں مصوتہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ ذیل میں اردو مصوتوں کو اردو، ہندی اور صوتیاتی تحریر میں درج کیا جاتا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱- اِی | इ | i: |
| ۲- اِ | इ | i |
| ۳- اِے | ए | e |
| ۴ خفیف اِے | ऐ | ɛ |
| ۵- اُے | ए | ɛ |
| ۶- خفیف اَے | अ | əɛ |

---

[1] اردو اور ہندی کا تلفظ از گرامم بیلی - مترجمہ چودھری محمد نعیم اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۷

[2] ہندوستانی صوتیات - نیا دور فروری ۱۹۶۱ء

| | | |
|---|---|---|
| ۷- اَ | ا | ə |
| ۸- آ | ا | a |
| ۹- اَو | او | ɔ |
| ۱۰- خفیف اُو | او | o |
| ۱۱- اُو | او | o |
| ۱۲- اُ | ُ | u |
| ۱۳- اُو | ُ | u: |

عام بول چال کے مطابق ان میں بعض مصوتے طویل اور بعض خفیف کہلاتے ہیں۔

طویل مصوتے: ای - اِ ے - اَ ے - آ - اَو - اُو - اُو

خفیف مصوتے: اِ - خفیف اِ ے - خفیف اَ ے - اَ - خفیف اُ

اُ

جڑواں مصوتہ ایک VOWEL GLIDE ہے یعنی اس کی ادائگی میں اعضائے نطق ایک مصوتہ کے مخرج سے روانہ ہو کر تیزی کے ساتھ دوسرے مصوتے کے مقام تک پہنچتے ہیں۔ یعنی یہ محض دو مصوتوں کے اجتماع کے مترادف نہیں۔ اس میں کئی شرائط ہیں:

۱- دونوں مصوتے ایک کوشش اور سانس کے ایک جھٹکے میں ادا ہونے چاہئیں اس طرح کہ سننے میں وہ گویا واحد آواز معلوم ہو۔

۲- یہ ہمیشہ ایک رکن (SYLLABLE) ہوتا ہے۔

۳- اصولاً اس میں آواز کی گونج میں کوئی نشیب و فراز نہیں ہوتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے پہلے اور آخری اجزاء میں سے ایک نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اگر ابتدا نمایاں ہوتی ہے تو اسے گراؤ (یا محروف کے ساتھ) جڑواں مصوتہ کہتے ہیں۔ اگر آخری جزو نمایاں ہوتا ہے تو اسے اٹھاؤ جڑواں مصوتہ کہتے ہیں۔ دوسری زبانوں کی طرح اُردو کے بھی تقریباً تمام جڑواں مصوتے گراؤ ہوتے ہیں۔

جڑواں مصوتے کے تعین میں دو لغزشوں سے بچنے کی ضرورت ہے:

۱- یہ ایک رکن ہوتا ہے۔ صوتیات میں رکن کی حد بندی اور شناخت سب سے پیچیدہ امر ہے۔ جڑواں مصوتہ کے لئے ایک رکن ہونا سب سے مقدم شرط ہے۔ اگر تلفظ میں دو ارکان ہو گئے تو وہ مصوتی خوشہ ہو جائے گا جڑواں مصوتہ نہیں۔ جڑواں مصوتہ کے دونوں اجزاء کو اپنی انفرادیت ختم کر دینی ہوتی ہے۔

۲- دو مختلف المخرج مصوتوں کے تواتر کو ہم سہل بنانے کے لئے نیم مصوتہ [د] اور [ی] کا سہارا لیتے ہیں۔ اس موقع پر ان مصوتوں کو GLIDE کہتے ہیں۔ اسی وجہ میں انھیں لغزیہ کہا جا سکتا ہے۔ جب دو مصوتوں کے بیچ لغزیے کا عمل ہوتا ہے تو انھیں جڑواں مصوتہ کہنا درست نہیں کیونکہ جڑواں مصوتہ خالص مصوتوں کے امتزاج کا نام ہے نیم مصوتہ کا نہیں مثلاً پیا۔ پیے۔ ہوا۔ ہوئے۔ سویا۔ کھویا — ان میں نہ صرف آخری مصوتہ سے پہلے لغزیہ آتا ہے بلکہ یہ سب الفاظ دو رکنی بھی ہیں۔ اگر ان میں نیم مصوتہ نہ بھی ہوتا تب بھی یہ محض مصوتی خوشے رہتے۔ کیونکہ یہ تنفس کی ایک جھونک میں ادا نہیں ہوتے۔ ان میں رکن کی حد بندی یوں ہوتی۔

i/a i/e u/a u/e o/e

دوسری سطر کے خوشوں میں i a اور u a کی شکلیں اعادہ اور معائی ہیں۔ باقی خوشے بغیر لغزیے کے اردو میں استعمال نہیں ہوتے لیکن ان میں سے کوئی جڑواں مصوتہ نہیں۔

ہندی کتاب راج رشی ابھی سندن گرنتھ میں ڈاکٹر کیلاش چندر بھاٹیا کا عالمانہ مقالہ ہندی اکشر (رکن) شائع ہوا ہے۔ موصوف نے ہندی (ہندوستانی) رکن کے راز سربستہ کو ٹٹولا ہے۔ انھوں نے ایک سے لے کر پانچ ارکان تک کے متعدد الفاظ درج کئے ہیں اور ان میں رکن کی حد بندی کی ہے۔ ہمارے لئے دو رکنی الفاظ (ص ۵۶۰ تا ۵۶۶) سب سے زیادہ اہم ہیں کیوں کہ ان میں جہاں کہیں رکن کا فصل دو مصوتوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔ وہ دونوں مصوتے جڑواں مصوتوں کی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ذیل کے تحفظات کے ساتھ زیادہ اہم شکلیں درج کی جاتی ہیں۔

ـ ـ خفیف معمّہ ـ ـ طویل معمّہ c ـ معمّہ

معمّہ کے آگے سر نشان معمّہ کا غائب ہونا ظاہر کرتا ہے۔ چھوٹی لکیر ـ رکن کی تقسیم کی علامت ہے:

| | |
|---|---|
| آؤ (طویل اُو کے ساتھ) | ـ ـ |
| مائی۔ کوئی۔ سوؤ (آخری معمّہ طویل ہے) | ـ ـ c |
| سائیں۔ لاؤں (آخری معمّہ طویل ہے) | ـ ـ c |
| گئے ہوئے ہوا ہوئی لیے ہوئے[1] | ـ ـ c |
| ہوئیں | ـ ـ c |
| میاں | ـ ـ c |
| ہوئے | ـ ـ c |

ان مثالوں کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے معمّی خوشے جڑواں معمّے نہیں

ao , ai , oi: , oo , au , ai: , ua ,

ui: , ie , ue , uo , ia , ua

ان میں اَئی ۔ اُئی ۔ اُئے پر خاص طور سے توجہ کی ضرورت ہے یعنی کوئی اور گئے کا آخری معمّہ طویل ہو تو یہ بھی جڑواں معمّے نہیں رہتے مزید تجزیہ کرنے پر کچھ اور اصول دکھائی دیتے ہیں:

۱۔ دو طویل معمّے تو الگ کبھی جڑواں معمّے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ الگ الگ رکن بن جاتے ہیں جب کہ جڑواں معمّہ کا ایک جزو دوسرے CONSONANTAL کے مقابل میں دبا ہوا رہتا ہے جس کی وجہ سے VOWEL کہتے ہیں مثلاً آئی ( ai ) کا آخری جزو۔ لیکن اگر دوسرا جزو بھی طویل ہو جائے ( ai: ) تو پھر یہ جڑواں معمّہ نہیں رہے گا۔

۲۔ جڑواں معمّوں میں دوسرا جزو کبھی طویل نہیں ہو سکتا۔ یعنی ـ ـ c کی شکل بھی محض معمّی خوشہ ہے۔ بظاہر یہ چونکا دینے والا انکشاف ہے لیکن یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ مشہور ماہر صوتیات ڈینیل جونس نے انگریزی بولیوں کے اہم و غیر اہم جو ۲۱ جڑواں معمّے درج کئے ہیں ان میں کسی کا آخری معمّہ طویل نہیں۔ جونس[2] نے ایک اور معرکے کی بات لکھی ہے کہ جڑواں معمّہ کی ادائگی میں پہلے معمّہ کو ادا کرنے کے بعد اعضائے نطق دوسرے معمّے کے آخری مقام تک نہیں پہنچتے۔ اس کے لگ بھگ پہنچنا کافی ہے کیونکہ آخری لفظ تک پہنچنے سے جڑواں معمّہ کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اب یہ جانی پہچانی بات ہے کہ [ آ ] کے علاوہ دوسرے طویل معمّوں کی ادائگی میں زبان کو جس قدر اونچا اُٹھانا پڑتا ہے اگر اس سے تھوڑا کم اٹھایا جائے تو اس سے مماثل خفیف معمّہ ادا ہو جائے گا یعنی جونس کے مفروضے کے مطابق جڑواں معمّوں کے آخر میں ہمیشہ خفیف معمّہ ادا کیا جاتا ہے خواہ رسم الخط کی پروا الجھنوں کے باعث ہم طویل معمّہ ہی لکھتے ہوں۔ اگر ہم نے زبان کو تھوڑا اور اوپر اٹھا کر طویل معمّہ ادا کر دیا تو یہ جڑواں معمّہ نہیں رہے گا۔ گویا جڑواں معمّہ کا ادا کرنا کارگہِ شیشہ گراں سے گزرنا ہے مثلاً ذیل کے مصرعوں میں خط شکستہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

| معمّی خوشے | جڑواں معمّوں |
|---|---|
| ai: ایک جاتا ہے تو جوتی ہی گرفتار کوئی | کوئی دن سے بخار آتا ہے ai |
| e ə قربان حبابِ لب دریا کہ پئے مرگ | ہم بھی ہوں دیئے انکار تو کچھ دُور نہیں ə E |
| ai: ذرا آئی پری آئی پری آئی | ہونٹوں پہ ترے دیکھ کے ہنسی آئی ہوئی سی ai |
| ae ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے | ہم بھی گئے واں اور تری تقریر کو روئے ae |
| ao آؤ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی | آؤ کچھ دیر سیر باغ کریں ao |
| aə خاک میں جاؤں سب کو ملا کر | یا ؤں تجھے اک کو گنوا کر aə |
| oi: بیمار کو تجھ غم کے دینی صحّی دوا کوئی | کوئی مرتا ہے کیوں خدا جانے oi |
| oe جا سوئے سیلمانی ہن ہیں | کچھ آج کل نظر آتے ہیں کچھ کھوئے ہوئے oe |
| i: سا ؤ ڈی نے تو کھویا دل جن سے لکیں | دنیا میں کسی فرد کو یکسوئی نہیں ہے i: |

۳۔ جڑواں معمّوں کا دوسرا معمّہ ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اسکتے دو نتیجے

---

[1] ان الفاظ کا مطلوبہ تلفظ اردو خط میں ظاہر کرنا مشکل ہے اس لئے ہندی کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ مناسب یہ تھا کہ بین الاقوامی صوتی تحریر میں لکھا جاتا لیکن اردو میں لکھتے وقت ہیں حتی الامکان صوتی رسم الخط سے بچتا ہوں کیونکہ اہل بیلیں اور عام قارئین کے لئے وہ ایک چیستاں بن جاتی ہے۔

[2] AN OUTLINE OF ENGLISH PHONETICS طبع ششم ص ۹۸

[3] ایضاً ص ۵۸

برآمد ہوتے ہیں :

(الف) دو خفیف مصوّتوں کا یکجا ہونا بھی لازماً جڑواں مصوّتے کی پہچان نہیں۔ چند خفیف مصوّتے جڑواں مصوّتوں کے طور پر آتے ہیں بقیہ میں ہر جزو اپنی انفرادیت بحال رکھتا ہے اور یہ دونوں اجزا ایک کوشش یا ایک جھٹکے میں ادا نہیں ہوتے۔ مثلاً ذیل کے مصوّتی خوشے ملاحظہ ہوں جن میں دونوں مصوّتے خفیف ہیں لیکن جنھیں ادا کرنے میں صاف دو جھٹکے سنائی دیتے ہیں۔

ə ə ع الجز۔ معاً۔ تحلق ə n سنّی۔ تحلق ə u ہوشیاری

جڑواں مصوّتہ کو VOWEL GLIDE بالکل صحیح کہا گیا ہے۔ اس کی ادا لگی میں ایک مصوّتے سے دوسرے مصوّتے تک سبک روی اور سہولت کا احساس رہنا چاہیے۔ 'معاً' میں وہ سبک روی کہاں

(ب) ہمارے مسلّمہ جڑواں مصوّتوں کا دوسرا مصوّتہ بھی اگر کسی لفظ میں متحرک ہو کر آتا ہے تو وہ جڑواں مصوّتے کی خاصیت کھو کر محض مصوّتی خوشہ رہ جاتے ہیں مثلاً ai اور ai معروف جڑواں مصوّتے ہیں لیکن رائمہ اور مائل میں یہ جڑواں مصوّتے باقی نہیں رہتے کیونکہ یہاں [ی] آگے آنے والے مصمتہ سے وابستہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ائی اور آئی کے دونوں مصوّتے دو جھٹکوں میں ادا ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں انگریزی لفظ FINE, FILE کا تلفّظ ملاحظہ ہو۔ یہاں ai جڑواں مصوّتہ ہے جب کہ اردو لفظ فاعل۔ مائل۔ خائن میں یہ کیفیت نہیں۔

جڑواں مصوّتوں کی انھیں نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی وجہ سے ڈاکٹر دھیریندر ورما یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ دوسرے جڑواں مصوّتوں اور محض پاس میں آنے والے دو یا زیادہ مصوّتوں میں خواہ اصولی نقطۂ نظر سے امتیاز کیا جا سکے لیکن عملاً دونوں میں بھید کرنا کٹھن ہے ... اسی لئے یہاں جڑواں مصوّتے اور مصوّتی خوشے میں فرق نہیں کیا گیا ہے...

اگر دو خفیف مصوّتوں کے اجتماع کو سچّا جڑواں مصوّتہ مانا جائے تو ادبی ہندی میں اَے اور اَو ہی جڑواں مصوّتے مانے جائیں گے۔

ہم مندرجہ بالا[1] بحثوں کا حل تلاش کر چکے ہیں۔ جڑواں مصوّتے میں طویل مصوّتے کی بھی سمائی ہے۔ اور اَے اور اَو جڑواں مصوّتے نہیں۔ اہلِ زبان انھیں معزوہی بولتے ہیں۔ ڈاکٹر دھیریندر ورما کی طرح ڈاکٹر اُدے نرائن تواری کو بھی اسی شکل کا احساس ہے۔ دونوں حضرات نے جو نمونے پیش کئے ہیں ان میں جڑواں مصوّتوں اور مصوّتی خوشوں میں امتیاز نہیں کیا۔ ان نمونوں میں بعض ایسے خوشے بھی ہیں جن کا تلفّظ خلافِ معمول درج کیا گیا ہے۔ دراصل ان میں لزیری یا د شامل کر کے بولا جاتا ہے۔ مثلاً

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| oa | اوْیرا | شمال: سوآ | کھوآ | یہاں اویا۔ سویا۔ کھویا چاہیے |
| ia | دُنیاوا | لیاوا | دیاوا | ایا۔ لیا۔ دیا چاہیے |
| io | | وِیوگ | دِیوی | اِیو۔ دیوگ چاہیے |
| ie | | لیئے | دیئے | ئیے۔ دیے۔ لیے چاہیے |
| ua | دُعا | دُوا | دُعا | اُدا۔ دُوا۔ دُعا چاہیے |
| ea | | کھیا | کھیا | ئے یا۔ کھے یا۔ سے یا چاہیے |

لزیے کی آواز کا نوں کو صاف معلوم ہو جاتی ہے اس میں کسی دید ھا کی گنجائش نہیں۔ مثلاً یہ تین تلفّظ ایک دوسرے سے ممیّز ہیں

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ کیا | क्या | KYA | استفہامیہ |
| ۲۔ کِ آ | किला | KIA | ڈاکٹر دھیریندر کے مطابق اِملا |
| ۳۔ کیا | किया | KIYA | کرنا کا ماضی |

ان تینوں میں کوئی بھی جڑواں مصوتہ نہیں۔ مصوتے اور لزیے کے اجتماع کی ایک صورت اور اس کے دو مماثلات ملاحظہ ہوں۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ eu | دیو۔ نیولا۔ | ریوڑی |
| ۲۔ eu | کشتی کھیوٗ۔ | انڈے سیوٗ |
| ۳۔ eo | کھے دُ۔ | سے دُ |

کھیوٗ اور سیوٗ کے تلفّظ کی دو سہل صورتیں ممکن ہیں ۱۔ آخر میں نیم مصوتہ [ د ] بولا جائے ۲۔ آخر میں طویل اُو (دُ) ملفوظ کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دو تلفّظوں سے ہٹ کر یہ بھی ممکن

---

[1] ہندی بھاشا کا اتہاس طبع چہارم ص ۱۱۰

[2] ہندی بھاشا کا اُدگم اور وکاس طبع اوّل ص ۳۲۲

ہے کہ ا سے کے بعد خفیف اُو بول سکیں - میرے لئے اس تلفظ میں کوئی دشواری نہیں - یہ جڑواں مصوّتہ ہے جب کہ اوپر کی مثال میں پہلا مصوّتہ اور نیم مصوّتہ کا خوشہ ہے اور تیسرا ایسا مصوّتی خوشہ ہے جو دو ارکان پر مشتمل ہے -

لیکن [ o ] و [ o o ] و [ o ɯ ] کی کیفیت مختلف ہے - ان میں پہلی اور دوسری شکلیں تلفّظ کے اعتبار سے سہل ہیں لیکن یہ جڑواں مصوّتے نہیں - تیسری شکل جڑواں مصوّتہ ہے لیکن اس کا ادا کرنا دشوار اور غیر واضح ہے - اس کی آخری آواز کو جول ہی واضح کیا جائے گا وہ [ د ] یا [ اُو ] جیسی ہو جائے گی - عام بولنے والا کوئی صوتیات کا آموختہ تو دہراتا نہیں - وہ پہلی یا دوسری شکل سے کام لے گا - اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں ɯo جڑواں مصوّتہ نہیں بولا جاتا - جہاں تک مجھے علم ہے ہندی میں جڑواں مصوّتوں کی کوئی فہرست نہیں ملتی - ڈاکٹر گرا ہم بیلی نے ۱۹۲۱-۲۳ء کے درمیان اردو اور ہندی تلفّظ سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا - اس[1] میں انھوں نے اردو میں ۵ جڑواں مصوّتے قرار دئے -

اَے  اَو  اَی (جیسے لفظ گئی میں)
اُ (انگریزی لفظ Pull کے مصوّتے سے ملتا جلتا)
اُو (یہ الحاوی [ u ] یا فرانسیسی [ o u ] کی طرح ہوتا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ ان میں نہ تین کے سوا کوئی جڑواں مصوّتہ نہیں باقی چاروں واحد مصوّتے ہیں -

ڈاکٹر زور کی قدیم کتاب HINDUSTANI PHONETICS میں اردو کے جڑواں مصوّتوں کی فہرست ہے - اُن[2] کے مطابق اردو میں ذیل کے ۹ جڑواں مصوّتے ہیں -

۱- اَو  مثال  خوف
۲- اِو  مثال  تاؤ
۳- اَے  مثال  لائے
۴- اَی  مثال  قیاض
۵- اِو  مثال شیوُ (siu) اردو علامتی
۶- eo  مثال neoba نیولا اردو علامتی

میری رائے میں پہلا واحد مصوّتہ ہے - پانچواں جڑواں مصوّتہ ہے لیکن اردو کے کسی لفظ میں اس کے وجود کا پتا نہیں چلتا - مثال کے اوپر جو لفظ شیوُ دیا ہے اس کا صحیح تلفّظ نیم مصوّتہ و کے ساتھ ہے اس لئے وہ جڑواں مصوّتہ نہیں مانا جا سکتا - نمبر ۶ eo دو ارکان پر مشتمل ہے جس کی وجہ سے وہ جڑواں مصوّتہ کی حدود میں نہیں رہتا - مثال کے لفظ نیولا کا تلفّظ بھی خلافِ واقعہ ہے - اہلِ زبان اسے نیم مصوّتہ و کے ساتھ بولتے ہیں - اس طرح ڈاکٹر زور کی فہرست میں محض دو سرا، تیسرا اور چوتھا جڑواں مصوّتے ہیں وہ بھی اس شکل میں جب کہ ان کا دوسرا مصوّتہ خفیف بولا جائے -

چودھری محمد نعیم[3] لکھتے ہیں کہ اپنے کام کے سلسلے میں انھوں نے اردو میں جڑواں مصوّتے تلاش کئے ہیں - صفحہ ۱۰۰ پر رقم طراز ہیں -

' DIPHTHONG - یہ دو مصوّتوں سے مل کر بنتا ہے - مثلاً پائے - لائی - پیو - پوئے -'

ظاہر ہے کہ جڑواں مصوّتوں کے لئے محض دو مصوّتوں کا اتصال کافی نہیں - پیو جڑواں مصوّتہ نہیں کیونکہ اس میں لغزیہ [ ی ] شامل ہے - اس کے علاوہ یہ دو رکنی لفظ ہے -

اردو کے جڑواں مصوّتوں میں بعض بہت کم لفظ میں آتے ہیں اور بعض زیادہ ہیں - ذیل میں اوّل اہم اور پھر غیر اہم جڑواں مصوّتوں کا شمار کیا جاتا ہے -

| بنرشاد صوتیاتی تحریر | اُردو تحریر | مثال |
|---|---|---|
| ۱- ai | اَئی | سیدھی بڑھئی - قیاض - لفظ کے درمیان میں اس کے بعد ہمیشہ لغزیہ ی آتا ہے - |
| ۲- ae | اَئے | گئے - ع کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق |
| ۳- au | اَؤ | گئو - کوّا - اوّل - لفظ کے درمیان میں اس کے بعد ہمیشہ لغزیہ و آتا ہے |

[1] اردو اور ہندی کا تلفّظ اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۷

[2] ص ۴۹

[3] اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۷

| نمبر شمار | صوتیاتی تحریر | اردو تحریر | مثال |
|---|---|---|---|
| ۴- | a i | آئی | ٹائی - پڑھائی - آبیٹے |
| ۵- | a E | آئے | فائدہ - رائے - پائگاہ |
| ۶- | a ɲ | آؤ | ناؤ - گھاؤ |
| ۷- | a u | آؤ | تاؤ - چڑاؤ - کماؤ یہ چڑواں مصوتہ غنائی شکل میں امدعہ کے متعدد افعال میں آتا ہے۔ |
| ۸- | o i | اُوئی | کوئی - روئیے |
| ۹- | o E | اُوئے | روئے - سوئے |
| ۱۰- | o u | اُوؤ | کھوؤ یہ چڑواں مصوتہ غنائی شکل میں متعدد افعال میں ملتا ہے۔ سادہ حیثیت سے اس کا استعمال شاذ ہے۔ |
| ۱۱- | u i | اُئی | چھوئی ہوئی تحریر میں اس چڑواں مصوتہ کا پہلا مصوتہ طویل لکھا جاتا ہے لیکن بولنے میں اکثر خفیف ہی بولا جاتا ہے۔ |

اردو کے غیر اہم یعنی کم واقع ہونے والے جڑواں مصوتے یہ ہیں:

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۲- | e i | اِے ئی | کھیئی |
| ۱۳- | e ɲ | اِے ؤ | کھیؤ - سیئو |
| ۱۴- | e u | اِے ؤ | جیئو |
| ۱۵- | E E | اَے ئے | روپیے (RUPEE) |
| ۱۶- | u: i | اُوئی | یکسوئی - رُوئی |

مندرجہ بالا مثالوں پر بعض حضرات کو شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کا آخری مصوتہ خفیف نہیں طویل بولا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ الفاظ دونوں طرح ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اگر آخری مصوتہ طویل ہے تو چڑواں مصوتہ باقی نہیں رہتا۔ چڑواں مصوتہ کا تلفظ مصوتی خوشے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اہل زبان روانی سے بولتے ہیں اس لئے اکثر مندرجہ بالا چڑوں کا آخری مصوتہ خفیف ہی بولا جاتا ہے۔ شعر میں یہ پہلو بخوبی واضح ہو جاتا ہے اُئی - اَئے اور اُئی کے علاوہ باقی جوڑوں کا آخری مصوتہ طویل کر کے باندھا جائے تو کچھ غیر فطری سا معلوم ہوتا ہے۔

فیر اہم جڑواں مصوتوں میں سے پہلے چار کا وقوع آغاز شاذ ہے کہ اوپر جو مثالیں درج کی گئی ہیں۔ فی الوقت ان کے علاوہ اور کوئی لفظ میرے ذہن میں نہیں آتا۔ u i اور u: i میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ یہی الفاظ بعض اوقات ایک طرح اور بعض اوقات دوسری طرح بول دئے جاتے ہیں گویا یہ دونوں جڑواں مصوتے ایک طرح سے آزادانہ تغیر میں ہیں۔ بولنے میں سہولت کی خاطر u i کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مصوتوں کے برعکس جڑواں مصوتوں کی تعداد میں کوئی قطعیت نہیں۔ اردو کے بعض علاقوں اور بعض حضرات کے تلفظ میں کچھ اور بھی جڑواں مصوتے ہو سکتے ہیں لیکن کھڑی بولی کے علاقہ میں مندرجہ بالا جڑواں مصوتے ہی سننے میں آتے ہیں۔ یہ ظاہر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اردو میں ہندی کی نسبت جڑواں مصوتوں کا رواج کم ہے۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اردو کو زیادہ عزیز نہیں۔

کھیئی - کھاؤ - اَیجاؤ، کھوؤ - بر دِکھوا - تُلوا -

جڑواں مصوتوں میں سے ہیشتر غنائی شکل میں بھی ملتے ہیں۔ غنائیت جڑواں مصوتے کی ابتداء کے بعد بقیہ تمام جزو پر طاری رہتی ہے ذیل کے جڑواں مصوتے غنائی حالت میں ملتے ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱- | ãi | کھیئیں |
| ۲- | ãa | مالی ع گئیں اور آئیں چاندنی راتیں دیر و زن فعلن فعلن فعل فعولن ) |
| ۳- | ãã | ع آئیں بہت دنیا میں بہاریں |
| ۴- | ãẽ | ع کچھ گائیں کلیاں کر رہی تھیں |
| | | ع جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیسے کرے کوئی |
| ۵- | ãɲ | ع گیا لیجے چھوڑے گاؤں کا نام |
| | | ع پیتا ہوں دھوکے خسرو شیریں سخن کے پاؤں |
| ۶- | ãũ | ع پاؤں تجھے اک اک گن کر |
| ۷- | õi | روئیں |
| ۸- | õẽ | ع تنکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے |
| ۹- | õũ | ع یہاں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں |
| ۱۰- | ũi | ہوئیں |

۱۱۔ u:i چھوئیں

ان میں سے نمبر ۱۔ ۲ اور ۱۱ بہت کم لفظوں میں ملتے ہیں۔

جس طرح دو مصوتوں کے وصل سے جڑواں مصوتہ بن جاتا ہے اسی طرح ایک مصوتہ اور نیم مصوتہ [ د ] کا وصل بھی جڑواں مصوتے سے بالکل مماثل ہو جاتا ہے۔ اصلاً انھیں جڑواں مصوتہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ DIPHTHONG کے دونوں اجزاء مصوتہ ہوتے ہیں لیکن ذیل کی صورتوں میں نیم مصوتہ بھی وہی کام سرانجام دے رہا ہے۔ اس موقع پر صوتیاتی تحریر میں [ و ] کے لئے [ u ] کی بجائے [ w ] لکھنا زیادہ مناسب ہے۔

۱۔ i:w نیو ۲۔ iw شو

۳۔ ew دیو۔ ریوڑی ۴۔ aw دیشنو۔ مادھو

۵۔ ow باولا۔ آؤلا۔ سانولا ۶۔ ow سوڈ۔ اسٹوڈ

ذیل میں کچھ مصوتی خوشے مع مثالوں کے درج کئے جاتے ہیں تاکہ جڑواں مصوتہ اور مصوتی خوشے کا فرق کچھ اور واضح ہو سکے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| i:a | شیمہ | au: | شور۔ روف۔ رعونت |
| ia | اعادہ | ai: | آئینہ۔ آئی |
| ei: | کھیئی | ae | آئے |
| ea | میعاد | ao | آؤ |
| eo | کھیئو | au | ماؤف۔ کاؤس |
| eu: | جنیئو | na | سنّی۔ سلّی |
| Eə | واقعتاً | oi: | کوئی |
| Ea | جامعہ۔ واقعہ | oe | روئے |
| Ea | ریحان | oo | سوؤ |
| ai: | واقعی۔ سعید۔ گئی | oã: | روؤں |
| aə | معاً۔ تعلق | ui: | مُعین۔ ہوئی |
| ə a | سعادت۔ معاذاللہ | ue | ہوئے گی۔ پانی ہوئے گا |
| u ə | ہوا شافی | u a | معاشرت۔ معاہدہ |

u:e ہوئے گی u:ã سُنے روؤں۔ ہنسوؤں

جڑواں مصوتے سے بھی آگے TRIPHTHONG ہوتی ہے جس میں تین مصوتے اس طرح ادا کئے جاتے ہیں کہ وہ ایک جھٹکے میں ادا کئے جاتے ہیں اور مل کر ایک رکن ہوتے ہیں۔ ان میں جڑواں مصوتے کے برعکس یہ آزادی ہے کہ یہاں ابتدا اور انتہا میں تشبیب لیکن وسط میں ایک فراز ہوتا ہے جب کہ جڑواں مصوتے میں کم از کم اصولی حیثیت سے تشبیب و فراز نہیں ہونا چاہیئے۔ اردو میں کوئی سچا TRIPHTHONG دکھائی نہیں دیتا۔ ذیل میں چند ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جہاں کسی جڑواں مصوتے کے اردگرد کچھ مصوتے اور نیم مصوتے جمع ہو گئے ہیں:

| | |
|---|---|
| aiya | تیار |
| aiyu | ایوب۔ قیوم |
| auwa | اوّل |
| auwa | کوّا۔ قوّال |
| aiye | آیئے |
| aiyã | رعنائیاں |
| aiyo | بھائیو |
| oiye | روئیے |
| oiyã | چھ میگوئیاں |
| oiyõ | چھ میگوئیوں |
| u:iyã | سوئیاں |
| u:iyõ | خوشبوئیوں۔ جیلوجوئیوں۔ سوئیوں |
| uaiya | معیّن |
| awaiye | گوئیے۔ روئیے |
| awaiya | روئیہ۔ گوئیا |
| awaiyõ | گوئیوں |

# قومی اتحاد، آزادی سے پہلے

اس صدی کے شروع میں جب میں نے لکھنؤ میں ہوش سنبھالا تو دہرہ کے موقع پر مسلمانوں کی طرف سے برہمن کو پیادہ پر بٹھا کر شریت تقسیم ہوا کرتا تھا اور عشرۂ محرم کے دوران ہندوؤں کی طرف سے سبیل لگتی تھی۔ یہ ایک معمولی سی بات ہے لیکن نفسیاتی پہلو رکھتی ہے، ایک ذہنیت کا پتہ دیتی ہے یعنی ہندوستان کے خمیر میں رواداری ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان رام چندر جی کو بھگوان نہیں مانتے اور کربلا کا واقعہ ہمارے ملک میں نہیں ہوا لیکن مسلمانوں کو ہندوؤں کی اور ہندوؤں کو مسلمانوں کی دل جوئی مقصود تھی اس لئے یہ پیادہ اور سبیلیں لگتی تھیں۔ اتحاد اور ادغام کا فرق سمجھ لینا چاہیئے۔ ادغام میں جداگانہ ہستی باقی نہیں رہتی لیکن اتحاد میں جداگانہ وجود باقی رہ جاتا ہے۔ اس کو کثرت میں وحدت کہتے ہیں۔ قومی اعتبار سے ہم ایک ہیں لیکن زبانیں الگ ہیں، صوبے الگ ہیں، رسم و رواج بہت کچھ الگ ہیں، مذہب الگ ہیں پھر بھی یہ علیحدگی اس یک جہتی میں حائل نہ ہوتی تھی۔ ہندوستان میں یونانیوں کے آنے سے پہلے کا زمانہ تو عام طور پر زمانۂ قبل تاریخ سمجھا جاتا ہے پھر بھی بھگوان بدھ اور بھگوان مہابیر جین کے نام اس زمانہ سے پہلے کے ہیں۔ انھوں نے مروجہ ویدک دھرم کی بہت سی مدوجہ باتوں اور عقیدوں سے اختلاف کیا لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ بھگوان بدھ کی مورتی دلی کے لکشمی نارائن مندر میں موجود ہے اور خود بدھوں کے سیایان فرقہ پر ہندو دھرم کا بہت اثر تھا۔ اسی طرح امتداد زمانہ سے جینیوں اور ہندوؤں کے اختلافات بہت کم ہو گئے اور اب تو ان میں آپس میں شادی بیاہ بھی ہونے لگے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہندوستان میں ان کی آمد ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی لیکن عربوں کی آمد اس سے بہت پہلے کی ہے۔ کیونکہ دکھنی ہندوستان کے علاقہ سے اور عرب سے وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ اس لئے مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو اس وسیع ملک کے ایک حصہ کے لوگ عربوں سے مانوس ہو چکے تھے۔ اسی طرح آٹھویں صدی عیسوی میں جب پارسی ہندوستان میں آئے تو وہ بھی بالکل غیر کی طرح ہندوستان میں نہیں آئے کیونکہ صدیوں پہلے سے ایرانیوں کی آمد ہندوستان میں جاری تھی۔ عیسائیوں کے قافلے بھی ہندوستان میں یورپ سے بہت پہلے آ چکے تھے۔ جو عیسائیت ہندوستان میں مغربی ملکوں کے ذریعہ آئی وہ تو بہت بعد کی اور قدرے مختلف چیز تھی لیکن حضرت عیسیٰ کے وطن سے براہِ راست عیسائیت تو ہندوستان میں بہت پہلے آ چکی تھی۔ یہ میں نے ان مذہبوں کا ذکر کیا جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی زمانے تک تھے۔ سکھوں کا مذہب تو ہندوستان میں ہی پیدا ہوا اور گرونانک کا جو مشی پندرھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا اس نے سترھویں صدی عیسوی میں گورو گوبند سنگھ کے زمانے میں مذہب کی صورت اختیار کی اور یہ میرے ہوش کی بات ہے کہ پنجاب کے کھتریوں میں اکثر خاندان تو ایسے تھے

جو گھر میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے لڑکے کو تو سکھ بنا دیتے تھے باقی ہندو رہتے تھے۔ مطلب یہ کہ سکھوں اور ہندوؤں میں کوئی مغائرت نہ تھی۔ ایک دوسرے کے یہاں آزادی سے شادی بیاہ ہوتے تھے۔ اس اتحاد نے علاً کیا صورت اختیار کی اس کے چند نمونے عرض کرتا ہوں۔

جین اور بدھ دھرم کے عروج کے بعد جب دوبارہ ہندو دھرم کا عروج ہوا تو برہمن ورن دھرم کے زمانے میں تاریخ کی کتابوں میں ایسا آتا ہے کہ وہ ہندو اور بودھ دونوں عقیدے رکھتا تھا۔ اور آج ہندو دیہات میں یا اس کے لیڈروں میں اپنا کا جو بہت ذکر ہے یہ انھیں دونوں کا اثر سمجھنا چاہیے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے ایک زبردست مشترکہ تمدن کی بنیاد پڑی جس کا سب سے بڑا یا سب سے پہلا علمبردار حضرت امیر خسرو کو مانا جاتا ہے۔ سندھ میں مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں بسنے لگے تھے چنانچہ سندھی وہ زبان ہے جو سب سے پہلے خط نسخ میں لکھی گئی اور سندھ میں ایسے بہت سے صوفی ہوئے جنھوں نے حقانیت اور بھگتی کا پرچار کیا۔ آج تک سندھی بلا تفریق ہندو و مسلم ان صوفیوں کے گیت گاتے ہیں۔ پنجاب میں گیارھویں صدی سے مسلمانوں کا تسلط ہوا وہاں مشترکہ تمدن کا سب سے بڑا علم بردار بابا فریدالدین کے عہد میں پیدا ہوا۔ یہ گرونانک تھے جنھوں نے فرقہ بندی کے مقابلے میں اصول دین پر زور دیا۔ ان کی تلقین ہندوؤں میں بھی مقبول ہوئی اور مسلمانوں میں بھی۔ اس سے قبل ہی اثر پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھگتی اور نیک عمل کی تلقین کی۔ اگرچہ کٹر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کی مخالفت کی لیکن ان کا وہ کلام جس میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ اپدیش دیا کہ وہ مل جل کر رہیں فروعات پر زور نہ دیں بلکہ سب کے اصولوں کو نظر میں رکھیں اور ان کے مطابق عمل کریں، آج بھی زندہ ہے۔ اگرچہ سکھوں کی طرح پنتھ ایک علیحدہ ملت کی صورت میں قائم ہو گیا لیکن آج بھی دیہات اور شہروں میں لاکھوں ہندوستانی اس کے دوہے شوق سے گاتے ہیں اور جا بجا ہمیں یہ سنائی دیتا ہے کہ

بھرا کھڑا بزار میں سب کی مانگے خیر
نانکا ہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر

مغلوں کے دور میں اس اعتبار سے کبیر کا زمانہ زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ اکبر کے دربار میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب مذہبوں کے علماء جمع ہوتے تھے اور مذہبی بحثوں کی تشریح کرتے تھے۔ آئین اکبری کو پڑھیے تو اس سے وہ وسعت خیال ظاہر ہوتی ہے جسے انگریز مؤرخوں نے پوری طرح اُجاگر نہیں کیا ہے۔ راجپوت آرٹ میں جو مغل آرٹ کا رنگ نظر آتا ہے یہ سولھویں صدی عیسوی کے اس مشترکہ تمدن کا نشان سمجھنا چاہیے نہ صرف مصوری میں بلکہ موسیقی میں بھی یہی بات ہے۔ خیال کا گانا سینکڑوں برس سے ہندوستان کے پکے گانے میں شامل ہے۔ لفظ خیال عربی کا لفظ ہے جو فارسی سے ہوتا ہوا ہندوستان میں آیا۔ پکے گانے والوں کے خیال سے مختلف وہ خیال بازی ہے جو نیم تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہے جس میں موضوعات حاضرہ پر تک ملا کر شاعری کی جاتی ہے۔ اور ہزاروں انسان سننے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ یہ خیال کے اکھاڑے کہلاتے ہیں اور ان میں یہ کثرت ہندوؤں کے شاگرد مسلمان اور مسلمانوں کے شاگرد ہندو نظر آتے ہیں۔ ٹھمری کا گانا بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول ہوا۔ موسیقی کی اس صنف کا فروغ دربار اودھ میں نواب واجد علی شاہ کے دور میں ہوا۔ خود واجد علی شاہ ٹھمریاں کہتے تھے۔ چونکہ اختر تخلص کرتے تھے اس لئے انھوں نے ٹھمریوں میں اختر پیا کا نام ڈالا ہے۔ قدر پیا کے نام سے ٹھمریاں کہیں اس طرح دادرا بھی گانے کی وہ صنف ہے جس میں بیچ بیچ میں دوہے بھی ہوتے ہیں اور اشعار بھی۔ دلی میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں گانے کی کئی قسمیں ایسی نکلیں جو اب تک رائج ہیں۔ جیسے تان سین نے اکبر کے زمانے میں کئی راگ ایجاد کئے تھے یعنی جہاں تک موسیقی اور مصوری کا تعلق ہے یہ دونوں فن ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ باعث بھی ہوئے۔ آج بھی دیکھئے کہ قوالی کی محفلیں کتنی کامیاب ہوتی ہیں جن میں ہندو، مسلمان اسکے سب لطف لیتے ہیں اور رام رحیم کرشن کریم وغیرہ بے تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ کعبہ کا بھی ذکر آتا ہے اور بت خانہ کا بھی۔

جہاں تک لباس کا تعلق ہے نہ قدیم ہندوؤں کی پوشاک ہی اپنے اصلی روپ میں رہی اور نہ مسلمانوں کی ہی۔ اگر کچھ جو عام طور پر

اسلامی لباس سمجھا جاتا ہے۔ ہندی لفظ ہے جو انگ اور رکھا دونوں کا مرکب ہے۔ داڑھی رکھنا بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں رائج تھا کم از کم بزرگ تو دونوں ہی فرقوں میں داڑھی رکھتے تھے۔ ہندوؤں کی جو عظیم ہستی مسلمانوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ بھگوان کرشن کی تھی اور مسلمانوں کی جو عظیم ہستی ہندوؤں میں قابلِ احترام سمجھی گئی وہ حضرت حسین کی تھی۔ چناں چہ ظفر علی خاں، الہ یار خاں جوگی، حضرت جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، نواب سائل دہلوی، حضرت آغا شاعر سب نے کرشن جی پر نظمیں کہی ہیں اور ہندی میں تو نور رس خاں نامی پٹھان نے رس کھان کے نام سے ایسی نظمیں کرشن بھگتی پر لکھی ہیں جو دو سو برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد آج تک بڑے پریم سے گائی جاتی ہیں۔ اسی طرح حضرت حسین کی شان میں سلام کہنے والے ہندو بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ عشرۂ محرم کی مجلسوں میں اور چہلم کے موقع پر ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ غرضیکہ موسیقی ہو یا مصوری، غذا ہو یا پوشاک، تیوہار ہو یا تفریحات، ہمارے ملک میں سینکڑوں برس سے ایک مشترکہ تمدن چلا آتا ہے جو مختلف فرقوں کے بزرگوں اور اکابر کی میراث ہے اور جسے وقتی ہنگامے مٹا نہیں سکے۔

جہاں تک روزمرہ کے رہن سہن کا تعلق ہے محلوں میں آج سے پچاس سال پہلے یعنی پہلی جنگِ عظیم سے قبل تک جو بزرگ ہوتا تھا وہ سارے محلہ کے نوجوانوں اور لڑکوں کو اپنی ڈانٹ میں رکھتا تھا۔ ایک بوڑھے پنڈت جی اگر کسی مسلمان لڑکے کو ڈانٹ دیں تو کیا مجال کہ اس کے والدین زبان کھولیں یا اگر محلہ کے مولوی صاحب کسی ہندو لڑکے کی تادیب کریں تو اس کے ماتا پتا بھی انگلی نہیں اُٹھاتے تھے۔ البتہ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے دیہات اور پرانی بستیوں پر جو اثر اُن نوجوانوں کا پڑا جو دوسرے ملکوں یا مخصوص مغربی ملکوں سے واپس آئے اور جو وہاں کی زندگی کا نزدیکی پہلو دیکھ کر آئے اس سے سماجی زندگی پر اثر پڑا۔ مزا سکولوں میں ماسٹروں کا وہ رعب رہ گیا نہ محلوں میں بزرگوں کا اور نہ گھروں میں والدین کا۔ دوسری جنگِ عظیم نے اسے اور بھی کم کر دیا۔ اب قومی یک جہتی کی صورت شخصی اقتدار کی بنیاد پر نہیں رہی بلکہ سماجی زندگی کی صورت میں یعنی ۱۹۳۷ء میں جب مخلوط صوبوں میں قومی حکومتیں قائم ہوئیں تو ملے جلے پروگرام شروع ہوئے جس میں نسل، رنگ، مذہب وملت اور ذات پات کی کوئی تفریق نہ تھی مثلاً دیہات میں اگر تعمیری کام شروع ہوا تو اس میں اس دیہات کے رہنے والے بلا امتیاز شریک ہوتے تھے۔ شہروں کے کلچرل پروگرام میں بھی یہی بات تھی، کلب کی زندگی کا بھی یہی مقصد تھا۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کلچرل پروگرام اور کلب کی زندگی میں صرف بالائی طبقہ یا متوسط سے کچھ بلند درجے کا طبقہ شریک ہوتا تھا جبکہ ان گاؤں کی محفلوں میں جو کہ چوپالوں پر ہوتی تھیں بے پڑھے لکھے عوام جن کی ہندوستان میں اکثریت ہے کثرت سے شریک ہوتے تھے اور شریک ہوتے ہیں۔ موجودہ صدی میں جس ہستی نے سب سے زیادہ زور قومی اتحاد پر دیا وہ مہاتما گاندھی تھے۔ انھوں نے ایشور اللہ تیرے نام سب کو سنتی سے بھگوان کا نعرہ بلند کیا جسے لاکھوں کروڑوں انسانوں نے دہرایا۔ آج اگرچہ وہ ہستی ہمارے درمیان میں نہیں ہے لیکن اس کا یہ سبق کہ 'سروھرم سماھتو' یعنی تمام مذہبوں کی یکساں عزت کرو، ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ کبھی کبھی وہ دماغ کی کمی تہہ میں دب کر رہ جاتا ہے لیکن پھر اس کے نقش ابھرتے ہیں۔ تحریک خلافت اور کانگریس میں ستیہ گرہ کی تحریک دونوں کی بنیاد مہاتما گاندھی نے کی اور انھیں حلیف الخلافت کہا گیا۔ لکھنؤ میں وہ مولانا عبدالباری کے یہاں فرنگی محل میں ٹھہرتے تھے۔ تحریک کے دنوں میں جب وہ دورہ کرتے تھے تو ان کے ایک طرف مولانا محمد علی اور دوسری طرف مولانا شوکت علی ہوتے تھے۔ انھیں کے اثر کا یہ نتیجہ تھا کہ دلی میں جب گوکھلے سمیلن ہوا تو اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر دلی کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور لیڈر حکیم اجمل خاں صاحب تھے۔ انھیں کے پیروخاص پنڈت جواہر لال نہرو اور آچاریہ ونوبا بھاوے اپنے اپنے انداز میں اسی کا پرچار کر رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ سبق سیاسی میدان میں تو مہاتما گاندھی سے ملا لیکن ان کے والد ماجد پنڈت موتی لال نہرو نے گھر پر ہی انھیں ایسی ابتدائی تربیت دی کہ وہ ایکتا اور یک جہتی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

# غزل

کس قدر سوزِ تمنا ہے جواں پچھلے پہر
رقصِ احساس بھی ہے شعلہ بجاں پچھلے پہر

وقت تھمتا بھی نہیں اور گزرتا بھی نہیں
ہے عجب چیز جہانِ گذراں پچھلے پہر

لفظ و آواز کی سرحد سے گزر کر دیکھا
چاندنی رات بھی کرتی ہے فغاں پچھلے پہر

تڑپ اٹھتا ہے زمانہ مری خاموشی پر
عام ہوتی ہے محبت کی زباں پچھلے پہر

دھڑکنیں دل کی سناتی ہیں فسانہ تیرا
کس قدر ہے مرا احساس جواں پچھلے پہر

جیسے ہر ذرہ سلگتا ہے مرا دل بن کر
جیسے ہر چیز سے اٹھتا ہے دھواں پچھلے پہر

مل گیا مجھ کو مرے ذوقِ پرستش کا صلہ
مرے قدموں پہ ہے فرقِ دو جہاں پچھلے پہر

آ بھی جاؤ کہ سمجھ میں مری آجائے یہ راز
دل سے کیا کہتی ہے چشمِ نگراں پچھلے پہر

ہر تمنا کو ہے خوابوں کے جزیرے کی تلاش
قافلے جانبِ منزل ہیں رواں پچھلے پہر

روح میں تیرگیٔ یادوں کے نشتر حرمت
ہو گیا اور سوا درد نہاں پچھلے پہر

# حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان

حافظ عبدالرحمٰن احسان، شاہ عالم ثانی (۱۷۶۱تا۱۸۰۶ء) کے عہد کے ممتاز اور مسلّم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں شاہ عالم کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اور شاہ عالم ان کے علم و فضل اور شعری کمالات کے بے حد معترف تھے۔ ان کی بدیہہ گوئی اور نغز۔ گفتاری کا بڑا شہرہ تھا۔ لیکن یہ کے زمانے میں ان کے کلام کو وہ شہرت حاصل نہیں رہی جو ان کی زندگی میں تھی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کا دیوان چھپا نہیں اور اس کے مخطوطے عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کی شہرت کو، ان کے علم و فضل کی شہرت نے ماند کر دیا۔

احسان، دہلی کے ایک عالم اور متقی خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد میں اکثر حافظ قرآن، علم دین کے مستند عالم اور فقہ کے ماہر گزرے ہیں۔ ان کے والد کے بارے میں قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے :-

"پدرش بہ امامی حضور والا جزء امتیاز داشت و
بہ ورع و تقویٰ بقدر ہمت می گماشت" [1]

قاسم نے احسان کے والد کا نام نہیں لکھا، لیکن نساخ نے ان کا نام حافظ غلام رسول خاں بتایا ہے[2]۔ احسان قاسم کے نو عمر معاصرین میں سے تھے۔ منشی کریم الدین نے بھی اپنا تذکرہ ان کی زندگی میں لکھا تھا۔ اسی لئے بڑی عمر پائی اور شیفتہ کے زمانے تک بھی زندہ رہے۔ اس کے باوجود ان کے حالات کسی نے تفصیل سے نہیں لکھے۔ منشی کریم الدین ان کے حالات لکھتے ہوئے زیادہ تر ان کے علم و فضل اور شاہی دربار سے ان کے تعلّق کا ذکر کرتے ہیں۔ قاسم نے احسان کے آبا و اجداد کے علم و فضل کی تھوڑی سی تفصیل دی ہے ان کا سنہ ولادت قاسم یا کریم الدین کسی نے بھی نہیں لکھا۔ تاہم منشی کریم الدین کے ایک بیان سے ان کے سنہ ولادت کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ ۱۸۰۷ء میں احسان کے حالات لکھتے ہوئے وہ ان کی عمر اسّی برس بتاتے ہیں[3]۔ اس حساب سے ان کی ولادت کا سنہ ۱۷۲۷ء قرار پاتا ہے۔ قاسم کے تذکرہ کی ترتیب کے وقت (۱۸۲۲ء) میں ان کی عمر اڑتیس انتالیس برس کی تھی۔ چنانچہ قاسم نے ان کے بارے میں لکھا ہے :-

"جوانے است متین یا تمکین، خوش اخلاط،
کشادہ پیشانی سراپا محبّت، سرسبز مہربانی" [4]

احسان دہلی کے تین حکمرانوں، شاہ عالم ثانی اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے دربار سے متوسل رہے۔ لالہ سری رام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر شاہ کے دربار میں شاہ نصیر سے ان کے مطارحات بھی ہوتے تھے[5]۔ منشی کریم الدین کے بیان کے مطابق احسان نے شاہ عالم کے عہد سے شاعری شروع کی۔ "طبقات شعرائے ہند" کی ترتیب کے وقت تک ان کے علم و فضل اور شعری اکتسابات کی شہرت عروج کو پہنچ چکی تھی۔ وہ پایۂ تخت کے سربرآوردہ شعراء میں گنے جاتے تھے اور ان کے علم و فضل اور شعری کمالات کی بنا پر بادشاہ نے انھیں شہزادوں کا استاد مقرر کیا تھا۔ اس کے علاوہ

---

[1] مجموعہ نغز۔ ص ۱۸۱-۱۹ [2] سخن شعراء ص ۱۱

[3] طبقات شعرائے ہند ص ۳۵۶ [4] مجموعہ نغز۔ ص ۱۸-۱۹

[5] خمخانۂ جاوید، ج ۱ ص ۴۷۹؛

دہلی کے اکثر امرا اور شرفا بھی انھیں اپنا کلام دکھاتے تھے۔ کریم الدین کے بیان سے ہم کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ احسان شہر کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے تذکرہ کا اقتباس درج ذیل ہے :-

"یہ صاحب بڑے پرانے استادوں مسلم الثبوت
شاہ جہاں فرخندہ بنیاد اور عموں اور امیروں
اس شہر لطافت بحر سے شمار کئے جاتے ہیں۔" [1]

مفتی کریم الدین نے احسان کو شہزادوں کا استاد تو بتایا ہے لیکن شہزادوں کے نام نہیں لکھے۔ ناسخ نے ان کے شاگردوں میں شہزادہ مرزا فرخندہ بخت کا نام لکھا ہے۔ لالہ سری رام نے مرزا صابر اور مرزا ثابت کا انھیں استاد بتایا ہے [2] لیکن مرزا ثابت کا نام انھوں نے نہیں لکھا۔

مرزا ثابت کا نام معز الدین تھا اور وہ شاہ عالم کے چھوٹے فرزند تھے۔ وہ احسان کے شاگرد تھے اور ان کا دیوان انھوں نے ہی مرتب کیا تھا اس دیوان کے نسخے اب کیا کیا ہیں۔ میرے علم میں تین مخطوطات آ سکے ہیں، جن میں سے ایک سالار جنگ کے کتب خانہ (حیدرآباد) میں محفوظ ہے [3] دوسرا خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اور تیسرا انڈیا آفس کے کتب خانہ لندن میں [4] مرزا ثابت کے دیوان پر ایک بسیط دیباچہ بھی لکھا ہے، جو کئی اعتبارات سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے حافظ عبدالرحمٰن کی شاعرانہ صلاحیتوں پر بڑی عمدہ روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے شاہ عالم کی شعری محفلوں کے بارے میں بڑی اہم، دل چسپ اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

مرزا ثابت کا احسان سے تلمذ ایک دل چسپ سلسلۂ واقعات کا نتیجہ تھا۔ مرزا ثابت کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنا چاہتے تھے۔ انھیں اس بات کی ٹوہ تھی کہ ان کو کوئی ایسا استاد مل جائے جو شعر کے فن میں ماہر ہو اور مسلم الثبوت استاد کا درجہ رکھتا ہو۔ اپنے والد شاہ عالم کی شعر و سخن کی محفلوں میں وہ شریک ہوا کرتے تھے۔ شاہ عالم کی شعری محفلیں 'مجلس خاص' کے نام سے موسوم تھیں ان کی تفصیل مرزا ثابت نے یہ لکھی ہے کہ جب سب بھرائی دیوان عام سے سلام کر کے رخصت ہو جاتے تو شاہ عالم محل سرا میں جاتے اور کھانے سے فارغ ہو کر دیوان خاص میں استراحت کی غرض سے آتے۔ اس موقع پر کئی عمائدین اور حافظ عبدالرحمٰن احسان ہوتے۔ شاہ عالم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ جب وہ محفل خاص میں آتے اور کوئی شعر یا مصرعہ موزوں ہو جاتا تو حافظ عبدالرحمٰن کو سناتے بعض وقت صرف ایک مصرعہ موزوں ہو پاتا اور دوسرا مصرعہ فوراً ان کے ذہن میں نہ آتا تو حافظ عبدالرحمٰن سے دوسرا مصرعہ تلاش کرنے کی فرمائش کرتے۔ اس موقع پر حافظ عبدالرحمٰن جس سرعت کے ساتھ مصرعہ یا شعر موزوں کر لیتے، اس کے بارے میں مرزا ثابت لکھتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا گویا پہلے سے کہی ہوئی غزل کے شعر ہیں، جنھیں وہ سنا رہے ہیں۔ حافظ احسان کی اس سرعتِ فکر اور تحضر ذہنی سے شاہ عالم بہت متاثر تھے اور ان کا بڑا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ انھیں 'حافظ جیو' کہہ کر مخاطب کرتے اور اپنا استاد کہتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے شاہ عالم کو مرزا سودا کا شاگرد لکھا ہے، لیکن حافظ عبدالرحمٰن کی طرف انھوں نے یا کسی اور تذکرہ نگار نے اشارہ نہیں کیا۔ مرزا ثابت لکھتے ہیں کہ :- "اصلحضرت ایشاں را اُستاد خود میبفرمودند"۔

احسان سے مرزا ثابت کی ملاقات پہلی دفعہ اسی مجلس خاص میں ہوئی۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو تفصیلات لکھی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ فارسی اور اردو میں اچھی مہارت پیدا کر چکے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ مجلسِ خاص میں موجود تھے شاہ عالم نے ایک مصرعہ جو موزوں ہوا تھا پڑھا۔ مصرعہ یہ تھا :

صبح بھی لوسہ تو دیتا نہیں اے ماہ مجھے

دوسرا مصرعہ سوجھ نہیں رہا تھا۔ انھوں نے حافظ جیو سے مصرعۂ ثانی کی فرمائش کی۔ احسان نے فی البدیہہ مصرعہ پڑھا :

نا مناسب ہے میاں وقت سحر گاہ نہیں

مجلس میں اس وقت ابو محمد خاں داروغہ خاصہ، اور نور علی خاں، داروغہ توشکی خانہ بھی حاضر تھے۔ انھوں نے خوب داد و تحسین دی۔ لیکن مرزا ثابت اس مصرعے سے مطمئن نہیں ہوئے اور یہ اعتراض کیا کہ اس مصرعے میں "وقت" اور "گاہ" دونوں ہم معنی واقع ہوئے ہیں۔

---

[1] طبقات الشعرائے ہند ص ۳۵۶ [2] تحفۂ ناسخ ج ۱ ص ۱۵۱
[3] نمبر ۳۳ کلیات و دواوین [4] نمبر ۱۷۳۳ کیٹلاگ بلوم ہارٹ

یا کوئی محض "وقت" پڑھیے یا "گاہ"۔ احسان جیسا جہاں دیدہ اور آزمودہ کار شاعر، صاحب زادہ کی اس حرف گیری کا کیسے متحمل ہو سکتا تھا۔ انھوں نے تبسم کیا اور کہا ــــ "حضرت ابھی علم شعر سے نابلد ہیں اور یہ علم بغیر استاد کامل کی مدد کے حاصل ہونا دشوار بھی ہے۔" بادشاہ نے صاحب زادے کا اعتراض سن کر، حافظ جیو کی تائید کی اور فرمایا ــ "حافظ جیو اپنے وقت کے استاد ہیں بغیر جانے یہ لفظ نہیں کہہ سکتے۔" ثابت نے پھر اصرار کیا کہ یہ لفظ فارسی ہے جب تک ولایت کے کسی استاد نے نہ باندھا ہو، قابل اعتبار نہیں۔ احسان نے صاحب زادوں کو مطمئن کرنے کے لئے سند میں مرزا صائب کا یہ شعر پڑھا ؎

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردد

بادشاہ کو احسان کی استادی کا ایک اور ثبوت مل گیا۔ فرمایا ــ "ہم نہیں کہتے تھے کہ ان سے خطا نہیں ہو سکتی۔" لیکن مرزا ثابت بھی آسانی سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے عرض کیا "قبلہ عالم! یہ شاعر ہیں خود تصنیف کر کے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اگر دیوان صائب میں دیکھ لے تو غلام کو اعتبار آئے۔" اس ہٹ دھرمی پر بادشاہ منفعل ہوئے اور فرمایا۔ "جواب جاناں باشد خموشی"

دوسرے دن احسان جب مجلس خاص میں آئے تو جیانی گیلانی شاگرد اور اشرف قزوینی کے اشعار سند میں لکھ لائے اور صاحبزادے کو سنائے۔

ایک اور موقع پر بھی ایسی ہی صورت پیش آئی۔ شاہ عالم نے فارسی کا ایک مصرعہ موزوں کیا تھا۔ مجھے مرزا ثابت نے درج نہیں کیا ہے جب احسان سے دوسرا مصرع کہنے کی فرمائش کی تو انھوں نے فی البدیہہ یہ مصرعہ پڑھا :-

نہ کردم عشق کس ہرگز چو من عاشق منم یا شم

اس مصرعہ میں بھی استادانہ نکتہ تھا اور مرزا ثابت نے اُسے تاڑ لیا۔ "مجھ سے حافظ جی کے کان میں کہا۔" لفظ عاشق میں اضافت کیوں حذف کر دی۔" احسان نے پھر استادانہ شان دکھائی اور جواب دیا۔ "میں نے درست کہا ہے۔" اور مرزا صائب کے تین شعر فوراً سند میں پڑھ دئے۔ اب کی بار ثابت بھی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے اور کہا "استادی ایسے ہی کو سزاوار ہے جو اساتذہ کے کلام کا اس قدر منبع ہو۔" اب احسان کے لئے استادی کا نکتہ بتانے کا موقع آ گیا تھا۔ انھوں نے کہا۔ "یہ درست ہے اور اگر چہ میں نے بھی کہا ہے اور صائب جیسے زبردست شاعر کی سند موجود ہے، لیکن میرے نزدیک بغیر اضافت کے ایسے اشعار رتبۂ فصاحت سے گرے ہوئے ہیں۔"

اسی مجلس خاص سے متعلق حافظ جیو کے مستعد دماغ کا ایک اور واقعہ بھی مرزا ثابت نے بیان کیا ہے۔ بادشاہ نے یہ مصرعہ فارسی میں موزوں فرمایا تھا "خدایا ندارم سوا تو کسے را" لیکن 'سوا تو' کی ترکیب پر اہل شبہ تھا۔ استاد سے پوچھا "سوا تو" درست ہے یا نہیں۔ دوسرے لوگ جو حاضر تھے، کہنے لگے۔ "لفظ "سوا تو" صحیح ہے"۔ اس پر بادشاہ نے فرمایا۔ "میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔" حافظ جیو نے کہا۔ "پیر و مرشد درست ہے۔" سند میں شاتی نکلو کا یہ شعر پڑھا :-

من جاں ندہم بکس سوا تو
تو دل نہ دہی بکس سوا من

صاحبزادہ کی طرف سے اس پر جو اعتراض ہو سکتا تھا وہ ان کے ذہن میں تھا، چنانچہ مرزا ثابت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اگرچہ یہ بھی درست ہے لیکن میرے خیال میں فصاحت سے بعید ہے۔"

حافظ جیو کی طبیعت کے اس استحضار نے مرزا ثابت کو اتنا متاثر کیا کہ وہ احسان کی شاگردی اختیار کرنے پر مائل ہو گئے اور ان سے کہا :-

"دلِ من خواہد کہ شعر فارسی در پختہ ہر دو گفتہ باشم"

فارسی شاعری کا ذوق اب تک اگلے زمانے کی یادگار کے طور پر باقی تھا، لیکن احسان یہ جانتے تھے کہ اب فارسی کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے اور اردو سرعت سے آگے بڑھ رہی ہے اور فارسی کی جگہ لے رہی ہے انھوں نے فرمایا :-

از ہندہ فارسی برآمدن خیلے دشوار است۔ اشعار پختہ فرمودہ باشند کہ غزل پختہ اگر خوب باشد بہتر از فارسی است۔"

لالہ سری رام نے احسان کے اس قول کا آخری حصہ نقل کیا ہے لیکن مرزا ثابت کا تذکرہ نہیں کیا۔

مرزا ثابت نے بھی بیہم مشق سخن سے استادی کا درجہ حاصل کر لیا تھا، اس کے باوجود احسان کے شعری کمالات کے وہ ہمیشہ معترف رہے چنانچہ لکھتے ہیں :-

" حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان، استاد ایں احقر العباد بنائے ریختہ آنچناں ریختہ انداز کہ روبروے ریختہ ایشاں، ریختہ کے ریختہ گو پسند خاطر فی آید۔ ہاں شیریں سخن را اگر خسرو اقلیم فصاحت و بلاغت تخیم روا ست چوں مملکت سخن سخن زیز گیں دارد۔"

ثابت کے ان جذبات استحسان و تشکر کی صدائے بازگشت ہم کو احسان کی ایک غزل میں سنائی دیتی ہے۔ ان کا شعر ہے :

غزل نہ کیونکر پڑھوں دوسری کہ اے احسان
محرک آج ہے ثابت سا ہمسر یاں میرا

احسان کے علم و فضل کا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ کریم الدین لکھتے ہیں :-

" نظر تحقیق الفاظ کی کتب درسیہ فارسی اور کچھ عربی پر طاری ہے۔" [1]

مرزا محمد الدین ثابت نے مجلس خاص کے جو واقعات ہم پہنچائے ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ احسان پڑھے حافظ و غ شاعر تھے اور اساتذہ کے بیسیوں شعر انھیں یاد تھے۔ اس کے علاوہ فن شعر پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ اسی لئے شاہ عالم ان سے اتنے مرعوب تھے کہ ان کے ہر لکھے کو سند کا درجہ دیتے تھے۔

قاسم نے احسان کی ملازمت کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی ہے، صرف اتنا لکھا ہے کہ :-

" در سلک ملازمت پایۂ تخت منسلک است۔"

شاہ عالم کے دربار سے ان کے لئے مشاہرہ مقرر تھا۔ ایک دو موقعوں پر جب مشاہرہ بروقت ایصال نہ ہو سکا تو انھوں نے قطعات

[1] طبقات ص ۳۵۶

لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ ایک قطعہ کے شعر ہیں :

عید ہا ہی و عیدِ دل شاہا — خوب ہے اور کچھ نہیں معیوب
جال ہوں اور شکار کھپی کا — لیتے ڈوبے کا ہے نکالا خوب
قطب صاحب تھے جب حضور گئے — وہ دو ماہہ مُجھے ہے میرا ڈوب
اس کو بھی حکم ہو تو مل آئے — میرکب تک ہو میں نہیں ایوب [2]

احسان کے ایک قطعہ سے ہم کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ بعض خانگی دشواریوں کی وجہ سے انھیں قلعہ سے موقوف کر دیا گیا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے ایک قطعہ لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔ جس کا اقتباس لالہ سری رام نے دیا ہے۔

احسان کا تعلق شہزادہ ابوبخش کی سرکار سے بھی رہا۔ چنانچہ منشی کریم الدین اور شیفتہ دونوں نے اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کئی سال شہزادہ کی سرکار میں مختاری کے کام پر مامور رہے [3] مرزا ابوبخش فرخندہ بخت کے خطاب سے مخاطب اور مرزا نیلی بخش کے لقب سے مشہور تھے۔ احسان کے دیوان میں ایک دو غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں، جن میں شہزادہ کی مدح کی گئی ہے۔ ایک غزل کے شعر ہیں :-

درۃ التاج شہنشاہ فخر زماں ابوبخش
فخر ہے فخر تری مدح سرائی مجھ کو
جس گھڑی ہو ہے گہر ریز ترا دستِ کرم
ہاتھ پھیلا کے کہے حاتم طائی مجھ کو
ہے یہی دولت عظمیٰ کہ میرے ہووے نصیب
در دولت کی ترے ناصیہ سائی مجھ کو

ایک اور غزل میں شہزادہ کے لئے دعا کی ہے :

میرزا نیلی مقصود سپہر نیلی
تجھ کو سرسبز رکھے خالق علام مدام
وجہ اس نام کے رکھنے کا یہ ہے تاکہ تنہا
نیل چشم بداعدا رہے یہ نام مدام

لالہ سری رام نے احسان کے اس قطعہ کا بھی ذکر کیا ہے، جو تنخواہ کی طلب میں اسی زمین میں لکھا گیا تھا جس میں غالب کا مشہور قطعہ لکھا گیا ہے۔

[2] خمخانۂ ج ۱ - ص ۱۵ [3] گلشن بے خار ص ۱۵

تنخواہ کی طلب میں لکھے ہوئے قطعوں اور غزل میں مدح سرائی کے انداز کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احسان کے یہاں غالب کے نقوشِ اوّل دستیاب ہوتے ہیں۔ احسان نے طویل عمر پائی تھی اور غالب نے ان کے عروج کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ احسان اور غالب دونوں کو فارسی سے گہرا لگاؤ تھا اور جہاں تک وقیعۃ سخنی کا تعلق ہے دونوں کی طبیعتوں میں بڑی یگانگت پائی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر غالب، احسان کے مخصوص اندازِ فکر سے متاثر ہوئے ہوں اور یہ اثر پذیری یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ غالب کے دیوان میں بعض غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں جو احسان کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ ذیل میں احسان کی ایک غزل کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جس کی زمین میں غالب نے دو غزلہ کہا ہے:

ہم بھی جب مضطر سبھی تھے، پھر جہاں سیماب تھا
خانہ زادِ اضطراب خاطرِ بے تاب تھا
شب عجب تھی تاب اس جلگنی کی جس کے سامنے
ماہِ عالم تاب بھی اک کرمک شب تاب تھا

احسان کے سارے علم و فضل اور شعری کمالات کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ دل سے زیادہ دماغ سے شاعری کرتے تھے۔ اپنے شعری کمالات کو ظاہر کرنے کی دھن میں وہ صنعتوں کے باندھنے اور لفظی رعایتوں کی نگہداشت کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے۔ کریم الدین اور شیفتہ نے ان کی شاعری کی اس خصوصیت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ صنعت تجنیس، اشتقاق اور شبہ اشتقاق اور تکرار صوتی کے وہ دل دادہ تھے۔ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہو سکے گا:۔

لب بلب لب سے ترے جب لب ہمیا نہ ہوا
جاں بلب تو ہی مجھے کہہ میں ہوا یا نہ ہوا
میں تجھ بغیر جب ہم ہلا ہل کو پی گیا
جم جم تو جی کہ ہاں ترے باعث سے جی گیا
کہیں کام ہیں وہ تو خود کام ہوگا — یہاں کام آخر ہے واں کام ہوگا
کہتے ہیں دوست مجھ کو دشمن کمت اب پڑھ تو
پیدا کروں ولیکن پڑھنے کی تاب کیوں کر

لفظی صنعت گری اور شاعرانہ رکھ رکھاؤ سے قطع نظر احسان کے کلام میں ایسی جاندار خصوصیتیں کم ملتی ہیں جو حیاتِ دوام عطا کر سکیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی فکر کے سادہ انداز کو دیکھ کر دہلی کے اساتذۂ قدیم کے کلام کا لطف آجاتا ہے۔ مثال کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

پہنچی کو ہاتھ پر رکھ کر بہ نزاکت بولے
ہاتھ ٹوٹے نہ مرے ہاتھ کو اکثر توڑا
قدم قدم کی ترے جب تلک ہے دم میں دم
میں پاؤں پر سے ترے سر نہیں اٹھانے کا
بے تابی سے جوں موجہ سیماب نہ ٹھہرا
ایک جا مجھ سے عاشقِ بے تاب نہ ٹھہرا
گلی میں جاتے ہو تم اس پری کے اے احسان
گلے میں آپ کے لازم ہے مشفقا، تعویذ

احسان کے دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں، جن میں غزل کی رمزیت اور رسمیت سے ہٹ کر انھوں نے خود اپنی ذاتی واردانوں کو سمویا ہے۔ ایک شعر میں اپنے سارے تقدس اور زہد و تقویٰ کو بالائے طاق رکھ کر اپنے بقال پسر کو پیغام بھیجتے ہیں:

ہمسہ دو بقال پسر سے کہ میرا دل لے کر
قصد اخذ دل اغیار نہ ہاں کیجیے گا

ایک دفعہ وہ لکھنؤ بھی گئے تھے لیکن لکھنؤ کی فضا ان کو بالکل پسند نہ آئی۔ لکھتے ہیں:۔

شہرہ ہے لکھنؤ کا لیکن تو خدا کا اللہ
مومن جو وہاں ہیں ان کو کفر نہاں میں دیکھا

دلّی سے انھیں فطرتاً محبت تھی۔ دوسرے شعر میں وہ دلّی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

دلّی کے ہندوؤں میں ہیں اہلِ دل ہزاروں
دلّی سا شہر کس نے ہندوستاں میں دیکھا

اپنے مخصوص انداز میں ایک اور شعر میں بھی انھوں نے دلّی کی طرف اشارہ کیا ہے:

دل سے دل پاس ہیں تو بھی ہے دلوں کی خواہش
کیا دلوں کی کہیں دلّی میں وکاں کیجیے گا

اس غزل کا ایک اور شعر ہے :

یار جب ساتھ سفر میں ہو کہاں کے روزے
روز روزوں ہی میں عید رمضاں کیجئے گا

ایک 'طفل ہرکی' کا ذکر بھی ان کی ایک غزل میں آتا ہے جسے رمزیت کے پردے میں چھپانے کی گنجائش نہیں ہے - شعر ہے :

اس طفل ہرکن کی محبت میں دوستو
حاصل خراش دل مجھے مثل عگیس ہوا

احسان کی طبیعت کی روانی میں شبہ نہیں - ان کے دیوان میں اکثر غزلیں طول طویل ہیں - دیوان کی پہلی غزل پندرہ شعر کی ہے - دو غزلہ سہ غزلہ کہنے میں شاہ نصیر کو ایک خصوصیت سی حاصل ہو گئی تھی - احسان ان کے معاصر تھے اور وہ بھی اکثر دو غزلہ لکھتے تھے -

احسان نے کچھ مثنویاں بھی لکھی تھیں - ان کی طویل مثنوی 'یوسف زلیخا' کا تذکرہ لالہ سری رام نے کیا ہے - اس کے علاوہ دو مختصر مثنویاں ان کے کلیات میں شامل ہیں - ان میں سے ایک مثنوی، احسان نے اپنے استاد محمد مرتضیٰ کے انتقال پر لکھی تھی - محمد مرتضیٰ بڑے اچھے عالم تھے اور خاص طور پر ریاضی میں مہارت رکھتے تھے - احسان کو ان سے گہرا تعلق خاطر تھا جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوگا :

اے چرخ فتنہ گر یہ ستم تو نے کیا کیا
رنج و غم و الم کا مجھے مبتلا کیا
میرا چراغ دل کا ستم گر بجھا دیا
داغ فراق مولوی مرتضیٰ دیا
وہ یادگار دورۂ ماضی کہاں گیا
ملا سے باغ علم ریاضی کہاں گیا
وہ عالم و محدث و حافظ کدھر ہے آہ
کس طرح کھینچوں آہ کہ بیٹھا جگر ہے آہ

آخر میں وفات کی تاریخ "یوم الوفات ان کا ہے پہلی وفات کی" سے نکالی ہے - دوسری مثنوی میں میر محمد خاں سرور کے "تذکرہ سرور" کی تاریخ ترتیب لکھی ہے - یہ مثنوی ڈاکٹر شیشہ شوکت بلگرامی نے شاہ کالج، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن نے اپنے اس مختصر مضمون میں نقل کر دی ہے، جو تذکرہ سرور کی تاریخ کی بحث کے سلسلے کے مضامین میں 'ہماری زبان' میں شائع ہوا ہے کلیات میں شاہ عالم کے تخت طاؤس کی تاریخ کا ایک فارسی قطعہ بھی شامل ہے جس میں 'سریر شہنشاہ یادین و داد' سے تاریخ نکالی گئی ہے -

احسان کے خاندان میں ان کے دو پوتوں اور ان کے فرزندوں کا حال لالہ سری رام نے لکھا ہے ان میں سے ابوالحسن خاں مرلی میں منصف کے عہدہ پر مامور تھے اور لالہ سری رام کے دوست تھے -

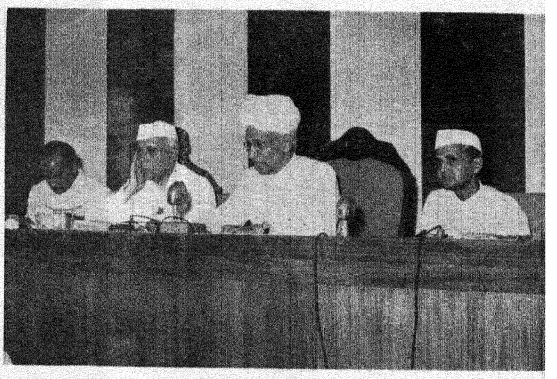
احسان کے شاگردوں کی تعداد کثیر بتائی جاتی ہے، لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جن کے حالات اب دستیاب ہو سکتے ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے شاگردوں میں عموماً شہزادے اور امراء شامل تھے - ان میں اکثر شاعر کی حیثیت سے شہرت نہ پا سکے - مرزا ثابت اور مرزا ایزد بخش کے علاوہ مرزا قادر بخش نے بھی شہرت پائی - وہ ایک تذکرہ 'گلستان سخن' کے مؤلف تھے - احسان کے انتقال کی انھوں نے حسب ذیل تاریخ کہی تھی :

عین ہنگام الم میں صابر دل گیر نے
اپنے دل کو تھام کر یا صدغم و یا صد بکا
کی رقم اس معدن احساں کی تاریخ وفات
دل گیا بیٹھ آہ جب عالم سے احساں اٹھ گیا (۱۲۶۷ھ)

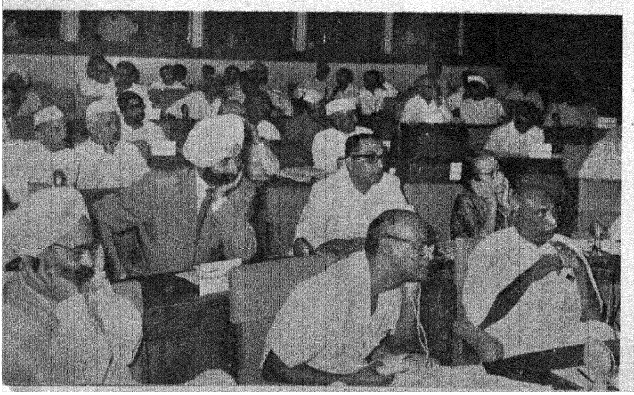
# دلّی میں قومی یک جہتی کانفرنس



اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر ہیمر شولڈ
جن کا ہوائی جہاز کے حادثہ میں انتقال ہوگیا

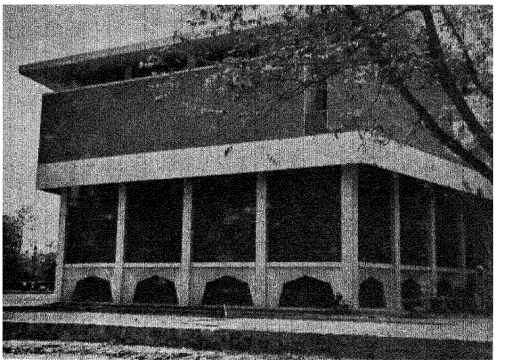


نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن
کانفرنس کا افتتاح فرما رہے ہیں

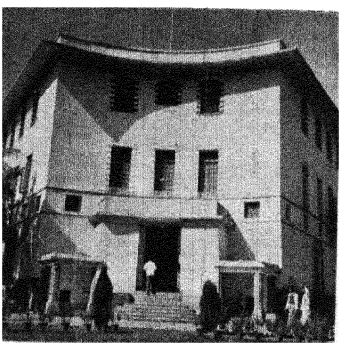


کانفرنس کا ایک منظر

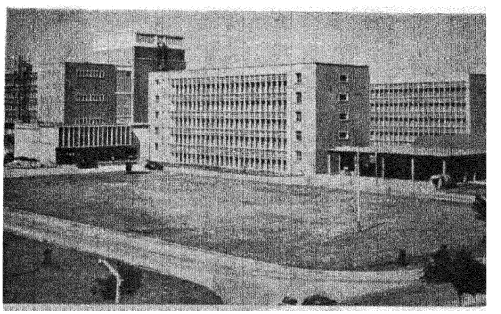
# دلّی کی چند



راجندر بھون

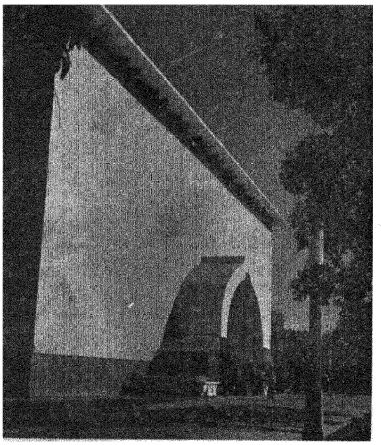


آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ
کرافٹس سوسائٹی کی عمارت



آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز
کی عمارت

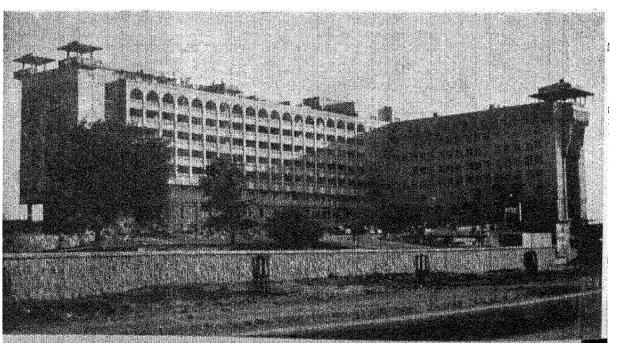
# جدید عمارتیں



وگیان بھون



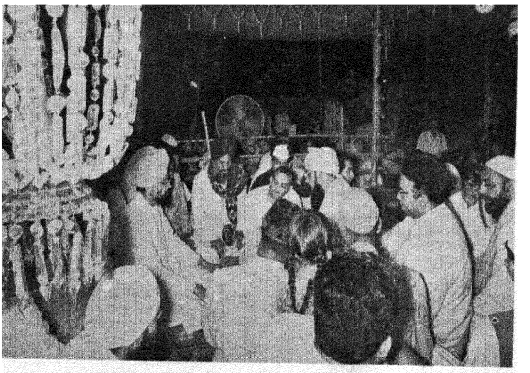
یوجنا بھون



شوک ہوٹل

# عُرس

## حضرت خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ



فاتحہ خوانی



قوالوں کی ایک پارٹی



سامعین

# نفرت

## کردار

انیسہ - ایک خوب صورت اور تیز مزاج لڑکی
صفیہ - صورت شکل معمولی مگر بہت تیز طرار
طاہر - خوش شکل، محنتی سا لڑکا۔ مگر بہت چالاک بننے کی کوشش میں مصروف۔
دادی - عام دادیوں کی طرح۔
بچوٹے خالو - جیسے کہ چھوٹے خالو حضرات ہوا کرتے ہیں

— متوسط طبقے کا ایک معمولی سا کمرہ جو معمولی سے ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ نیچے فرش پر چاندنی بچھی ہے اور وہاں چاروں طرف کپڑے پھیلائے انیسہ مشین سے سینے میں مصروف ہے۔ اس کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے صفیہ بیٹھی دوپٹے پر گوٹا ٹانک رہی ہے۔ تخت پر دادی پاندان کھولے بیٹھی ہیں اور چھالیہ کاٹ رہی ہیں۔ ان کے سامنے کرسی پر طاہر بیٹھا کتاب کے مطالعے میں مصروف ہے مگر اس کا دھیان لڑکیوں کی طرف ہے —

انیسہ - اب کی بازار گئی تو ایسا ہی نائیلون کا ایک دوپٹہ ضرور لاؤں گی۔

صفیہ - مگر بہت مہنگا ملا۔ پانچ روپے گز سے کم تو کوئی دیتا ہی نہیں۔

انیسہ - پانچ روپے — ہ اوہ — پھر تو ایسے دوپٹے کی حسرت دل میں لئے مر جاؤں گی

دادی - (تھالی میں سروتا رکھ کر) ذرا مجھے دکھانا وہ پانچ روپے گز کا کپڑا

(صفیہ بڑی احتیاط سے دادی کو دوپٹہ دکھاتی ہے — طاہر بھی بڑے غور سے دیکھتا ہے)

دادی - (پاندان میں سے عینک نکال کر لگاتی ہیں) ہونہہ - یہ تو وہی کتے کا کفن پانچ روپے گز! میں سمجھی ڈھاکے کی ململ ہے۔

صفیہ - دادی یہ نائیلون جالی ہے۔ امریکن کپڑے کو آپ کتے کا کفن کہہ رہی ہیں!

دادی - یہ امریکا ویریکا تو میں جانتی نہیں مگر پانچ روپے گز تو بہت ہنسکا پڑا۔ ہمارے زمانے میں تو پانچ روپے میں ریشمی جوڑا بنا کرتا تھا۔

انیسہ - (غصہ میں) بنتا ہوگا۔ آپ کو تو کبھی کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی۔ ہر چیز مہنگی لگتی ہے۔

دادی - تو میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم بچا کر سو روپے گز کا کپڑا پہنو میں کون ہوں بیچ میں بولنے والی؟ (غصہ میں پاندان بند کر کے پیچھے کو ڈھکیل دیتی ہیں) باپ بچارا تین سو روپئے کماتا ہے اور بٹیا پانچ روپے گز کا دوپٹہ اوڑھے گی۔

انیسہ - دیکھیئے کہ، آپ سے تو بات کرنا مصیبت ہے۔ طعن تشنیع شروع کر دیتی ہیں۔

صفیہ۔ دادی آج کل اسی کپڑے کا فیشن ہے۔ کالج میں بھی لڑکیاں ایسے دو پٹے خرید رہی ہیں۔

دادی۔ آگ لگے تمھارے فیشن کو بی بی۔ جس دن سے یہ مُوا فیشی شروع ہوا ہے۔ ہر چیز پر آگ برسنے لگی ہے۔ لڑکیوں کو پڑھانے کا فیشن ہے۔ ننگے سر بازاروں میں گھومنے کا فیشن ہے اور اب یہ مُوا مکڑی کا جالا پہننے کا فیشن ہے کہ سر ڈھکے نہ تن۔

طاہر۔ انیسہ کو ایک دوپٹہ منگوا دیجئے نا دادی، میں نے صابرہ اور شاہدہ کو بھی ویسے ہی دو پٹے لاکر دئے ہیں۔

انیسہ اور صفیہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتی ہیں)

دادی۔ (ناگواری سے) تمھاری برابری کون کر سکتا ہے میاں۔ تمھاری سی آمدنی کس کے ہاں آتی ہے۔

(یہ سن کر طاہر بڑی طمانیت سے مسکراتا ہے)

انیسہ۔ اور ہاں کتاب پڑھ چکو تو مجھے دے کر جانا۔

طاہر۔ میں الماری میں رکھ جاؤں گا۔

انیسہ۔ نہیں جناب۔ آپ مجھے دے کر جائیے۔ اس دن بھی آپ کہہ گئے تھے کہ کتاب الماری میں رکھے جا رہا ہوں۔ مگر کہیں نہ ملی۔ آخر ایک ہفتے تک پیدل کالج جانا پڑا تو اس کتاب کی قیمت چکائی۔

طاہر۔ (افسوس کے ساتھ) ارے چچ چچ۔ چچ چچ۔ آخر وہ کتاب کہاں کھو گئی؟

دادی۔ جاتی کہاں؟ وہیں چلی گئی۔ جہاں اس سے پہلے میرے دس روپے گئے تھے۔ احمد کا کوٹ گیا، انیسہ کا قلم گیا۔ ایک چیز ہو تو گنوائی جائے۔ چوروں کو بھلے لچھے تو اسی جگ میں دیکھا۔

طاہر۔ تعجب ہے۔ ایسا دلیر کون ہو سکتا ہے۔ جو سب کے سامنے سے چیزیں اٹھا کر لے جاتا ہے۔

انیسہ۔ میں تو اب تک جانے کتنی بار لکھ لیتی مگر دادی کو ہمیشہ رحم آجاتا ہے۔

طاہر۔ (خوشی ہوکر) دادی بچاری کتنی رحم دل ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج کل کی تعلیم انسان کو بے رحم اور دہریہ بناتی ہے۔

صفیہ۔ شاید اسی لئے آپ نے میٹرک سے آگے نہیں پڑھا کہ بے رحم نہ ہو جائیں۔

انیسہ۔ بلکہ میٹرک پاس کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

صفیہ۔ سُنا ہے شاعری نے بھی طاہر بھائی کو بڑا روینٹک بنا لیا ہے۔

انیسہ۔ اسی لئے تو طاہر بھائی کو جون کی دوپہر اور کوّے کی آواز بہت پسند ہے۔

صفیہ۔ اچھا طاہر بھائی سچ سچ بتائیے آپ نے شاعری کیوں شروع کی؟

طاہر۔ (جھینپ کر) ارے چھوڑیئے اس ذکر کو۔ یہ ایک راز ہے راز ہی رہنے دیجئے۔

صفیہ۔ (ہنستی ہے) مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی گرلفرینڈ ہو گئی ہے یعنی آپ کو کسی نے شاعر بنا دیا ہے

طاہر۔ (مسکرا کے انیسہ کی طرف دیکھتا ہے) شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔

(انیسہ جلدی سے سر جھکا کر مشین چلانے لگتی ہے)

صفیہ۔ اچھا تو طاہر صاحب! کچھ اتہ پتہ تو بتائیے کہ آپ کو کس نے چرایا ہے۔

انیسہ۔ کوئی قلاش ہوگا جس نے طاہر بھائی کو چرایا۔

طاہر۔ (اداسی کے ساتھ) ہاں شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھ جیسے بے روزگار مفلس کو کون چرائے گا۔

صفیہ۔ واہ۔ آپ بے روزگار کیوں ہوتے۔ آپ تو کہتے ہیں کہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بہت بڑا بزنس ہے۔

طاہر۔ (سنبھل کر) جی ہاں وہ تو ہے ہی مگر بات یہ ہے کہ میں نے اس دن اپنے کاروبار کے بارے میں یوں ہی کچھ بڑھا چڑھا کر کہہ دیا تھا۔

انیسہ۔ معاف کیجئے گا طاہر بھائی آپ اکثر باتیں یوں ہی کہہ دیتے ہیں ایک دن آپ کہہ رہے تھے کہ کالج کی ہزار دو لڑکیاں آپ پر مرتی ہیں۔ اس دن فرما رہے تھے کہ عنقریب کار خرید لیں گے۔

اور پھر شادی کر کے ہنی مون منانے کشمیر جا رہے ہیں اور ابھی بتا رہے تھے کہ ہیرو اور شرٹ کے لئے ٹائیوں کے دو پیٹے لائے ہیں۔

طاہر۔ (سٹپٹا کر) جی ہاں۔ وہ بات یہ ہے کہ — ابھی میں نے صفیہ صاحبہ سے کہا تا کہ آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ یا پھر یہ کہ آپ مجھے جاننا ہی نہیں چاہتیں۔

انیسہ۔ جیسے مجھے دنیا کا کوئی کام ہی نہیں کہ بیٹھی فضول باتوں میں سر کھپاؤں۔

طاہر۔ خیر، تو اب ہم چلتے ہیں۔ وہ میرا سوٹ کیس کہاں گیا — ؟ یہ آپ کی کتاب یہاں رکھ دی ہے (کتاب میز پر رکھ کر سوٹ کیس اٹھاتا ہے)

دادی۔ یہ سوٹ کیس تمہیں کہاں سے مل گیا۔ دیکھوں بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔

طاہر۔ ملتا کہاں سے؟ آپ بھی سمجھتی ہیں کہ میں کہیں سے چرا کر لایا ہوں؟ ابھی ابھی دس روپے میں خریدا ہے۔

صفیہ۔ دس روپے میں — ! دس روپے میں کہیں سوٹ کیس ملتا ہے؟

طاہر۔ تو اور کتنے میں ملتا ہے؟ آپ کیا تیس روپے میں خریدیں گی؟

انیسہ۔ (مسکرا کر) میرے خیال میں تو — طاہر بھائی نے یہ خریدا نہیں ہے بلکہ — بلکہ —

طاہر۔ (جلدی سے اس کی بات پوری کرتا ہے) بلکہ کہیں سے چرایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے لئے آپ کے دل میں اتنا زہر کیسے بھر گیا ہے؟

صفیہ۔ جبکہ آپ کے دل میں انیسہ کے لئے شکر ہی شکر بھری ہوئی ہے۔

دادی۔ (غصہ میں، انیسہ میں نے تم سے کئی بار کہا کہ اپنی زبان قابو میں رکھا کرو۔

انیسہ۔ اچھا بھئی، اب کبھی طاہر بھائی کے بیچ میں بولوں تو زبان کاٹ لینا بس؟

طاہر۔ (گھبرا کر) لیجئے، اب بگڑ گئیں۔ دیکھا دادی!

دادی۔ بگڑنے دو۔ کوئی بڑے بھائیوں سے ایسا مذاق کرتا ہے۔ ہاں تو میاں! اگر تم پچ پچ دس روپے میں یہ سوٹ کیس لائے ہو تو مجھے دے دو۔ میں انیسہ کے جہیز میں دوں گی۔

طاہر۔ انیسہ کے لئے جہیز کی کیا ضرورت ہے دادی! یہ تو یوں ہی بہت قیمتی ہیں۔

دادی۔ ارے بیٹا آج کل صورت شکل کون دیکھتا ہے۔ ایک لڑکا دو سو روپے کا نوکر ہے اور پانچ ہزار روپے جہیز مانگ رہے ہیں۔

طاہر۔ صرف دو سو! آپ کی قسم دادی۔ تین چار سو روپے تو میں خود ہی کما لیتا ہوں۔ وہ تو ہمارے گھر کا کچھ سسٹم ہی بگڑا ہوا ہے کہ ایسی بدنظمی پھیلی رہتی ہے۔ اگر انیسہ جیسی کوئی سلیقہ مند لڑکی آ جائے تو سال بھر میں ہم مکان خرید ڈالیں۔

انیسہ۔ (اٹھلائی غصہ میں) بس جناب میرا نام بار بار مت لیجئے۔

طاہر۔ جی بہت اچھا۔ میں خود بھی احتیاط کرتا ہوں کہ آپ کا نام بار بار زبان پر نہ آئے۔ تو دادی اب میں جاتا ہوں۔

دادی۔ مگر سوٹ کیس کہاں لئے جا رہے ہو۔ یہ میں نے خریدا ہے میں ابھی قیمت دیتی ہوں۔

طاہر۔ دیکھئے بات یہ ہے کہ میں اسے شاہدہ کے لئے لایا ہوں۔ اگر سوٹ کیس لے کر نہ گیا تو وہ خفا ہو جائے گی۔

دادی۔ میں کچھ نہ سنوں گی۔ انیسہ بیٹی ذرا میری پٹاری میں سے دس روپے تو لا دینا۔

(انیسہ دس روپے کا نوٹ لا کر دادی کے سامنے رکھ دیتی ہے)

دادی۔ لو قیمت۔ اب میں کچھ نہ سنوں گی

طاہر۔ (بے بسی سے سر کھجاتا ہے) اچھا تو صرف پانچ منٹ کی اجازت دیجئے۔ میں سوٹ کیس ابھی لا کر دیتا ہوں۔

دادی۔ اللہ توبہ۔ لو بھئی۔ اپنی چیز میں نہیں لیتی۔

طاہر۔ ارے آپ تو خفا ہو رہی ہیں۔ اچھا لے لیجئے۔ اب میں جاتا ہوں آداب عرض

دادی۔ جیتے رہو — ہاں وہ کتاب کہاں رکھ دی!

طاہر۔ (سٹپٹا کر) کتاب — کتاب تو میں نے یہیں کہیں رکھ دی تھی

کوئی لے تو نہیں گیا ؟

انیسہ - ذرا سوٹ کیس میں تو دیکھ لیجئے۔ آپ نے غلطی سے کہیں اس میں نہ رکھ دی ہو۔

(صفیہ زیرلب مسکراتی ہے)

طاہر - (جھجک کر) ہاں ہاں۔ ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے۔

(کانپتے ہاتھوں سے سوٹ کیس کھول کر کتاب نکالتا ہے)

ارے ۔ ؟ واقعی اسی میں تھی۔ لیجئے اپنی کتاب۔ کھو گئی تو آپ کے پھر مجھ پر شبہ ہوگا۔

دادی - انیسہ کا یہ مطلب تھوڑی تھا بیٹا۔ تم تو بات بات پر خفا ہو جاتے ہو۔

طاہر - میں انیسہ کی باتوں پر کیسے خفا ہو سکتا ہوں دادی۔ پھر بھی یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ۔۔۔ خیر جانے دیجئے ۔۔۔ خدا حافظ

(یہ وہ اٹھا کر باہر چلا جاتا ہے)

(تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہتی ہے۔ انیسہ دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکائے کسی گہری سوچ میں غرق ہے ۔۔۔ دادی سوٹ کیس الٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہیں اور صفیہ سینے میں مصروف ہے)

دادی - (آپ ہی آپ بڑبڑاتی ہیں) تو یہ ۔ اس لڑکی کی زبان کو لگام ہی نہیں ہے۔ بھلا کوئی یوں کسی کو منہ پر چور کہہ دیتا ہے۔ سب کے سامنے سوٹ کیس سے کتاب نکلوا دی۔ کیسا شرمندہ ہو گیا بے چارہ۔

انیسہ - تو اتنے سب کے سامنے کتاب چراتے شرم نہ آئی۔ ابھی تک جانے کتنی چیزیں پار کر چکے ہیں۔ اوہو اپنے بارے میں بڑی خوش فہمی ہے جناب کو ۔۔۔

دادی - (آہستہ کہہ کے) کیسا اچھا سوٹ کیس دے گیا بے چارا۔ تیس روپے سے کم میں کہیں نہ ملتا۔

انیسہ - اور یہ تیس روپے سے کم میں کسی نے خریدا بھی نہ ہوگا۔

صفیہ - تمہارا خیال ہے کہ یہ سوٹ کیس بھی کہیں سے اڑا کر لائے تھے۔

انیسہ - اور کیا۔ میرے اوپر رعب ڈالنے کو کہیں سے اٹھا لائے تھے

مگر دادی کو بے وقوف بنا کر دس روپے بھی ہتیا لئے۔

دادی - اے بیٹی یوں لوگوں پر جھوٹے الزام تو نہ لگاؤ۔ اس وقت بیچارا اتنے سستے میں سوٹ کیس دے گیا اور پھر بھی اسی پر بے ایمانی کے الزام لگا رہی ہو۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

صفیہ - کون ہے ۔ ؟

آواز - باہر آیئے۔

انیسہ - آپ ہی اندر تشریف لائیے نا

(پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک نوجوان اندر آتا ہے)

نوجوان - یہاں طاہر شریف صاحب رہتے ہیں نا - وہی جو موٹروں کا کاروبار کرتے ہیں - ؟

انیسہ - نہیں وہ یہاں نہیں رہتے - مگر آپ کو ان سے کیا کام ہے؟

نوجوان - وہ میرا سوٹ کیس اپنی بہن کو دکھانے لائے ہیں - مجھے یہی پتہ دیا تھا۔

دادی - (چونک کر) سوٹ کیس - کیسا سوٹ کیس ؟

نوجوان - جی چھوٹا سا تھا بالکل نیا - انھوں نے جمع واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

انیسہ - آپ نے بھی خوب کیا - کہ جان نہ پہچان اور سوٹ کیس تھما دیا

نوجوان - جی نہیں - ان سے میری ملاقات ہے - وہ اکثر میری چیزیں لے جاتے ہیں - میں ان کی کار میں تفریح کرتا ہوں -

انیسہ - (تعجب سے) مگر طاہر کے پاس کار کہاں سے آئی ۔۔ ؟

جو شخص اونے پونے دو سروں کے سوٹ کیس بیچتا پھرے، اس کے پاس کار کہاں سے آئے گی ؟

نوجوان - مگر انھوں نے میرا سوٹ کیس بیچا تو نہیں شام تک لا دیں گے

دادی - ارے اب یاد آیا آپ کا سوٹ کیس تو طاہر میرے پاس رکھ گیا ہے - یہ لیجئے۔

انیسہ - (غصہ بھری نظروں سے دادی کو دیکھتی ہے) واہ یہ سوٹ کیس ان کا کیسے ہو گیا! یہ تو ہم نے خریدا ہے۔

نوجوان - آپ نے خریدا ہے ؟ کس سے ؟ یہ تو میرا سوٹ کیس ہے

دادی - جی نہیں ہم نے نہیں خریدا۔ انیسہ کو کیا معلوم۔ طاہر مجھ سے کہہ گیا تھا کہ آپ آئیں تو دے دوں۔

نوجوان۔ طاہر صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ آداب عرض۔ (چلا جاتا ہے)

انیسہ۔ (انتہائی غصہ میں) دادی آپ تھوڑا سا زور مشکوا کر ہم لوگوں کو کیوں نہیں دے دیتیں۔ پھر ابا کی ساری جائداد کا مالک آپ کا بھتیجا ہو جائے گا۔

دادی - اوئی، بیٹی میں نے تمھارے باپ کی کون سی کائی ٹنا دی ہے۔ آج ضرور دس روپے کا نقصان ہو گیا۔ مگر غیر آدمی کے سامنے اس کی عزت تو چلی جاتی تو ہمارے خاندان کا نام ہی تو بدنام ہوتا۔

انیسہ - اب تو ہمارے خاندان کا نام جھنڈے پر چڑھا ہوا ہے نا۔ وہ تو سب کو اُلو بناتا پھرتا ہے۔ جیسے ہم تو گدھے ہیں کہ اس سے اپنا گھر لٹوا دیں گے۔

صفیہ - تم اسے بے وقوف کیوں نہیں بناتیں۔ بھئی مجھے کوئی ایسا دل چسپ شغل بتاؤ جس سے خوب لوٹوں اور ایسی سزا دوں کہ زندگی بھر یاد رکھے۔ ٹھہرو تمھیں بھی ایک ترکیب بتاتی ہوں

(انیسہ کے کان میں کچھ کہتی ہے دونوں خوب ہنستی ہیں)

پردہ گرتا ہے

## دوسرا منظر

[ وہی کمرہ ہے اور وہی ساز و سامان - انیسہ منہ لپیٹے بستر پر دراز ہے - پاس صفیہ بیٹھی ہے - طاہر سامنے کرسی پر بیٹھا بہت بے چین اور اداس نظر آتا ہے - آج وہ نہایت بڑھیا سوٹ پہنے ہے - کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اور انگلی میں چمکتی ہوئی انگوٹھی بھی بہت نمایاں ہیں )

طاہر۔ میں دو مہینے تک یہاں نہیں آ سکا تو تم لوگ بھی انجان بنے مجھے خبر ہی نہ لی کہ انیسہ بیمار ہیں۔

صفیہ - جیسے آپ تو انیسہ کو بہت یاد کرتے رہے ہوں گے۔

طاہر۔ اگر انھیں بھول جائیں گے تو پھر کسے یاد رکھیں گے۔

صفیہ - اچھا اگر آپ انیسہ کو یاد کرتے تھے تو اس کے لئے کیا لائے۔

انیسہ - (منہ کھول کر) لئے صفو تو کیسی باتیں کرتی ہے۔ طاہر بھائی میرے لئے کوئی چیز کیوں لانے لگے ؟

طاہر۔ بات یہ ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں انیسہ خفا نہ ہو جائیں۔

صفیہ - اچھا اب چھپائیے مت بتا کیوں نہیں دیتے کہ یہ انگوٹھی انیسہ کے لئے لائے تھے۔

طاہر۔ خوشش ہو کر جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ مگر بات یہ ہے کہ .... کہ ....

انیسہ - اری صفو یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں اتنی قیمتی انگوٹھی نہیں پہنوں گی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ طاہر بھائی نے مجھے انگوٹھی کیوں پہنائی ہے ؟

طاہر۔ (جوشش میں آکر) ارے لوگ کون ہوتے ہیں ہمارے بیچ میں بولنے والے۔

صفیہ - ہاں جی لوگوں سے کیا واسطہ۔ لائیے میں اپنے مبارک ہاتھوں سے انیسہ کو پہنا دوں۔

طاہر۔ لیکن یہ انگوٹھی اگر انیسہ کو پسند نہیں ہے تو میں دوسری لا دوں گا۔

صفیہ - واہ پسند کیسے نہیں آئے گی۔ اتنی اچھی تو ہے۔

طاہر۔ جی نہیں کچھ اچھی نہیں ہے یہ تو معمولی سی تیس پینتیس روپے کی انگوٹھی ہے۔

صفیہ - اب ہمیں بے وقوف مت بنائیے۔ یہ بہت قیمتی انگوٹھی ہے زمرد جڑا ہوا ہے۔

انیسہ - تب اسے واپس کر دو صفو - میں اتنی قیمتی انگوٹھی نہیں لوں گی۔

صفیہ - کیوں نہیں لوگی - لاؤ ہاتھ میں پہنا دوں (انیسہ کی انگلی میں انگوٹھی پہناتی ہے) خدا تمھیں مبارک کرے - اب یہ تمھاری ہو چکی ہے۔

طاہر۔ ہاں، اب یہ انیسہ کی ہو گئی۔

صفیہ ۔ اچھا تو اب لائیے ہمارا انعام (ہاتھ پھیلا کر طاہر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے)

طاہر ۔ انعام ۔ کاہے کا انعام ۔ ؟

صفیہ ۔ لیجئے ۔ آپ کو کوئی خبر ہی نہیں کہ ہم نے کیا شاندار کارنامہ انجام دیا ہے ۔ بیٹھے بٹھائے ایسی حسین و جمیل لڑکی سے منگنی کرا دی ۔ میں تو انعام میں کوئی بڑھیا سی چیز لوں گی ۔

انیسہ ۔ بڑھیا سی کیا چیز لوگی ۔ اب طاہر صاحب تمہیں اپنی گھڑی تو دینے سے رہے ۔

صفیہ ۔ (چونک کر) کون سی گھڑی ۔ ارے یہ گھڑی ۔ میں تو یہی لوں گی ۔ لائیے جلدی اتار دیجئے میری گھڑی ۔ ہائے اللہ کتنی خوب صورت ہے ۔

انیسہ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر طاہر صاحب نہ دینا چاہیں تب بھی لے لوگی ؟

طاہر ۔ نہیں ایسی بات تو نہیں ۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے ایک دوست نے یہ گھڑی پریزنٹ کی تھی ۔ اور پھر یہ تو مردانہ ہے آپ کے لئے میں ایک لیڈیز رسٹ واچ لا دوں گا ۔

انیسہ ۔ تو کیا اپنے دولھا کو منہ دکھائی میں دے گی اسے ؟

صفیہ ۔ تم کچھ بھی کہو مگر یہ گھڑی تو میری ہو چکی ہے (جلدی سے کھول کر اپنی کلائی پر باندھ لیتی ہے) نی اماں تو یہ میری کلائی پر بھی بڑی نہیں لگ رہی ہے ۔ آداب عرض طاہر بھائی

طاہر ۔ جیتی رہیئے ۔ تو اب مجھے اجازت دیجئے ۔ پھر کسی دن حاضر ہوں گا ۔ اور ہاں ۔ کہنا یہ تھا کہ ان چیزوں کو ابھی کسی کو دکھایئے مت ۔ خواہ مخواہ بات پھیلے گی ۔

صفیہ ۔ آپ اطمینان رکھئے کسی کو نہیں دکھائیں گے ۔

طاہر ۔ تو اب میں جاتا ہوں (دروازے پر جا کر پھر واپس لوٹ آتا ہے) انیسہ کیوں کیا بات ہے ؟

طاہر ۔ کچھ نہیں ۔ ۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ دونوں کو یہ چیزیں پسند نہ ہوں اور آپ میری خاطر لے رہی ہوں ۔ اگر ایسا ہے تو مجھے دے دیجئے ۔ میں کل ان سے بھی اچھی چیزیں لا دوں گا ۔

صفیہ ۔ ہائے اللہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ۔ ہمیں تو یہ دونوں چیزیں بے حد پسند آئی ہیں ۔ ہمیں دوسری نہیں چاہئیں ۔

طاہر ۔ اچھا تو میں جاتا ہوں ۔ آداب عرض ۔

صفیہ ۔ خدا حافظ (طاہر چلے جاتے ہیں دونوں لڑکیاں اُٹھ کر زور زور سے قہقہے لگاتی ہیں)

## تیسرا منظر

[ وہی کمرہ ہے ۔ نیچے فرش پر انیسہ اور صفیہ جب عادت بیٹھی ہیٹنگ کر رہی ہیں ۔ دادی مینک لگائے کچھ سی رہی ہیں ۔ ان کے آس پاس کپڑوں کی رنگ برنگی کترنیں پھیلی ہوئی ہیں ]

انیسہ ۔ اُفوہ ۔ کتنی سردی ہے ۔ کہیں باہر گھومنے میں بڑا مزہ آئے اس وقت ۔

دادی ۔ تمہیں تو باہر جانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ملے ۔ گرمی لگ رہی ہے اس لئے باہر جائیں ۔ سردی لگ رہی ہے اس لئے باہر جا رہے ہیں ۔ برسات ہے تو باہر کی فکر ۔ اللہ تو بہ ہمارے زمانے میں جوان لڑکیاں گھر سے باہر قدم نہ نکالتی تھیں ۔

انیسہ ۔ تو گھر میں بیٹھے کیا کریں ۔ کالج بند ہو گیا ۔ کوئی اچھی سی کتاب بھی نہیں ملتی ۔ سردی الگ بور کر رہی ہے ۔

صفیہ ۔ اور طاہر بھی تو نہیں آ رہے ہیں ۔ کیوں انیسہ ۔ ؟ (انیسہ اشارے سے منع کرتی ہے)

دادی ۔ وہ بچارا آتا ہے تو تم لوگ اسے منہ لگاتی ہو ۔ تمہیں تو اس کی ہر بات زہر لگتی ہے جیسے تمہارا گھر لوٹ کرنے جائے گا ۔

صفیہ ۔ مگر دادی اب تو وہ بے چارے کچھ نہیں لے جاتے بلکہ کچھ دے ہی جاتے ہیں کیوں انیسہ ؟

انیسہ ۔ (آہستہ سے) چپ رہو دادی کو خبر ہو جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں کیا دے جاتے شاید صفیہ کو کچھ دے گئے ہوں ۔ کیوں صفو ! تجھے کوئی انگوٹھی وغیرہ تو نہیں دے گئے طاہر ؟

صفیہ ۔ چپ بے شرم ۔ ہٹ تو سہی ۔ تیرا بیاہ اس اُچکے سے نہ کر دوں

تو میرا نام بدل دینا کیسے مزے میں منگنی کی انگوٹھی پہنے بیٹھی ہے۔

(دونوں قہقہے لگاتی ہیں۔ خالو صاحب گھبرائے ہوئے اندر آتے ہیں)

انیسہ اور صفیہ۔ سلام چھوٹے خالو۔

خالو۔ جیتی رہو۔ جیتی رہو۔ اچھا صفن ہیں۔ کہو مزاج کیسا ہے تسلیمات عرض کرتا ہوں چھوپو۔

دادی۔ جیتے رہو۔ آج کیسے بھول پڑے اس طرف۔

انیسہ۔ چھوٹے خالو آج ہمیں کوئی پکچر دکھایئے گا۔ گھر میں پڑے پڑے بور ہو گئے ہیں۔

صفیہ۔ نہیں تو ہمیں کوالٹی میں آئس کریم ہی کھلا دیجئے۔

دادی۔ اری لڑکیو! ذرا حواس تو بیٹھنے دو۔ کوئی گھر میں آئے اور تمہاری فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ کہو چھوٹے میاں خیریت تو ہے تمہاری دلھن کا مزاج کیسا ہے؟

خالو۔ اب تو ٹھیک ہے۔ پرسوں اسپتال میں لڑکا ہوا ہے۔ البتہ منے کو ہیضہ ہو گیا ہے اور چھوٹو کو تو پیٹ کا ورڈ چھوڑتا ہی نہیں۔ گڈو کو خسرہ نکلی ہے۔ پاپا کو کھانسی بخار ہے۔ بیوہ بچارے کو یدھمی ہو گئی ہے اور — مگر آپ نے کچھ اور بھی سنا — ؟ بچاری چھوٹی چھوپو پر کیا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

دادی۔ چھوٹی چھوپو — ؟ کیا ہوا انھیں — ؟ الٰہی خیر — کہیں طاہر کو پولیس تو پکڑ کر نہیں لے گئی — ؟

(انیسہ اور صفیہ بھی چونک کر ادھر دیکھتی ہیں)

خالو۔ طاہر کہاں ہے اب۔ رات اس نے خودکشی کر لی۔

دادی (تعجب سے) طاہر مر گیا۔ ! کیا کہہ رہے ہو چھوٹے میاں۔ ہائے میرے اللہ (رونے لگتی ہیں) ہے ہے ایسا جوان۔ نہیں نہیں یہ جھوٹی خبر ہے۔

انیسہ اور صفیہ (چونک کر) طاہر مر گیا۔ ہائے اللہ۔ مگر ہوا کیا۔؟

چھوٹے میاں۔ کیا معلوم۔ مختلف روایتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے سانپ نے کاٹ لیا۔ ہاں کہتی ہے ہارٹ فیل ہو گیا۔ رات اچھا خاصا سویا تھا۔ بہنیں کہتی ہیں کہ کسی دوست سے کچھ زیور مانگ کر لایا اور کھا پی ڈالے۔ اب اس دوست نے پولیس میں اطلاع دے دی تو کچھ کھا کر سو گیا۔ مگر بہت برا ہوا۔ بچاری چھوٹی چھوپو کا برا حال ہے

صفیہ (رونے لگتی ہے) نہیں یہ بات جھوٹ ہے۔ چھوٹے خالو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ انیسہ اب کیا ہو گا؟ (انیسہ آنکھیں پھاڑے چھوٹے خالو کو گھور رہی ہے)

انیسہ۔ (رونے ہوئے) صفو — صفو — یہ کیا ہوا — ؟ یہ ہم نے کیا کر دیا؟

چھوٹے خالو جانے کہاں کہاں آوارگیاں کرتا پھرتا تھا۔ کیا معلوم اصل بھید کیا تھا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ کچھ عشق و شق کے چکر میں آ کر اس نے زہر کھا لیا۔

دادی۔ اے لو وہ بھی کیا کسی نوٹنکیا پر مرتا تھا کہ کچھ کھا لیا۔ اس بچارے سے تو سب ہی نفرت کرتے تھے۔

(انیسہ اور صفیہ سر جھکائے ساکت بیٹھی رہ جاتی ہیں اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

---

## دوسرا بین الاقوامی فلمی میلہ

اس سال ۲۰ اکتوبر سے لے کر ۱۷۔ نومبر تک وزارت اطلاعات و نشریات کے زیر اہتمام دوسرا بین الاقوامی فلمی میلہ منعقد ہو رہا ہے۔ یہ میلہ نئی دہلی میں ۲۷۔ اکتوبر کو شروع ہو کر ۲۔ نومبر کو ختم ہو گا۔ پھر کلکتہ (۳ سے ۹ نومبر تک) مدراس (۷ سے ۱۳ نومبر تک) اور بمبئی (۱۰ سے ۱۲ نومبر تک) فلمی میلے منائے جائیں گے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان میں پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ ۱۹۵۲ء میں منایا گیا تھا جس میں اقوام متحدہ کے علاوہ ۲۱ ملکوں نے حصہ لیا تھا۔

محبوب اللہ مجیب

## گیارھویں اور بارھویں صدی میں

# ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی حالت

عہد کی عمر سے زیادہ تہذیبوں کی عمر ہوا کرتی ہے۔ عہد مٹ جاتا ہے، تہذیبی باقی رہ جاتی ہیں۔ تہذیبیں زمانے کے لئے نقش راہ کا کام دیتی ہیں کسی عہد کا دل ٹٹولنے اور سراغ پانے کے لئے ہمیں ایک ایسی دیدۂ بینا کی ضرورت پڑتی ہے جو اس عہد کے بارے میں صحیح خبر دے سکے۔ اس دور کی تہذیبی زندگی کو ایک تعلیلی اور تجزیاتی روپ دے سکے کیونکہ ہر زمانہ اور ہر دور کے بہت سے اہم پہلو ہوتے ہیں جس سے اس زمانے اور اس دور کے ہزارہا پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان تصویروں میں صدیوں پہلے کے افراد ہماری نظروں کے سامنے چلتے پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہر دور اپنے دامن میں بہت ساری چیزیں محفوظ کرنا چاہتا ہے یا بالکل اسی طرح جیسے ہر ماں اپنے ہر بچے کو ایک ہی سا پیار دینا چاہتی ہے لیکن نہ پہلی بات صحیح ہے اور نہ دوسری بات ممکن۔

زمانہ جو گزر چکا، زمانہ جو ہے اور زمانہ جو آئے گا۔ یہ سب اپنی اپنی مشترک قدروں سے منسلک ہیں اور یہ مشترک قدریں ہر دور کے تہذیب و تمدن میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ زمانے کو سمجھنے کے لئے تہذیب تمدن وہ واحد اکائی ہے جو زمانے کے خد و خال کو پہچاننے میں مدد دیتی ہے کیونکہ تہذیبیں ایک دن میں نہیں بنا کرتیں تمدن ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسا پودا ہے جو صدہا سال کی محنت و مشقت کے بعد بار آور ہوتا ہے۔

یہ چند ٹوٹے پھوٹے اور تراشیدہ نقش ہیں جن کو ذہن میں رکھ کر ہمیں سات سو برس پرانے ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی حالت کو پرکھنا ہوگا۔ ان کے بھونڈے رسوم، سادہ زندگی اور غیر دلچسپ مشاغل سے منہ نہیں موڑنا ہوگا بلکہ ان کی قدر کرنی ہوگی کیونکہ یہ ہمارا ایک متبرک تہذیبی ورثہ ہے۔

### تعلیم

اگر یہ صحیح ہے کہ زمانے کی تربیت تعلیم سے ہوتی ہے تو ہمارا ہندوستان ہزاروں سال پہلے تربیت حاصل کر چکا تھا۔ ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی سے کہیں پہلے مقدس وید کے لفظ ہمارے کانوں میں گونج چکے تھے اور زندگی کے فلسفے کو سمجھنے کے لئے ہمارے لئے اپنشد کہیں پہلے تیار ہو چکی تھی۔ کتابیں لکھنے اور چھاپنے کا اگرچہ کوئی انتظام نہ تھا پھر بھی ہمارے دل کے چھاپہ خانے اس کام کو انجام دینے کے لئے تیار تھے۔ بھکشوؤں کے لئے بہاتما بدھ کا ایک بار ہی اپدیش دے دینا کافی ہوتا تھا۔ وہی باتیں ازبر کر کے وہ دوسری جگہ جا کر لوگوں کو بتلاتے اور سننے والے اُسے اپنی لوحِ دل میں محفوظ کر لیتے اور اس طرح تعلیم و تربیت کا پرچار ہوا کرتا۔

اس صدی میں تعلیم و تعلّم کا بڑا رواج تھا تعلیمی اداروں کی کثرت دیکھ کر ہمیں رشک ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آخر اتنے سارے تعلیمی ادارے کیونکر پیدا ہوئے۔ کس طرح چلتے رہے اور علم کی فیاضی کس طرح بانٹتے رہے۔ تکشلا اور نالندہ جیسی یونی ورسٹیوں میں ایسی کیا غیر معمولی کشش تھی جن سے ہیونگ سانگ اور فاہیان جیسے لوگ اپنا ملک، اپنا وطن اور اپنا گھر بار چھوڑ کر علم حاصل کرنے کے لئے یہاں تک پہنچے اور اس التزام و احترام سے

آئے جیسے طواف کوئے یار کے لئے چلے ہوں۔

لکشمی دھر، اپار کا اور وجنانلیشور جیسے مشہور تذکرہ نویسوں نے اگرچہ صرف برہمنوں کی تعلیمی خدمات کا ہی تذکرہ کیا ہے۔ مگر ایسا نہیں تعلیم کی دیوی گھر گھر اور دروازہ دروازہ پھر تی نظر آتی تھی تعلیم حاصل کرنا شاید تک پہونچنے کا ایک راستہ تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے مقدس طریقے کو وہ 'پاروویا' تصور کرتے تھے اور اسے چھوڑ کر باقی چیزوں کو 'اپاروویا' کا نام دیتے تھے۔

اس طرح کی تعلیمی زندگی صرف مذہبی کتابوں کو پڑھنے اور مقدس ویدوں کے اشلوک کو یاد کرنے پر ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اس کے ساتھ فلسفہ، سائنس، علم نجوم، موسیقی اور رقص کو بھی سیکھنے کا رواج تھا۔ اسمرتی چندرکا کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رقص و موسیقی کے درس و تدریس کا کام ویش دیسا ہی رواج تھا۔ جو طلبا، موسیقی اور رقص میں دلچسپی رکھتے تھے وہ استادوں کے گھر میں رہ کر تحصیل فن کرتے۔ استادوں کے سامنے ریاض کرتے جو ان کی خوبیوں اور خامیوں پر ہر وقت نظر رکھتے تھے۔ استاد کے ہاں رہنے والا طالب علم ان کے اپنے بیٹوں سے کم اہمیت نہیں رکھتا تھا یہ بھی نہیں بلکہ اس کے کھانے پینے کی ذمہ داری استاد ہی کے سر ہوتی۔

مشہور عالم متلکشی نے رقص و موسیقی کے ذمرے میں آیورویدک طریقۂ علاج کو بھی شامل کیا ہے۔ اس کے خیال میں یہ علم بھی استاد کے ساتھ ہی رہ کر سیکھا جا سکتا ہے۔ آیورویدک طریقۂ علاج کے ساتھ ساتھ دھرویدا (فوجی تعلیم) گندھروویدا (موسیقی و رقص) اور ارتھ شاستر (انتظام حکومت) میں بھی تعلیم و تربیت کا یہی طریقۂ کار مفید ہو سکتا ہے۔

استاذہ کی عزت اور قدردانی اس زمانے میں کہیں زیادہ تھی استاذہ بڑے قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے۔ ہیم کرا، گیا دھرادر بگون ناتھ مترا للندر وغیرہ ۱۰۲۷ء سے ۱۲۰۲ء کے درمیانی حصے اور وقت میں بنت گئے جہاں ان کی بہت قدر ہوئی۔ مشہور چینی سیاح فاہیان نالندہ سے تحصیل علم کر کے جب وطن واپس ہوا تو اس نے یہاں کے علما کا تذکرہ اپنے وطن میں کیا جس کی بنا پر تقریباً گیارھویں صدی میں ہندوستان سے تین اہل علم دھرم راکشی، میتری بھدر اور سورین یا ساسس چین گئے جہاں وہ ہندوستانی علوم کا درس دیتے رہے۔ اسی طرح تبت سے بھی بہت سے اہل علم درس و تدریس کی چاہ میں اس ملک میں آکر بس گئے۔ تاریخ کے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ بلوایہ ان سیاروں (۱۰۵۹ء تا ۱۱۰۸ء) ہندوستان آیا اور کشمیر کے مشہور عالم پراہت بھدر اور بھیاراجہ کے قدموں میں بیٹھ کر علم کی پیاس بجھاتا رہا۔

## تعمیرات

اس صدی میں تعمیرات صرف دو چیزوں پر مشتمل تھیں اول شاہی محل اور دوم مندر۔ اس دور کے تعمیراتی نمونے ہمیں دونوں جگہوں پر ملتے ہیں تعمیر کی خوش سلیقگی اس دور کے کھجوراہو اور مکتی ناتھ کے مندروں کی جان ہے۔ پتھروں پر کندہ دیوتاؤں کی تصاویر، روشنی کا انتظام کرنے کے لئے پتھروں کو کاٹ کر جالیاں بنانا یہ سب فن تعمیر کے بہت ہی خوب صورت نمونے ہیں۔

موسیقی و رقص کی طرح اس فن کے شیدائی طلبا اپنے اپنے استادوں کے گھر جمع ہوتے اور اکتساب فن کرتے۔

گیارھویں اور بارھویں صدی میں "سمارن گنسٹر ادھار" اور "اسانا سواگر و پدھاتی" فن تعمیر پر دو مشہور کتابیں لکھی گئیں جو سنسکرت زبان میں ہیں۔

## ناٹک

اس صدی کے تفریحی مشغلوں میں سے ایک مشغلہ ناٹک کھیلنا اور دیکھنا بھی تھا۔ ویسے ناٹکوں کے کھیلے جانے کی نامی جگہ تو بادشاہ کا دربار ہی ہوتا تھا جہاں صرف بادشاہ اور ان کے امراء اور وزراء ہی لطف اندوز ہو سکتے تھے لیکن مندروں کے سامنے پھیلے ہوئے وسیع میدانوں میں ہونے والے ناٹکوں میں عام لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ اس زمانے میں کھیلے جانے والے ناٹکوں پر عموماً مذہبی رنگ حاوی ہوتا تھا جن کے موضوع مہابھارت اور رامائن سے لئے جاتے تھے۔ نل کی بہادری، بھگوان سری کرشن کی شجاعت یہ سبھی موضوع ان ناٹکوں میں ضرور آتے۔ اس صدی کے ناٹک کلاکاروں میں سے کئی نام زیادہ مشہور ہیں مثلاً کمسندر اور ملہنا (کشمیر) وسل دیو اور سوم دیو

(راجپوتانہ) رام چندر اور لیش پال (گجرات) کوی راج سنگھ دھرویدی) وغیرہ وغیرہ۔

رام چندر اور لیش پال نے تو اس موضوع پر دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ رام چندر کی "نل ویاس" اور لیش پال کی "نر بھیہ بھیم" یہ دونوں بہت ہی مشہور کتابیں ہیں۔

ظاہر ہے اس زمانے میں آج کل کی طرح کوئی ناٹک گھر نہیں تھا۔ ناٹک کرنے کی دو ہی جگہ تھیں۔ مندر اور راجا کا محل۔ مندروں کے سامنے پھیلے ہوئے میدانوں میں اسی وقت ناٹک ہوتا جب کسی خاص پوجا کا وقت آتا اور دور دراز سے لوگ اکٹھا ہوتے اور اس کھیل کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے۔ ان ناٹکوں میں عورتیں اور مرد دونوں ہی حصہ لیتے تھے۔ ناٹکوں کو دل چسپ بنانے کے لئے جگہ جگہ موسیقی سے بھی کام لیا جاتا۔ موسیقی میں جو ساز اس وقت استعمال ہوتے تھے ان میں سے ڈھول، بانسری اور باجے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

موسیقی اور ناٹک کے سرپرست کی حیثیت سے چولکیہ خاندان کے مشہور راجہ شیشور کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔

## شاعری

شاعری نے ہر دور میں انسان کو غم واندوہ سے نجات دلائی ہے اس کے سامنے جذبات کی اس طرح آئینہ داری کی کہ وہ غم واندوہ کو بھول کر زندگی کو حسین تصور کرنے لگا۔ یہ شاعری کا اعجاز تھا۔ شاعری نے لطیف احساسات کے اظہار کو اپنا مقصد بنایا اور اس کو حاصل کر کے انسان نے اپنی گم شدہ جنت حاصل کر لی۔ گیارھویں اور بارھویں صدی میں بھی شاعری کی خوش گوار روایات پائی جاتی ہیں۔ کالی داس کی شکنتلا اور میگھ دوت نے برات عاشقاں میں سکون، اطمینان اور اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ اور کالی داس کے بعد اس صدی کی محفل کو رونق بخشنے والے کوی بلہن اور کوی جے دیو تھے۔ کوی بلہن کی "چورپنچاسیکا" بہ حیثیت عشقیہ داستان کے آج تک رشک کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے کوی جے دیو اس صدی کا بہت ہی مشہور شاعر گزرا ہے۔ جے دیو کا سرپرست راجہ لکشمن سینا تھا جو خود بھی شاعر تھا۔ جے دیو کے علاوہ لکشمن سینا نے اور بھی دوسرے شاعروں مثلاً اوما پتی دھر، سارن

اور گووردھن آچاریہ وغیرہ کی سرپرستی کی۔ جنسی نظر کشی جے دیو کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ "گیت گووند" اس کے مجموعے کا نام ہے۔

## لباس و زیورات

گیارھویں اور بارھویں صدی میں لباس کے معاملہ میں لوگ اسی طرح خوش ذوقی کا ثبوت دیا کرتے تھے جس طرح کہ آج کل۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا اس زمانے میں ایشیا کے دوسرے ممالک میں بھی کثرت سے بھیجے جاتے تھے۔ کشمیری شالیں اور کشمیری کمبل ایران اور بغداد کے بازاروں کی خاص رونق تھے۔ کپڑا تیار کرنے والے شہروں تو بہت سے تھے لیکن کوٹلیہ نے اس سلسلے میں کسمہ پورہ، بنگال گلبرگہ، ملدورا، اپرنتیا اور کلنگ کا خاص طور سے تذکرہ کیا ہے۔ بنگال اس زمانے میں کپڑے کا بہت بڑا تجارتی مرکز تھا اور بقول پیری پلس "گنگا کے قریب کا یہ شہر ریشمی کپڑوں اور موتیوں کی تجارت سے مالا مال ہو رہا تھا۔" اس بات کی تصدیق مشہور عرب سیاح سلیمان نے بھی کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "یہاں کے بنے ہوئے کپڑے کی تعریف کس طرح کی جائے؟ یہ اس قدر خوب صورت اور ہلکا ہوتا ہے کہ انگوٹھی کے درمیان سے بآسانی نکل سکتا ہے۔" (ہیڈ ۱۹۶۱)

متمول اور غیر متمول طبقے کے لوگوں کے لباس میں کافی فرق تھا۔ متمول لوگ کڑھے ہوئے اور کامدانی کے کپڑے پہننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ برخلاف اس کے غیر متمول افراد معمولی دھوتی اور ساڑھیاں پہنا کرتے تھے۔ "اوگھتا" اور "نولا" نام کا کپڑا نقاب کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

عورتوں کے علاوہ مرد بھی زیور پہنا کرتے تھے۔ عورتوں کی طرح مرد بھی اس زمانے میں کان میں آویزے پہننا پسند کرتے تھے۔ بادشاہ کانوں میں آویزے پہننا ایک اچھا شگون سمجھا جاتا تھا۔ ایک عرب سیاح ابوزید نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

> "اس ملک کے بادشاہ بیش قیمت لباس پہننا پسند کرتے ہیں۔ انگلیوں میں قیمتی پتھر پہننے کے قائل ہیں۔ زیادہ تر شرخ اور سبز پتھر کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ پتھر بہت ہی قیمتی ہوتے ہیں۔ دربار کے امراء، حکام اور کارندے بھی اپنی اپنی پسند کے پتھر استعمال کرتے ہیں اور انھیں

انگوٹھیوں میں جڑوا پہنتے ہیں۔"
(ہندوستان اور چین کے قدیم تذکرے (انگریزی) صفحہ ۳۰۶)

## تہوار

ہمارے یہاں کے تہوار موسموں سے خاص مناسبت رکھتے ہیں گیارھویں اور بارھویں صدی میں ہندوستان میں چیت کا موسم بڑی خوشی کے ساتھ منایا جاتا تھا اور یہاں تک کہ چیت کی گیارہ تاریخ کو عورتیں مردوں سے انعام طلب کرتیں۔ اچھے سے اچھے لباس زیب تن کرتیں اور اس موسم میں پندرہ دن تک کام دیو کی پوجا کرتیں۔

فصل تیار ہو جانے پر بھی کچھ تہوار منائے جاتے تھے۔ مشہور تذکرہ نویس لکشمی دھر نے ایک ایسے ہی تہوار کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسوج کے مہینے میں جب فصل کٹتی ہے تو لوگ کھیتوں میں جمع ہو جاتے ہیں پھر ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر کھیت کے بیچوں بیچ کھڑا ہو جاتا ہے اور کوئی ساز بجاتا ہے۔ ساز کی آواز سن کر سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور گاتے گاتے رقص کرنے لگتے ہیں اور یہ سلسلہ کافی دیر تک قائم رہتا ہے ——

دیوالی کا تہوار ہندوستان کا بہت ہی پرانا تہوار ہے۔ اماوس کی سیاہ رات میں کارتک کے مہینے میں اس تہوار کی دھوم دھام دیکھی جا سکتی ہے۔ بھوج نے اپنی کتاب راجا مارتنڈ میں اس تہوار کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دیوالی کی رات کو لوگ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ لکشمی کی پوجا ملک کے طول و عرض میں ہوتی تھی۔ چاروں طرف دئے جلا کر خوشی منائی جاتی تھی۔ کیا گھر کیا دوکانیں، کیا شہر اور کیا دیہات سبھی جگہ دیوالی کے دئے جلا کر روشنی کی جاتی تھی۔

گیارھویں اور بارھویں صدی کے ہندوستان میں سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے ایک سو اٹھائیس دن تہواروں کے لئے ہوتے تھے۔ تہواروں کی اتنی کثرت دیکھ کر لوگوں کو حیرت تو ضرور ہوگی لیکن ان تہواروں کی زیادتی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس صدی میں تفریح کے زیادہ مشاغل نہیں تھے۔ نہ اس وقت کوئی کلب تھا، نہ سنیما تھے، نہ تھیٹر کمپنیاں تھیں، نہ ہوٹل اور نہ کافی ہاؤس۔ لوگوں کو سماجی میل جول کے مواقع یہی تہوار فراہم کرتے تھے۔ ان تہواروں کے موقع پر دور دور سے مقامات پر بسنے والے رشتہ دار ایک جگہ جمع ہوتے، ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہوتے اور محبت کے دائمی رشتہ کو مضبوط کرتے۔

## تیرتھ

ہندوستان کے تیرتھ یاتریوں نے تاریخ میں وہ کارنامہ کر دکھایا ہے جو کسی ملک کے سیر سے بھی نہیں ہو سکتا۔ گیارھویں اور بارھویں صدی کے ہندوستان میں شمال سے لے کر جنوب تک مختلف مقامات پر تیرتھ ہوتے تھے۔ جنوب کا رہنے والا شمال کی تیرتھ گاہ میں ضرور حاضری دیتا اور شمال کا رہنے والا اسی طرح جنوب کی تیرتھ گاہوں میں جانا اپنا فرض اولین خیال کرتا۔ یہ زیارت کرنے والے ایک لائق سفیر کا کام انجام دیتے۔ ان کی زبان، ان کا لباس اور ان کی طرز رہائش مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو جاتے کہ شمال و جنوب کا فرق باقی نہ رہتا۔

## دیو داسیاں

ہندوستان میں دیو داسیوں کی بھی عجیب کہانی ہے گو اب رواج بہت کم ہو گیا ہے لیکن گیارھویں اور بارھویں صدی کے ہندوستان میں دیو داسیاں کثرت سے ہوا کرتی تھیں۔ یہ رواج کس طرح پیدا ہوا، کس طرح پروان چڑھا اور اس کو پروان چڑھانے میں کس کس کا ہاتھ تھا؟ اس کے بارے میں زیادہ تو نہیں لیکن ایک عرب سیاح ابوزید الحسن نے لکھا ہے:

"جب کوئی عورت چاہتی ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو اور وہ اولاد کے لئے منت مانگتی ہے۔ اگر اس کی پہلی اولاد لڑکی ہوئی تو وہ مندر میں لے جا کر جنیٹ کر دیتی ہے۔ وہاں اس کا کام مورتی کے گرد رقص کرنا ہوتا ہے۔"

یہ تھی گیارھویں اور بارھویں صدی کے ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی زندگی کی جھلک۔ اپنے ماضی کی شاندار روایات پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں۔

مظہر امام

## غزل

ہر لمحہ ایک خالِ رُخِ ماہ وسال ہے
کتنا حسیں تسلسلِ ماضی و حال ہے

اے محوِ لطفِ خود نگری! تجھ کو کیا خبر
تیرا جمال، میری نظر کا جمال ہے

احسانِ التفات سے مجروح ہو گئی
معذور کس قدر مری چشمِ سوال ہے

ساقی! شرابِ ناب کے چھینٹوں کو کیا ہوا
اب تک رُخِ حیات پہ گردِ ملال ہے

یہ دورِ غم ہے تیرے تغافل کا آئینہ
شامِ فراق ہے نہ یہ صبحِ وصال ہے

آشفتگیٔ دل کو نہیں بے کسی کا غم
خود حسن بھی رفیقِ ہے آشفتہ حال ہے

اے حسنِ دوست تیری رفاقت پہ میں نثار
اب جو مرا سوال ہے تیرا سوال ہے

بخشے مرے شعور نے دل کو وہ غم امامؔ
جو غم امامِ قافلۂ ماہ و سال ہے

تبسم نظامی

## غزل

نظر میں قوتِ گفتار ہم بھی رکھتے ہیں
خموشی اک لبِ اظہار ہم بھی رکھتے ہیں

چمن کو ہم نے بھی دیکھا ہے دیکھنے کی طرح
چمن میں دیدۂ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں

نہیں ہے ہم سے بہار و خزاں کا راز نہاں
کچھ امتیازِ گل و خار ہم بھی رکھتے ہیں

ہمارا حال نہ پوچھا کسی نے ہم سے کبھی
اگرچہ دل میں غمِ یار ہم بھی رکھتے ہیں

ابھی تو اور بھی رُخ ہیں تری تجلّی کے
ابھی تو حسرتِ دیدار ہم بھی رکھتے ہیں

دماغِ نالہ کشی و مزاجِ شکوہ گری
بقدرِ لذّتِ آزار ہم بھی رکھتے ہیں

ہمیں چمن میں تبسّم نہ کر نظر انداز
شعورِ نکہتِ گلزار ہم بھی رکھتے ہیں

# تیسرا پنج سالہ پلان

## مطمحِ نظر اور طریقۂ کار

ہندوستان کے تیسرے پنجسالہ پلان پر پارلیمنٹ نے اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس کے مطابق پلان کے بڑے بڑے مقاصد درج ذیل ہیں:

(۱) قومی آمدنی میں زائد از پانچ فی صد کا سالانہ اضافہ حاصل کرنا اور اس کے ساتھ ہی سرمایہ کاری کی ایک ایسا ڈھانچہ تیار کرنا جس میں قومی آمدنی میں اضافہ کی یہ شرح آئندہ پلانوں کے دوران میں بھی برقرار رہے۔

(۲) غذائی اجناس میں خود کفیل ہونا اور صنعت و برآمدات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے زرعی پیداوار کو بڑھانا۔

(۳) فولاد، ایندھن، بجلی اور کیمیاوی اور انجینئرنگ کی بنیادی صنعتوں کو توسیع دینا اور مشین سازی کی صلاحیت استوار کرنا تاکہ تقریباً دس سال کے اندر اندر صنعتوں کے فروغ کی ضرورتوں کو ملک کے اپنے ہی ذرائع سے پورا کیا جا سکے۔

(۴) ملک کی افرادی قوت کے ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور روزگار کے مواقع میں بھی توسیع کرنا۔ اور

(۵) بتدریج ایسے حالات پیدا کرنا کہ ملک کے لوگوں کو ایک سے مواقع ملنے میں اور زیادہ آسانی ہو۔ آمدنی اور دولت کے فرق میں کمی کرنا اور اقتصادی طاقت کی اور زیادہ بہتر تقسیم کرنا۔

ہندوستان کی ترقیات کا بنیادی مقصد ہر دور میں طور پر یہ ہونا چاہیئے کہ ملک کے عوام کو ایک اچھی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے۔ اس مقصد کی کامیابی کا انحصار دنیا میں امن رہنے پر ہے۔

ہندوستان کے چالیس کروڑ سے بھی زیادہ لوگوں کو اچھی زندگی مہیا کرنا ایک بہت بڑا کام ہے۔ زیادہ قومی مسئلہ افلاس اور اس سے پیدا ہونے والی دشواریوں کو دور کرنا ہے اور یہ صرف سماجی اور معاشی ترقی سے ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس طرح صنعتی لحاظ سے ایک پختہ نظام میسر آئے گا اور ایک ایسا سماجی نظام استوار ہوگا جس میں ملک کے تمام شہریوں کو یکساں مواقع ملیں۔

### منصوبہ بند ترقی

جب آزادی حاصل ہوئی تو بھارت کو بہت بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ دیہی معاشیات کی تعمیرِ نو، صنعتی و اقتصادی ترقی کی بنیاد رکھنے اور تعلیم اور دیگر سروسوں کو توسیع دینے کے لئے سارے ملک کے لئے ایسی منصوبہ بندی بہت ضروری تھی جس میں اقتصادی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا گیا ہو۔

پنجسالہ پلانوں میں ترقی کا جو ڈھانچہ مدِ نظر رکھا گیا ہے اس کا بنیادی نصب العین مسلسل اقتصادی ترقی نیز منصفت بخش روزگار کے مواقع بڑھانے، معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور عام لوگوں کے کام کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے ٹھوس بنیادیں فراہم کرنا ہے، جیسا کہ لازمی ہے، اولین ترجیح زراعت کو دی گئی ہے۔ چنانچہ زرعی پیداوار کو ۱۰۰ امکانی حد تک بڑھانا ہے زراعت کی ترقی اور انسانی وسائل کا فروغ دونوں یکساں طور پر صنعتی ترقی کے ساتھ

وابستہ ہیں صنعتیں نہ صرف نئے آلات فراہم کرتی ہیں بلکہ کاشتکار کے اندازِ فکر میں تبدیلی بھی لاتی ہیں۔ لہٰذا زراعت اور صنعت کو ترقی کے عمل کا لازمی حصّہ سمجھنا چاہیئے۔ سرکاری حلقے کو توسیع دینی چاہیئے اور ایک بڑا اور ترقی پذیر کوآپریٹو حلقہ قائم کیا جانا چاہیئے۔

اقتصادی نظام کی تیز رفتار توسیع کے ساتھ سرکاری اور نجی دونوں حلقوں کے لئے ترقی کے وسیع تر مواقع پیدا ہوتے ہیں اور بہت سی باتوں میں یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے امداد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ نجی حلقہ میں نہ صرف منظم صنعتیں بلکہ چھوٹی صنعتیں، زراعت، تجارت، تعمیرات اور دیگر شعبوں کی بہت سی تعمیری سرگرمیاں بھی شامل ہیں۔ اسی حلقہ کو رفتہ رفتہ امداد باہمی کی شکل اختیار کرنی ہے نیز قومی منصوبہ بندی کی حدود میں رہتے ہوئے سارے سماج سے مخلص اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا ہے۔

ترقیاتی اسکیم میں امداد باہمی یا کوآپریشن کا ایک اہم مقام ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اقتصادی زندگی کی کئی شاخوں میں بالخصوص زراعت چھوٹی صنعتوں، تعمیر اور شہری آبادی کے لئے ضروری آسائشوں کی فراہمی میں امداد باہمی رفتہ رفتہ مادی حیثیت حاصل کرلے گی۔ قومی معاشیات میں چھوٹی اور دیہی صنعتوں کو نہایت اہم پارٹ ادا کرنا ہے کیونکہ یہ صنعتیں عام استعمال کی چیزوں اور دیگر اشیاء کے علاوہ ایک بڑے پیمانے پر لوگوں کو روزگار فراہم کرتی ہیں۔ مزید برآں یہ قومی آمدنی کی زیادہ منصفانہ تقسیم کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔

منصوبہ بند ترقی کی کوششیں شروع کرنے، نیز تیزی سے ترقی کرنے اور سوشلسٹ طرز کا سماج بنانے کے آدرش میں جو بنیادی اصول سامنے رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی سارے سماج کو اور خصوصی اس سے زیادہ کمزور طبقوں کو فائدہ پہنچے۔

## سوشلزم کی طرف پیش قدمی

بھارت کے جمہوری انقلابوں میں ایک بنیادی وعدہ یہ کیا گیا ہے کہ جمہوریت اور عوام کے اشتراک عمل کے ذریعے سوشلسٹ ڈھنگ سے جو ترقی ہوگی اس سے تیز رفتار اقتصادی ترقی، روزگار کی توسیع نیز منصفانہ تقسیم، آمدنی اور دولت کی نابرابریوں میں کمی ہوگی۔ اقتصادی طاقت محض چند افراد کے ہاتھوں میں جمع نہیں ہو پائے گی اور ایک آزاد اور مساوات پر مبنی سماج کے اقدار و رجحانات پیدا ہوں گے۔

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ سوشلسٹ طرز کے نظام کا نقطۂ نگاہ سائمن اور ٹیکنالوجی کی جانب ترقی پسندانہ ہونا چاہیئے نیز یہ نظام اس تباہی اور بربادی سے بچنا چاہیئے کہ ترقی پذیر وہ کہ ایک ایسی سطح پر پہنچ سکے جہاں عوام کی فلاح و بہبود کا مقصد عملی شکل اختیار کرلے۔ دوسرے سوشلسٹ نظام میں ہر شہری کو برابر کا موقع میسّر ہونا چاہیئے۔ اس سمت میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ سب کو بنیادی ضروریات مہیّا کی جائیں، خاص کر خوراک، کام، تعلیم کے مواقع، صحت و صفائی کی معقول سہولیات، مکانات کی صورت حال میں بہتری اور کم سے کم اتنی آمدنی جس سے معقول معیارِ زندگی حاصل ہو سکے۔

تیسرے، سوشلسٹ نظام کو ایسا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیئے جس سے اقتصادی و سماجی نابرابریاں کم ہوں، اقتصادی ڈھانچہ تیزی کے ساتھ بڑھے اور اقتصادی طاقت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے پائے نہ ہی اجارہ داری کو فروغ ہو۔

آخری بات یہ ہے کہ سماجی اقدار اور تمام طبقوں کے لوگوں میں مشترکہ مفادات اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا جانا چاہیئے۔

## مساوی مواقع

سب کے لئے برابر کے مواقع فراہم کرنے اور کم از کم جتنی آمدنی کا ہونا ضروری ہے اسے حاصل کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو کام کا متلاشی ہو، منفعت بخش روزگار مہیّا کیا جائے۔ اقتصادی ڈھانچے میں خامیاں ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ صحیح بنیاد کو کافی مضبوط کیا جائے اور تعلیم اور دیگر سماجی سروسوں کو ترقی دی جائے اس کے بعد ہی اقتصادی ڈھانچہ تمام محنت کشوں کو کافی اُجرت دلا سکتا ہے۔ ان تمام باتوں میں وقت لگتا ہے۔ لہٰذا کچھ مدّت تک بڑی اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی نیز زراعت اور اقتصادی و سماجی سروسوں میں اضافہ کے پروگراموں کے علاوہ بڑے پیمانے کے دیہی پروگراموں کے ذریعے قلیل ترین آمدنی والے طبقات کے لئے کام کے اضافی مواقع مہیّا کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

سماجی سروسوں میں توسیع سے بھی اسی قسم کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ خاص کر مفت پرائمری تعلیم سے اعلیٰ اور پیشہ وارانہ تعلیم کے وسیع تر مواقع سے ذہانت اور دوسری شکلوں میں امداد کی فراہمی سے صحت و صفائی کے حالات میں بہتری سے اور پانی کی بہم رسانی اور مکانات کی صورت حالت میں اصلاح سے۔ درج فہرست قبائل اور جاتیوں کی بہبود اور دیگر فلاحی خدمات اقتصادی ترقی کی اسکیم کا ایک جزو ہیں۔

## اقتصادی طاقت اور آمدنی کی تقسیم

اگر زیادہ اقتصادی طاقت مٹھی بھر کے ہاتھوں میں جمع ہو جائے تو اس سے جمہوریت میں سماجی نظام پر دباؤ پڑتا ہے اور یہ چیز اقتصادی مواقع کو پھیلانے میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ چنانچہ ہماری پالیسی کا مدعا لازمی طور پر اقتصادی طاقت کے اجتماع اور اجارہ دارانہ رجحانات کی نشوونما کی روک تھام اور صنعتی تنظیم کے ایک ایسے ڈھانچے کو فروغ دینا ہوگا جس کے نتیجے کے طور پر پیداوار بڑھے گی اور نئے دھندے چالو کرنے والوں، درمیانہ اور چھوٹے پیمانے کے کاروباری اداروں اور امداد باہمی کی تنظیم کو قومی منصوبہ بندی کی حدود کے اندر پھلنے پھولنے کا پورا پورا موقع میسر ہوگا۔

آمدنی کی نابرابری کے مسئلے کا ایک اہم پہلو دیہاتی اور شہری آمدنیوں کے درمیان تفاوت سے تعلق رکھتا ہے جو صنعتی اور اقتصادی ترقی کے زیر اثر اور بڑھنے لگتا ہے۔ یہ مقصد زرعی پیداوار میں اضافے سماجی خدمات کے فروغ، زمین پر انحصار میں کمی۔ دیہاتی علاقوں کے اقتصادی ڈھانچے میں صنعتی توسیع کے ذریعہ گوناگونی اور زرعی پیداوار کی قیمتوں کی ایک ایسی پالیسی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے جو کسانوں کے مفاد کا پورا پورا تحفظ کرے اور شہریوں کے لئے بھی منصفانہ ہو۔

## قدم بہ قدم

اگرچہ بہت کچھ خلا باقی ہے تاہم سرشلسٹ نظام کا ڈھانچہ تعمیر کیا جا رہا ہے لیکن اب اسے عملی اعتبار سے مضبوط اور زیادہ با مقصد بنانا ہے۔ سرکاری نظم و نسق اور اقتصادی زندگی کے تمام شعبوں میں طے شدہ پالیسیوں اور پروگراموں کو زیادہ مضبوط ارادے کے ساتھ عملی جامہ پہنانا چاہیئے اور جانچ پڑتال کے زیادہ سخت طریقے اپنانے چاہئیں۔ مزید برآں ہمیشہ اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار پر، جو اقتصادی ترقی کو معنی پہناتی ہیں، مناسب زور دیا جانا چاہیئے۔ اگر قوم خاطر خواہ اتحاد اور نظم و ضبط قائم رکھے، ترقیاتی کاموں کا باربرداشت کرنے پر آمادہ رہے اور لوگوں کے مختلف طبقوں کو اس بات کا شعور ہو کہ اس مرحلے پر ان کا کیا فرض ہے تو اقتصادی اور سماجی پیش قدمی کی رفتار توقع سے کہیں زیادہ تیز ہو سکتی ہے۔ جن پالیسیوں کا بڑا اٹھایا گیا ہے وہ ٹریڈ یونینوں، امداد باہمی کی تحریک، رضاکارانہ تنظیموں اور یونیورسٹیوں جیسے اداروں کو استحکام بخشیں گی اور دیہاتی اور شہری برادریوں میں تعمیری لیڈرشپ پیدا کریں گی۔ وہ اقتصادی طاقت کے اجتماع اور اجارہ داری کی نشوونما کے انسداد میں تہذیبی اور اقتصادی اتحاد کو پروان چڑھانے میں اور بھارت کے ہر شہری کو کام کے مساوی مواقع اور ایک کم از کم معیار زندگی کا حق دینے میں معاون ثابت ہوں گی۔

انجام کار اقتصادی ترقی محض ایک حصول کا ذریعہ ہے اور اس کا مقصد ہے ملی جلی کوشش اور قربانی کے ذریعہ ایک ایسے سماج کی تعمیر جس میں مذہب و ملت اور دور رعایت کو کوئی دخل نہ ہو اور جو قوم کے ہر طبقے اور ملک کے تمام حصوں کو بڑھنے پھولنے اور قومی بہبود میں ہاتھ بٹانے کے پورے پورے مواقع بہم پہنچائے۔

## طویل المدت ترقیات کے بارے میں اندازِ نظر

اگلے تین پلانوں کی مدت میں اقتصادی ترقی کے تمام امکانات کو پورے اور مؤثر طور پر بروئے کار لانا لازمی ہے۔ تیسرے پلان اور بعد کے پلانوں کے لئے جو حکمت عملی منظور کی گئی ہے وہ زراعت اور صنعت کے اقتصادی اور سماجی، ملکی اور علاقائی ترقی کے ایک دوسرے پر انحصار اور اندرونی اور بیرونی ذرائع کی فراہمی پر زور دیتی ہے۔ زراعت کی ترقی جو دیہات کی افرادی قوت اور منفعی ذرائع کے زیادہ سے زیادہ استعمال پر مبنی

ہے، ملک کی ترقی کی کنجی ہے۔

## ۶۶ - ۱۹۶۱ء کے آثار

اندازہ ہے کہ ۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں کے حساب سے قومی آمدنی دوسرے پلان کے اختتام پر تقریباً ۵۰۰ ۱۴ کروڑ روپے سے تیسرے پلان کے اختتام پر تقریباً ۱۹۰۰۰ کروڑ روپے۔ چوتھے پلان کے اختتام پر تقریباً ۲۵۰۰۰ کروڑ روپے اور پانچویں پلان کے اختتام تک بڑھ کر ۱۴-۱۵، ۱۷-۱۸ اور ۱۹-۲۰ فی صد ہو جانی چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں تیسرے پلان کی مجوزہ رقم ۱۰۵۰۰ کروڑ روپے کے مقابلے میں چوتھے اور پانچویں پلان میں خالص سرمایہ کاری ۱۷۰۰۰ کروڑ روپے اور ۲۵۰۰۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوگی اور گھریلو بچتوں کو جو اس وقت ۸ فی صد ہیں تیسرے اور چوتھے اور پانچویں پلان کے اختتام پر علی الترتیب قومی آمدنی کے تقریباً ۱۱ فی صدی، ۱۵ تا ۱۶ فی صدی اور ۱۸ تا ۱۹ فی صدی تک بڑھانا ہوگا۔ پانچویں پلان کے اخیر میں معیشت اتنی مستحکم ہو جائے گی کہ غیر ملکی سرمائے کی عام آمدنی کے علاوہ بیرونی امداد کے بغیر ہی تسلی بخش رفتار نشوونما پانے لگے گی۔

## تیسرے پلان سے متعلق نقطۂ نظر

پچھلے دس سالوں میں کل سرکاری اور نجی سرمایہ کاری، جو پہلے پلان کے شروع میں ۵۰۰ کروڑ روپے سالانہ سے زائد تھی، بڑھ کر دوسرے پلان کے اختتام پر ۱۶۰۰ کروڑ روپے ہوگئی۔ سرکاری اداروں کی طرف سے سرمایہ کاری اس عرصے میں ۲۰۰ کروڑ روپے سے ۸۰۰ کروڑ روپے تک جا پہنچی۔ موجودہ قیمتوں کے حساب سے پہلے اور دوسرے پلان میں مجموعی سرمایہ کاری ۱۰۱۱۰ کروڑ روپے تھی جس میں ۵۲۱۰ کروڑ روپے سرکاری حلقے میں اور ۴۹۰۰ کروڑ روپے نجی حلقے میں۔

پہلے پلان میں زیادہ تر زرعی پیداوار میں ترقی کے باعث قومی آمدنی بہ قدر ۱۸ فی صد بڑھی جبکہ اصل نشانہ ۱۲ فی صد تھا دوسرے پلان میں قومی آمدنی میں اضافہ ۲۰ فی صد رہا جبکہ اصل نشانہ ۲۵ فی صد تھا۔ زرعی پیداوار میں تقریباً ۴۰ فی صد توسیع ہوئی اور اناج کی پیداوار میں ۴۶ فی صد۔ مصنوعات تیار کرنے والی منظم صنعتوں کی خالص پیداوار تقریباً دگنی ہوگئی۔

پچھلے دس سال میں ترقی یکساں نہیں رہی۔ قدرتی اسباب، بین الاقوامی حالات یا بعض حالتوں میں عمل درآمد کی خامیوں کے باعث نشیب و فراز آتے رہے ہیں۔ آبادی کے اضافے نے بے روزگاری کا مسئلہ اور پیچیدہ بنا دیا۔ ناکامیوں اور غلطیوں، جن سے بچا جا سکتا ہے اور اقتصادی اور سماجی ڈھانچے کی ان کمزوریوں کے باوجود جو ابھی تک ہر طرف پائی جاتی ہیں نئی راہیں ہموار کر دی گئی ہیں اور بیش قیمت تجربہ حاصل ہوا ہے۔

تیسرے پلان کی غرض و غایت خاص کر زرعی معیشت کو مستحکم بنانا، صنعت، برقی قوت اور نقل و حمل کو فروغ دینا اور صنعتی و سرفہرست تیز کو جلد از جلد عمل میں لانا ہے۔ سماجی مواقع اور سماج کے سوشلسٹ ڈھانچے کی جانب نمایاں طور سے پیش قدمی کرنا اور کام کرنے والوں کی تعداد میں جو اضافہ ہو ان سب کو روزگار بہم پہنچانا ہے۔

ان مقاصد کا حامل ترقیاتی منصوبہ قوم سے دور رس تقاضے کرے گا۔ یہ ضروری ہے کہ تیسرے پلان کے دوران میں ترقیات کا بار منصفانہ طور پر بٹ جائے اور ہر مرحلے پر اختیار کی جانے والی اقتصادی، مالی اور دوسری پالیسیاں عوام کی بہبود اور معیار زندگی میں سدھار کریں۔

## زراعت کو اوّلین ترجیح

تیسرے پلان کی ترقیاتی اسکیم میں زراعت کو اوّلین ترجیح دی گئی ہے۔ تیسرے پلان کے اہم مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دیہاتی علاقوں میں افزائش قوت کے وسائل سے کام لیا جائے۔ دیہاتی علاقوں کی ترقی میں ذمہ داری اور تحریک عمل گرام پنچایتوں، پنچایت سمتیوں اور ضلع پریشدوں کے ہاتھ میں ہے۔

دوسرے پلان کی طرح تیسرے پلان میں بھی بنیادی صنعتوں جیسے فولاد، ایندھن، برقی قوت اور مشین سازی اور کیمیائی صنعتوں میں توسیع تیز تر معاشی ترقی کے لئے ضروری سمجھی گئی ہے، اور پوری معیشت کی ضروریات اور تقاضوں کی اہمیت کے مطابق ان صنعتوں کے پھیلاؤ

کے پروگرام تیار کئے گئے ہیں۔ تیسرے پلان میں بڑی اور چھوٹی صنعتوں کے درمیان تعلق پیدا کرکے صنعتی ڈھانچے میں چھوٹی صنعتوں کو کلیدی اہمیت دینے کی کوششیں جاری رکھی جائیں گی تاکہ صنعتی ترقی کے فائدے قصبات اور دیہات کے لوگوں تک بھی پہنچ سکیں۔ اور ساتھ ہی دیہی صنعتوں میں جدید تکنیک کا بھی رواج ہو سکے۔

تیسرے پلان کے دوران میں ہماری قوم پانچ سال کی مدت میں اتنی ہی کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہے جتنی گزشتہ دس سال میں پہلے اور دوسرے پلان کے ذریعے حاصل کی گئی ہے لہٰذا حال اور مستقبل کے لئے یہ پلان ایک بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ اس کے انتظامی پہلو بھی اتنے ہی پیچیدہ اور وسیع ہیں اور ہر شعبے میں اعلیٰ معیار کارکردگی قائم رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ مؤثر عمل درآمد تبھی ممکن ہے جبکہ اپنے ذرائع و وسائل سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کی جائے اور ہر اہم مرحلے پر مکمل ربط ہو اور آنے والی مشکلات اور مسائل کا پورا علم ہو اور ترقی کے موقعوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہنرمند اور پڑھے لکھے لوگ ذمہ داریاں اپنے سر لے سکیں پلان چاہے کتنا ہی مفصل اور داغ ہو وہ صرف وسیع سلسلۂ عمل کے موٹے موٹے خطوط کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ بہت بڑا چیلنج ہے جس کا مقابلہ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ ان کے تقاضوں کا شعور ہو اور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے پیداوار کے نئے ذرائع کو جنم دیا جائے اور معاشی سہولیات اور سماجی انصاف کے لئے اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت کو پیش نظر رکھا جائے۔

---

قاضی معراج دھولپوری

## داستانِ حُسن

فہم سے خالی بشر سمجھا نہ رُتبا حُسن کا
فی الحقیقت ورنہ ہر بندہ تھا بندا حُسن کا

سوئے کعبہ جا رہا تھا کاروانِ آرزو
لوٹ آیا راہ سے دیکھا جو چہرا حُسن کا

جھک گیا سجدوں کی خاطر اضطرابِ شوق میں
کعبۂ دل کو نظر آیا جو نقشا حُسن کا

حُسن لیلےٰ دیکھنے کو چشمِ مجنوں چاہیئے
اہلِ ظاہر کیا سمجھ سکتے ہیں رُتبا حُسن کا

عالمِ بالا میں پہنچی جب نگاہِ خود شناس
منتہائے اوج پر دیکھا ستارا حُسن کا

جذب ہو کر اک نگہ میں رہ گئے چودہ طبق
اہلِ دل کو جب نظر آیا سراپا حُسن کا

چھوڑ کر تنہا چلے جائیں گے سارے اقربا
دورِ غم میں کام آئے گا سہارا حُسن کا

سوئے کعبہ جائیں ہم یا سیرِ بُت خانہ کریں
حسن افروزِ نظر ٹھہرے گا جلوا حُسن کا

کہہ دیا معراج یہ کیا آپ نے اشعار میں
تھا لبِ خاموش پر بھی آج چرچا حُسن کا

چندر کرن سوں کسا

# شکستِ خواب

شام ہو چلی تھی۔ روپ بازار کے سب آباد کوٹھے بجلی کے لال پیلے ہرے نیلے قمقموں سے جگمگا اُٹھے۔ دن بھر بے رونق رہنے والے کمرے اس وقت سنید چاندنی، گاؤ تکیے، پاندان، خاصدان وغیرہ سے آراستہ ہو کر بگرے اور پھولوں سے مہک اُٹھے۔ کہیں سے گھنگھروؤں کی آواز آ رہی تھی کہیں طبلے کے ساتھ سارنگی کے سُر ملائے جا رہے تھے۔ مگر زہرہ کا کوٹھا اس وقت بھی تاریک تھا۔ وہ کئی ماہ سے بیمار تھی۔ ہفتہ وار نئے جوان حسن پر منڈلایا کرتے تھے، ایک ایک کر کے اڑ گئے۔ ایسا نہ تھا کہ اُسے کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ یا نائکی تمام ناچنے والیاں دن بھر اس کے پاس جمع رہتی تھیں۔ خدمت، تیمارداری اور علاج میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ بوڑھے استاد جی بھی دن کا کافی وقت زہرہ کے پاس گزارتے تھے۔ تقریباً تین ماہ سے تنخواہ کے نام پر ایک پیسہ بھی نہ ملنے پر استاد جی زہرہ کی گیارہ سالہ لڑکی کو ناچ و گانا سکھانے میں کبھی ناغہ نہ کرتے۔ لیکن شام سے آدھی رات تک روزگار کا وقت رہتا ہے اس لئے اس وقت زہرہ اکیلی ہی رہتی۔ بوڑھی خادمہ نے زیرو پاور کا بلب جلا کر پوچھا: "بیگم دودھ لے آؤں؟"

دودھ! بیماری اور دودھ۔ زہرہ کو دودھ کے نام سے چڑ ہو گئی تھی مگر دودھ نہ پیئے تو کمزوری کیوں کر دُور ہو۔ طاقت کا دوسرا نام حسن و جوانی ہے۔ دودھ تو پینا ہی پڑے گا۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لے آیئے۔"

گندے بستر سے پریشان ہوئی زہرہ سوچ رہی تھی — کیا زندگی ہے یہ بھی..... کیڑے کوڑے سے بھی بدتر۔ لاکھ نخوت نہیں، ہیکڑی ٹھاٹ باٹ کھائیں لیکن ایک غریب مزدور بھی نہیں اپنے سے گئی گزری سمجھتی ہے اور کیوں نہ سمجھے۔ وہ مزدوری کرتی ہے، اپنی محنت بیچتی ہے۔ محنت ہاتھ پیر کا میل ہے اور ہم لوگ فروخت کرتے ہیں جسم، عزت، پاکیزگی۔ اس کی کوئی برابری نہیں ہے۔ مگر زندگی کی دھندلی شام جب ہمارے تھکے ماندے جسموں پر جھریاں بن کر اُبھرنے لگتی ہے۔ تب ان خریداروں میں سے کوئی جھانکتا بھی نہیں آتا..... دروازے پر آہٹ سن کر اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ امی امی پکارتی ہوئی جوہی آ کر ماں سے لپٹ گئی اور اس کے پیچھے بوڑھے استاد جی بھی داخل ہوئے۔

"بڑا اچھا تماشہ تھا امی" جوش میں جوہی بولتی گئی۔ "ایک میری ہیرو کی لڑکی نے ٹھمک ٹھمک ناچ دکھایا۔ اسے تین تمغے چاندی کے ملے اور ایک بڑی لڑکی نے بھرت ناٹیم دکھایا۔ ایک نے ستار پر شیام کلیان بجایا..... امی میں بھی ٹھمک سیکھوں گی اور تم مجھے اسکول پڑھنے کیوں نہیں بھیجتی ہو.....؟"

بیٹی کے سلسلۂ کلام کو روکتے ہوئے زہرہ نے کہا۔ "اچھا اچھا جا کر کپڑے بدل اور کھانا کھا۔"

"نہیں پہلے وعدہ کرو کہ مجھے اسکول بھیجو گی۔"

"بھیج دوں گی بابا۔" زہرہ نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ جوہی اپنا ریشمی غرارہ سرسراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"اب جلدی سے تندرست ہو جاؤ زہرہ بائی۔" استاد جی نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "سنگترے کا عرق پیا یا نہیں اور دودھ ہر گز ایک پیالہ لیا واہ۔ اس طرح نہیں طاقت آ سکتی ہے۔ ابھی چار پانچ سال تک تو تمہیں اپنا

خیال رکھنا ہی پڑے گا۔ پھر جوہی بیٹی تیار ہو جائے گی تو انشاء اللہ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ واہ کیا خوب گلا پایا ہے۔ اور پاؤں تو طبلے کی تھاپ کے ساتھ یوں تھرکتے ہیں جیسے پانی۔ میں کہتا ہوں دیکھنا تو سہی جس دن اپنی جوہی نے محفل میں قدم رکھا، سارے بازار کی روشنی سمٹ کر تمہارے کوٹھے پر چلی آئے گی۔"

"مگر استاد جی! میرا ارادہ جوہی کو محفل کی شمع بنانے کا نہیں ہے۔"

"تو.....تو....." استاد جی چونکے، ہکلاتے ہوئے بولے۔ "کیا شادی کر دینے کا ارادہ ہے۔ بائی جی اس خیالِ خام کو دماغ سے نکال ہی دیجئے تو بہتر ہے۔ کوئی شریف آدمی رنڈی کی لڑکی کو اپنی دلھن بنانے کو تیار نہ ہوگا۔"

"ہوں۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میری دلی خواہش ہے کہ وہ اگر کسی اچھے خاندان کی دلھن نہ بھی بنے تو کم از کم اس پیشے سے آزاد رہے۔"

"ایں" استاد جی نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "بڑھاپے میں تم کیا کرو گی بیگم؟ دو مہینوں میں دیکھو کیا حال ہو گیا۔ مکان کا کرایہ، بنیا، دھوبی، دودھ والا، سب کی مقروض ہو گئی ہو۔ تم پر خدا کا کرم ہے اس نے چاند سی بیٹی عطا فرمائی ہے ورنہ دوسری ہم پیشہ عورتوں کی طرح ادھر اُدھر لڑکی تلاش کرتی پھریں۔ خانم نے تمہیں بھی تو چار سو میں خریدا تھا۔ تعلیم دے کر تیار کیا پھر بڑھاپے تک آرام سے پان چباتی رہیں۔"

"کاش مجھے تعلیم کے بجائے زہر دے دیا ہوتا۔" زہرہ نے آہ بھری۔ "نہیں استاد جی میں تو نہیں چاہتی کہ ہماری جوہی برتن صاف کر کے دن گزارے مگر اتنا ضرور چاہتی ہوں کہ پانی پیٹ کے لئے اپنی جوانی کی دوکان نہ سجانی پڑے۔ مگر اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ ناچنا گانا بڑے بڑے شریف گھروں کی بہو بیٹیاں سیکھنے لگی ہیں۔ نوکری کرتی ہیں، وکالت کرتی ہیں تو کیا میری جوہی کوئی ایسا ہی سکھانے پڑھانے کا کام کر کے گذر بسر نہیں کر سکتی؟ محبت کر کے کسی پر نثار ہو جائے یہ بات الگ ہے مگر اسے پڑھنے لکھنے کا کتنا شوق ہے۔ میں اسے پڑھاؤں گی اور اونچے درجے کی موسیقی سکھاؤں گی تاکہ وہ اپنے ہنر سے روٹی کما سکے۔ اسے وہ فخر حاصل ہو جو ایک مزدوری کرنے والی پاک دامن عورت کو ہوتا ہے مگر ہماری ایسی عورتوں کو حاصل نہیں ہوتا، خواہ ہم بہت امیر ہی کیوں نہ ہوں۔"

استاد جی نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن سوچ سمجھ لو۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ نوبجے گلاب بائی کی محفل میں طبلے پر سنگت کرنی ہے۔"

"سلام"

استاد جی دعائیں دیتے ہوئے باہر چلے گئے۔

شریعت بلخ اور سمجھے جانے کی تمنا اور کسی شخص کی ہمیشہ ہو کر زندگی بسر کرنے کی آرزو زہرہ کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔ اپنی جوہی کے لئے وہ اسی خواب کو حقیقت میں بدل دینا چاہتی تھی۔ اس نے سُنا تھا شہر میں کئی اسکول کھل گئے ہیں جہاں بڑے گھروں کے بچے ناچ گانا سیکھتے ہیں۔ کتھک ناچ کے مشہور اُستاد سے اس نے التجا کی کہ اس کی لڑکی کو اپنی شاگردی میں قبول کر لیں۔ وہ اس کو محفل کے رقص نہیں سکھانا چاہتی۔ استاد جی جوہی کو ٹھمری، دادرا اور قوالی کے بجائے دوسرے تمام راگنیوں کی تعلیم دینے لگے۔ ماسٹر سے گھر ہی پر کورس ختم کرا کے اسے ساتویں جماعت میں شہر کے ایک ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ جوہی اس کو روزانہ موٹر میں پہنچا آتی۔ "امی میری بہت سی سہیلیاں بن گئی ہیں۔ انجینیر صاحب کی بیٹی اوشا تو مجھے آج اپنی موٹر میں لے جا رہی تھی — امی ڈاکٹر بھاٹیہ کی اندرا کو جو ماسٹر ستار سکھاتے ہیں وہ چالیس روپے ماہوار لیتے ہیں — امی ہماری شمی بہن جی بہت اچھی ہیں۔ میں بھی پڑھ لکھ کر استانی بنوں گی۔ امی گانا سکھانے والی بہن جی کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے ہیں۔ میں بڑی ہو کر اپنے اسکول میں گانا سکھاؤں گی — امی جب میں گانے لگوں گی تب تم یہ گانا بجانا بند کر دینا۔ مجھے یہ گانا سننے والے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ کیسی واہیات باتیں بکتے ہیں....." بیٹی کی باتیں سن کر زہرہ کا دل باغ باغ ہو جاتا۔

دن گزرتے گئے۔ یتیں سال میں جو کمال کتھک ناچ میں جوہی نے حاصل کیا اس پر بیندہ مہاراج دنگ تھے۔ کلاسیکی موسیقی میں کرشن بھگتی کے گانے جوہی اس خوبی سے گاتی کہ استاد جی نے اس کا نام میرا رکھ دیا

تھا ستار کے جملے سُن کر راستہ چلتے شوقین طبیعت لوگ رُک رُک کر کوٹھے کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ زہرہ بیٹی کی اس ترقی کو دیکھ کر بہت خوش تھی اور اس دن کے خواب دیکھ رہی تھی جب اس کی چوہی موسیقی کا اپنا اسکول چلائے گی۔ شہر کے معزز لوگوں کے بچے اس کی آپا اور بہن ہی کہہ کر عزت کریں گے۔ شہر کے بڑے بڑے موسیقی کے جلسوں میں عزت کے ساتھ بلائی جائے گی، محض کی رقاصہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اعلیٰ فن کار کی حیثیت سے..... اور..... اور..... پھر شاید اس کی قسمت جاگے تو کوئی شریف دل والا کلاکار اُسے اپنی رفیقۂ حیات بنانے پر آمادہ ہو جائے.....

ایک دن جو ہی اسکول سے واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر بڑے پیار سے بولی "امی تمہیں اجازت دینی ہی پڑے گی۔"

"کس بات کی؟"

"سول لائن جانے کی۔ تم مجھے میری سہیلیوں کے پاس نہیں جانے دیتی ہو نہ انہیں بلاتی ہو۔ مگر میں آج وعدہ کر آئی ہوں۔ وہاں کے لڑکے اور لڑکیاں مل کر دیوالی پر جو ورائٹی شو کر رہے ہیں اس میں میں کتھک ناچ ناچوں گی اور سٹار پر بھی میرا کے دو بھجن گاؤں گی۔ مگر انہیں طبلے والا نہیں مل رہا ہے۔ میں اس دن استاد جی کو لے جاؤں گی — دیکھو امی اب منع مت کر دینا۔ وہاں ڈاکٹروں، پروفیسروں اور وکیلوں کی لڑکیاں میری کتنی خوشامد کر رہی تھیں۔"

"اچھا!" زہرہ نے کہا بے شک وہ بڑے گھروں کی عورتوں میں بیٹھنے کا حق کھو چکی ہے مگر اس کی بیٹی جو ہی تو ان کے بچوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ سکتی ہے۔ وہ کچھ کا کچھ نا کھول ہے اور اگر وہاں کے معزز لوگوں پر اس نے اپنی دھاک جما لی تو اسے اسکول کھولنے میں سہولت ہو گی۔ شاید اسی دن سے کچھ صاحبان اپنی بچیوں کو کتھک ناچ کے ٹیوشن کے لئے منظور کر لیں۔ زہرہ کا دل اس خیال سے کھل اُٹھا۔

خوب تیاریاں کی گئی تھیں۔ انجنیر صاحب کے بڑے لان میں سینکڑوں کرسیاں پڑی تھیں، دریاں بچھی تھیں۔ مہمانوں کو پانی پیش کیا جا رہا تھا۔ دالان بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا اور پیشی پردوں سے ڈھکا ہوا اسٹیج بڑا شان دار لگ رہا تھا۔ سات بجے سے ورائٹی شو کا پروگرام تھا اور ابھی سے شہر کے تعلیم یافتہ، مہذب، معزز اور دولت مند لوگوں سے بھر گیا تھا۔ یہ تو انہیں کے بچے بچیوں کا کھیل پروگرام تھا دیکھنے کیوں نہ آتے۔ ڈاکٹر بھلا کے صاحب زادے سے پرمود یا بو جو کہ ڈائرکٹر بھی تھے، عمر بھی صرف سترہ سال کی تھی، نہایت پریشان تھے۔ گرین روم میں کوئی ان سے مونچھیں ٹھیک کراتا تو کوئی صافہ بندھوانے کی جلدی کرتا۔ لڑکیاں کریم پاؤڈر بندی اور لپ اسٹک کے ساتھ ہولی کھیل رہی تھیں۔ مگر طبلے والا ابھی تک ندارد تھا۔ پہلی بار وہ اپنی ذمہ داری پر ایسا شو کر رہے تھے۔ یوں تو اسکول کالجوں میں پروفیسروں کی ہدایت کاری میں ان میں سے بہت سے بچے بچیاں اداکاری کر چکے تھے۔ یہ ذمہ داری ان پر پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔ سات بج گئے۔ پرمود چیخ اُٹھا۔ "ارے شیلا تم ابھی تک سرسوتی بن کر تیار نہیں ہوئیں۔ اوشا، سُدھا، کملا چلو اسٹیج پر لائن بنا کر کھڑی ہو۔ رمیش تم پردے کے پیچھے سے جن من گن گاؤ۔ یہ لڑکیاں بیچ میں بھول گئیں تو سب گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"طبلے والا نہیں آیا۔ راجندر نے گھبرا کر اپنی بہن سے پوچھا" اوسو دیکھا تیری سکھی جوہی کہاں ہے جس نے کتھک ناچ کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اب ساڑھے سات بج رہے ہیں۔ اس کا گھر بتاؤ تو کسی کو بلانے بھیجوں۔"

"گھر کا مجھے پتہ نہیں۔"

"کس کی لڑکی ہے؟ واہ یہ بھی پتہ نہیں — ناچ کے بغیر پروگرام خراب ہو جائے گا۔ تو بھی بے وقوف ہے۔ تین سال سے کتھک اسکول میں جاتی ہے مگر اسٹیج پر آنے کے نام سے نانی مرتی ہے۔"

باہر پردہ کھلوانے کے لئے تالیاں بج رہی تھیں۔ کسی طرح پردہ اٹھا بغیر طبلے و ہارمونیم کے گانے سے سب بے مزہ لگ رہے تھے۔ پھر بھی تالیاں بھیں، دادیں کیوں کہ بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی ضروری تھی۔

ایکٹ آئٹم ختم ہوئے مگر پھیکے سے، اُکھڑے ہوئے سے۔ پرمود نے گرین روم میں جھلا کر کہا۔ "سور دیکھا کیا اسٹیج پر جا کر سکھایا پڑھایا سب بھول گئی۔ ہے تمہاری سکھی جوہی کہاں غائب ہو گئی — ؟؟ طبلے والا کہاں مر گیا؟؟؟"

سوریکھا پچھواڑے سے بھاگتی ہوئی باہر آئی شاید جوہی آئی ہو وہ کئی بار پہلے بھی دیکھ گئی تھی۔ ایک رکشا آکر رکا۔ اس میں جوہی تھی۔ ساتھ میں بوڑھے استاد جی دبلے سنبھالتے ہوئے اترے۔ سوریکھا جوہی کو جلدی جلدی گھسیٹتی ہوئی اندر پہنچی — "لو آگئی — جان کھا ڈالی اتنی دیر میں، جوہی تم نے بہت دیر لگائی۔"

جوہی آج ساٹن کا جوڑی دار پاجامہ اور ویسی ہی گوٹہ دار اچکن پہنے ہوئے تھی۔ سب کو نمستے کرتی ہوئی بولی۔ "درزی نے یہ کپڑے دینے میں دیر کی۔"

"جلدی کرو۔" پرمود بولا۔ "ان کا میک اپ کردو۔ اگلی بار یہی اسٹیج پر جائیں گی۔"

"میں یونہی جاؤں گی۔" چاند سی کھلی ہوئی جوہی نے کہا۔ "مجھے لپ اسٹک بہت بُری لگتی ہے۔ لاؤ ذرا سا پاؤڈر لگا لوں۔"

پرمود نے مائک پر اعلان کیا کہ اب کماری جوہی کتھک ناچ پیش کریں گی۔

پردہ اُٹھا۔ طبلے پر چوٹ پڑی اور جوہی ناچ کی مدرا میں سر جھکائے کھڑی تھی — تا تھئی تتھئی تت کی سُریلی آواز پورے لان پر چھا گئی۔ "یہ نئی لڑکی کون ہے؟ سول لائن کی تو ہے نہیں۔" لوگوں نے انجنیر صاحب کی طرف دیکھ کر پوچھنا شروع کیا۔ "شوان کے یہاں ہو رہا ہے انھیں ضرور معلوم ہوگا۔ جوہی کی خوب صورت انگلیوں بند سے ہوئے پاؤں اور سریلی آواز نے سب پر جادو سا کر دیا۔

"پخت سیام سنگیت مدھر دھن بجت گھنگھرو جھن نن ن۔ ن تا تھئی تا تھئی تراام تھئی تتا تراام تھئی۔" بیٹھے بول پر بول پھوٹنے لگے۔ "مدرائیں بنتی گئیں وقت گزرتا گیا اور جوہی تیز اور تیز ناچتی گئی۔ سب لوگ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ وہ رکی جیسے کسی نے چلتے ہوئے ٹیپ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہاتھ جُڑے، نظریں جھکیں اور اشارا پاتے ہی پرمود نے پردہ گرا دیا۔

"دس مور..... شاباش ....." تیز آواز کے ساتھ ڈاکٹر وکیل، ایس پی سب لوگوں نے انجنیر کے کان کھا ڈالے۔ "یہ کماری جوہی کون ہیں؟ — یار کمال کر دیا — بڑی ہونہار ہے — ضرور یہ بنارس گھرانے کی شاگرد ہے — اس کے باپ کیا کرتے ہیں — پرمود سے کہیں ان کا ایک شو اور ہوگا — کیوں یار بتاؤ نا یہ کون ہیں — ہمارے کالج کے جلسے میں بھی آئیں گی یا نہیں ——" مگر انجنیر صاحب نے جواب میں اتنا کہا کہ "میں خود نہیں جانتا یہ کس کی ماجزادی ہیں۔ شاید پرمود کے کسی دوست کی بہن ہیں۔ اس سے پوچھتا ہوں۔" مسٹر ورما کئی آدمیوں کے ساتھ اندر پہنچ گئے۔ "کیوں پرمود یہ کماری جوہی کس کی لڑکی ہیں؟ کیوں بٹیا تمھارے والد کا کیا نام ہے؟ جوہی خاموش سی آنکھیں جھکائے کھڑی رہی۔ پرمود نے کھسیا کر سوریکھا کی طرف دیکھا۔ سوریکھا نے استاد جی کی طرف — استاد جی نے آداب بجا کر بہت شائستگی سے جواب دیا۔ "سرکار یہ ہماری بیٹی ہے اسکول میں نویں جماعت کی طالب علم ہے۔" ہندی لگی داڑھی، چکن کا کرتہ، درباری آداب — ورما جی سناٹے میں آگئے۔ پروفیسر صاحب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے — استاد جی داخ طور پر کسی کوٹھے والی کے دلبلے معلوم ہوتے تھے۔

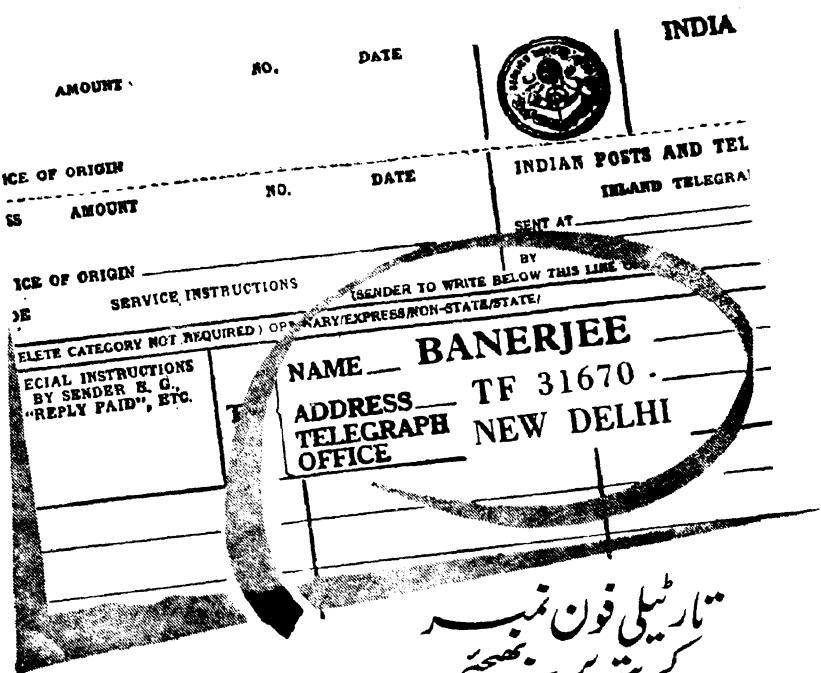
فوراً رنگ ڈھنگ بدل گئے۔ "..... تو ..... تو ....."

یہ کسی بائی جی کی لڑکی ہیں؟ بائی یعنی طوائف — ارے بھلے گھر میں طوائف گھس آئی۔" ورما جی نے آنکھیں نکال کر پرمود سے پوچھا۔ "تم نے کسی سے پوچھ کر انھیں بلایا۔ جانتے ہو یہ طوائف؟"

طوائف! جوہی پیلی پڑ گئی۔ بچے چونک پڑے مگر پرمود ہکلایا۔ "ڈیڈی یہ تو اتنی چھوٹی ہیں ..... سوریکھا کی سکھی ہیں۔"

"یہ نہ ہی۔ اس کی ماں تو طوائف ہے۔ ہم سے پوچھے بغیر اس لڑکی کو کیوں بلایا۔ اور استاد جی آپ کی بھی عقل ماری گئی۔ یہ شریف لڑکے لڑکیوں کا پروگرام ہے۔ کسی شریف اور عزت دار کے گھر پر آپ انھیں لے کیسے آئے؟"

وہ خاموش رہے۔ کیسے کہتے کہ وہ بچی کی حوصلہ افزائی کے لئے لائے تھے۔ ورما بولتے ہی گئے۔ "چلئے جلدی اپنا طبلہ سنبھالئے۔ کہاں پروگرام میں ایسی لڑکیوں کی کیا ضرورت ہے؟"




# تار ٹیلی فون نمبر کے پتہ پر بھیجئے

تار رسانی کی اس نئی سروس کے لیئے آپ کو پتہ میں بس اُس آدمی کا نام، جسے آپ تار بھیج رہے ہیں، اُس کا ٹیلی فون نمبر اور ڈاک گھر کا نام ہی تو لکھنا ہے۔ ٹیلی فون نمبر سے پہلے ٹی ایف ضرور لکھیئے۔ ٹی ایف اور ٹیلی فون نمبر کو ایک ہی لفظ مان کر دام لگائے جاتے ہیں۔

## آپ کا تار جلدی پہنچے گا



آپ فون پر بھی تار بک کر سکتے ہیں۔ اس کے لیئے براہ کرم ٹیلی گرام کا نمبر ڈائیل کیجئے

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمۂ ڈاک و تار

DA 6/737

# باہر کے مُلکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹ - اسٹریٹ نمبر ۳۴ - پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲ - رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵ - بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا۔ ۳۱ گرینج روڈ، سنگاپور

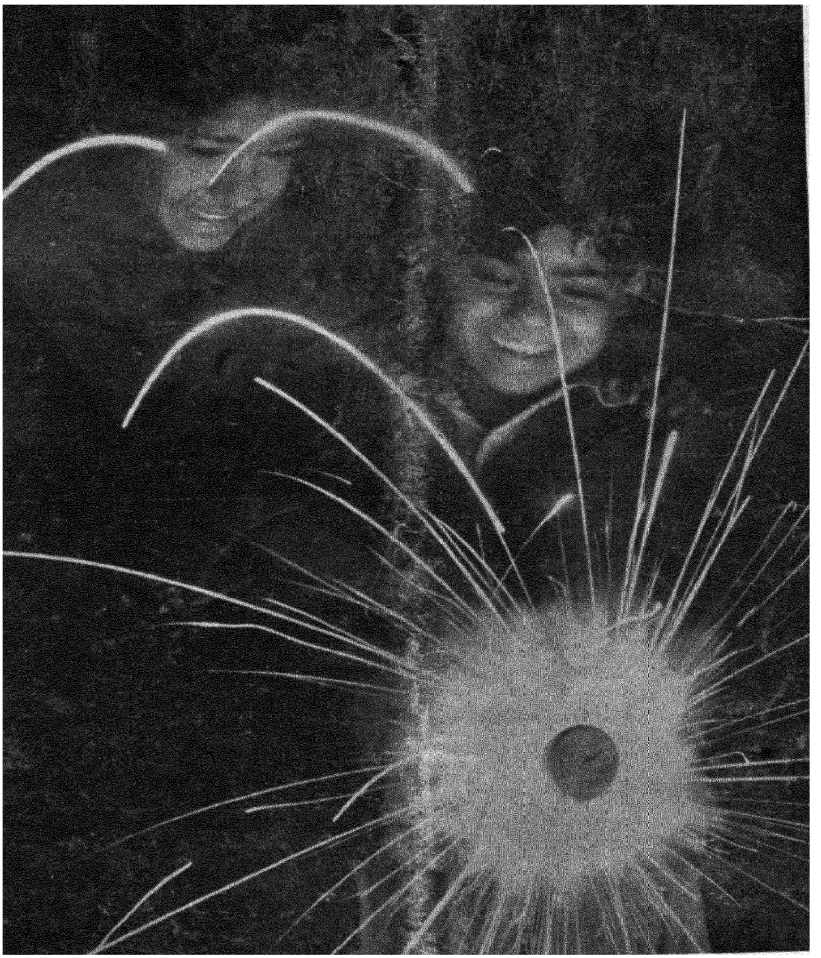
**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی**

# آج کل کے خریداران نوٹ فرمائیں

ہندوستان میں 'آج کل' کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ چندہ ختم ہونے سے پہلے ہی آئندہ سال کا چندہ بھیج دیں تاکہ رسالہ ان کے نام بدستور جاری رہے۔ خریداروں کی سہولت کے لئے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ان کا چندہ ختم ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے ہی انھیں اطلاع دے دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک 'بزنس ریمائنڈر کارڈ' بھی بھیجا جائے گا جس کی خانہ پُری کرکے بیرنگ ڈاک کر دیں۔ اگر کوئی جواب نہ ملا تو رسالہ بھیجنا بند کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے وی۔ پی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کے لئے ان کی طرف سے کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی ہو۔

ازراہِ کرم چندہ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**

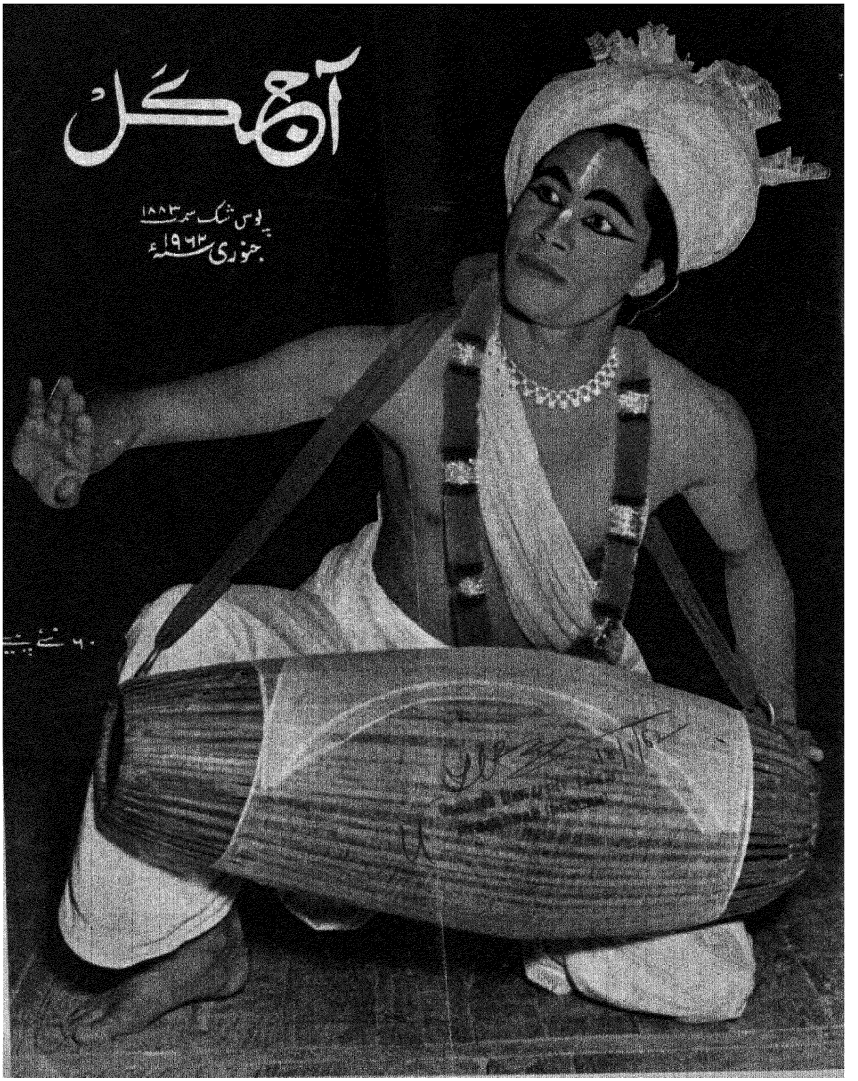


Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**

# آج کل

پوس شک سمہ ۱۸۸۳
جنوری ۱۹۶۳ء



۶۰ نئے پیسے

# ہماری کتابیں



| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پنڈت نہرو سے بات چیت ٹیبر منڈی | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| تیسرا پنج سالہ پلان | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ۴۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ۳۵ نئے پیسے | ۱۰ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں | ۱۰ نئے پیسے | ۸ نئے پیسے |
| نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ | (فی نمبر) | (فی نمبر) |

ملنے کا پتہ

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | اداره | ۲ |
| موسیقار اعظم | حضور ہسوانی | ۴ |
| جہیز | زیب النساء زیب | ۷ |
| مدرسۂ محمود گاواں بیدر | صلاح الدین رفعت | ۹ |
| کاکو اور اس کے پریمی | بلونت سنگھ | ۱۳ |
| داغ دہلوی کی اصلاحیں<br>برق بیسوی کے کلام میں | آمنہ خاتون | ۱۷ |
| میں کون ہوں | ثاقب کانپوری | ۲۷ |
| میرزا نامہ — از میرزا کا حران | اقتدار عالم | ۲۹ |
| بچپن | خاور باگوٹی | ۳۷ |
| چند گراں مایہ خطوط | رئیس بینائی بنگلوری | ۳۸ |
| غزل | مظفر حنفی بسوی | ۴۲ |
| نئی کتابیں | ع - م<br>ش - ح | ۴۳ |


سورق :- ڈھول بجانے والا ایک آسامی کلاکار
ملک کے ایسے کتنے ہی کلاکار جشن جمہوریت میں حصہ لیتے ہیں
رسالے کی پشت پر :- بھرت تالیم کا ایک انداز


جلد ۲۰ نمبر ۶

پوس شک سمت ۱۸۸۳

جنوری ۱۹۶۲ء


مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر ' آج کل ' (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶


اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آج کل دہلی

مجلس ادارت

| | |
|---|---|
| محمد حبیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | حیدرآباد |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| رحمان نیاہی | سری نگر |

یو - ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

ی - این - ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)

بی نجما ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)

مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- مظفر شاہ

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سنٹ

مرتب و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۱۰۳ دہلی

# ملاحظات

دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ثقافتی امور کی ہندوستانی کونسل اور ہندوستانی بین الاقوامی مرکز کے زیر اہتمام نئی دلی میں پہلی ایشیائی تاریخ کانگریس منعقد ہوئی اس میں ہندوستان اور بیرون ملک کے سو سے زائد مندوبین نے شرکت کی۔

یہ کانگریس کئی لحاظ سے بڑی اہم ہے۔ آج ایشیائی ملکوں میں جو بیداری پیدا ہو رہی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ وہ باہم مل بیٹھیں اور اپنے نظریات اور واقعات کو ڈھونڈیں جو ان میں مشترک ہیں تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی اور بیداری پیدا ہو۔ دوسرے یہ کہ مغربی مؤرخین نے ایشیا کی جو تاریخیں مرتب کی ہیں وہ عام طور سے مسخ شدہ ہیں اور ان میں حقائق اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر ایشیائی قوم گویا کسی مغربی قوم کی منتظر تھی کہ وہ آکر انھیں تہذیب اور شائستگی کا سبق سکھائے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ تہذیب اور انسانیت کو آگے بڑھانے میں ایشیائی ممالک کا نمایاں ہاتھ رہا ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے کہ پہلی کانگریس ہندوستان میں ہو رہی ہے کیونکہ آج ایشیا جن باتوں کا علمبردار ہے ان کی جھلک ہندوستان میں شاید دوسرے ہر ملک سے زیادہ نظر آتی ہے۔ پچھلے پانچ ہزار برسوں سے ہندوستان مختلف تہذیبوں کا سنگم رہا ہے اور مشترکہ ثقافت کی نمایندگی کرتا رہا ہے۔

وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے افتتاحی تقریر میں امید ظاہر کی کہ مؤرخین تاریخ کو صحیح طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کریں گے اور خصوصاً ایشیائی مؤرخین ایسی غلط باتوں کو دور کرنے کے لئے مزید کوشاں ہوں گے جو مغربی مؤرخین نے ایشیائی تاریخ میں بھر دی ہیں۔

آج جبکہ دنیا میں نظریوں کا اختلاف بڑھتا جا رہا ہے اور اس کا ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں پوری دنیا ہی نہ ختم ہو جائے تاریخ دانوں پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسی تاریخیں لکھیں جو نفرت کی بجائے محبت، جنگ و جدل کے بجائے صلح و آشتی، شک و شبہ کی جگہ اعتماد اور یقین پیدا کریں۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ واقعات توڑ مروڑ کر پیش کئے جائیں بلکہ صرف یہ ہے کہ ان باتوں کو زیادہ اُجاگر کیا جائے جو دلوں کو ملا رہی ہیں اور ان کو کم اہمیت دی جائے جو اختلاف اور انتشار پیدا کرنے کا باعث ہوں۔

مشترکہ رسم الخط کے باب میں تحقیق و تدقیق ہمیشہ جاری رہی ہے۔ ساری دنیا کو ایک ہی ریاست بنانے کا خواب اہل نظر دیکھ رہے ہیں یہ خواب شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکتا جب تک دنیا بھر کی زبان ایک

اور رسم الخط ایک نہ ہو۔ بیگم عبدالقدیر انصاری پنام مٹ علاقہ ہدایت نے اس باب میں خاص تحقیق کی ہے اور مسئلہ رسم الخط کی بین الاقوامی پیچیدگیوں کا ایک معقول حل نکالا ہے۔

ایک اچھے رسم الخط کے لئے ضروری ہے کہ

۱- دیکھنے میں جاذب نظر ہو
۲- لکھنے میں آسان و رواں ہو
۳- پڑھتے وقت اغلاط میں دھوکہ نہ ہو
۴- ہر زبان کے لفظ کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھے
۵- لکھائی چھپائی اور ٹائپ کے لئے موزوں ہو

انھوں نے اردو رسم الخط کی خامیاں اور خوبیاں پیش کی ہیں انگریزی حروف تہجی کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان میں سے گیارہ حروف C,G,Q W X Y A I E O U کی خامیوں کو تفصیل سے لکھا ہے۔

مشترکہ رسم الخط کے لئے انصاری صاحب نے انگریزی حروف تہجی ہی میں اصلاح و ترمیم کی ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ انگریزی حروف چوں کہ عالمگیر رسم الخط کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے مشترکہ رسم الخط کی تجاویز ایک بہت بڑے حلقۂ علم میں پسندیدگی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔

اصلاح و ترمیم کے بعد ایس حروفِ صحیح قائم کئے ہیں اور اعراب کے پانچ حروف ان میں شامل کر کے جملہ حروف کی تعداد چوبیس ہے اس کے بعد جن مخرجوں کے لئے حروف نہیں ہیں ان کے لئے اضافی حروف کو بلحاظ قریب المخرج حرف نقطوں اور لکیروں کے فرق سے تشکیل دی گئی ہے۔ اس مجوزہ رسم الخط میں کل بیالیس حروف ہیں۔ ایک کتابچہ مشترکہ رسم الخط کے نام سے انصاری صاحب نے شائع کیا ہے۔ اس کے متعلق اہلِ علم نے بہت اچھی رائیں دی ہیں۔

ہر زبان میں آوازوں کی تعداد محدود ہے۔ کچھ آوازیں ایک زبان میں پائی جاتی ہیں کچھ دوسری زبانوں میں۔ حروفِ صحیح کے علاوہ حروفِ علت اور زیادہ دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن انصاری صاحب نے بڑی کاوش سے حرکتوں کی اوپچ نیچ اور ہیئت، اشام و امالہ اور مخارج کے باب میں محققانہ بحث کی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا مجوزہ رسم الخط مکمل ہے لیکن اس قابل ضرور ہے کہ اہلِ علم ان کی تحقیق کا بغور مطالعہ کریں اور اگر ان کے نزدیک تجاویز مفید ہوں تو اس کے رائج کرنے کی کوشش کریں۔

ملک کی خوش حالی اور ترقی کا دارومدار ہماری تعمیری کوششوں پر ہے اور ان کے نتائج کو ہی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارا ملک کس رفتار سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس لحاظ سے صورتحال حوصلہ افزا ہے اور ہم ترقی کے میدان میں برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ حال ہی میں وزیر اعظم پنڈت نہرو کے ہاتھوں بھاکڑہ بند کے بائیں جانب والے پاور ہاؤس کا افتتاح ہوا جو ایشیا کا سب سے بڑا پاور ہاؤس ہے اور جس کی تعمیر پر ۲۲۰۲۲ کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے۔ اس سے دور دور تک برقی قوت پہنچ جائے گی۔ بھاکڑہ بند سے راجستھان کے ریگستانی علاقہ میں پانی پہونچانے کا انتظام کیا گیا ہے اور اس طرح یہ ریگستانی علاقہ لہلہاتے کھیتوں کی صورت میں بدل جائے گا۔

افریقہ کے ملکوں میں آزادی اور خود مختاری کی لہر سی آئی ہوئی ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ملک آزاد ہوتا رہتا ہے۔ ۹ دسمبر کو مشرقی افریقہ کا علاقہ ٹانگانیکا بھی آزاد ہو گیا اور برطانوی دولت مشترکہ کی برادری کا رکن بن گیا۔ یہ علاقہ کوئی چالیس سال تک برطانوی حکومت کے زیر انتظام رہا۔ اس کا رقبہ تین لاکھ بارہ ہزار مربع میل ہے۔ اس کی آبادی ۹۰ لاکھ افریقی، ۷۷ ہزار ایشیائی اور ۲۱ ہزار یورپی باشندوں پر مشتمل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ٹانگانیکا بھی ایک آزاد ملک کی حیثیت سے ہمہ جہت ترقی کرے گا اور آزاد دیشوں کی برادری میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکے گا۔

# موسیقارِ اعظم

شتاق حسین خان صاحب ۱۸۷۹ء میں اپنے آبائی وطن سہسوان (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ جب دس سال کے سن کو پہنچے تو اپنے والد کلّی خاں (جو اس فن کے بڑے ماہر تھے) سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی جس کا سلسلہ چودہ برس کی عمر تک جاری رہا۔ ۱۸۹۲ء میں عنایت حسین خان (جو چچا زاد بھائی تھے اور آگے چل کر جن سے خسر کا رشتہ ہو گیا تھا) کے پاس ریاست نیپال چلے گئے۔ جہاں ان سے اور ان کے بھائی محمد حسین خاں بین کار اور حیدر خاں اور ان کے صاحبزادے فدا حسین خان (جو مشہور موسیقار نثار حسین خان کے والد تھے) سے اڑھائی برس تک فن کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد سہسوان چلے آئے اور اپنے پھوپی زاد بھائی امداد حسین خاں (جو ہدّو خاں گوالیاری کے شاگرد تھے) سے علمِ موسیقی حاصل کیا۔ کچھ مدّت کے بعد اپنی ننھال قصبہ اترولی (ضلع علی گڑھ) جا کر اپنے ماموں پتّن خاں اور محبوب خاں درس سے (جو اس دَور کے نامور تھے) اکیس برس تک موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہاں سے عنایت حسین خاں کے پاس (جو اس دوران میں نواب حامد علی خاں صاحب والیٔ رام پور کے ہاں ملازمت حاصل کر چکے تھے) رام پور چلے گئے۔ اور ان سے مزید تین سال تعلیم حاصل کی۔ پھر جب عنایت حسین خاں، نواب ظفر جنگ بہادر کے بلاوے پر حیدر آباد گئے تو خان صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہاں دس برس نہایت لگن کے ساتھ اپنے فن کی تکمیل میں لگائے۔ اس دس سالہ مدت کے دوران میں ان کے فن کی تکمیل کے سلسلے میں ایک ایسا انقلاب نمودار ہوا کہ جس نے اچنبھے کو کھلا دیا۔

جب ان کا ریاض دس بارہ گھنٹے سے تجاوز کر گیا تو ان کی آواز گویا بالکل ختم ہو گئی۔ گاتا تو کیا وہ بات کرنے سے بھی معذور ہو گئے۔ یعنی ان کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی۔ کہتی ہی کوشش کرتے مگر آواز گلے سے باہر نہ آتی۔ وہ مایوس ہو گئے۔ مگر ان کے استاد اس تیزی سے ذرا بھی پریشان نہ ہوئے۔ انھوں نے ہدایت کی کہ ریاض اتنی ہی دیر کرتے رہو خواہ آواز قطعی نہ نکلے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب جو آواز کھلے گی تو وہ زندگی بھر خراب نہ ہو گی

لہٰذا خانصاحب اسی تندہی سے ریاض کرتے رہے۔ چند دنوں بعد ان کی آواز یکایک کھل گئی اور ان کا ریاض بارہ گھنٹے سے بڑھتے بڑھتے بیس گھنٹے تک جا پہونچا۔

ان کے استاد کا کہنا درست ثابت ہوا۔ اس وقت سے اب تک خانصاحب کی آواز نے کبھی دھوکا نہیں دیا۔

اب ان کی تعلیم تقریباً مکمل ہو چکی تھی اور وہ حیدر آباد سے رام پور آ کر نواب حامد علی خاں صاحب کے دربار میں ملازم ہو گئے تھے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نواب رضا علی خاں صاحب کے مسندنشین ہونے پر بھی خانصاحب دربار رام پور سے متعلق رہے۔

نواب رضا علی خاں صاحب ہی کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ساون کے مہینے میں جب بارش کی آمد آمد تھی۔ نواب صاحب موصوف نے حسبِ دستور بیگمات کی ساونی منانے کا اہتمام کرایا۔ جملہ بیگمات، کنیزیں، خواجہ سرا

اور فوج کے کتنے ہی جوانوں کے ساتھ نواب صاحب اپنے ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ درختوں پر جھولے ڈال دیئے گئے اور بارش کی بوچھار کا انتظار کیا جانے لگا۔ بادل کسی حسین موقع کی طرح آتے اور گزر جاتے مگر بارش نہیں ہوئی۔ اسی طرح آٹھ دن بیت گئے۔ آٹھویں روز نواب صاحب نے خاں صاحب کو بلا کر میگھ راگ گانے کا حکم دیا تاکہ پانی برس سکے۔ خاں صاحب یہ سن کر گھبرا گئے کیوں کہ آج ان کے فن کا امتحان تھا۔ اور اس امتحان میں کامیابی کی انہیں ذرہ بھر امید بھی نہیں تھی اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے میگھ راگ الاپنے سے بادل کے سوتے کھل جائیں گے۔ لہٰذا انھوں نے بصد احترام عرض کیا "حضور کی تعمیلِ ارشاد سے خادم انکار کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن دراصل وہ اس کا اہل نہیں۔" مگر نواب صاحب نہیں مانے۔ ساز منگائے گئے۔ دیگر درباری گویئے اور اہلِ دربار اکٹھا ہوئے اور ایک کمرے میں محفلِ سرود کا اہتمام کیا گیا۔

خانصاحب اس وقت حد درجہ متاثر تھے۔ اُن کی آنکھیں یا دیارِ آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں اور وہ عالمِ خیال میں اللہ تبارک تعالیٰ سے اس امتحان کی کامیابی کے لئے گڑگڑا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد خانصاحب میگھ ملہار گانے بیٹھے۔ حاضرین نے ان کا رنگ آج بالکل بدلا ہوا پایا۔ آواز کی غنائیت اور اس کا جادو حد کو تجاوز کر گیا اور وہ خود دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ ان کی آواز کی سحر انگیزی نے ہر سامع کو مسحور کر دیا۔ ہر شخص پر وجدانی کیفیت طاری تھی اور سب اپنے گرد و پیش سے بے خبر ــــ پھر سب لوگ اس وقت نیند سے جاگے جب روشن دان کے راستے پانی کی بوچھار کمرے میں آنے لگی۔ اب کیا تھا نواب صاحب کا چہرہ کھل اٹھا اور حاضرین کی آنکھیں تیز سے بھی تیز بارش کی پیش گوئی کر رہی تھیں۔ خانصاحب کو اس وقت جتنی مسرت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آج انھوں نے اپنے فن کی معراج پالی تھی۔

اس واقعہ کے تقریباً بیس برس بعد ۱۹۵۴ء میں دوسری بار آل انڈیا ریڈیو کانپور میں آپ کو میگھ راگ گانے کا اتفاق ہوا۔ جس وقت آپ نے الاپ شروع کی تھی۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ ادھر آپ گاتے رہے اُدھر خدا جانے کہاں سے بادل کے ٹکڑے آسمان کو گھیرتے رہے۔ اور جب آپ نقطۂ عروج پر پہونچے تو یکایک زور کی بارش ہونے لگی۔ ہال میں جمع ہوئے لوگوں کو (جن میں بیشتر نامور موسیقار تھے) بارش کا علم اس وقت ہوا جب باغ میں بیٹھا ہوا مالی اور چوکیدار بارش سے بچنے کے لئے کمرے میں سرعت سے داخل ہوا۔

اس کے علاوہ چند بار اور بھی آپ نے میگھ راگ کا مظاہرہ کیا جس میں ہر مرتبہ اسی قسم کی صورتیں پیدا ہوئیں۔

نواب صاحب کے روبرو میگھ راگ کا کامیاب مظاہرہ کر کے خانصاحب نے رام پور کے درباری گویوں میں صرف پہلا نمبر ہی حاصل نہیں کر لیا بلکہ نواب صاحب کے دل میں اپنی قدر و قیمت حد سے زیادہ بڑھا لی۔ لیکن اب بھی آپ اپنی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا وزیر خاں (جو کار سے رجب محمد شاہ رنگیلے کے دربار کے ماہر فن نصرت خاں سارنگ کی اولاد میں سے تھے) دھرپد وغیرہ کی تعلیم لیتے رہے۔

۱۹۲۵ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی میوزک کانفرنس میں آپ نے پہلی بار شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جملہ ریاستوں سے ممتاز فنکار آئے تھے اور اودھ کے تمام رؤسا اس مجلس میں شریک تھے۔ تمام فنکاروں نے اپنے کمالات کا مظاہرہ ان کے روبرو کیا مگر کامیابی کا سہرا خانصاحب کے سر رہا اور آپ کو ایک گولڈ میڈل اور ایک سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا۔

۱۹۲۶ء میں لکھنؤ کی دوسری کانفرنس میں شمولیت کی۔ جس میں آپ کے فن کو بہت سراہا گیا اور انعام و اکرام اور داد و تحسین سے نوازا گیا۔

کچھ دنوں بعد ریاست رامپور جنگ بلائے گئے۔ جہاں "سنگیت بھوشن" کا خطاب حاصل کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک محفلِ سرود منعقد ہوئی جس میں اودھ کے راج گان اور یونیورسٹی کے طلباء کے علاوہ اور بھی کئی سو افراد شریک تھے اور یہاں آپ کو 'فخرِ موسیقی' کا خطاب پیش کیا گیا۔ اسی اثنا میں کلکتہ کی ایک کانفرنس میں شریک ہوئے جہاں سے 'شرومنی' کا خطاب پایا۔

۱۹۵۳ء میں اس سال کے بہترین سنگیت کار تسلیم کئے گئے

چناں چہ صدرِ جمہوریہ نے ایک ہزار روپیہ، ایک بیش قیمت کشمیری دوشالہ ایک طلائی تمغہ اور ایک سند عطا کی۔

۱۹۵۷ء میں دوسری بار صدر محترم نے خانصاحب کو ملک کا بہترین موسیقار قرار دے کر راشٹرپتی بھون میں پدم وبھوشن، کا خطاب اور ایک سنہری تمغہ نیز ایک سند سے نواز کر ان کی عزت افزائی کی۔

سب سے پہلے آپ نے دہلی ریڈیو سٹیشن سے اپنا نگیت پیش کیا اس کے بعد ملک بھر کے ریڈیو سٹیشنوں سے آپ کا پروگرام وقتاً فوقتاً نشر ہوتا رہا ہے۔ آپ کے ریکارڈ ہندوستان بھر کے ریڈیو سٹیشنوں سے پیش کئے جاتے ہیں۔ آپ ملک کے سینکڑوں چھوٹے بڑے مقامات پر اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

اس فن سے آپ کی وابستگی کا زمانہ پون صدی کے قریب ہے۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال کی ہے اور دس سال کی عمر سے آپ اس فن سے وابستہ ہیں۔ منتہیٰ فن کی وجہ سے 'بھارتیہ للا کیندر' دہلی' تین برس سے آپ کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

خانصاحب کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ یوں تو ہندوستان بھر میں ان کے شاگرد بکھرے ہوئے ہیں لیکن حیدرآباد رام پور، دہلی، کلکتہ اور کان پور وغیرہ مقامات پر خانصاحب کے شاگرد زیادہ تعداد میں ملیں گے۔

خانصاحب کے چند مشہور شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

اشتیاق حسین خاں (ریڈیو سنگر) اسحاق حسین خاں (نواب صاحب رام پور کے مخصوص گویئے) اشفاق حسین خاں (ریڈیو سنگر) محمد نیازی (میوزک پروڈیوسر فکمنٹ ریڈیو سٹیشن) افضال حسین نظامی (ریڈیو سنگر) غلام نقی، غلام صادق (ریڈیو سنگر)

سازوں سے متعلق خانصاحب کا کہنا ہے کہ ہر ایک ساز کی آواز انسان کو مسحور کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی مشاق کے ہاتھ میں ہو۔ بربط (سارنگی) آپ کے نزدیک سب سے بہتر مگر مشکل ساز ہے۔

موصوف صرف کسی ایک صنف موسیقی پر قادر نہیں ہیں بلکہ آپ ہوری، دھرپد، ساورا، دھمار، ٹپہ، خیال اور ٹھمری کے ساتھ ساتھ میگھ راگ گانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

آپ کا کہنا ہے کہ یوں تو عموماً ہر کسی ایک راگ کو بھی گانا آسان نہیں لیکن جتنا مشکل 'خیال' ہے اتنا کوئی دوسرا راگ نہیں ہے۔ جس نے خیال گا لیا وہ ہر ایک راگ کو بخوبی گا سکتا ہے اور موسیقار کہلانے کا مستحق ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ ملک میں ایسے موسیقار چند ہی نکلیں گے جو خیال گانے میں ماہر ہوں۔ موصوف کو اس راگ پر اتنا ئی کمال حاصل ہے اور میگھ راگ تو خانصاحب کے علاوہ دوسرے کسی فنکار کو اس دور میں گاتے سُنا ہی نہیں گیا۔

آپ کے خیال کے مطابق وہی شخص ایک اچھا موسیقار بن سکتا ہے۔ جسے کسی استادِ کامل سے فیض حاصل ہو۔ جس کی آواز میں سُر (جسے موسیقی کی اصطلاح میں ایشور کہا جاتا ہے) ہو۔ جو لَے پر قدرت رکھتا ہو اور جسے راگوں سے پوری واقفیت حاصل ہو۔

موصوف نے جن جن فن کاروں سے اس فنِ لطیف کو حاصل کیا ہے۔ اور جن کے اسماء گرامی اوپر دئے جا چکے ہیں۔ وہ سب کے سب اس فن کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ آپ آواز کے اُتار چڑھاؤ پر جیسی قدرت رکھتے ہیں وہ مشکل سے ہی کہیں اور ملے گی اور آواز کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ اتنی زیادہ دیر تک قائم رکھتے ہیں کہ اس پر حیرت ہوتی ہے۔ خانصاحب کے گانے کی خوبی یہ ہے کہ سامع پر ایک محویت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

اکثر موسیقاروں کی طرح آپ نے بھی کچھ جدید راگ، راگنیاں ایجاد کی ہیں۔ مگر آپ پرانے راگ اور راگنیوں ہی کے قائل ہیں۔ یوں تو آپ کا تعلق سدا رنگ سے بھی ہے۔ لیکن آپ درحقیقت تان سین ہی کے خاندان سے متعلق ہیں۔

اس طرح آپ گوالیار کے مشہور گھرانے کے ایک کامیاب ترین نمایندے کہلائے جاتے ہیں۔

# مدرسۂ محمود گاواں بیدر

شہر بیدر (ریاست میسور) بہمنی بادشاہوں کا دوسرا دارالسلطنت رہا ہے اور اپنی صحت بخش آب و ہوا، اپنے جغرافیائی محل وقوع اور اپنی شان دار اور خوب صورت عمارتوں کے لحاظ سے بہمنیوں کے پہلے دارالسلطنت گلبرگہ پر ہر طرح فوقیت رکھتا ہے۔ گلبرگہ صرف ستر پچھتر سال تک دکن میں ایک ابھرتی ہوئی مملکت کا دارالسلطنت رہا لیکن بیدر کو تقریباً ڈیڑھ دو سو سال تک جنوبی ہند کی سب سے وسیع اور سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت کا دارالحکومت بنے رہنے کا امتیاز حاصل رہا ہے۔ بیدر میں یوں تو وسیع و عریض قلعہ بھی ہے جو مستحکم شہر پناہ بھی ہے، عظیم برج بھی ہیں، بلند و بالا مقبرے بھی ہیں، پُرشکوہ مسجدیں بھی ہیں لیکن ان سب پر چھایا ہوا بہمنی سلطنت کے سب سے زیادہ مقتدر اور باتدبیر وزیر مملکت خواجہ عمادالدین محمود گاواں کا بنایا ہوا مدرسہ ہے جس کی نظیر جنوبی ہند میں کیا ہندوستان کے پورے طول و عرض میں مشکل سے ملے گی۔

ہندوستان میں اقامتی جامعات قائم کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ نلندا، وکرم شیلا، اجین اور امراؤتی کے عظیم الشان دارالعلوم ہندوستان قدیم کی شہرۂ آفاق جامعات ہی ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اس طرح کی جامعات کی رسم قریب قریب ختم ہو گئی۔ مسلمانوں نے اپنے ڈھنگ پر مسجدوں کے ساتھ مدرسے قائم کئے اور بیشتر مساجد ہی پر یک وقت عبادت گاہ اور مدرسہ کا کام دینے لگیں۔ خواجہ محمود گاواں نے مسجد سے الگ مستقل اقامتی جامعہ قائم کرنے کی رسم کو اس ملک میں پھر سے زندہ کیا اور ان کا بنایا ہوا مدرسہ نلندا، وکرم شیلا، اجین اور امراؤتی کی جامعات کی طرز کی درس گاہوں کے سلسلہ کی آخری کڑی بنا اور ہندوستان میں مغربی طرز کی جامعات بننے سے پہلے یہ ہندوستان کی سب سے بڑی آخری جامعہ ثابت ہوئی۔

خواجہ عمادالدین محمود گاواں اپنے وقت کے بہت بڑے تاجر تھے، بہت بڑے سیاس تھے، بہت بڑے مدبر سلطنت تھے، بہت بڑے سپہ سالار تھے، بہت بڑے عالم تھے، یہ سب باتیں اب تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں۔ لیکن ان کا ایک کارنامہ جس نے ان کے نام کو جاوداں بنا دیا ہے، وہ ان کا بنایا ہوا مدرسہ ہے۔ جب تک یہ مدرسہ اس سرزمین پر باقی ہے، آنے والی نسلوں کے دلوں پر اس کی عظمت کا سکہ برابر نقش ہوتا رہے گا۔

آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے ۱۴۷۲ء میں جب یہ عمارت خود وزیر مملکت خواجہ محمود گاواں کی راست نگرانی میں بن کر تیار ہوئی تو وہ آج کے ویران اور شکستہ مدرسہ سے بالکل ہی مختلف تھی لیکن آج بھی یہ ویران عمارت دیکھنے والے کے دل پر اپنے دبدبہ، جلال اور اپنے شکوہ و عظمت کا ان مٹ نقش ثبت کر دینے پر قادر ہے۔

خواجہ محمود گاواں نے اپنے وامن دولت سے وابستہ اور آگے چل کر بیجاپور کے عادل شاہی فرماں روا خاندان کے بانی امیر یوسف عادل خاں کے مشورے سے اپنا مدرسہ ۸۷۶ھ میں بنوانا شروع کیا۔ یہ بہمنی سلطنت کے تیرھویں فرماں روا سلطان جلال الدین محمد شاہ لشکری

بہمنی کا عہد تھا جس کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر خواجہ فائز تھے۔ اس عظیم الشان عمارت کو مکمل ہونے کے لئے تقریباً گیارہ سال کی طویل مدت درکار ہوئی۔ اس کا نقشہ بنانے اور اس کی تعمیر میں خواجہ محمود گاواں نے امورِ مملکت کی زبردست مصروفیت کے باوجود شخصی طور پر دلچسپی لی اور خود اپنی راست نگرانی میں اسے تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیر کے دوران میں کتنے ہی بار لوگوں نے انھیں اہم امورِ مملکت سے تھوڑا سا وقت بچا کر اس کی اٹھتی ہوئی چار دیواری کے اندر گھومتے دیکھا اور کتنے ہی موقعوں پر تعمیر کاروں نے ان کی راست ہدایت سے استفادہ کیا۔ ۸۷۶ھ میں مدرسہ بن کر مکمل ہوا تو اس عہد کے ایک فارسی گو شاعر ساعتی نے قطعۂ تاریخ کہہ کر خواجہ کے حضور میں پیش کیا۔

| | |
|---|---|
| ایں مدرسۂ رفیع و محمود بنا | تعمیر شدہ است قبلۂ اہلِ صفا |
| آثار قبول ہمی کہ شد تاریخش | از آیت "بنا نتقبل منا" |

۸۷۶ھ

اس عظیم الشان مستطیل عمارت میں تین منزلیں ہیں۔ اس کا طول شرقاً غرباً (۲۰۵) فیٹ اور عرض شمالاً جنوباً (۱۸۰) فیٹ ہے۔ وسط میں سو مربع فیٹ کا ایک صحن ہے۔ مشرق کی طرف ایک نہایت کشادہ اور چھت تک بلند باب الداخلہ بنایا گیا تھا۔ جو اب باقی نہیں رہا عمارت کے باقی تینوں ضلعوں کے وسط میں بھی ایسے ہی بلند و بالا طاق بنائے گئے ہیں اور اصل میں یہ درس کے بڑے بڑے ہال ہیں۔ اندازہ ہے کہ ہر ہال کے فرش پر قریب قریب ایک ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ ان طاقوں کے اوپر بنے گئے ہیں جن کی وجہ سے عمارت کے شکوہ اور اس کی دل آویزی میں بڑا خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔ مدرسہ کے سامنے کے حصہ کے دونوں گوشوں پر دو شاندار مینار بنائے گئے تھے جن میں ایک مینار اب بھی باقی ہے۔ یہ مینار ایک سو فیٹ بلند ہے اور اپنی وضع قطع کے لحاظ سے پورے ہندوستان میں بس اپنی آپ نظیر ہے۔ ان میناروں کی وجہ سے عمارت کی عظمت اور شان دوبالا ہو گئی تھی۔ مدرسے کے سامنے کے حصہ کو سفید، نیلے اور زرد رنگ کی کاشی کاری سے مزین کیا گیا تھا اور میناروں کو بھی اسی کاشی کاری سے اوپر سے لے کر نیچے تک سجایا گیا تھا اور اس میں بل کھاتی پٹیاں بنائی گئی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر چھت کے قریب کاشی کاری میں کلام اللہ کی آیتیں لکھی گئی تھیں۔ مینار اور چھت کے قریب کے حصہ پر آج بھی اس بے نظیر اور دل فریب کاشی کاری کے آثار کا ایک بڑا حصہ باقی ہے۔ اس کام میں پختہ ہوئی گل کاری، ہندسی شکلوں اور پاکیزہ خطِ نستعلیق میں لکھی ہوئی عبارتوں کا حسن اور ان کی دل آویزی بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ عبارت کے حروف تین تین فیٹ کے قریب لمبے اور چھ چھ انچ کے قریب چوڑے ہیں۔ کاشی کاری کے ان دل آویز نمونوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب یہ پورا حصہ مکمل اور آراستہ ہو گا تو اس کا منظر آنکھوں کو کیسی تراوٹ اور کیسی ٹھنڈک بخشتا ہو گا۔

مدرسے کے سامنے کے حصہ ہی میں باب الداخلہ کے ایک طرف مسجد اور دوسری طرف کتب خانہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کتب خانے میں عدد رجہ نفیس، نایاب اور نادر قلمی کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ خود خواجہ محمود گاواں ہی کے عہد میں اس کتب خانے کی کتابوں کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی۔

محمود گاواں کا بنایا ہوا یہ مدرسہ ایک اقامتی جامعہ تھا۔ اس میں طالب علموں کے سوا اساتذہ کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ مدرسہ کی عمارت کے اندر ایک ہزار کمرے بنائے گئے تھے۔ عمارت کے گوشوں میں بنے ہوئے وسیع اور کشادہ کمرے جن کے اندر کتابیں رکھنے کے لئے شیلف بھی بنے ہوئے ہیں، اساتذہ کے لئے مختص تھے۔ باقی کمروں میں طلبہ رہتے تھے۔ یہ سب کمرے اتنے روشن اور ہوادار ہیں کہ آج کی ہماری اقامتی جماعات کے اقامت خانوں کے رہائشی کمرے بھی شاید اس سے زیادہ روشن اور ہوادار نہ ہوں گے۔ مورخ فرشتہ کے عہد تک بھی یہ مدرسہ ہر طرح آباد تھا۔ ایشیا کے دور دراز ملکوں تک اس مدرسہ کی شہرت پھیل گئی تھی اور دنیا جہان کے طالب علم اس مدرسہ میں پڑھنے کے لئے آتے تھے۔

مدرسۂ محمود گاواں میں نہ صرف علماء کو تعلیم مفت ملتی تھی بلکہ ان کے خورد و نوش اور ان کے لباس کا اہتمام بھی مدرسہ ہی کے ذمہ ہوتا تھا۔ اساتذہ کی علمی خدمت کے معاوضہ میں گراں قدر تنخواہیں مقرر تھیں۔ مدرسہ کے احاطہ ہی میں ایک اور دارالاقامہ بھی

بنایا گیا تھا جس کو تمتہ " کہتے تھے اور اس میں تمتہ یافتہ طالب علموں کی رہائش کا انتظام تھا۔

مدرسہ کے اس مہتمم بالشان خرچ کے لئے خواجہ محمود گاواں نے نہ صرف اپنی ذات سے کافی بڑی جائداد وقف کی تھی بلکہ بہمنی بادشاہوں نے بھی اپنے عہد میں اس مدرسے کے لئے خطیر رقمیں معاش مقرر کر رکھی تھی اور اس کے اخراجات کی پابجائی کے لئے بعض دیہاتوں کی آمدنی بھی وقف کی تھی۔ ایسے ہی ایک وقف اور مدد معاش کی سند جناب سید محمد صاحب مورخ بیدری کے مجموعۂ نوادرات میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ سند سلطان محمود شاہ بہمنی کی عطا کردہ ہے اور اس میں مدرسہ کے لئے تین سو پچاسی تنکہ سالانہ بطور مدد معاش اور ایک گاؤں کے وقف کا ذکر موجود ہے۔ بہمنی بادشاہوں کے علاوہ سلطنت کے صوبہ داروں میں احمد نگر، بیجاپور اور گول کنڈے کے صوبہ داروں نے بھی بڑی بڑی جائیدادیں اس مدرسے کے لئے وقف کی تھیں۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد یہ امدادیں جاری رہیں لیکن جب ہر صوبہ دار نے اپنے اپنے صوبے میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور آپس کی خانہ جنگیاں بہت بڑھیں تو یہ امدادیں بھی بند ہو گئیں اور مدرسہ ویران ہو گیا۔

مدرسہ بننے کے بعد خواجہ محمود گاواں نے اس کی صدارت کے لئے اس عہد کے ایک بہت بڑے عالم اور فارسی زبان کے آخری بڑے کلاسیکی شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامی کو ایران سے بلانا چاہا۔ بعض اسباب کی بنا پر وہ اس پیش کش کو قبول نہ کر سکے۔ اس مدرسے میں پڑھانے کے لئے مدرسوں کا انتخاب ان کی دور و نزدیک تک پھیلی ہوئی علمی شہرت کی بناء پر کیا گیا اور چن چن کر اپنے اپنے مضامین کے ماہر اور لیگانہ روزگار علماء ہی کو پڑھانے کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ خود خواجہ محمود گاواں ریاضیات اور علم ہیئت کے بہت بڑے عالم اور ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی گیرمعروفیات اور اپنی کبرسنی کے باوجود اس مدرسہ میں ریاضی اور علم ہیئت پڑھانے کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ مدرسہ ۱۴۷۲ء میں بنا اور انھوں نے ۱۴۸۱ء میں شہادت پائی۔ اس طرح وہ نہ صرف تن من دھن سے اس مدرسے کی خدمت کرتے رہے بلکہ اپنی شہادت تک لگاتار دس سال اس مدرسے میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں تو ضرور ملیں گی کہ کسی صاحب ثروت یا صاحب اقتدار نے اپنی مساعی سے ایک بڑی درسگاہ بنا کر کھڑی کر دی، لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس میں درس و تدریس کی خدمت بھی وہ انجام دے، اس کی مثال ڈھونڈے سے شاید ہی ملے گی۔

اس مدرسے میں عربی صرف و نحو، منطق، ریاضیات، ہندسہ ہیئت، علوم معقول و منقول، طب اور ادب پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مدرسہ میں پڑھنے والے طالب علموں کے نام ایک خاص رجسٹر میں درج کئے جاتے تھے۔ اس رجسٹر کو "دوزنامچۂ ہمایوں" کہا جاتا تھا۔ پڑھائی کے دو درجے تھے۔ پہلا درجہ "ملازم" کا ہوتا تھا اور دوسرا درجہ "مدرس" کا۔ پہلا امتحان پاس کرنے کے بعد طالب علم کو ملازم کی سند دی جاتی تھی اور اسے مدرس کے درجہ میں ترقی دی جاتی تھی۔ ملازم کے نصاب کے دو درجے تھے۔ ان درجوں میں بلاغت اور کلام کی چوٹی کی کتابوں کے سوا اصول فقہ، قانون، حدیث اور عقائد کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ملازم کی سند رکھنے والے کو دوسرے درجے کا قاضی یا بڑے شہروں میں نائب قاضی مقرر کیا جاتا تھا۔ دوسرے درجے کے مدرس کے لئے کوئی نصاب یا امتحان مقرر نہ تھا۔ ملازم کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایک مدت تک ادنیٰ جماعتوں کو پڑھانے پر بھی "مدرس" کی سند عطا ہوتی تھی۔ مدرس کے بھی بلحاظ قلیم کئی درجے تھے۔ کاتب، منشی، مولوی اور ملا۔ اسی مدرسے سے ملا عزیز، ملا نظام الدین، ملا سراج الدین صدر الصدور سلطنت بہمنیہ، ملا محمود صدر جہاں وزیر مملکت بہمنیہ جیسے عالم فاضل اور ماہر قانون پڑھ کر نکلے اور اس مدرسہ کی علمیت میں چار چاند لگانے کا باعث ہوئے۔ ایک مدت دراز تک اس مدرسہ کے فارغ التحصیل طلباء ہی سے بہمنی سلطنت کو اور اس کے بعد اس کی جانشیں احمد نگر، بیجاپور، بیدر اور گول کنڈے کی سلطنتوں کو ماہر عالم، فقیہہ، قاضی، صلح اور منتظمان سلطنت سربراہ ہوتے رہے۔

یہاں یہ خیال نہ گزرے کہ محمود گاواں کا مدرسہ خالص دینی یا

مذہبی تعلیم کی تدریس کا مدرسہ تھا۔ بے شبہ اس مدرسہ میں خالص اسلامی علوم جیسے قرآن، فقہ اور حدیث بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایسے علوم بھی بڑے زور سے پڑھائے جاتے تھے جن پر کسی دین یا دھرم کی چھاپ نہیں لگائی جا سکتی۔ فلسفہ، منطق، ریاضیات، ہیئت اور طب کسی خاص مذہب کی میراث نہیں۔ یہ مدرسہ اپنے زمانے میں علم کا ایک بہت بڑا مینار تھا جو اپنے دور کی ساری لمی، ریاضیاتی اور سائنسی معلومات کا نور عوام میں پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

خواجہ محمود گاواں کی قائم کی ہوئی یہ اقامتی جامعہ کم و بیش دو سو سال تک ہمارے ملک میں علم کا نور پھیلاتی رہی۔ اس کے بعد پھر جو اس کی تباہی و بربادی کے دن آئے تو یہ بالکل ہی اجڑ کر رہ گئی۔ اس کی بربادی و ویرانی کا سب سے بڑا سبب تو بہمنی سلطنت کا زوال بنا۔ اور اس زوال کے نتیجے کے طور پر جو طوائف الملوکی پھیلی تو اس کو سنبھالنے والی امدادیں بند ہوئیں۔ پھر علی برید کے عہد میں جب چاروں طرف سے بیدر پر یلغار احمد نگر، بیجاپور اور گول کنڈے کے حملے ہونے لگے تو اس نے مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے بیدر کی حفاظت کے لئے اس شہر کی عالیشان عمارتوں، ایوانوں اور محلوں کو ڈھا کر ان میں لگے ہوئے پتھروں اور اینٹوں سے فصیل، برج اور حصار تعمیر کئے۔ اس تباہی سے مدرسۂ محمود گاواں بھی نہ بچ سکا۔ اس کی اصل عمارت تو ایک حد تک محفوظ رہی لیکن اس سے ملحقہ تمام عمارتیں توڑ دی گئیں اور تعلیم و تعلم کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔

۱۰۷۲ھ میں اورنگ زیب نے بیدر کو عادل شاہیوں کے ہاتھ سے چھین لیا۔ مدرسہ کی عظمت، رفعت اور اس کے شکوہ سے وہ بہت متاثر ہوا اور اس کے دوست کرنے اور اس میں دو یا ڈورشی تدریس شروع کرنے کا تھوڑا بہت انتظام اس میں ضرور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے اس مدرسے کے ایک حصہ سے بارود خانہ کا بھی کام لیا گیا۔ آج سے تقریباً دو سو سال قبل رمضان ۱۱۰۷ھ میں اس مدرسے کے ایک حصہ پر رات کے وقت بجلی گری اور بارود میں آگ لگ گئی۔ اس کی وجہ سے مدرسہ کا ایک مینار، کتب خانہ، باب الداخلہ اور مسجد سب ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد یہ عالی شان عمارت ایک مدت تک انتہائی کس مپرسی میں پڑی رہی۔ لوگ اس کے دروازے، چھت کی ٹائیں اور اینٹ پتھر اٹھا کر لے جاتے اور اپنے مکانوں کی تعمیر میں استعمال کرتے رہے۔ باقی عمارت آج بھی یوں کی توں کھڑی ہے اور اپنی عظمت رفتہ کی ماتم گزار ہے۔ سابقہ ریاست حیدرآباد میں جب آثار قدیمہ کا محکمہ قائم ہوا تو اس کے نامور ناظم ڈاکٹر غلام یزدانی کی کوشش سے اس کے تحفظ اور اس کی مرمت پر توجہ ہوئی۔ اور آج جس عالم میں بھی یہ عمارت دکھائی دیتی ہے اسے اس سابقہ ریاست کا ایک فیض اور ہندوستان کے اس قابل فخر ماہر آثار قدیمہ کی مساعی جمیلہ کا احسان سمجھنا چاہیئے۔ حکومت ہند نے بھی اس عمارت کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا ہے اور آج اسے قومی اہمیت کے آثار کی فہرست میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

---

## ۔ بھارتی دستکاریوں کی اہمیت

بھارتی دستکاریوں کی روایات بجا طور پر باعث فخر ہیں۔ وہ ماضی اور حال کے رشتے کی کڑی کا کام دیتی ہیں۔ آج بھی بلاشبہ بھارت میں بہت ہی اونچے معیار کی دستکاری کے ثبوت موجود ہیں جو بہت ہی قدیم دقتوں سے دنیا کے کسی بھی حصے میں تیار ہونے والے دستکاری کے بہترین نمونوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں

بھارتی دستکاریوں کی صنعت، اپنی تمام خامیوں کے باوجود آج بھی ملک کے محنت کشوں کو روزی مہیا کرنے والا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آج دس لاکھ محنت کش ملکی اور غیر ملکی منڈیوں کے لئے نہایت ہی خوبصورت اور روزمرہ کے کام کی چیزیں تیار کر رہے ہیں۔

آج نت نئی شکلوں کی چیزوں کی مانگ رہتی ہے اور ہمارا آج کا دستکار اس تقاضا کو بلیک کہہ کر نفیس رنگ دار چیزیں، خوش نما کپڑے، بھینی بھینی خوشبوئیں اور چینی مٹی و عام مٹی کی "کشتی چیز" بنانے میں مستعدی دکھا رہا ہے۔ بھارتی دستکار بیل گاڑیوں کے دور سے گزر کر جیٹ جہاز کے اس نئے دور میں بھی کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس میں اسے اپنے پرانے فن میں محض کہیں کہیں سادہ سی تبدیلی سے کام لینا پڑا ہے۔

بلونت سنگھ

# کاکو اور اُس کے پریمی

کاکو کی عمر اڑھائی تین سال کی ہوگی . . . . بڑی پیاری بچی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں تارے آنکھ مچولی کھیلتے تھے ۔ اس کا چہرہ پگھلے ہوئے چاند کی طرح تھا ۔ اس کے ہونٹوں پر ہیر بہوٹیاں دمکتی تھیں اور گال ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے سفید بادلوں پر طلوع ہوتے ہوئے سورج نے گلابی رنگ پھیلا دیا ہو ۔ اور بال جیسے موسم برسات کا نمدار کوئلہ ۔

پنجاب میں بچے کو کاکا اور بچی کو کاکی کہتے ہیں ۔ اور اگر بہت لاڈلی ہوئی تو کاکو ۔

ظاہر ہے کاکو اس کا اصلی نام نہیں تھا ۔ لیکن نام میں کیا رکھا ہے؟

وہ ایک سکھ کسان درشن سنگھ کی لڑکی تھی ۔ جب وہ پیدا ہوئی تو درشن سنگھ کو ذرا خوشی نہ ہوئی بلکہ لڑکی پیدا ہونے کی خبر سن کر اس نے یوں سر نیچے ڈال دیا جیسے اب لوگ اس کے مرد ہونے میں بھی شک کرنے لگیں گے . . . . . مگر جب کاکو ذرا بڑی ہوئی تو سب لوگ باپ سے کہتے کہ تم بڑے خوش نصیب ہو جو ایسی خوب صورت بچی پائی . . . . . رفتہ رفتہ درشن سنگھ کو بھی وہ پیاری لگنے لگی اور وہ اکثر اسے گود میں اُٹھا کر اس وقت تک پیار کرتا جب تک کہ اسے پریا دھن آجاتا کہ وہ تو لڑکی ہے . . . . . لیکن باقی سب لوگ کاکو کو پیار کرتے تھے . . . . . کیونکہ ان میں سے کسی کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ جب کاکو بڑی ہوگی تو پرائے گھر چلی جائے گی اور اپنے ساتھ باپ کی گاڑھی کمائی کا بہت بڑا حصہ بھی لیتی جائے گی اور بوڑھے والدین کے لئے سہارا نہیں بنے گی ۔

کاکو بڑی ہنس مکھ بچی تھی ۔ زندگی کی تلخیوں کا اسے کچھ پتہ نہیں تھا وہ اپنے سادہ ماحول میں یوں چہکتی جیسے بڑے اچنبھے کے بیلے میں آ نکلی ہو ۔ . . . . . صبح وہ اپنے باپ کے کندھے پر یا ماں کی گود میں سوار ہو کر گوردوارہ جاتی ۔ وہاں لمبی ڈاڑھی والا گرنتھی نہ جانے ایک موٹی سی کتاب میں سے کیا پڑھا کرتا تھا ۔ وہ گا کر نہیں پڑھتا تھا لیکن اس کی آواز میں ترنم اور ایک عجیب قسم کی کھنکھناہٹ تھی ۔

وہاں پر اسے جو بات سب سے اچھی لگتی وہ یہ تھی کہ پرتن کے بعد اسے بہت سا حلوہ کھانے کو ملتا تھا ۔ اپنے حصے کے علاوہ اپنے باپ اور ماں کے حصے میں سے بھی وہ حلوہ لے لیتی تھی . . . . یہاں تک کہ گوردوارے کے باہر بیٹھی گونگی (لیکن بہری نہیں) مائی سیلوں بھی اپنے حلوے میں تھوڑا سا چکھ کر باقی حلوہ کاکو کو دے دیتی تھی ۔ ہر روز اتنا سارا حلوہ کاکو کے لئے ناشتے کا کام دیتا تھا ۔

وہ سارا دن اِدھر اُدھر گھوما کرتی ۔ گاؤں کے قریب والے رہٹ کا پانی کلبلاتا ہوا کھاتا ، جھاگ اڑاتا . . . کنارے کنارے اگی ہری بھری دُوب سے اُلجھتا ہوا پیپل کے بڑے بڑے جڑ کے قریب سے ہو کر سرسراتا بہتا چلا جاتا ۔ پیپل کی چھاؤں تلے نمدار دُوب میں چھپے ناک تک پانی میں ڈوبے پیلے پیلے مینڈکوں کی اُسے تلاش رہتی ۔ اکثر مینڈک اُسے پہلے ہی دیکھ لیتے اور اس کی نیت بھانپ کر اُچھلتے اور غڑاپ سے پانی میں ڈبکی لگا جاتے ۔ کاکو پہلے تو یک ٹک پیچھے ہٹ جاتی اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگتی اس کی ہنسی کی موسیقی پانی کی چھن چھناہٹ میں گھل مل جاتی

کھیتوں میں جھڑبیری کی جھاڑیوں کے علاوہ میٹھی سوڑیوں کے پیڑ بھی ہوتے تھے۔ دیگر بچوں کے ساتھ وہاں جا کر وہ بیریوں کے ساتھ کانٹوں کا مزا بھی چکھتی ..... مارے درد کے سی سی کرتی پھر بھی بیر کھائے جاتی۔ سوڑیوں کا تو بھلا کہنا ہی کیا ..... ہاں کبھی سوڑی کی بیس دار ٹھٹلی منہ سے پھسل کر حلق میں اٹک جاتی تو کھانسی کھانس کر اس کا چہرہ لال ہو جاتا۔

اس کام سے فرصت پا کر وہ سب بچے مدار کے پودوں کے پاس جا کھڑے ہوتے اور ان پر لگے ہوئے آموں کی طرف کنکھیوں سے تاکتے۔ توڑ توڑ کر جھولیوں میں بھر لیتے، حالاں کہ وہ ان کے کسی کام میں نہ آ سکتے تھے ..... پھر ایکا ایک کسی بڑے اور موٹے پتے پر بیٹھا ہوا لمبی لمبی ٹانگوں والا ہرے رنگ کا ٹڈا انھیں گھورتا دکھائی دیتا ..... وہ ٹھٹک کر ہاتھ روک لیتے جیسے وہ ٹڈا نہیں چوکیدار ہو جو انھیں تاڑ لے تو ڈنڈے پڑوانے پٹکارنے لگے گا۔ ٹڈا بھی، انھیں ایسی سنجیدگی سے گھورتے جانا جیسے اس نے سبھی دید اور پران گھوٹ کر پی رکھے ہوں۔

جب وہ متی کی کچی اینٹوں کی بنی ہوئی دیواروں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے کھیلتے تو شاید ہی کوئی راہگیر ایسا ہوتا جو اسے دیکھ کر رک نہ جاتا۔

یوں تو سبھی اسے پیار کرتے تھے لیکن ان میں تین بوڑھے سب میں پیش پیش تھے۔ یعنی بھگا سنگھ، لکھا سنگھ اور جھنڈا سنگھ۔ ان میں سے سب سے چھوٹا ستر سال کا اور باقی دو اسی سال سے کچھ ادھر یا اُدھر ــــــ ان تینوں بوڑھوں کی آپس میں کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ وہ الگ الگ گاؤں میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک اپنے زمانے کا نامی ڈاکو رہ چکا تھا، دوسرا جوا کھلاتا تھا اور تیسرا نٹ بازی کی چیریں مثلاً انیون، بھنگ چرس وغیرہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے پہونچایا کرتا تھا۔ اب یہ بڑے دھندے چھوڑ چھاڑ کر واہگورو نام جہاز ہے، جپا کرتے تھے۔

ان بوڑھوں کی داڑھیاں بہت لمبی، بہت لمبی اور قریب قریب سفید تھیں۔ سر پر بھاری بھاری پگڑ باندھتے تھے جیسے پورا تھان لپیٹ رکھا ہو۔ گلے میں کھدر کے کرتے اور کرتوں کے نیچے نیلے، ہرے یا لہولہان رنگ کے تہمند۔ کہنے کو بوڑھے لیکن دیکھنے میں خوب لمبے چوڑے تھے۔ بڑے بڑے ہاتھ، مضبوط بازو، چمکدار آنکھیں جن پر سفید بھنویں جھکی پڑتی تھیں ــــ ان تینوں کا قد کاٹھ کھانے کا چسکا تھا۔

ہر بوڑھا کاکو کو بہت چاہتا تھا۔ ان کا اپنا آگا نہ پیچھا ..... جو کوئی آتا کاکو کے لئے کھلونے، مٹھائیاں اور کپڑے لاتا۔ کاکو ان میں سے کسی کو دیکھ لیتی تو دُم دار سی سے چلاّ اٹھتی۔ "باپو!" اور تب اپنے ننھے ننھے بازو پسارے دوڑ پڑتی اور پھر اچھل کودنے میں یا نہیں حائل کر دیتی ..... بوڑھے بھی اس سے مل کر اس قدر خوش ہوتے کہ ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔

ہر تیسرے چوتھے روز ایک نہ ایک بوڑھا آ ہی رہتا ..... اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کاکو ایک بوڑھے کی گود میں چڑھ کر گلیوں کی سیر کے بعد لوٹتی تو گھر پر دوسرا بوڑھا انتظار میں بیٹھا ہوتا۔ کبھی وہ تینوں کے بعد دیگرے آ ٹپکتے۔ اس دن کاکو کی خوشی کا ٹھکانا نہ ہوتا کیونکہ اس روز اسے زیادہ سے زیادہ تحفے اور مٹھائیاں ملتی تھیں۔

ایک روز شام کو جبکہ اندھیرے کی سیاہی کافی گہری ہو چکی تھی بھگا سنگھ کاکو سے ملنے کے لئے آیا ... ایسے موقعوں پر کاکو اکثر ڈیوڑھی میں اپنے باپ کے ساتھ باتیں کرتے دکھائی دیتی تھی یا گھر میں سے اس کے چہچہانے کی آواز سنائی کیا کرتی تھیں ..... لیکن آج اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ درشن سنگھ ہل میں پھانس ٹھونک رہا تھا۔ بھگا سنگھ کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا "کاکو کہاں ہے؟"

درشن سنگھ نے سر اوپر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "وہ بیمار ہے ..... ریشہ (زکام) ہو گیا ہے اسے۔"

"ریشہ؟" بھگا سنگھ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اب کے درشن سنگھ کچھ نہیں بولا تو بھگا سنگھ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ کاکو پچھلے چھوٹے سے کمرے میں اپنی ننھی سی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ سرسوں کے تیل کے چراغ کی پھڑپھڑاتی روشنی میں وہ بالکل موم کی مورتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ سُرخ تھا، آنکھیں بند تھیں، ناک بھی بند تھی۔ آج اس کی ناک کی نوک بھی ہونٹوں کی طرح سُرخ ہو رہی تھی اور وہ منہ سے سانس لے رہی تھی۔ اس کے کلیوں کے سے ہونٹوں میں سے دو دانت دیے دیے چمک رہے تھے۔

بھگا سنگھ نے اپنا بڑا سا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا اور پھر بھاری آواز میں کاکو کی ماں سے پوچھا "بیٹی! کاکو کب سے بیمار ہے؟"

کاکو کی ماں پیار میں بیٹی روٹی پکا رہی تھی۔ گھونگھٹ کی آڑ سے بولی۔ "کل شام سے۔"

"کوئی دوا دارو؟"

"یکم جی کا کاڑھا پلا رہے ہیں۔"

پھگا سنگھ نے کچھ دیر سوچا اور پھر تہبند کے پلو سے اپنی افیون کی ڈبیہ نکالی اور چٹکی میں تھوڑی سی افیون لے کر اس کی ننھی سی گولی بنائی اور چپکے سے کاکو کے ادھ کھلے منہ میں سرکا دی ... پھر بڑے اطمینان سے بولا۔ "پھکر نہیں .... کل صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ مچھکا اور اس نے کاکو کے چھوٹے سے اُجلے ہاتھ کو چوما اور بھاری قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ افیون پیتے ہوئے ریبنے کے پانی کو سکھا کر تاک مشک کر دیتی ہے اور زکام دم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ اس نے اپنی حکمت عملی کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ وہ اسی میں مگن تھا کہ صبح جب سب لوگ کاکو کو ایک دم ٹھیک ٹھاک دیکھیں گے تو کتنے خوش ہوں گے۔

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد بگا سنگھ آنکلا۔ اسے جب پتہ چلا کہ کاکو بیمار پڑی ہے تو وہ بے چین ہوا اُٹھا۔ تہبند جھاڑ جھاڑا تا ہوا وہ کاکو کی کھاٹ کے پاس پہنچا۔ اسے کچھ دیر تک پُرنم آنکھوں سے دیکھتا رہا.... پاہر بیٹھی ماں سے اِدھر اُدھر کے سوالات کئے۔ آخر جب اس نے بیماری کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تو جیب ٹٹول کر افیون کی ڈبیہ نکالی اور اس میں سے ننھے بچے کے لئے مناسب خوراک نکالی اور اس کی گولی بنا کر پیاری کاکو کے پیارے منہ میں لڑھکا دی۔ اس نے بھی پہلے سے اپنا کام کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دوادارو کے معاملے میں کاکو کے ماں باپ بالکل اَکڑ سے ہیں۔

وہ بھی بڑے اطمینان سے رخصت ہوا۔

کہیں سے جھنڈا سنگھ کو بھی پتہ چل گیا کہ اس کی لاڈلی کاکو بیمار ہے۔ گھر کے لوگ سونے جا رہے تھے کہ اس نے آن دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر اندر پہونچ کر بولا۔ "بھئی درشن سنگھ معاف کرنا کاکو کی بیماری کا حال سُن کر مجھ سے رہا نہیں گیا .... بھاگا چلا آیا۔"

پھر وہ کاکو کی ننھی سی کھاٹ کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔

جب اسے پتہ چلا کہ کاکو کو محض رلیشہ ہے تو اس نے اعلان کیا کہ یہ تو معمولی بات ہے .... اس نے بھی کمال صفائی سے والدین کی آنکھ بچا کر افیون کی مناسب خوراک اس کے منہ میں ڈال دی۔

جاتے جاتے کہنے لگا۔ "میں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں کوئی کھاس بیماری نہ ہو ..... ریبنے سے گھبرانے کی کوئی بات ہی نہیں .... صبح تک اُچھلنے کودنے لگے گی ..."

اس کے بعد "باہگورو جی کا کھالصہ اور باہگورو جی کی فتح" کا نعرہ لگا کر وہ خوش خوش ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

جب دوسری صبح سورج دیوتا نے نور کا پہلا لیزہ پھینکا تو صبح کا تارا دُور ہی سے بگٹٹ ہوا گا اور نظروں سے غائب ہو گیا پھر آسمان کی نیلاہٹ ہلکی پڑتی چلی گئی۔ بڑے پیتل کے پتے تالیاں بجانے لگے۔ ہلکے نیلے آسمان میں ایک سفید کبوتر چکر پھیریاں لیتا ہوا یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے چاندی کے ورق میں جان پڑ گئی ہو۔ کھیتوں کی کاہیوں کے شور میں کسان ہل لے کر کھیتوں میں جا پہنچے بیلوں کی گھنٹیوں سے ساری فضا گونج اُٹھی۔

ان سب چیزوں کو دیکھ دیکھ کر چہکنے اور تالیاں بجانے والی کاکو اس وقت تک مر چکی تھی۔

درشن سنگھ کو پہلے تو اس بات کا یقین ہی نہیں آیا لیکن جب اسے محسوس ہوا کہ کاکو سچ مچ ایسی مری ہے کہ لوٹ کر نہیں آنے کی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور کہنے لگا "نہیں نہیں میں اپنی لاڈلی کو چل بسنے نہیں دوں گا۔ میں تو اسے باقاعدہ چتا میں جلاؤں گا اور پھر اس کے پھول (ہڈیاں) ہردوار لے جا کر گنگا جی میں بہاؤں گا۔"

اس صبح کاکو کے گرد و دوارے میں طوطے کا ناشتہ کرنے نہیں گئی۔ گونگی مائی سیوواں بہت دیر تک کڑاہ پرشاد ہاتھوں میں ملائے کاکو کا انتظار کرتی رہی۔ کہیں دوپہر تک کسی نے اسے بتایا کہ بچاری ننھی کاکو تو باہگورو اکال پُرکھ کے چرنوں میں پہونچ چکی ہے مائی سیواں کا بھی کاکو سے گہرا پیار تھا۔ وہ اس کی موت کی خبر سن کر بہت اداس ہوئی۔ شام کے وقت اس نے گوردوارے کا سارا صحن جھاڑو سے صاف کیا۔ گرنتھی جی کی بیوی اور بچوں کی مدد سے

اس نے سب سے بڑی دری صحن میں بچھادی - چوں کہ اس روز کوئی تہوار تھا اسی سلسلے میں یہ سب تیاریاں کی جارہی تھیں -

جب رات ہوگئی تو مائی سیواں سنگت کے جوتوں کی حفاظت کرنے کے لئے گوردوارے کے بڑے پھاٹک کے باہر والے چبوترے پر بیٹھ گئی -

رفتہ رفتہ لوگ آنے لگے - سنگت جمع ہوگئی تو شبد کیرتن شروع ہوا - بھگا سنگھ دیر سے آیا - جب وہ مائی سیواں کے پاس پہونچا تو کاکو کے سلسلے میں دکھ سکھ کرنے کے لئے وہیں بیٹھ گیا - اس کا چہرہ بہت اترا ہوا تھا - کاکو کا ذکر آتے ہی اس کی آنکھیں پرآب ہوگئیں - بے چاری مائی سیواں اشاروں ہی اشاروں میں اسے تسکین دینے کی کوشش کر رہی تھی - بھگا سنگھ نے افیون والی بات بھی بتادی اور یہ بھی کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کاکو کو افیون کی خوراک ذرا کم ہی دی - اگر تھوڑی سی اور دے دیتا تو شاید وہ بچ جاتی -

اس کے بعد وہ آنسو پونچھتا ہوا سنگت میں جاکر بیٹھ گیا - پھر بگا سنگھ اور جھنڈا سنگھ بھی یکے بعد دیگرے آگئے - تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے مائی سیواں کے پاس بیٹھے - انھوں نے بھی افیون والی بات بتادی -

اب مائی سیواں پر یہ بات کھلی کہ اپنی پیاری کاکو کو ان بڈھوں نے کس قدر خلوص اور پیار کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا ہے -

مائی سیواں دنیا کے بہت دکھ جھیل چکی تھی - وہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن اس پر واہگورو اکال پرکھ کی خاص کرپا تھی - وہ گورو کی بانی کو اچھی طرح سمجھتی تھی - اس کے دل میں ان گوردواروں کے نور کی کرن رقص کرتی تھی ..... وہ جانتی تھی کہ سنسار میں کئی ایسی چیزیں ہیں جو بھی نہ تھی پریوں کی طرح ہیں یا رنگین پروں والی تتلیوں کی طرح ..... وہ پریاں، وہ تتلیاں انسان کی ذہانت، اس کی چالاکی اور طبّاعی کی مثل نہیں ہوسکتیں ..... وہ انسان کی ذہانت کی شدید جدّت کے مقابل آتے ہی مرجھا اور کملا کر زمین پر گر پڑتی ہیں اور خس و خاشاک کا حصّہ بن جاتی ہیں -

صحن کے پرلے سرے پر دیوار کے ساتھ بیل گاڑی کا بھاری بھرکم پہیّہ ٹکا ہوا تھا - پاس ہی گوبر اور غلاظت کے ڈھیر سے بدبو اُٹھ رہی تھی - صحن کے اس سرے پر چنبیلی کے پھول ہوا کے شانوں کو خوشبو سے بوجھل کر رہے تھے — وہ تینوں بوڑھے اب بھی کچھ کچھ وقفے کے بعد اپنے آنسو پونچھنے لگتے ..... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتے تھے -

گوردوارے کی پھلواڑی پر اندھیرا چھایا ہوا تھا - وہاں اس تاریکی میں بھوت ناچ رہے تھے -

مائی سیواں نے آسمان کی طرف دیکھا .... اُجلے اُجلے تارے اسے یوں لگے جیسے وہ سفید سفید پھول ہوں اور کسی اَن جانے ہاتھ نے دھرتی پر ان کی بارش کردی ہو -

پھر نہ جانے کیوں ..... وہ پھول .... اُجلے پھول ... راستے میں ہی معلّق ہو گئے ——— اب وہ نہ نیچے ہٹ سکتے تھے اور نہ دھرتی پر برابر رحمت کی بوندوں کی طرح برس سکتے تھے -

## ضروری گزارش

۱- مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھئے -

۲- غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ اُن کے ہمراہ ہوں گے

(ادارہ)

# داغ دہلوی کی اصلاحیں برق میسوری کے کلام میں

نواب عزیز جنگ بہادر تاریخ الموائط میں لکھتے ہیں (سنہ تالیف ۱۳۲۲ھ م ۱۹۰۴ء)

"محمد باقر، مولوی لقب، برق تخلص، مشاہیر قوم سے ہیں۔ آپ ریاست میسور کے نواح ماسی میں کافی پلانٹر دبون کی کاشتکاری (کاکاڑیا) زمیندارانہ حیثیت سے فرماتے ہیں، آپ کے باغات کے خالص حاصل کا سالانہ اندازہ تقریباً بارہ ہزار روپے کہا جاتا ہے۔ عربی اور فارسی زبان میں ذی استعداد ہونے کے علاوہ فن سخن سے بھی دل چسپی رکھتے ہیں۔ دیوانِ برق آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ مؤلف کے بعض احباب نے کہا کہ آپ خلق مجسم اور بڑے ملنسار شخص ہیں۔"

برق کا انتقال ۱۹۰۴ء -- ۱۹۰۵ء میں ہوا، وفات کے وقت عمر چھتیس ۳۶ برس کی تھی، برق کے قلمی دیوان میں ٹ۔ ث۔ خ ڈ ڑ ش ص ض ط ع غ کے سوا بقیہ تیئیس ۲۳ حروف تہجی کی ردیفوں میں جملہ ۲۵۵ غزلیں ہیں، برق اپنی غزلیں اصلاح کے لئے داغ کے پاس حیدرآباد بھیجتے تھے، وہ اصلاح کے بعد واپس کرتے تھے تو دیوان میں درج ہوتی تھیں۔ اس لئے یہ دیوان ردیف وار مرتب نہیں ہے اور اسی لئے بہت اہم ہے کہ اس سے شاعر کی زبان کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔

زوال سرکار خداداد تک میسوری شاعر اور ادیب اپنی مادری زبان دکنی (اردوئے قدیم) میں بولتے اور لکھتے تھے، سلطان شہید کے زمانے کی اردو زبان کا سب سے مستند نمونہ ملک الشعراء حسن علی عزت کی تصنیف "مفرح القلوب" ہے۔ سنہ تصنیف ۱۷۸۲ تا ۱۷۸۴ء۔ "مفرح القلوب" علم موسیقی کی کتاب ہے، اس میں راگوں اور راگنیوں کا منظوم بیان ہے۔ ایسی کتاب کو راگ مالا کہتے ہیں۔ عزت نے یہ کتاب سلطان کے حکم سے لکھی ہے اور حسب توقع سراپا جدت ہے۔ اس کتاب کی نقل میں نے مہارانی کالج میسور کے علمی وادبی مجلے "ریاست میسور" اردو" جلد اوّل میں شائع کردی ہے۔ اصل کتاب کا ایک ہی مخطوطہ ہندوستان میں اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے۔ دورِ سرکار خداداد کے بعد میسوری اپنی تحریر و تقریر میں دتی یا لکھنؤ کی اردو کی تقلید کرتے اور امکان جبراً اپنی مادری زبان دکنی سے بچتے تھے۔ برق کا کلام اسی تقلید کی ایک سو برس کی کاوش کا نتیجہ ہے، داغ کی خصوصاً وہ اصلاحیں جو جنوبی ہند والوں کے لئے بہت اہم ہیں جن میں انھوں نے شاگرد کو "مدراسی" طرز بیان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیوں کہ یہ وہ عام غلطیاں ہیں جو جنوبی ہند کے ہر غیر محتاط شاعر اور ادیب سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ ایک بات نظر میں ہونی چاہیئے کہ برق کے کلام میں دکنی کے جو نمونے ہیں وہ اپنی جگہ درست ہیں۔ انھیں دکنی زبان کے نمونوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی شاگرد کے کلام میں ایک نوع کی غلطیاں ایک جگہ نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً ایسا نہیں ہو سکتا کہ شاگرد سے صرف قواعد کی غلطیاں یکے بعد دیگرے ہوتی رہیں اور پھر محاورے کی غلطیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے وعلیٰ ہذا القیاس، بلکہ شاگرد کے کلام میں مختلف قسم کی غلطیاں مختلف مقاموں میں بکھری ہوئی ہوں گی۔ ان کے مطالعے سے زبان دانی کے طالب کو اُلجھن ہوتی ہے اور ذہن میں مختلف قسم کی غلطیوں کے بیک وقت آنے سے ان غلطیوں کی صحیح صورتیں اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتیں، اس لئے میں نے داغ

کی اصلاحوں کو مختلف عنوانوں کے تحت مرتب کردیا ہے :- قواعد، محاورہ، متروکات، لغات، تلفظ، انکسار، دبستانِ دہلی و لکھنؤ، مدارسی یا میسوی اردو، عیوب، ظرافت، بے معنی، تحسین، لطفِ زبان، اجتہاد، استاد کی عبارتیں۔ ممکن ہے کہ میں نے کسی ایک عنوان کے تحت جو اصلاحیں لکھی ہیں ان میں دوسرے عنوانوں کا شائبہ موجود ہو۔ ب سے برق اور د سے داغ مراد ہیں۔

قواعد

برق (ب) میری توبت پہ نشانی کے لئے اے ساقی
سنگ بھی لا کے لگانا درِ میخانے کا

داغ (د) درِ میخانے کا نہیں ہوسکتا، میخانے لفظ اردو ہوگیا اس پر اضافت نہیں آسکتی۔

(ب) کلیسا میں کریں گے ہم عبادت یہ قیدِ مسجد و کعبا ہی کیا ہے

د - قافیہ فرد اگنگا، مالا وغیرہ، کعبا الف کے ساتھ اردو ہوگیا۔ پھر مضاف الیہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔

(ب) سیمنہ غربال کیا کس کا ترے تیروں نے
شور ہے واہ کا کیوں کر لبِ سوفاروں سے

د - لبِ سوفاروں کی اضافت کیوں کر ہوگی، سوفاروں اردو ہوگیا

محاورہ

ب اندھیرا سا چھایا ہے آنکھوں میں اے ماہ
دکھاؤ ذرا روئے روشن تمھارا

د اس ترکیب میں تمھارے کی جگہ اپنا چاہیئے۔

ب - مدت ہوئی نکل کر باہم دلوں کے ارماں
عرصہ ہوا ہے صاحب ہو کر دو چار ہم تم

د - ہو کر دو چار ہم تم، نہیں ہوسکتا، یہ زبان کے خلاف ہے

ب ع ستاؤں رد بدد رو داد میری

د - اپنی چاہیئے

ب مجھے معلوم ہے بنیاد میری

د یہاں بھی اپنی چاہیئے ع
وگرنہ خاک تھی بنیاد میری

(ب) خود جانتے ہیں آپ ہی نشانے دل کا
کیسے عرض کروں اور ارادہ مرے دل کا

د - اس جگہ اپنے کہتے ہیں۔

ب - کوچۂ رشک پری کی ہے ہوا باندھی ہوئی
کس طرح جنت میں ٹھہرے جانِ مضطر بعد مرگ

د - ہوا باندھی کا یہاں محاورہ نہیں

ب (کم خوردہ) سے یہ جا کر بول دے
جو ترا بیمار تھا سوئے عدم جاتا رہا

د - گیا، یہ محل اس کا ہے

ب - ہر بات پہ لوٹے کی طرح آنکھ ہری کی
یہ چال بری ہے مرے اوس رشکِ پری کی

د - کیا برا مقطع کہا ہے اور کہو، آنکھ ہری کرنا یہ زبان خدا جانے کہاں کی ہے، تمام عمر میں آج سنا ہے لوٹے کی طرح آنکھ ہری، یہ محاورہ

ب - دھوکے میں آ کے دیکھو تو لیں گے یقین ہے
خط بھیجتے ہیں آج نئے آدمی سے ہم

د - نئے آدمی کے ہاتھ چاہیئے۔

متروکات

(ب) بہت خاک ڈالی مرے خون پہ
یہ شہرت مگر گھر پہ گھر ہوگئی

د - در بدر - گھر بہ گھر متروک

ب - زنجیر ہے پاؤں میں گلے میں ہے طوق
جو دل نے کیا اس کا یہ فتح پایا
(مفعول مفاعیل مفاعیلن قاعدہ یا فع مرتبہ)

د - لفظ پاؤں ہمزہ کے ساتھ متروک

ب - چال وہ چال ہے اس فتنۂ محشر کی دلا
درِ دولت پہ قیامت بھی پڑی رہتی ہے

د - ساتھ ہو لیتی ہے جب گھر سے نکلتے ہیں وہ - دلا متروک

ب - ترکِ ہتاب پہ چھوٹے گی ہوائی اے چرخ
جلوہ دکھلائے اگر وہ مہِ کامل اپنا

ب - چمک جاتے تھے تیرے نام سے برق
اوھنوں کے دل میں یہ دہشت کبھی تھی

د - بتوں کے بجائے اوھنوں کے، متروک

ب - انسان ہوں میں، انسان کی ہے دل میں عجلت
نہ حور کی خواہش نہ تمنا ہے پری کی
(مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن - مرتبہ)

د - نے حور - لفظ حور متروک

ب - پر جو پہ کے معنے پر آتا ہے جائز ہے یا نہیں ملیح فرمانا - سرفراز[1]

د - اوپر کے معنی میں پر پہ جائز ہے لیکن مگر کی جگہ متروک -

لغات

ب - اس سے زیور کو بھی رفعت آسماں کی مل گئی
کان کا اوس سمے کے پروین گوشوارا ہو گیا

د - گوشوارہ کے معنی تم نے کیا لئے ہیں - یہ کون زیور ہے -

ب - بندے نے گوشوارہ کا معنے جھمکے کا لیا ہے

د - درست ہے

مرتبہ - گوشوارہ کان کا بالا، آویزہ (ذوق)
ستارے دیکھ کر موتی تمہارے گوشوارے کا
کہیں ہم کو ملا یہ نور صدقہ اس ستارے کا

ب - ع روپیہ پاس ہے جب تک تو سب گھیرے ہی رہتے ہیں

د - ٹکا ہے پاس جب تک سب کے سب گھیرے ہی رہتے ہیں -
روپیہ لفظ نہیں ہے، تشریدِ غلط ہے

مرتبہ - (داغ) لگ گئی آگ ایسی دولت کو
کہ روپے[2] بھنتے ہیں چنوں کی طرح

ب - ہم نام کے شاعر ہیں نہیں کچھ بھی لیاقت
واللہ ہمیں شیوہ بیانی نہیں آتی

د - یہاں شیوا الف سے چاہیئے

مرتبہ - شیوا - فصیح و بلیغ، شیوہ طور طریق

---

[1] لیکن یہ لفظ درست ہے - روپیہ غلط ہے - ع - م

ب - چلے جب ناز سے وہ رقص کے وقت گڑی دل میں انی تیر ادا کی

د - تیر کی انی نہیں ہوتی، برچھی کی ہوتی ہے

ب - نہ آیا نام مہر اب تک وہاں سے تجسس کیوں نہ ہو پیکِ قضا کی

د - تجسس مذکر ہے، نہ کیوں ہو جستجو پیکِ قضا کی

ب - اوس حسنِ دل فریب کا بازار بند ہے
پیری سے اب شباب کا بیوپار بند ہے

د - بے پار دو طرح سے آتا ہے اور ہماری زبان پر بھی یہی ہے -

ب - عشق کا ہوں میں وہ رنجور نہ دیکھا نہ سنا
داغ دل پر ہیں وہ بھرپور نہ دیکھا نہ سنا

د - بھرپور دار کے ساتھ آتا ہے -

مرتبہ (ناسخ) کیا حسد ہے اگر اک شب نظر آیا بھرپور
ساغرِ ماہ کا گردوں نے کسا رہ توڑا (بھرپور - تمام کامل)

ب - عشق کیوں دل کو نہ ہو آتشیں رخساروں کا
روزِ اوّل سے ہے کیڑا انھیں انگاروں کا

د - لفظ آتشیں بروزن فاعلن چاہیئے

ب - اے طبیب قلبی شربتِ دیدار پلا دم ہے آنکھوں میں ترے بھر کے بیماروں کا

د - یہ لفظ بمعنی دل جب آتا ہے تو لام ساکن آتا ہے

ب - ہنستے ہنستے کہا جب میں نے تمھیں چھوڑ دیا
بولے جھنجھلا کے یقیں تم نے ہمیں چھوڑ دیا

د - قوافی - یقیں، حسیں، زمیں وغیرہ - تمھیں ہمیں میں یائے مجہول ہے - یقیں کا قافیہ کیوں کر ہو سکے، یہ غزل پھر کہہ کر بھجواؤ -
میں نے نہیں دیکھی -

ب - پاک ایسا ہوا کہ مثلِ گل آب شبنم ہی سے نہاتے ہیں

د - نہلاتے ہیں وزن میں آتا ہے، نہلا بہ وزن اصلاء -

ب - قطعۂ تاریخ کو خدائی دخترِ جناب مولانا مولوی حاجی سید شہاب الدین صاحب قبلہ قادری مدظلہم

برق تاریخ ایسی لکھو تم مرحبا سن کے تا کہے عالم
حور کے لب سے یہ صدا آئی کہ خدائی دخترِ دوم

۱۹۰۱ء

د۔ دوم عالم کا قافیہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر دیکھا ہے تو یاد نہیں۔
سند دو، داد بالفعل ہے کہ نہیں

## انگسار

ب۔ چھٹتے ہیں جو پھول وصف رخ ہیں یہ کلک ہے شاخ یاسمن کی
د۔ کلک مؤنث کسی نے باندھا ہے تو اطلاع دیجئے

مرتبہ۔ رذوق، کی علط نوخطوں کو کلک ادا کیا عاشق کو تختہ مشق جنا
عجیب اتفاق ہے کہ اصلاح کے وقت اپنے استاد ذوق کا یہ شعر
واقع کی نظر میں نہیں تھا

ب۔ ہم دل میں آگیا جب بے کسوں کے حال پر
ڈھانک کر منہ دامن خنجر سے قاتل پھیر گیا
د۔ اگر دامن خنجر آپ کی نظر سے گزرا ہے تو

## دبستان دلی و لکھنؤ

ب۔ بگڑنا روٹھنا شب بھر کسی کا کسی کے پاؤں تھے اور سر کسی کا
د۔ ہیں نے کبھی شب بھر نہیں کہا، رات بھر لکھنؤ والے شب بھر کہتے ہیں۔
ب۔ کیوں کر نکل کے خانۂ دل سے یہ جائے گا
درد و الم حضور سا کچھ میہماں نہ تھا
د۔ حضور بادشاہ اور بزرگوں کو کہتے ہیں۔ حضور معشوق کو لکھنؤ والے کہتے ہیں۔ تم کہاں کے ہو۔

## میسوری یا مدراسی اُردو

ب۔ چپکے نہیں تو قرض تو دے گا ضرور برق
پیہم مساں تمہارا بڑا روشناس ہے
د۔ دے گا نہ مفت، چپکے دینا محاورہ نہیں ہے۔
ب۔ غیروں کو بھی بتاتے ہیں صورت کبھی کبھی
لٹواتے ہیں وہ حسن کی دولت کبھی کبھی
د۔ دکھاتے
ب۔ نزع میں بھی یاد ہیں ابرو کسی کے دوستو
قبر پر رکھ دو عوض ڈالی کے خنجر بعد مرگ
د۔ کیا میسور میں قبر پر ڈالی چڑھاتے ہیں۔ ہم نے تو پھول چڑھاتے دیکھے ہیں۔ اس کا حال لکھو

مرتبہ۔ میت کو دفن کرنے کے بعد اکثر قبر پر کسی ہرے بھرے پیڑ کی ایک ڈالی توڑ کر لگا دیتے ہیں۔ یہ تعامل ہے اس امر کا کہ میت قبر میں سرسبز رہے۔ پھولوں کی چادر تیجے یعنی فاتحۂ سوم کے دن قبر پر چڑھائی جاتی ہے۔

ب۔ نہیں کچھ حور بھی تیزی سے اچھی نہیں جنت بھری تیری گلی سے
د۔ تیرے سے اچھی، یہ زبان نہیں۔
ب۔ دل میرا تڑپا تھا یا کہ اچھا تم نے تھرکیں لے کے دیکھا تھا
د۔ یہ زبان مدراس کی ہے۔ تم کو اسے
ب۔ ٹوٹتے ہیں ستارے گردوں سے رخ پہ افشاں وہ جب چلاتے ہیں
د۔ جماتے، چناتے ہیں خلاف زبان، چنواتے یا چلتے چاہیئے تھا
ب۔ گل خورشید کی طرح سے آپ ہر وقت منہ پھیرتے ہیں
د۔ منہ پھیرتے ہیں چاہیئے تھا
ب۔ یہ بوجھ بھی اٹھتا نہیں نازک کمروں سے
پٹکا بھی نہیں باندھتے وہ ہیرکنی کا
د۔ ہیرے کی کنی۔ ہیرکنی کیا چیز ہے

مرتبہ۔ ایک قسم کا سوتی پرکا جس کی بافت ایسی ہوتی ہے کہ اس میں ابھری ہوئی بندکیاں نظر آتی ہیں۔

ب۔ پٹکا احمد نے اپنی کمر میں بندھا ہے فور
عمدہ کھلا ہے ہم پہ یہ احمد کے میم کا
د۔ کیا آپ کی زبان میں باندھے کو بندھا کہتے ہیں
ب۔ شہید ناز کی تربت پہ مرد با ندھ جاتا ہے
بنا کر چاندنی اترے ہوئے پھولوں کی باروں کی
د۔ چادر سنی ہے۔ چاندنی مزار پر نہیں سنی۔ یہ کیا ہے اطلاع دو۔

مرتبہ۔ پھولوں کی چادر کو میسور میں پھولوں کی چاندنی کہتے ہیں۔

ب۔ نہیں بوسہ لیتے کو دیتے وہ گیسو مگر دشمنوں جاں یہ کالے ہوئے ہیں
د۔ طرح زبان دہلی بابت ۲۰ جنوری ع نرالے مے عشق والے ہوئے ہیں،
لینے کو دینے یہ گنواری زبان ہے۔
ب۔ ہوگئے سنتے ہی سنتے آگ بھاگ ہیں نے جب پوچھا مزاج اچھا تو ہے

د - اگ دہ - اگ بھاگ - یہ کہاں کی زبان ہے -
مرتبہ - یہ میسوری زبان بھی نہیں -
ب - ہمراہ عدد آج دہ آئے بھی گئے بھی
ٹھوکر سے مری قبر مٹائے بھی گئے بھی
د - قبر مونث ہے اس کی خبر شائی بھی - آئے گی -
ب - نظروں میں سمایا ہے مری طور کا عالم
وہ جلوۂ دیدار دکھائے بھی گئے ہیں
پھر حال پریشاں مرا آکر نہیں دیکھے
دیوانہ کا کل وہ بنائے بھی گئے ہیں
د - اس ترکیب میں خاص عدد اس کی زبان ہے

## عیوب

ب - محفل خوشی کی بزم طرب ہے سبھی ہوئی
ٹھہری ہے کہ خدائی مرے نور عین کی
د - ٹھہری ہے کہ خدائی اب اس نور عین کی - سب ی گر پڑیں
خیال نہیں کرتے -
ب - ہر آہ کو یاد سی تو زمید ہے نالہ
سب چھوڑ کے بیٹھے ہیں بھروسا مرے دل کا
د - یاوس جو ہے آہ - ی گر پڑی
ب - کہ پرندہ جہاں نہ پر مارے میرے دلبر کا گھر وہاں ہے برق
د - اک پرندہ الخ - کاف بیانیہ شروع مصرع - یہ ایجاد آپ کا ہے -
ب - نہ دیکھو اوس کو دزدیدہ نظر سے
نہیں دیتے ہیں لو دل ہم خوشی سے
د - نظر سے ، خوشی سے ، تقابل ردیفین ہوا -
ب - کون سے دن خون آنکھوں سے مری بہتا نہیں
پاؤں تیرے چومے کو لب حیا آتی نہیں
د - خون آنکھوں سے مری بہتا نہیں کب رشک سے — تقابل ردیفین
ہوا اس کو نکال ڈالو
ب - جی ادھر ہم تری خلخال کی سن کر آواز
روح داخل ہوئی پھر جسم میں سن کر آواز
د - اس سے ہم نے نہ سنی تھی کبھی بہتر آواز — مطلع میں بن کر اور
سن کر قافیہ کیوں کر ہوگا -
ب - وعدہ تو وہ ظالم نے کیا آنے کا لیکن
سوچو تو ذرا باقی ابھی اقرار بہت ہیں
د - سوچو تو سہی اور بھی اقرار بہت ہیں - ذرا کا الف دبتا ہوا
نہ آیا کرے
ب - کیا کام تھا پھر قبر تک وہ کس لئے آتے
لاشے پہ مرے اشک بہائے بھی گئے بھی
د - قبر تک وہ ، اس میں تک کا کاف گر گیا

## ظرافت

ب - دین و ایماں جان و دل دے کر بت لنڈن کو آج
برق جو مرد مسلماں تھا نصاریٰ ہو گیا
د - اللہ پھر مسلمان کرے
ب - کیا کہیں ہم گلشن عشرت کی پھر کیا تھی بہار
یار تھا ہمراہ تھی سیر گلستاں رات بھر
د - باغ میں رات کو چور جایا کرتے ہیں
ب - زخم خنداں سے مرے جب دل جلنے کو لگا
سیکڑوں دن خالی گئے اوس نے نمکداں رات بھر
د - رات کی کوئی قید نہیں
ب - سودے ہیں ہیں حور و وش کے ساتھ مل کر خواب میں
شور و غل کرتا نہیں اے صور محشر سر کے پاس
د - کیا دونوں ایک جگہ دفن ہوئے -

## بے معنی

ب - جس طرح آئینے سے عکس ہو دور یوں جدا ہوتے ہیں وہ مل مل کے
د - میں اس شعر کے معنی نہیں سمجھا -
ب - ہم بغل میرے اگر وہ نوجواں ہو جائے گا
تیرسا قد کبھی کے اک دن میں کماں ہو جائے گا
د - میں نہیں سمجھا
ب - مفت تم کو دکھائے کوئی صورت ہے کسی کی آئینۂ دل میں بھی کدورت ہے کسی کی

د- اس مطلع کے صحیح نہیں سمجھی۔ آخر مصرع کا ردیف قافیہ اول مصرع کو بگاڑتا ہے، مکرر مطلع لکھو

## تحسین

ب - یوسر رخسار کا کب بزم میں مانگا میں نے
بے سبب آپ عبث چیں بہ جبیں ہوتے ہیں

د - ۵ - یہ درست ہے۔ اس معاملے کا شعر ہم نے اب تک نہیں دیکھا
مرتبہ۔ پہلے اس شعر کو کاٹ دیا ہے پھر صاد کرکے یہ عبارت لکھی ہے۔

## لطفِ زبان

ب - نسبت نہیں کچھ اوس سے تجھے اے شہ خوباں
کچھ چال نرالی ہے تری کبک دری سے

د - آتی ہے بھلا اس کو یہ کب فتنہ خرامی
اوڑنے کی نہیں چال تری کبک دری سے

مرتبہ۔ "اوڑنے" مجہول معنوی سے کلام میں جو خفتگار اور چستگی پیدا ہوئی ہے، اس کی تعریف نہیں ہوسکتی

## اجتہاد

ب - بے ہوش پڑا ہوں ترے کدے میں دنیا کی خبر مجھے نہ دیں کی
د - " " " " دنیا کی مجھے خبر نہ دیں کی
ب - " " " " دنیا کی خبر ہے اور نہ دیں کی

مرتبہ - استاد نے صرف لفظ مقدم مؤخر کردئے تھے۔ شاگرد نے مصرع کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

ب - وہ کوٹھے پہ جب تک ٹہلتے رہے بصیرت کسی کی بہلتی رہی
د - وہ کوٹھے پہ جب تک ٹہلتے رہے ہیں رقیبوں میں تلوار چلتی رہی
ب - اشارہ جب ابرو کا اوس نے کیا رقیبوں میں تلوار چلتی رہی
د - اشارہ جو ابرو کا ہر اک طرف تھا
ب - اشارہ جو ابرو کا تھا ہر طرف ( دیوان )
ب - سوا تیغ کے کون خلوت میں تھا مگر دہ بھی حسرت سے جلتی رہی
د - سوا تیغ کے کون تھا جو کی شب وہی اک مرے ساتھ جلتی رہی
ب - وہ مٹکی وہ ٹھوکر تری وقتِ رقص کلیجہ ہمارا مسلتی رہی
د - ایک سبب جو میں کم تھا دیکھو خیال کرو
د - وہ مٹکی وہ ٹھوکر تری رقص کے وقت
ب - وہ مٹکی وہ ٹھوکر تری وقتِ رقص ( دیوان )
ب - پریشاں وہ مانندِ گیسو رہے ہماری آہوں کی چلتی رہی
د - پریشاں وہ مانندِ گیسو رہے ہیں
ب - بلائیں جو زلفوں کی لیتا رہا
د - بلائیں جو زلفوں کی لیتا رہا وہ
ب - نزاکی بھر کے دیکھا کبھی ہم نے برق
د - نزاکی بھر کے دیکھا کبھی برق اوس کو مگر اوس کے رُخ پر پھسلتی رہی

مرتبہ - بحر متقارب مثمن مقصور (فعولن فعولن فعولن فعول) کو استاد نے اکثر جگہ بحر متقارب مثمن سالم (فعولن فعولن فعولن فعولن) بنا دیا ہے لیکن شاگرد نے مقصور بحر ہی بحال رکھی ہے۔

## استاد کی بعض عبارتیں جو حاشیوں پر درج ہیں

۱- یہ غزل پھر بھجوانا، رمضان ہے، روزہ رکھتا ہوں، بوڑھا آدمی ہوں، رم لازمی ہے۔ آم میں یہاں پھول خوب آیا۔ وہاں کا حال لکھو۔

۲- میں سفر میں ہم رکاب سرکار ہوں۔ مجھ کو فرصت نہیں۔ تھوڑی بُن لینی کافی بھجواؤ، کافی کا درخت کس موسم میں لگاتے ہیں

۳- قلعہ گول کنڈہ میں ڈاکٹر مہندی حسین صاحب تخلص آتم نے ایک کتاب مسمی بہ گلبن تاریخ فن تاریخ گوئی میں بہت عمدہ لکھی ہے طلعہ روپیہ قیمت ہے، ضرور منگوائیے۔ دوسرا خط میں نے آپ کو تاکید لکھا ہے کہ خدا علی خان کے نام رام پور میں آنب جائیں۔ فرقی کے نام ہرگز نہ روانہ کرنا یقین ہے اس کی تعمیل آپ نے کی ہوگی۔

۴- پلیڈا کافی کا پہنچا

۵ - ب - قامت تانیث ہے یا تذکیر، اہل لکھنؤ تانیث باندھتے ہیں
د - قامت مذکر ہے۔

۶- فصل پر اپنے باغ کے نادیل بھیجنا۔ آم تو ضرور بھیجو گے

۷ - ب - قرۃ العین کی تصویر جو لیموں صورت ۵ لکھی جاتی ہے۔ اس کے اعداد چار سو لئے جاتے ہیں یا پانچ آگاہ فرمائیے۔

د - مولوی امام بخش صہبائی دہلوی نے ۵۰۰ لئے ہیں، اہل لکھنؤ ۵ لیتے ہیں۔

# میں کون ہوں

خانۂ دل ہے مرا ایک نہاں خانۂ راز
پردۂ حُسن ہے میرے لئے اک پردۂ ساز

میری فطرت میں ازل سے ہے محبّت کا خمیر
زندگی میری ہے دنیا میں سراپائے نیاز

دونوں عالم کی حقیقت پہ نظر ہے میری
بزمِ گیتی مری نظروں میں ہے اک بزمِ مجاز

میں نفوسِ بشری میں ہوں حقیقت کی نمود
دہر کے پردۂ اجسام میں ہوں سحر طراز

میں ہی گل زار میں ہوں ہم نفسِ شبنم و گُل
میں ہی غنچوں کے تبسّم کی ہوں دل کش آواز

میرے جذبات نے بخشا ہے محبّت کو فروغ
حُسن کو میں نے بنایا ہے سراپا انداز

گلشنِ دہر میں گل کارِ تصرف ہوں میں
میں نے ترتیب دیا قصّۂ محمود و ایاز

میری تخیّل نے دنیا کی روش بدلی ہے
میں نے انسان کے سینے کی خلش بدلی ہے

میری محفل میں مغنّی کا ترنّم کیا ہے
نطق و آواز ہے کیا زورِ تکلّم کیا ہے

میرے گلشن کے مقابل ترے پھولوں کے قریں
چمنِ دہر کے غنچوں کا تبسّم کیا ہے

میری ہر موجِ تخیّل ہے ہمہ وقت رواں
مرے آگے غمِ افشانیٔ قلزم کیا ہے

میری ہستی کے ہیولے سے ہے آغازِ ازل
مجھ سے پوچھو کہ یہ اشیاء کا تقدّم کیا ہے

میری نظروں میں ہے آئینِ جہاں بانیٔ دہر
عدل کیا چیز ہے اور شانِ ترحم کیا ہے

ایک آئینۂ حیرت ہے مری بزمِ حیات
مجھ سے پوچھو کہ یہ ہستی کا توہم کیا ہے

مجھ سے پوچھو کہ یہ ہنگامۂ کونین ہے کیا
اور جذبات و تخیّل کا تصادم کیا ہے

میں ہر اک ظاہر و باطن پہ نظر رکھتا ہوں
اپنی ہر بات میں پائندہ اثر رکھتا ہوں

وسعتِ عالمِ کونین میں یکتا ہوں میں
حسن افروزِ جہاں رونقِ دنیا ہوں میں

میری تابندہ جبیں پر ہے زمانے کی نظر
زینتِ جلوہ گہِ چشمِ تماشا ہوں میں

غیرِ محدود تجلّی کا ہے پرتو مجھ پر
ہر نظر میں جو سمایا ہے وہ جلوا ہوں میں

کس نے دیکھا ہے مرا نقشِ قدم میرا مقام
بزمِ دنیا کے ہر اک حُسن سے بالا ہوں میں

غالبؔ و میرؔ بھی ہیں حسرت و اقبالؔ بھی ہیں
ہم سخن تھے یہ مرے ان کا سراپا ہوں میں

منزلِ شعر و ادب ہے مرا ہر نقشِ قدم
الغرض رہبرِ اُردو کا معلّا ہوں میں

خود بتا دے گا زمانے کو مرا طرزِ کلام
میرا انداز ہے کیا کون ہوں میں کیا ہوں میں

گلشنِ عالمِ لاہوت کا طائر ہوں میں
دونوں عالم مرے قبضے میں ہیں شاعر ہوں میں

---

# میرزا نامہ — از میرزا کامران

## مقدمہ

سنہ ۱۹۱۳ء میں مولوی ہدایت حسین صاحب (مسلم پروفیسر ڈینسی کالج کلکتہ) نے قصبہ چکدہ (ضلع نادیا) کے رئیس قاضی محمد محمود کے ذاتی کتب خانہ میں ایک قلمی رسالہ 'میرزا نامہ' (فارسی) دریافت کیا تھا۔ رسالہ کے سرورق پر مصنّف کا نام میرزا کامران دیا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے بیان کے مطابق یہ رسالہ بہت خراب شکست میں تھا جس کو انھوں نے نہایت محنت اور عرق ریزی کے بعد صاف کیا۔ انھوں نے 'میرزا نامہ' کی اصل عبارت اور اس کا انگریزی ترجمہ ایک چھوٹے سے دیباچہ کے ساتھ 'جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال' کی سنہ ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں چھپوایا۔

میرزا نامہ کے مضمون سے اس بات کا صاف پتہ نہیں چلتا ہے کہ یہ رسالہ کس زمانے میں تصنیف کیا گیا۔ ایک جگہ مصنّف نے سنہ ۱۴ میں اپنے لاہور سے گزرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک اور جگہ میرزا رفیع شیرازی کا ذکر اس انداز سے آیا ہے کہ جیسے وہ مصنّف کا ہمعصر ہو۔ ان دو اطلاعات کی بنیاد پر اس قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 'میرزا نامہ' کی تصنیف ۱۰۱۴ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔[1]

'میرزا نامہ' کے مصنّف کی بابت مولوی ہدایت حسین کا یہ فیصلہ قطعی مناسب ہے کہ وہ بادشاہ ہمایوں کا چھوٹا بھائی میرزا کامران نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا خود مولوی صاحب نے فرمایا ہے اس رسالہ میں جس انداز سے میرزا رفیع شیرازی کی قابلیت اور علمی استعداد کا ذکر آتا ہے اس کی امید میرزا کامران (شہزادہ) سے نہیں کی جا سکتی ہے۔ شہزادہ کامران کی موت کے وقت میرزا رفیع شیرازی کی عمر صرف سترہ سال رہی ہوگی۔ ظاہر ہے اس کم عمری میں وہ یہ مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا تھا کہ شہزادہ کامران ایسا خود بین اور

---

[1] سنہ ۱۰۱۷ھ میں جب میرزا رفیع شیرازی نے اپنی کتاب 'تذکرۃ الملوک' لکھی تو ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ اس طرح اندازاً ان کی تاریخ پیدائش سنہ ۹۴۷ھ قرار پاتی ہے (دیکھئے مولوی ہدایت حسین، جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۱۳ء صفحہ ۲)

اگر مصنّف دراصل رفیع شیرازی کا ہمعصر تھا تو ظاہر ہے اس نے اپنے کشمیر سے لاہور پہنچنے کی جو دھوری تاریخ (سنہ ۱۴) دی ہے اس سے مقصد ۱۰۱۴ھ ہوگا۔

'میرزا نامہ' کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ مصنّف نے سفرِ کشمیر کے فوراً بعد یہ رسالہ لکھا تھا۔ اس لئے اس رسالہ کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۱۴ھ کے قریب قرار پائے گی۔

صاحب علم اسے دنیا کا 'قابل ترین انسان' تسلیم کر لیتا[1]۔ علاوہ ازیں یہ مان لیا گیا ہے کہ اس رسالہ کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۱۴ھ کے قریب ہے تو پھر کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کیونکہ ہمایوں کا بھائی میرزا کامران تو سنہ ۹۶۴ھ میں مر گیا تھا[2]۔

بہرحال یہ سوال اپنی جگہ پر اہم ہے کہ 'میرزا نامہ' کا مصنف میرزا کامران کون تھا؟ اس سلسلے میں مولوی ہدایت حسین نے خاموشی اختیار کی ہے۔ رسالہ کے مضمون سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک بہت معمولی حیثیت کا منصب دار تھا اس لئے اس عہد کے امراء کے تذکروں میں اس کا نام نہ ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے[3]۔ مگر صاحب تالیف نے جس انداز سے امراء اور سرکاری افسران کے آداب مجالس اور ان کی روزمرہ کی زندگی کے مسائل پر تبصرہ کیا ہے یا اس نے جس طرح شمالی ہندوستان کے مختلف مقامات کا ذکر کیا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میرزا کامران کو نہ صرف ہندوستانی امراء کی سوسائٹی کا دیرینہ تجربہ تھا بلکہ وہ ملکی حالات سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا۔ ان واقعات کی روشنی میں اگر یہ تصور کیا جائے کہ میرزا کامران ایک لمبے عرصے تک مغل حکومت کا ملازم رہا ہوگا تو بے جا نہ ہوگا۔

اکبر نامہ اور طبقات اکبری میں کامران بیگ گیلانی نامی ایک منصب دار کا ذکر ملتا ہے جو شاید عبدالرحیم خان خاناں کی ملازمت میں تھا[4]۔ عبدالباقی نہاوندوی رحمہ نے عبدالرحیم خان خاناں کے حکم پر اس کے کارناموں اور خاندانی حالات کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی) نے بھی کامران بیگ گیلانی کا ایک جگہ ذکر کیا ہے[5]۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے کامران بیگ کا نام دوصدی منصب داروں کی فہرست میں دیا ہے[6]۔ کامران بیگ عبدالرحیم خان خاناں کے ماتحت ۹۹۹ھ تک گجرات میں تعینات رہا۔ سنہ ۱۰۰۴ھ اور سنہ ۱۰۰۵ھ میں جب خان خاناں دکن کی مہم پر گیا تو یہ وہاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ میرا گمان ہے کہ کامران بیگ گیلانی اور 'میرزا نامہ' کا مصنف میرزا کامران ایک ہی شخصیت تھی۔ کامران بیگ نے سنہ ۱۰۰۵ھ کے بعد بھی اپنے نام کے ساتھ 'میرزا' کا لقب استعمال کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ 'میرزا نامہ' کے مصنف نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ پیدائشی میرزا نہیں تھا بلکہ اس نے یہ درجہ "اپنی ریاضت اور اخلاق کے بل پر حاصل کیا تھا۔"

ویسے تو 'میرزا نامہ' ایک میرزا کی خصوصیات سے متعلق اقوال کا مجموعہ ہے جو بظاہر بغیر کسی ترتیب کے یکجا کر دئے گئے ہیں۔ لیکن مصنف کا منفرد انداز تحریر اور اس کا زندگی کی طرف سے نہایت عملی اور حقیقت پسندانہ رویہ، فلسفہ، مذہب اور جنگ کے بارے میں اس کے Cynical خیالات پورے مضمون میں ایک قسم کا اندرونی تسلسل پیدا کر دیتے ہیں۔ مصنف اپنے رسالہ کی نوعیت بیان کرتے ہوئے ابتدائی چند فقروں میں خود ہی یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کی تحریر میں ہزل اور

---

[1] میرزا نامہ کا مصنف ایک جگہ لکھتا ہے۔" میرزا پر واجب ہے کہ معاصرین وقت میں قاضی زادہ ہروی، میرزا رفیع شیرازی اور جلالی اردشانی کو قابل ترین ہستیاں مانے۔"

[2] دیکھو۔ اکبر نامہ (فارسی) ایشیاٹک سوسائٹی۔ جلد اول صفحہ ۳۲۱

[3] مغل امراء کے تین مشہور تذکرے ہیں (الف) ذخیرۃ الخوانین از شیخ فرید بھکری (ب) ماثر الامراء از شاہنواز خاں۔ (ج) تذکرۃ الامراء از کیول رام۔ ان تذکروں میں کسی ایک میں بھی میرزا کامران کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ گو کہ تذکرۃ الامراء میں عموماً بہت سے ایسے معمولی حیثیت کے منصب داروں کا ذکر مل جاتا ہے جن کو دوسروں نے نظر انداز کیا ہے لیکن میرزا کامران کے ذکر کو کیول رام نے بھی اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی ہے۔

[4] دیکھو اکبر نامہ (فارسی) ایشیاٹک سوسائٹی، جلد سوم صفحہ ۴۵۳، ۵۳۰-۵۳۱ و ۵۹۴-۶۰۰ و ۶۱۸

طبقات اکبری۔ انگریزی ترجمہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی جلد دوم ۵۸۱-۵۸۳ و ۶۱۲

[5] دیکھو۔ عبدالباقی نہاوندوی۔ ماثر رحیمی۔ ایشیاٹک سوسائٹی جلد دوم۔ صفحہ ۲۲۲

[6] آئین اکبری از ابوالفضل۔ نول کشور واڈیشن صفحہ ۱۶۴

جملہ بازی کا عنصر شامل ہے۔ میرزا کامران کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں چھپے ہوئے طنز و مزاح کے زہریلے نشتر اس بات کا صاف پتہ دیتے ہیں کہ اس نے سماجی زندگی کے ہر پہلو کا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ زمانے کے سرد و گرم دیکھے ہوئے تھا اور سترھویں صدی عیسوی کے منفی مناظر کی ڈکھی رگوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا کامران کے بعض جملے تو بالکل چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔ اس کا انڈر لیلکہ بے ڈھب انداز فکر اور سماجی مسائل پر روایاتی اقدار سے انحراف کر کے رائے زنی کرنے کے تیور اس عہد کے ادبی اور تاریخی لٹریچر میں ایک انوکھی چیز ہے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے اس قسم کے مشورے دیتا ہے: "جہاں تک ہو سکے میرزا جنگ سے دور رہے۔" "بُزدل کو پہچانے لیکن ان کی بُرائی کا تذکرہ نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا خلافِ حکمت ہے۔" "میرزا مدت سے تازہ کھلے ہوئے طالب علم سے علمی بحث نہ کرے ورنہ وہ اس کا ذہنی سکون ختم کر دے گا۔" "بحث میں مخالف کو زیر پڑے تو اسے پوری طرح زک پہچانے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھے۔ مگر صورت حال برعکس ہو تو فوراً پسپا ہو جائے۔" ان جملوں کو پڑھ کر بے اختیار جارج برنارڈ شا کی The Revolutionists Handbook یاد آجاتی ہے۔

سترھویں صدی عیسوی کی تہذیبی زندگی اور مغلوں کے سیاسی اور سماجی اداروں کے متعلق اطلاعات کے ماخذ کی حیثیت سے "میرزا نامہ" کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ تہذیبی اور سیاسی اداروں کے متعلق اعداد و شمار اور اس دور کی اخلاقی قدروں اور سماجی زندگی کے اصولوں کا بیان تو اکثر ملتا ہے۔ اس لحاظ سے 'میرزا نامہ' کے اندر کوئی خاص نئی بات نہیں ہے۔ جو چیز اس رسالہ کو منفرد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ان اقدار اور اصولوں کو روزمرہ کی زندگی کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ بات ہمیں اور دوسرے ذرائع سے بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ ایک عام مغل امیر کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری تصور کیا جاتا تھا تاکہ بقول میرزا کامران "اس کی نفس جہالت کی لعنت سے آزاد ہو۔" لیکن عمل میں اس 'تعلیم' کا مفہوم کیا تھا اور اس کا اندازہ میرزا کامران کے چند جملوں سے ہوتا ہے۔ وہ شاید موٹی موٹی کتابیں چھان کر بھی نہ ہو سکتا۔ اس کا خیال ہے کہ "ایک میرزا کو عربی، فارسی، ہندی اور ترکی زبانیں جاننا چاہیئے۔ اس کی طبیعت میں ایجاد اور تخلیق کا مادہ ہو اور وہ اپنا کام پھرتی سے کر سکتا ہو، حساب کتاب میں مہارت رکھتا ہو لیکن کلرکوں کی سی عادت اختیار نہ کرے میرزا کو فلسفہ کے مدارج سے واقفیت ہونی چاہیئے لیکن جبر و اختیار اور قضا و قدر کی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہیئے کیونکہ ایسی بحثوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔ فلسفہ کے دیگر مسائل سے بس اسی قدر واقفیت کافی ہے کہ وہ کہہ سکے "میں جانتا ہوں" ــــ اسی طرح میرزا نامہ میں بہت سی دلچسپ اور معنی خیز جھلکیاں معمولی منصبداروں کے معیارِ زندگی، فوجی افسروں اور ماتحتوں کے درمیان سماجی تعلقات کی نوعیت اور مذہبی اخلاقیات کے مظاہر ملتے ہیں۔

'میرزا نامہ' کے مضمون سے اس عہد کے مذہبی اخلاقیات اور مباحث کی بابت یہ تو اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ کیا مسائل درپیش تھے۔ اس کے لئے دوسرے زیادہ اہم ماخذ موجود ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان نظریاتی تناؤ اس حد تک موجود تھا کہ گلی کوچوں میں بحثیں ہوا کرتی تھیں جن میں اکثر نوبت مار پیٹ تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ اور سُنّی فرقوں کے درمیان اخلاقیات اس زمانے میں کافی شدت اختیار کر گئے تھے۔ اور اس سلسلے میں کچھ لوگ انتہائی احمقانہ تنگ نظری کا ثبوت بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے میرزا کامران کی طرح کے لوگ بھی تھے جو تنگ نظری کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ مذہبی مباحث کو فضول حرکت سمجھتے تھے اور دوسروں کو بھی صلاح دیتے تھے کہ اگر ہاتھ پاؤں کی سلامتی چاہتے ہو تو مذہبی مباحث سے دامن بچاؤ ان کا نظریۂ حیات اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ یہ تمباکو، شراب، جُوا، طوائف، "پسر جام" سب سے شغف رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ خدا پرست بھی تھے بلکہ انسان کی خدا شناسی سے ہی اس کے 'کمالات' کا تعین کرتے تھے۔ لیکن ملّا اور مفتی کا خاکہ اڑانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ میرزا کامران

ایک جگہ بڑی صفائی سے اعلان کرتے ہیں۔ "ہندوستان میں جو اپنے سروں پر بڑے بڑے عمامے باندھے گھومتے ہیں (میرزا) ان سے عقل کی امید نہ رکھے۔"

گو کہ اس رسالہ کا فارسی مضمون اور انگریزی ترجمہ اب سے اٹھانوے برس پہلے چھپ چکا تھا لیکن ابھی تک اس سے کسی نے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف صاحب نے اپنی کتاب "لائف اینڈ کنڈیشن آف دی پیوپل آف ہندوستان" میں اس رسالے کا سرسری تذکرہ ضرور کیا ہے لیکن ان کا موضوع دہلی سلطنت کا عہد تھا اس لئے وہ 'میرزا نامہ' کی طرف کافی توجہ نہ دے سکے۔ اس رسالہ کا اصل استعمال تو وہ اسکالر ہی کر سکے گا جو عہدِ متاخرہ کی کچھ اور سوشل تاریخ پر کام کر رہا ہو۔ بہرحال یہ امید کی جا سکتی ہے کہ "میرزا نامہ" کا مندرجہ ذیل اردو ترجمہ تاریخ سے شغف رکھنے والے اردو داں حضرات کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ترجمہ

شکر اور حمد اس خدا کی جس کی ذات مخلوقات کی تعریف کی محتاج نہیں اور درود و سلام بے نہایت حضرت مصطفےٰ اصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرقد منوّر پر۔ ارباب ہمت کو معلوم ہو کہ سنہ ۱۰ ہجری بمطابق ۱۶۰۱ عیسوی جب نشانِ جنت کی سیر کے بعد والا مکان ہندوستان میں داخل ہوا (کہ قسمت کا کرنا یہی تھا) اور دارالسلطنت لاہور سے گزرا اتفاقاً زمانہ میں کچھ مدت زور لوگوں نے اپنی خصلت کے مطابق بہت سر اٹھا رکھا تھا اور میرزائی کے دعوے دار بن بیٹھے تھے۔ چوں کہ بندہ کو مرزا کہلانے کا حق حاصل ہے اس لئے میری غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ میرزائی کے رسم و قواعد میں ایسا انقلاب اور فتور واقع ہو۔ معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر سوچا کہ اس مسئلہ پر ایک ایسا رسالہ لکھوں جو اہلِ روزگار کے لئے دستورالعمل بن جائے اور کوئی غیر مستحق اس اعزاز کا (یعنی میرزائی کا) دعوے دار نہ ہو

سخن بسیار دانی اندکے گوئی
یکے را صد مگو صد را یکے گوئی

معلوم ہو کہ بندہ نے اپنی ریاضت اور اخلاق کے بل پر میرزائی کا درجہ حاصل کر لیا ہے اس لئے جو کچھ بھی میں کہتا ہوں وہ سچ اور خیر سے عبارت ہے۔ اگرچہ میرے بیان میں ہزل اور جملہ بازی کا انداز آ گیا ہے لیکن اس کتاب سے چند ایسی نصیحتیں نکلتی ہیں جن کو لوگ اغلاطون اور یونانی کی رہنمائی اور امداد کے لئے بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اگر کوئی کوتہ نظر اپنی کم عقلی کی بدولت میری باتوں کی اہمیت نہیں سمجھتا ہے تو کیا پروا۔ سورج کو کیا فکر کہ چمگادڑ اس کی طرف توجہ نہیں کرتا اور ایک کوہ گراں پایہ اس بات سے اندیشہ مند کیوں ہو کہ ایک جنگلی چوہا اس کو پیچ قرار دیتا ہے۔

بے ہنر چند زخود بے خبر — عیب پسند ند ہنر عم ہنر
دود شوند از بدماغی دسند — باد شوند از بہ چراغی رسند

اگر کسی شخص کے دل میں میرزائی کی ہوس ہو تو اس کو چاہئے کہ جو کچھ اس رسالہ میں درج کیا جاتا ہے اس کے مطابق عمل کرے۔ اور اگر وہ ان باتوں پر عمل نہیں کرتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ ایسی خطرناک حرکت کا مرتکب ہو کر (یعنی میرزائی کا دعوے دار بن کر) لوگوں پر اپنی نیچی اوقات اور کم ظرفی کا مظاہرہ کرے معلوم ہو کہ قانون میرزائی کے دس خاص اصول ہیں اور چند ذروی شرائط ہیں۔ تمام اصولوں میں اوّل یہ ہے کہ (میرزا) خدا کو پہچانے کیونکہ انسان کے کمالات اس کی خدا شناسی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ دوم یہ کہ علم و فضیلت حاصل کرے تاکہ اس کی نفسی جہالت کی لعنت سے آزاد ہو اور اسے بے جا نامحسوس کی ہوس نہ رہے[1] ابتدا میں صرف اور نحو کا سرسری مطالعہ کرے اور ان دو علوم سے واقفیت اس حد تک ضروری تصوّر کی جائے کہ وہ (یعنی میرزا) لکھنے اور بولنے میں فارسی اور عربی کے الفاظ صحیح استعمال کر سکے۔ محفلوں میں میرزا کو ہوس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس کے منھ سے غلط الفاظ نہ نکل جائیں کیونکہ ایک میرزا کے لئے گفتگو میں غلطی

---

[1] فارسی عبارت یوں ہے: "وصول نشینی بخاطرش منظور نباشد"

کرنا بہت بڑا عیب ہے۔ سوم یہ کہ تیس سال کی عمر میں مرزا کو شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان ختم کر لینی چاہیئے۔ چہارم یہ کہ وہ (یعنی مرزا) مردم شناس ہو جو کہ اعلیٰ ترین کمالات میں سے ایک ہے اور ہر اُس یا توفی اور دھوکا باز شخص کے دعوے پر یقین نہ کرے جو یہ کہے کہ وہ گیٹی بارجن قابو میں کر چکا ہے اتنا آنکھ پر واقعہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔ بلکہ اس کے باوجود شبہ کی گنجائش ہے کیونکہ اہلِ کشف (اس طرح) اپنے کمالات ظاہر نہیں کرتے ہیں اور اس قسم کے دعوے اشخاص کو دھوکہ دینے کے لئے وہی لوگ کرتے ہیں جو دراصل کچھ نہیں جانتے ہیں۔ پنجم یہ کہ مدرسہ سے تازہ نکلے ہوئے طالب علم کے ساتھ دبیرزا) علمی بحث نہ کرے کیونکہ وہ اپنی کج بحثی سے مرزا کا ذہنی سکون ختم کر دے گا۔ ششم یہ کہ ہر ایسے بچرے سے بات نہ کرے اور صرف اپنے برابر کے لوگوں سے تعلقات رکھے۔ ہفتم یہ کہ وہ عربی، فارسی، ہندی اور ترکی زبانیں جانتا ہو۔ ہشتم یہ کہ اس کی طبیعت میں عجب دلآویز تملیق کا مادہ ہو اور اپنا کام بچرتی سے کرتا ہو کہ عمرِ عزیز چند روزہ ہے۔ نہم یہ کہ حساب کتاب میں مہارت رکھتا ہو لیکن اس کو (یعنی میرزا کو) کلرکوں کی سی عادتیں نہ اختیار کرنا چاہیئے۔ دہم یہ کہ مرزا کو فلسفہ کے مختلف مدارج سے واقفیت ہونی چاہیئے لیکن اسے جبر و اختیار اور قضا و قدر کی بحث میں نہ پڑنا چاہیئے کیونکہ ایسی بحث سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔ فلسفہ کے دیگر مسائل سے بس اس قدر واقفیت کافی ہے کہ وہ سمجھ سکے "میں جانتا ہوں۔"

## فروعی شرائط کا باب

پہلی بات یہ کہ مست یا متی اور میرزا کے درمیان ایک فرسنگ کا فاصلہ رہنا چاہیئے۔ اگر چینی کے برتن میسر ہوں تو وہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا اور میوہ نہ کھائے اور اگر مٹی کا برتن ہاتھ آئے تو چینی کے برتن میں پانی نہ پیئے۔ اگر ایک گھر میں دس آدمی رہتے ہوں اور ان میں سے ایک بُرا آدمی ہو تو میرزا کو ان دسوں سے ملنے جلنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ میرزا کا نام اگر جلال الدین یوسف رکھا گیا ہو تو اس کو چاہیئے کہ اتنا لمبا نام نہ لکھا کرے بلکہ اپنے آپ کو صرف میرزا یوسف کہلوائے۔ میرزا کو اگر کوئی چیز خریدنی ہو تو اس کی قیمت پر سوداگروں کی طرح حجت نہ کرے۔ اس کو چاہیئے کہ یاقوت کو سب سے بہتر ہیرا، پالکی کو سب سے بہتر سواری اور خربوزہ کو سب سے بہتر میوہ سمجھے۔ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور سر ترڑوانا نہیں چاہتا ہے تو لشکر کے ساتھ کشمیر کبھی نہ جائے۔ خشکہ اور چلتی[1] کو تمام دوسرے کھانوں سے بہتر سمجھے۔ "عشقِ پاک" کو اونچے طاق میں رکھ دے اور اس سے ہمیشہ دُور رہے۔ جس حسین کی طبیعت میں شرارت ہو اس کے پیچھے کبھی نہ لگے۔ اور تنہا کو زیادہ نہ استعمال کرے۔ ہندوستان کے دورانِ قیام میں جہاں تک ہو سکے اپنے آپ کو بیماریوں سے بچائے رکھے تاکہ میرزا کو اپنے افسر کے حکم کا سامنا کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ جس جگہ میرزا کی جان پہچان

---

[1] شاہی کیمپ کو عموماً "لشکر" کہا جاتا تھا۔

[2] "خشکہ یا مصالح" کا مطلب مولوی ہدایت حسین صاحب نے مصالحہ کے ساتھ ابالے ہوئے چاول لیا ہے لیکن خشک ابلے ہوئے سادہ چاولوں کو کہتے ہیں۔ میرے خیال میں خشکہ یا مصالح سے میرزا کا مران کا مفہوم خشکہ اور چلتی یا خشکہ اور سالن سے ہے۔ شاید وہ ایک میرزا کے لئے خشکہ اور چلتی بہترین غذا قرار دے کر سادہ رہن سہن یا صوفی منشی کی تلقین کر رہا ہے۔ اوپر بھی ایک ایسا ہی جملہ آیا ہے جس میں قیمتی برتن کے استعمال نہ کرنے کی صلاح دی گئی ہے۔

[3] فارسی عبارت یوں ہے۔ "در ہندتا ی تواند خود از ہمہ یہا محفوظ نماید کہ روئے طبیب منصب دارش نبا ید دید۔" مولوی ہدایت حسین نے اس جملہ کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا اس میں طبیب منصب دارش کے لئے Court Physician یعنی 'شاہی طبیب' لکھا ہے جو غلطی غلط ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ یہاں پر مرزا کامران کا اشارہ اس طبیب کی طرف ہے جو شاید ہر بڑے منصب دار کے عملہ میں شامل رہا کرتا تھا اور اس کے ماتحت افسروں (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

---

[1] فارسی عبارت یوں ہے۔ "ہم آنکہ در علم سیاق وقوفی دیہرہ داشتہ باشد اما محرّر وطنیت نباشد؛

ہو جائے وہاں تین مرتبہ جانا چاہیئے۔ ایک مرتبہ پہلے دن کہ اس روز ملاقات ہوئی۔ دوسرے روز سلام و دعا کہلوا کر گھر میں داخل ہو لیکن تیسری مرتبہ اگر بغیر سلام کہلوائے ہی بلا لیا جائے تو چلا جائے مگر بغیر بلاوے کے وہاں جا کر خفت نہ اٹھائے کیونکہ عزت ایک بار ہاتھ سے جائے تو واپس نہیں ملتی ہے۔ وہ (یعنی مرزا) لاہور کو ہندوستان کے تمام شہروں سے برتر مانتے اور آگرہ کے قلعہ کو دنیا کے تمام قلعوں میں کیتا سمجھے اور اگر اس بات پر زیادہ مخالفت نہ ہو تو اصفہان کو ایران کے بہترین شہروں میں شمار کرے۔ بھیڑ جھاڑ میں مرزا کو لوگوں کی بغلوں میں چھپی ہوئی قلموں کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اس کی آمدنی کم سے کم اتنی ہونی چاہیئے کہ وہ بیس روپے تک پالکی اور دربانوں پر خرچ کر سکے۔ (میرزا) سرائے میں کمرہ لے کر کبھی نہ رہے کہ اس طرح طبیعت فقیرانہ بن جاتی ہے۔ جان کو عزیز رکھے اور جنگ کے قریب نہ چلے۔ اور اگر جنگ پر جانا ہی پڑ جائے تو پھر ایسی جگہ کھڑا ہو جہاں توپ کے گولے نہ پہنچ رہے ہوں۔ اگر جنگ میں فتح ہو تو وہ شکست خوردہ لشکر کے تعاقب میں نہ جائے۔ لیکن اگر جنگ کا نتیجہ برعکس ہو تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ میرزا کا کلام بامعنی ہونا چاہیئے تاکہ وہ کم الفاظ میں وسیع مفہوم ادا کر سکے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر میرزا اور دوسروں میں فرق ہی کیا ہے۔ نرگس، بنفشہ اور نارنج جہاں نظر آئیں میرزا کو چاہیئے کہ انہیں حاصل کرے۔ وہ بڑوں کو پہچانے لیکن ان کی برائی کا ذکر نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا خلافِ حکمت ہے۔ اس کو جوا کھیلنا آئے لیکن وہ جواری نہ بنے۔ شطرنج میں ہزاروں کی بازی بھی نہ لگائے۔ وہ مشغل اشعار سے رغبت نہ رکھے اور اس کے معنی تلاش کرنے میں وقت نہ خراب کرے کیونکہ یہ عمر گنواں مایہ چند ہی دنوں کو ملی ہے۔ اگر کوئی ہم سفر اپنے گھوڑے کو تیز ہانک رہا ہو تو میرزا کو

---

(بقیہ فٹ نوٹ پچھلے صفحہ سے آ گے) اور سپاہیوں کی حفظانِ صحت کا ذمہ دار بھی کرتا تھا۔ دراصل یہ ایک نئی اور بہت دل چسپ اطلاع ہے جو مغلوں کے فوجی نظام کے ایک اہم پہلو کو روشن کرتی ہے۔

چاہیئے کہ اس کے ساتھ نہ چلے۔ اس کا ساتھ چھوڑ دے تاکہ وہ جہاں جانا چاہتا ہو چلا جائے۔ کوئی ملاقاتی میرزا سے دریافت کرے کہ تمہاری تنخواہ کیا ہے تو اس کو بتا دے لیکن اس ہی صورت میں جب کہ میرزا کو یقین ہو کہ وہ اس کی جگہ نہیں لے سکتا ہے۔ لیکن معاملہ برعکس ہو تو میرزا کو چاہیئے کہ اس شخص سے بچ کر دور بھاگ جائے۔ اگر دسترخوان پر میرزا کے قریب کوئی مفتی بیٹھا ہو تو (میرزا کے لیے مناسب ہوگا کہ) کھانے سے ہاتھ کھینچ لے۔ وہ بھوک سے مر بھی گیا (تو کوئی حرج نہیں) کیونکہ اس کو بڑا ثواب ملے گا۔ اگر میرزا کی شکل و صورت اچھی ہو اور گلا بھی خوب پایا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو ایک آدھ چیز سنا دے۔ اگر گانے کی عادت ضرورت سے زیادہ ہو تو پھر اس کو اپنے کھانے پینے کے برتن علیحدہ کر لینا چاہیئے کیوں کہ وہ (اب میرزا نہیں بلکہ) گویا ہے۔ میرزا پر واجب ہے کہ معاصرین وقت میں قاضی زادہ ہڑی میرزا رفیع شیرازی اور جلالا لی[1] اردستانی کو قابل ترین ہستیاں مانے لیکن جب ان لوگوں پر کوئی اعتراض کرے تو بحث نہ کرے۔ میرزا کو کسی ادیب کی عظمت کا اندازہ اس کے کپڑوں سے نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کسی شخص سے میرزا کی بحث ہو جائے اور اس بحث میں مخالف کمزور پڑے تو میرزا کو چاہیئے کہ اسے پوری طرح زک پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ اگر صورت حال برعکس ہو تو پھر (فوراً) مدمقابل کی بات مان لے۔ اگر میرزا بڑے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا ہو اور وہاں

---

[1] میرے خیال میں صحیح نام جلال الدین اردستانی ہے۔ شاید مولوی ہدایت حسین نے قلمی نسخہ کی عبارت پڑھنے میں غلطی کی ہے۔ خراب شکست میں لکھے ہوئے 'جلال الدین' کو 'جلالا لی' پڑھا جا سکتا ہے جبکہ جلال الدین محمد اردستانی عہد اکبری کا ایک مشہور طبیب تھا۔ سنہ ۱۵۹۶ء میں نظام الدین بخشی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ آج کل اعلیٰ حضرت (اکبر) کی ملازمت میں ہے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۰۰۱ھ میں جب 'میرزا نامہ' تصنیف کیا گیا تو زندہ تھا کیونکہ اس کا ذکر ایک ہمعصر کی حیثیت سے کیا ہے دیکھو۔ طبقاتِ اکبری انگریزی ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی۔ جلد دوم صفحہ ۷۱۲)

ہر کوئی اپنی آمدنی اور قابلیت کا ذکر کر رہا ہو تو اس کو چاہیئے کہ موضوع بدلنے کی کوشش کرے۔ یہ ممکن ہو تو بہتر ورنہ محاملہ صاحب خانہ پر چھوڑ دے اور خود سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ مفت کی سیر کرے کہ دیکھنے کے قابل جگہ ہے۔ اگلے کہیں سکونت اختیار کرنے کا خیال ہو تو شام کو دلی بنائے کیوں کہ وہاں عمدہ روٹیاں، پنیر اور میٹھے خربوزے (بدا فراط) ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ چیزیں (فضیوں کی (مخصوص) غذا ہیں۔ یہ چیزیں ایک سچے مسلمان مرزا کو دستیاب ہوں تو ان کے کھانے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہندوستان میں چاقشو[1] بھی زیب تن نہ کرے اور زیادہ باتیں کرنے سے پرہیز کرے۔ محفل میں لوگوں کے ساتھ بحث نہ کرے۔ خصوصاً مذہبی بحثوں سے بچے۔ جو کچھ بھی اس کا مذہب ہو اُسے خفیہ رکھے ورنہ ہو سکتا ہے کبھی اس کی پٹائی ہو جائے۔ اگر مرزا کو کہیں سے ہو تو جب تک وہ پانچ سو کے منصب پر نہ پہنچ جائے اپنے گھر کسی کو مہمان نہ بلائے۔ مصیبت کے دنوں میں چھوٹے لوگوں کا احسان نہ لے (اور ان کے گھر مہمان نہ بنے) کہ اس میں ذلت کا امکان ہے۔ جوئے کو دنیا کے تمام کھیلوں میں بہتر سمجھے۔ کسی کی عزت اور ناموس کی بابت غیر مدارانہ باتیں نہ کرے۔ ہر ایرے غیرے سے مذاق نہ کرے اور نہ ہی اسے اپنے سے مذاق کرنے کا موقعہ دے۔ دوستوں سے کبھی بھی ملے اور اپنی طرف سے کوشش نہ کرے کہ دن میں ایک سے زیادہ بار ملاقات ہو۔ اپنی سو روپیہ ماہوار تنخواہ میں سے دس روپے پٹے اور چیرہ[3] بادلہ پر خرچ کرے۔ اگر یہ دونوں چیزیں اس کے افسر نے اسے دی ہوں تو بہتر ان کو بھیجنا نہیں چاہیئے[2] اور اگر وہ پچاس روپیہ سمور پر خرچ کرے تو یہ فضول خرچی نہیں کہلائے گی۔ جب لوگ چوسر کھیل رہے ہوں تو بات نہ کرے۔ لوٹ کے لئے کسی غیر کے گھر نہ جائے، خصوصاً ایسے آدمی کے یہاں جو میرزا سے زیادہ استعداد والا ہو اگر میرزا کے روئے مبارک پر دھول جم گئی ہو تو اس کو نمک اور سرکہ سے دھونا چاہیئے۔ تاریخ الدنیا و رویش کے علاوہ میرزا کو کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ شعر ہمیشہ پورا پڑھنا چاہیئے۔ حسن مطلع اگر آسان اور مشہور ہو تب بھی اس کو پورا نا ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک مصرعہ پڑھ رہا ہو تو یہ مناسب نہیں ہے کہ میرزا اس سے پہلے دوسرا مصرعہ پڑھ دے۔ ہندوستان میں اگر میرزا مکان لے تو اس کے در و بام کی خوبصورتی سے زیادہ استحکام کی طرف توجہ دینا ضروری ہے تاکہ برسات میں بے اجل نہ مرنا پڑے۔ حمام میں بوڑھے حجام کو اپنا بدن نہ چھونے دے مگر حجام کے بیٹے کے ساتھ ملامت سے پیش آئے۔ کبھی ایسے حوض میں نہانے کے بعد جہاں کئی آدمی نوکر نگار رہے ہوں میرزا کے لئے یہ مناسب ہے کہ غسل خانہ میں جا کر تھوڑا سا (صاف) پانی سر سے ڈال لے۔ اگر مرزا چاہتا ہے کہ حقہ نہ اٹھائے تو بالا نشینی کا سودا اپنے سر سے دور کر دے۔ ہندوستان میں جو لوگ اپنے سروں پر بڑے بڑے عمامے باندھے گھومتے ہیں ان سے عقل کی امید نہ رکھے۔ اگر میرزا کو اپنی عزت پیاری ہے تو ایسوں سے کوئی توقع نہ رکھے جو اُٹھتے بیٹھتے اس طرح کی باتیں کرنے کے عادی ہیں "میں فلاں بڑے آدمی سے ملوں گا۔ وہ مجھے ہزار روپیہ دے بہت انعام و اکرام دے گا"۔ ہندوستان میں لوگوں کے گھروں پر جا کر فربہی اور پاندہ

---

[1] ایک قسم کے موزے

[2] فارسی عبارت یوں ہے :-

"عاشق حرف خود نباشد"

[3] چیرہ - یہ معنی صاف - یا دلہ ہندی لفظ ہے یہ معنی تار نقرہ یا طلا - بظاہر "چیرہ بادلہ" سے مطلب ہے "کار چوبی صاف" مولوی ہدایت حسین نے اسکا انگریزی میں ترجمہ embroidered badge کیا ہے -

---

[1] ملی منصب دار اپنے ماتحتوں کو تنخواہ کا ایک حصہ پرانے کپڑوں اور روزمرہ کے استعمال کی دوسری چیزوں کی صورت میں دیا کرتے تھے - دیکھو مانوچی اسٹوریا ڈی موگر - انگریزی ترجمہ جلد دوم صفحے ۳۷۸ - ۳۷۹ - اس اطلاع کے لئے میں اپنے محترم دوست اور ساتھی سید اطہر علی صاحب کا شکر گزار ہوں جن کی کتاب The Mughal Nobility During Aurangzeb's Reign جلد شائع ہونے والی ہے -

کھانے کی عادت نہ ڈالے کیونکہ ان چیزوں کے کھانے سے انسان کاہل ہو جاتا ہے اور پھر بے عزتی ہونے کا بھی خطرہ ہے۔ منصب صدی پر رہتے ہوئے میرزا کو اپنے حقہ کا سرپوش اور گھوڑے کی لگام خود ہی نہیں بنانی چاہئے کیونکہ یہ چیزیں (زیادہ دن تک) اس کے پاس نہ رہ سکیں گی (یعنی بیچنا پڑیں گی)۔ اگر میرزا اپنے افسر کے ساتھ سفر کر رہا ہو تو اسی پر لازم ہے کہ اپنے گھوڑے کو آگے نہ نکلنے دے لیکن جب پُل پر سے گزرنا ہو تو آگے ہو جائے اور سلامتی کے ساتھ پُل پار کر کے پھر پہلے کی طرح اپنا گھوڑا پیچھے کرلے۔ اگر میرزا کی حالت ٹوٹی ہوئی ہو (اور اس کو عمدہ برتن دستیاب نہ ہوں) پھر بھی وہ پیتل کے برتن استعمال نہ کرے کیوں کہ ان کے کناروں پر نقش بنے ہوتے ہیں جن میں جما ہوا میل آسانی سے صاف نہیں ہوتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو بسنتی خاں کی سرائے کے دروازے پر میرزا اپنے منھ سے کوئی بات نہ نکالے کیوں کہ وہاں کی بہت لوگ جمع رہتے ہیں۔ اگر میرزا چاہتا ہے کہ نقصان نہ اٹھائے تو چند چیزوں سے دور رہے۔ اگر کوئی آدمی بلی کہانی سنانی شروع کر دے تو اس کے چکر میں میرزا کو نہ پڑنا چاہیئے کیونکہ وہ کہانی گھنٹوں کا جیل خانہ ہے (جس سے باہر نکلنا مشکل ہوتا ہے) کچ بحث سے تبادلۂ خیال بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ اس میں سراسر تکلیف ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے محمد صادق بیگ نویسندہ اور میرزا فضل بیگ سے دوستی کرنے سے گریز کرے۔ کیونکہ یہ دونوں لمبی گفتگو کرنے اور گپ مارنے کے بہت عادی ہیں۔ کسی مجلس میں جہاں بہت سے لوگ مدعو ہوں میرزا کو سب سے پہلے پہنچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اگر سب سے پہلے پہونچ گیا تو تمام مہمانوں میں سے جو کوئی بھی داخل ہوگا اس کی تواضع کرنی پڑے گی (یعنی کھڑے ہو کر معافی کرتے کرتے ناک میں دم آجائے گا)۔ ان باتوں کو "چار و حبۂ اختلاط" کہتے ہیں۔ بہرحال اگر کسی کے سر میں میرزائی کا سودا ہے تو اس رسالہ کی طرف رجوع ہو۔

---

## مضمون "اردو کے جوڑاں مصوتے" (آج کل۔ نومبر ۱۹۶۱ء) کا غلط نامہ

صفحہ ۷ کے آخر اور صفحہ ۸ کی ابتدا میں اردو کے مصوتوں کی ہندی علامتیں درج ہیں۔ ان میں ۱ سے ۱۱ تک کی ہندی شکلیں غلط ہیں۔ صحیح علامتیں درج ذیل ہیں:-

| | |
|---|---|
| ۴۔ خفیف اِ سے | ऍ |
| ۵۔ اَ سے | ॅ |
| ۶۔ خفیف اَ سے | ॆ |
| ۷۔ اَ | अ |
| ۸۔ آ | आ |
| ۹۔ اُو | ओ |
| ۱۰۔ خفیف اُو | ॉ |
| ۱۱۔ اُو | ऑ |

ان کے علاوہ ذیل میں چند اور غلطیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

| صفحہ | کالم | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|---|
| ۷ | ۲ | ۸ | مصوتوں | نیم مصوتوں |
| ۸ | ۰ | ۱۷ | ॅ/ॆ، ॅ/ॆ | ु/ॅ , ु/ॆ |
| ۸ | ۱ | ۷ | ॅ سے | ॅ |
| ″ | ۲ | ۲۲ پہلا لفظ | ॅ ओ | ॅ ऑ : |
| ۹ | ۰ | ″ آخری لفظ | ॅ आ | ॅ ऑ |
| ۰ | ۰ | ۲۵۔ پہلا لفظ | ा : ॅ | ा : ॅ |
| ۰ | ″ | ″ آخری لفظ | ा : ॅ | ा : ॅ |
| ۹ | ۲ | ۱۸ | किला | किला |
| ۱۰ | ۱ | ۲۶ | ाऊ | आऊ |
| ″ | ۲ | ۱۴ | جوڑاں مصوتے | ۲۰ جوڑاں مصوتے |
| ۱۱ | ۲ | ۱۸ | مالی | حالی |

# چبھن

مراٹھی کے مشہور جدید شاعر شری وی۔ ایم۔ کلکرنی کی ایک نظم "گھر ٹیاسس"
(آشیانے سے) کا آزاد ترجمہ، ان کی پُرخلوص اجازت کے ساتھ۔ (خاور)

تیری چھاؤں میں پل کر
میں نے زندگی پائی

اس جہاں کے نظارے
منتبر ہوئے جس سے
تجھ سے میری آنکھوں نے
ایسی روشنی پائی!
تیری گود ہی تک تھی
میری چہچہاہٹ بھی
دل نواز سی کتنی
زندگی کی آہٹ بھی!

کتنی آندھیاں اٹھیں
کتنے زلزلے آئے
تیری گود میں، لیکن
تھا کہاں خطر کوئی؟
ہر کڑی مصیبت میں
میرے سر پہ لہرائے
تیرے پیار کے سائے
میں تیری حفاظت میں
کتنا مُسکراتا تھا
کھل کے چہچہاتا تھا
خوب گیت گاتا تھا

پَر نکلتے ہی، لیکن
اب مری نگاہوں کے
سامنے، اڑانیں ہیں
آسماں کی وسعت ہے
اور کھلی فضائیں ہیں
بیکراں خلائیں ہیں

تیری گود کے وہ دن
اب ہیں، خواب کی باتیں
آج دل کی قسمت ہیں
اضطراب کی باتیں

تیرے نرم پنکھوں کی
وہ حسیں محبّت بھی،
تیری تیز آنکھوں میں
مامتا کی شدّت بھی،
اب کہاں سے پاؤں گا!

اپنی چونچ میں دانے
دُور دُور سے لاکر
کون اب بھرائے گا؟
میری بھوک کا، اتنا
دھیان کس کو آئے گا؟

یہ بجا کہ، اب مجھکو
اپنے پختہ پنکھوں کو
اٹھکے پھڑپھڑانا ہے
آسماں پہ جانا ہے
میرے دل میں اب روشن
عزم کے دیئے بھی ہیں

مرحلے، فضاؤں کے
وا، مرے لئے بھی ہیں
اب مرے مقدّر میں
گرمیٔ سفر بھی ہے
زورِ بال و پر بھی ہے

میں بھی اڑکے جاؤں گا
گیت فتح کے اپنی
رفعتوں پہ گاؤں گا
پھر بھی اک "چبھن" میرے
دل کو گدگدائے گی
جبکہ آشیاں کے، وہ
دلکش و حسیں لمحے
نقش ہیں جو اس دل پر
یادگار ہیں، تیری
بیکراں محبّت کے
مامتا کی شدّت کے
— پھر کہاں سے لاؤں گا!

# چند گراں مایہ خطوط

(بنام حضرت نفیس)

اردو میں مکتوباتی ادب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کاتب و مکتوب الیہ کی نفسیات، ان کی شخصیت کے خدوخال، ان کے افکار و امیال اور ان کی زندگی کے اصلی روپ پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا۔ A man's soul lies naked in his letters ' ایک آدمی کی روح اس کے خطوط میں عریاں نظر آتی ہے' اس تجزیہ و تحلیل کے دور میں ادب اور ادیب کے درمیان ایک مربوط و منظم رابطہ قائم کیا جا رہا ہے اور ان کو ایک نئے زاویہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس حیثیت سے خطوط اس باب میں اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اردو کے مکتوباتی ادب اس کی روایات اور تاریخی ارتقاء پر مشاہیر ادبا نے بڑی جانچ و مانچ آرا کا اظہار کیا ہے اور اس کو نئے تقاضوں اور نئے ادبی شعور سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور حدیہ ہے ع

یہ بیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو باز نم نہ داشت

والا معاملہ ہے۔ ذیل میں جن غیر مطبوعہ خطوط کا تعارف کرایا جا رہا ہے وہ میرے والد مرحوم حضرت نفیس بنگلوری سے متعلق ہیں۔

حضرت نفیس اگرچہ اپنے علم و فضل اور اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں کے باوجود وہ شہرتِ عام حاصل نہ کر سکے جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اب ان اسباب و علل اور تاریخ پر غور کریں تو عجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر ملک میں تقریباً صاحبانِ فن و کمال کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ ایسی صورت میں حضرت نفیس کی ذات اس کلیہ سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتی تھی؟ یہ خوش قسمتی ہے کہ بعض صاحبانِ علم و ادب نے حضرت نفیس کو نہ صرف اردو کا ایک مایۂ ناز شاعر سمجھا بلکہ ایک محقق و فن کی حیثیت سے آپ کا لوہا تسلیم کیا۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ فنی معلومات اور وسعتِ مطالعہ کے اعتبار سے والد مرحوم زبان و ادب کے تمام پہلوؤں پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔

یوں تو حضرت نفیس کو فصاحتِ جنگ جلیل مانچوری سے شرفِ تلمذ حاصل تھا لیکن ان کے فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی اور وجدان و شعور کے تجسس و تفحص نے بیگانہ چنگیزی، عزیز لکھنوی، آرزو لکھنوی، اہل بارہ بنکوی، اثر لکھنوی، عزیز یار جنگ، نوح ناروی، احسن مارہروی اور ناطق گلاوٹھوی وغیرہم سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ موصوف نے ان مشاہیر سے خوب استفادہ اور اکتسابِ علم و فن کیا۔ حضرت نفیس کی تصنیفات اور اکتشافاتِ علمی میں آپ کا ایک "مجموعۂ کلام" ہے جس میں رندانہ کیفیت اور بے پناہ سرمستی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ فنِ عروض پر ایک رسالہ "میزانِ سخن" "مزہ دکا رقیم" "اصطلاحاتِ جلیل" "تشریحاتِ ناطق" (گلاوٹھوی) اور ادبی خطوط و انشائیے بڑی اہمیت و افادیت کے حامل ہیں۔ بہرحال بقول جناب ہادی رفعت مدیر "آثار"۔

"جنوبی ہند کے لئے حضرت نفیس کی ذات منتخات کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ نہ صرف ایک بہترین شاعر اور

خوش ذہن تھے بلکہ فنی معلومات اور وسعتِ مطالعہ کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ دوستوں میں ایک بہترین دوست، شاعروں میں ایک بہترین شاعر، شاگردوں میں ایک بےمثل استاد بن کر آپ نے ایک مثال قائم کر دی ایسی ایک باشعور شخصیت کا انتقال کر جانا قوم کے لئے ایک نقصانِ عظیم سے کم نہیں۔"

آخر روشنی کا یہ مینار جس نے اپنی ضیا پاشیوں سے ملک کی ممتاز و بلند پایہ شخصیتوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا ۱۹۵۱ء میں بجھ گیا، زمانہ کی قدرناشناسی و بے اعتنائی نے اس نامی و گرامی شاعر اور محقق فن کو قبرِ گمنامی میں ڈال دیا۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چوں مسیح
باز بس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

آپ کے ادبی سرمایہ سے مشاہیر کے کچھ خطوط ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

(۱)

خط بسلسلہ اہتمام حضرت عزیز لکھنوی

لکھنؤ اشرف آباد عزیز منزل

۲۱ مارچ ۱۹۳۳ء

مکرمی! السلام علیکم

محبت نامہ پہونچا، آپ کے حسنِ ظن کا منت پذیر ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے کہ بے حد عدیم الفرصت رہتا ہوں۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے برکرت ایسے خطوط آتے رہتے ہیں اگر میں ایسی خدمت کو انجام دیتا رہوں تو شاید اپنا کوئی کام نہیں کر سکتا، مجبوراً میں نے وقت کا معاوضہ مقرر کیا۔ آپ شاید اس کو بداخلاقی پر محمول کریں مگر میں اس طرزِ عمل پر مجبور تھا۔ تفصیل کبھی پھر تحریر کروں گا۔ آپ سے میری یہ خواہش نہیں کیونکہ آپ کا کلام نہایت پاکیزہ ہوتا ہے اور یہ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ ایسے مقامات پر بھی ایسے ایسے لوگ موجود ہیں۔ آپ کی غزلیں فرصت کے وقت دیکھ کر بھیج دوں گا۔

مرزا رسوا صاحب کا پتہ عثمانیہ یونیورسٹی دارالترجمہ حیدرآباد ہے۔ ریاض صاحب کا پتہ خیرآباد ہے۔ مگر آج کل.... لکھنؤ میں ہیں۔

مخلص

عزیز

(۲)

خط مرزا لیگانہ چنگیزی لکھنوی

والد مرحوم نے ماہنامہ جہانستان دہلی بابت مارچ ۱۹۴۲ء میں مرزا لیگانہ[1] چنگیزی کی ایک غزل دیکھی۔ والد صاحب کو اس غزل کی بحر کے متعلق کچھ شبہ سا ہو گیا اور اس باب میں لیگانہ مرحوم سے اختلاف رائے کیا جس کے جواب میں مرزا صاحب نے یہ مکتوب تحریر فرمایا:

۱۹ ستمبر ۱۹۴۲ء

بندہ نواز! تسلیم

..... جب مطلع اعلان لوگ میدان میں آ کر شہر کا حق حاصل کر لیں تو پھر علم عروض کو جانچنے اور اس کے ضوابط کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہی اب موزوں و ناموزوں کی بحث بے کار ہے۔

البتہ میں نے اب تک اس فن کا لحاظ رکھا ہے مگر بحرِ متقارب و متدارک کے بعض زحافات کے خلط باہمی کو میں نے جائز سمجھ لیا ہے زیادہ کیا عرض کروں اور آپ ڈھونڈیں گے تو اگلے اساتذہ کے ہاں بھی عروض کے بعض اصول کی خلاف ورزی کا ثبوت مل جائے گا۔

ایک وہ ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر بعض زحافات کے خلط باہمی کو جائز قرار دے لیتے ہیں اور ایک وہ ہوتے ہیں جو بے سمجھے بوجھے ایک وزن سے دوسرے وزن میں بہک جاتے ہیں ان دونوں میں فرق ہے

مخلص

میرزا لیگانہ چنگیزی لکھنوی

سب رجسٹرار بادیگر دکن

---

[1] لیگانہ مرحوم نے دورِ حاضر کے چند شعراء کے نام لکھے ہیں جن کا تذکرہ میں مناسب نہیں سمجھتا۔

(۳)

## خط حضرت آرزو لکھنوی

۲۷- فروری ۱۹۴۴ء

حبیب دل نواز!

سلام مسنون پہونچے۔ کارڈ ملا۔ شعر کے متعلق اطلاع دہی کا شکریہ۔ تمام سخن میری نظر سے نہیں گزرا۔ انشاء اللہ نشانِ آرزو کی آئندہ اشاعت میں یہ مطلع نکال دیا جائے گا

میزان الحروف کے نہ پہونچنے کا تعجب ہے آج ارسال ہے کل انشاء اللہ اس کی کاپی سپیل کی جائے گی۔ آج کل علالت کا سلسلہ جاری ہے۔ ملازمت کے فرائض انجام دینا ہی پڑتے ہیں۔ لہذا بقیہ امور کی طرف توجہ کرنے کا موقع ذرا کم ملتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنی خیریت اور حالات سے مطلع کرتے رہیں گے۔ ازحد پر آرزو تسلیم و نیاز

خیر طلب

آرزو لکھنوی

(۴)

## خط فصاحت جنگ جلیل مانکپوری

از حیدر آباد دکن

دل نواز!

سلام مسنون، مدت کے بعد آپ کا نوازش نامہ آیا۔ سطر سطر سے آنکھیں روشن ہوئیں اور دل مسرور ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشی رکھے۔

اندوہ کے عروض پر جو حاشیہ آپ نے لکھا ہے اس کا نمونہ میں نے دیکھا۔ مناسب ہے بہتر ہے۔ دوسرا رسالہ عروض جو آپ نے مرتب کیا ہے اس کا نمونہ بھی بھیجئے تو میں دیکھ کر رائے قائم کر سکوں ولادتِ فرخندہ جند مبارک ہو

انشاء اللہ تاریخ نکال کر بھیجوں گا۔ نام آپ نے سلیم احمد رکھا ہے۔ اگرچہ یہ میرے ایک فرزند کا نام ہے مگر خیر جو آپ کی رائے ہو۔ حضرت اختر میانوی سلام کہتے ہیں اور سب اطفال خوش خصالی تسلیم گزار ہیں۔ علی سلمہ اپنی غزلیں بھیجیں گے۔

والسلام

فصاحت جنگ جلیل کان اللہ لہ

(۵)

## خط نواب عزیز یار جنگ

عزیز منزل

۲۶ ستمبر ۴۰ ۱۳ھ

مکرمی!

آپ کا خط ملا، اس مصرع میں (دل مرا جان مری داغ سویدا اپنا) "اپنا" اور "میرا" کا اجتماع شتر گربہ ہے۔

گریباں اپنا جامہ گی کا دامن کوہ صحرا کا

سطر دست جنوں سے سب یہ پرزے ہونے والے ہیں (اختر میانوی)

عجب کچھ عالم وحشت میں حالت ہو گئی اپنی

کہ روتا ہوں تو روتا ہوں جو ہنستا ہوں تو ہنستا ہوں (ساکھنوی)

ان میں 'اپنا' اور 'اپنی' کا لفظ 'خود و خویش' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

کوئے جاناں میں صدا ہے اپنی کہیں میرا دل شیدائی ہے

جلیل (فصاحت جنگ)

اس شعر میں 'اپنی' کا لفظ خاص 'ذاتی' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

میں خوف سے عصیاں کے جیتا ہوں نہ مرتا ہوں

ہے مجھ پہ عیاں حال اندوہ ربا اپنا (اختر لکھنوی)

یہاں 'اپنا' بمعنی 'میرا' آیا ہے۔

ان اشعار سے شتر گربہ کا کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ والسلام

عزیز یار جنگ

---

لہ دیوان فصاحت جنگ جلیل مانک پوری

ہ حضرت جلیل مرحوم کے "رسالہ عروض" پر والد مرحوم نے حواشی لکھے تھے جس میں اسی کی جانب اشارہ ہے۔

سے خود والد مرحوم نے عروض پر ایک کتاب "میزان سخن" بھی مرتب کی ہے۔

(۶)

سری نگر کشمیر  خط حضرت اثر لکھنوی

۱۸-جولائی ۱۹۴۱ء

مکرمی! تسلیم

خط کا شکریہ، مگر افسوس ہے کہ کہیں گم ہوگیا اور تلاش کے باوجود نہیں ملا۔ اگر زحمت نہ ہو تو امورِ استفسار طلب دوبارہ تحریر فرمائیے

کسی خط میں آپ نے لکھا تھا کہ عروض پر آپ نے ایک کتاب تصنیف کی ہے اس کا اشتیاق ہے۔ جہاں سے طبع ہو وہاں حکم دے دیجئے کہ ایک جلد میرے نام وی۔ پی کر دی جائے۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

نیازمند

اثر

(۷)

خط مولانا ناطق گلاوٹھوی

جونا جیل روڈ۔ ناگپور سٹی

مورخہ ۱۲-مئی ۱۹۴۲ء

مولوی صاحب! السلام علیکم

مزاج شریف۔ آپ کے خط کا جواب اور قطعہ دیکھ کر اپریل کے دوسرے ہفتہ میں اور کتابی سوالات موختر جوابات ۲۴-اپریل کو روانہ کر چکا ہوں جس کے لئے پوسٹنگ سرٹی فکیٹ بھی لے لیا گیا تھا امید ہے کہ دونوں آپ کو مل گئے ہوں گے مگر ہنوز رسید کا خط نہیں آیا جس سے کتاب کے متعلق کوئی تشویش ہے کہ اگر نہ ملی ہوگی تو میری کئی روز کی محنت برباد ہوگئی۔ میں نے معنوی اصلاحات کے متعلق آپ کو جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ مولانا آسی سے اس پارہ میں خط و کتابت کیجئے اور ان کا پتہ بھی لکھ دیا تھا۔ اب یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ مولانا نفیس بنگلوری کا کوئی خط آئے تو انھیں ضرور جواب دیجئے اور انھوں نے قبول بھی کر لیا ہے۔ دوسری یہ بات ہیں آپ کو لکھنا بھول گیا تھا کہ گذشتہ سال جگر مرادآبادی کے خود کردہ انتخاب کے اول پچاس اشعار پر جو "نگار" میں جنوری نمبر میں شائع ہوئے تھے "اخبار" کاماں، بمبئی میں مسلسل اعتراض کئے گئے تھے جن میں لفظی و معنوی دونوں اغلاط ہر شعر کے ذیل میں جدا جدا بتائے گئے ہیں۔ یہ فائل مولانا[2] شاکر کے پاس بھی موجود ہے اگر آپ ان سے حاصل کر کے نقل کر سکیں تو فبہا ورنہ مجھے لکھئے میں بھیج دوں گا ان اعتراضات کو سارے ملک نے مانا ہے۔ بہرحال جواب بواپسی دیجئے کہ کتاب کی رسید کے متعلق اطمینان ہو۔

والسلام

ناچیز

ناطق

---

[1] شارح دیوانِ غالب

[2] استاذی علامہ شاکر ناطقی پروفیسر جامعہ دارالسلام عمرآباد

مظفر حنفی سہسوی

# غزل

مرا رفیق بروزِ ازل رہا ہے چاند
سمٹ رہی ہے سیاہی نکل رہا ہے چاند

تھمی ہوئی ہے شبِ انتظار آؤ بھی
کہ اضطراب میں کروٹ بدل رہا ہے چاند

نگاہِ ناز یقیناً ادھر اُٹھی ہوگی
بہت قریبِ رگِ جاں مچل رہا ہے چاند

تمہاری آنکھ میں آنسو مری تباہی پر
کہ سرد آہ میں اپنی پگھل رہا ہے چاند

شبِ وصال کو زلفیں بکھیر لینے دو
ابھی قریب نہ آؤ کہ جل رہا ہے چاند

فلک پہ آج اندھیرے کمند پھینکیں گے
غریبِ شہر کے ہمراہ چل رہا ہے چاند!

نیا سوال اٹھایا ہے رات والوں نے
سحر کی بات نہ چھیڑو کہ ڈھل رہا ہے چاند

ترے خیال سے پھر درد کی لہر ابھری
کچھ اس ادا سے کہ دل پر پھسل رہا ہے چاند

شبِ فراق مظفر بڑی بھیانک ہے
حبیب ابر کا ٹکڑا نگل رہا ہے چاند

# نئی کتابیں

## غالب

از خورشید الاسلام - پبلشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ - تقطیع ۸½×۲۲ - صفحات ۲۸۴ - کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ - قیمت چھ روپے -

اس کتاب کا موضوع غالب کا ابتدائی دور ہے - مصنف نے بڑی کاوش سے غالب کے ابتدائی کلام پر اس کے پیشروؤں کے اثر کو ثابت کیا ہے - وہ پیشرو ہیں شوکت، اسیر، بیدل، غنی، ناصر علی، ثاقب اور ناسخ - ان حضرات کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے - اس کے بعد غالب کے آزاد کا ذہنی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے - غالب پر اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کتاب کا انداز تحقیق اس سے الگ ہے اور یقیناً یہ کتاب غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے - محض انتباہی نہیں بلکہ اس کے مطالعے سے اردو شاعری کو سمجھنے کا ایک نیا انداز ہاتھ آئے گا -

## گلِ رعنا

رعنا جمّی کی رباعیوں اور قطعات کا مجموعہ - ناشر مکتبۂ برہان اردو بازار دہلی - تقطیع ۸½×۲۲، صفحات ۲۳۲، کتاب صوری اور معنوی حسن کی حامل ہے - قیمت تین روپے آٹھ آنے -

رعنا کلاسیکل انداز کے شاعر ہیں لیکن سادگی کے ساتھ نئے نقاضوں کا ذکر کرتے ہیں - ان کا انداز بیان بہت سُلجھا ہوا ہے رُباعی جیسی صنف میں انھوں نے پُرکاری کا ثبوت دیا ہے - قطعات بھی خوب ہیں :-

نغمات سے تنویر نکل آتی ہے — زہراب سے اکسیر نکل آتی ہے
تخریب کے پڑ سے ہی سے اکثر رعنا — اک صورتِ تعمیر نکل آتی ہے

ان کا کلام اور انداز زندگی ظاہری نمائش سے آلودہ نہیں اور انھیں اپنے جوہر کا صحیح احساس ہے -

کب ذات صفت سے معتبر ہوتی ہے — مرہونِ ہنر قدرِ ہنر ہوتی ہے
ہوتا نہیں خورشید سحر کا محتاج — خورشید کی محتاج سحر ہوتی ہے

## ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصّہ

مؤلفہ ڈاکٹر سیّدہ جعفر - ناشر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد - تقطیع ۸½×۲۲ - صفحات ۲۱۴ قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے - کتاب ٹائپ میں چھپی ہے -

ماسٹر رام چندر ان منتخب ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے پہلے پہل اردو مضمون نگاری کی بنیاد رکھی - مولوی ذکاءاللہ اور نذیر احمد ایسے اردو کے مشہور مصنف آپ کے شاگردوں میں سے ہیں - یہ علوم سائنس اور ریاضی کے ماہر تھے - انھوں نے سماجی اصلاح اور تدریجِ زبان کے لئے رسالے جاری کئے، مضامین لکھے اور تصنیفاتِ کمیڑہ سے اردو کا دامن مالا مال کیا - کتاب میں ان کے دلچسپ حالاتِ زندگی اور ان کے مضامین درج ہیں - حالاتِ زندگی میں مزید واقفیت بہم پہنچائے جانے کی گنجائش ہے - ان کے خودنوشت سوانح حیات سے غالباً فائدہ نہیں اُٹھایا گیا -

## جذباتِ نادر

نادر کاکوروی کے کلام کو اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے از سرِ نو بڑے اہتمام سے ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ممتاز حسن صاحب کا فاضلانہ مقدمہ ہے اور وہی اس کے مرتب بھی ہیں۔ دردؔ کاکوروی نے 'محفوظ کلام نادر' کے مادے سے حتی تاریخ گوئی ادا کیا ہے۔ نادر نے انگریزی نظموں کے بہت ہی خوشی آیند اور سلیس ترجمے کئے تھے۔ وہ اور ان کا دیگر کلام اس کتاب میں شامل ہے۔ اس جواں مرگ شاعر کو اگر مزید مہلتِ زندگی ملتی تو اردو ادب کو اور بہت کچھ ملتا۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۳۵۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ بہت خوب صورت چھپی ہے اور دیدہ زیب جلد پوش اور مضبوط جلد کی حامل ہے۔ قیمت دس روپے۔

## اقبال اور اس کا عہد

مصنف جگن ناتھ آزاد۔ ناشر ادارۂ ادبیاتِ اردو الہ آباد۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ یہ کتاب جگن ناتھ آزاد کے تین مقالات پر مشتمل ہے یہ مقالات 'شعرِ اقبال کا ہندوستانی پس منظر' 'اقبال کے کلام کا متصوفانہ لب و لہجہ' اور 'اقبال اور اس کا عہد' جموں و کشمیر یونی ورسٹی سری نگر کی فرمائش پر لکھے گئے تھے۔ آزاد نے اقبال کا مطالعہ بڑے غور و فکر سے کیا ہے اور یہ مقالات 'اقبالیات' کے من میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

## داستانِ زبانِ اردو

مصنف ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ ناشر اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ قیمت پانچ روپے۔ کتاب حسین جلد کی حامل ہے۔ کتابت و طباعت اوسط، فخامت ۲۱۶ صفحات، تقطیع ۸½×۲۲

تاریخ اردو اور لسانیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب بڑی مفید ہے۔ فہرست مطالب سے کتاب کے موضوع پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ وہ یہ ہے:۔ اردو، لسانی سرمایہ، مختلف نظریے، اردو اور پنجابی، مولد و منشا، اخذ و استفادہ، صرفی نحوی نشو و نما، خراج و منہاج، ارتقائی مدارج، اردو کے قدیم۔

## تنکے

خوان چند نسیم کے کلام کا مجموعہ۔ اس کتاب میں کچھ غزلیں ہیں اور کچھ نظمیں نسیم صاحب بڑے خوش گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں پختگی ہے۔ اندازِ بیان پرانا لیکن اندازِ فکر پرانا نہیں ہمیں امید ہے یہ مختصر مجموعہ مقبول ہوگا۔

## تنقیدی زاویے

از ڈاکٹر عزیز احمد۔ پبلشرز:۔ شاہین بک سٹال سری نگر کشمیر۔ سلسلۂ تنقید کی یہ کتاب اوّل ہے۔ قیمت چار روپے پچھتر نئے پیسے۔ فخامت ۳۰۰ صفحات، کتابت، طباعت اوسط۔

مصنف نے اردو میں تنقید کی ایک مستند اور مستقل تصنیف کا ارادہ کیا ہے۔ یہ ارادہ مستحسن ہے۔ اس جلد میں شاعری پر بحث ہے۔ دوسری زبانوں یا خصوص یورپی زبانوں میں جو معیارِ تنقید ہے اس کو پیشِ نظر رکھا ہے اور تنقید کو ایک فن کی حیثیت سے پرکھا ہے۔ فلسفۂ تنقید کو مختلف موضوعات میں تقسیم کیا ہے جو شاید ایک عام قاری کی سمجھ میں نہ آئیں۔

## امراضِ شکم

ڈاکٹر چمن لال پرنگ کی تصنیف ہے۔ موضوع کتاب نام سے ظاہر ہے۔ فخامت ۲۳۲ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰½، قیمت پانچ روپے جو کتاب کی ضخامت کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ انگریزی کی عبارتیں اگر ٹائپ میں کمپوز کر کے شائع کی جاتیں تو بہتر ہوتا۔ موضوع کے اعتبار سے کتاب ہر شخص کی طبی رہنمائی کر سکتی ہے۔

## رگِ جاں

خورشید الاسلام کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ تقطیع ۲۰×۳۰½، فخامت ۱۱۲ صفحات۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ جلد اور جلد پوش عمدہ۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔

خورشید الاسلام تنقید میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے فکر کا نیا اسلوب اور بیان کا نیا انداز ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔

کوئی فریب تراشو کوئی چراغ جلاؤ
یہ ایک رات کسی طور سے بسر کر جاؤ

زندگی کے ساتھ مصالحت کی تلقین ہے۔ اسی مصالحت کا نام رجائیت ہے، ان کی نظموں میں ارتقاء ایک تاثر، اور تجربہ

بہت پسندیدہ نظمیں ہیں۔ غزلوں میں وہ ربودگی اور بے ساختگی تو نہیں جو نظموں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن گہرے فکر اور خلوص کے آثار ہر جگہ ملتے ہیں۔

## نغمۂ حرم

(ہندی حروف میں) اردو کی ۱۰۴ شاعرات کے حالاتِ زندگی اور کلام۔ از ابودھیا پرساد گپتا۔ ناشر بھارتیہ گیان پیٹھ، کاشی تقطیع ۲۰×۳۰، صفحات ۲۷۲۔ قیمت چار روپے۔ کتاب بہت حسین و جمیل شائع ہوئی ہے اور مرتب کی محنت قابلِ داد ہے۔

(ع۔م)

## حیواتی زندگی کی دل چسپ باتیں

مؤلف ڈاکٹر ایس۔ این حسن، محشر عابدی۔ ناشر تلنگو اردو اکاڈمی برائے سائنس و تاریخ حیدرآباد دکن۔ قیمت بارہ روپے مجلد مع گرد پوش۔ صفحات ۲۰۸

اردو میں سنجیدہ موضوعات خصوصاً سائنسی موضوعات پر کتابیں بہت کم ہیں اور لکھی بھی کم جاتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب صرف اس لحاظ سے قابلِ قدر نہیں ہے کہ یہ حیواتی زندگی سے متعلق ہے بلکہ اس لئے بھی کہ جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ بڑے دل چسپ اور عام فہم انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ پسند خور مکڑی، اودبلاؤ، شہد کی مکھی، چمپانزی گوریلا و ہیل اور اسی طرح چھوٹے بڑے حیوانوں کی ۲۴ تصویریں بھی درج ہیں جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ مختلف عنوانات قائم کر کے حیوانوں کی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے جیسے حیوانوں کے جذبات، ان کی ذہانت، ان کی ماتا وغیرہ سے متعلق بڑی دل چسپ اور معلومات افزا باتیں رقم کی گئی ہیں اور اس کے لئے ڈاکٹر محشر عابدی یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں۔

دوسری قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور بہت اچھی چھپی ہے۔

## کیف و عرفاں

مصنف یوسف اجمیری، مرتب وفا راشدی۔ حمد و نعت اور منقبت کا مجموعہ۔ ناشر مکتبۂ اشاعتِ اردو کوڑی حیدرآباد (پاکستان) قیمت ۷۵ پیسے۔ ضخامت ۶۲ صفحات۔

## دینِ حق

مصنف پروفیسر سید نواب علی۔ ناشر عثمانیہ بک ڈپو، نمبر ۱۰۴ اورچیٹ پورروڈ، کلکتہ ۱۔ قیمت ایک روپیہ۔ صفحات ۸۸۔ جلد مع گرد پوش۔ طباعت اور کتابت اچھی ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کتاب مذہب اسلام سے متعلق ہے۔ پانچ ابواب اسلام، قصصِ قرآن، انبیائے کرام، حضرت خاتم النبیین اور تکمیلِ دین پر مشتمل ہے۔

## مناجاتِ مقبول

مولانا اشرف علی تھانوی نے قرآنی اور حدیثی دعاؤں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان دعاؤں کو ترجمہ اور شرح کے ساتھ شائع کرایا ہے۔ یہ کتاب بھی عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ نے شائع کی ہے۔ قیمت دو روپے مجلد مع گرد پوش کتابت و چھپائی اچھی ہے۔

## شہرِ دل

محسن زیدی کی غزلوں کا مجموعہ۔ ناشر مرکزِ ادب ۵۹۷۱ نیا محلہ پل شنگی دہلی ۶۔ قیمت دو روپے۔ صفحات ۱۳۶، مجلد مع گرد پوش۔ کتابت و چھپائی اچھی ہے

محسن زیدی نوجوان شاعر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں بڑی پختگی ہے اور کلام فنی استقام سے پاک ہے۔ پیش لفظ میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں:۔ "محسن زیدی کے لہجے میں ایک دھیما پن، ہلکی ہلکی آنچ سے گرمی پیدا کرنے والی ایک کیفیت ہے جو اُن کے گداز دل سے آشنا کرتی ہے۔ یہاں جذبات کی کارفرمائی کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ سطح پر موجوں کی رفتار بہت تیز نہیں معلوم ہوتی لیکن سطح کے نیچے اچھا خاصا ہیجان نظر آتا ہے ..... انھوں نے کنایوں سے بہت کام لیا ہے ..... رجائیت اور تشریح کے بجائے اشاریت نے پیچیدگی سے کچھ کہہ کر اثر پیدا کر لینے میں بڑی مدد دی ہے۔"

محسن زیدی کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اس رائے سے

پورا پورا اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ اس جواں سال شاعر سے ہمیں بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ امید ہے اہلِ ذوق اس مجموعے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

مشورہ بک ڈپو نام نگر، پوسٹ بکس ۱۶۳۹ دہلی ۶ نے اردو میں پاکٹ بک کا بڑا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی تمام کتابیں اچھی لکھائی چھپائی اور گٹ اپ کی حامل ہیں۔ اس کے باوصف قیمت فی کتاب صرف ایک روپیہ ہے یعنی یہ کہ یہ سلسلہ ضرور مقبول ہوگا اور اس طرح ناشران کی ہمت افزائی ہوگی کہ وہ اعلیٰ اور معیاری کتابیں زیادہ تعداد میں شائع کریں۔

اس سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابیں موصول ہوئی ہیں:-

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱- | کلیوں کا مزار | (ناول) | شاکر پونچھی |
| ۲- | زخم | (ناول) | الیاس احمد گدی |
| ۳- | بوند اور سمندر | (ناول) | کرشن گوپال عابد |
| ۴- | بچھڑ گئے پنچھی | (ناول) | نعمی صدیقی |
| ۵- | وی | (ناول) | اکرم الہ آبادی |
| ۶- | چغد | (افسانے) | سعادت حسن منٹو |
| ۷- | تیری صورت میری آنکھیں | (ناول) | ہمدم ناتھ |
| ۸- | چاندنی | (ناول) | عادل رشید |
| ۹- | دیوان درد | | خواجہ میر درد کا دیوان |
| ۱۰- | رباعیات عمر خیام حصہ سوئم | | مترجم پروفیسر واقف |

تمام کتابیں مندرجہ بالا پتے سے طلب کی جاسکتی ہیں۔

(ش۔ح)

## موصولات

**مراۃ الغالب** دیوانِ غالب کی شرح از بیخود دہلوی (نیا ایڈیشن) ناشر عثمانیہ بک ڈپو نمبر ۴-۱۰- لوئر جیبت پور روڈ کلکتہ۔ قیمت پانچ روپے۔

**اُوپر، نیچے اور درمیان** (نیا ایڈیشن) سعادت حسن منٹو کے مضامین کا مجموعہ۔ ناشر عثمانیہ بک ڈپو نمبر ۴-۱۰- لوئر جیبت پور روڈ کلکتہ۔ قیمت چار روپے

**سایۂ گل** آنچ۔ شوکت تھانوی کا ناول۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ:۔ عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ۔

**میری ماں** (تاثرات) سلطان احمد۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے۔ صفحات ۴۲۔ مجلد۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر اتحاد پٹنہ ۴

**چین کے مسلمان** چین میں مسلمانوں کے مصائب کی داستان ناشر نیشنل اکاڈمی ۹- انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی۔ قیمت ۲۵ نئے پیسے۔

**انتظام کتب خانہ**۔ کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم اور کتابوں کی تقسیم سے متعلق معلومات کا مجموعہ۔ مصنف شیخ محبوب قریشی ناشر محبوبیہ کارخانہ جلد سازی، حیدرآباد کالونی ۱۴، کراچی ۵۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

**ستاروں کی سیر اور خرگوش کا سپنا**۔ بچوں کے لئے کرشن چندر کے لکھے ہوئے ناول۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی قیمت دو روپے ۷۵ نئے پیسے۔

**آغازِ سحر**۔ بہار کے نوجوان اور خوش فکر شاعر ناوم بلخی کے کلام کا مجموعہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نیشنل بک سنٹر ڈالٹن گنج۔ پلاموں (بہار) قیمت دو روپے ۲۵ نئے پیسے۔

**ذکرِ غم**۔ فنی تاریخ گوئی اور حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کا اجمالی تذکرہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ اردو ۲/۱۵ جی سنٹرل جیکب لائن کراچی۔ قیمت ۷۵ نئے پیسے

**نغمۂ دل**۔ رونق جونپوری کا مجموعۂ کلام۔ ملنے کا پتہ:۔ رونق جونپوری مقابل سنڈھی اسکول، چھورا لی گلی، کھائی روڈ حیدرآباد۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

**آغوشِ گل**۔ اس مجموعے میں ایسے شعراء کا کلام شامل ہے جو شملہ کے رہنے والے ہیں یا طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ مرتب۔ را جندر ناتھ رہبر۔ ناشر بزمِ ادب شملہ۔ ملنے کا پتہ:۔ انڈین بک ڈپو۔ دی مال شملہ ۱

**نیرنگِ نظر** روی علی اصغر صاحب کا مجموعۂ کلام قیمت ۲ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دیکا بی دلا۔ حمایت نگر، حیدرآباد (اے۔ پی)

# پلان سے کیا ہوگا



ہر ایک کے لئے
آمدنی میں ۵۵ روپے کا اضافہ



کافی خوراک



لگ بھگ دو گز اور کپڑا



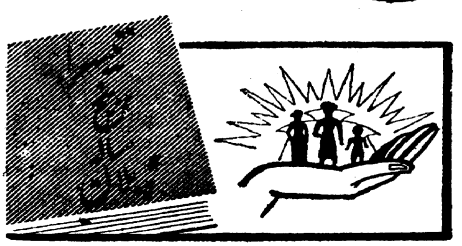
مفت اور لازمی پرائمری تعلیم



زیادہ ہسپتال، دواخانے



دیہات میں پینے کا صاف پانی
اور
۱۴۰ لاکھ نئی نوکریاں



پلان کو محنت، لگن اور ہمت سے
کامیاب بنایئے

## ہر شخص کے لئے اچھی زندگی

۵۸-۵۱/۱۰۹۵



# خوشی کی تقریب
# کو
# اَور خوشگوار بنایئے

نیک خواہشات بھیجنی ہوں یا مُبارک باد کے پیغام ــــ تہنیتی تار (گرٹینگز ٹیلی گرام) سے بھیجیے۔

مُبارک باد کے تار باتصویر فارم پر اور دل کش و خوب صورت لفافے میں پہنچائے جاتے ہیں۔

مختلف ذاتی اور سماجی تقریبات کے لیے بہت سے موزوں جملوں کی ایک فہرست موجود ہے۔ اس میں سے آپ اپنی پسند کا جملہ منتخب کر سکتے ہیں۔

مُبارک باد کے عام تار کی کم سے کم فیس ۵۰ نئے پیسے ہے۔ ہر اضافی لفظ کے لئے، نئے پیسے مزید ادا کرنے پڑتے ہیں۔

## مُبارک باد گرٹینگز یا ڈی لکس تار سے بھیجیے

### ڈی لکس سروس

اگر آپ اپنے تار میں زیادہ اثر اور خوبصورتی پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں تو ڈی لکس سروس سے استفادہ کیجیے تار میں آپ جو چاہیں سوچیں مگر ہدایت کے خاص کالم میں لفظ ڈی لکس ضرور لکھیے۔ آپ کا پیغام ایک خاص تہنیتی فارم پر پہنچایا جائے گا۔ اس کے لئے تار کی عام فیس کے علاوہ آپ کو صرف ۱۲ نئے پیسے ادا کرنے ہوں گے۔

محکمۂ ڈاک و تار

# باہر کے مُلکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹۔ اسٹریٹ نمبر ۳۴۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲۔ رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۱۵۱۳۔ بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا۔ ۱۳۱ گرینج روڈ، سنگاپور

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی**

# آج کل کے خریداران نوٹ فرمائیں

ہندوستان میں 'آج کل' کے خریداروں سے درخواست ہے کہ وہ چندہ ختم ہونے سے پہلے ہی آئندہ سال کا چندہ بھیج دیں تاکہ رسالہ ان کے نام بدستور جاری رہے۔ خریداروں کی سہولت کے لئے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ان کا چندہ ختم ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے ہی انھیں اطلاع دے دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ایک 'بزنس ریمائنڈر کارڈ' بھی بھیجا جائے گا جس کی خانہ پُری کرکے بیرنگ ڈاک کردیں۔ اگر کوئی جواب نہ ملا تو رسالہ بھیجنا بند کر دیا جائے گا۔ آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے وی۔ پی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کے لئے ان کی طرف سے کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی ہو۔

ازراہِ کرم چندہ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

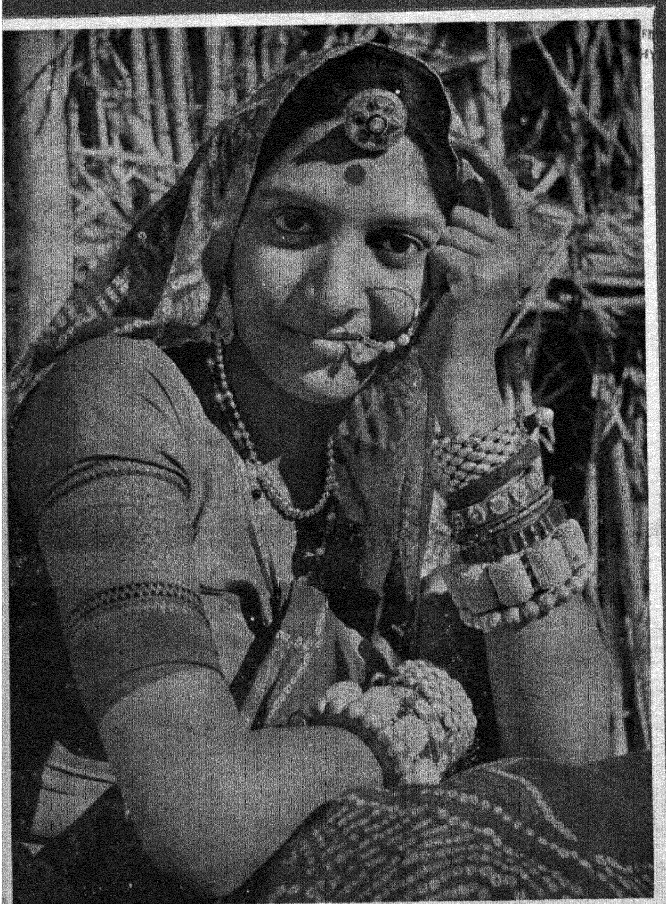
**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**

# آج کل



ماہ نامک سنہ ۲۳
فروری سنہ ۱۹۶۲ء

۴۰ نئے پیسے

# ہماری کتابیں



| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پنڈت نہرو سے بات چیت ٹیبر منڈی | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| تیسرا پنج سالہ پلان | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ۴۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ۳۵ نئے پیسے | ۱۰ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں | ۱۰ نئے پیسے | ۸ نئے پیسے |
| نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ | (فی نمبر) | (فی نمبر) |

ملنے کا پتہ

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

# آج کل دہلی

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| غزل کیا ہے؟ | فراق گورکھپوری | ۳ |
| غزل | فضا ابن فیضی | ۷ |
| مغلیہ دور میں حکومت اور سماج | تارا چند | ۸ |
| کتاب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب | قدرت نقوی | ۱۴ |
| تامل ادب میں اسلامی عناصر | حسرت سہروردی | ۲۱ |
| غالب پر پہلا اہم مضمون | محمد عتیق صدیقی | ۲۷ |
| غزل | مانی انقادری | ۳۲ |
| بچوں کی فلمیں | خواجہ احمد عباس | ۳۳ |
| غزل | ظرف قریشی | ۳۵ |
| حسرت خاں | رشید احمد | ۳۶ |
| آرنسٹ ہیمنگوے اور اُس کا فن | سلمان احمد | ۴۱ |
| غزل | قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی | ۴۴ |
| گوا کی آزادی | نامہ نویس | ۴۵ |


سرورق :- حُسنِ راجستھان

رسالے کی پشت پر :- سعیٔ ناکام


مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد مجیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | حیدرآباد |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| رحمان ملہی | سری نگر |

یو-ایس-سوپن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی-این-ایس- راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نجما نتھ (ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اُردو (سیکرٹری)
مدیرِ مسئول
اسسٹنٹ ایڈیٹر- مظفر شاہ



ماگھ شک سمت ۱۸۸۳
فروری ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ - نمبر ۷

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سنٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش طیسانی ایڈیٹر 'آج کل' (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

# ملاحظات

۱۹ - دسمبر ۱۹۶۱ء کو ہندوستانی فوجوں نے گوا کو کئی سو سال کی پرتگیزی غلامی سے آزاد کرایا۔ انگریزوں نے دانش مندی سے ہندوستان کو آزادی دی اور اپنے اقتدار کو ختم کیا۔ فرانسیسی تو آبادیوں کو بھی خود فرانس نے بدلتے ہوئے حالات کے تحت ہندوستان کے حوالے کر دیا لیکن پرتگیزی سامراج پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ہندوستان کے پاس فوجی اقدام کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ اس کا ثبوت پرتگیزی وزیراعظم سالازار کا حالیہ بیان ہے کہ وہ ہندوستان کو فوجی اقدام پر مجبور کر کے اس کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ خود پرتگال کی سیاست ہی بے نقاب ہوئی۔

قاہرہ کے باثر اخبار روزنامہ الاہرام نے ایک اداریہ میں بھارت کی سرزمین پر پرتگیزی نوآبادیوں کے خاتمے پر تبصرہ کرتے ہوئے موزمبیق اور انگولا میں رہنے والے ہندوستانیوں کے خلاف انتقامی اقدامات کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ بھارت میں پرتگیزی علاقوں کا خاتمہ مسرت کا مقام بھی ہے اور گہرے فکر کا بھی۔ مسرت کا اس لئے کہ جنگ آزادی نے نوآبادیاتی نظام کے جنگل سے ایک اور علاقے کو چھڑا لیا ہے اور فکر کا اس لئے کہ نوآبادیاتی نظام اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اس وقت پسپا ہوتا ہے جب اس کے سر پر انقلاب کی تلوار لٹک رہی ہو۔" جمہوریۂ متحدہ عرب پر ہی کیا موقوف ہے دنیا کے جہت سے ملکوں نے بھارت کے اس اقدام کو سراہا ہے۔ مغربی ممالک میں برطانیہ کا رویہ زیادہ مستحسن نہیں رہا لیکن اس نے بھی کوئی ایسی کارروائی نہیں کی جس سے معاملاً الجھے۔ اب تو امریکی مدبرین نے بھی صاف اعلان کر دیا ہے کہ بھارت کی گوا میں پیش قدمی سے امریکہ کی پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور امریکہ بھارت کو اقتصادی ترقی کے لئے جو امداد دے رہا ہے اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ پرتگیزی سیاست دان اور وہ لوگ جو نوآبادیاتی نظام کے حامی ہیں ان باتوں سے سبق حاصل کریں گے اور ان لوگوں کو امن کا سانس لینے دیں گے جو غلامی کا بوجھ اتار کر آزادی کی فضا میں دم لینا چاہتے ہیں۔

۱۱ - دسمبر ۱۹۶۱ء کے آخری ہفتے میں آندھرا پردیش اردو کانفرنس کا اجلاس حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر تلگو، ہندی، مرہٹی اور کنڑی زبانوں کے رہنماؤں نے پرسوز تقریریں کیں۔ مشہور تاریخ دان اور ادیب ڈاکٹر سمارا چندر نے کانفرنس کی صدارت کی۔ آپ نے اپنے عالمانہ خطبے میں اردو، پنجابی، پہلوی اور فارسی کے بنیادی اتفاق کے ساتھ سنسکرت، اپ بھرنش اور کھڑی بولی کی تخلیق و ارتقاء کا ذکر کیا۔ انھوں نے معترضین کے اس اعتراض کو غلط قرار دیا کہ اردو ادب پر ہندوستانی تہذیب کا رنگ پھیکا ہے۔

کانفرنس نے قومی یک جہتی کو ہندوستان کے لئے ضروری قرار دیا اور بیشتر مقررین کی تقریروں کا لب لباب یہ تھا کہ اردو قومی یک جہتی کا ایک نہایت ہی اچھا لسانی ذریعہ ہے۔

اس سال ماہ فروری میں میرا عام انتخاب ہوگا۔ اتنے بڑے پیمانے پر دنیا بھر میں کہیں انتخاب نہیں ہوتا۔ اس سے قبل دو عام انتخاب تہائی خوش اسلوبی اور پُرامن طریقے سے انجام پا چکے ہیں۔ امید ہے کہ اس انتخاب میں بھی پہلی روایات قائم رہیں گی۔ کسی ملک کی ذہنی اور دماغی ترقی کا اندازہ اسی بات سے لگ جاتا ہے کہ اس کے ووٹر اپنے ووٹ کے حق کو کس خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ انتخاب میں مخالفت تو ہوا ہی کرتی ہے لیکن اگر وہ مخالفت محض اصولی ہو اور ذاتیات تک نہ پہنچے تو اس بردبار جمہوریت میں بھی دوستی کا ہی مزا رہتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انتخابی پارٹیاں اپنے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے وقت متانت اور سنجیدگی کو نہیں چھوڑیں گی۔

ہندوستان کی کرکٹ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ ایم۔ سی۔ سی سے کلکتہ کا ٹیسٹ میچ جیت کر بھارتی ٹیم نے بھارت کو نے سال کا تحفہ دیا تھا۔ اس کے بعد مدراس ٹیسٹ جیت کر سیریز بھی جیت لیا۔ ہماری ٹیم قابل مبارک باد ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جس طرح صنعتی اور اقتصادی ترقی کی طرح کھیل کے میدان میں بھی تیز رفتاری سے ترقی کرتا جائے گا۔

فراق گورکھپوری

# غزل کیا ہے؟

غزل سے پہلے قصیدہ نے جنم لیا۔ قصیدہ کسی آدمی یا کسی اور موضوع پر مسلسل اشعار سے مرتب ہوتا تھا۔ ان مسلسل اشعار میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ہوتی تھی۔ بہت سے قصیدوں میں صرف قافیہ ہوتا تھا ردیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ صنفِ سخن عربی شاعری سے فارسی میں آئی اور فارسی سے اردو میں۔ ایک قصیدے میں بسا اوقات صدہا اشعار ہوتے تھے۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں ردیف اور قافیہ کی یہ پابندی ناممکن ہے کیونکہ دوسری زبانوں کی لغات میں دو دو تین تین سو ہم قافیہ الفاظ ہیں ہی نہیں اور نہ ان کے صرف و نحو میں ان صدہا ہم قافیہ الفاظ کو ایک متعینہ ردیف سے ملا کر باندھا جاتا ہے۔ جلیل مانکپوری کے ایک قصیدے کا یہ مصرعہ ہے

شبِ غم لاکھ طولانی ہو نتڑ کا ہو ہی جاتا ہے

اس قصیدے میں "نتڑ کا" قافیہ ہے اور "ہو ہی جاتا ہے" ردیف ہے۔ اس قصیدے میں سیکڑوں ہم قافیہ الفاظ آسکتے ہیں جنھیں 'ہو ہی جاتا ہے' کے ساتھ باندھا جا سکتا ہے مثلاً ایسا ہو ہی جاتا ہے، تمھارا ہو ہی جاتا ہے، اچھا ہو ہی جاتا ہے، کسی کا ہو ہی جاتا ہے، پیدا ہو ہی جاتا ہے، ہویدا ہو ہی جاتا ہے، اشارا ہو ہی جاتا ہے، خونِ تمنا ہو ہی جاتا ہے، مسیحا ہو ہی جاتا ہے، دھوکا ہو ہی جاتا ہے، ہمارا ہو ہی جاتا ہے، شناسا ہو ہی جاتا ہے، دریا ہو ہی جاتا ہے، نظارا ہو ہی جاتا ہے، جلوا ہو ہی جاتا ہے کی ردیف کے ساتھ باندھے جا سکتے ہیں۔ ان قافیوں کو آپ خود سوچ لیجئے اور ان کی ایک فہرست بنا لیجئے۔

کسی ایک موضوع پر قصیدہ کہنے کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ بہت سے ہم قافیہ و ہم ردیف اشعار کہتے چلے جاتے اور جب شاعر یہ بھرے ہوئے اشعار کافی تعداد میں کہہ لیتا تھا تو اس کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا تھا۔ یہ ابتدائی اشعار بظاہر غیر مسلسل ہوتے تھے لیکن ان میں داخلی طور پر ایک تسلسل ہوتا تھا اور ان اشعار کو قصیدے کی اصطلاح میں "تشبیب" کہتے تھے۔ تشبیب کے اشعار کہہ چکنے کے بعد شاعر اسی ردیف میں اور اسی قافیے میں قصیدے کو ایک نیا موڑ دے دیتا تھا۔ اس نئے موڑ کو "گریز" کہتے تھے "گریز" میں اصلی موضوع پر پیرایہ راست اشعار کہے جاتے تھے۔

غزل کا بیسیوں اور غزل کے امکانات قصیدے کی تشبیب میں پنہاں تھے۔ تشبیب میں ایسی چیزوں کا ذکر ہوتا تھا جو عام طور سے انسانوں کی دلچسپی کا موجب ہوں مثلاً حسن و عشق، زندگی، مناظرِ قدرت ایسی آپ بیتی جو جگ بیتی ہو اور دیگر مرکزی جذباتی ردِ عمل تشبیب کے مضامین محدود نہیں ہوتے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ان مضامین میں ہمہ گیری ہو اور ہماری انسانیت کے لئے ایک ایسی اپیل ہو جسے ہم تہذیب کے ہر دور میں اپنا سکیں۔ زندگی بدلتی رہتی ہے۔ زندگی بسر کرنے کے ذریعے بدلتے رہتے ہیں، زندگی کے نظریے بدلتے رہتے ہیں، زندگی کی بہت سی قدریں بدلتی رہتی ہیں لیکن تیز کی اس ہمہ گیری کے باوجود زندگی میں ایک تسلسل بھی قائم رہتا ہے جو

اقدارِ زندگی اس تسلسل کی حامل ہوتی ہیں وہی موضوعاتِ غزل ہیں - یہ موضوعات کبھی پُرانے نہیں ہوتے یہ سدا سہاگ اور سدا بہار ہیں - جاگیردارانہ تہذیب کی پیداوار شعراء کے کچھ اشعار ہیں سناتا ہوں کیا ٹس اور چین کے انقلاب کے بعد یہ اشعار باسی ہوگئے؟ اور کیا انقلابی روس اور انقلابی چین کی نئی انسانیت ان اشعار کو باسی سمجھے گی -

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

تو اور آرائشِ خم کاکل ہیں اور اندیشہ ہائے دور دراز
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا (غالب)

ہمہ عمر ما تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نہ می رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما (بیدل)

درد دل ما غم دنیا نخم معشوق شود
بادہ چوں خام بود خستہ کند شیشۂ ما (عرفی)

در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش (حافظ)

دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے (میر)
کھولی تھی آنکھ صبحِ ازل کو نرسے نے
آخر کو تاجِ تارکے ناچار سو گئے (خواجہ میر درد)

زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے (جگر گورکھپوری)

موت مانگوں تو ملے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے (آتش)

کیا یہ اشعار جو اب سے بہت پہلے کہے گئے تھے - مارکس، لینن، دنیا کے سائنس دانوں اور جدید ترین فلسفہ اور علوم اور نظریوں کے نمائندوں یا آنے والی نسلوں کے لئے کبھی بھی بے معنی و بے کیف ہو سکتے ہیں - یہ اشعار تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی کے تسلسل کی نشان دہی کرتے ہیں - یہی حال اور یہی حقیقت و بید مقدس سے آج تک کے آفاقی اشعار میں ہم پلتے ہیں

کئی سو برس سے ابھی کل تک لفظ غزل کے معنی محبوب سے بات چیت کرنا بتائے جاتے تھے - غزل کی یہ تعبیر یہی سنسکرت کی اس مشہور کہاوت کی یاد دلاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شاعری کسی پیارے دوست کو نصیحت کرنے یا سمجھانے کا نام ہے - مجھے یاد آتا ہے کہ اب سے کچھ دنوں پہلے غزل کے کچھ اس سے بھی گہرے اور مؤثر مفہوم کا پتہ چلایا گیا - جب شکاری کتے یا دوسرے خونخوار جانور جنگل میں ہرن کا پیچھا کرتے ہیں اور جب ہرن بھاگتے - بھاگتے کسی ایسی جھاڑی یا کسی ایسے مقام میں آکر پھنس جاتا ہے جہاں سے وہ بھاگ نہیں سکتا اور جہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ شکاری کتے یا دوسرے درندے اُسے مار ڈالیں گے تو اس کے گلے سے ایک انتہائی درد بھری آواز نکلتی ہے جسے غزل کہتے ہیں - غزل کی شاعری وہ ہے جس سے ہمیں درد بھری اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز سنائی دے - غزل بغیر کسی کتھا کہانی، بغیر کسی ایسے واقعہ کا ذکر کئے ہوئے جس میں ظاہری طور پر کوئی پُر درد بات ہوئی ہو کم سے کم لفظوں میں درد میں ڈوبی ہوئی بات سناتی ہے - ہم ورڈ سورتھ کی باتیں کیوں سننا چاہتے ہیں، ہم درد بھرے اشعار کو کیوں پیار کرتے ہیں اس لئے کہ اگر درد سچا اور پکا ہے اور اس میں خلوص ہے، معصومیت ہے، نرمی ہے اور ترنم ہے تو ایسا درد ہماری ڈھارس بندھاتا ہے، گہرے سے گہرا اطمینان اور توانائی بخشتا ہے اور حیات و کائنات کے لئے ہمارے اندر محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے - سنسکرت میں درد رسوں کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے کرُن رس اور شانت رس یہ بھاو اور رس ناٹکوں میں، بیانیہ نظموں میں، کہانیوں میں اور بڑی کھتاؤں میں بھی ہمیں مناسب موقعوں پر مل جاتے ہیں لیکن غزل موقعہ اور واقعہ کی دست نگر نہیں ہوتی - غزل براہِ راست ایک مختصر سی بات سیدھے سادے بول چال کے الفاظ میں کہہ کر یہ اثر پیدا کر دیتی ہے مثلاً پوری رامائن کی کہانی جو ہزارہا صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اس ایک شعر میں سمٹ آتی ہے ؎

دہرلیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس

دیکھئے رام کی آپ بیتی کس طرح جگ بیتی بن گئی یا یہ شعر لیجئے ؎

رام ہوں یا ہوں کرشنا کہ جنوں یا ہم تم
ملن کے بعد بیوگ جگ کی ریت یہی

غزل زمان و مکان میں بکھرے ہوئے اور پھیلے ہوئے واقعات کا نست یا جوہر نکال لیتی ہے اور ہر شخص کی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتی ہے - یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی خاص کہانی کسی خاص روایت یا کسی خاص نام کا سہارا لیا جائے - مثلاً یہ اشعار لیجئے ؎

کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ درد محبت ہی تو کیا مر جائیں

یہی کہہ کر ستاروں کو کیا رخصت شب وعدہ
کہ جس کا آسرا تھا شام سے اب تک نہیں آیا

بھور کو تک کے چلے گئے بجھو آہ بھر کے چلے گئے
ترے کو چے ہم بجھو آئے بھی تو ہٹھر ٹھر کے چلے گئے

ناموں اور واقعات کا سہارا تو غزل میں بہت کم لیا جاتا ہے البتہ غزل میں کچھ علائم (رموز) ایسے لائے جاتے ہیں کہ ان کی تعداد تو تھوڑی سی ہے لیکن ان کے ذریعہ سے ہزارہا اشعار کو تڑپ رس رسوز و گداز سے بھرے ہوئے اب تک ہم ڈھالے گئے ہیں - ان میں سے خاص رموز یہ ہیں :- (۱) گل و بلبل اور ان کے متعلقات مثلاً صیاد، دام، آشیانہ، بجلی، اسیری، آزادی (۲) بہار و خزاں (۳) ساقی و مے خانہ اور ان کے متعلقات مثلاً جام، ساغر، صراحی، رند، مستی، نشہ (۴) شمع و پروانہ (۵) کارواں (۶) ویرانہ (۷) صحرا، (۸) منزل (۹) وطن (رمز) (۱۰) غربت (پردیس) (۱۱) ہوش اور دیوانگی (۱۲) زنداں (۱۳) زنجیر (۱۴) کعبہ و بت خانہ (۱۵) گناہ و ثواب وغیرہ وغیرہ - ان رموز کو یا علائم کے سہارے غزل کے بڑے شاعروں نے مختصر سے میں بہت کچھ کہہ دیا ہے چند مثالیں پیش کرتا ہوں

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

قید خانے میں رہ کر گھر کی بربادی یا گھر پر کوئی مصیبت آنے کی خبر کتنی دردناک ہوتی ہے اس کی تصویر غالب نے مندرجہ بالا شعر میں کھینچی ہے - ایک اپنا شعر حاضر کرتا ہوں

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

دوسرا شعر جگت موہن لال رواں کا ہے ؎

اب چمن میں بھی کسی صورت سے جی لگتا نہیں
ہاں مگر جب تک قفس میں تھے قفس بدنام تھا

میر کا یہ شعر سنیئے ؎

رات بھر شمع سر کو دھنتی رہی ___ کیا پتنگے نے التماس کیا

داغ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے (غالب)

چھٹ کے گھر آگئے اسیر ترے ___ لیکن اب ان کو کون پہچانے

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

لیکن علائم یا رموز کا سہارا لئے بغیر بھی غزل میں نہایت پُر درد اور پُر تاثیر اشعار کہے گئے ہیں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں ___ خیر تم نے تو بے وفائی کی

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں ___ میر کو تم عبث اداس کیا

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی ___ اور یہیں آج تک خبر نہ ہوئی

آج آنکھوں میں کاٹ لے شبِ ہجر ___ عمر ساری پڑی ہے سو لینا

دمل میں رنگ اڑ گیا میرا ___ کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے ___ عشق بن یہ ادب نہیں آتا

جب نام ترا لیجے تب آنکھ بھر آئے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

جاتا ہے آسماں لے کو چے سے یار کے
آتا ہے جی بھر اور در و دیوار دیکھ کر

کرب و تڑپ رس یا سوز و گداز میں جب پختگی آجاتی ہے تو غم، غم نہیں رہتا بلکہ ایک روحانی سنجیدگی میں بدل جاتا ہے - غزل کی شاعری میں غم اور خوشی، امید اور نا امیدی، محبوب کی مہربانی اور نامہربانی

آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہو جانا یا ان کا بار بار ہونا دُکھ اور سکھ موت اور زندگی، سوگ اور بھوگ غرضکہ زندگی کی وہ مختلف کیفیتیں جو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں ان سب کا سنگم ہو جاتا ہے اور یہ سب مل کر زندگی کی پوری ایک اکائی بن جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر غزل کی شاعری وہ مقام حاصل کر لیتی ہے جس کی طرف کرشن بھگوان نے گیتا میں اشارہ کیا ہے اور جسے میں نے ظاہر کرنے کی ایک نظم میں کوشش کی ہے ان الفاظ میں

بصیرت، عقل، ہمدردی، صداقت اور خدا ترسی
شجاعت، خوف، ہستی، نیستی، نیکی، ریاکاری
سکونِ قلب، دُکھ سُکھ، نیک نامی اور بدنامی
مرے ہی نور کی کرنیں ہیں یہ کیفیتیں ساری

غزل کا موضوع کیا ہے۔ کچھ لوگ تو اس خیال کے ہیں کہ صرف حسن و عشق کے معاملے اور واردات ہی کو غزل میں جگہ ملنی چاہیئے لیکن فارسی اور اردو کے عظیم تر غزل گو شعرا نے حسن و عشق کے علاوہ حیات و کائنات کے ان سدا بہار مسائل و موضوعات کو بھی نہایت رچاؤ کے ساتھ غزل میں جگہ دی ہے جو ہماری زندگی کے مرکزی رجحانات عمل اور دل چسپیوں سے متعلق ہیں اور جو زندگی کے دائمی اقدار کے حامل ہیں۔ حسن و عشق کے موضوع ہی کو لے لیجئے شہوانی اور نفسانی خواہشات و محرکات سے عشقیہ شاعری شروع ہوتی ہے لیکن جب عارضی تلذذ سے گزر کر محبوب کا خیال اور اس کی یاد یا اس کی شخصیت عاشق پر اس قدر چھا جائے کہ جنسی لذت حاصل ہونے پر بھی محبوب کا خیال شعور سے نہ اُترے تو بھوگ دلاس ترقی کر کے عشق بن جاتے ہیں۔ محبوب کا ایسا تصور عشق کی دوسری منزل ہے اس کے بعد محبوب کا تصور حیات و کائنات اور پوری زندگی، پوری تاریخ و تمدن، علوم و فنون تمام فلسفیانہ مسائل کے ایک ایسے تصور کو اپنے آغوش میں لے لیتا ہے جو انسانی زندگی اور اس کے ادراک کو رس اور جس سے بھر دیتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ایک مختصر سا شعر ساری کائنات کی شاعری بن جاتا ہے۔ غزل اس نازک کام میں اسی لیے کے ذریعہ سے کامیاب ہوتی ہے جو بہت مشکل سے ہاتھ آتا ہے اور جس کے لیے ایک داخلی روحانی ریاضت یا سادھنا اور توفیق غیبی کی ضرورت پڑتی ہے۔ لامحدود وجود کو انسانیت کی صفت عطا کرنا کائنات کو انسان نما بنا دینا اور اس طرح ایسا کر سکنا کہ دل پر وائی اثر پڑے یہی غزل کی غرض و غایت ہے۔ علم و فلسفہ، اخلاق و مذہب، تہذیب و تمدن، جذبات و عمل سب اُس انسانیت کی تخلیق کے لئے کھاد کا کام دیتے ہیں جو ہمیشہ انسانیت ہے اور جو ان سب کو ہضم کر کے ہماری معصومیت ہمیں پھر سے واپس دے دیتی ہے۔ غزل وہ پانسری ہے جسے زندگی کی بھلوں میں ہم نے کہیں کھو دیا تھا اور جسے غزل کا شاعر کہیں سے پھر سے ڈھونڈھ لاتا ہے اور جس کے بھرے سن کر بھگوان کی آنکھوں میں بھی انسان کے لئے محبت کے آنسو آجاتے ہیں۔


**سریتا** ماہنامہ — سماجی تعمیرِ نو کا ترجمان

- سماجی اور گھریلو زندگی کی صحیح عکاسی کرنے والی کہانیاں
- اہم اور پے چیدہ سیاسی اور انفرادی مسائل پر خیال انگیز مضامین
- دل نشیں نظمیں اور جذباتی غزلیں
- طنز و مزاح
- عورتوں کے سُلجھے ہوئے مضامین

فی شمارہ ۷۵ نئے پیسے

زرسالانہ ایک سال ۶ روپئے — دو سال ۱۱ روپئے

مینیجر، سریتا اُردو۔ جھنڈے والان، رانی جھانسی روڈ۔ نئی دِلّی۔

مجھے اگلے شمارہ سے ایک سال/دو سال کے لئے خریدار بنا لیجئے۔ زرچندہ کے لئے وہ شمارہ وی۔ پی۔ پی سے روانہ کیجئے۔

نام _____

پتہ _____

# غزل

چھوڑتی نہیں مجھ کو دل کی یہ لگن تنہا
ہوں ترے تصوّر سے خود اک انجمن تنہا

کون بزمِ ہستی میں غم مرا سمجھتا ہے
جی رہا ہوں سہہ سہہ کے درد کی چبھن تنہا

اے نسیمِ بے پروا! کون سی یہ منزل ہے
پھر رہی ہے راہوں میں بوئے پیرہن تنہا

قصّۂ شبِ ہستی کہہ کے اڑ گئی شبنم
رہ گئی پھولوں پہ صبح کی کرن تنہا

اُن کی کیا خطا اس میں، وجہ اس خرابی کی
ہے مری طبیعت کا واہمہ پن تنہا

ختم ہو نہیں سکتے معرکے محبّت کے
کوہِ بے ستوں لاکھوں، جانِ کوہکن تنہا

عشق کی یہ جرأت بھی فیض ہے ترے غم کا
حسن کے مقابل ہے دل کا بانکپن تنہا

صورتِ صبا نکلی بوئے گُل بھی آوارہ
رہ گئی ہے اک بلبل محرمِ چمن تنہا

یوں تو داغ پائے ہیں کچھ گلوں نے بھی، لیکن
آئی اپنے حصّے میں عشق کی جلن تنہا

مدّتوں سے چپ سی ہیں وہ غزل فریب آنکھیں
لے کے پھر رہا ہوں میں تہمتِ سخن تنہا

اب تو دُور پہنچی ہے اپنے فن کی رسوائی
دوش پر اُٹھانا ہے بارِ فکر و فن تنہا

# مغلیہ دور میں حکومت اور سماج

منجھو تاریخ دان ڈاکٹر تارا چند نے آل انڈیا ریڈیو سے پہلی میموریل لیکچرز کے سلسلے میں تین تقریریں پچھلے سال انگریزی میں نشر کی تھیں۔ ذیل میں دوسری تقریر کے چند دل چسپ اقتباسات کا ترجمہ موصوف کے شکریے کے ساتھ درج ہے۔ (ادارہ)

ہمیں اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں اور علماء کے مابین، حکومت، خاص کر حکومت اور عوام کے تعلقات کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ اشتش کے زمانے سے لے کر جس نے علماء کی یہ تجویز قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی کہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کر لیا جائے، بلبن، علاؤالدین خلجی، محمد تغلق اور شیر شاہ تک قریب قریب سب ہی حکمرانوں کا یہی نظریہ رہا کہ مذہب اور حکومت کو یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر، بنگال اور دکن کے صوبائی سلطانوں کا بھی یہی نظریہ تھا۔

مغلوں نے اس فنی تصور کو ایک ایجابی اور تعلیمی پالیسی کی شکل دینے کی کوشش کی۔ بابر نے مرتے وقت ہمایوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ ہندو مسلمان میں کوئی امتیاز روا نہ رکھے۔ اکبر نے اس سلسلے میں جو جرأت مندانہ کوششیں کیں وہ سب جانتے ہیں۔ جہانگیر میں ایسی جرأت نہ تھی، مگر وہ بھی اپنے باپ کے راستے سے نہیں ہٹا۔ اور شاہجہان بھی کچھ پس و پیش کے بعد مجموعی طور سے اسی راہ پر چلتا رہا۔ افسوس کہ اورنگ زیب نے وقت کے دھارے کو بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھی بالآخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ مذہب اور سیاست کو ملانا نہ تو مفید ہے اور نہ مناسب۔ اورنگ زیب کے ایک محبوب افسر صمصام الدین خاں نے، جو "مفید عالمگیری" کے فرضی نام سے مشہور ہے، احکام عالمگیری جمع کئے تھے۔ ان میں ایک جگہ یہ عبارت درج ہے:۔

"دنیاوی معاملات کا مذہب سے کیا تعلق! مذہب کے معاملات میں تعصب کا کیا دخل! تمہارے لئے تمہارا مذہب ہے، میرے لئے میرا (لکم دینکم ولی دین۔ قرآن) ۔ اگر قانون شریعت پر عمل کیا جائے تو یہ ضروری ہوگا کہ تمام راجاؤں اور ان کی رعیت کو ختم کر دینا چاہیئے"۔ —— اس کا یہ بھی قول تھا "ہمارا کسی دوسرے کے مذہب سے کیا واسطہ؟ میسا اپنی را موسیٰ اپنی راہ"

دور وسطیٰ کے بادشاہوں کے اقدامات اور ان کی پالیسیوں کی حرف ان کے مذہبی عقائد یا مذہبی قوانین کی روشنی میں تشریح طلب کرنا نہ تو ممکن ہوگا اور نہ مفید۔ اس کے علاوہ بہت سے دیگر وجوہ تھے خاص کر اقتصادی اور سیاسی وجوہ، جو ان اقدامات پر اثر انداز ہوئے۔ مگر بدقسمتی سے ان پر پردہ پڑا رہا ہے، کیونکہ اس زمانے کی تاریخیں زیادہ تر علماء نے مرتب کیں، جنھیں مذہب سے خصوصی دل چسپی تھی۔ وہ مسلمان حکمرانوں کی فتوحات کو چار چاند لگانا اور ان کی مذہبیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا چاہتے تھے۔

آیئے ان باتوں کے پیش نظر ہم از منۂ وسطیٰ کی حکومت کے وجود اور اس کے فرائض کا مطالعہ کریں۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اس وقت کی حکومت بالکل مطلق العنان نہ ہوتی تھی —— درحقیقت اس کا دائرۂ اختیار و عمل

اتنا محدود تھا کہ بادشاہ سے ہی صحیح معنی میں خود مختار کہلائی جا سکتی تھی۔ قانونی اصطلاح میں چودھویں صدی کے آخر تک مسلم حکومتیں ماتحت قلمرو رہیں جنھیں خلیفہ کے فرمان کے ذریعہ اختیارات حاصل ہوتے تھے اور اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ جنگجوؤں کے بغاوت کر دینے کے بعد بھی برسوں تک یہ رسمی حیثیت قائم رہی۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ایشیا میں اب کوئی خلیفہ نہ رہا تھا۔ اس کے بعد جب ترکی کے عثمانی سلطانوں نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا تو ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا بلکہ انھوں نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا کہ خود ہی خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا اور ان شرائط کا کوئی لحاظ نہیں کیا جو اس منصب کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے شدید نتائج مرتب ہوئے کیونکہ اس سے فقہائے دین کا ایک گروہ ناراض ہو گیا، جو اس مسئلہ میں مغل قوانین کا سختی سے پابند تھا۔ اکبر کی مذہبی حقیقت کی تلاش اس مسئلہ سے شروع ہوئی۔ وہ اس خلا کو پُر کرنا چاہتا تھا جو بغداد کے ہاشمی خاندان کے ختم ہو جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ یہی خاندان قانونِ شریعت کے مطابق منصبِ خلافت کا جائز وارث ہو سکتا تھا۔ اکبر نے اسلامی فقہ کے چاروں مکاتیبِ فکر سے تعلق رکھنے والے نمائندہ علماء کو جمع کیا تاکہ وہ کوئی راستہ تلاش کریں۔

لیکن ان لوگوں نے اس کی مشکلات دور کرنے کی بجائے آپس میں ہی بحث شروع کر دی جس سے اکبر ناراض ہو گیا اور تقلید پرست علماء کے مذہبی عقائد اور اعمال کے بارے میں شک کرنے لگا۔ شیخ مبارک فیضی اور ابوالفضل جیسے علماء کی مدد سے اس نے ان لوگوں سے پیچھا چھڑا لیا اور خود 'امام عادل' کا منصب اختیار کر لیا۔ بدقسمتی سے ملا عبدالقادر بدایونی جیسے متعصب لوگوں نے اس کو بدنام کرنے کے لئے پیچھے پیچھے بہتان تراشیاں شروع کر دیں اور ہر طرح غیر اسلامی عقائد و اعمال اس سے منسوب کرنے لگے۔ سب سے بُری بات یہ ہے کہ آج بھی جبکہ تاریخ نے ان الزامات کا کھوکھلا پن ثابت کر دیا ہے بدایونی کے حامی ان کے قائل ہیں۔

اکبر کے اس حل کے بارے میں خواہ کچھ ہی کہا جائے، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ خلافت کا منصب مسلم سوسائٹی کے لئے محور کی حیثیت رکھتا تھا اور اس منصب کے ختم ہونے سے اس کی آفاقیت بھی جاتی رہی تھی۔ افسوس کہ تیرھویں صدی سے لے کر اب تک اس مسئلہ کا کوئی معقول حل نہیں نکل سکا۔

لیکن قانون و شریعت سے قطع نظر مغل حکومت کا دائرۂ عمل بہت محدود تھا۔ آج ریاست کا سب سے بڑا کام قانون سازی ہے۔ یہی اس کے اقتدارِ اعلیٰ کی نشانی سمجھی جاتی ہے اور قانون سازی کا سب سے بڑا ذریعہ قانون ساز اسمبلیاں ہیں لیکن ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں نہ تو قانون سازی ہوتی تھی اور نہ کوئی قانون ساز جماعت تھی۔ چنانچہ جہاں تک قانون سازی کے معاملہ میں خود مختاری کا تعلق ہے اس لحاظ سے اس زمانے کی ریاست بالکل کمزور اور نامکمل کہی جا سکتی ہے۔

ہندو اور مسلمان دونوں ہی تمام معاملات میں اپنے اپنے قوانین کے ماتحت تھے، جو آسمانی سمجھے جاتے تھے۔ یہ ضوابط ہر طرح کے قوانین پر مشتمل تھے ـــــ سیاسی اور دستوری، دیوانی اور فوجداری اور مذہبی ـــــ یہ قوانین مقدس سمجھے جاتے تھے جو کسی آسمانی طاقت نے ودیعت کئے تھے۔ کوئی انسانی ادارہ ان میں ردوبدل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ انھیں غیر فانی، مکمل اور محیطِ کل سمجھا جاتا تھا۔

نظریاتی اعتبار سے یہ قوانین تمام اہلِ دین کے لئے تھے لیکن عملی طور پر ان کا نفوذ محدود تھا۔ جہاں تک سیاسی ضوابط کا تعلق ہے حالات نے ان کے نفاذ کو مشکل بنا دیا تھا۔ خلافت یا قانونی اعتبار سے مرکزی طاقت ختم ہو چکی تھی اور اس لئے خلیفہ اور سلطان کے باہمی تعلق اور اختیارات سے متعلق شرائط اور ناقابلِ عمل ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ اصول جن میں حکمران اور رعایا کے حقوق و فرائض کی وضاحت کی گئی تھی اور جن کی بنیاد عربوں کے رسم و رواج اور سنتِ رسول و خلفاء الراشدین کے معاملات پر قائم تھی، وسطِ ایشیا سے آنے والے فاتحوں کے رسم و رواج سے بالکل مختلف تھے اور اس لئے ان پر چلنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان اصولوں کی ایک اہم دفعہ میں

غیر مسلم رعایا کے مرتبہ اور حیثیت کا ذکر کیا گیا ہے ان اصولوں کو غلط سمجھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ فوجی سردار جو فاتحوں کے دل یا قائم شدہ حکمران خاندانوں کے سرپرداہ تھے، ایسے لوگ تھے جن کی مادری زبان فارسی نہ تھی اور چونکہ ان کی تعلیم بھی معمولی تھی اس لئے وہ عام طور سے ان ضوابط کے احکام، ان کی تشریحات اور علماء کی مختلف تفصیلات سے براہِ راست واقف نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر چونکہ ان کے زیر حکومت اتنی بڑی آبادی تھی، جس کا مذہب، رسم و رواج، زبان اور ثقافت جداگانہ تھی، اس لئے حکومت کی عملی ضرورتوں کی وجہ سے بھی بہت سی مشکلات پیدا ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پالیسی کسی ایک نہج پر قائم نہ رہ سکی۔ بعض بادشاہوں نے جزیہ لگایا، بعض نے اس سے احتراز کیا۔ بعض نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز برتا، دوسروں نے ایسا نہیں کیا۔

دیوانی اور فوجداری قوانین کے معاملے میں بڑی اُلجھنیں پیدا ہوئیں۔ ہندو تو فقہ اسلامی کے دائرہ سے باہر تھے مگر مسلمانوں میں بھی ایک بہت بڑی تعداد، خاص کر نو مسلم اسی رسم و رواج کے پابند رہے جن کو وہ خود یا ان کے قریبی اجداد اسلام قبول کرنے سے پہلے مانتے آئے تھے۔ یہ لوگ شادی اور وراثت کے معاملے میں پرانے طبقاتی قوانین کی پابندی کرتے تھے۔ ہندوؤں میں اونچی ذات کے لوگ شاستروں کے احکام مانتے تھے، لیکن ایک بہت بڑی تعداد جو نیچی ذات سے تعلق رکھتی تھی اس کے اپنے روایتی قوانین تھے۔

مسلمانوں کے قانون فوجداری میں بڑی سخت سزائیں رکھی گئی ہیں اور مقدمہ کی کارروائی طول طویل ہوتی ہے۔ لیکن اس قانون کا ایک حصہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب پر نافذ تھا۔ لیکن جہاں تک عملی نفاذ کا تعلق ہے سزائے موت بہت کم دی جاتی تھی اور عام طور سے ہاتھ پیر کاٹنے کی سزا بھی نہ ملتی تھی۔ سخت سزائیں ایسے جرائم کے لئے مخصوص تھیں جو حکومت کے خلاف سرزد ہوتی تھیں اور ان میں رحم کے لئے گنجائش نہ تھی بلکہ ان میں بادشاہ کی اپنی مرضی اور خوشی سے فیصلہ ہوتا تھا قانون کے لحاظ سے نہیں۔

قانون سازی کے بعد دوسرا اہم رتبہ عدل گستری کو حاصل ہے از منۂ وسطیٰ میں عدل گستری بادشاہ کا سب سے اہم اور محبوب فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ سب بادشاہ یہی چاہتے تھے کہ عادل کہلائیں۔ 'میزانِ عدل' اس بات کا نشان تھا کہ بادشاہ رعایا کی فلاح و بہبود کو عزیز اور خوفِ خدا کو ملحوظ رکھتا ہے۔ ان باتوں کو دیکھ کر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں نظامِ عدل بہت ہی منظم اور مضبوط ہوگا۔ لیکن تعجب خیز حقیقت یہ ہے کہ عدلیہ کا ایک بڑا حصہ حکومت کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا انھیں اپنے دیوانی اور انفرادی مقدمات کے لئے پنڈتوں اور شاستریوں کی نجی عدالتوں یا برادری یا گاؤں کی پنچایتوں میں جانا پڑتا تھا۔

ساری رعایا کے فوجداری مقدمات اور مسلمانوں کے دیوانی مقدمات قاضیوں کی عدالت میں جاتے تھے۔ حکومت میں ایک ایسا محکمہ قائم تھا جو ان امور سے تعلق رکھتا تھا۔ بادشاہ اس محکمے کے افسرِ اعلیٰ کا تقرر کرتا تھا۔ صوبائی قاضی اس محکمہ کی طرف سے مقرر کئے جاتے تھے جنھیں ضلع اور پرگنہ کے قاضیوں کے تقرر کا امتیاز حاصل تھا۔ البتہ دیہات میں ریاست کی طرف سے شاید ہی کوئی قاضی رہتا ہو۔ قاضیوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں بلکہ انھیں کرہ راوقات کے لئے ایسی زمینیں مل جاتی تھیں جن کی مال گذاری نہیں لی جاتی تھی نظام قضا میں کوئی درجہ بندی نہ تھی۔ اپیلوں کا بھی کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا۔ البتہ بعض اوقات کسی ایک قاضی کے طے کردہ مقدمات نظرِ ثانی کے لئے دوسرے قاضی کے پاس بھیج دئے جاتے تھے۔ جو لوگ قضای قاضی کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہوتے تھے وہ تا انصافی کے ازالہ کے لئے صوبائی گورنر کے پاس جا سکتے تھے۔

بادشاہ سرچشمۂ عدل و انصاف سمجھا جاتا تھا، صرف اس لئے نہیں کہ وہ دیوانی اور فوجداری مقدمات سن کر فیصلہ صادر کرتا تھا، بلکہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ غریبوں اور مظلوموں کا محافظ ہوتا تھا۔ ان حالات میں جبکہ سرکاری حکام، امیر اور طاقت ور لوگ جو چاہے کر سکتے تھے، بادشاہ ہی مظلوموں کا سہارا تھا۔

مغل مورخوں نے بہت سی ایسی مثالیں بیان کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہوں نے مجرموں کو سخت ترین سزائیں دیں۔ بابر

نے محمد زمان مرزا کو اندھا کرا دیا تھا کیونکہ اس نے حاجی محمد خاں کوکی کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ مرزا بابر کا بہت ہی قریبی رشتہ دار تھا۔ اکبر دولت خانہ میں خاص دربار کیا کرتا تھا جس میں اپیلیں سنی جاتی تھیں۔ جب یہ عدالت بیٹھتی تو نقارہ بجا کر لوگوں کو اطلاع دی جاتی تھی۔ اکبر نے اپنے دودھ شریک بھائی ادھم خاں کو اپنے سامنے سزا دلائی تھی جس نے اتکاخاں کے قتل کی سازش کی تھی۔ اکبر نے اس کو اندھا کرا کے سر کے بل قلعہ کی چہار دیواری سے نیچے گرا دیا تھا جس سے اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔

گجرات کے گورنر خاں اعظم مرزا عزیز کوکا کا واقعہ بڑا دل چسپ ہے۔ خان اعظم نے اپنے ملازم کو مروا دیا تھا کیوں کہ اس نے ایک عامل کو جان سے مار ڈالا تھا مگر اس عامل کا باپ اس سزا سے مطمئن نہیں ہوا اس نے گورنر کے خلاف شکایت پہونچائی۔ اکبر نے مقدمہ کی سماعت کا حکم دیا اور خان کو ایک بڑی رقم بطور خون بہا دینا پڑی۔

جہانگیر نے ایک سونے کی زنجیر لگوا رکھی تھی جو تیس گز لمبی تھی اور اس میں ساٹھ گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس زنجیر کا ایک سرا قلعہ آگرہ کے شاہ برج کی فصیل سے بندھا ہوا تھا اور دوسرا سرا جمنا کے کنارے ایک پتھر کے کھمبے میں اٹکا ہوا تھا۔ جب کوئی مظلوم عدالتوں سے انصاف پانے میں ناکام ہوتا تو آکر اس زنجیر کو کھینچتا اور اس طرح گھنٹیاں بجا کر فریاد کرتا۔ جہانگیر ہفتہ میں ایک بار دیوانی اور فوجداری مقدمات سننے کے لئے دربار کیا کرتا تھا۔ وہ مجرموں کو سخت ترین سزائیں دیتا تھا۔ جیسے ہاتھیوں کے پیروں تلے کچلوانا، شیروں سے پھڑوا دینا وغیرہ وغیرہ۔

شاہجہان ان حاکموں کو جرأت ناک سزائیں دیتا، جو ظلم کرتے تھے۔ گجرات کا گورنر نامزد خاں بڑا ظالم تھا۔ واقعہ نویسوں کو رشوت دیتا تھا کہ شہنشاہ اس کی حرکتوں سے واقف نہ ہونے پائے۔ چند مظلوم سیدھا گرکسی نہ کسی طرح آگرہ پہونچے اور انھوں نے شاہجہان کے سامنے ایک ڈرامہ کھیلا جس میں گجرات کی بدانتظامی کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس کو دیکھ کر شہنشاہ کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے تحقیقات کی۔ حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد اس نے نامزد خاں کی جائداد ضبط کر کے اس کو روہتاس گڑھ کے قلعہ میں قید کرنے کا حکم دے دیا۔

شاہجہان نے مختیر کے ظالم اور بدکردار صوبیدار اعتقاد خاں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ اس سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اس صوبے دار کے ظلم اور رشوت ستانی نے وادیٔ کشمیر میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ جوں ہی شاہجہان کو کشمیر کے حالات کا علم ہوا، اس نے صوبیدار کو برخاست کر کے اس کی جگہ مُعظم خاں کو مقرر کر دیا اور اس بات کا اعلان کر دیا کہ اعتقاد نے جو بدعتیں شروع کی تھیں وہ ختم کر دی گئی ہیں۔ شاہجہان نے اپنے احکام ایک سنگ مرمر کی سل پر کندہ کرا کے اس کو جامع مسجد کے صدر دروازے پر نصب کرا دیا تاکہ حکام آئندہ تنبیہ رہیں۔

اورنگ زیب عدل گستری کے لئے بڑا سرگرم عمل تھا۔ وہ دربار میں سنتا اور فیصلے صادر کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک 'دیوانِ مظالم' بھی قائم کیا تھا جہاں ایسے مقدمات پیش ہوتے تھے۔ اس کے حکم سے ضابطۂ قوانین شرعی بھی تیار کیا گیا تھا۔ اس نے شیخ نظام اور چھ دیگر فقیہوں کو اس کام پر مامور کیا کہ قانون و ظائر سے متعلق صورت حال کا جائزہ لے کر قانونی فیصلوں کا باقاعدہ خلاصہ اور قانون کی صحیح تفریح مرتب کریں۔ چنانچہ سات سال کی محنت کے بعد یہ کام پورا ہوا اور شہنشاہ کے نام پر اس کا نام 'فتاویٰ عالمگیری' رکھا گیا۔

بادشاہ کا حکم وزراء اور امراء کے ذریعہ چلتا تھا جنھیں فوج میں جمع سے لے ہوئے تھے۔ درحقیقت عدلیہ کو چھوڑ کر جملہ افسران فوجی جمع بردار ہی ہوتے تھے۔ اس نظام کو منصب داری نظام کہا جاتا تھا اکبر نے سب سے پہلے یہ نظام قائم کیا تھا۔ منصب داروں کی تنخواہ یا تو شاہی طرف سے ادا ہوتی تھی یا انھیں کچھ زمینوں کی مال گذاری وصول کرنے کا اختیار دے دیا جاتا تھا۔ اعلیٰ افسران کے معاملے میں عام طور سے دوسرا ذکر طریقے پر ہی عمل ہوتا تھا۔ اس طرح یہ منصب دار جاگیردار ہوا کرتے تھے اور اپنی جاگیر کی پوری الرامنی کی آمدنی میں سے ریاست کا پورا حصہ یا اس کا کچھ حصہ وصول کیا کرتے تھے۔ اس لئے زمینیں دو حصوں میں منقسم تھیں۔ خالصہ زمین، جس کا انتظام براہ راست حکومت کے ہاتھ میں رہتا۔ اور جاگیری زمین۔ جس کا انتظام منصب دار یا تو اپنے کارندوں کے ذریعہ یا سرکاری اورگاؤں

سروں کی معرفت کیا کرتے تھے ان دونوں میں کوئی مقررہ تناسب قائم نہ تھا۔ بعض بادشاہ محتاط تھے انھوں نے جاگیروں کو محدود رکھنے کی پیہم کوشش کی۔ بعض بادشاہ لاپرواہوئے تو انھوں نے خالصۂ زمینوں کو بھی جاگیرداروں کے قبضہ میں جانے دیا۔ اکبر نے اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں جاگیریں ختم کرنے کی کوششیں کی تھیں لیکن بعد کو مالگذاری کی وصولی کے ذریعہ تنخواہیں دینے کا طریقہ برقرار رکھا۔ مگر اس نے یہ اجازت نہ دی کہ امراء اپنی مخصوص جاگیروں پر مستقل طور سے قابض رہیں، اس لئے اس نے جاگیروں کو ادلتے بدلتے رہنے کا حکم دیا۔ منصب دار کے انتقال کے بعد اس کی جاگیر اور املاک حکومت کے قبضہ میں آجاتی تھیں۔

لیکن ریاست کے فرائض میں صرف امن وامان کا قیام اور مالگذاری کی وصولی ہی شامل نہ تھی، ہمسایہ حکمرانوں کی طرف سے حملے کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ گولیا نے قدیم زمانے کی سیاست سے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بات از منۂ وسطیٰ میں بھی صحیح ثابت ہوئی تھی۔ سرحدی حکومتوں سے دشمنی رہا کرتی تھی اور ان کے خلاف دور دراز کی حکومتوں کو حلیف بنایا جاتا تھا۔ سرحد پر کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رہتا تھا اور سرحد کی حکومتیں برابر حملہ کرنے کی تاک میں رہا کرتی تھیں۔ ان حالات میں خود حملہ کرنا ہی دفاع کا سب سے اچھا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بھی یہی صورت حال تھی اور مسلم حکومتیں قائم ہونے پر بھی قائم رہی۔ چنانچہ ہندو راجہ اخومیدھ یگیہ کرنا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ ان کی فتوحات ہمسایہ حکمرانوں کو کامیابی سے زیر کرنے پر منتج ہوتی تھیں۔ یہ مہمیں دیگ یعنی دسہرہ کے دسویں دن شروع ہوتی تھیں جب بارشیں ختم ہو جاتیں اور فوجوں کے آگے بڑھنے کے لئے راستے کھل جاتے تھے۔

مسلمان بادشاہوں کو دوہرا فرض انجام دینا ہوتا تھا۔ یعنی کاربانی اور جہاں گیری۔ جہاں گیری کے لئے وہ خود اپنی فوجوں کے ساتھ اپنی ہمسایہ حکومتوں پر چڑھائی کیا کرتے تھے۔

مغل دربار "اردوئے معلیٰ" کے نام سے مشہور تھا، لیکن یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ مغل حکومت ایک فوجی کیمپ تھی۔ اگرچہ فوج کو بڑی اہمیت حاصل تھی، لیکن ان کی مستقل فوج کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی، ہاں ضرورت کے وقت منصب داروں کی فوجیں جمع کرکے اس میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ ان فوجیوں کی تعداد یوں اور بھی زیادہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ بہت سے ایسے لوگ بھی فوجوں کے ساتھ ساتھ چلتے تھے جو لڑتے نہیں تھے۔ دراصل لڑنے والی فوج کی تعداد بہت زیادہ نہ ہوتی تھی۔

ہم مغل حکومت کو پولیس حکومت بھی نہیں کہہ سکتے، اور اسی کی وجہ یہی ہے کہ حکومت سماج کے معمولی کاموں میں بہت کم دخل انداز ہوتی تھی۔

پھر یہ مذہبی ریاست بھی نہیں کہی جا سکتی کیونکہ مذہبی لوگوں کو کوئی بالادستی حاصل نہ تھی اور بادشاہ بھی ان کے زیر اثر نہ ہوتے تھے۔ وہ آسمانی احکام کے مطابق حکومت کرنے کا دم نہ بھرتے تھے اور نہ اس کا کوئی سوال تھا کہ وہ سماج کے مذہبی قائد بنیں۔

رعایا سے تعلق بادشاہوں کا بنیادی فرض یہ تھا کہ اس کے لئے مہذب اور اچھی زندگی کے مواقع مہیا کریں۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ صرف زندگی گزارنے یا جیوانی زندگی گزارنے کا مطلب اچھی زندگی نہیں ہو سکتا۔ ذہن انسانی فن وادب اور موسیقی میں آسودگی پاتا ہے اور اس کے لئے وہ لطافت وثقافت کی تلاش میں رہتا ہے۔ اکثر مغل بادشاہ علم وادب کے شیدائی تھے۔ بابر تزک کی زبان کا بہت اچھا شاعر تھا اور اس نے بے مثال سوانح عمری لکھی ہے۔ ہمایوں کو فلکیات اور ارضیات کے مطالعہ کا شوق تھا وہ ستاروں کی گردش دیکھتا رہتا تھا۔ اکبر کو مذہب اور فلسفہ سے بڑی دلچسپی تھی اور مختلف مذاہب کے رموز کا پتہ لگانے میں وہ رات رات گزار دیتا تھا۔ جہانگیر مصوری کا دلدادہ تھا اور اپنے دربار میں صورتوں کا اچھا نقاد اور رہنما تھا۔ شاہ جہاں کی قوت تخیل نے ایسی عمارتیں تعمیر کرائیں جو غیر فانی حسن کی مالک ہیں۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا دارا شکوہ ایک جید عالم تھا۔ وہ فارسی، عربی اور سنسکرت زبانیں جانتا تھا اس نے پچاس اپنشدوں کا سنسکرت سے فارسی میں بڑا اچھا ترجمہ کیا تھا اور "مجمع البحرین" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ہندو ؤں اور مسلمانوں کے صوفیانہ عقائد کی یکسانیت ظاہر کی گئی ہے یہاں تک

کو اورنگ زیب جیسا متشدد مزاج بادشاہ بھی زبردست عالم اور مسلم الثبوت نثر نگار تھا۔ اس کے بعد اودھ کی بادشاہ شاعر گزرے ہیں۔ آخری ملی بادشاہ بہادر شاہ ظفر تو اردو اور برج بھاشا کا بہت اچھا شاعر تھا۔

آج شہنشاہ نہیں رہے لیکن ہندوستانی ثقافت میں ان کے کارنامے ہمیشہ یادگار رہیں گے ہم یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اکثر جدید ہندوستانی زبانیں ان کے دور میں اور انھیں کے زیر سایہ پروان چڑھیں۔ ہندی کے دو عظیم شاعر اسی زمانے میں پیدا ہوئے۔ سورداس اور تلسی داس۔ عبدالرحیم خانخاناں اکبر کا امیرالامراء تھا۔ وہ خود بھی اعلیٰ درجے کا ہندی شاعر اور بہت سے شاعروں کا سرپرست تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مسلمان بادشاہ اور امراء ایسے گزرے ہیں جو علماء و فضلاء کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ وکن میں بہمنی سلطان بڑے روشن خیال اور علم و ادب کے سرپرست تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ دکھنی اردو کا عظیم شاعر گزرا ہے۔ جون پور کے شرقی بادشاہوں نے اپنے دربار میں بہت سے شاعر اور ادیب جمع کر رکھے تھے۔ بنگال کے نامور شاہ نے بنگالی ادب کو ترقی دی اور اسی کے حکم سے مہابھارت کا بنگالی میں ترجمہ ہوا۔ وہ وجیانگر کا دوست تھا۔ حبشی شاہ نے بالادھر رامائن کا "جگوت پران" کا ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا۔

ملی بادشاہوں کے زیر سایہ ادب کے علاوہ بہت سے سائنسی علوم کی ترویج ہوئی۔ علم طب بھی ان میں شامل تھا۔ اکبر نے ملک بھر میں بہت سے اسپتال قائم کئے تھے، اسی طرح جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب نے بھی اسپتال کھولے اور ان کے اخراجات کے لئے جائدادیں وقف کی تھیں۔ ان میں سے بعض اسپتالوں میں یونانی اور آیورویدک دونوں طریقۂ علاج سے کام لیا جاتا تھا۔ ایسی طبی کتابیں مرتب کرنے کی بھی کوشش کی گئی جن میں دونوں طریقۂ ہائے علاج کے اصول درج تھے۔

ریاضی اور علم نجوم کو بھی خوب ترقی دی گئی۔ اس موضوع پر لکھی ہوئی سنسکرت کتابوں کا فارسی میں اور عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مختلف علوم سے بھرپور سنسکرت کتب کا فارسی میں اور فارسی اور عربی کتابوں کا ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ لاعلمی کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جو خلا موجود تھا اس کو پُر کرنے کی کوششوں کی اس طرح حوصلہ افزائی کی گئی اور ہندو مذہب و فلسفہ کی اہم کتابوں کو فارسی میں منتقل کر دیا گیا۔

فنون لطیفہ میں معماری، فن تعمیر اور موسیقی پر خاص توجہ دی گئی۔ اس دور میں فنون لطیفہ کے میدان میں ہندوستان نے جو ترقی حاصل کی اس کی جب یہ زمانہ یورپ کے دور نشاۃ ثانیہ یا یونان کے دور زریں کی طرح ممتاز سمجھا جاتا ہے بادشاہ ان سب فنون لطیفہ کے بڑے قدردان تھے۔ معماری تو عام طور سے درباری فن ہی سمجھا جاتا تھا۔ بابر اور ہمایوں تو وسط ایشیا سے اپنے ہمراہ اس فن کے استاد لائے تھے۔ اور اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان کی سرپرستی میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ آگرہ اور دہلی کے دربار دں کی دیکھا دیکھی صوبائی گورنروں، راجستھان کے ہندو راجاؤں اور پہاڑی ریاستوں نے معماری کے مقامی اسالیب کی پرداخت و پرورش کی۔

---

## ضروری گزارش

۱۔ کاغذ کے ایک طرف لکھئے۔

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں۔ (ادارہ)

قدرت نقوی

# غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب

غالب کے زمانے میں کسے خبر تھی کہ غالب کے خطوط ادبی حیثیت سے بلند مرتبہ ہونے کے علاوہ ایک اہم تاریخی دستاویز کا کام بھی دیں گے غالب خود ان کی اشاعت و طباعت کے مخالف تھے۔ لیکن جب ادبی اہمیت کا احساس ہوا تو انھوں نے خود طباعت کے کام میں مدد دی اور اپنے خطوط کی نقول فراہم کرنے میں مرتبین عود ہندی و اردوئے معلیٰ کا ہاتھ بٹایا۔

غالب کے زمانے میں صرف ادب ملحوظ تھا۔ اس وجہ سے کسی نے بھی تاریخوں کی درستی کی طرف توجہ نہیں کی نیز ترتیب میں بھی تاریخی حیثیت کو نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں خطوط بکھرے ہوئے ہیں۔ اردوئے معلیٰ میں صرف مرتبین نے اس امر کو ملحوظ رکھا کہ سہل رقعات حصۂ اول میں جمع کئے اور مشکل رقعات حصۂ دوم میں شامل کر دئے لیکن جب ۱۹۲۲ء میں مجیدی پریس کان پور کے کارپرداز ان نے اردوئے معلیٰ کی طباعت کا اہتمام کیا تو مولوی محمد منیر صاحب نے، دونوں حصوں میں ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے، سب کو یکجا کر دیا، لیکن بلحاظ تاریخ ترتیب نہ دیا۔ اردوئے معلیٰ لاہور میں وہی قدیم ترتیب قائم رہی۔ البتہ شیر محمد صاحب سرخوش نے مولانا حسرت موہانی کے رسالہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ میں مطبوعہ خطوط بنام قدر بلگرامی و لطیف احمد بلگرامی بطور ضمیمہ شامل کر دئے۔

تاریخی اعتبار سے ترتیب دینے کی اوّلیت کا سہرا منشی مہیش پرشاد آنجہانی کے سر ہے جنھوں نے کچھ خطوط تاریخی اعتبار سے ترتیب دے کر "خطوطِ غالب" کے نام سے طبع کرائے۔ مولانا غلام رسول مہر نے جملہ خطوط کو بلحاظ تاریخ "خطوطِ غالب" ہی کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کیا اور لاہور میں طبع کرائے جن میں عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے علاوہ مختلف رسائل میں مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں۔ دو مجموعے مکاتیب غالب از مولانا عرشی، نادرات غالب از آفاق دہلوی بلحاظ تاریخ مرتب کئے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا کوششیں قابلِ تحسین ہیں کیونکہ ان کی بدولت آگے بڑھنے کا راستہ ایک حد تک صاف ہو گیا ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے ترتیب دینے میں جس محنت کی ضرورت تھی اس کے لئے غالباً ان بزرگوں کو فرصت نہ مل سکی اور ترتیب و صحت تاریخ میں تا حال غلطیاں موجود ہیں۔ متن میں الفاظ کی غلطیاں الگ پائی جاتی ہیں۔ اگر تاریخی اعتبار سے صحیح طور پر مرتب کر دیا جائے تو بہت سے واقعات پر کما حقہٗ روشنی پڑ جائے۔ بالخصوص ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور جن کو غالب نے اپنے خطوں میں بیان کیا ہے ایک ترتیبِ تسلسل کے تحت ہمارے سامنے آ جائیں۔ (خواجہ حسن نظامی نے اسی قسم کی کوشش کر کے "غالب کا روزنامچہ" مرتب کیا تھا لیکن چونکہ عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں خطوط کی ترتیب درست نہ تھی اس لئے اس میں بھی یہ خامی باقی رہی اور واقعاتی تسلسل قائم نہ ہو سکا۔)

غالب کے جملہ خطوط پر اگر نظر ڈالی جائے تو بلحاظ تاریخ وہ دو نوعیت کے ہیں

(۱) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت ہے :-

(ا) صحت تاریخ کا قرینہ موجود ہے (ب) صحت تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

(۲) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت نہیں ہے :-

(ا) تعیّن تاریخ کا قرینہ موجود ہے (ب) تعیّن تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

آج "خطوطِ غالب" کے پہلے مکتوب الیہ امین الدین خاں کے نام تھے خطوط ہیں ان پر بطور مثال روشنی ڈالی جاتی ہے۔ خطوطِ غالب اردو معلیٰ میں ان کے نام صرف چھ خط ہیں اور دو خط رسالہ 'نقوش' کے 'مکاتیب نمبر' میں شائع ہوئے ہیں گویا مجموعی تعداد آٹھ ہے۔ اردوئے معلیٰ کانپور (۱۹۲۲ء) میں یہ خطوط از صفحہ ۲۹۳ تا صفحہ ۲۹۶ اور اردوئے معلیٰ لاہور (۱۹۳۰ء) میں از صفحہ ۲۸۶ تا صفحہ ۲۹۰ بلحاظ ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں پہلے اور آٹھویں خط پر کوئی تاریخ نہیں۔ چھٹے خط کی تاریخ بغیر سن کے ہے لیکن ان تینوں میں تعیّن تاریخ و سن کے قرائن موجود ہیں۔

خطوطِ غالب میں پہلا خط " بھائی صاحب ساٹھ برس سے الخ" ہے۔ اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن تعیّن تاریخ کا قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کا قریبی زمانۂ تحریر کیا ہے ؟ خط مذکور میں غالب نے اپنی ایک تمنا لکھی ہے :-

> میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان سبکیوں کے واسطے تمہارا دعاگو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں (امین الدین و ضیاء الدین) کے سامنے میں مرجھاؤں تاکہ اس قلق کو اگر روٹی نہ دو گے تو جینے دو گے۔ اور اگر جینے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے میری بلا سے، میں تو موافق اپنے تصوّر کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ گھلوں گا۔"

غالب اس زمانے میں تاہل کی زندگی سے بیزار تھے اور وہ تجرّد کی زندگی گزارنا چاہتے تھے ان کا ارادہ کسی ریاست میں چلے جانے کا تھا۔ حکیم محمود خاں کے پاس غالب کا قیام تھا وہ ریاست پٹیالہ میں راجہ کے طبیب خاص تھے ان کی تحریک پر یا خود ہی غالب پٹیالہ جانے کے خواہاں تھے لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، کیونکہ اس ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے متعلقین کی کفالت کرنے کی کسی میں بھی استطاعت نہ تھی جب حکیم صاحب ۲۶ - مارچ ۱۸۵۸ء کو پٹیالہ چلے گئے تو حکیم غلام نجف کے پٹیالہ نہ جانے کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں :-

> " بھائی میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک کو تنہائی سے نفور رہے ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی اگرچہ مجھکو دولت تنہائی میسر آ جاتی، لیکن اس انتہائی چند روزہ اور تقریب تکلف کی کیا خوشی۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتکڑیاں بھی پڑ گئیں[1]

خط مذکورہ بالا یکم اپریل ۱۸۵۸ء کے بعد کا ہے۔ کیونکہ یکم اپریل کے خط میں حکیم احسن اللہ خاں کی نظر بندی کا ختم ہونا اور ان سے ملاقات کا نہ ہونا تحریر ہے اور اس میں ان سے بعد نظر بندی ملاقات کا ہونا مذکور ہے اس لئے حکیم غلام نجف کے نام کا یہ خط وسط اپریل کا ہے۔

---

[1] طوق سے مراد بیڑی اور ہتکڑیوں سے مراد شیرانِ عارف (حسین علی و باقر علی) ہیں جن کو غالب نے پالا تھا۔ خط ۱۷ خطوط غالب صفحہ ۳۷ (لاہور)

[2] یہاں نہ کے بعد 'صرف' ہونا چاہیئے جو نہ معلوم کس وجہ سے تمام نسخوں میں نہیں ہے۔

خط بالا سے اس کا اندازہ ہوا کہ غالب تبادل کی زندگی سے بیزار تھے بالخصوص غدر کے زمانہ میں جبکہ پنشن بھی بند ہوگئی تھی۔ چنانچہ دستنبو کے خاتمے میں لکھتے ہیں:۔

"پنشن سابقہ اگر مل جائے تو بھی کچھ نہیں ہوگا اور اگر نہ ملے تو حال تباہ ہوگا — یہاں کی آب وہوا مجھ کو راس نہیں۔ کسی دوسری بستی میں رہائش اختیار کرنی چاہیئے"[1]

یہ عبارت ۳۱-جولائی ۱۸۵۸ء کی ہے غرض وہ دہلی چھوڑ کر جانا چاہتے تھے صرف مسئلہ اہل خانہ کی کفالت کا تھا۔ دہلی میں لے دے کر ان کے اعزا میں خاندان لوہارو تھا لیکن اس خاندان کے سربراہ غدر کے ملزمین میں شامل تھے، بے گناہ ثابت ہو چکے تھے لیکن پھر بھی نظر بند تھے اور جاگیر سے دور۔ ایسی حالت میں اہل وعیال کو کس پر چھوڑ تے ہنڈ پڑیالے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ امین الدین خاں وضیاء الدین خاں کو ریاست پرجانے کی اجازت اگست میں ملی تھی کیونکہ ۱۲-اپریل ۱۸۵۸ء کو شہاب الدین خاں کو لکھتا ہے:۔

میرا بی تو یہ چاہتا تھا کہ اب جو خط تمہیں لکھوں، اس کے آغاز میں یہ لکھوں کہ مبارک ہو تمہارے اب وعم (امین الدین خاں رضیاء الدین خاں) مع الخیر جاگیر کو روانہ ہوگئے"[2]

اور جب دستنبو ختم کر کے چھپنے بھیج دی اور مجروح کو اطلاع دی کہ تحریر ختم کر دی۔ اس کا آخری حصہ نقل کر کے بھیجا تو مجروح نے بادشاہ دہلی اور امین الدین خاں وضیاء الدین کے حالات کے اندراج کے متعلق معلوم کیا تو جواب میں لکھا:۔

"امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا؟ ان کو جاگیر اگست میں

---

[1] ۔ تعجب ہے غالب رہائش کو صحیح قرار دیتے تھے ۔ ع-م

[2] ۔ کلیات نثر ص ۶۱۰ مطبوعہ ۱۸۸۸ء

[3] ۔ خط ۳۳ خطوط غالب (لاہور) ص ۱۰۷

ملی، بادشاہ اکتوبر میں گئے"[1]

اگست میں جاگیر ملی تو امین الدین خاں وہاں گئے[2] ان کے فرزند علاؤ الدین خاں اور بھگر متعلقین وہیں تھے۔ ضیاء الدین خاں اپنی والدہ کو لینے لوہارو گئے ہیں۔ اس خط میں غالب نے اس کی اطلاع بھی دی ہے اور آنے کے لئے بھی لکھا ہے:۔

"جناب والدہ ماجدہ تمہاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاء الدین خاں اسی واسطے وہاں پہنچے ہیں سنو لہذا تبدیل آب وہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں کثرت الماء، صحبت احباء۔ تنہائی سے نہ ملول رہو گے، حرف وحکایت میں مشغول رہو گے۔ آؤ آؤ، شتاب آؤ، بھائی۔"

جب یہ سب دہلی آگئے تو غالب نے پھر اس مسئلے کو سب کے سامنے پیش کیا ان کے منظور کر لینے کے بعد علاء الدین خاں علائی کو لکھا:۔

"اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدۂ ماجدہ اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کریہ تمہاری قوم کے ہیں مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے، اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا، چل دیا"[3]

یہ خط بنام علائی ۲۳-اگست ۱۸۵۸ء کا ہے۔ ضیاء الدین کی آمد ورفت وقیام لوہارو کا عرصہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ یوم مقرر کیا جا سکتا ہے اس لئے خط زیر بحث بنام امین الدین اگست ۱۸۵۸ء کے عشرۂ ثانی کی ابتدا (۱۱-اگست تا ۱۵-اگست) کا قرار دیا جا سکتا ہے۔

---

[1] ۔ خط ۳۴ خطوط غالب ص ۲۷۰

[2] ۔ خط ۳۳ ص ۵۵ خطوط غالب

یہاں ایک پہلو تشنہ رہ جاتا ہے کہ جب امین الدین خاں کو جاگیر پر جانے کی اجازت اگست میں ملی اور وہ اپنی جاگیر پر ۵ر کے بعد اگست ہی میں گئے، تو اتنی جلدی واپسی کیوں ہوئی۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رہیں تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے - اوّل یہ کہ علاؤ الدین خاں وغیرہ ریاست میں سفید و سیاہ کے مختار تھے لہٰذا امورِ ریاست میں کسی قسم کا خلل نہ تھا اس وجہ سے ریاست کی دیکھ بھال کی طرف سے بے فکری تھی - دوم یہ کہ امین الدین خاں بیمار تھے جیسا کہ زیرِ بحث خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ "سلو بعد تبدیلی آب و ہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں - کثرتِ اطباء، صحبتِ احباء" لہٰذا جلد واپس آجانا کوئی تعجب کی بات اور امر بعید نہیں -

مندرجہ بالا شواہد و قرائن کی روشنی میں یہ خط اگست ۱۸۵۸ء کے عشرۂ ثانی کی ابتدا کا لکھا ہوا ہے -

خطوط ۳۵ تا ۴۵ (خطوط غالب) کی تاریخوں میں جزوی اختلافات ہیں خط ۳۵ کی تاریخ عیسوی خطوط غالب میں ۲۲-جون ۱۸۶۷ء طبع ہوئی ہے لیکن خط میں "یوم الخمیس ۱۷- محرم ۱۲۸۱ھ درج ہے - تاریخ ہجری کی مطابقت تاریخ عیسوی سے کرتے وقت صرف جنتری کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور دن کو نظر انداز کر دیا گیا - یوم الخمیس (جمعرات) کو جون کی ۲۳ واقع ہوتی ہے لہٰذا یوم الخمیس ۱۷ محرم ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۳-جون ۱۸۶۴ء صحیح تاریخ ہے - کیونکہ ہجری مہینہ کی تاریخیں رویتِ ہلال پر مبنی ہوتی ہیں اس لئے غالب کا لکھا ہوا دن درست ہے -

خط ۴۵ کی تاریخ اردوئے معلیٰ کانپور میں جمعہ ۲۲ مئی ۱۸۶۵ء غلط چھپی ہے - چھ اردو کے ہندسوں میں تمیز خطی کی بنا پر عموماً التباس واقع ہو جاتا ہے - ۲۶ر کو ۲۲ر کاتب نے بنا دیا کیونکہ عبارتِ خط میں ۲۵ مئی موجود ہے، نیز جمعہ کو ۲۶ - مئی واقع ہوئی ۲۲ نہیں اس لئے خطوطِ غالب اور اردوئے معلیٰ لاہور میں ۲۶ - مئی ۱۸۶۵ء صحیح تاریخ ہے -

خط ۴۶ کی تاریخ اردوئے معلیٰ کانپور میں چہارشنبہ ۲ر ربیع الاول ۱۲۸۲ھ اور اردوئے معلیٰ لاہور و خطوطِ غالب میں چہارشنبہ ۲ - ربیع الاول ۱۲۸۲ھ طبع ہوئی ہے - خطوط میں ۲۶ - جولائی ۱۸۶۵ء سے مطابقت دکھائی ہے - اردوئے معلیٰ کان پور میں تاریخ غلط ہے کیونکہ یوم جب رواج ایکم ربیع الاوّل لکھا جاتا چاہئے تھا اس کو سہو کاتب خیال کیا جائے اسی طرح خط ۴۸ کی تاریخ بھی اردوئے معلیٰ کانپور میں ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء غلط شائع ہوئی ہے - اردوئے معلیٰ لاہور اور خطوطِ غالب میں ۱۵- نومبر ۱۸۶۶ء صحیح ہے - اس کو بھی سہو کاتب پر محمول کرنا چاہئے -

خط ۵۱ کے آخر میں اردوئے معلیٰ کانپور و لاہور اور خطوطِ غالب میں کوئی تاریخ درج نہیں ہے عبارت خط میں صرف ۲۲ - جون مرقوم ہے - مولانا ہرنے حاشیہ میں لکھا ہے :-

"میرا اندازہ ہے کہ یہ خط ۲۲ جون ۱۸۶۷ء کا ہوگا اس میں امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا سے گفتگو کا مفاد درج کیا ہے - ان کی پیدائش ۱۸۶۱ء میں ہوئی اسی لئے انہیں پانچ چھ برس کا لڑکا بتایا گیا ہے"[1]

مولانا نے اندازہ لگانے میں صرف فرخ مرزا کی عمر کا لحاظ رکھا اور مندرجہ خط کو نظر انداز کر دیا ہے - درحقیقت یہ خط ۱۸۶۵ء کا ہے کیونکہ اسی خط میں گرمی کی شدت کے ساتھ علاء الدین کا مع اہل و عیال دہلی میں مقیم ہونا اور اپنے والد امین الدین خاں سے ناواقفی مذکور ہے - اور یہ امور ۱۸۶۵ء سے متعلق ہیں - شواہد ملاحظہ ہوں :

(۱) غالب کے خط سے مترشح ہے کہ گرمی کی شدت ہے اور علاء الدین خاں مع اہل و عیال دہلی میں مقیم ہیں - چناں چہ غالب گرمی کی شدت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

"خراب فصل سے قطع نظر ایک کودک غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جانسوز نہیں بلکہ دل افروز ہے - پرسوں فرخ مرزا آیا - اسی کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا -"

---

[1] خطوطِ غالب حاشیہ ص ۵۳

علاء الدین خاں لوہارو سے دہلی کب آئے اس کے لئے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ غالب علاء الدین کی آمد کے بے حد منتظر تھے۔ چناں چہ انھیں لکھتے ہیں :-

"رجب بیگ، شبان بیگ، رمضان بیگ یہ نامور جینے ہیں سو خالی گئے۔ شوال بیگ آدمی کا نام نہیں سنا ہاں عیدی بیگ ہو سکتا ہے۔ پس جب عید ہے اور روزِ سعید ہے تو کیا بعید ہے کہ بخلاف مشہور تلاشِ ماضیہ اس مہینے میں تم آ سکو۔" (۲۳-فروری ۱۸۶۵ء)

علاء الدین خاں غالباً اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں دہلی آ گئے، ہیں ان کی آمد کے بعد ۲۶-مئی ۶۹ء کو این الدین خاں کو لکھا ہے :-

"ریگستان کے ملک (لوہارو) سے ایک سردار زادہ کثیر العیال، عسیر الحال، عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے بلی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔"[1]

دہلی میں ان کا قیام آخر جولائی تک یقینی اور ستمبر ۱۸۶۶ء تک ظنی ہے غالب نے غلام غوث خاں بیخبر کو ۷-جولائی ۱۸۶۵ء کے خط میں لکھا :-

"بھائی امین الدین خاں کے اصرار سے حضرو کی غزل پر ایک غزل لکھی ہے۔ علاؤ الدین نے اس کی نقل ان کو بھیج دی ہے۔ میں دیوان پر نہیں چڑھاتا۔ مسودہ بھیجتا ہوں، تقدیم و تاخیر ہندسوں کے مطابق ملحوظ رہے۔ گرمی کی شدت سے حواس بجا نہیں مہذا امراض جسمانی و آلام روحانی۔"[2]

اور ۲۶ جولائی کو امین الدین خاں کو لکھا :

"وکیل حاضر باش دربار اسد اللہی یعنی علائی مولائی نے اپنے مؤکل (امین الدین خاں) کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی اگر پسند آئے تو مطلب کو سمجھائی جائے اور جھنجھوٹی کے اوپنے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔"

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ جون ۱۸۶۵ء میں علاء الدین خاں دہلی میں مقیم تھے۔

(۲) علاء الدین خاں کی اپنے والد امین الدین خاں سے کسی معاملہ میں شکر رنجی ہو گئی تھی۔ غالب نے صلح کرانے میں کوشش کی اور علاء الدین خاں کی خوب وکالت کی ہے۔ خط ۳۵، ۴۷ اور خط زیر بحث میں یہ ذکر موجود ہے۔ خط ۳۵ مورخہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء میں اقتباس بالا کے بعد لکھا ہے :-

"بلی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔ بسبب ضرورت حکام شہر سے مل لیتا ہے باقی گھر کا دروازہ بند کئے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ، غالب علی شاہ درویش کے تکیہ پر آ جاتا ہے۔ اہلِ شہر حیران ہیں کہ کھاتا کہاں سے ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ یہ باپ سے پھر گیا ہے میں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظروں سے گر گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہو غالب علی شاہ کا قول یہ ہے کہ کل کا بھلا ہو۔"

خط ۴۷ مورخہ ۲۶-جولائی ۱۸۶۵ء میں یہ غزل

"میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی" بھیجی ہے اور تایید قلب کی خاطر علائی کا ذکر کیا ہے کہ اس نے لکھوائی ہے اور تمہارے لئے لکھوائی تاکہ علائی کے متعلق یہ احساس پیدا کیا جا سکے کہ وہ تمہارا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ اب خط زیر بحث میں بھی اردو کی غزل فرخ مرزا بچہ ہے اور یہ نفسیاتی بات ہے کہ انسان بچے سے بہت محبت کرتا ہے یا فضولی دادا پوتے کو بہت پیار کرتا ہے۔ میرزا فطرتِ انسانی کے بہت بڑے نباض تھے انھوں نے نفسیاتی ژرف نگاہی سے کام لے کر فرخ مرزا کو بہانہ بنایا۔ اس کی گفتگو پیش کر کے باپ بیٹوں میں صفائی کرانے کی کوشش نہایت ہی عمدہ پیرایہ میں کی ہے۔ خط کا یہ حصہ قابلِ غور ہے :-

---

[1] خط ۴۵ ص ۹۸ ۲۳-فروری ۱۸۶۵ء
[2] خط ۳۵ ص ۹۴ [3] خط ۱۳۵ ص ۳۳۲

"پرسوں فرخ مرزا آیا اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟ کہا جناب عالی، آ کا جان کی تنخواہ آتی ہے میری نہیں آتی۔ میں نے کہا تو واپس جائے تو تنخواہ پائے گا۔ کہا، حضرت میں تو آ کا جان سے روز کہتا ہوں کہ ہمارا دیس چلو، اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے؟ سبحان اللہ بااشت بھرکا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم۔ میں اس خوبیٔ خو اور فرخیٔ سیرت پر اس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔ مصاحب بے بدل ہے تو اس کو بلا کیوں نہیں بھیجتے؟ مگر بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے منتج ہو کہ زین العابدین وحید دہلی اور ان کی اولاد کو کبھی منہ نہ لگایا۔ علاء الدین خاں جیسا ہوش مند و بہہ داں بیٹا۔ فرخ سیر جیسا دانشور، بذلہ سنج اور شیریں سخن پوتا۔ یہ دو عطیۂ عظمیٰ و موہبت کبریٰ ہیں تمہارے واسطے من جانب اللہ۔

اگر دریا فتی برداشت بوسس
وگر غافل شدی افسوس افسوس

آج ۲۲۔ جون کی ہے آفتاب سرطان میں آگیا۔ فعلہ انقلاب مہینے میں دن گھٹنے لگا چاہئے کہ تمہارا خیط و غطب ہر روز کم ہوتا چلے۔"

خط کی عبارت صاف بتا رہی ہے کہ اس خط کا تعلق خط ۳۲ سے ہے۔ رہا فرخ مرزا کی گفتگو کا اندراج اس کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غالب نے نفسیات شناسی سے کام لے کر اس طریقہ خطاب فرزند و کالت کو اختیار کیا ہے۔ تاکہ بچے کی باتوں پر محبت جوش میں آئے اور صلح و صفائی ہو جائے۔ اس وقت فرخ مرزا کی عمر چار سال سے زاید تھی۔ اس عمر کا بچہ اگر ذہین ہو تو اس قسم کی باتیں اس سے کچھ بعید نہیں ہیں۔ باپ بیٹوں میں شکر رنجی باقی رہی۔ آخر کار ستمبر کے مہینہ میں باپ بیٹوں کی صلح ہوئی یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء کو علائی کو صلح کی مبارک باد اس طرح دی ہے:

"شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد
جوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
قدسیاں ہر دعائے تو دادا پدرت
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"[1]

یہ تمام خطوط داخلی تسلسل کے حامل ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ انھیں شواہد کی بنا پر یہ خط میرے نزدیک ۲۲ جون ۱۸۶۵ء کا ہے اور ترتیب میں اس کا چوتھا نمبر ہے۔ ۱۸۶۷ء کا نہیں ہے، کیونکہ اس زمانہ میں علائی دہلی نہ تھے اور غالب سے اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا (ملاحظہ ہو خط ۳۳ بنام سیاح (ص ۴۴۹) مورخہ ۱۱ جون ۱۸۶۷ء، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ غالب ناتوانی پر کیا گزر رہی تھی۔

ان چھ خطوں کے علاوہ دو خط نقوش کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلے خط پر ۳۔ مارچ ۱۸۶۷ء درج ہے اور دوسرے خط پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ ضمناً الدین آرزو نے ۱۸۶۲ء-۱۸۶۴ء زمانۂ تحریر متعین کیا ہے لیکن تعین تاریخ کا کوئی خاص قرینہ نہیں پایا جاتا۔ صرف کلیات نثر کے ذکر کو اساس قرار دے کر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کلیات کے متعلق غالب لکھتے ہیں:-

"بھائی سے دو سوال ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعہ نثر کے خاتمہ کو کیا کروں وہ مبنی تھا اس حقیقت پر کہ نول کشور نواب ضیاء الدین خان سے واسطے اطباع کے لے گیا جب یہ واقع نہ ہوا تو اب اس کو نکال ڈالوں اور اس کی جگہ جو کئی نثریں اور ہیں وہ لکھ دوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ منشی نول کشور آخر نومبر ۱۸۶۳ء کو دہلی پہنچے خط ۳۳ بنام علاء الدین خاں مورخہ ۳۰- دسمبر ۱۸۶۳ء میں ان کی آمد مذکور ہے اور خط ۳۴ مورخہ ۱۳- دسمبر ۱۸۶۳ء میں ان کی روانگی کو چار یا پانچ دن کا عرصہ بتایا ہے گویا وہ سات یا آٹھ دسمبر ۱۸۶۳ء کو دہلی سے لکھنؤ روانہ ہوئے اور کلیات نثر اپنے ہمراہ طباعت کے لئے

---

[1] خط ۴۲ ص ۹۹

ے گئے۔ اس لئے یہ خط ۱۸۶۳ء کا نہیں ہوسکتا۔ اب اگر کلیاتِ نظم کی طباعت کے عرصہ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو غالب کم از کم ایک سال بعد اس کی طباعت سے مایوس ہوئے ہوں گے اس لئے یہ خط ۱۸۶۴ء کے بعد کا ہوسکتا ہے پہلے کا نہیں۔ حالاں کہ کلیاتِ نثر پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ء مطابق رمضان ۱۲۸۴ھ میں شائع ہوا گویا پانچ سال بعد اس کی طباعت مکمل ہوئی۔

کلیاتِ نثر میں ایک خط بنام غلام بابا سورتی شنبہ ہفتم مئی ۱۸۶۴ء کا موجود ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۱۸۶۴ء تک غالب کلیاتِ نثر میں خود اضافہ کرتے رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ کم از کم ۱۸۶۴ء میں طباعت سے نا امید نہیں ہوئے ہوں گے البتہ ۱۸۶۵ء کا کچھ عرصہ گزرنے پر نا امید ہوئے ہوں گے جیسا کہ خط زیرِ بحث سے ظاہر ہے۔ پس یہ خط ۱۸۶۵ء کا ہوسکتا ہے یا اس کے بعد کا قرار دیا جاسکتا ہے۔ ممتاز الدین آرزو کا متبسمہ عرضہ درست نہیں ہے امور مندرجہ بالا کی روشنی میں اب امین الدین کے جملہ خطوط کی تاریخیں اور ترتیب حسب ذیل ہوگی:-

خط ۱ - بھائی صاحب ساٹھ برس سے الخ: ۱۱ تا ۱۵ اگست ۱۸۵۵ء

خط ۲ - الخ مکرم کے خدام الخ، یوم الخمیس ۱۷ محرم ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۳- جون ۱۸۶۴ء

خط ۳ - برادر صاحب جمیل المناقب الخ: جمعہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء

خط ۴ - جمیل المناقب حمیم الاحسان الخ: ۲۲ جون ۱۸۶۵ء

خط ۵ - برادر صاحب جمیل المناقب الخ: چہار شنبہ ۲- ربیع الاول ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء

خط ۶ - بھائی سے دو سوال الخ: ۱۸۶۵ء (مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر)

خط ۷ - بھائی صاحب آج تک الخ: ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء

خط ۸ - اے میری جان کس وقت الخ: ۳- مارچ ۱۸۶۸ء (مطبوعہ نقوش، مکاتیب نمبر)

میرے پیشِ نظر تاریخی ترتیب کا ایک اور پہلو ہے یعنی جملہ خطوط کو بلا لحاظ مکتوب الیہم بلحاظ سنین مرتب کیا جائے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ واقعات میں تسلسل قائم ہو سکتا ہے۔

---

لہ - ذکرِ غالب ص ۱۲۲

---

## تیسرے پلان میں دستکاروں کی تربیت

تیسرے پلان کے پہلے سال میں ملک بھر میں دستکاروں کی تربیت سے متعلق مختلف صنعتی اداروں میں لگ بھگ ۲۲۵۰۰ نشستیں مہیا کی جائیں گی۔ اس طرح کل ملا کر ہر سال ۴۵۰۰۰ دستکار تربیت حاصل کر سکیں گے۔

صرف اکتوبر میں پنجاب، بہار، اتر پردیش، دہلی، ہماچل پردیش اور نئی پورہ کی ریاستوں میں قائم شدہ صنعتی تربیتی اداروں میں مزید ۱۲۰۰ نشستیں مہیا کرنے کی منظوری دی گئی تھی۔

تیسرے پلان میں موجودہ تربیتی اداروں میں توسیع کے ذریعہ اور بہت سے نئے تربیتی یونٹ قائم کر کے لگ بھگ ۵۷۹۰۰ مزید دستکاروں کو تربیت دینے کی تجویز ہے۔ روزگار و تربیت سے متعلقہ مرکزی ڈائریکٹوریٹ جنرل کے پلان کے مطابق یہ نشانہ چاہو پلان کے پہلے تین برسوں میں پورا ہو جائے گا تاکہ پلان کے آخر تک صنعتی تربیتی ادارے ہر سال لگ بھگ ایک لاکھ دستکاروں کو تربیت دینے کے قابل ہو جائیں۔

دوسرے پلان کے خاتمہ پر سالانہ ۴۲۰۰۰ کے قریب دستکاروں کو تربیت دینے کی سہولتیں موجود تھیں۔

حسرت سہروردی

# تامل ادب میں اسلامی عناصر

ہندوستان کا کلچر ایک رنگا رنگ کلچر ہے جس کو مختلف قوموں نے سنوارا ہے۔ لیکن اس رنگا رنگی کے باوجود اس کی روح ایک ہے۔ کثرت میں وحدت جلوہ گر ہے اور یہی اس کی بہت بڑی خوبی ہے۔

اسی طرح یہاں جدید اور قدیم زبانوں کا بھی گویا سنگم ہے۔ یہاں دنیا کی جدید سے جدید زبان بھی پائی جاتی ہے اور قدیم سے قدیم زبان بھی ملتی ہے سنسکرت کی طرح تامل بھی ہندوستان کی قدیم زبان ہے۔ اس کا کلاسیکی ادب بڑا ہی جان دار ہے۔ اس میں چند ایسی کتابیں بھی ہیں جن کی سہرت لافانی ہے۔ "تر وکورل" دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو ۲۰۰۰ سال قبل لکھی گئی۔ اس کے تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

یہ بات مسلّم ہے کہ مسلمان فاتحین سے قبل مسلمان تاجر ہندوستان آئے جنھوں نے اپنے حسنِ خلوص سے مقامی لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ ان مسلمان تاجروں کے کئی خاندان یہیں رچ بس گئے اور یہیں کے ہو رہے سب سے پہلے ان تاجر پیشہ لوگوں نے ملابار اور تامل ناڈ کے ساحل کو اپنایا۔ ملابار میں کوچین اور تامل ناڈ میں کایل پٹنم ان کے مسکن بنے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کا ادب یہاں کی بسنے والی مختلف قوموں کے تنائج فکر کا مرہونِ منّت ہے۔ تامل ادب بھی اس سے کچھ مستثنیٰ نہیں ہے۔ جس طرح مسلمانوں نے دوسری زبانوں کے ادب کو اپنی گراں قدر تخلیقات سے مالا مال کیا۔ تامل ادب کو بھی انھوں نے بہت کچھ دیا ہے خصوصاً تامل کلاسیکی ادب اس حقیقت کا غماز ہے۔

یوں بھی تامل کی مروّجہ تمام اصنافِ ادب میں مسلمان اہلِ قلم کی تخلیقات ملتی ہیں۔ مسلمانوں نے تامل ادب میں جن نئی اصناف کا اضافہ کیا ان میں ممتاز ترین ایجاد "پڑائی پور" رجز نامہ ہے۔ تامل ادب میں مسلمانوں سے پہلے اس صنف کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ تامل ادب کو مسلمانوں کا یہ بہترین تحفہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس صنف کے موجد حسن علی پلوور[1] ہیں۔ ان کی ایک تصنیف ایندرپڑائی پور (پانچ رجز نامے) بہت مشہور ہے۔ اس میں پانچ اسلامی جنگوں جنگِ احد جنگِ بدر، جنگِ جمل، غزوۂ خندق وغیرہ کے حالات اجمالاً منظوم کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۸ء) میں لکھی گئی۔ اسی صنف میں ایک اور تصنیف "ستیات پڑائی پور" حضرت عمرؓ کے زمانے کی ایک جنگ کا منظوم خاکہ ہے۔ اس کے مصنف کنجو مو کو پلوور ہیں یہ ۱۲۱۶ھ (۱۷۹۷ء) میں لکھی گئی۔

متذکرہ بالا دونوں رجز ناموں میں عربی اور فارسی رجز ناموں کا تتبع کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی میں جتنے رجز نامے ملتے ہیں یہیں دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتے۔ چوں کہ یہ مصنف عربی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تامل رجز ناموں میں عربی اور فارسی کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔

---

[1] پلوور۔ تامل زبان میں شاعر کو کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی چند ایسی اصناف کا اضافہ کیا ہے جو عربی اور فارسی سے ماخوذ ہیں۔ مثال کے طور پر (۱) مناجات (۲) قصہ (۳) مقالہ (۴) نامہ وغیرہ ان میں سید محمد عالم کی مناجات مالی گانی[1] علامہ صاحب پلوری کی "یعقوب نبی قصہ" قصہ یعقوب علیہ السلام) سید عبدالقادر بلے کی آئر مقالہ[2] سید عبدالقادر ریکاد کی 'فور نامہ' نمائندہ تصانیف ہیں۔

تامل کلاسیکی ادب میں غزل کا کہیں بھی پتہ نہیں چلتا۔ غزل سے ملتی جلتی صنف کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ اردو فلموں سے متاثر ہو کر جدید تامل شاعروں نے غزل کو اپنانے کی کوشش کی ہے صرف شوقیہ ہی اکثر شعراء کے اظہار خیال کا ذریعہ بنی ہے۔ محمد عرصا حب کی شہرۂ آفاق تصنیف "سیرا پرانم" بھی اسی صنف میں شامل ہے "سیرا پرانم" دو مختلف زبانوں کے دو لفظوں کا مرکب ہے۔ "سیرا" عربی کے لفظ 'سیرت' سے ماخوذ ہے۔ "پرانم" سنسکرت کے پرانی یا پرانم سے ماخوذ ہے۔ عرصا حب سے متعلق تحقیقات جاری ہیں اب تک ان کے حالات پردہ پڑا ہوا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے اجداد جو عرب کے تاجر تھے صوبہ مدراس کے ضلع رامناڈ کے ایک گاؤں "کیلا کرائی" میں آکر بس گئے تھے۔

" سیرا پرانم" تامل زبان کی بہت ہی اہم تصنیف ہے۔ اس میں حضور صلعم کی سیرت کے خد و خال خوبصورت پیرائے میں منظوم

---

[1] مالی گانی تامل زبان میں ہزار یا مالا کو کہتے ہیں۔

[2] آئر مقالہ۔ آئر تامل زبان میں ہزار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو اور فارسی کے برعکس مقالہ کی شکل تامل میں بابل بدل گئی ہے۔ 'آئر مقالہ' میں سوال و جواب کی شکل میں مذہبی مسائل پر ہزار سوال اور ان کے موزوں جوابات موجود ہیں۔

کئے گئے ہیں۔

شعر و سخن میں عرصا حب نے اپنے زمانے کے مشہور ہندو شاعر منو پلور سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

'سیرا پرانم' تامل زبان کے ایک عظیم شاعر کمبن کی ایک لافانی تصنیف "رامایانم" کے طرز پر لکھی گئی ہے کہا جاتا ہے کہ اس تصنیف کے لئے عرصا حب کو شیخ صادق اللہ صاحب نے جو اس دور کے بڑے شیخ مانے جاتے تھے، مواد فراہم کیا تھا۔

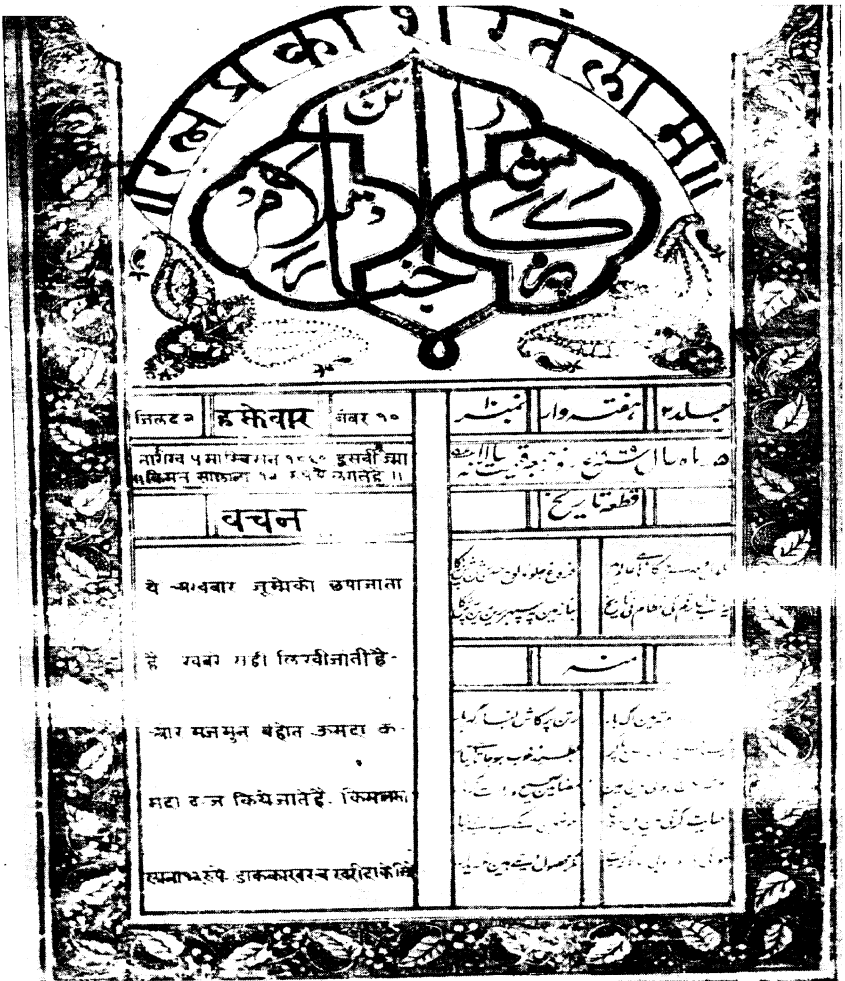
کمبن کی رامایانم اور عرصا حب کی 'سیرا پرانم' میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ کمبن کی اندھی تقلید میں عرصا حب سے وہی غلطی سرزد ہوئی ہے جو کمبن نے کی ہے۔

کمبن اپنی 'رامایانم' میں ایودھیا کے ماحول کو پیش کرنے کی ناکام کوشش میں جنوبی ہند کے ہنر مند راکے ماحول کو پیش کرتے ہیں۔ عرصا حب عرب کے ماحول کو پیش کرنے کے زعم میں اپنے وطن کے ماحول کو پیش کر دیتے ہیں۔

کمبن ایودھیا کے جغرافیہ سے ناواقف تھے اور عرصا حب کو عرب کے جغرافیہ کا علم نہ تھا۔

زبان کے لحاظ سے یہ ادیب اور شاعر سب کے سب یکساں سطح پر نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان بھی وہی ہے جو عوام کے اور ہمعصر شعراء کی ہے۔ ان سب نے تامل کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔

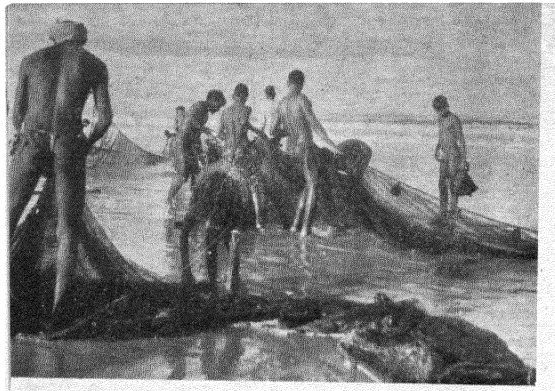
جن شاعروں اور ادیبوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی کئی ایسے ادیب ہیں جو اب تک منصۂ شہود پر نہیں آ سکے۔ تحقیقات جاری ہے شاید بہت جلد اور گراں قدر تصانیف دستیاب ہوں۔




اخبار رتن پرکاش مورخہ ۵ مارچ ۱۸۶۹ء کا پہلا صفحہ۔ اس اخبار کا ایک ایک کالم
اُردو اور ہندی رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں غالب پر پہلا اہم مضمون شائع ہوا

# گوا کی جھلکیاں

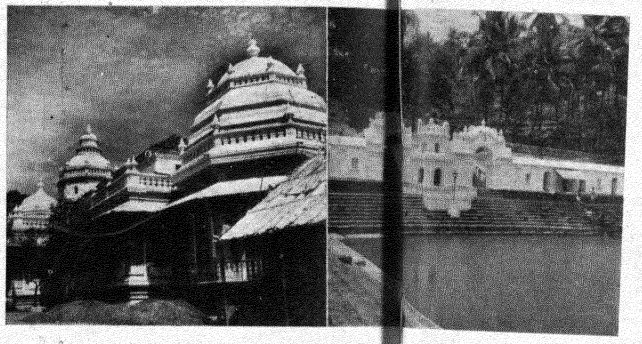
۱۹-دسمبر ۱۹۶۱ء کو گوا پر تقریباً ساڑھے چار سو برس کے پنجے سے آزاد ہو کر بھارت کا ایک حصہ بن گیا۔



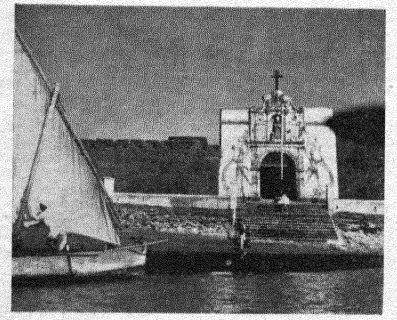
گوا کے مچھیرے



۱۹۵۵ء میں گوا کو آزاد کرانے کے لئے ستیہ گرہی گوا میں داخل ہوئے تھے۔ گاؤں والے اُن کا استقبال کر رہے ہیں۔



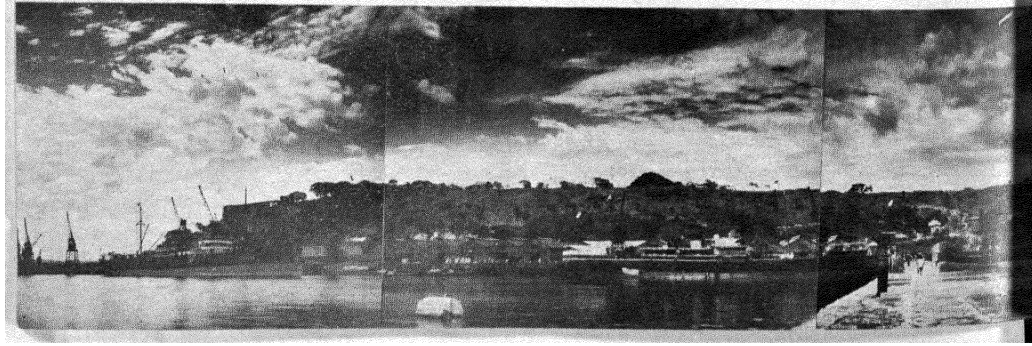
گوا کے مندر



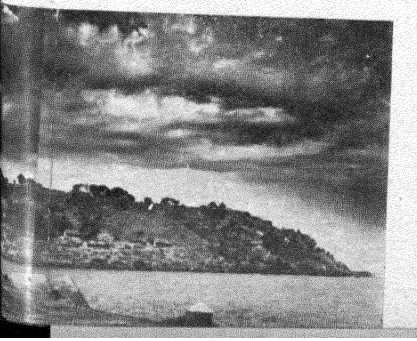
دمن کا قلعہ

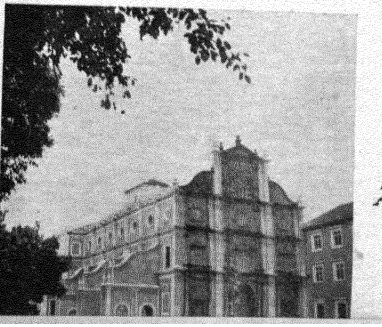


گوا کا ایک لوک ناچ

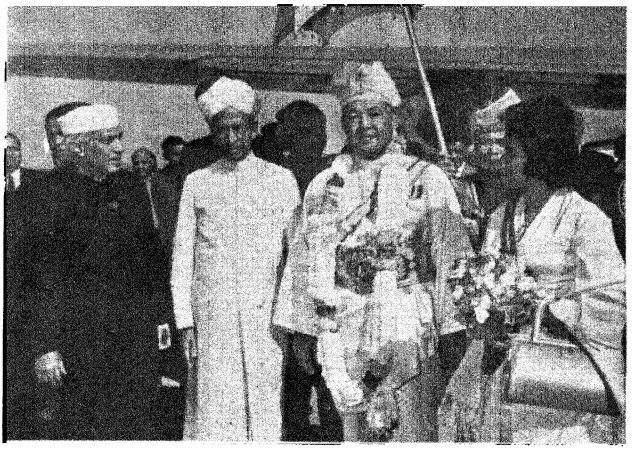


بندرگاہ مارماگوا کا منظر





سینٹ فرانسس زیویئر کا مقبرہ



ملایا کے حکمران اعلیٰ اور ان کی ملکہ، جو حال ہی میں ہندوستان کے دورے پر آئے



روس کے صدر مسٹر برژنیف اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے۔ استقبال کرنے

محمد عتیق صدیقی

# غالب پر پہلا اہم مضمون

غالب کی وفات کے بیس دن بعد 'رتن پرکاش' (رتلام) کی اشاعت مورخہ ۵-مارچ ۱۸۶۹ء میں نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ تخلص بہ غالب' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جو کئی اعتبار سے اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ غالب کی زندگی میں شعراء کے جو تذکرے لکھے گئے، ان سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو 'رتن پرکاش' کے اس مضمون کو 'غالب پر پہلا مضمون' بھی ہم قرار دے سکتے ہیں۔

'احوال غالب' (مرتبہ مختار الدین احمد) میں سید مسعود حسن صاحب رضوی نے ایک مختصر سا مضمون 'ذخیرہ بالگوبند' سے اخذ کر کے شامل کیا تھا اور اسی کو غالب پر پہلا مضمون قرار دیا تھا۔ 'ذخیرہ بالگوبند' آگرے کا ایک ماہوار رسالہ تھا اور یہ مضمون مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعت کی صحیح تاریخ کا تعین اب تک نہ ممکن ہے ممکن ہے کہ اوایل مارچ میں شائع ہوا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اواخر مارچ میں شائع ہوا ہو۔ مارچ کے شروع میں اس کے شائع ہونے کا امکان کم ہے۔ 'رتن پرکاش' ایک ہفتے وار اخبار تھا اور زیر بحث مضمون ۵-مارچ ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہی مضمون پہلے شائع ہوا ہو۔ "ذخیرہ بالگوبند" اور "رتن پرکاش" کے مضامین کی تقدیم و تاخیر کو پس پشت ڈال کر ان تمام تذکروں پر، جو غالب کی زندگی میں مرتب کیے گئے تھے اور ان دونوں مضامین پر، جو ان کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے تھے، اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ 'رتن پرکاش' کا مضمون ہر اعتبار سے سب سے اہم اور سب سے ممتاز ہے۔

یہ مضمون 'رتن پرکاش' کے ایڈیٹر محمد حسین خاں نے لکھا تھا۔ انھوں نے غالب سے اپنی ذاتی واقفیت کا ادعا نہیں کیا ہے لیکن غالب کے حالات اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے وہ یقیناً باخبر تھے۔ غالب کی فارسی کی نظم و نثر کی اہمیت اور ان کی اردو شاعری کی قدر و منزلت سے بھی محمد حسین خاں کو کلی واقفیت تھی۔ ان کی باخ نظری کا واضح اور ناقابلِ تردید ثبوت ہم کو اس جگہ ملتا ہے، جہاں انھوں نے غالب کے "دیوانِ ریختہ" کے مستقبل سے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے پُر مہم الفاظ میں لکھا تھا کہ:

> "بعضے اہلِ قیاس کے نزدیک مرزا غالب ایک دیوان ریختہ کے زور سے اردو زبان پر حکم نہیں چلا سکتے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ چالیس پچاس برس بعد . . . . وہ لوگ آج مرزا صاحب کو اردو کا حاکم نہیں سمجھتے، ان ہی کی اولاد بے شک و شبہ تسلیم کرے گی کہ زبانِ ریختہ پر مرزا صاحب کے کتنے احسان ہیں اور خیال کی گنجائش اردو میں کس زبردست کلام کے صدقے سے پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی . . ."

(رتن پرکاش جلد ۲، نمبر ۱۰، مورخہ ۵-مارچ ۱۸۶۹ء)

جس مضمون کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے، اس کو نقل کرنے سے پہلے 'رتن پرکاش' کا اجمالی ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ 'رتن پرکاش'

رتلام کا ایک ہفتہ وار "دو بھاشائی" اخبار تھا، جس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی تھی۔ اور ہندی رسم الخط کے مطابق اخبار بائیں طرف سے شروع ہوتا تھا یعنی اردو کے مطابق اخبار کا جو آخری صفحہ ہونا چاہیئے تھا، وہ اخبار کا پہلا صفحہ ہوتا تھا۔ بالعموم ایک ہی خبر دونوں زبانوں میں لکھی جاتی تھیں، لیکن کچھ ایسے مضامین بھی ہوتے تھے جو صرف اردو میں یا صرف ہندی میں لکھے جاتے تھے۔ غالب سے متعلق مضمون بھی صرف اردو ہی میں درج کیا گیا تھا۔ اس کے برابر کے کالم میں ہندی کا ایک دوسرا مضمون ہم کو ملتا ہے۔

یہ اخبار "مطبع رتلام" میں مولوی محمد حسین خاں کے اہتمام سے چھپ کر شایع ہوتا تھا۔ محمد حسین خاں کے حالات کا ہم کو علم نہیں ہے۔ "رتن پرکاش" کے ایک شمارے میں "ریاست رتلام" کے عنوان سے ریاست کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

"اس نیاز مند کو ابتدائے سن تمیز سے اتفاق سیر و سیاحت کا بہت رہا۔ اکثر بلاد نامی گرامی ہندوستان میں آب و دانہ کی کشش سے اتفاق بود و باش کا رہا۔ ہر ہر جگہ کی وضع اور رسم و رہ دیکھنے بھالنے کی کمال خواہش رہی۔ اب سنہ پانچ چھ برس سے ملک دکن میں آ پڑا ہوں۔ یہاں اکثر ریاستوں میں نوکری کی۔ کچھ زمانہ حیدرآباد دکن میں وقت کٹا۔ تھوڑے دن بھوپال کی گلیوں کی خاک چھانی تین برس کے قریب اندور کے مدرسے میں طالب علموں کا یہاں مٹھ بنا رہا۔ آٹھ مہینے کے عرصہ سے حسب تحریک جناب پنڈت پران کشن صاحب ناظم عدالت رتلام اور حسب طلب جناب میر شہامت علی خاں صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ ریاست رتلام کے یہاں آ پڑا۔ جناب ممدوح نے کمال قدر شناسی اور ذرہ نوازی سے مجھ کو مطبع رتن کا پریس رتلام کا اہتمام سپرد کیا....."

(رتن پرکاش۔ جلد ۲ نمبر ۲۰
مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۶۹ء)

## نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ متخلص بہ غالب

اکمل الاخبار سے معلوم ہوا کہ جناب مرزا نوشہ صاحب غالب تخلص نے پانزدھم فروری ۱۸۶۹ء کو دوپہر ڈھلے وفات پائی اور ہندوستان کے حکیمانہ شاعروں میں سب سے روشن چراغ گل ہو گیا۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس زبردست صاحب قسم کی سوانحہ (گلگرا) عمری سے ہم کو تفصیل وار واقفیت نہیں اور نہ اکمل الاخبار سے کچھ مدد ملی۔ گو اوس جانب سے اس قسم کی توقع رکھنی بہت معقول اور واجب نظر آتی ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت کی اصل خاندان جمشید سے تھی۔ گو فی الحال تو فقط توران کے رئیس زادوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ یتیغ زنی ہمیشہ آپ کے بزرگوں میں ذریعۂ نام آوری رہی چنانچہ حضرت کے والد ماجد مرحوم کارزار میں کام آئے اور فرزند دلبند کم سنی کی وجہ سے باپ کے جیتے جی تو خدمت پدری کی سعادت سے محروم رہا مگر یتیمی کی حالت میں فرزانگی سے ایک مشہور قصیدہ میں فنا کی صورت دکھلا کر باپ کے نام کو بقا دے گیا۔

قولہ

زاں پس کہ گشت گوہر من در جہاں یتیم — زاں پس کہ کشتہ شد پدر من بکارزار
در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور — زیں بیش طارم و دیریں وظیفہ خوار
بایدشنید راز ثناخوانِ بارگاہ — بایدشنفت قصہ زپیرانِ آں دیار
کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرورنیست — در خاک راج گڑہ پدرم را بدہ مزار

الغرض باپ کے پسپہدی نے مرزا صاحب کو پانچ برس کی عمر میں یتیم اور پنشن دار بنا دیا۔

آگرہ آپ کا مولد ہے اور دلی مسکن دل پسند۔ تعلیم کا انتظام مختلف ادیبوں کے سپرد رہا۔ مگر حضرت کے نفس ناطقہ نے ایک پارسی نامی شت ہرمز کے نعتش کو بالتخصیص قبول فرمایا۔ چنانچہ آپ کے کلام میں جا بجا ابطبیحات کے اشارات جا بجا نظر آتے ہیں یہ سب اوسی زردشتی فرزانہ کی صحبت کا نتیجہ ہے، گو مادہ تو پہلے سے موجود تھا۔

انگریزی سرکار کے انتظام نے پیہیدی کو ہندوستان والوں کے لئے بے فیض اور بیکار کر دیا تھا - تو رانی پہلوانوں کے وارث نے زمانہ کی ضرورت سے تیغ کو میان اور علم کو قلم کیا - پٹان چہ پیشہ 'مورد تی کی مفارقت کا رنج ایک داد طلب رباعی کی صورت میں اس طرح ادا ہوا ہے

قولہ

غالب بہگر زودہ ٔ نزاد شم — زاں رو بصفائی دم تیغ است دم
چوں ُ فت پہیدی زدم چنگ پشر — شد قرشکستۂ نیسا گان قلم

پھر حضرت نے اگرچہ سے دتی کو ہجرت کی اور وہاں کے خوش باشی پر لیے غش ہوئے کہ پاہر کی بڑی بڑی ریاستوں میں بیش قرار تنخواہوں پر بھی دلی سے دُور رہنا گوارا نہ کیا بلکہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب سب دتی والے شہر سے نکل جائے تو حضرت اوس سرزمین کی مٹی کے اشتیاق میں ہیں کے وہیں اڑے رہے ، اور اس طوفان بے تمیزی میں کسی طرح کا ضرر آپ کے جسم اطہر کو نہ پہونچا -

پنشن کی آمدنی ضروری خرچ کو بھی کافی نہ ہو سکتی تھی کہ اوس میں بھی لوگوں نے رخنہ ڈالا اور خیالی شاعر کو چارنا چار علمی دنیا میں اوترنا پڑا مقدمہ بڑھا اور حضرت داد خواہ کی حیثیت سے دتی چھوڑ کر گورنر جنرل بہادر کے پاس پہونچے اور اوس شہر کرامت پہر کی مفارقت کا درد شاہ اودھ کے حضور میں اس طرح ادا کیا -

قولہ

چہرہ افروزہ بگرد و مژہ آغشتہ بخوں — خود گواہم کہ ز دلی بحر عنوان رفتم
ہم جگر تفتہ ز کیں خواہی اغیار شدم — ہم دل آزردہ ز بیہودہ خویشاں رفتم
اضطرار آئینہ پرداز جلاے وطنی است — نہ بدل رفتم ازاں بلکہ بدل از جاں رفتم

کلکتہ میں بعض اداناشناسوں نے حضرت کو ناحق دتی کیا - آپ مقدمہ لڑانے گئے تھے کہ پوربی ان سے لڑ مرے - گویا دتی کا سخنور ہونا بھی مدت سے جرم میں داخل تھا گو بمو جب ہمیشہ محمود ہے - حضرت نے فضلائے کلکتہ کے اعتراض کا جواب ایک مثنوی باد مخالف نام کی صورت میں پہر سوا پہر میں لکھ کر بھیج دیا اور اوس واجبی غصہ کی حالت میں دتی کی راست بازی اور سلامت روی کا لحاظ یہاں تک رہا کہ اوسی مثنوی میں ایک زحمت رسیدہ شریف کی صورت سے فرماتے ہیں

قولہ

نہ زآمد پرسشن بیاں ترسم — من و ایمان من کجاں ترسم
کہ پس از من بہ سا ہیا ئی دراز — بزبان ماند ایں حکایت باز
کہ سیفجے رسیدہ بود ایں جا — چند روز آرمیدہ بود ایں جا
با بزرگان ستیزہ پیش گرفت — زحمت داد و راہ خویش گرفت
ہم سیفہا نہ گفتگوے داشت — ہم خرابا تیا نہ ہوئے داشت
برگ و نیا نہ سازو نیش بود — ننگ دلی و سرزنیش بود
آہ زاں دم کہ بعد رفتن من — خون دہلی بود بگردن من

پرچ کہنا تلوار مارنے کے برابر ہو گیا - حوالی موالیوں نے مقدمہ بگاڑ دیا اور دتی کی عزت کا حامی خالی ہاتھ دتی کو پھرا - طرح طرح کی گردش دیکھی - پھر گورنر جنرل بہادر نے خاص دتی میں سات پارچہ کا خلعت دیا اور خاتم السلاطین مغلیہ نے تاریخ نویسی کا منصب عطا کیا اور میاں ذوقی کی وفات کے بعد اپنا استاد بنا لیا - ۱۸۵۷ء کے غدر بھر آپ دتی میں رہے اور اپنے خانگی روزنامچہ سے ایک کتاب لکھتے رہے ، جو اب دستنبو کے نام سے مشہور ہے - فساد مٹنے کے بعد تھوڑے سے دن کے لئے رام پور کو تشریف لے گئے تھے ، مگر دل نہ لگا اور والیٔ رام پور نے محبت اور قدردانی کی راہ سے کچھ وظیفہ دتی ہی میں مقرر کر دیا ہشتم رجب ۱۲۱۴ ہجری آپ کی سال گرہ کا روز تھا اور پانزدہم فروری ۱۸۶۹ء روز وفات ہو گیا - عمر قریب اکہتر برس کے ہوئی اور نزع کی حالت میں بھی حکیمانہ استقلال قائم رہا - پٹان چہ آٹھ روز پہلے کھانا پینا سب چھوڑ دیا کہ روح بہت سہولیت اور اطمینان کے ساتھ علیحدہ ہو جائے - بہت سی کتابیں آپ سے یادگار ہیں - دقیقہ شناسان سخن کے حسن قبح پر رائے لگایا کریں - لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت اپنے زمانہ کے بعد پیدا ہوئے تھے اور اسی وجہ سے دتی ہو کر فرماتے تھے -

قولہ

ہر چہ با شوق طلایم نہ فتد مرگ دلست — ہر چہ بر طبع گرانبار نہ بود جان فرساست
خانہ از سیل بفیتد بود اربیں بہا — آتش از آب ببرد خود اگر آب بقاست

اکبر ثانی کی بزم کے قابل تھے - اکبر ثانی کے عہد میں دنیا کو دیکھا - نام جوئی کا شوق بے حد تھا ، مگر میداں بہت ہی تنگ اور نئی قطع کا

نظر آیا۔ اگر آدمی کا کلام عموماً دل کا مترجم قرار دیا جائے تو مرزا غالب کے عالی حوصلہ ہونے میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں۔ انسان کی عظمت کا خیال ہمیشہ پیشِ نظر رہتا تھا، چنانچہ ایک جگہ شاہنشاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں

قولہ

بچشمِ کم منگر گرچہ خاکِ راہ توام — کہ آبروے دیارم دریں خلافتگاہ
کمال ہیں کہ بدیں فتنہ ہائے جاں فرسا — ہنوز نگرکہ بدیں فتنہ ہائے طاقت کاہ
مربّیِ سخنِ من بہ پایہ داری فکر — زنطقِ من بودش عیشہا سے خاطرخواہ
باخذِ فیض رسیدہ فزودنم از استغنا — کہ بودہ ام قدرے دیرتر بداں دلگاہ
نزول من بہ جہان لبدِ یگزار و دوست — ظہورِ سعدی و خسرو پیشش سعد و ہنجاہ
سخن زنکتہ سرایانِ اگر بمی چہ کنی — چو من بخوبی عہدِ توام زخویش گواہ
کنوں تو شاہی و من مدحِ گو تواں تعمال — گزشت دورِ نظیری و عہدِ اکبرشاہ

جو صاحب غالب کے کلام سے مرزا کے سینہ کا میزانِ دل دریافت کر سکے ہیں وہ خود دیکھ لیں گے کہ جو صلہ کس پایہ پر تھا اور حسرت کس مقدار پر۔ آپ کا دیوان جو مطبع اودھ اخبار میں چھپا ہے ہر شخص خرید سکتا ہے اس کو دیباچہ حضرت کے نعتِ ناطقہ کی کیفیت بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ کس حسرت و درد سے کہتے ہیں:

قولہ

بارِ خدایا! دردِ ناروائی کا لا دل را ان چناں فزوں نہ گرفتہ کہ تن بہ زبونی در نہ دہم و بدیں آرزو منت بر خویشتنی نہ نہم کہ یارب پس از من چو من بگو سراپا گفتار گردیدۂ بیا فریبِ مآوارسد کہ دیوار کاخ والاے سخن در چہ پایہ بنداست و سرشتہ کمندِ خیالم دراں فراز مکان بگذاے و زدہ بند

شعر

ذوقیست ہمدمی بہ نخواں بگذرم شرک — خارِ دہست بہ پاے عزیزاں خلیدہ باد

آپ کی رزم کا قیاس تو صرف اوس استطلال سے ہو سکتا ہے کہ جو ایام قدیمی آپ کی جانب سے ظہور میں آیا۔ لیکن آپ کی بزم سب دلی والے جانتے ہیں۔ یگانہ ظرافت شاعرانہ نمک کے ساتھ آپ پر ختم تھی اور رمز شناس نقد ہیں کہ حضرت ہر طرح سے دربارِ ہند کے قابل ہوتے بر شرطے کہ ہندوستان میں شخصی حکومت رہتی اور انگریزی زبان ذریعۂ کاروبار قرار نہ پاتی۔ غالب نہ کو راعرفی تھا نہ پورا فیضی۔ مگر جو عرفی اور فیضی کو دو جان اور ایک قالب کی صورت میں دیکھنا ہو تو مرزا نوشہ صاحب کا کلام فی الجملہ عکسی تصویر کا کام دے سکتا ہے۔ اخلاق میں تو اضع شریفوں کی خودداری کے ساتھ تھی اور نام جوئی کا شوق امیرانہ شان کا پابند۔ نہ عوام کی طرف آپ کا خطاب تھا اور نہ عوام آپ کے کلام سے بہت حاظ یا بہت سا فائدہ اوٹھا سکتے ہیں۔ جس شخص کو الفاظ کی شوخی کا اتفاق صحیح کی نزاکت کے ساتھ دل نشین معلوم ہو اوس کے واسطے حضرت کے کلام میں دل لگی کی دل لگی ہے اور فائدے کا فائدہ۔ آپ کی طبیعت کا میلان اون جھوٹے تکلفات کی جانب نہ تھا جن کی ظاہری جھلک سے جھوٹی امت والے اصل صورت کے عیب چھپایا چاہتے ہیں اور ظاہر بینوں کو دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔ جن سادہ صورتیانہ پوشاک میں غضب کر جاتا ہے گنوار دان جھوٹے کناری گوٹہ سے رہے ہے صورت بھی لگاڑ کریں۔ قولہ۔ نہ ترانہ صرف آشفتہ فہم براے اسرت و نہ زمزمۂ سلب و ایجاب یزداں، نہ فون ابراہیم بگیرد ان است و نہ نقشِ قاموسِ پرو دوش، نہ آبلہ پاے جادہ صنایع و نہ گوہر آماے رشتۂ ابداع۔ کباب گرمی آتش بے دود پارسیم و خراب تلخیِ پُرزورِ معنی آتش کدۂ تا دیانِ عجم را سمندرم۔ سوزِ من ہم از من پرس و گلزار نخل بندانِ پارس را بلبلم شورِ من ہم از من جوی فقط

جب آپ کا مذاق اس قسم کا نیرا تو ظاہر ہے کہ عوام آپ سے کیوں کر خوش ہوں اور آپ عوام میں کس طرح راضی رہیں۔ نہ پائے رفتن و نہ جاے ماندن کا نقشۂ آ جا۔ قولہ۔ سبزہ و ماندۂ ابراست و گل فشاندہ باد۔ چمین و دستہ بستن کمینہ صنعت است دیارانِ پیشینہ در مذاقِ آری ہیکل را نشاید نہ زیبت۔ نعتی در شیرازہ کاشتن است، و زبان دریا نہ در دون۔ و گر گفتن و ہم از خود پایہ برگرفتن شگرفِ حالت است۔ و ما اندرین ہنگامہ ایم، ایمنی از ذوقی تواں مرد

شعر

در تہ ہر حرف غالب چیدہ ام صد نکتہ — تا ز دیوانم کہ سرتاسر سخن خواہد شدن

اگرچہ میرکا اوجڑا دیار حدت سے اوجڑا دیار ہے لیکن اس گئے گزرے وقت میں بھی دس پانچ زبردست شخص ایسے موجود تھے کہ ایرانیوں نے ان کے سکّہ کو مانا۔ چنانچہ ایک مرتبہ دربارِ ایران کا ایک امیر دلّی میں آیا اور شاہ کے کلاہِ ایران یعنی فتح علی شاہ قزلباش کی غزل ایک مجلس میں قزلباش پڑھی اور کہنے لگا کہ ایران کے شاعروں نے بادشاہ کی غزل پر غزل نہ لکھی۔ زمین مشکل ہے اور فقط قافیہ بندی معنی کی خوبی کے بغیر بے معنی اور اہل ولایت کے مذاق کے خلاف۔ مرزا غالب اور مولانا صہبائی وغیرہ نے فوراً فتح علی شاہ قزلباش کی غزل کا جواب لکھا اور مرزا نوشہ صاحب نے اوسی جواب میں ایرانی کنایہ کا جواب کنایہ میں دیا۔

اے کہ رانی سخن از نکتہ سرایانِ عجم — برچہ مامنتِ لبیار تہی از کرم شان
ہند را خوش نفساند سخنور کہ بود — یا دور خلوتِ شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیّر و صہبای و علوی اس گہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ دل گرچہ نیرزد بہ شمار — ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شان

ہر چند بعضے اہلِ قیاس کے نزدیک مرزا غالب ایک دیوانِ ریختہ کے زور سے اردو زبان پر حکم نہیں کر سکتے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ جب چالیس پچاس برس بعد ہم عصری کا حسد اور تعصب اپنے آپ غارت ہو جائے گا اور اردو جو ابھی حرف لولی ہے، زبان کا منصب حاصل کر لے گی، تو وہ لوگ جو آج مرزا صاحب کو اردو کا حاکم نہیں سمجھتے انہی کی اولاد بے شک و شبہ تسلیم کرے گی کہ زبان ریختہ پر مرزا صاحب کے کتنے احسان ہیں اور خیال کی گجائش اردو میں کس زبردست کلام کے صدقہ سے پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی۔ جن لوگوں کو مرزا صاحب کی اردو میں تامل ہے وہ خوب یاد رکھیں کہ زبان داں کے مذاق کی خصوصیت اور بیگانہ کی نادانی میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بہادر شاہ کا زمانہ دلّی میں عجیب زمانہ ہو گیا ہے۔ سلطنت کی رزم باقی نہ رہی تھی، مگر جن لوگوں سے سلطنت کی بزم کو رونق ہوتی وہ سب کے سب موجود تھے جیسے ہیندی، آزردہ دہلوی، امجد اللہ خاں علوی، مولانا صہبائی، حکیم مومن خان، شاہ نصیر، میاں ذوق، میر مومن، مولانا فضل حق یہ سب کے سب مرزا غالب کے رقیب اور رفیق تھے۔ اور آخر کار بزم کو درہم برہم کر گئے۔ دلی کے پارسی شاعروں میں مرزا صاحب کو خاتم الشعراء کا لقب اچھی طرح سے عطا ہو سکتا ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ خلفاء میں کوئی خلیفہ ایسا نکلے کہ وہ اپنے نام کو دونی دے اور دُور دُور تک اپنا عمل پھیلائے۔ اگر انگریزی سرکار ہندوستانی زبان میں کارروائی کرنی اور ضرورتِ ملکیہ سے اردو کو بانکا منصب دینا پڑتا تو یہ سب لوگ ایسے تھے کہ اردو بولی کو زبان ریختہ کر دکھاتے اور حضرت ملکہ وکٹوریا کی رعایا کو یہ مصیبت نہ ہوتی کہ ممالک ہند پر تفصیل واحوال انگریزی کی تحصیل کے بغیر معلوم نہ ہو۔

جو کچھ مرزا صاحب کا حال ہم کو معلوم تھا وہ تو ہم نے لکھ دیا یعنی ایک روز پیدا ہوئے اور ایک روز مر گئے مگر آدمی کی سوانح (کذا) عمری کی تحصیل کے لئے طریقۂ علمی کا اظہار ضرور رہے۔ حضرت کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اون حکیموں میں تھے جو دنیا کو عالم خیال قرار دے کر ہمہ اوست کا نقشہ جماتے ہیں اور اوس رابطۂ مخفی پر اعتقاد رکھتے ہیں جو باعث اور نتیجہ میں ہے مگر باعث اور نتیجہ سے علیحدہ کچھ بھی نہیں۔

قولہ

ہم دریں فصل کہ مستانہ سخن می گذرد — نکتۂ چند سرایم ز وجوب و امکان
صورکون نظمِ شش است و سہ یولی اصفر — صفر عنقاست چہ گوئی ز نقوشِ کوکان
ہستی محض نگیرد نہ پذیرد ز نہاد — حرفِ آلان کما کان، ازیں صفر بخوان
متہاں گفت کہ ہیں ہست چرا نتواں گفت — صور علیہ از علم نیاید بعیاں
پرتو و لمعہ ندانی کہ بود جزو شہ — موج و گرداب نہ بینی کہ بود جزو عمان
عالم از ذات جدا نبود و نبود جزو ذات — ہم چو راز ے کہ بود در دلِ فرزانہ نہاں

لیکن یہ بھی اس کے ساتھ ہے کہ حضرت مذہب مقررہ پر قائم رہنے کو بھی ضرور سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ شعر

غالب خاں ز اہل حکمش گرفتہ اند — بے دانشے کہ لعنت بر اہلِ کتاب زد

بعضے صاحب مرزا غالب کا ایلان طریقۂ زردشتی کی جانب قرار دیتے ہیں۔ خط جانے کیا معاملہ تھا، گو حضرت تو یہ ہی فرماتے ہیں۔

قولہ

کاری عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا — مومن نبود غالبؔ کافر نتواں گفت

دنیا میں بے عیب تو وہ ہو سکتا ہے جس کا نام دُور سے سُنو
مگر آنکھ سے نہ دیکھو۔ طریقۂ مذہبی کچھ ہی ہو لیکن اس میں شک نہیں
کہ بہت بڑا زبردست آدمی دنیا سے اٹھ گیا اور ایک صورت خاص
میں ہندوستان کو بھی بے چراغ کر گیا۔ شاعری کو کبھی اپنا فخر نہ سمجھا اور
دل کی سادگی کو مصنوعی ہنر پر ترجیح دی۔

قولہ

ہر چند دریں عرصہ ہر رنگ کہ خواہی — با نیک و بد ہر بسری رہ دو اما
دل می طلبد دوستی و دشمنی خلق — لب تشنۂ خوں اند، چہ اعدا چہ احبا

---

مانی القادری

## غزل

درد کیوں اٹھتا ہے اے دل اسے تو کیا جانے
جو خفا ہے نگہِ عربدہ جو کیا جانے

مے گلرنگ کی مستی دلِ خود رفتہ سے پوچھ
جام کیا جانے اسے، اس کو سبو کیا جانے

حسن کی پردہ دری کرتی ہے کیوں فصلِ بہار
غنچے غنچے کو ہے کیوں ذوقِ نمو کیا جانے

کون سا جلوۂ دیدار نظر آئے گا
آنکھیں کیوں کرتی ہیں اشکوں سے وضو کیا جانے

کل تھی جس بزم میں تزئینِ چراغاں مانی
آج کیوں اس میں ہے اک عالمِ ہُو کیا جانے

آں کہ ریا می زغسل یاز ندانم
ذوقِ تو دانیدہ دلبِ سبزۂ گلفام
ترکانہ زوم زمزمہ مدح و ثنایت
ایں پادسی سادہ زآرایش دعوی
دُور از اثر عربدہ دیمث و ستیزہ
در عرض ثنایت نفسم جوہر معنی
سیراب سفالم زنم رشحہ کوثر

تاریخ پے مستی نشاسم زمعما
مدح تو وداتیدہ بدل رایتہ احیا
در منطقِ اجداد نہ بر مسلک آبا
دیں بندگیٔ پاک زآلائش غوغا
منظورِ نگاہِ دل و جاں بخش تو بادا
در بزم ولایت لقبم غالب شیدا
گلپوش مزادم نہ بجوم پے مولی

(رتن پرکاش)

خواجہ احمد عبّاس

# بچّوں کی فلمیں

ایک مشہور ہندوستانی فلم پروڈیوسر سے پوچھا گیا۔ "آپ بچّوں کے لئے فلمیں کیوں نہیں بناتے ؟"

انھوں نے اس سوال پر بڑے تعجّب کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میری تو ساری فلمیں بچّوں کے لئے ہی ہوتی ہیں۔"

ان کا مطلب تھا کہ ان کی سب فلمیں 'بچکانہ' ہوتی ہیں یعنی ایسی ہوتی ہیں جو بچّوں کی بھی سمجھ میں آسکتی ہیں، جن میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس کو سمجھنے کے لئے کسی خاص سمجھ بوجھ یا سوچ بچار کی ضرورت پڑے۔

دس برس ہوئے ہالی وڈ کی فلموں کے بارے میں ایک جانے بوجھے امریکن فلم کریٹک نے کہا تھا کہ ان کی ادبی سطح بارہ تیرہ برس کے بچّوں کی سمجھ بوجھ سے زیادہ اونچی نہیں ہوتی۔

اس لحاظ سے تو ہر گھٹیا فلم کو بچّوں کی فلم کہا جا سکتا ہے۔

لیکن ہر 'بچکانہ' فلم نہ تو بچّوں کے لئے دل چسپ ہوتی ہے اور نہ ان کے لئے مفید ہی ہوتی ہے۔

ان میں بہت سی فلمیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کو دیکھنے سے بچّوں کے دل اور دماغ پر بُرا اور کبھی کبھی بڑا خطرناک اثر ہو سکتا ہے۔ مثلاً وہ فلمیں جن میں بڑے بھیانک سین دکھائے جاتے ہیں یا وہ فلمیں جو خون، تشدّد، ڈکیتی اور دوسرے جرموں سے متعلق ہوتی ہیں۔

اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کتاب، اخبار، ریڈیو سے کہیں زیادہ اثر بچّے کے کردار اور نفسیات پر سنیما کا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنیما کے پردے پر دکھائی گئی فلمی زندگی بھی دیکھنے والوں کو اور خصوصاً بچّوں کو اصلی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال بہت اہم ہو جاتا ہے کہ بچّوں کو کون سی فلمیں دکھائی جائیں اور کن فلموں سے ان کو بچایا جائے۔

جہاں تک سنسر کا تعلق ہے وہ اس مسئلے کو ایک منفی طریقے سے حل کرتے ہیں یعنی بعض فلموں کو 'اڈلٹ' سرٹیفکیٹ دے کر بچّوں کو ایسی فلمیں دیکھنے سے روک دیتے ہیں لیکن وہ بھی یہ نہیں بتاتے کہ بچّے دیکھیں تو کون سی فلمیں دیکھیں۔

لیکن دوسرے ملکوں میں برابر ایسی فلمیں بنائی جاتی ہیں جو خاص طور سے بچّوں کی دل چسپی اور ان کے فائدے کے لئے ہوں۔

ان میں ایک تو تعلیمی فلمیں ہوتی ہیں جو ایک دل چسپ طریقے سے بچّوں کو تاریخ یا جغرافیہ یا سائنس پڑھنے میں مدد دیتی ہیں۔ موجودہ تعلیمی رجحانات کے مطابق ہر اسکول میں ایک پروجیکٹر کا ہونا اتنا ضروری ہو گیا ہے جیسے ہمارے اسکولوں میں بلیک بورڈ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

بچّوں کے لئے ایسی تعلیمی فلمیں ہمارے ملک میں اب تک باقاعدہ طور سے نہیں بنتیں۔ صرف بعض اچھے اسکول دوسرے

ملکوں کی تعلیمی فلمیں منگا کر بچوں کو دکھاتے ہیں اور ان کے پرنسپل اور ہیڈ ماسٹروں کا کہنا ہے کہ بچے بڑے شوق سے ان فلموں کو دیکھتے ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ لیکن یہ فلمیں دوسرے ملکوں کی ضروریات اور ان کے ماحول کے مطابق بنائی جاتی ہیں۔ عام ہندوستانی بچے خصوصاً وہ جو چھوٹے قصبوں اور دیہات میں رہتے ہیں نہ ان کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں نہ ان سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری مرکزی اور صوبائی محکمۂ تعلیم اس طرف پوری توجہ دیں اور اپنی نگرانی میں چھوٹی تعلیمی فلمیں بنوائیں اور ہر اسکول میں ان کو دکھانے کا انتظام کیا جائے۔ کم سے کم ہر ضلع کے ہر اسکول میں ایک چھوٹا سنیما کا پروجیکٹر تو ہونا چاہیئے۔ جہاں تک گاؤں کے اسکولوں کا تعلق ہے وہاں چلتی پھرتی سنیما گاڑیوں کے ذریعے ان تعلیمی فلموں کو کم سے کم مہینے میں ایک بار دکھایا جا سکتا ہے

لیکن بچوں کو تعلیمی فلموں کے علاوہ تفریحی فلموں کی بھی ضرورت ہے۔ ایسے فلم جن کو وہ دل چسپی سے دیکھیں جن کو دیکھ کر ان کو مزا بھی آئے اور جن سے وہ کوئی اچھا سبق بھی حاصل کر سکیں۔ ایسے فلم بنانے کی ہمارے ملک میں بہت ہی کم کوشش کی گئی ہے ---

شانتا رام صاحب کا پروڈیوس کیا ہوا اور نوجوان ڈائرکٹر رام گیاسے کا ڈائرکٹ کیا ہوا فلم "پھول اور کلیاں" جس کو پچھلے برس بچوں کی بہترین فلم کا سنہری تمغہ تو ملا لیکن اس کو دکھلنے میں وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کا وہ حقدار تھا۔

مشکل یہ ہے کہ عام سنیما کے مالک صرف وہ فلمیں دکھانا چاہتے ہیں جو بڑوں، بچوں سب کی دل چسپی کی ہوں۔ ان کو صرف بچوں کی فلمیں دکھلنے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے اور نہ بچوں کی فلمیں دکھا کر وہ اتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جیسے بڑوں کی فلمیں دکھا کر۔ اس لئے بچوں کے لئے اچھی فلم کبھی کبھی ہی بن بھی جاتی ہے تو اسے دکھانے کے لئے سنیما والے تیار نہیں ہوتے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شہر اور بڑے قصبے میں کم سے کم ایک سنیما ایسا ہو جو صرف بچوں کی دل چسپی کی تصویریں دکھاتا ہو اور جس کے پروگرام میں ماں باپ اپنے بچوں کو اس اطمینان کے ساتھ بھیج سکیں کہ وہاں جو فلم دکھائی جائے گی وہ سچ مچ ان کی دل چسپی اور ان کے فائدے کی ہوگی۔

سرکاری مدد سے ایک چلڈرنز فلم سوسائٹی بنائی گئی ہے اور اس سوسائٹی نے کئی فلم بچوں کے لئے بنائے ہیں جن میں سے چند اچھے بھی ہیں۔ لیکن ابھی تک اس سوسائٹی کے بنائے ہوئے فلموں کو دکھانے کا بھی پورا انتظام نہیں ہے۔ فلم تو بن جاتے ہیں لیکن برسوں گزرنے پر بھی ملک کے لاکھوں بلکہ کروڑوں بچے ان فلموں کو دیکھ نہیں پاتے۔

اس سوسائٹی کے لئے میں نے بھی "عید مبارک" کے نام سے ایک چھوٹی سی فلم بچوں کے لئے بنائی تھی۔ اس کا اسکرین پلے منشی پریم چند کی مشہور کہانی "عیدگاہ" کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹے سے بچے اور اس کی دادی کی کہانی ہے۔ مجھے اس فلم کو ڈائرکٹ کرتے ہوئے بڑی ہی مسرت ہوئی۔ نہ صرف اس لئے کہ منشی پریم چند کی یہ کہانی بہت ہی خوب صورت اور انسانی جذبات سے بھرپور ہے۔ اور اس کی بنیاد پر اسکرین پلے لکھتے ہوئے اختر مرزا صاحب نے پریم چند کی کہانی کی خوبصورتی کو قائم رکھتے ہوئے اپنی طرف سے نئے سین بڑھائے تھے وہ بھی خوب تھے اور پریم چند ہی کے خیالات پر مبنی تھے، جیسے وہ سین جس میں عید کے دن ایک گوالن دادی سے دودھ کے پیسے نہیں لیتی اور یاد دلاتی ہے کہ دیوالی پر دادی نے بھی تو اس سے سلائی کے دام نہیں لئے تھے اور اس طرح ہمارے گاؤں کے سماج میں جس بھائی چارے سے ہندو مسلمان رہتے ہیں اس کی جھلک بڑی خوب صورتی سے دکھائی ہے۔ کہانی کے علاوہ میری خوش قسمتی سے اس فلم میں مرکزی کردار کرنے کے لئے مجھے ایک بہت ہی اچھا بچہ مل گیا تھا۔ جس سے کام لینا آسان تو نہیں تھا مگر نہایت دل چسپ ضرور تھا۔ دراصل کسی بچے سے فلم میں اچھا کام لینے کے لئے ڈائرکٹر کو خود بچہ بننا پڑتا ہے تب کھیل کھیل میں مشکل سے مشکل سین چٹکیوں میں ہو جاتے ہیں۔

ہمارے دیش کے بچّوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پردھان منتری جواہر لال نہرو بچّوں سے اتنی محبت کرتے ہیں اور ان کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ تب ہی ان کی سالگرہ کا دن سارے دیش میں بچّوں کا دن منایا جاتا ہے۔ اس برس میں امید کرتا ہوں کہ اس ننھے دن پر نہ صرف ہمارے دیش کے بچّے اچھی فلمیں دیکھ سکیں گے بلکہ آئندہ کے لئے ایسی تدابیر اختیار کی جائیں گی جن سے ہمیشہ بچّوں کے لئے اچھی، دل چسپ اور مفید فلمیں بنانے اور دکھانے کا مستقل انتظام ہو جائے گا اور تب بڑی فلموں کو نہیں بلکہ سب سے اچھی فلموں کو "بچّوں کی فلم" کا درجہ دیا جائے گا۔

---

ظرفؔ قریشی

# غـــزل

چھا گئی گھنگھور بدلی جھوم کر بادل اُٹھا
محتسب نیّت بدل، ساغر اُٹھا، بوتل اُٹھا

تشنگی پیاسوں کی زاہد کچھ تو بجھنی چاہیئے
میں صراحی ہاتھ میں لیتا ہوں تو چھاگل اُٹھا

قیس کے آنسو تھے یا پگھلا ہوا سونا تمام
آگ صحرا میں لگی سارا بیاباں جل اُٹھا

اے برہمن اب بھی مٹ سکتا ہے این و آں کا فرق
شیخ زمزم ہاتھ میں لے اور تو گنگا جل اُٹھا

یہ تو کرنا ہی پڑے گا یہ تو ہونا ہے ضرور
تو بساطِ زیست اپنی آج اُٹھا یا کل اُٹھا

پیچ ہے گھونسے کے بھی دن اللہ دیتا ہے پلٹ
ہو گیا جنگل میں منگل جب کوئی پاگل اُٹھا

رات اندھیری، راہ ناہموار، منزل دُور تر
رہروِ ہستی اُجالا تیز کر مشعل اُٹھا

آج ہر مدفن مزارِ عارفِ باللہ ہے
چاہے جس کا عرس کر چادر چڑھا صندل اُٹھا

ہو گئی ظرفؔ بہت ہمسفرِ بساطِ زندگی
پھینک لے جا کر کہیں اس کو کھڑا ہو چل اُٹھا

رشید احمد

# حسّو خاں

پستہ قد کے منحنی سے آدمی! مرنجا مرنج! ہونٹوں پہ پان کا لالی، آنکھوں میں شوخی اور ظرافت کی چمک، سر پہ ٹیڑھی باؤں کے گنگا جمنی پٹے، دھوپ چھاؤں کا مزا دکھاتے، شرعی شیروانی کا کرتا، سبز مشرو کا گھٹنا، سیاہ مڑاسے کی گرگابی پہنے دالان میں کھڑے مسکرا رہے ہیں، ان سے ملئے یہ ہمارے حسّو خاں ہیں۔

عمر کا بہترین حصہ نوابین اور بیگمات لکھنؤ کی سرکاروں میں بسر ہوا۔ مشرقی تہذیب و تمدن کی اس اجڑی ہوئی محفل کی یادگار، جس کے نقوش اب قریب قریب مٹ گئے۔

حسّو خاں اگرچہ مکتب میں کریما، مامیقاں کے درس سے آگے نہ پڑھے، مگر لکھنؤ کی اعلیٰ صحبت کی فیض بخشیوں سے اپنا دامن بھرے ہوئے، تیز طرار، کڑھے ہوئے انسان، لکھنؤ کی ڈیوڑھیوں اور محل سراؤں سے تابہ زندگی وابستہ رہ کر ان کی شوکت و حشمت رفتہ کی شام یادِ بزمِ آخر دیکھے ہوئے، اپنے وقت میں درباں و معمار سے لے کر داروغگی اور خواجہ سرائی تک کی خدمات انجام دیں۔

ان کی بیوی اصغری خانم! محل سرا کے اندر مغلانی کی خدمات انجام دیتیں، وہ بیگمات اور عزیزات عالی مقام کی پیش دست تھیں، خصوصاً ان کی پوشاک کی تراش خراش، نئے نئے انداز و اسلوب سے اس کی سلائی، آراستگی اور زیبائش کا کام انھیں سپرد تھا، ایک ایک پاجامے دو پٹے کی حاصل تیاری، اور ان پر مسالہ جات پلکا، پٹی بیل، پٹی، گوٹھ اور نبت کے بیسنے ٹانکنے پر چھ چھ مہینے اور سال سال بھر مشقت و ریاض کرتیں اور بھنیر دیپچی، مُرّی وکٹاؤ، کنگرے اور جال کے وہ وہ نادر اور لطیف نمونے پیش کرتیں کہ سبحان اللہ! تب جاکے کہیں جوڑا تیار ہوتا، جو دو ایک بار پہن کر توشہ خانے کی زینت بن جاتا اور پھر کسی جدید وضع کی تیاری شروع ہو جاتی۔

حسّو خاں بازار سے بیگمات کے لئے سودا سلف لاتے اور ڈیوڑھی پر حاضر ہونے والے تاجروں، صنّاعوں اور دیگر اہلِ حرفہ کی بندگی اور مجرا عرض کرکے ان کا مال برائے ملاحظہ و انتخاب محلسرا میں پہنچاتے اور سودا گروں سے شرح دستوری لے کر کے اسی مناسبت سے اس کے حسن و قبح پر تنقید کرتے، غرضکہ اسی خوش وقتی اور خوشحال گذرانی میں ان کے ایام بسر ہوئے، تاآنکہ انقلاب دوراں اور گردشِ روزگار نے وہ ڈیوڑھیاں سونی اور ویران کر دیں اور وہ سرکاریں برباد!

حسّو خاں اپنی پیرِ فتح پر چار آنسو بہاتے ہی مغلانی کو لئے اپنے ولی ماموں ابو سرائے آئے جو اودھ کے قدیم دارالسلطنت شہر فیض آباد کے مضافات میں شرقاً کی ایک چھوٹی سی بستی ہے تا حیات وہ مغلانی اور وہ اپنے آبائی مکان میں رہے، اور جو کچھ اندوختہ تھا اس پر بسر اوقات کی، مغلانی کی رحلت کے بعد تنہائی سے گھبرا کر گاؤں کے زمیندار میر صاحب کی ڈیوڑھی پر آمد و رفت اختیار رکھی اور وہیں سے سفرِ آخرت اختیار کیا۔

وہ جہد رفتہ اور معاشرتِ قدیم کی ایک جیتی جاگتی یادگار تھے، ان کا سارا وقت مزاح لطیف اور حاضرینِ محفل کے ساتھ خوش طبعیوں اور خوش فکریوں میں بسر ہوتا۔ وہ محفل نور و نغمہ کی صورت آگیں یاد سے سامعین کے دلوں میں ایک پُر مزہ رسمیگی، ایک معصوم لذتِ درد پیدا کر دیتے۔ وہ حسن کے بڑے پرستار تھے، فرماتے، حسن ہمیشہ لائقِ پرستش ہے، وہ جہاں اور جس حال میں بھی ہو ہر ایک دل سے ہدیۂ نیاز کا طالب ہے۔

درحقیقت فطرتاً وہ ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے، جس محفل میں بیٹھتے اپنی ظلافت لسانی اور جادو بیانی سے اس پر چھا جاتے اور اس میں زندگی اور تازگی کی ایک لہر دوڑا دیتے۔ حاضرینِ محفل کی بذلہ سنجیوں کے قلم سے مسحور ہو جاتے ہر خورد و بزرگ انھیں چھیڑ چھیڑ کر اس قسم کی دل چسپیوں پر آمادہ کرتا، چھوٹے بڑے یکساں ان کی شگفتہ بیانی اور انوکھے طرزِ ادا سے محظوظ اور مسرور ہوتے۔ کہیں فرنگی بول چال کی نقل ہے، انگریزی اندازِ گفتگو کا ہو بہو ویسی صوتی چربہ آتارا جاتا، تو کہیں کوثر سے دھلی ہوئی بیگماتی زبان میں دادِ سخن وری دی جاتی۔ سنبل و ریحاں سے زیادہ نازک اور لطیف کنائے، کوثر و سلسبیل سے زیادہ صاف اور رواں تلمیحات! کہیں خس خانہ و برفاب کے اہتمام کی منظر کشی، تو کہیں بیگمات کی انتہائی سادہ لوحی اور معصومیت کی مثالیں اور ان کے حضور اپنی فرد حساب کی پیشی کے مرقعے! کہ تو بل میں دس روپے ہیں سے مبلغ دو روپے کی بالائی خریدی اور دو روپے بالائی والے کو دے۔ دو روپے کی شیرالیں لیں اور دو روپے ان کی تیاری پر صرف ہوئے۔ بقیہ دو روپے کے تبرکات درگاہ حضرت عباس میں نیاز دلا کر فقراء اور مساکین کو تقسیم کر دیئے۔

ان کی تشبیہات کی ندرت، زنگی اور اچھوتے پن سے سامعین نشۂ حیرت بن جاتے۔ نواب کی فرطِ عقیدت اور محبتِ اہل بیت بیان کرتے ہوئے نصیر امام باڑہ آصفی کا یوں ذکر فرماتے! کہ آصف الدولہ نے غمِ حسین میں جس قدر آنسو بہائے تھے امام باڑہ آصفی ان میں سے صرف ایک آنسو ہے جو حسنِ قبول سے منجمد ہو کر دُرِ شہوار بن گیا ہے۔ کبھی محمد علی شاہ کے زہد و ریاضت کا ذکر کرتے ہوئے یوں گوہر افشاں ہوتے کہ حضرت ظلِ سبحانی نے بہشتی خوبصورتی کا خواب دیکھ کر اس کی تمثیل امام باڑہ حسینیہ آباد کی صورت میں تیار کرائی تھی جو اپنی لطافت و پاکیزگی کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ہاتھوں سے نہیں بنایا گیا بلکہ اس نے ید قدرت سے مثلِ ایک خوش نما پھول کے نشو نما پائی ہے، جس کے سقف و گنبد میں نہ معلوم کتنے بے چین دلوں کی دھڑکنیں اور آہیں بسی ہوئی ہیں جو یومِ نشور کو قلبِ مومن کا وسیلۂ نجات ہوں گی۔

کبھی شبِ ماہ میں کنارِ چمن بیگمات کے گل گشت کی تصویر یوں کھینچتے۔ کہ وہ خرامِ ناز جس سے موسیقی کے بہترین نغمات سیکھے جا سکتے ہیں، اور نہرِ سیمیں پر چاند کی شفاف روشنی کے انعکاس کا وہ طلسمی نظارہ! ایسا معلوم ہوتا کہ مونگیوں کو سنہری شراب میں حل کر کے فرشِ مرمریں پر پھیلا دیا گیا ہے اور چاندنے اپنی تجلی سے سارا عالم کو غرقِ تنویر کر دیا ہے اور فطرت اس دریائے نور میں نہا نہا کر نکھر رہی ہے۔ نہر کے پانی پر کنول اور اس کے مست تھرکتے غنچے اس طرح پڑے لوٹ رہے ہیں جیسے کسی پری کا ہاتھ لوٹ کر سیلِ آب پر بکھر گیا ہو۔

کبھی اپنے ہمدرشتاد دوران کی یاد اور محل سرا کی کنیز گلشن سے اپنی چھیڑ چھاڑ اور شرارتوں کا ذکر کر کے اس لطف سے اس کا سراپا کھینچتے۔ کہ غلام گردش میں چھپ کے پیچھے سے "ہاؤں" کر کے جو اُسے ڈرا دیتے اس کے بوں سے جنھیں شغلہ "تکلم" کہہ سکتے ہیں ایک چیخ نکل جاتی اور عالم اضطرار میں اس کے گیسو کھل کر گلا گوں پر اس طرح بکھر جاتے جیسے سیاہ حرفوں میں کوئی روشن دل آویزشِ اعراب خیال پنہاں ہو اور پھر حقیقتِ حال سے آگاہ ہو کر جب وہ مسکراتی تو اس کے بوں کا قہم دلوں کے لئے نویدِ سرور بن جاتا۔

آواز کے زیر و بم اور طرزِ ادا کی دل کشی اور بے ساختگی سے وہ اپنے کردار کی خود مجسم تصویر بن جاتے، اپنی مخصوص ہیئت کذائی اور اعضاء و جوارح کے فشار و انتشار سے حسبِ دل خواہ فضائی تخلیق ان کا ادنیٰ کرشمہ تھی، وہ تنہا اپنے ڈرامہ کے ہر کردار کی تمثیل وہ خود بن جاتے اور اپنے الفاظ سے وہ منظر کشی کرتے جو مادی آب و رنگ سے بے نیاز اور بلند و بالا ہوتی، وہ اپنی محفل کے ہر گویا کو خاموشی اور

ہر خاموش کو گویا بنا دیتے اور گویائی اُسے سخت دھرجا میں بدل جاتی۔

عروس البلاد لکھنؤ کے اس جبر و رنگ و شباب میں فنونِ لطیفہ کا مذاق عام تھا۔ ہر کہ و مہ قدر دانِ فن تھا، حتّٰی خاں بھی موسیقی کے بڑے دلدادہ اور رسیا تھے، محفلِ رقص و سرود میں تو بس ان کی بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی اور وہ اس دنیائے اُلٹ پلٹ سے دُور کسی نشاط و نیا میں پہنچ جاتے جہاں جذبِ ملفوظ کے سوا رسمی آداب و قیود کی حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ جس طرح بی کھول کر وہ ایک محفتی کی شان سے فن کی داد دیتے، اسی طرح ادنیٰ کو تاہی پر وہ پیں بہ جبیں بھی ہو جاتے۔ تال و سُر کی خفیف سے آہنگی ان کے سامعۂ لطیف پر بار ہوتی اور موقع پڑنے پر وہ بڑے سے بڑے گلوکار و موسیقار کو لقمہ دینے میں نہ چُوکتے۔ راگ راگنی کے اصل روپ اور ٹھاٹ سے وہ بخوبی آشنا تھے اور ایک فن کار کی حیثیت سے اس پر تنقید و تبصرہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

لکھنؤ کے ایک عظیم الشان تاریخی جلسے کا حال یہ بڑی حسرت اور بڑے چاؤ سے مزے لے لے کر بیان کرتے کہ حضور! ابھی کوئی پانچ اوپر دو صدی سال کا ذکر ہے چوک میں طوائفوں کی چودھراہن ماہ منیر و بدر منیر کے یہاں جو عرفِ عام میں ننھوا اور بچوا کے نام سے مشہور تھیں ان کی نوزائیدہ بچی رشکِ منیر کی سالگرہ کا جلسہ تھا، جس میں شرکت کے لئے ہندوستان بھر کے مشہور طائفے، نامور گوئیے اور ساز کا رمد عو تھے۔ برادری کے ناتے سے اس تقریب میں فن کاروں کا ایسا زبردست اجتماع تھا جو اس سے پہلے سرزمینِ لکھنؤ پر کبھی دیکھا نہ گیا تھا۔ اگر ایک طرف کلکتے والی گوہر جنم انجمن بنی ہوئی تھی تو دوسری طرف بمبئی، جے پور، آگرہ الہ آباد اور بڑودہ وغیرہ کے مشہور طائفے اور گلوکارہ رونقِ محفل تھے۔ چودھراہن کے ساتھ لکھنؤ کے دیگر نامی فن کاران آدھا بگن، چونے والی جیدی، جلی خورشید، ملکہ جوجان، محمدی جان اور استاد کالکا بندادین، خورشید علی خاں اور نصیر الدین خاں وغیرہ فرائض میزبانی بڑے خلوص اور تپاک سے ادا کر رہے تھے۔

جلسہ شبانہ روز تین دن تک قائم رہا۔ اژدہام کثیر کے خیال سے چودھراہن نے اصلاً گولہ گنج کی رفاہ عام والی عمارت میں جلسہ کا انتظام طے کیا تھا جس میں علاوہ وسیع بارگاہ کے مہمانوں کے قیام کے لئے بھی کافی گنجائش تھی۔ نوابین، راجگان اور تعلقہ داروں کے توشہ خانے کے توشہ خانے ڈھل آئے تھے۔ بیش قیمت شیشہ آلات، جھاڑ فانوس، روشنی، ایرانی قالینوں، کارچوبی مسندوں اور زرنگار پردوں سے ساری عمارت سجا کر دلہن بنا دی گئی تھی، آرائش و اہتمام کا سلسلہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا کہ کسی بد اندیش نے بیچ میں کانٹا مار دیا کہ "رنڈیوں کا جلسہ انجمن کے سرکاری مکان میں ہونا چہ معنی دارد!" لیجئے چشم زدن میں سارا کیا دھرا اکارت ہو گیا، انجمن کے سکرٹر "مسٹر ان یوسف بالسٹر" سے اس باب میں کچھ بے جا بھی ہو گئی، جنھوں نے اولاً جلسہ کی اجازت دے کر بعد میں بدعہدی کی تھی۔ طوائف و اطراف بے جا کو مار پیٹ کر گولی حضت! اس میں ہتھر کی معزز چودھراہن کی ذلت و سبکی کا جو پہلو نکل آیا، بس غضب ہی تو ہو گیا۔ نوابوں اور رئیسوں نے جلسہ گاہ کے لئے اپنی محل سرائیں خالی کر دینے کی پیشکش کی، ادھر چوں کہ معزز جوہریوں اور بستی گیوں نے اپنی کوٹھیاں مہمانوں کے قیام کے لئے خالی کر دیں، بالآخر یہ جشن مانوس رفاہ عام کے بجائے چودھراہن کی بارہ دری چوک ہی میں منایا گیا۔

پورے چوک میں گول دروازے سے تا بہ اکبری دروازہ سارا راستہ بیرقوں اور بندن واروں سے آراستہ کیا گیا جا بجا نشئی محراب اور گل پوش چھاؤنک تیار کر کے ان پر نوبت خانے قائم کئے گئے، جن پر شہنائی نواز اپنے فن کے کمالات دکھا رہے تھے۔ ابریشمی قمقموں اور قندیلوں سے سارا راستہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا، راستہ میں مہمانوں کی فرش پالکی، ہوادار، محافے اور سکھ پال کا تانتا بندھا ہوا تھا اور کہاروں کی ہٹو بچو سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

جلسہ کی بارگاہ اور اس کے اردگرد کے متوازی ایوانوں میں فانوسوں کا سیمیں تفاطر عجب ترنم پیدا کر رہا تھا، جا بجا فتری مجمروں میں عود و صندل سلگ رہا تھا اور پھول والی گلی کی ساری متاع رنگ و بو ایوان و بارگاہِ محفل پر لٹا دی گئی تھی۔ اس طلسمی ایوان میں داخل ہوتے ہی نگاہیں روشنی اور تابانی کے ایک سمندر میں غوطہ زن ہو جاتیں۔ وسطِ بارگاہ فوارے کے پانی میں رنگین روشنیاں اس طرح منعکس ہوتیں گویا قوس قزح کو پارہ پارہ کر دیا گیا ہے اور ایک دریائے نور و عجلتی رواں ہے۔

اس تمہید میں لکھنؤ کے طائفوں کے سوا کلکتہ والی گوہر، آگرہ کی منی جان، زہرہ اور ملکہ، علی گڑھ کی نواب پتنی، دلّی کی گوہر تاج، (زہرہ جبیں) اور خورشید، بنارس کی بدیا دھری و راجیشری، الٰہ آباد کی چھپّن چھری، پٹنہ عظیم آباد کی منشی اور مسن بانو، اندور کے کاکے صاحب، بروڈہ کے استاد فیاض خاں، گوالیار کے کھانڈے راؤ اور عظیم الدین خاں، اور میہر کے بندہ حسن، غرضکہ تام کہاں تک گنائے جائیں سارے ہندوستان کے نامور گائک، کلاونت و موسیقتکار اپنے فن کے جوہر دکھا لات دکھانے کے لئے جمع تھے۔

ارباب نشاط کے بے پناہ حسن و جمال، ان کی آرائش کی طرفگی اور پائکین اور ان کی زرکار پوشاکوں اور موتیے زیورات کی جگمگاہٹ سے نکلا ہوا ہال میں چکا چوند پیدا ہوتی تھی۔ اس محشرستانِ حسن و رعنائی میں ایک کو اگر ذرّہ سری نیواسٹن میں کمال حاصل تھا تو دوسری فن نقاب اُنگلی میں ہیرا کر کس طرح اس میں اندازِ تغافل پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک اگر فن حنا بندی میں بے مثل تھی کہ انگلیوں کی پوریں کس ترکیب سے رسیلی نوش رنگ رنگی جا سکتی ہیں کہ اگر ان کا عکس آئینہ پر پڑ جائے تو تہہ آب شاخ مرجاں کا گماں ہونے لگے، تو دوسری تقریر سرمہ میں کمال رکھتی اور جانتی تھی کہ آنکھوں کو کس وقت شوخ نگاہی کی ضرورت ہے اور کب انھیں چشم بسمل ہونا چاہیئے، غرضکہ حسن اپنی تمام فتنہ سامانیوں اور پوشش ربائیوں کے ساتھ جلوہ فرما تھا۔ مشاطگی حرفِ آخر میں گئی تھی اور صباحت و ملاحت کا ایک بیلاب عظیم برپا تھا جس میں ہوشش و خرد حس و خاشاک کی طرح بہے جاتے تھے اور چشم تیز اپنی آخری جائے پناہ ڈھونڈھ رہی تھی۔

بظاہر سارے فن کاروں میں ایک برادرانہ اخوت و ہم آہنگی ضرور نمایاں تھی، مگر بمقتضائے بشری فنّی مظاہرات میں، اندرونی طور پر ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ انفرادی جذباتِ تفوّق سے قطع نظر اجتماعی حیثیت سے ایک دوسرا جذبہ شہری تفوّق کا بھی دلوں میں کارفرما تھا، جس میں اہلِ لکھنؤ پیش پیش تھے، کیا مجنی، شہر کی ناک رکھنے کا سوال تھا، اور یہاں کے فن کار اپنی سیاست و مہارتِ فن کا سکہ دیگر مقامات کے فن کاروں پر بٹھا دینا چاہتے تھے غرضکہ یہ موقعہ مکتبہ لکھنؤ کے علمبرداران کے لئے سخت آزمائش کا تھا جس پر آئندہ ان کی روایات کی عظمت و بقا کا دارومدار تھا۔

نظام جشن کا عنوان یوں تھا کہ ایک محفل روزمرہ صبح کو منعقد ہوتی جس میں بھیرویں سے لے کر آساوری، جونپوری، سارنگ اور للت کے راگوں میں ماہرین اپنے دیرینہ فن کی داد دیتے۔ دوسری مجلس سہ پہر سے شروع ہو کر شام تک تمام ہوتی، جس میں دہناسری، ملتانی، ایمن، خیال، جھوپالی اور درگا کے راگوں میں ارباب فن اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے اور تیسری مجلس خاص شب میں برپا ہوتی جس کا سلسلہ ڈیڑھ دو بجے تک قائم رہتا۔ اسی میں شیام کلیان، کیدارا، مالکوس، جے جے ونتی، درباری، بائیکسری، پدیج اور بہاگ وغیرہ کی چیزیں اس لطف و ریاضت سے پیش کی جاتیں کہ معلوم ہوتا راگ راگنی مجسّم ہو کر خود بنفسِ نفیس محفل میں جلوہ فرما ہے اور نوائے نغمہ و زمزمۂ موسیقی میں خود بھی مست و بے خود ہوئی جاتی ہے اور سحر نغمہ تمام فضا پر چھایا ہوا ہے۔ طرز ادا میں استرہ و استھائی کے مینج و مخرج کا مدّ و جزر سمندر کے جوار بھاٹے کا سماں پیش کرتا۔ الاپ اور گلے بازی میں زمزمہ و گٹکری، مرکی و مینڈکی کی وہ وہ نازک اور لطیف حسّاسیاں پیش کرتے اور کمالِ فن کو اس بلندی پر پہنچا دیتے جس کی شرح لفظ و بیان میں نہیں سما سکتی اور جس کا لطف محض گوش شنوا اور روح مرتعش ہی کا حصّہ ہے۔

سازکاروں میں عنایت خاں ستار یئے، خدا بخش بین کار، غلام علی طبلچی، سکھا رام پکھاوجی، نایاب حسین سارنگیئے اور سخاوت حسین سرود کار نے وہ وہ کمالات دکھائے کہ ساری محفل عش عش کر گئی۔ آخری محفل میں گوہر جان کلکتہ نے 'پیا بن نا ہیں آوت چین' لکھنؤ کی اوھا بکّن نے ترانہ اور محمدی جان نے 'ہمارا جوکو ڈیا کھول رس کی بوندیں پڑیں' کی چیزیں اس لطف و ریاض سے گائیں کہ ان کا حصّہ ہو گئیں اور اہلِ فن کے حلقہ میں آج تک اس کی دھوم ہے۔

بھاؤں کی خاطر تواضع، ناشتہ اور خاصے کا اس بلند پیمانے پر انتظام کیا گیا جو کسی شاہی تعزیت کے اہتمام سے کم نہ تھا۔ ہشر بھر کے ناری رکاب دار اور باورچی ایوانِ نعمت کی تیاری پر مامور تھے۔ زعفران، کیوڑہ و گلاب، مشک و عنبر کی خوشبوؤں کی فراوانی سے ایوان مطبخ طبلۂ عطار بن گیا تھا۔ تبنجی، مرغ باقرخانی، شیرمال، پلاؤ، قورمہ اور مرغ و ماہی ہمہ اقسام نعمت کے دریا

بہہ رہے تھے۔

محفل میں تل رکھنے کی جگہ بھی باقی نہ تھی۔ نامور رؤسا جاگیر و تعلقہ داران اودھ، نوابین اور شہزادوں کے سوا روسا و معاندین شہر بہ تعداد کثیر رونق افروز ہوئے۔

فن رقص و نرتکاری میں اُستاد کالکا و بندادین کی شاگرد راشگوں اداکاروں نے وہ سوآگیں سماں پیدا کر دیا کہ حاضرین بزم مسحور ہو گئے۔ عالم رقص میں ان کی گردنیں ایسا معلوم ہوتا گویا مینائے مرمریں ہیں جن میں شراب ارغوانی بھری ہوئی ہے۔ ان کے رقص کا ہر دائرہ توس قزح نظر آتا۔ ان کی طلائی پازیبوں کے گھنگرو اپنی جھنکار سے روح کو مرتعش دیئے تھے کر رہے تھے۔

صدہا آرزوؤں اور التجاؤں کے تلاطم میں بالآخر استاد کالکا و بندادین کے فن رقص و نرتکاری کے شاہکار یا حرفِ آخر کی صورت میں رونق محفل بن کر اپنے کمال فن کی نمایش شروع کی۔ بندادین بہ تن رقص سیمابی کا ایک پیکر تصویر بن گیا اور کالکا اس کے نازک و لطیف کنایات پر غزل خواں! اس کی شوخ رقص و کنایات بجائے خود ایک مرقع غزل بن جاتی۔ وہ قاص کے کنایات کی تفسیریوں کرتا! حضور! یہ نقشہ ملاحظہ ہو! نقاشِ ازل نے کیا عالم تصویر بنایا ہے، وہ تصویر!!! جس میں مصور نے اپنے موقلم کی تمام جاں بخش نزاکتوں کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ دامن نقاب جلوۂ بے حجاب سے زیادہ دل کش اور نیم نگاہی نظارہ بے حجاب سے زیادہ ہلکسم ہوتی ہے۔

ہنگام رقص گھنگروؤں کی آواز پر وہ قدرت کہ جتنے گھنگرو دیکھو اتنے ہی بولیں، سبک تراوی کا وہ عالم کہ بتاشے پر سے رقصاں گزر جائے مجال کیا کہ ایک بتاشہ بھی پھٹے۔

سارا ایوان طرب شائقین کی داد و تحسین سے گونج رہا تھا، ہر طرف سے صدائے مرحبا و سبحان اللہ بلند ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیائے آب و گل ایک خواب ہے، ایسا خواب جس میں جنتوں کی عشرت پنہاں اور بس یہی دل چاہتا ہو کہ اس خواب نوشیں سے کبھی بیدار نہ ہو۔

غرضکہ حسّوخاں بجائے خود ایک مستقل نگارخانہ تھے۔ فہم فردا کی کدورتوں سے پاک، حس سے ہر بناوٹ کی بیری و آسودگی سے محبت اور مشرقی تہذیب و تمدن کا ایک ایسا مرقع تھے جو اب تہ خاک دفن ہو چکا ہے اور جس کے اب نام لیوا بھی باقی نہیں۔ رہے نام اللہ کا!!!

---

## کثیر صنعتی انقلاب کے دروازے پر

گزشتہ چند برسوں میں ریاست جموں و کشمیر نے صنعتی لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ کئی ایک نئے نئے صنعتی کارخانے قائم کئے گئے اور پرانی صنعتوں کو وسعت دی گئی۔

نئی صنعتوں کو پرائیویٹ سیکٹر میں کافی فروغ مل رہا ہے اور حکومت کی طرف سے کارخانہ داروں کو کافی سہولیات دی جا رہی ہیں جن میں مالی، ٹیکنیکل اور مارکیٹنگ سہولیات شامل ہیں۔ پرائیویٹ سیکٹر کی ترقی کے لئے حکومت نے بجلی، زمین اور پانی ایسی سہولیات بہم پہنچائیں تاکہ وہ ریاست میں زیادہ کارخانے لگائیں۔ ریاست میں صنعتی ترقی کا جائزہ لینے کے لئے حکومت نے ایک انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بورڈ قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک انڈسٹریل ایڈوائزری بورڈ قائم کیا گیا جس کے ممبر سرکردہ کارخانہ دار ہیں تاکہ وہ حکومت کو صنعتی ترقی کے میدان میں مشورے دے سکیں۔ کھٹوعہ میں دو سوتی پارچہ بافنے کی ملیں ہیں جن میں ایک لاکھ ۲۱ ہزار تکلوں کی قوت موجود ہوگی۔ اون بھیجنے و بینری کا سامان بنانے کا کارخانہ بھی حکومت اور ایک پرائیویٹ ادارے کے اشتراک سے بنایا جا رہا ہے۔

حکومت کا غذ بنانے کے دو کارخانے قائم ہونے کے متعلق غور و خوض کر رہی ہے جس میں ایک کشمیر کی وادی میں ہوگا اور دوسرا صوبہ جموں میں قائم کیا جائے گا۔

سلطان احمد

# آرنسٹ ہیمنگوے اور اُس کا فن

مقطع صورت، مقدس ڈاڑھی، تر بتر ہوئے لب اور حیران آنکھیں، بڑھاپے میں چاق و چوبند اور نیم فوجی لباس زیب تن، یہ تھے آرنسٹ ہیمنگوے، ایک صاحب طرز مصنف، جن کی داستانِ حیات ان کی سخت جانی اور قلم کی روانی پر ختم ہو گئی۔ اب دنیا ماتم کرے اور بھول جائے یا نقشِ قدم پر چلے اور یاد رکھے۔ وہ اپنا کام پورا کر چکے!

باپ معالج تھا، بیٹا بچپن سے شکار کا دلدادہ، وکٹوریا میں کلی کا شوارہ۔ بڑھا اور جوان ہوا تو مرد میدان اور ہنر آزما نکلا۔ دنیا کی دو بڑی جنگوں کے درمیان وہ متعدد معرکوں میں شریک رہا۔ پھر شجاع اور بہادر ایسا کہ جان کی پروا نہیں۔ کہیں ہو اور کسی کام میں ہو، بگل کی آواز کان میں پڑتے ہی یہ جنگ کے لئے روانہ۔ موقع آیا اور آ موجود، سخت سے سخت معرکہ ہو، یہ پیچھے والا نہیں۔ بڑے سے بڑا حال ہو، یہ مقابلہ سے باز نہ آئے۔ فرانس کے محاذ پر سگمنڈ لائن کی خون ریز جنگ میں، ۱۸ دن تک وہ گھمسان کی لڑائیاں ہوئیں کہ کریل جوانوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ تین ہزار کے لشکر میں سے ۲ ہزار سے زائد سپاہی زخمی و ہلاک ہوئے۔ ساری جمعیت پریشان و منتشر ہو گئی۔ موت اس کے بھی سامنے تھی۔ اپنی آنکھوں سے ہزاروں کو گرتے اور دم توڑتے دیکھا مگر اپنی جگہ اٹل رہا۔ اس کے قدم نہ اکھڑے وہ سپاہیوں میں ایک نشان تھا جو شجاعت و بہادری کے نام سے پکارا گیا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ ناموری اس کے لئے کافی نہ تھی اور وہ ایک ادیب اور شعلہ نگار بن کر چکے گا؟ مگر محنت اور شوق کو کیا کہئے جو ماحول کو بدل دے اور جو اندازہ بھی غلط کر دے۔ لوگ اس کو مرد میدان ہی سمجھتے رہے۔ اور یہ وادیٔ موت کا ہیرو بھی نکلا لیکن اس کی تابانیوں کا ایک نیا ستارہ ابھی طلوع ہونے والا تھا جس کی روشنی میں اس کا اصلی جوہر کھلا اور وہ تلوار سے زیادہ قلم کا دھنی ثابت ہوا۔

اتوار کے دن علی الصباح گرجوں میں عبادت کے گھنٹے بج رہے تھے۔ اسی وقت اس کے گھر بھی ایک گھنٹی بجی، یہ اس کے ہاتھ کی گھنٹی تھی۔ وہ اپنی شکاری بندوق صاف کر رہا تھا کہ موت آ پہنچی۔ اس نے کئی بار موت کو دیکھا تھا۔ مگر اس مرتبہ وہ بالکل اجنبی تھی۔ اس نے آتے ہی داؤں پر پکڑا۔ اب مہلت کہاں تھی۔ بندوق کے منہ سے گولی نکلی اور یہ ڈھیر ہو گیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اس بہادر کی موت خود اپنے ہی ہاتھوں ہوئی ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

وہ طبیعت کی اُفتاد اور دل کی لگن سے مجبور تھا۔ اس نے ناموری بھی حاصل کی اور شہرت بھی دیکھی۔ یہ اس کی شجاعت اور بہادری تھی کہ بڑھاپے میں پیر توڑ کر بیٹھا۔ شہروں میں عیش و آرام کی خاطر نہ ٹھہرا اور صحراؤں اور سمندروں کے گرد چکر کاٹتا رہا۔

وہ اپنی سخت جانیوں اور مشکل پسندیوں کے لئے جتنا داد طلب ہے اس سے زیادہ زبان و ادب میں ایک نئی کشش پیدا کرنے کے لئے مستحق مبارک باد ہے اور یہ امر کسی قدر موجب اطمینان ہے کہ وہ جن مراحل کو اپنی زندگی میں طے نہ کر سکا اب مرنے کے بعد ان کی طرف اقدام کیا جائے۔ چناں چہ اس نامور ادیب کی رحلت پر جناب کینیڈی صدر امریکہ نے یہ تاثرات ظاہر کئے ہیں :-

" مسٹر ہیمنگوے نے صرف ذاتی رجحان اور اپنی جدوجہد سے وہ خدمت انجام دی ہے کہ موجودہ ادب کی کایا پلٹ گئی۔ ان کا نقطۂ نظر اور انداز بیان ادبی اور حیاتی مسائل کے سلجھانے میں انتہائی مؤثر ثابت ہوا ہے جس سے نہ صرف ملکی افراد مرد و زن کے تصورات بدلے بلکہ ان کے تصورات سارے عالم پر چھا گئے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ادب کی تخلیق ہو یا اس کی بچداشت۔ دونوں ہماری ضرورتوں میں داخل ہیں۔ جو کچھ پہلے گزر گیا، اس کے ذکر سے خوشی ہوتی ہے۔ ہم اپنے پیش روؤں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اپنے منصوبے باندھتے ہیں تو ان سے مدد لیتے ہیں، ان کی گمرہی صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ جن مکروہات سے وہ باز رہے ان سے بچتے ہیں اور محفوظ رہتے ہیں اور جہاں ان کے عزم و حوصلہ کا نشان ملتا ہے وہاں اپنی استقامت و کامیابی ڈھونڈتے ہیں۔ ایسی ہی داستانیں یادگار زمانہ ہوتی ہیں مثلاً کر ان کے اقوال اور محاورے زبان پر چڑھتے پڑھتے ضرب المثل ہو جاتے ہیں جن سے گفتگو میں جان آتی ہے۔ وہ ہمارے اندر کیف و وجدان پیدا کرتے ہیں اور ہم ان سے روشنی اور جوش عمل حاصل کرتے ہیں۔ سادگی اور سچائی ادب کی جان ہے اس میں کسی تصنع و آرائش کی ضرورت نہیں زبان، خیال کے ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے۔ جتنے اور جیسے بھی الفاظ بے جھجک زبان پر آ جائیں خیال کو ظاہر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ ان میں صوتی آہنگی اور قدرتی روانی ہوتی ہے۔ آورد اور جوڑ توڑ سے خیال مکدر ہو جاتا ہے۔ بیان کو خیال کا پابند ہونا چاہیئے۔ خیال جتنی آسانی سے برآمد ہو، بہتر ہے۔ زبان کی خوبی کے لئے خیال کو مجروح کرنا مناسب نہیں۔ مکمی ہے بندش سے عبارت زوردار ہو جائے لیکن خیال پس ماندہ رہ جائے گا اور الفاظ کا بوجھ بار خاطر ہوگا۔ سیدھے سادے الفاظ سماعت سے گزر کر ذہن پر وارد ہوتے ہیں اور ان کا مفہوم دل میں اتر جاتا ہے۔ اس زمانہ میں آسان اور مختصر نویسی کی طرف خاص رغبت ہے۔ چوں کہ زندگی کے مشاغل گوناگوں ہیں اور فرصت کے لمحات بہت تھوڑے ہیں اس لئے ضخیم اور سلسلہ وار کتابوں کے مطالعہ کی مہلت نہیں۔ اس کمی کو خلاصوں اور مختصر افسانوں سے پورا کرتے ہیں۔ روزانہ اخبارات کا مطالعہ اس عہد کی بڑی خصوصیت ہے۔ جنگوں اور مہمات یعنی کی خوشہ چینیوں سے جو پنجوڑ ہاتھ آتا ہے وہ 'وقتی ادب' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ادب بروقت اور برسرعت پیش کیا جاتا ہے جو وقتی ضرورتوں سے متعلق ہوتا ہے۔ اس میں بناوٹ سے زیادہ حقیقت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نگارش اور انداز بیان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ معیاری لحاظ سے اعلیٰ ترین نہ ہو مگر اس میں وقت کی روح جلوہ گر ہوتی ہے اسی لئے وہ دل کش اور دل نشیں بھی ہوتا ہے۔ اس کا لب و لہجہ خواہ اخباری ہو یا افسانوی بہت تند و تیز ہوتا ہے لیکن یہ ہمارے خیالات کی سوفی صدی نمائندگی کرتا ہے۔

اسی ادب اور ماحول کی معتوری مسٹر ہیمنگوے بھی کرتے رہے۔ وہ اس عہد کے عظیم ناول نویس تھے۔ ۱۹۵۴ء میں انھیں ادب کا نوبل انعام بھی ملا۔ پہلی مرتبہ ان کی بین الاقوامی شہرت ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ جب ان کا ناول "آفتاب بھی بلند ہوا" شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرے متعدد ناول شائع ہوئے جن میں "اسلحوں کو الوداع" "موت کا گھنٹہ کس کیلئے بجا" اور "بوڑھا اور سمندر" امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ چھوٹے چھوٹے افسانے بھی لکھتے رہے جو بے حد مقبول ہوئے۔ مگر ان کی زندگی بے قرار تھی۔ وہ شعلوں کی طرح بھڑکنے اور شرر کی طرح قطع منزل کرتے رہے۔ اپنی زندگی کے ۶۳ سال میں سب سے طویل قیام انھوں نے کوبا میں کیا جو صرف ۱۵ سال کی مدت تھی اور وہ بھی مسلسل نہیں۔ وہ ۱۹۲۴ء میں لندن

آئے اور امریکی صحافتی تشریف بن گئے۔ پھر کوبا کی واپسی پر ۱۹۵۴ء میں جبکہ وہ ایک طیارہ کے حادثہ کے بعد، جو افریقی علاقہ یوگنڈہ میں پیش آیا، ابھی زیر علاج ہی تھے کہ ان کو نوبل انعام پانے کی مسرت حاصل ہوئی۔ یہ مسرت انھیں بڑی محنت اور مشقت کے بعد ملی۔ کیونکہ لکھنے کی مشق کو جاری رکھنے اور کامیاب بنانے میں انھیں ایک آہنی عزم سے کام لینا پڑا۔ اپنے افسانوں میں وہ خاص طرز کے موجد تھے اور اس جدت کی خاطر وہ اصولوں کو بھی نظر انداز کر جاتے۔ ان کو کسی معقول و منطقی سے غرض نہ تھی۔ وہ صرف تاثرات کو سب کچھ جانتے تھے اور دماغ کی جگہ صرف دل میں اترنا چاہتے تھے۔ شاید یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہو۔ ان کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو اجزائے ثلاثہ میں اصلی واقعہ کی اہمیت ماحول کی عکاسی اور سادے بول کے سوا کچھ نہیں۔ ہیمنگوے کا کلام استدلال اور زور قلم بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دوسروں کی نقل کرنے سے ہم کوئی فوقیت نہیں پا سکتے۔ ہمیں اپنے کمال کے لئے اپنی ہی راہ نکالنی چاہیئے۔ جس کا نتیجہ شدید مکنت پیہمی تھی اور یہی شدت ان کی شہرت کا باعث ہوئی۔ ان کو وہ تمام کامیابی و شہرت زندگی ہی میں مل گئی تھی۔ جس کے لئے دوسروں کو موت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس شہرت کا سبب خود بتاتے ہیں:-

"ہمارے کسی فعل سے، پہلے صرف چند آدمی متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن اس فعل کو جب ہم مسلسل کرتے ہیں تو اس سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور وہ اس کا ذکر اپنے بچوں سے کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ تذکرہ ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا ہے۔ اور جب یہ تذکرہ کتابی شکل اختیار کرے اور کتاب مقبول بھی ہو تو وہ ایک بڑی مدت تک قائم رہے گی۔"

یہ تصورات تو ہیمنگوے کے ابتدائی نقوش ہیں جو شہرت و کامیابی کے حدود سے آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن میرے نزدیک ان کا آخری زمانہ بہت بوجھل گزرا۔ کیونکہ خیال کا بوجھ بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ تبدیلی اور تفریح اس کو ہلکا کرتی ہے۔ امید آگے بڑھاتی اور اعتدال پر صحت قائم رہتی ہے۔ اگر خیال آگے نہ بڑھے تو مہلک بن جائے۔ طبیعت پر اس کی گراں باری تلوار سے سخت ضرب لگاتی ہے۔ اس کا زخم نہیں بھرتا اور مایوسی تو موت ہی ہے۔ یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ ہیمنگو سے کی آخری نوبت کسی سیلاب خیال میں ڈبانے کی محرک ہوئی یا مایوسی نے کام تمام کیا۔ یہ بھی شبہ سے خالی نہیں کہ انھوں نے باپ کی طرح خودکشی کر لی۔ ڈاکٹر کلارنس کی موت بھی اسی ماحول میں ہوئی جس کا عکس بیٹے کی موت کا جواب بن گیا ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ ان پیشقدتوں کا بڑا غایہ ہوا۔ ان کے اعصاب ذکی الحس اور فکر ور ہو چکے تھے۔ بدن میں رعشہ نہ ہو، مگر ہاتھوں میں جنبش ہوئی اور قابو نہ چل سکا۔ اب دم آنکھوں میں تھا۔ کوس رحلت بجا اور دوسری دنیا کا سفر شروع ہو گیا۔ یہاں کی پرواز زمان و مکان کی پابند تھی۔ مگر ہیمنگوے کا مطالعہ بلند ہو گیا۔ ان کی نگاہیں فضائے بسیط کو چیر کے آگے بڑھیں اور خیال کی گیئر شوٹ میں زمانہ کی وسعتیں گھر گئیں۔ وہ دل کی گہرائیوں میں ڈوبا تو تاثرات کا سمندر سے کر نکلا اور عالم بالا میں گم ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ کچھ نہ معلوم ہوا۔ پھر اس خاکی پتلے کی حقیقت ہی کیا تھی؟ اس کو یہیں چھوڑا اور آگے بڑھا۔ وہ اس قید و بند سے تنگ آ چکا تھا اور چند دنوں سے غیر شعوری طور پر اپنے پرواز کی ایک نئی دنیا ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ کس کا جام لبریز ہوا؟ اور "یہ گھنٹی کس کی موت کی پکار ہے"۔ انتظار کی جن الجھنوں کو ظاہر کرتی ہے وہ دوسروں کے لئے شرکت غم کی دعوت ہو لیکن خود اپنے لئے اس کے اندرونی ہیجانوں کی تسکین۔ وہ ساری زندگی موت سے لڑتا رہا شاید سکون کا یہی ذریعہ ہو۔ موت اس کا دل پسند موضوع تھا۔ اب وہ ایک نئے طوفان کے مقابلہ کی ٹھان چکا تھا مگر مہلت نہ ملی اور وہ چل بسا۔ اس ضمن میں ان کی بیوہ مسز ہیمنگوے کا بیان کتنا عبرت ناک ہے کیمشن کے پہاڑ کی چوٹی میں اخبار نویسوں سے فرماتی ہیں:-

"تمام دن ایک بڑا ذخیرہ بینک میں محفوظ ہے اب ان کا ارادہ تھا کہ انھیں مکمل کر کے شائع کر دیا جائے لیکن انھیں کیا معلوم کہ صبح ہوتے ہی وہ اس دنیا سے سفر

کرنے والے ہیں۔ زندگی کی آخری رات کا کھانا انھوں نے بڑے اطمینان سے کھایا۔ ادھر موت صرف گھنٹوں کی منتظر، ادھر گھر میں سکون و مسرت موجود۔ کھانے کے بعد وہ دانتوں میں خلال کرتے ہوئے برآمدے میں آئے۔ "میں نے تمہارے لئے کوئی تحفہ پیش کروں" اور ایک طاؤسی گیت گانے لگی۔ اب دانت صاف ہو چکے تھے۔ ہیں جب گیت کے آخری حصہ پر پہنچی تو وہ بھی میرے ساتھ گنگنانے لگے۔ یہی رات، موت کی صبح ہونے والی تھی۔ بتلائیے ان صورتوں میں یہ سانحہ کتنا سخت و دردناک ہے!"

ہینگوئے کی یہ پُر درد بیان سنگ آمد و سخت آمد کی ایک زبردست مثال ہے۔ جس کی چوٹ سخت سے سخت دل بھی محسوس کرے گا۔ ان تمام مسدودوں کی اشاعت بھی ہوگی۔ مگر اپنی شادکامی پر اطمینان کا سانس لینے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکا ہے۔

---

قاسم شبیر نقوی نصیرآبادی

## غزل

خلوص عشق میں کن مشکلوں سے آیا ہے — کبھی انھیں تو کبھی خود کو آزمایا ہے
صلہ حیات کا اس طرح دل نے پایا ہے — نفس نفس غم الفت کے کام آیا ہے
جنون عشق کبھی یوں بھی رنگ لایا ہے — ترے خیال میں خود کو گلے لگایا ہے
طرح طرح سے تمنا فریب دیتی ہے — سمجھ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں بھلایا ہے
یہ دل زمین کے ذروں پہ کر سکا نہ نگاہ — یہ دل فلک کے ستارے بھی توڑ لایا ہے
نگاہ عام تھی گم رنگ و بو کی منزل میں — نگاہ لالہ نے کانٹوں میں حسن پایا ہے
نئے نئے نکل آئے ہیں پہلوئے غم دل — کبھی جو ترک محبت کا وقت آیا ہے
یہ درد عشق حیات آفریں سہی لیکن — مگر یہ درد کہاں سب کو راس آیا ہے

مرے لئے تو وہیں تک ہے زندگی قاسم
جہاں تک ایک نگاہ کرم کا سایا ہے

ناصر یزدانی

# گوا کی آزادی

## (ایک تاریخی تقاضہ کی تکمیل)

تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ گوا، دمن اور دیو ہندوستان کا اٹوٹ انگ اور جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان کا حصہ ہیں۔ یہاں ۴۵۰ سال سے زیادہ پرتگیزیوں نے اپنا غاصبانہ تسلط قائم رکھا، مگر یہاں کے باشندے آج بھی کونکنی زبان بولتے ہیں جو آریوں کی قدیم زبان پراکرت بھاشا کی ایک شاخ ہے۔ اب بھی یہاں سنسکرت زبان کے اثرات ملتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کی بیش تر آبادی اپنے قدیم مذہب ہندو دھرم پر قائم ہے۔

ہندوستان میں پرتگیزیوں کے قبضہ کی ابتدا پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے نواب اور راجے ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ سب سے پہلا پرتگیزی جو ہندوستان کی سرزمین پر آ کر اترا وہ ایک سیاح تھا جس کا نام پیرو۔ڈی۔کوولہا تھا۔ وہ ۱۴۸۷ء میں کناور کے ساحل پر آ کر اترا تھا اور ایک عربی تاجر کے بھیس میں ایک عربی جہاز پر سفر کر رہا تھا۔ اس نے ہندوستان کے متعلق معلومات کا جائزہ لیا۔ کالی کٹ، گوا اور مالابار کے ساحل کے مختلف شہروں کی سیاحت کی۔ اس نے عربوں کی جہازرانی اور ہندوستان کے ساحلی راستوں کی اطلاع اپنے ملک کو بھیجی، ساتھ ہی اس نے ہندوستان کی تجارتی اہمیت اور یہاں کی آپس کی پھوٹ اور عسکری طاقت کے فقدان کی خفیہ اطلاع بھی اپنے ملک کو دی۔ ہندوستان کی فیروزمند دولت کے افسانے یوں بھی یورپ میں مشہور تھے۔ پرتگیزی بھی طاقت کے بل بوتے پر یہاں کی دولت لوٹنے کے لئے بے قرار تھے۔ لہٰذا ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کا جہازی بیڑہ کالی کٹ میں آن پہنچا۔

کالی کٹ میں واسکوڈی گاما یہاں کے حاکم زمورین کا مہمان ہو گیا مگر پرتگیزیوں کی نازیبا حرکتوں کی وجہ سے زمورین ناراض ہو گیا۔ واسکوڈی گاما کے آدمیوں نے زمورین کے چند درباری پکڑ لئے اور انھیں قید کر کے وہاں سے چل پڑے۔ زمورین کے سپاہیوں نے کشتیوں میں بیٹھ کر ان کا پیچھا کیا مگر ناکام رہے۔ راستے میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان کے کئی جہاز سمندر میں غرق کر دئے۔ دو سال بعد پیڈرو الوارینز کیبرل کی سرکردگی میں ایک اور بیڑہ کالی کٹ پہنچا اور کالی کٹ کے حکمران کو مجبور کر دیا کہ وہ پرتگیزیوں کو ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دے دے۔ مگر جلد ہی دونوں فریقوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ۱۵۰۰ء میں پرتگیزیوں اور عربوں میں ایک فوجی تصادم ہوا جس میں ۵۰ پرتگیزی ہلاک ہوئے۔ مقامی باشندوں نے پرتگیزیوں کے تجارتی مرکز تباہ کر دئے۔ اس کے بعد پرتگیزی جنوب کی طرف کوچین چلے گئے جہاں کا راجہ کالی کٹ کے حکمران زمورین سے پرانی مخالفت رکھتا تھا۔ راجہ نے زمورین سے لڑنے کے لئے پرتگیزیوں کی مدد مانگی اور اس کے بدلے میں انھیں تجارتی مراعات

وے دیں۔

کچھ عرصہ تک پرتگیزی ہندوستان میں تجارت کے ذریعہ اپنے قدم جماتے رہے۔ یہاں کے مصالحہ جات کی تجارت سے وہ روزبہ روز مالا مال ہوتے گئے۔ آخر کار طور پر ہندوستان میں اپنے پاؤں جما نے کے لئے ۱۵۱۰ء میں نئے وائسرائے الفانسو ڈی۔ البوقرق کی سرکردگی میں پرتگیزیوں نے ہندوستان پر ایک زبردست وحشیانہ حملہ کیا۔ اس حملہ کے لئے انھوں نے گوا کے ساحلی شہر کو ہی موزوں ترین شہر سمجھا اور زبردست بسالت کی۔ یکم مارچ کو انھوں نے شہر کو فتح کر لیا۔ دو ماہ بعد بیجاپور کے نواب یوسف عادل شاہ نے گوا کو آزاد کرانے کے لئے ایک بھاری فوج بھیجی جس نے پرتگیزیوں کو مار بھگایا۔ مگر نومبر میں چودہ جہازوں کا ایک فوجی بیڑہ پرتگال سے چل کر آن پہنچا اور شہر کو پھر فتح کر لیا۔ اس فتح کی اطلاع حسب ذیل الفاظ میں البوقرق نے اپنے ولی عہد کو بھیجی تھی۔ "میں نے شہر کو جلا ڈالا ہے اور قتل عام کا حکم دے دیا ہے۔ کئی دن سے شہر میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ہم نے شہر کی ساری مسجدوں کو آگ لگا دی ہے اور ایک مسلمان کو بھی زندہ نہیں چھوڑا۔ ہم اب تک چھ ہزار لاشیں گن چکے ہیں۔"

پرتگیزیوں نے ۱۵۰۵ء میں دیو اور ۱۵۵۹ء میں دمن کو بھی فتح کر لیا۔ اور اس طرح انھوں نے ہندوستان پر باقاعدہ قدم جما لئے۔ ۱۵۱۷ء میں یہاں پادریوں سے بھرے ہوئے کئی جہاز بھیجے گئے جنھوں نے یہاں باقاعدہ حکومت کی سرپرستی میں عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کر دی۔ ۱۵۴۸ء میں ایک پرتگیزی گورنر نے لکھا۔ "پرتگیزی ہندوستان میں ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں صلیب لے کر پہنچے ہیں مگر یہاں لاتعداد سونا دیکھ کر ان کا عقیدہ متزلزل ہو گیا ہے اور انھوں نے صلیب ایک طرف رکھ کر جیبیں بھرنی شروع کر دی ہیں۔" تاہم پرتگیزیوں کا تسلط انھیں مقامات تک محدود رہا۔ وہ برطانوی اور ولندیزی استعماریت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انھوں نے گوا میں لاتعداد چرچ اور قلعے بنائے اور اپنی تجارت اور حکومت کے ذریعے دور میں گوا کو مشرق کا سب سے زیادہ حسین شہر بنا ڈالا۔ لیکن ترقی کے اس دور میں بھی مقامی باشندے غریب اور مفلوک الحال رہے۔ ان کی حیثیت غلاموں جیسی تھی اور جسمانی محنت کے سارے کام انھیں کالے لوگوں سے لئے جاتے تھے۔

ہندوستانی مورخین کا کہنا ہے کہ ان ساڑھے چار سو برسوں میں وہاں پچاس سے زائد عوامی بغاوتیں سر اٹھا چکی ہیں۔ سب سے پہلی بغاوت ۱۶۵۴ء میں ہوئی تھی۔ اس کا بانی ایک ہندوستانی (مراٹھا) پادری تھا۔ اس کے بعد اٹھارھویں صدی میں ان بغاوتوں کا سلسلہ تیزی سے قائم ہو گیا۔ ۱۸۵۲ء میں ایک مرہٹہ بیڈرہ دیسائی کی سرکردگی میں زبردست بغاوت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دیسائی کے ساتھیوں نے کئی مقامات کو فتح کر لیا۔ خود وائسرائے کو اس کی سرکوبی کے لئے آنا پڑا اور پرتگیزیوں نے اپنی حکمت عملی سے چند لیڈروں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور مرہٹوں کو فوج میں ملازمتیں دینے کا وعدہ کر لیا۔ باغیوں کو رہا کرنے کی شرط تسلیم کرنی پڑی۔ مگر جیوں جیوں وقت گزرتا گیا پرتگیزیوں نے ظلم و زیادتی کا سلسلہ پھر شروع کر دیا اور بہت سی مراعات واپس لے لیں۔ ۱۸۷۰ء میں ایک عام فوجی بغاوت ہندوستانی سپاہیوں نے بڑے زور شور سے کی۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لئے اپنے ملک سے سینکڑوں سپاہی لانے پڑے تھے۔ اس کے بعد ۱۴ ستمبر ۱۸۹۵ء کو ہندوستانی فوج نے ایک اور زبردست بغاوت کی۔ اس بغاوت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ہندوستانی سپاہی افریقہ کی مہم پر بھیجے جا رہے تھے۔ غیور سپاہیوں نے اپنے مذہبی عقیدت کی آڑ لے کر سمندر کے سفر کا بہانہ کر ڈالا۔ گمان غالب ہے کہ وہ افریقی لوگوں پر کئے جانے والے مظالم کا ذریعہ نہ بننا چاہتے تھے۔ اس کے بعد سے بغاوتوں کا ایک سلسلہ جاری رہا مگر ہر بغاوت فیرمعمولی تشدد کے بعد دبا دی جاتی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ گوا کے حریت پسند بھی اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے رہے مگر انگریزوں کی نسبت یہاں آزادی کی تحریک کو پھلنے کے لئے زیادہ دردناک اختیار کی جاتی تھی۔ تاہم آزادی کی جدوجہد کے آگے ظلم و تشدد کے سیلاب کو پیچھے ہٹنا پڑا اور ۱۹۵۰ء تک دادرا اور نگر حویلی کا علاقہ آزاد ہو گیا۔ ان علاقوں کے آزاد ہوتے ہی حکومت نے وہاں پنچایتیں قائم کیں، اسکول اور ہسپتال کھولے اور بیگار کا قانون ختم کر کے ٹیکس کم کئے۔ یہاں سڑکیں بنائی گئیں

جہاں پہلے صرف چار مدرسے تھے وہاں اب پچاس مدرسے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ تمام رعایتیں اور آزادیاں صرف اسی وقت ممکن ہو سکیں جب وہ غلامی سے چھٹکارا پا سکے۔

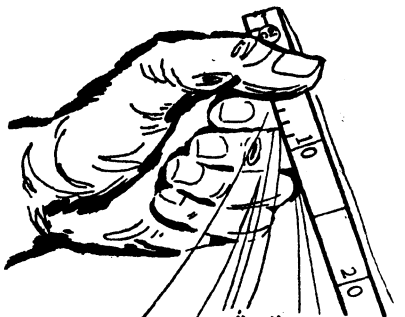
وادیٔ اوزگر حویلی کی آزادی کے بعد گوا کے باشندوں کو آزادی کی نعمت کا بھی طور پر احساس ہوا۔ گوا کے باشندے اپنے ہندوستانی بھائیوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ ہندوستان کے پانچ سالہ پلانوں اور یہاں کی انفرادی اور آئینی آزادی کا مقابلہ اپنے یہاں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور حکومت کی سختی سے کرتے تھے اور دل ہی دل میں یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ وقت دُور نہیں جب وہ اپنے قدیم بھائیوں کے گلے سے لگ جائیں گے اور بیرونی اور خود غرض حاکموں سے نجات حاصل کر لیں گے۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۵۵ء سے انھوں نے آزادی کی مہم تیز کر دی۔ پُرامن جلوسوں پر گولیاں چلائی گئیں۔ ستیہ گرہیوں پر مظالم توڑنے کے لئے خاص قسم کے تربیت یافتہ کتے لائے گئے۔ جو پُرامن ستیہ گرہیوں پر چھوڑے جانے لگے۔ مگر ہندوستان کی امن پسند حکومت صبر و سکون سے باہمی گفت و شنید کے ذریعہ آزادی کی کوششیں کرتی رہی۔

بہرحال اس تمام ظلم و ستم کا نتیجہ وہی نکلا جو مستقبل کے مورخ کا فرمان تھا۔ ۱۹۔ دسمبر کی صبح کو گوا ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔ گوا جس کا رقبہ ۱۳۱۲ مربع میل ہے ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۶۳۸۰۰۰ ہے۔ ہندوؤں کی تعداد ۶۱ فی صد ہے اور عیسائیوں کی ۳۷ فی صد۔ دمن کا رقبہ ۲۱۱ مربع میل ہے اور دیو کا رقبہ ۱۴ مربع میل۔ بمبئی اور گوا کے درمیان ۲۳۰ میل کا فاصلہ ہے۔ گوا کا دارالخلافہ پانم شہر ہے۔ تجارتی اعتبار سے یہ ساحلی شہر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ان تینوں نو آزاد علاقوں میں قدرتی وسائل بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں معدنی اشیا وافر مقداروں میں پائی جاتی ہیں اور اس کے اردگرد سمندر میں مچھلیاں بکثرت ملتی ہیں۔ یہاں کے جنگلات میں عمارتی لکڑی بکثرت پائی جاتی ہے۔ یہاں کی زرخیز زمین اور گرم سمندری آب و ہوا اور بکثرت بارش اور دیگر سہولتوں کے پیش نظر معمولی کوشش اور پلاننگ سے لوگوں کا معیار زندگی غیر معمولی حد تک بلند کیا جا سکتا ہے اور یہ صرف قومی حکومت میں ہی ممکن ہے۔ یہاں کے باشندے چاول اور تاڑیل کی کاشت کرتے ہیں۔ باوجود اتنی زرخیز زمین کے یہاں کے کسان غیر معمولی افلاس کا شکار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس زمین کے قطعے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آبادی کے بیشتر افراد کے پاس سرے سے زمین ہے ہی نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہاں کے باشندے اپنی کاریگری میں ثانی نہ رکھتے تھے یہاں کے باشندوں کی قدیم دستکاریاں بُنائی، ملمع سازی اور چمڑی نقش کاری وغیرہ جن کا ایک زمانہ میں بڑا شہرہ تھا، ہمدمانی کی داستانیں بن کر رہ گئی ہیں۔ ان علاقوں کی اقتصادی زندگی کی سب سے بڑی چیز یہاں کی معدنی منحت ہے۔ گوا کی زمینوں میں المونیم اور نکل کی دھاتیں پائی جاتی ہیں یہاں کی سب سے زیادہ اہم معدنیات لوہا اور منگانیز ہیں۔

ہندوستان بنیادی طور پر ایک پُرامن ملک ہے۔ دنیا عجب میں نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے لئے ہندوستان نے جو آواز بلند کی ہے اس کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ خود ہندوستان کا چپہ چپہ بیرونی حکمرانوں سے پاک ہو۔

گوا کی آزادی کا مطلب ہے وہاں کے باشندوں کی آئینی، سیاسی اور اقتصادی آزادی۔ کل تک وہاں منصوبہ بندی یا ترقیاتی پروگراموں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ پرتگیزی استعمار پرست وہاں کی دولت کا آخری قطرہ تک نچوڑنے کی فکر کر رہے تھے اور وہاں کے عوام کا معیار زندگی تیزی سے پست ہو رہا تھا۔ اب قومی حکومت میں گوا کے باشندے اقتصادی اور تہذیبی طور پر ترقی کر سکیں گے وہ اپنے مقدر کے خود مالک ہوں گے۔ وہ دن دُور نہیں جب ہم ایک پھلتے ہوئے گوا کو اپنی آنکھوں سے خوشحال حالی سے بغل گیر ہوتے دیکھ سکیں گے۔

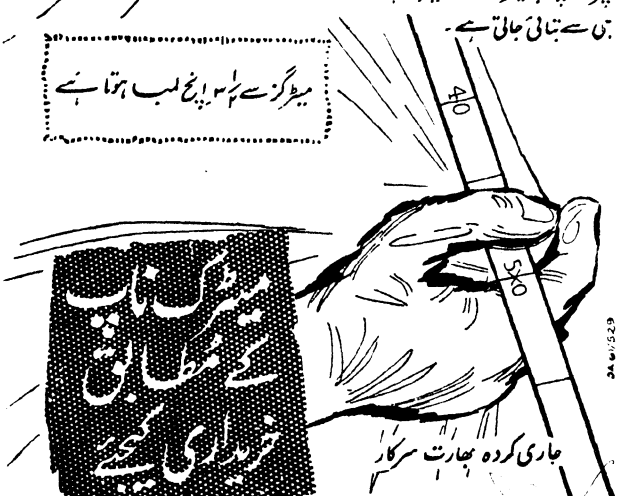


# میٹر ناپ کو اپنائیے

یکم اکتوبر سے لمبائی ناپنے کے پیمانے کے روپ میں میٹر کا استعمال شروع ہو چکا ہے۔ ایک سال کے بعد گز، فٹ، انچ کا استعمال قانونی نہیں رہے گا۔

کپڑے پر اب میٹر کا نشان بنایا جاتا ہے۔ اور قیمت بھی میٹر کے حساب سے بتائی جاتی ہے۔

میٹر گز سے ۳½ انچ لمبا ہوتا ہے



## میٹرک ناپ کے مطابق خریداری کیجیے

جاری کردہ بھارت سرکار

58 ا/529



# بچت کی بچت جلدی کی جلدی

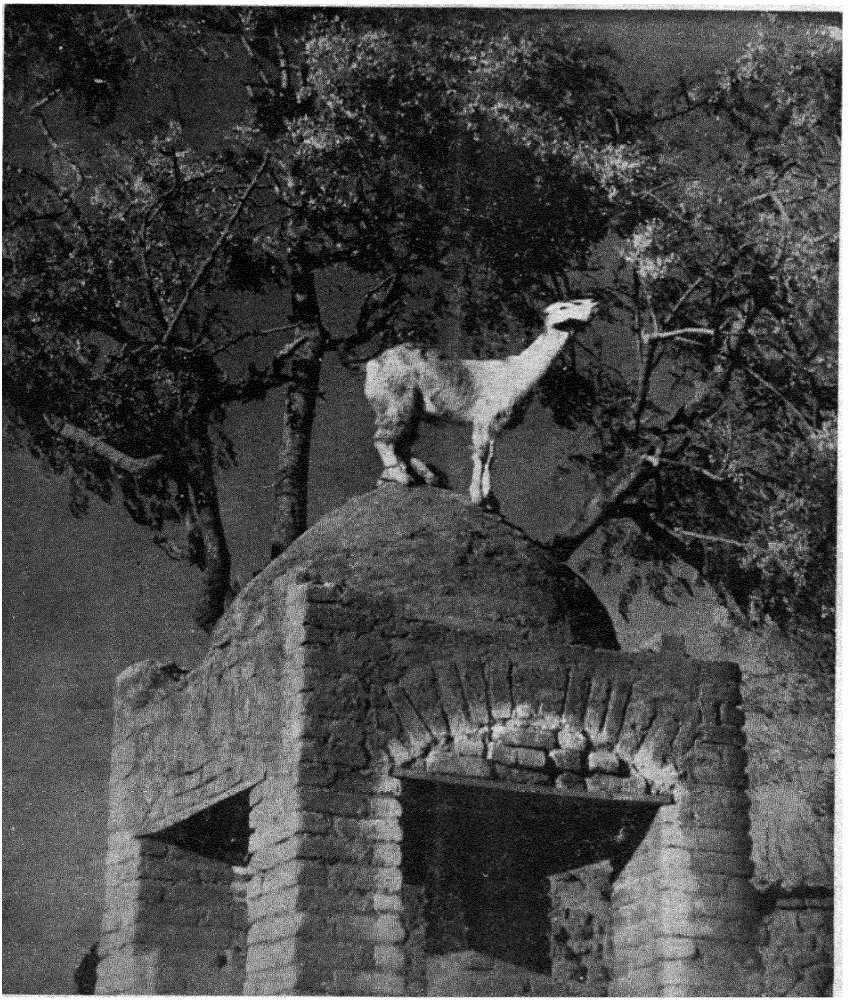
کام بہت ضروری ہو، جبھی تو آپ تار بھیجتے ہیں۔
تو پھر پتہ پورا کیوں نہیں لکھتے۔ پتہ پورا ہونے
سے تار یقیناً جلدی پہنچتا ہے۔
پتہ ادھورا ہونے کی صورت میں تار کے دیر
سے پہنچنے کا امکان ہے۔
آپ پیسے بھی بچا سکتے ہیں اور تار بھی جلدی پہنچ سکتا
ہے۔ وہ کیسے؟ تار ٹیلی فون نمبر کے پتہ پر دیجئے۔
پتہ یوں لکھئے مثلاً "برج راج ٹی۔ ایف۔ ۳۱۶۷۰
دہلی" جیسے ہی تار دہلی پہنچے گا اُسے ٹیلی فون پر
پڑھ کر سنا دیا جائے گا۔

پتہ ہیں "ٹی۔ ایف۔ ۳۱۶۷۰" کو ایک ہی لفظ مان کر دام لگائے جاتے ہیں۔

## ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمۂ ڈاک و تار

DA 61/962

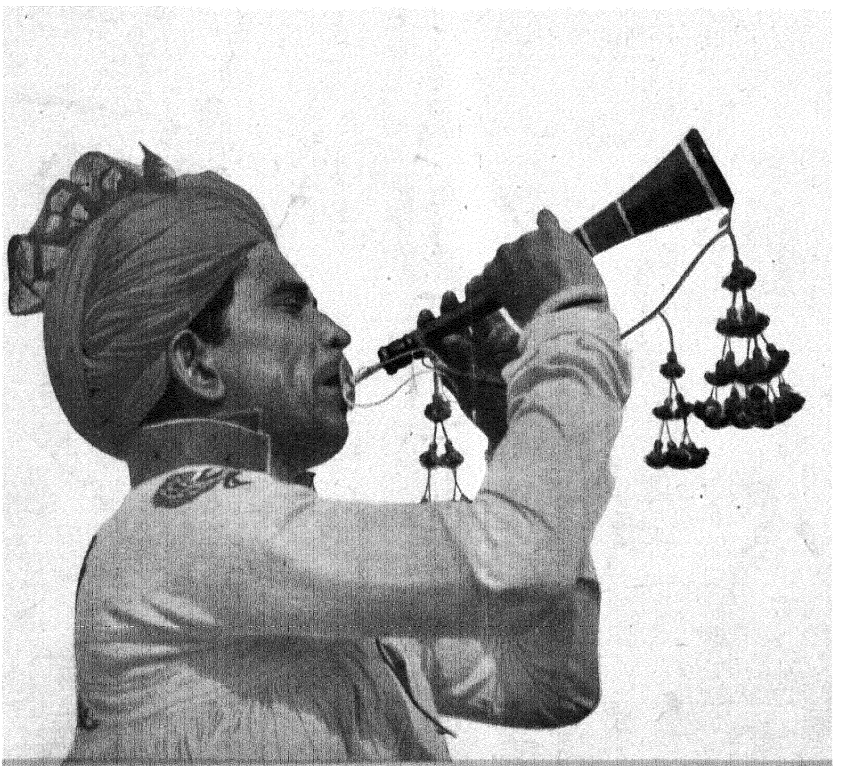


Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**

# آج کل

پھالگن شک سمہ ۱۸۸۳
مارچ سنہ ۱۹۶۲ء



۶۰ نئے پیسے

# ہماری کتابیں



| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پنڈت نہرو سے بات چیت ٹیبر منڈی | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| تیسرا پنج سالہ پلان | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ۴۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ۳۵ نئے پیسے | ۱۰ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں | ۱۰ نئے پیسے | ۸ نئے پیسے |
| نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ | (فی نمبر) | (فی نمبر) |

ملنے کا پتہ

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

# آج کل دہلی

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاقات | ادارہ | ۲ |
| بیدل کی کتابِ زندگی کا آخری ورق | ملا کاکوی | ۳ |
| شہزادی زیب النساء بیگم | رینا بیتربی | ۵ |
| قدم ملا کے چلیں | نجیب رامشی | ۱۲ |
| ادب اور مقصدیت | صابر شاہ آبادی | ۱۳ |
| فتح آدم | منیر الدین احمد | ۱۹ |
| جھلکیاں | دھی عارف | ۲۰ |
| کرکٹ | عرشی ملسیانی | ۲۱ |
| ایبسٹریکٹ آرٹ | من موہن تلخ | ۲۷ |
| غزل | سعادت نظیر | ۳۲ |
| دل فنت، فنت | نریندر لوتھر | ۳۳ |
| تربیت | ہنس راج رہبر | ۴۰ |
| ایٹی تھا نائی | اندرجیت لال | ۴۳ |
| غزل | عزیز حامد پوری | ۴۶ |


مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد حبیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | سری نگر |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| عبدالقادر سروری | حیدرآباد |

یو۔ ایس مہیش راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی۔ این۔ ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نجف ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرشی ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)
مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر:۔ مظفر حسین

سرورق :۔ گجرات کا ایک لوک کلاکار
رسالے کی پشت پر :۔ سورج مکھی

پھالگن شک سمہ ۱۸۸۳

مارچ ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ — نمبر ۸

سالانہ چندہ:۔
ہندوستان میں :۔ سات روپے
پاکستان میں :۔ سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :۔ ۱۰ شلنگ یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ :۔
ہندوستان میں :۔ ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :۔ ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :۔ اشلنگ یا ۱۰ سنٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرشی ایڈیٹر آج کل اردو ادارہ سیکرٹریٹ دہلی ۶

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

# ملاحظات

ایک زمانہ تھا کہ افریقہ کو تاریک براعظم کہتے تھے لیکن ہندوستان کے حصولِ آزادی کے بعد افریقہ کے کروڑوں غلام خوابِ غفلت سے اُٹھے اور آزادی کا نعرۂ مستانہ لگانے لگے ہیں۔ الجیریا میں سات سال سے جنگ و جدل کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ آخر اب حالات یہاں تک پہنچے ہیں کہ فرانس کے صدر جنرل ڈیگال نے اعلان کر دیا ہے کہ الجیریا کے قوم پرستوں کے ساتھ گفت و شنید اس مقام پر پہونچ گئی ہے کہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ الجیریا میں جلد امن قائم ہو جائے گا۔

سامراجی نظام جہاں بھی ہے اُسے جلد ختم ہونا ہے۔ اس دورِ جمہور میں کوئی قوم زیادہ دیر تک غلام نہیں رہ سکتی۔ کانگو میں حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ اقوامِ متحدہ نے کارروائی کر کے وہاں بھی سامراجی نظام کے ہاتھوں میں کھیلنے والوں کی سرگرمیوں کو کچل کے رکھ دیا ہے۔ کاٹنگا سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ بلجیئم کمپنیاں اور کچھ یورپی لوگ کاٹنگا کو کانگو سے الگ رکھنے میں مسٹر شومبے کی مدد کر رہے تھے۔ لیکن مقامِ مسرت ہے کہ مسٹر شومبے اب راہِ راست پر آ رہے ہیں اور امید کی جا سکتی ہے کہ کانگو کی سالمیت قائم رہے گی۔ شومبے کے بعد لومبا کے ساتھی گزنگا نے کانگو کی مرکزی حکومت کی مخالفت کی لیکن اب وہ حراست میں ہیں۔ اور کانگو کے وزیرِ اعظم اڈولا نے اعلان کیا ہے کہ ان پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ مسٹر اڈولا نے اقوامِ متحدہ کی امن دوستی کی تعریف کی ہے اور جو فوجی مدد کانگو کو اقوامِ متحدہ نے دی ہے اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔

گانبیا کو آزادی ہو گیا۔ آزاد ممالک کی برادری میں ایک اور ملک کا اضافہ ہوا۔ اس کے قوم پرست لیڈر نیریری نے وزیرِ اعظم کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے لیکن یہ استعفیٰ وزارت میں کسی اختلاف کا نتیجہ نہیں بلکہ موصوف قومی اور ملکی بک جہتی کا کام زیادہ تن دہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ وزیرِ اعظم رہتے ہوئے شاید یہ فریضہ ادا کرنا اتنا آسان نہ تھا۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد بڑا مفید لسانی، ادبی اور ثقافتی کام کر رہا ہے۔ اس ادارے کے اہتمام سے ہر سال یوم قلی قطب شاہ منایا جاتا ہے۔ اس دفعہ بھی ماہ جنوری کے دوسرے ہفتے میں یہ تقریب منائی گئی۔ تاجدار دکن ہونے کے علاوہ قلی قطب شاہ شہر حیدرآباد کا بانی اور اردو زبان کا سب سے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہوا ہے۔ اس موقعے پر رنگا رنگ پروگرام پیش کیا گیا ادارے کے معتمدِ اعزازی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی جس میں ادارۂ ادبیات کی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔

اس سال یومِ جمہوریت کے اعزازات میں اردو کے حصے میں پدم بھوشن کے دو اعزاز آئے ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور جناب نیاز فتح پوری مدیر نگار کو یہ اعزاز ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ملا ہے۔ دونوں بزرگ مدت العمر سے اردو ادب کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ امید ہے کہ اردو کے حلقوں میں ان بزرگوں کی قدر افزائی پر اطمینان کیا جائے گا۔

ڈاکٹر حفیظ سید آبادی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے مدت تک متعلق رہے، اب ریٹائر ہو چکے تھے، حال ہی میں ان کے انتقال پُر ملال کی خبر آئی ہے۔ موصوف عثمانیہ سوسائٹی سے بھی متعلق تھے۔ بڑے مرنجاں مرنج قسم کے وضعدار انسان تھے۔ آج کل میں اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اُن کا انتقال ایک ادب دوست اور شریف انسان کا انتقال ہے۔ ادارۂ آجکل کو ان کے لواحقین سے پوری ہمدردی ہے۔

عطا کاکوی

# بیدل کی کتابِ زندگی کا آخری ورق

بیدل نے کافی عمر پائی۔ دورِ شاہجہانی میں ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے لفظ 'انتخاب' سے ولادت کی تاریخ برآمد ہوتی ہے اور دورِ محمد شاہی میں ۱۱۳۳ھ میں وفات ہوئی۔ 'میرزا بیدل از عالم رفت' وفات کی تاریخ ہے، خوشنؔ گو نے کیا اچھی تاریخ نکالی ہے جس سے روزِ تاریخ اور مہینہ سب ظاہر ہوتا ہے۔ "یوم پنجشنبہ چہارم ماہ صفر" برٹش میوزیم میں بیدل کی رباعیات کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں کاتب نے دورانِ تحریر یہ لکھا ہے، کہ آج بتاریخ ۴ صفر بیدل کا انتقال ہوا۔ بعض تذکروں میں ۳ صفر تاریخ وفات ہے، یہ غلط ہے، ممکن ہے یہ اختلاف روایت کی وجہ سے ہو۔ خوش گو سے بڑھ کر شہادت اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کو بیدل سے بڑی عقیدت تھی، دن رات ان کی خدمت میں باریاب تھا خود اپنے سفینہ میں لکھتا ہے کہ ہزار سے زیادہ بار وہ بیدل کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ بیدل کی وفات کے وقت وہ دلی ہی میں تھا اور فاتحہ سوم میں شریک تھا، بقول خوشگو بیدل ماہ محرم ۱۱۳۳ھ میں بیمار پڑے، بخار آیا، چار پانچ دن بخار رہا۔ پھر اُتر گیا، غسل کیا۔ غسل کے دوسرے دن ۳ صفر چہارشنبہ کی شام حرارت پھر عود کر آئی، رات بھر بخار رہا۔ نواب عبرت خاں ببرؔ صلابت جنگ جن سے بیدل کا یارانہ تھا رات بھر بیدل کے ساتھ رہے۔ ان کا بیان ہے کہ کبھی افاقہ ہو جاتا اور کبھی بے ہوشی طاری رہتی۔ افاقہ کے وقت بے اختیارانہ ہنسی آنے لگتی۔ بہ مصداق بیت قدیم ؎

جاناں بہ قمار خانہ رندی چیزند
بر نسیہ و نقد ہر دو عالم خیزند

بہرحال یاس کی حالت طاری ہوتی رہی یہاں تک کہ صبح کو حالی دگرگوں ہو گیا بتاریخ ۴ صفرروز پنجشنبہ ۱۱۳۳ھ دن کے چھ بجے انتقال کیا اور اپنی ہی حویلی کے صحن میں اس قبر میں دفن ہوئے جو دس سال پہلے ہی سے اپنے لئے بنوا رکھی تھی۔ یہ حویلی نواب شکرالله خاں اور نواب شاکر خاں نے دہلی دروازہ کے باہر محلہ کھیکھریاں گذر گھاٹ کے کنارے سے جو لطف علی حویلی کے نام سے موسوم تھی مبلغ پانچ ہزار میں خرید کر کے نذرِ بیدل کی اور ان کا دو روپیہ یومیہ مقرر کیا۔ بیدل اس حویلی میں ۶۴ سال بے فکری کے ساتھ رہے۔ ان کا مکان مرجع خلائق تھا جن میں فیضؔ پور یا نشیبی بھی تھے اور صاحب تاج ونگیس بھی۔ مصحفی نے بیدل کا سنہ وفات حفظ شریا میں ۱۱۴۳ھ لکھا ہے۔ یہ محض غلط ہے بیدل نے اپنی ہی زندگی میں اپنے کلیات کا ایک مکمل نسخہ چوہ مصری لکھوایا تھا اور اس کے ہم وزن روپیے اور جواہرات خیرات کئے تھے۔ اس کا وزن چودہ سیر ہوا۔ اس کلیات میں تقریباً ایک لاکھ اشعار تھے جس کی تفصیل خوشگو نے دی ہے،

| | |
|---|---|
| مثنوی عرفان و بحر حدیقہ ثنائی | ۱۱۰۰۰ ابیات |
| مثنوی طلسم حیرت | ۴۰۰۰ " |

| | | |
|---|---|---|
| مثنوی لجود معرفت | ۳۰۰۰ | ابیات |
| محیط اعظم (ساقی نامہ) | ۲۰۰۰ | " |
| مثنوی تنبیہ المومنین | ۱۰۰۰ | " |
| ترجیع بند | ۱۰۰۰ | " |
| قصائد و ترکیب بند وغیرہ | ۷۰۰۰ | " |
| ہزلیات | ۳۰۰۰ | " |
| رباعیات (۴۰۰۰) بیت | ۸۰۰۰ | " |
| چہارعنصر نثر بہ مقدار | ۱۰۰۰۰ | " |
| غزلیات وغیرہ تقریباً | ۵۰۰۰۰ | " |
| | ۱۰۰۰۰۰ | ابیات |

یہ کلیات ان کے مزار پر رہتا اور سالانہ عرس کے موقع پر مشاعرہ ہوتا اور ابتدا ان ہی کی کسی غزل سے ہوتی۔ آج نہ اس حویلی کا پتہ ہے نہ مزار کا۔ خواجہ حسن نظامی نے غلط فہمی میں غالباً کسی دوسرے مزار کی مرمت کرادی۔ ضرورت ہے کہ اس مزار کا سُراغ لگایا جائے اور وہاں کوئی یادگار قائم کی جائے۔ فاتحہ سوئم کے دن ان کے بستر کے نیچے سے جو ایک تازہ غزل اور ایک رباعی برآمد ہوئی تھی خوش گو نے بیدل کے ماموں زاد بھائی مرزا محمد سعید کے پاس دیکھی اور اپنے سفینہ میں بجنسہٖ نقل کی ہے۔ بیدل کے ماموں کا نام مرزا عباد اللہ تھا۔ ان کے بیٹے مرزا محمد سعید بیدل کے جانشین ہوئے اور عرس اور مشاعرہ کا اہتمام ان ہی کے سپرد تھا۔ بیدل کا یہ کلام آخری ہے جو ان کے زبانِ قلم سے نکلا غزل کی ایک خاص فضا ہے اور کلام کی ہم آہنگی ان کے آخری وقت کے دلی جذبات کی ترجمان ہے۔ یہ یادگار تحفہ پیشِ خدمت ہے ؎

بشنو، صبح این گلستان نشاند جوشِ غبار خود را
عرق چو سیلاب از جبیں رفت و مانہ گوہرِ کار خود را

ز پاسِ ناموس ناتوانی چو سایہ ام نالہ گریز طاقت
کہ ہرچہ زیں کاروان گراں شد بدوشِ ما افگند بار خود را

بہ عمرِ موہوم فکرِ فرصت فزود صد بیش و کم ز غفلت
تو گر بیا بر اہل مزگری نفسی چہ داند شمار خود را

قلم بہ صد دشت و در گشادی ز نالہ در گوشِ فتادی
عنان بہ ضبط نفس نہادی بلیغ تے نے سوار خود را

بلندیٔ سر بجیب پستی است اعتبارِ جہان ہستی
چراغ ایں بزم تا سحرگاہ زندہ دارد مزار خود را

ز شرمِ ہستی قدح نگونی کہ باغ مستی بوہم خوں کن
تو ای حباب از طرب چہ داری پر از عدم کن کنار خود را

بجوشش گر چشم می کشودی چو موجِ دریا گہر نبودی
چہ سحر کرد آرزوئی گوہر کہ غنچہ کردی بہار خود را

اگر دلت زنگ کیں ندارد خلافِ خلقت نہ پیش آید
صفائے آئینہ شرم دارد کہ خوردہ گیرد دو چار خود را

تو شخص آزاد پرفشانی نیا متست اینکہ غنچہ مانی
فرو دو خود دار یت بزنگی کہ سنگ کردی شرار خود را

وداعِ آرائشِ نگیں کن ز شرمِ دامانِ حرص چیں کن
مزن بہ سنگ از جنونِ شہرت چو نام عنقا وقار خود را

بدر ز ذہد عاچو بیدل ز الفتِ دہم پوچ بگسل
بر آستانِ امید باطل تجمل مکن انتظار خود را

بیدل جس نے چار ہزار رباعیاں کہیں اور سعد اللہ گلشن کا یہ قول ہے کہ رباعی گوئی بیدل کا حق ہے۔ اس کی آخری رباعی بھی سن لیجئے جس کے بعد بیدل کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی ؎

بیدل کلکِ سیاہ پوشی نہ شوی تو شوئش گلوئی نوحہ کوشی نہ شوی
بر خاک بمیرد و بہیچاں او برباد مرگت سبک است بار دوشی ز شوی

یہ غزلیں اور یہ رباعی ان کے عام قلمی دیوان کے نسخوں میں نہیں اس لئے نایاب ہے۔ بیدل کا کلام ان کی زندگی ہی میں بہت مقبول ہو گیا تھا، کثرت سے ان کے کلام کے قلمی نسخے سارے ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ ہر سر سیلما نیہ پٹنہ سٹی کے کتب خانے میں ان کا ایک قلمی دیوان جو ان کی زندگی کے آخری سال میں مکتوب ہوا تھا میری نظر سے گزرا ہے۔ بیدل افغانستان اور ترکستان میں بھی بہت مقبول تھے۔ روس کے اکثر کتب خانوں میں ان کا کلیات موجود ہے۔

رینا بیز جی

# شہزادی زیب النساء بیگم

## زیب النساء کی ولادت

زیب النساء اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی۔ اس کی ماں جس کا نام دلرس بانو بیگم تھا جو شاہنواز خاں صفوی کی بیٹی تھی شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزماں تھا جو جہانگیر کے زمانے میں معزز عہدوں پر ممتاز ہو کر شاہ نواز خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔

شاہ نواز خاں نے شاہجہان کے زمانے میں بھی بڑے بڑے کارنامے انجام دئے یہاں کہ ذاتی لیاقت کے ساتھ ساتھ عالی خاندان بھی تھا اس لئے شاہجہاں نے جون ۱۶۳۹ء میں اپنے بیٹے اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی دلرس بانو بیگم سے کر دی۔ چار لاکھ اشرفی مہر باندھا گیا۔ ع

دو گوہر یک قلزم دوراں کشید

زیب النساء شادی کے دوسرے سال پیدا ہوئی اور شہزادیوں کی طرح شاہی محلات میں تربیت پاتی رہی۔

## ابتدائی تعلیم و تربیت

عالمگیری اُمراء میں عنایت اللہ خاں نہایت معزز عہدہ دار تھا۔ اس کی ماں حافظہ مریم نہایت ہی ذہین، قابل اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ چناں چہ جب زیب النساء پڑھنے کے قابل ہوئی تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لئے حافظہ مریم کو مقرر کیا۔

جس نے حسب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ زیب النساء نے پہلے قرآن شریف ناظرہ ختم کیا اور اس کے بعد دو سال چار ماہ کی مدت میں حافظہ مریم ہی کی شاگردی میں قرآن پاک حفظ یاد کر لیا جس کے بدلے میں اورنگ زیب نے حافظہ مریم کو تیس ہزار اشرفی انعام میں دی۔ اس خوشی میں شاہانہ جشن بھی منایا گیا۔ ملک کے طول و عرض میں یتیم خانے اور لنگر خانے کھولے گئے۔ غربا اور مساکین میں اشرفیاں تقسیم کرائی گئیں۔ حافظہ مریم نے شہزادی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی گہری توجہ دی۔ یہاں تک کہ تیرہ سال کی عمر میں شاہی آداب و قوانین کے ساتھ وقار پیدا ہوا اور مطلبہ تاریخ سے بخوبی واقف کرا دیا۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم کچھ اس مستحکم بنیاد پر دی گئی تھی کہ میاری اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں شہزادی کو کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

تمام تاریخیں اور تذکرے متفق الرائے ہیں کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی اور بڑے بڑے علماء اور فضلاء اس کے دربار میں رہتے تھے

## اعلیٰ تعلیم

اورنگ زیب کی طرف سے یوں تو شہزادی کے لئے کئی استاد رکھے گئے تھے لیکن اس کے اساتذہ میں سے زیادہ مقرب اور

---

لہ ماثر الامرا جلد دوم ص ۶۷۰-۶۷۱

لہ سرو آزاد تذکرہ ملا اشرف

اور باریاب ملا سید اشرف ماژندرانی تھے جو ملا سید تقی مجلسی کے نواسے تھے۔ عالمگیر کے آغاز جلوس میں ایران سے ہندوستان آئے اور عالمگیر نے ان کو زیب النساء کی تعلیم کے لئے مقرر کیا[1]۔ اس وقت شہزادی کی عمر اکیس سال کچھ ماہ کی تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تیموریوں میں مستورات کی تعلیم کا سلسلہ کس قدر بلند تھا۔

زیب النساء نظم اور نثر میں ملا سید ہی سے اصلاح لیتی تھی۔ ملا اشرف ان فاضل اساتذہ میں سے تھے جن کی لیاقت اور ہمہ دانی کا سکہ زمانے کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ علاوہ علوم رسمیہ کے وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور پایہ نفس صوفی بھی تھے۔ ملا اشرف تقریباً چودہ برس تک شہزادی موصوف کی تعلیم کے سلسلے میں رہے۔ اس دوران میں شہزادی نے موصوف سے علوم حاضرہ میں دستگاہ کامل حاصل کی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، نظام مملکی غرضیکہ ہر ایک فن پر عبور کامل حاصل کرنے کے بعد شاعرانہ ذوق بھی پیدا کیا مگر استاد محترم کا اشارہ نیز والد بزرگوار کے عندیہ کو سمجھنے کے بعد شاعری کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہزادی زیب النساء نے فن شاعری کے بنیادی اور اعلیٰ منازل پر کامل دسترس حاصل کی تھی۔ حمد و نعت لکھنے کا شوق تھا۔ تصوف اور اخلاقیات پر بھی زیب النساء کے اشعار ملتے ہیں۔ مختصر یہ کہ فن عروض و بلاغت پر شہزادی موصوفہ کو کامل عبور تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ صاحب دیوان نہ تھی۔

## ملا سید اشرف ماژندرانی کی وطن کو مراجعت

جب شہزادی نے علوم رسمیہ اور علوم ضروریہ میں کافی مہارت حاصل کر لی تو ملا صاحب نے وطن عزیز کی معاودت کا ارادہ کیا۔ مگر شہزادی استاد کے فیض و برکت سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لئے درخواست پر اس نے چنداں توجہ نہ دی اور التجا کی کہ مجھے فیض و برکت سے محروم نہ فرمایا جائے۔ ملا سید چونکہ کافی ضعیف العمر ہو چکے تھے اور وطن کی جدائی میں کافی زمانہ گزر گیا تھا۔ اس واسطے انھوں نے ایک قصیدہ لکھ کر شہزادی کے پاس بھیجا۔ قصیدہ دہلی میں شہزادی کے حضور میں پیش کیا گیا جس کے چند شعر یہ ہیں:-

یکبار از وطن نتواں برگرفت دل
ورغربتم اگر چہ فزوں است اعتبار
پیش تو قرب و بُعد تفاوت نمی کند
گر خدمت حضور نباشد مرا شعار
نسبت چوں با لمع است چہ دوری چہ اصفہان
دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ قندہار[2]

بوڑھے استاد کی اس گزارش پر شہزادی کا دل بھر آیا اور اشرف قدسی حاصل کرنے کے بعد پچاس ہزار دینار اور خلعت شاہانہ کے ساتھ وطن جانے کی اجازت دے دی گئی۔

## شہزادی کو ملکی سیاست میں دخل تھا

شہزادی زیب النساء نے جس قسم کی تعلیم پائی تھی اور خود اس کا مذاق طبیعت جس قسم کا تھا اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پالیٹکس سے بالکل ناآشنا تھی تاہم عالمگیر کے پُرپیچ دورِ حکومت کے گوناگوں واقعات نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ سیاست سے دلچسپی پیدا کرے۔ چنانچہ شہزادی نے اپنے دادا شہاب الدین محمد شاہجہان، پھوپھی جہاں آرا بیگم اور چچا دارا شکوہ وغیرہ کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات کا بھی عمیق مطالعہ کیا اور بعض ضروری امور میں اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ اکبر کو بھی خط کے ذریعے کچھ مشورے دیئے جبکہ شہزادہ اکبر فوج کی ایک جمعیت کے ساتھ راجپوتوں کی بغاوت کو دبانے کے لئے جودھپور گیا ہوا تھا اور راجپوتوں کے بہکانے سے باغی ہو کر ایک

---

[1] سرو آزاد تذکرہ ملا اشرف

[2] مقالات شبلی نعمانی جلد پنجم (تاریخی حصہ اول)

زبردست طاقت کے ساتھ عالمگیر کے مقابلے کے لئے بڑھا۔ زیب النساء اور شہزادہ اکبر دونوں حقیقی بھائی بہن تھے۔ دونوں میں برابر خط وکتابت رہتی تھی چناں چہ اس وقت شہزادی کے حریفوں کے لئے یہ بہتری موقع تھا۔ شہزادی کا خط اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا۔

## شہزادی کی نظر بندی اور جاگیر کی ضبطی

جب اورنگ زیب کو یہ معلوم ہوا کہ شہزادی زیب النساء شہزادہ اکبر کی بغاوت میں شامل ہے اور اس کے خطوط پکڑے گئے ہیں تو اس نے فوراً حکم صادر کیا کہ شہزادی کو قلعہ سلیم گڑھ میں نظر بند کر دیا جائے اور اس کی تنخواہ جو ساڑھے چار لاکھ ہے بند کر دی جائے۔ علاوہ ازیں محل اور اس کے جملہ مال ومتاع کو ضبط کر لیا جائے۔ "تفتیش حقائق" اس حکم کی سخت سے تعمیل کی گئی مگر جب اورنگ زیب کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ زیب النساء بے گناہ ہے اور خطوط محض اخلاقی حیثیت پر لکھے گئے ہیں جو شاہانہ وقار میں اضافہ تو قیر کے خاص ہیں تو اس نے نہ صرف شہزادی کو آزاد کر دیا اور اس کی تنخواہ اور جاگیر و مال ومتاع واپس کر دیا بلکہ شہزادی کے مخالفوں کو قرار واقعی سزا دی تاکہ آئندہ کسی کو اس قسم کی جرأت نہ ہو سکے۔ مآثر عالمگیری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شہزادی کی نظر بندی کی مدت تقریباً تین سال نو مہینے تک تھی۔ اس خط نے شہزادی زیب النساء کا وقار باپ کی نظر میں اور بھی بلند کر دیا۔

## شہزادی زیب النساء کی عظمت بادشاہ کی نظر میں

تحقیق کے بعد جب شہزادی زیب النساء بے گناہ ثابت ہوئی تو اورنگ زیب کی نظر میں بیٹی کی توقیر اور بھی بڑھ گئی۔ چناں چہ ۱۰۹۴ ہجری میں جب شہزادہ کام بخش (اورنگ زیب کا سب سے چھوٹا لڑکا) کی شادی ہوئی تو شادی کی تمام رسمیں زیب النساء ہی کے محل میں ادا ہوئیں اور اورنگ زیب کے حکم سے تمام ارکان دربار زیب النساء کی ڈیوڑھی تک پا پیادہ گئے۔ بادشاہ نے شہزادی کو جملہ امور میں آزادی دے دی بلکہ اکثر و بیشتر امور میں تو بادشاہ شہزادی سے مشورہ لیتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زیب النساء کا وقار بادشاہ کے دل میں کس قدر تھا۔ جب بھی وہ باہر سے آتی تو بادشاہ خود استقبال کے لئے جاتا اور شہزادوں کو بھیجتا۔ ہمیشہ سفر ہو یا حضر اس کو ہمراہ رکھتا تھا۔ کشمیر کے دشوار گزار سفر میں شہزادی زیب النساء بادشاہ کے ہمراہ تھی۔ مگر جب اورنگ زیب دکن گیا تو زیب النساء نے غالباً اپنی علمی مصروفیت کی وجہ سے پلنے تخت چھوڑنا مناسب نہ جانا اور اورنگ زیب نے بھی اسے مجبور نہ کیا۔ چناں چہ اس سفر میں زیب النساء کی چھوٹی بہن زینت النساء بیگم اورنگ زیب کے ہمراہ گئی۔

## زیب النساء بیگم نے شادی نہیں کی

زیب النساء کو باپ، بھائی اور بہنوں سے اس درجہ محبت تھی کہ وہ ان سے پل بھر کے لئے بھی جدا نہیں رہنا چاہتی تھی۔ مثل مشہور ہے۔ "بیٹی ماں ہوتی ہے۔" زیب النساء نے اس مقولہ کو یقیناً کما حقہٗ پورا کیا اور پوری زندگی باپ کی خدمت کے ساتھ ساتھ بھائی بہنوں کے لئے ماں کے فرائض انجام دئے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں سے اس قدر محبت کرتی تھی کہ تا زندگی ان کے لئے ایک مشفق سرپرست بنی رہی اور ان کی غلط اور بے جا روشوں پر مشفق والدین کی طرح نزدیاتی آمیز سرزنش بھی کرتی رہی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زیب النساء ایک قابل اور امور مملکت کو سمجھنے والی دور اندیش مدبر اور اعلیٰ درجے کی ذہین شہزادی تھی مگر وہ شادی کے قیود سے آزاد رہنا چاہتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شادی کے رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد، جن خدمات کو انجام دینا چاہتی ہے وہ سترمندۂ تعبیر نہ ہوں گے اس لئے اس نے

---

لے مآثر عالمگیری ص ۲۰۴

باوجود والدبزرگوار کی تاکید کے شادی نہ کی اور مرتے دم تک بوڑھے باپ کی رفیق کار اور بھائی بہنوں کے حق میں ماں جائی بنی رہی۔

اس نے اپنی دونوں چھوٹی بہنوں زبدۃ النساء بیگم اور زینت النساء بیگم کی شادی بھی اپنی مرضی نیز والدبزرگوار کی اجازت سے سپہر شکوہ اور ایزد بخش (پسر شہزادہ مراد) سے کر دی جس کا مفصل بیان تاثر عالمگیری میں ملتا ہے۔ شہزادی کا یہ انتخاب مغلیہ خواتین کی نگاہوں میں مستحسن امر قرار پایا۔ مذکورہ صفات کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہزادی کس قدر مایہ ناز اور پاکیزہ نفس تھی کہ جس کی باسٹھ سالہ زندگی میں عیب کا کوئی بدنما داغ نظر نہیں آتا۔

## زیب النساء کی وفات

دورِ مغلیہ کا یہ آبدار موتی جس کی شخصیت بذات خود ایک بیت العلوم (اکادمی) کی تھی باسٹھ سال کی عمر میں ۱۷۰۱ء میں جبکہ عالمگیر کی تخت نشینی کا اڑتالیسواں سال تھا، داخل گلزار رضوان ہوا۔ تجہیز و تکفین کے واجبات دلی ہی میں ادا ہوئے اور 'ادخلی جنتی' مادۂ تاریخ نکلا۔

## اورنگ زیب پر شہزادی کی وفات کا اثر

زیب النساء بیگم کی وفات کی خبر جب اورنگ زیب کو پہونچی تو سخت غمزدہ ہوا۔ اس زمانے میں وہ فتوحاتِ دکن میں مصروف تھا آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور باوجود انتہائی درجہ صبر و استقلال تزلزل کے صبر کی تاب نہ لا سکا۔

سید احمد خاں، حافظ محمد خاں اور شیخ عطاء اللہ کے نام حکم صادر ہوا کہ ایصالِ ثواب کے لئے زکوٰۃ وخیرات دیں اور مرحومہ کا مقبرہ تیار کرائیں۔

خافی خاں نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں زیب النساء کا نام اور اس کے واقعات ۱۷۱۰ء بمطابق ۱۱۲۲ھ تک آتے ہیں۔ لیکن یہ صریحی غلطی ہے کاتبوں نے غلطی سے زینت النساء بیگم کی جگہ زیب النساء بیگم لکھ دیا ہے۔ شہزادی زیب النساء بیگم کی تاریخ وفات ۱۷۰۱ء مطابق ۱۱۱۳ ہجری ہے کیونکہ اورنگ زیب کی وفات جملہ مؤرخین کے نزدیک ۱۷۰۷ء ہے اور تاثر عالمگیری کے مطالعہ سے یہ حقیقت پائے ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ شہزادی زیب النساء کی وفات اورنگ زیب کی زندگی میں ہوئی جبکہ وہ فتوحاتِ دکن میں مصروف تھا۔ وفات کی خبر پر اس کے دلی جذبات کا بھی اظہار کیا جا چکا ہے۔ نیز تعمیر مقبرہ کی اطلاع تاثر عالمگیری صفحہ ۶۲۴ پر موجود ہے اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ ۱۷۱۰ عیسوی تک جو نام خافی خان کے بیان کے مطابق آیا ہے وہ زیب النساء کا نہیں بلکہ اس کی چھوٹی بہن زینت النساء بیگم کا ہو۔

## مؤرخین یورپ کی گل کاریاں

ہم یورپ کی علمی فیاضیوں کا شکریہ ادا کرتے کرتے تھک جاتے ہیں لیکن یورپ اپنی فیاضیوں سے نہیں تھکتا۔ اس نے قدیم ترین زمانے کے جو واردات دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں اس سے کسی بھی مہذب ملک کو انکار نہیں۔ سنسکرت اور عربی کے علاوہ فارسی کے قدیم مآخذ کو مہیا کرنے کے سلسلہ جو کچھ یورپ کر چکا ہے اور مصروف کرتا آرہا ہے وہ یقیناً قابلِ صد آفرین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کی علمی فیاضیوں کا بادل عالم پر آبِ حیات برسا رہا ہے۔

دنیا کی تمام قوموں کے مردہ علوم و فنون، تاریخ اور دیگر گاریں زمین کے بطن الٹ الٹ کر نکالے جا رہے ہیں اور دنیا کی نمائش گاہیں ان گم شدہ جواہرات سے اس طرح سجائی جا رہی ہیں کہ گویا پچھلا زمانہ اسی سروسامانی کے ساتھ دوبارہ بہت جلد سامنے آنے والا ہے۔

مگر جہاں یورپ کے اہلِ قلم نے علم و ہنر کے بے شمار چشمے بہائے ہیں وہاں یورپ ہی کے بے درد، کم فہم اور متعصب واقعہ نگاروں نے سلاطینِ مغلیہ کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ مؤرخ اور مدبر شخصیتیں بھی تھوڑی دیر کیلئے غلط فہمی کا شکار ہو گئیں۔ تقلید پرستوں نے تو ان کی ہم آہنگی کو دستورِ زندگی بنا لیا ہے۔

انگریز مصنفین کی غلط بیانیاں جو عالمگیر ہو جاتی ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص ان کی پروہ دہی نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو ایسی دقی زبان میں جس کی اصلیت خیر تک نہیں ہوتی۔ اس لئے

سلسلہ بسلسلہ وہ غلط فہمیاں پھیلتی گئیں اور ان سے سلاطینِ مغلیہ کے اخلاق و عادات کی نسبت عوام میں نہایت ہی غلط خیالات پیدا ہوتے گئے۔

## سلاطین تیموریہ پر الزام

عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطین تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو یورپین مصنفین نے بہت زیادہ شہرت دی ہے اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے لیکن یہ قصہ سرے ہی سے بے بنیاد ہے۔ تیموری جاہ و جلال سے جو بھی واقف ہے وہ بڑی آسانی سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ مغل سلاطین کس کردار کے حامل تھے خصوصاً ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ سے لے کر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی تک کے سلاطین تو بلاشبہ تیموری جاہ و جلال کے حقیقی علمبردار تھے۔

## ایشیائی مؤرخین

بر خلاف اس کے ایشیائی مؤرخین کی عادت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں صرف جنگ و جدل، بغاوت اور خوں ریزیوں کے واقعات کو لیتے ہیں اور ان کو خوب پھیلاتے ہیں۔ اسی لئے یورپ والے ہماری تاریخوں کو قصہ گوئی کی دوکان کہتے ہیں اور ان کا کہنا کسی حد تک بجا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اگر ان تاریخوں سے اس عہد کے تمدن، شائستگی یا ٹیکنس طرز معاشرت اور دیگر متعلقات تمدن کا پتہ لگانا چاہیں تو بہت کم کامیابی ہوگی۔

اس سلسلے میں میں مستحکم دلائل کے ساتھ ثابت کر سکتی ہوں کہ گلبدن بیگم، جہاں آرا بیگم اور شہزادی زیب النساء وغیرہ کے بارے میں جو فرضی افسانے تراشے گئے ہیں وہ محض غلط ہیں۔ ان کی پاکیزہ خیالی، عالی ہمتی، شائستہ وقار اور بے پناہ لیاقت اس حقیقت پر دال ہے کہ مذکورہ شاہی خواتین دورِ مغلیہ کی وہ آب دار موتی ہیں جن کے نام نامی اور اعلیٰ کردار پر تاریخ اور تمدن دونوں بجا فخر کر سکتے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بیگمات پاکیزہ ادب اور فن تاریخ کے گُر سے کافی واقف تھیں۔ کیونکہ ان کی ذاتی تصانیف یا ان کی نگرانی میں جس قدر تصانیف وجود میں آئیں۔ ان سے اس زمانہ کی تہذیب تمدن نیز معاشرت کی مفصل تاریخ حقائق کے آئینے میں صاف صاف نظر آتی ہے۔

## اخلاق و عادات

شہزادی زیب النساء اپنے بلند اخلاق و عادات کی بنا پر اورنگ زیب کی نظر میں عدیم المثال مقبول تھی۔ اسے شاہی اعزاز کے ساتھ ساتھ باپ کی حقیقی شفقت پوری طرح حاصل تھی۔ وہ فطرتاً پاکیزہ خیال بلند اخلاق اور معدل حاتم ہوئی تھی۔ احکام شرعیہ کی پابندی میں وہ کبھی غافل نہ رہی۔ یتیموں اور مساکین کی پرورش اس کا خصوصی کردار تھا۔ بیسواؤں اور اپاہجوں کی وہ حتی المقدور امداد کرتی تھی۔ اس کا دریا دلی اعانتِ غرباء میں نوشیرواں سے کم نہ تھا۔

## علم پروری

شہزادی زیب النساء بذاتِ خود ایک اعلیٰ درجہ کی فاضلہ تھی۔ اس نے علوم و فنون کی ترقی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ اسی کا دریا دلانہ ترقی یافتہ بیت العلوم تھا۔ جسے علوم و فنون کی ایک پُر مسیار اور ترقی پسند اکادمی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے علماء اور ماہرینِ فن پرورش پاتے تھے۔ زیب النساء نے خود کوئی تصنیف کی ہو یا نہ کی ہو لیکن اس نے اپنی نگرانی میں اہلِ علم و فن سے بہت سی عمدہ اور مفید کتابیں تصنیف کرائیں

## شہزادی زیب النساء سے متعلق عشق و محبت کے فرضی افسانے

شہزادی زیب النساء کے متعلق بہت سے غلط اور فرضی افسانے مشہور کئے گئے ہیں جن کو مؤرخینِ یورپ نے اور بھی زیادہ آب و رنگ دے کر پیش کیا ہے بقول شاعر ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اور جسے ہمارے ذہنی عیاشیوں میں سرگوشیاں کرنے والے بداخلاق لوگوں نے بصد خوشی قبول کیا اور بھول کر بھی اس حقیقت پر غور کرنے و نیز عمیقانہ نظر ڈالی کہ جس جامِ شیریں کو وہ منہ لگا رہے ہیں اس میں شربت نہیں بلکہ زہرِ ہلاہل ہے جس کا نشہ صرف انھیں ہی نہیں بلکہ ان کی آنے والی نسلوں کو بھی حقائق سے کوسوں دور کر دے گی۔ وہ کبھی بھول کر بھی یہ نہ سوچیں کہ ان کے روشن مستقبل کے لئے متقدمین نے

کیا کیا خون پسینہ نہیں بہایا۔

زیب النساء بیگم جیسی پاکیزہ دامن اور پاک نفس خاتون پر جہاں بہت سے فرضی افسانے گھڑنے والوں نے تراشے ہیں ان میں عاقل خاں رازی اور ناصر علی خاں کا فرضی تشنج بھی دکھلایا گیا ہے۔ عاقل خاں کے بارے میں یہاں تک مبالغہ سے کام لیا گیا ہے کہ زیب النساء اسے چوری چوری محل میں بلاتی تھی۔ چنانچہ ایک کنیز نے اس کی اطلاع اورنگ زیب کو کر دی۔ اورنگ زیب اچانک زیب النساء کے محل میں داخل ہوا۔ شہزادی کے لئے جب کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تو عاقل خاں کو حمام کی دیگ میں چھپا دیا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے انجان بن کر اسی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا۔ عاقل خاں نے راز کے ظاہر ہونے کے اندیشے میں دم نہ مارا اور جل کر رہ گیا اور مرنے کے وقت اپنے خون سے دیگ کی دیوار پر یہ مصرع لکھ دیا تھا

بعد مردن زجفائے تو اگر یاد کنم
از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

صد افسوس ہے ایسے عقل و دانش پر کہ ہنوز ہمارے قارئین میں اکثر و بیشتر ایسے حضرات ملیں گے جو ان فرضی افسانوں کو حقائق کی حد پر بلکہ اس سے بڑھ کر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس دور میں جس قدر بھی پُر معیار کتابیں لکھی گئیں اور جنھیں ہمارا حلقہ دادب مستند کتاب کا درجہ دیتا ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی اس قسم کا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا۔ عالمگیر نامہ۔ مآثر عالمگیری، مآثر الامرا۔ خزانہ عامرہ مرقع دہلی اور بیاض بینوا وغیرہ وغیرہ میں ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق نہیں ملتا۔ حالانکہ اس کی وفات کا تذکرہ سب نے لکھا ہے جو ۱۱۰۷ ہجری میں واقع ہوئی۔ اردو میں بھی ایک کتاب محض تجارتی مفاد کو مدنظر رکھ کر عاقل خاں رازی اور شہزادی زیب النساء بیگم کے نشتی پر ناول کے انداز میں شائع ہوئی ہے جس کا نام "مرقع دلی" رکھا گیا ہے۔ دوسرا بہتان شہزادی پر ناصر علی خان سے عشق و محبت کا ہے جس میں شاطر اور مفاد پرست تاجروں نے ادنیٰ معیار شاعروں کے ہیرو کو چاندی یا اشرفی کے چند ٹکڑوں کے عوض خرید لیا ہے اور ان کے چند شعروں کو زیب النساء کی طرف منسوب کر کے اور عاقل خاں کی طرف سے خاطر خواہ جواب دلوا کر شہزادی کی پاک دامنی پر بدنما داغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ زیب النساء نے یہ مصرعہ کہا

ع از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم

چاہتی تھی کہ مطلع ہو جائے مگر دوسرا مصرع اس کی جوڑ کا نہیں ہوتا تھا چنانچہ ناصر علی خاں کے پاس لکھ کر بھیجا۔ اس نے برجستہ کہا ؎

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم
شاید رسید بر لب زیب النساء لبم

لیکن جو شخص تیموریوں کے جاہ و جلال اور آداب و آئین سے ذرا بھی واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ غریب ناصر علی کو خواب میں بھی اس گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ اگر وہ ایسی جرأت کر بھی گزرتا تھا مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ پاک دامن شہزادی کی عصمت اور پاک دامنی سے گستاخی کی جرأت کرتا۔ چند کتابوں میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ معمر ثانی کے خلاف شہزادی کو سخت غصہ آیا اور اس نے ناصر علی کو لکھ کر بھیجا ؎

نامرعلی بنام علی کردۂ پناہ
ورنہ بذوالفقار علی سر بریدمت

مگر یہ سارے واقعات ہی الف سے یا تک غلط ہیں جن کا کوئی معقول ثبوت نہیں ملتا۔

**شہزادی صاحب دیوان نہ تھی**

دیوان مخفی کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شہزادی زیب النساء ایک اعلیٰ درجے کی شاعرہ تھی اور شاعری میں مخفی تخلص کرتی تھی۔ چنانچہ اسی سے منسوب کر کے ۲۱۸ صفحات پر مشتمل ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں تقریباً ۵۰۰ غزلیات درج ہیں۔

کتاب جناب منشی بشن نارائن صاحب بھارگو مالک منشی نولکشور لکھنؤ کی زیر سرپرستی شائع ہوئی ہے۔ طباعت کی تاریخ جولائی ۱۹۲۹ء ہے اور شائع کنندہ جناب مولانا عبدالباری آسی لکھنوی ہیں۔

یہ موضوع بحث یہ ہے کہ میں شہزادی موصوفہ کے بارے میں متعدد تاریخی حوالوں کے ساتھ یہ ثابت کر سکوں کہ زیب النساء کے بارے میں حلقۂ علم و ادب میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کیا جائے اور ان تمام ـــــ لوگوں کو دندان شکن جواب دیا جائے جن کا سرمایۂ معلومات تمام تر بازاری قصے ہیں جو محض بے سر و پا ہیں اور جنھیں صرف تجارتی غرض سے لکھا گیا ہے۔ جو بلاشبہ شہزادی موصوفہ کے بلند کردار پر بدنما داغ ہیں۔ عہدِ عالمگیری کی کسی تاریخ یا تذکرے میں یہ نہیں ملتا کہ زیب النساء ایک اعلیٰ درجے کی شاعرہ تھی اور مخفی تخلص کرتی تھی۔ اس دور کی سب سے بہتر اور پُر از حقائق کتاب مخزن الغرائب ہے جسے احمد علی ندیلوی نے لکھا ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی نکتہ ایسا نہیں ملتا جس کو وسعت دی جائے۔ شعر کہہ لینا ایک الگ بات ہے اور صاحب دیوان ہونا ایک الگ حقیقت ہے۔ البتہ شہزادی کی تصانیف میں سے "زیب المنشآت" ایک بہتر کتاب کا پتہ چلتا ہے جو شہزادی زیب النساء کے خطوط و رقعات کا مجموعہ ہے اور یہ عین حقیقت ہے کہ شہزادی نے اپنی سرپرستی میں اہلِ فن سے بہت سی عمدہ کتابیں تصنیف کرائیں۔

چونکہ شہزادی کا دربار ایک نہایت ہی نایاب اور نادر قسم کا بیت العلوم تھا جس میں ہر علم و فن کے علماء اور فضلاء نوکر تھے اور جو ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے لہٰذا جس قدر کتابیں بھی اس اکادمی سے شائع ہوتی تھیں وہ شہزادی کے نام سے موسوم ہوتی تھیں۔ یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا جزء "زیب" کا لفظ ہوتا تھا۔ اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہے۔ اور ان لوگوں نے ان کتابوں کو زیب النساء کی تصنیف یا تصانیف میں شمار کیا ہے حالانکہ یہ حقیقت نہیں۔

زیب النساء نے تصنیف و تالیف کا جو محکمہ قائم کیا تھا اس کے ساتھ ایک عظیم الشان اور معیاری کتب خانہ کا ہونا بھی ضروری تھا جس سے مصنفین فائدہ اُٹھا سکیں۔ چناں چہ شہزادی موصوفہ نے ایک نہایت ہی عظیم الشان اور معیاری کتب خانہ قائم کیا۔

مصنف مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ جو کتب خانہ شہزادی زیب النساء نے قائم کیا اس کی نظیر کسی کی نظر سے نہ گزری ہوگی مصنف موصوف کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"دریں کارخانہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بہ نظر بیچ یک در نیامدہ باشد (ص ۵۳۹)

مذکورہ حالات کی روشنی میں ہمارے فاضل ناظرین شہزادی موصوفہ کے بارے میں بہتر سے بہتر رائے قائم کر سکتے ہیں۔

اس مختصر مقالے کی تیاری میں درج ذیل کتابیں زیر مطالعہ رہیں

مآثر الامرا۔ مآثر عالمگیری۔ تذکرہ ملا شرف۔ وقائع عالمگیر۔ رقعاتِ عالمگیر، عالمگیر نامہ۔ خزانۂ عامرہ۔ تذکرہ نصرت علی خاں۔ مقالاتِ شبلی، دیوان مخفی۔ ہندوستان پر مغلیہ حکومت۔ دارا شکوہ (لائف اینڈ ورکس) مصنفہ بجرمایجیت حسرت۔ نیز دیگر مؤلفہ و معیاری مقالات و رسالہ جات اُردو۔

---

ضروری گزارش

۱۔ کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھیے

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کیے جاتے ہیں جبکہ مناسب سائز کا لفافہ اور ٹکٹ ان کے ہمراہ ہوں۔

نجیب رامش

# قدم ملا کے چلیں

یہ دیس امن و اہنسا کے دیوتاؤں کا
یہ دیس رشیوں کا، گندھرو کنیاؤں کا
یہ دیس بھجنوں کا، میلاد کا، کتھاؤں کا
یہ دیس ہرنوں کا، ہنسوں کا، فاختاؤں کا
یہ دیس ہیروں کا، راجھا ؤں، اُرملاؤں کا
یہ دیس غزلوں کی، گیتوں کی اپساؤں کا

یہ سرزمیں کہ جہاں لوک گیت کا جادو
پکارتا ہے کہ سنیے ہمیں چاند چمکا لو
پیام دیتی ہے نازک کنواریوں کو شفق
گداز ہاتھوں پہ مہندی کی آگ دہکا لو
کتھا کلی کی تھرکتی انچا ئیوں کو ہے
یہ اُروشی کا وطن ہے نظر کو جھکا لو
تلاش کرتی ہے خلوت بسنت کی بالا
یہ میگھ دوت کی دھرتی ہے جام چھلکا لو

یہ سرزمیں جو ہے گیتا کی اور پُرانوں کی
شباب پر ہے کسی جنگلی ہرن کی طرح
تنے کھڑے ہیں جیں بھیت مثلِ قوسِ قزح
مہک رہی ہے فضا بوئے پیرہن کی طرح

نئے اُفق پہ بڑا تازیانہ اُجالا ہے
سیاہ رات کے ترکش میں کوئی تیر نہیں
خراج لیتا ہے ہر سنگ پیرہن سے جنوں
جنوں سے مرغِ جنوں مانعِ عبیر نہیں

بچھل رہی ہے شفق عارضِ تخیل پر
دلوں کے پھول خزاں سے اثر پذیر نہیں
افق پہ ڈھونڈھ رہی ہے زمیں کے نقشِ قدم
نگاہ فکر کے پنجوں میں اب اسیر نہیں
ہر ایک موج جوئبیل میں آج رقصاں ہے
کسی کی زلفِ مسلسل سے کم شریر نہیں
وہ روشنی سی بڑھی تھی جو بھاگ کر، بن کر
اب آفتاب ہے، کرنوں کی اک لکیر نہیں
مچل رہا ہے عروسِ بہار کا آنچل
کسی کی آنکھ میں اب آنسوؤں کا تیر نہیں
فلک سے جھیکتے ماہ جبیں گے اب گھٹاؤں کی
ہم اہلِ فکر کے بچاری کوئی فقیر نہیں

ہمارے ہاتھ پہ رقصاں رہی ہیں تعبیریں
جو چھو بھی لیں تو نہیں پتھروں سے تو یریں

زمیں کی گود بھریں روشنی کے پھولوں سے
فضا کو راگنیوں کی مدھر دھنوں سے سجائیں
سیاہیٔ شبِ حرماں کو مات دے آئے
جلائیں شمعِ عمل روشنی کے شہر بسائیں

بہار لالہ و گل سے نقاب اُٹھا کے چلیں
یہ راہ راہِ جنوں ہے قدم ملا کے چلیں

●

صابر شاہ آبادی

# ادب اور مقصدیت

ادب چونکہ ایک لطیف فن ہے اس لئے اس کے ساتھ 'مقصدیت' کا جامد تصور لیٹا ہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ تاریخ 'ادب' کو بے مقصد تحریک نہیں بتاتی اس لئے مناسب یہی ہے کہ ادب ماضی کا سرسری جائزہ لے کر 'ادب' کو مقصدیت سے ہم کنار کرنے والے قدیم اسباب پر سنجیدگی سے غور کریں اور کسی صحیح نتیجہ پر پہنچیں۔ یہاں سنجیدگی میں نے اسی لئے کہا ہے تاکہ 'مقصدیت' سے کسی ایسی ٹھوس اور جامد افادیت ہی کا تصور نہ کیا جائے کہ 'پھول' کی لطیف افادیت مشکوک اور مقصدیت کا مفہوم محدود ہو جائے کیونکہ ادب شعوری طور پر کسی مخصوص مقصد سے ہمکنار کئے جانے سے قبل بھی اپنی باطنی و لطیف افادیت کے اعتبار سے "مقصدی" ہی رہا ہے، خواہ وہ مقصد داخلی ہو کہ خارجی انفرادی ہو کہ اجتماعی۔

ظاہر ہے کہ کسی بے مقصد تحریک کا 'نغمہ' ہی مشکل ہے چہ جائیکہ وہ صدیوں تک رائج رہے اور عالمگیر حیثیت سے مشہور و مقبول ہو کر جزو نہاد بھی ہو اور ذریعۂ انقلاب بھی۔

سامی روایت کے مطابق ادب کی ابتدا آدم کے کلام موزوں سے ہوئی، جس کے پس منظر میں ان حد لڑکوں ہابیل و قابیل کی متضاد طبیعت اور ایک کے ہاتھوں دوسرے کا قتل تھا، مگر فرزندانِ آدم کی یہ طبع قدیم شعر گوئی یا ادب کے لئے موزوں ہونے تک معمّوری اور موسیقی وجود میں آچکے تھے، گویا 'ادب' ان کے بعد ظہور پذیر فن لطیف ہے۔ اور چونکہ معمّوری و موسیقی سے ابتدائیں برسوں تک مذہبی و اجتماعی کام ہی لئے گئے ہیں اس لئے انہیں کے بطن سے نکلے ہوئے ادب کا 'مقصدی' راہ اختیار کرنا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر چونکہ ادبی مباحث میں ابھی تک پُرخلوص اور سنجیدہ نقطہ نظر کی کمی اور انتہا پسندانہ جذبات کی بہتات ہے اس لئے ادب کے ساتھ مقصدیت کا یہ قدیم تعلق اب بھی سب کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ حالانکہ ادب نگاری ایک شعوری عمل ہے اور ہر شعوری عمل کا کوئی نہ کوئی مقصد ہونا لازمی امر ہے۔

چونکہ اکثر مقامات پر ادب کا آغاز شعر ہی سے ہوا ہے اور شعر ابتداً داخلی جذبات ہی کا ترجمان رہا ہے۔ اس لئے یہ مان لینا چاہیئے کہ شعر گوئی کے ذریعہ اجتماعی مقاصد کے حصول کا جذبہ ابتداً لاشعوری طور پر ہی نمودار ہوا ہوگا۔ چنانچہ عرب کے دورِ جاہلیت میں شعراء اشعار کے ذریعہ اپنے قبائلی جذبات ہی کے اظہار کو منتہائے کمال خیال کرتے اور سامعین کی داد سے مسرور و مطمئن ہو جاتے تھے، جس سے ظاہر ہے کہ عربی شعراء میں شعر کے ذریعہ اجتماعی مقاصد کے حصول کا جذبہ تا بعید تھا یعنی قبائلی طرزِ زندگی کے زیر اثر پس پردہ یا قوتوں کو بھی بے باکانہ ظاہر کر دینے والے 'آزاد' جذبے کا شعر کی فنی قیود منظور کرنا اور رفتہ رفتہ شعراء کی آزاد طبائع کا شعر میں معنوی حیثیت سے 'مجروحیت' جیسے متضاد میلان کو لازمی قرار دینا اور جاہل عشاق کا اپنے محبوب کے لئے 'سرد ھڑکی بازی لگا دینا ظاہر کرتا ہے کہ شعراء کے سنجیدہ طبقے نے مخاطب کے جذبات پر جب شعر کی بے انتہا تاثیر دیکھی ہوگی تو شعراء کے اس فطری و مفید جوش کو متانت سے بدل کر شعر کو

مزید انشاء آفرینی بنانے کے لئے اسے فنی قید سے حسین و منظم کیا ہوگا تاکہ شعر کے ذریعہ تفریحی و ذوقی کام کے ساتھ ساتھ اجتماعی و اخلاقی کام بھی لئے جا سکیں اور اس طرح ادب کا رُخ ابتداً انفرادیت و داخلیت سے موڑ کر مقصدیت کی طرف پھیر دیا ہوگا۔

چناں چہ شعر کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایران میں شاعری ابتداء میں فطری جوش کی بجائے کسبِ معاش کے سلسلے میں وجود میں آئی اور عربی شعراء کی تقلید سے وہاں قصیدہ عام ہوا۔ اس طرح رفتہ رفتہ قصیدے کی تشبیب یعنی غزل کو زندگی ملی اور 'تصوف' کے عروج سے اس کو شباب ملا۔ چونکہ تصوف کے بیشتر مسائل فلسفیانہ مسائل سے مماثلت رکھتے تھے اور صفویہ دور میں تصوف داخلِ نصاب بھی ہو چکا تھا اس لئے غزل میں فلسفیانہ خیالات تصور ہونے لگے۔ اس طرح غزل میں فلسفیانہ نظریات کے سبب جہاں شاعری میں وقت پسندی کا سلسلہ پڑ گیا وہیں غزل 'داخلیت' کی بجائے معقولات کے اہم مسائل سلجھانے کا ذریعہ لطیف بن گئی اور تصوف کے زیر اثر جبر و علم اور عفو و درگذر جیسے تزکیۂ نفس پر قدرت دلانے والے اور سپردگی و فنا دگی پیدا کرنے والے لطیف و مفید احساسات عام ہوئے۔ لیکن صوفی شعراء کا یہ طرزِ احساس چوں کہ علمائے ظواہر و شرع کے خلاف تھا اس لئے علماء و مختلف جماعتوں میں بٹ گئے اور نظریاتی کشمکش شروع ہوگئی۔ چناں چہ صوفی شعراء کے علمائے شرع کے دوزگی کردار پر طنز کرنے کی وجہ سے جہاں اخلاقی عامہ پر مفید اثر پڑا وہیں ادب میں طنز کا پہلو بھی داخل ہوگیا اور شیخ و ناصح پر چوٹ کے جا طنز شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ صوفی شعراء کی 'مشراب معرفت' کی بے باکانہ تعریفوں سے جہاں اخلاقی حیثیت سے انہماکِ حق کا جذبہ عام ہوا اور شاعری میں خمریات و تعلیات کی داغ بیل پڑی وہیں اس کے تیز ہونے سے متصوفانہ ادب کی تخلیق سے قطعِ نظر شعراء انانیت کا شکار ہوئے لیکن رفتہ رفتہ یہ انفرادی فضا چھٹ گئی اور صوفی شعراء کی مصلحت آمیز خاموشی و سنجیدگی سے غزل پھر متوازن ہوگئی۔ اس توازن کو خواجہ حافظ نے لطافت، شوخی اور عہدِ تیموریہ نے وسعت۔ جس کی وجہ سے غزل ترقی کرتے کرتے ہندوستان تک پہنچ گئی۔ ایرانی شعراء میں غزل کی صنفی دل ربائی قائم رکھتے ہوئے اس کے ذریعہ مقصدی و اخلاقی کام لینے میں حافظ، عرفی، نظیری، صائب اور کلیم بہت مشہور ہیں۔

یورپ کے برخلاف ایشیا چونکہ سولھویں صدی عیسوی میں ابھی شاہی دور ہی سے گزر رہا تھا اس لئے ایران کے ادب میں اجتماعی مقصدیت کی کوئی واضح اور گہری شعوری کوشش نہیں ملتی اور نہ ہند کے ابتدائی ادب میں کوئی افادی و مقصدی جد و جہد نظر آتی ہے اور نظر آتی بھی کیسے کیونکہ ہندوستان کا فارسی شعر و ادب ابتداً ایران ہی کے اثرات قبول کر رہا تھا بلکہ انھیں اثرات کے تحت کئی ایرانی شعراء ہندوستان آ گئے تھے جن میں سے کچھ اکبر و خانخاناں کے درباری شاعر ہو گئے اور کچھ گولکنڈے اور بیجاپور کی سلطنتوں میں بس گئے۔ ہندوستان میں فارسی شعر و ادب اور تقلیدِ غزل کے بنیادی اسباب یہی حالات اور دربار کے فارسی مشاعرے تھے جو رفتہ رفتہ عوام تک پہنچ گئے اور اردو بھی چوں کہ کچھ زمانے بعد ترقی پا کر فارسی زبان کی شکل اختیار کر چکی تھی اس لئے فارسی مشاعروں کے ساتھ ساتھ اردو مشاعرے بھی شروع ہو گئے۔

جیسا کہ ابھی اوپر عرض کر چکا ہوں ایشیائی فضا انقلاب آفریں سیاست سے دور تھی اس لئے ایک عرصہ تک ہندوستان کی شعری تخلیقات پر ایرانی شاعری ہی کی چھاپ رہی بلکہ نظیر اکبرآبادی سے قبل تک اردو شاعری خصوصاً غزل داخلیت کی اسیر رہی لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں کچھ تو محدود و فرسودہ تخیلات کے بار بار اعادہ سے اور کچھ شعورِ عامہ کی افادیت پسندی کے تحت شاعری کی یہ داخلیت بے جان معلوم ہونے لگی اور ملک پر انگریزوں کے تسلط کا یقینِ خواہیدہ عوام کو اپنے اندر بھی فوری اور فیصلہ کن تیز کیلئے جھنجھوڑنے لگا۔ اس سیاسی انتشار و اضطراب کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ دولوگ گل بلبل کی پرانی روبہ عمل داستان سے بیزار ہوتے اور ماحول کی طرف مداحانہ توجہ کرتے، چناں چہ ایسا ہی ہوا اور ذوقِ عامہ 'عمل' میں بدل کر 'خدمت' کی صورت میں نمودار ہوا جس سے ہندستان کی عام و خاص زندگی بشدت سے متاثر ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے حالات اس قدر دگرگوں اور غیر یقینی ہو گئے کہ جن کی تفصیلی و ضاحت اور اصلاح کے لئے غزل

کا ایمائی و استعاراتی اسلوب بے کار معلوم ہونے لگا، کچھ اس لحاظ سے اور کچھ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو شاعری کی بے مائگی کے خیال سے خصوصاً محمد حسین آزاد اور حالی کو ادب میں ایک ہمہ گیر اور افادیت افروز انقلاب کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی۔ جس کا ادبی نتیجہ اصلاحی تحریک، خطبات آزاد اور مقدمۂ شعر و شاعری کی صورت میں رونما ہوا جس کے اثرات اس لحاظ سے یقیناً مفید ثابت ہوئے کہ شدید واعظیت کی بنا پر گھٹی، چوٹی سے الجھی ہوئی مزمل نظم میں بدل کر سماجی مقصدیت سے ہمکنار ہوئی اور جیسے جیسے یہ مقصدی لے تیز ہوتی گئی ویسے ویسے شعر و ادب میں سیاست در آتی گئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اقبال، اکبر، حسرت، جوش، فراق اور سیماب وغیرہ نے شاعری کے ذریعہ سیاسی و سماجی کام کا آغاز کیا۔

اس سیاسی تیور کا اثر اردو کے علاوہ دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب پر بھی پڑا چنانچہ بنگالی شاعری کے لئے ٹیگور نے کچھ نویں نکالیں اور مرہٹی اور گجراتی شاعری نے بھی اپنے طور پر نیا رنگ و روپ اختیار کیا بلکہ مرہٹی شاعری تو اس سے قبل ہی اپنے آپ کو نادر سیت و ماورائیت سے بچانے اور ماحول سے ہمکنار کرنے کے لئے لوٹ چکی تھی جس کے نتیجہ میں جھگتی شاعری کی جگہ شاہری وجود میں آ گئی تھی جس کی رو مقصد پسند اور ماحول پرست ضمیتیں پیدا ہوئیں اور لاوٹی بہت مقبول ہوئیں جو صرف تماشوں میں گا کر سنائی جاتی تھیں۔

غرض ملک پر انگریزوں کے تسلط اور اصلاحی تحریک کے زیر اثر عام ادبی فضا مقصدیت کی طرف کھنچ رہی تھی۔ چنانچہ مذہب، اسماج، تعلیم و تربیت، ادب و فن اور تہذیب و تمدن بلکہ ہر شعبۂ حیات پر تنقیدی نگاہ پڑنے لگی۔ لہٰذا اس تغیر کا اثر اردو تنقید پر بھی پڑا جو اب تک محض تذکرہ نگاری کی حد تک محدود تھی جس کا کوئی منصفانہ و تنقیدی مقام نہ تھا، چونکہ حالات بدلنے سے شاعر "علم غیب" یعنی ماوراء تنقید منصب سے اتر کر عام سماجی افراد کی صف میں شامل ہو گیا تھا اس لئے تذکرہ نگاروں پر لفظی و فنی جانچ پرکھ کے ساتھ ساتھ شعر کو شاعر کی زندگی کے پس منظر میں دیکھنے کی پابندی بھی عاید کر دی گئی جس کے کچھ اثرات آزاد کی 'آب حیات' میں جھلکتے ہیں تذکرہ نگار یا ناقد پر اس پابندی کا یہ اثر تو مفید نکلا کہ شعراء چونک گئے اور شعر میں کھوکھلی داخلیت کی جگہ حقیقت پسندی کا رواج شروع ہوا لیکن یہ اچھا نہیں ہوا کہ شعر کو فنی پیمانے کی بجائے مقصدی آلہ سے ناپنے کی وجہ سے 'تنقید' — فن میں — تخلیقی لطافت و تاثیر پیدا کرنے کی بجائے مقصدیت کی رو میں اٹکے 'تخلیق' کی رہی سہی لطافت و جاذبیت کو بھی غیر ضروری سمجھ کر ختم کرنے لگی جس کی وجہ سے تخلیق و تنقید کی روایتی خلیج اور بھی وسیع اور بلند ہونے لگی جو ارتقائی اعتبار سے قابل مذمت ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اردو تنقید کے اتنے عرصے بعد بھی تخلیقی جاذبیت و کشش سے دور ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندستان کے اردو شعر کی طرح اردو تنقید کو ایران یا عرب سے مدد نہ مل سکی کیونکہ خود ایران معاشرتی اختلاف کی بنا پر عربوں کے فنی نقد سے استفادہ نہ کر سکا تھا تاہم اردو تنقید کی سرا پے کے محدود ہونے اور خاص طور سے تخلیقی بلندیوں سے دور ہونے میں یہاں کے ناقدوں کی شدید مقصدیت پسندی کا بھی خاصا دخل ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب شاعری جیسی داخلی صنف ادب (اور تنقید بھی) مقصدیت سے ہمکنار ہو چکی تھی، ایسے حالات میں ناممکن تھا کہ اردو ناول متاثر نہ ہوتا جو مغرب کی ایک خارجی افادی رنگ کی صنف ادب تھی اور وہیں سے ہندستان کو حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ رتن ناتھ سرشار کو سرور انیتز کا ناول اور عبدالحلیم شرر کو اسکاٹ کا ناول ٹیلسمن پڑھنے کے بعد ہی ناول نگاری کا زیادہ شوق ہوا اور چونکہ ناول کے ذریعہ بلکہ چھوٹے چھوٹے قصوں اور معمولی جاسوسی کہانیوں کے ذریعہ بھی مغرب میں سیاسی و سماجی کام ہی لئے جاتے تھے، اس لئے ناممکن تھا اردو کے ناول نگار خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد والی مقصدی فضا میں ناول کے ذریعہ اجتماعی کام نہ لیتے۔ لہٰذا نذیر احمد کے ناولوں میں توبۃ النصوح، مراۃ العروس اور فسانۂ مبتلا ہیں، اور سرشار کے ناولوں میں فسانۂ آزاد، جام سرشار اور سیر کہسار ہیں جو رجحانات اور زندگی کے عملی و مقصدی حقائق کی ترجمانی ملتی ہے اور اسی کے ساتھ جس طرح حالی نے مسدس کے ذریعہ اور بعد میں حالیہ شاعر متھلی شرن گپت نے اپنی

نظم ' بھارت بھاگیہ ' کے ذریعہ کارنامہائے اسلاف سناکر اپنی اپنی خوابیدہ قوموں میں جہدِ عمل کی نئی روح پھونکنا چاہی اسی طرح ۱۸۵۷ء کے حالات میں مسلمانوں کے زبوں و تذبذب اور انتشار و اضطراب کو قوت عمل سے بدلنے کے لئے نثر نے قدیم مسلم تاریخ کو اپنے ناولوں کا موضوع بناکر ایک حد تک وہی کام انجام دیا جو انقلابی حالات میں توازن پیدا کرنے کے لئے سرسید اور ان کے رفقاء کار انجام دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں بنگال میں بنکم چندر اور مرہٹی میں آپٹے نے بھی ناول نگاری کو نئے اور افادی طریقوں سے چمکایا۔

اس دور میں ' آزادی ' کے موضوع پر ڈرامے بھی لکھے گئے لیکن کچھ صنفِ ڈراما کے تمام ضروری پہلوؤں سے پُر اعتماد واقفیت نہ ہونے اور کچھ اسٹیج فراہم نہ ہونے کے سبب یہ ڈرامے مشہور و مقبول نہ ہو سکے۔ ان کا ایک ابتدائی سبب اردو ڈراما نگار کی مغربی ڈراموں کی سرسری و سطحی تقلید بھی تھی۔ تاہم مقصدیت کے اعتبار سے بقول احتشام صاحب صنفی رامیشور پرشاد کا ڈراما ' آزادی ' قابل دہلوی کا ' جھانسی کی رانی ' منیر محمود خاں کا ' سکھیا بھارت ' اور حکیم احمد شجاع کا ' بھارت کا لال ' لائقِ ذکر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ محمد حبیبی آزاد نے بھی ایک ڈراما لکھا تھا جو نامکمل رہ گیا ورنہ وہ ادبی اعتبار سے اردو کا پہلا ڈراما کہلاتا۔

چونکہ افسانہ نگاری کے باب میں بھی ہندستان بڑی حد تک مغرب ہی کا مقلد تھا اور پھر اس وقت تک یورپ میں افسانہ نگار کے یہی تجربے اور موپاساں کے دو اسکول مسلّم معیار اختیار کر چکے تھے اس لئے ان کا اثر ہندستانی افسانہ نگاروں پر بھی پڑا۔ اس اثر کا ایک سبب تجربے کی بیشتر کہانیوں کی فضا بھی تھی جو ہندستانی فضا سے مماثلت رکھتی تھی جن کے زیرِ اثر ابتداء میں کچھ انگریزی کہانیوں کے تراجم ہوئے اور پھر بعض سیاسی وجوہ سے ذاتی کاوشوں کے جو ہر دکھانے کی فضا عام ہوئی۔ اس سلسلے میں سجاد حیدر یلدرم، جلیل قدوائی، اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مقصدیت کا مسلسل اور بے رنگ پرچار ذہنوں میں خشکی اور تھکن پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد یورپ کے رومانی ادب سے متاثر ہو کر لطیف احمد اکبر آبادی، نیاز فتح پوری اور جاب امتیاز علی نے بعض ایسے افسانے لکھے جن میں مقامی و وقتی فضا کی بجائے جاذبیت غنائیت پائی جاتی ہے۔ لیکن ابھی یہ رومانی افسانے کوئی مستقل حیثیت اختیار نہ کر پائے تھے کہ بیسویں صدی کے سیاسی تقاضوں نے شورِ عامہ کو پھر مقصدیت کی طرف متوجہ کر دیا اور افسانوں میں بیرونی اثرات کی بجائے مقامی حالات کو سمونے کے میلانات ابھرنے لگے۔ چنانچہ پریم چند نے رومانیت پسندی کے باوجود ایسی کہانیاں لکھیں جن میں بیرونی اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں اور جن میں مقامی حالات حقیقت پسندانہ حسن و دلکشی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، اس سلسلے کی قابلِ ذکر کڑیاں سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی ہیں۔

دیکھئے کہ شروع لفت کی طرح ناول اور افسانوی تخلیقات میں خارجی و داخلی انتہا پسندی جھلکتی ہے۔ چنانچہ شرر نے ناولوں کے ذریعہ سراسر مورخانہ و رہبرانہ کام لینا چاہا اور منشی رامیشور اور مائل دہلوی نے ڈراموں کے ذریعہ یکسر انقلابی اور ان کے برعکس نیاز و جاب وغیرہ نے سراسر رومانی و جمالی، بعد ازاں پریم چند نے پھر وہی ملکی و مقامی کام لینا چاہا جس کی وجہ سے ناول، کہانی اور افسانوں کے متعلق اتنا کثیر مواد جمع ہونے کے باوجود وہ ادبی اعتبار سے[عہ] ایسا نہیں ہے کہ جس کی روشنی میں ان اصناف کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکے۔

غرض ۱۸۵۷ء کے سیاسی تغیر کی وجہ سے کئی سال تک شعر و ادب کی دنیا میں مقصدیت کی کشمکش جاری رہی۔ لیکن مقصدیت کی اس جذباتی نہج میں ادب کی فنی و جمالی پابندیوں کا خیال نہ کرنے سے ادب ادبیت سے محروم ہو کر سپاٹ سا ہونے لگا اور عقل کے اس غیر نفسیاتی ' انداز بیانی ' سے دل اندر

---

عہ فاضل مضمون نگار کی اس رائے سے بیشتر اہلِ ادب کو اختلاف ہوگا (ادارہ)

بھی اندر بھیجے اور مرجھانے لگا لیکن ابھی مشہورِ عام "دل" کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہو سکا تھا کہ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے شعر و ادب کی دنیا میں مقصدیت کی خاطر پھر وہی ۱۸۵۷ء کا سا غلغلہ اُٹھا۔ ان دونوں تحریکوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ تحریک ملک میں سیاسی انقلاب کے پیدا کردہ حالات ہی قوانین پیدا کرنے کے لئے عمل میں آئی تھی اور یہ انقلاب پیدا کرنے کے لئے اس کے پیشِ نظر داخلیت کی تردید اور صداقت پسندانہ ادبی ترقی تھی اور اس کے پیشِ نظر سرمایہ دارانہ نظریات کی تردید اور اشتراکیت کی اشاعت و تبشیر۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں نے نہ فقط ۱۹۳۶ء سے پہلے کے ادبی موضوعات ہی میں سرمایہ دارانہ ذہنیت دیکھی بلکہ اس کے اسالیب بیان میں بھی اعنی غیر جمہوری گھٹن محسوس ہوئی۔ یہاں میں نے "غیر جمہوری" دانستہ کہا ہے، کیونکہ ان اسالیب سے بغاوت انسان کی ایسا ثیت کی بنا پر ہوتی، جو یقیناً ترقی پسندوں کے نئے نظریات کی مکمل وضاحت کے منافی تھی تاہم طبقہ کم از کم اپنے نظریات کی وضاحت کے بعد ایسا ثیت پسندی سے باز آ جاتا پرانے اسالیب اپنا تا لیکن ایسا ثابت نہ ہو سکا بلکہ وہ اپنے نظریات کی تفہیم و تشریح کے بعد بھی اسی اسلوبی بغاوت پر ڈٹا رہا۔ چنانچہ شعر و ادب میں اوقاف الفاظ اور استعارات و تشبیہات کی مخالفت اس نے بعینہٖ انجمن کی بجائے سرمایہ دارانہ ذہنیت پر رکھی۔ حالانکہ کم از کم استعارات و تشبیہات کا تعلق کسی سرمایہ دارانہ ذہنیت سے قطع نظر داخلی جذبات کی رنگا رنگی و پیچیدگی کو کم سے کم الفاظ میں دل نشیں طور پر ظاہر کرنے سے ہے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ان کا مقصود ادب میں سادگیٔ بیان کے پردے میں قدیم و صحت مند روایات کی مخالفت اور اشتراکیت کی تبشیر و اشاعت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض سنجیدہ طبقوں نے ادب میں سادگیٔ بیان اور حقیقت پسندی کو مدِ نظر رکھنے کے باوجود ترقی پسند نظریات کا بھرپور خیر مقدم نہیں کیا۔ اسی گریز کی بنا پر ہی ترقی پسندوں کا اشتمالی انگیز مخالفانہ لب و لہجہ اور ان کے نظریات کی رومانیت بیزاری بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہر بات کے کہنے کا ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ نہیں ہوتا تو شیخ اور تاجِ اپنی بالمنی ہمدردی و رفاقت کے باوجود بدنام ہو جاتے ہیں اور ترکِ شراب پر آمادہ رند بھی مشتعل ہو کر تجدیدِ شراب کی سوچنے لگتے ہیں۔ کچھ یہی حال سادگی پسندی و حقیقت پرستی کی تائید میں ترقی پسندوں کے بعض غیر نفسیاتی بیانات کے سبب ہوا۔ چنانچہ کچھ قدامت پسندوں نے سادگیٔ الفاظ کو معنی خیز نہ جاننے اور نہ ماننے کے باوجود اوقاف الفاظ کی ایسی عجیب عجیب تاویلیں کیں کہ خدا کی پناہ! جس کی وجہ سے بہت دنوں تک ادبی مباحث کا کوئی تعمیری اور اطمینان بخش نتیجہ نہیں نکلا بلکہ نت نئے نظریات اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس ادبی اُلجھاؤ کا کسی ایک طبقہ کو ذمہ دار ٹھہرانا انصاف نہیں ہے۔

ترقی پسندوں کی ایسا ثیت بیزاری سے خصوصاً غزل کچھ دنوں تک متاثر اور نظم متبرا رہی اور رفتہ رفتہ "شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل" کی باغیانہ کے تیز رہی۔ لیکن کچھ دنوں بعد نظم کی بے جا اور اکتا دینے والی رجائیت اور تصنع و بدمزہ تفصیل کی وجہ سے غزل کی ادائے دلبری بے اختیار یاد آنے لگی اور جو ترقی پسندوں نے بھی پڑھ کر اس کو گلے لگا لیا۔ لیکن ابتداء میں انھوں نے غزل کے "دلفریب غم دوراں" کے پڑھنے میں ایک طرح سے غزل کی مخالفت ہی کا کام لیا۔ تاہم کچھ دنوں بعد غزل پوری توانائیوں اور جواں خط و خال کے ساتھ ابھر کر ماضی کے منقطع روایات سے ہم کنار ہو گئی۔ چنانچہ اپنی ترقی پسندی کے باوجود خصوصاً فراق، فیض، مجاز، جذبی اور مجروح وغیرہ نے غزل میں غمِ دوراں کے ساتھ ساتھ غمِ جاناں کو بھی ملحوظ رکھا۔

مگر چونکہ اپنے مقاصد کا اشتراکی تصور رکھنے والی یہ ادبی و سیاسی تحریک مجموعی طور پر اسی قابل نہیں تھی کہ وہ پیچیدہ زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہو سکے اس لئے وہ آزادی کے کچھ سال بعد ختم سی ہو گئی۔ لیکن یہاں یہ بات ماننا پڑے گی کہ اس ادبی تحریک کی بدولت ادب میں بیانیہ اعتبار سے سادگی اور افادیت پسندی کا میلان عام ہوا، ادبی موضوعات کو وسعت اور شاعری کو کچھ نئی بحریں ضرور مل گئیں جن کی افادیت سے انکار کرنا انصاف نہیں ہے۔

اس تحریک کی عدم کامیابی سے ظاہر ہے کہ ادب فنی و جمالی قیود سے بغاوت کر کے اور وجدانی پہلو پر مقصدی پہلو کو ترجیح دے کر اپنے

مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے - اگرچہ اردو ادب میں ۱۹۵۷ء اور ۱۹۳۶ء کے یہ مادّی و سیاسی تغیرات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور ادب کو ماحول کے تابع بنانے کی دلیل میں بلوط خاص پیش کئے جاتے ہیں لیکن اک عارضی تغیر سے یہ اندازہ کرنا درست نہیں ہوگا کہ مادّی تغیّر یا ارتقاء کے بغیر فکر و نظر کا تغیّر و ارتقاء ناممکن ہے - اگر ایسا ہوتا تو جدلیاتی مادیت کا فلسفہ فکری و حقیقی کہلاتا لیکن تاریخ کے بعض اہم اور اساسی فلسفہ حیات کی صحت اور اکملیت کی نفی کرتے ہیں جس کے متعلق مشاہ عرض کر چکا ہوں -

ادب کو صد فی صد ماحول کے تابع یا کسی سیاسی نظریے کا پابند بنا دینے کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ ماحول کے بدلنے پر بدلے ہوئے ماحول کا ادب اس قابل نہیں رہتا کہ نئے ادب کا دامن اس سے بانڈھا جا سکے اور ادب کے لئے ظاہر ہے کہ یہ تسلسل لازمی چیز ہے - ذرا غور کیجئے ہم ادب کو سارے فراغت لطیفہ طاق پر رکھ کر صرف معاشی آسودگی کا ذریعہ بنا دینا چاہتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ معاشی آسودگی کے بعد ہم ادب سے کیا کام لیں گے - کیا تاقیامت ادب روک دیا جائے گا اور پھر معاشی آسودگی کے بعد فنکارانہ طور پر تیزی سے اُبھرنے والے ان لطیف تقاضوں کی تکمیل کے لئے کس سے مدد لی جائے گی جو اب تک بھوک کی وجہ سے تحت الشعور میں دبے پڑے تھے اور جن کی اہمیت معاشی تقاضوں سے قطعاً کم نہ ہوگی - غور کیجئے کیا معاشی ادب کو پرکھنے کے لئے وضع کئے ہوئے وہ اقتصادی پیمانے ان لطیف احساسات و جذبات کو ناپ سکیں گے اور کیا اس طرح تنقید اتنی مختلف النوع ہو کر تخلیقی جاذبیت پیدا کر سکے گی کیونکہ ظاہر ہے کہ معاشیات و رومانیات جیسے متضاد احساسات کو جوڑ دینے والے جزو مشترک کی تخلیق آسان کام نہیں - خاص بات تو یہ ہے کہ معاشی زندگی حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو سنگ ادب یقیناً بھوک اور فاقوں کے بے جان اذکار سے اٹا ہوگا، کیا ان عالک کے لوگوں کو بھی محظوظ کر سکے گا جنھیں معاشی خوشحالی کی وجہ سے بھوک کے ساتھ ہماری طرح مشدید تعلق نہ رہا ہو اور کیسا ہمارا ادب اس بے مائگی اور عدم توزع کے باوجود آفاقیت کا دعویٰ کر سکے گا -

بھوک کی تکلیف سے قطعاً مجالِ انکار نہیں لیکن بھوک کے وقت جتنی ضرورت غذا کی فراہمی کی ہے اتنی ہی ضرورت ان جذبات لطیفہ کی حفاظت کی بھی ہے جو ہمارے رات دن جبر و تسلم سے زندہ رہنے سے فنا ہو کر روح کو تاریک بنا سکتے ہیں - "زندان کی سفتیاں" "مسلم" لیکن ان سے گھبرا کر "ذوقِ گلستاں" فراموش کر دینا ماحول پسندی کی بجائے "رہائی" کو بے لطف اور زندگی کو اجیرن کر دیتا ہے - اگر قحط کے زمانوں میں ہمارے اسلاف غزل کی طرف نسبتاً کم ہی سہی دھیان نہ دیتے تو شاید غزل آج باقی نہ رہتی اور نہ ہم اس سے آسودگیٔ ذوق کے ساتھ ساتھ سماجی کام لے سکتے -

کیا حالی نے اسی لئے غزل کے فیضِ اداؤ کا رونا رویا تھا کہ ادب محض پھر کر پھر اسی دائرۂ جمود میں آ گرے - کیا ادب کو مطلقاً ماحول کی ترجمانی یا وقتی ترجمانات کے پابند بنا دینے سے پیدا شدہ یہ نقصان ہمارے پونکنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ فنوں میں ماحول نہ ہونے کی وجہ سے مرثیہ، قصیدہ اور مثنوی کو دمنی حیثیت اختیار کرنے کے باوجود آج کوئی پوچھنے والا تک نہیں ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے غزل کی زندگی کو دیکھئے جو نت نئے تنزل بیز احوادث و تغیرات کے باوجود دم توڑنے کی بجائے "صنفِ ادب" کے دائرے سے نکل کر جزوِ تہذیب ہو چکی ہے - آخر کیوں؟ اس لئے کہ اس نے اکثر مستقل اور آفاقی احساسات و جذبات ہی کی ترجمانی کی ہے اور مقصدیت کے ساتھ ساتھ "آرٹ" کا بھی لحاظ رکھا ہے اس لئے ادب کو اتنی جمالیاتی وسعت عزور دی جانی چاہئے جو زیادہ سے زیادہ اور مختلف النوع ادوار کے احساسات کو ناپ سکے -

ادب دراصل علمی و افادی چیز بھی ہے اور جمالیاتی بھی - اس لئے اس میں موضوع کی بھی اہمیت ہے اور انداز بیان کی بھی - یقیناً "کیا کہنا ہے" کا سوال "کس طرح کہنا ہے" سے زیادہ اہم ہے لیکن جب تک کہنے کے ڈھنگ سے کہنے والے کا مقصد دل نشیں طور پر ظاہر نہ ہو، مقصد کی نوعیت اور اہمیت ثابت نہیں ہو سکتی - جب مقصد کی اہمیت ہی واضح نہ ہو تو پھر اس کے ذریعہ سامعین و ناظرین میں عملی تحریک کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے -

یہی وجہ ہے کہ بعض شعراء خوش فکر تو ہوتے ہیں لیکن انداز بیان کی طرف توجہ نہ کرنے سے خوش گو نہیں مانے جاتے ـــــ اگر ادب میں اسلوب کی اہمیت و وقعت نہ ہوتی تو ماہرین فن کلام کو حال کے مقتضائے حال کے مطابق بنانے کے لئے علم معانی کی ترتیب و تقسیم میں اتنی مغز کھپائی اور عرق ریزی کوششیں نہ کرتے اور نہ غریب شیخ وناصح حق گوئی اور بیباکی کے باوجود اپنے تیز و طنزیہ لب و لہجہ کی وجہ سے بدنام ہوتا اور نہ "ساقی" اپنی ایمان سوز ذہنیت کے باوجود شیریں بیانی سے ہر دل عزیز ہو سکتا۔

---

منیر الدین احمد

# رخِ آدم

## عزم

رخِ عالم بدلتا جا رہا ہے
مرے قدموں تلے چھایا آ رہا ہے
گل و گلزار کا ایک ایک پتہ
ادھم کے باغ کو شرما رہا ہے
تمدن وقت کے داغِ جبیں کو
ستارے کی طرح چمکا رہا ہے
ابھی ہے آدمی کی نوجوانی
کہ یہ دیوانہ پن دکھلا رہا ہے
مزاجِ عشق زیرِ پختگی ہے
تبسمِ حسن بھی گہرا رہا ہے

•

حقائق کی بدل جائیں گی قدریں
یہ علم و آگہی کا منتہا ہے
خلافت مقتضائے خلقِ آدم
یہ سازِ آفرینش کی صدا ہے
یہی تفویضِ منصب حق بشارت
کہ رخِ غیب جس کا ارتقا ہے
جہاں ہے علم و عقل و عزم و ہمت
وہیں جلوے ہیں دیدارِ خدا ہے

وصی عارف

# جھلکیاں

ہر نظر آئینۂ جلوۂ غم ہے لیکن
ہر نفس حوصلۂ دل تو بڑھا جاتا ہے
ہر قدم سیلِ حوادث کا کرم ہے لیکن
قافلہ جانبِ منزل تو بڑھا جاتا ہے

کوئی کیفیتِ غم تھی نہ مسرت کا سرور
زندگی جبرِ مسلسل کا نشاں تھی پہلے
کشتۂ درد تھا اخلاص و محبت کا شعور
زندگی سلسلۂ آہ و فغاں تھی پہلے
رات دن درپئے آزار تھا باطل کا غرور
زندگی روحِ صداقت پہ گراں تھی پہلے
مرکزِ سعی و عمل سے رہ تسخیر سے دُور
زندگی مایۂ بے تاب و تواں تھی پہلے

نیا انداز لئے عظمتِ کردار ہے آج
دیکھنا نظمِ کہن زیر و زبر ہے کہ نہیں
ذرّہ ذرّہ مہ و اختر کا طلبگار ہے آج
دیکھنا ذوقِ تجسس کا اثر ہے کہ نہیں

اور ہی رنگِ بہارِ گل و گلزار ہے آج
دیکھنا ارضِ وطن خلدِ نظر ہے کہ نہیں
حسنِ جمہور کا ہر جلوہ ضیا بار ہے آج
دیکھنا ہند کے آنگن میں سحر ہے کہ نہیں

آہنی عزم کا ہے نقش بھلائی کا جلال
روڑکیلا کی حسیں شوخ کرن کیا کہیئے
بھاکڑا، ننگل و ریہانڈ کا یہ حسن و جمال
لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی پھبن کیا کہیئے
بجلیاں کرکے منیدہ یہ ہوئی صورتِ حال
جگمگا اُٹھے ہیں صحرا و چمن کیا کہیئے
کامگاروں نے کیا حل نئے الجھن کا سوال
لے کے پہنچے گا کہاں جذبۂ فن کیا کہیئے

آج مستقبلِ روشن کی تمنا ہے یہی
توڑ دیں دامِ ہوس جس نظر عام کریں
آگے بڑھتے ہوئے لمحوں کا تقاضا ہے یہی
ساتھیو آؤ کہ مل جل کے کوئی کام کریں

نوشاد علیانی

# کرکٹ

## انگلستان اور ہندوستان کے حالیہ میچوں کے پیشِ نظر

کرکٹ کا کھیل بڑا دل چسپ ہے۔ کسی میچ کے انجام تک پہنچتے پہنچتے اتار چڑھاؤ ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عالم گیر کھیل ہے۔ آسٹریلیا، انگلینڈ، ہندوستان، پاکستان، جنوبی افریقہ، جزائر غرب الہند اور نیوزی لینڈ میں یہ کھیل بہت مقبول ہے۔ بعض کھلاڑی بیٹنگ یعنی دوڑیں بنانے میں ماہر ہوتے ہیں بعض بولنگ یعنی گیند پھینکنے میں۔ بعض ان دونوں حیثیتوں میں اچھے کھلاڑی ہوتے ہیں ان کو آل راؤنڈر کہا جاتا ہے۔

بیٹنگ میں انگلستان کے ہمنڈ، ہٹن، اے۔ کاؤڈری اور برنگٹن قابلِ ذکر ہیں۔ آسٹریلیا کے ڈان بریڈمین، ہاروے اور ویل۔ پاکستان کے حنیف، امتیاز اور سعید، جزائر غرب الہند کے ووِل، والکاٹ، ویکس، سوبرس اور کنہائی اور نیوزی لینڈ کے شکلف، ہندوستان کے کھلاڑیوں میں رانجی، دلیپ سنگھ جی، پاٹودی، سی۔ کے نائیڈو، امرناتھ، مشتاق علی، وجے مرچنٹ، ہزارے، منکڈ، امری گر اور منجریکر کا ریکارڈ قابلِ رشک ہے۔ مدراس میں نوجوان نواب آف پاٹودی نے ۱۰۳ دوڑیں بنا کر ثابت کیا ہے کہ ان کا مستقبل بھی شان دار ہے۔

بولنگ میں آسٹریلیا کے اوریلی، بینو، ڈیوڈسن اور لِنڈوال، انگلستان کے ویری ٹی، کلارک، ٹروِمین، سٹیتھم، پاکستان کے فضل محمود اور ہندوستان کے شاراحمد، امرسنگھ، امرناتھ، ونومنکڈ، غلام احمد، جسو پٹیل، سبھاش گپتے قابلِ ذکر تو تھے ہی حالیہ میچوں میں سلیم درّانی نے اپنے کمالات سے پہلی صف میں جگہ حاصل کر لی ہے۔ جزائر غرب الہند میں گلکرسٹ اور ہال بہت اچھے گیند پھینکنے والے ہیں۔

ہندوستان تقریباً بتیس سال سے بین الاقوامی کرکٹ کے میدان میں ہے۔ جہاں اس کے کھلاڑیوں نے بڑے بڑے کارنامے نمایاں کئے ہیں وہاں بدقسمتی سے زیادہ جیت اس کی قسمت میں نہیں تھی۔ ٹیسٹ میچوں میں نیوزی لینڈ سے ہم نے ربر جیتا تھا۔ پاکستان سے بھی جیتا، لیکن آسٹریلیا، جزائر غرب الہند اور انگلینڈ سے کبھی ربر نہیں جیتا تھا۔ آسٹریلیا سے کانپور میں ٹیسٹ میچ جیتا تھا اور انگلستان سے مدراس میں۔ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان حالیہ پانچ ٹیسٹ میچوں میں تین میچ ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہو گئے۔ دو میچ ہندوستان نے جیت کر ربر جیت لیا۔ یہ ہماری کرکٹ کی تاریخ میں ایک نئی بات ہے۔ یہ پانچ میچ بالترتیب بمبئی، کان پور، دہلی، کلکتہ اور مدراس میں کھیلے گئے۔ فیصل میں ان میچوں کی مختصر تفصیل درج ہے:۔

بمبئی کا میچ نومبر ۱۹۶۱ء کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ دونوں طرف کا اسکور یہ ہے:۔

| | | |
|---|---|---|
| ایم۔ سی۔ سی (انگلینڈ) | پہلی اننگز آٹھ وکٹ پر | ۵۰۰ دوڑیں |
| | دوسری اننگز پانچ وکٹ پر | ۱۸۴ " |
| ہندوستان | پہلی اننگز | ۳۹۰ " |
| | دوسری اننگز پانچ وکٹ پر | ۱۸۰ " |

یہ کھیل ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہوا۔ انگلینڈ کے کھلاڑی پیرنگٹن نے ۱۵۱ دوڑیں بنائیں اور وہ آوٹ نہیں ہوئے۔

کانپور کا میچ بھی ناقابل فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہوا۔ ہندوستان نے پہلی اننگز میں آٹھ وکٹ پر ۴۹۷ رنز بنا کر کھیل کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ایم۔ سی۔ سی ٹیم پہلی اننگز میں صرف ۴۴۴ رنز بنا سکی۔ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ۲۶ ٹیسٹ میچوں میں پہلی بار انگلستان کو فالو آن (ایک اننگز کے فوراً بعد دوسری اننگز کھیلنا) کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن دوسری اننگز میں انگلینڈ نے پانچ وکٹ پر ۴۹۷ رنز بنائیں۔ اس میں ہیں امری گر نے ۱۴۷ رنز بنائیں اور وہ آؤٹ نہیں ہوئے۔ انگلستان کی طرف سے پُلر نے ۱۱۹، بیرنگٹن نے ۱۷۲ رنز بنائیں۔ کپتان ڈیکسٹر نے ۱۳۶ رنز بنائیں اور وہ آؤٹ نہیں ہوئے۔ بسجاش گپتے نے پہلی اننگز میں انگلینڈ کے پانچ وکٹ لئے۔

دہلی کے میچ میں بھی ناقابل کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ بارش کی وجہ سے آخری دو دن تو کھیل ہی نہیں ہو سکا۔ پہلی اننگز میں ہندوستان نے ۲۶۶ رنز بنائیں اور انگلینڈ نے کھیل ختم ہونے تک تین وکٹ پر ۲۵۶ رنز بنائیں۔ ہندوستان کے کھلاڑی جے سمہا نے ۱۲۷ رنز بنائیں اور ٹیسٹ میچوں میں یہ ان کی پہلی سنچری تھی۔ منجریکر نے ۱۸۹ رنز بنائیں اور وہ آؤٹ نہیں ہوئے۔ اس طرح انھوں نے انگلستان کے خلاف کسی ایک کھلاڑی کی رنز کا ریکارڈ توڑا۔ اس سے پہلے منکد نے ۱۹۵۲ء کے لارڈز ٹیسٹ میں ۱۸۴ رنز بنائی تھیں۔

کلکتے کا میچ بہت دلچسپ رہا۔ اس میں ہندوستان کی جیت ہوئی۔ ہندوستان نے پہلی اننگز میں ۳۸۰ رنز بنائیں اور انگلینڈ نے ۲۱۲۔ دوسری اننگز میں ہندوستان نے ۲۵۲ اور انگلینڈ نے ۲۳۳۔ اس طرح ہندوستان نے یہ میچ ۱۰۷ رنز سے جیتا۔ اس میچ میں کسی طرف سے کسی کھلاڑی نے ۱۰۰ یا اس سے زیادہ رنز نہیں بنائیں۔ سلیم درانی نے پہلی اننگز میں پانچ اور دوسری اننگز میں تین وکٹ لئے۔ اس میچ میں بورڈ سے نے ہندوستان کی طرف سے دونوں اننگز میں بالترتیب ۶۸ اور ۶۱ رنز بنائے اور پہلی اننگز میں انگلینڈ کے تین وکٹ لئے۔

کلکتے کا یہ میچ جیتنے کے بعد ہندوستانی ٹیم کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ کیونکہ اگر مدراس ٹیسٹ برابر بھی رہتا تو بھی ہندوستان کی جیت تھی۔ لیکن مدراس ٹیسٹ بھی ہمارے کھلاڑیوں نے جیت لیا۔ یہ میچ آخر دم تک دل چسپی کا موجب بنا رہا۔ ہندوستان نے پہلی اننگز میں ۳۸۴ رنز بنائیں۔ پالی دی اور کنٹریکٹر نے تیسری وکٹ پر ۱۰۴ رنز بنائیں۔ کنٹریکٹر ۶۰ اور پالی دی ۱۰۳ رنز بنا کر آؤٹ ہوئے۔ ناوکارنی اور اجیت نے بالترتیب ۶۳ اور ۶۵ رنز بنائیں۔ پالی دی کی یہ پہلی ٹیسٹ سنچری تھی۔ انگلینڈ نے پہلی اننگز میں ۲۰ رنز بنائیں جن میں ایم جے کے سمتھ کی ۷۲ رنز قابل ذکر ہیں۔ سلیم درانی نے ۳۶ رنز دیکر چھ اور ۱۰۰ رنز دیکر لئے وکٹ لئے۔ اور دو ایسے تھے جن میں کوئی رنز نہیں بن سکی۔

دوسری اننگز میں ہندوستانی ٹیم صرف ۱۹۰ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ ۴۵ منٹ باقی تھے اور انگلینڈ کو میچ جیتنے کے لئے صرف ۳۳۸ رنز کی ضرورت تھی جو اتنے وقت میں کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن انگلینڈ کی ٹیم صرف ۲۰۹ رنز بنا پائی۔ اس طرح یہ میچ ہندوستان نے ۱۲۸ رنز سے جیت لیا۔ درانی نے دوسری اننگز میں چار وکٹ لئے۔

انگلینڈ نے یہ جیت کر ہندوستانی ٹیم نے کرکٹ میں اپنی ساکھ رکھ لی اور منتقدین کے اس اعتراض کا قرارواقعی جواب دیا کہ ہندوستان کا کرکٹ کا کھیل درجۂ اوّل کا نہیں۔ ناری کنٹریکٹر نے بمبئی کو چھوڑ کر ہر میچ ٹاس ضرور جیتا اور انگلینڈ کے اچھے کھلاڑی ٹیم میں نہیں تھے پھر بھی ہندوستانی ٹیم کی فضیلت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

اس سال کے یوم جمہوریت کے اعزازات میں ناری کنٹریکٹر کپتان اور امری گر نائب کپتان کو پدم شری کا اعزاز دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کرکٹ کے ایک کھلاڑی جمو ٹیل کو یہی اعزاز کا پنور میں آسٹریلیا کی ٹیم کی شکست کا موجب بننے پر دیا گیا تھا۔ حال ہی میں ہماری ٹیم جو امرغرب اہند کے دورے پر روانہ ہوئی ہے۔ اس کے کپتان ناری کنٹریکٹر ہیں اور نوجوان نواب آف پاٹودی نائب کپتان ہیں۔ اس ٹیم میں ۱۶ کھلاڑی شامل ہیں۔

# ایبسٹریکٹ آرٹ

"اگر تخلیق سے مسرت حاصل نہ ہو تو لیتین جانو میں کبھی برش کو ہاتھ نہ لگاؤں۔" (وان گاگ)

وان گاگ کا یہ قول کیا معنی رکھتا ہے اس کے بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف رائیں پیش کی ہیں۔ لیکن شاید اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ وان گاگ کے یہی الفاظ ایبسٹریکٹ آرٹ کی مکمل ترین تشریح پیش کرتے ہیں۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے فن کے بارے میں مجموعی حیثیت سے وان گاگ کے اس بیان کو درست تسلیم کر بھی لیں تو سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مسرت کس صورت میں تخلیق کا حاصل ہو سکتی ہے۔ ممتاز مصور چغتائی کہتا ہے کہ کوئی بھی فن حقیقی مسرت کا حامل اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس میں انقلاب ظہور پذیر ہوتا رہے۔ لیجئے ہم فن میں مسرت ڈھونڈتے ڈھونڈتے انقلابی باتیں بھی کرنے لگے۔ لیکن بات چغتائی کی بہرحال فن میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے فن کار کو اصول روایات اور قدروں سے کھیلنا پڑتا ہے۔

جہاں تک ایبسٹریکٹ آرٹ کی تاریخ کا تعلق ہے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تحریک کسی نہ کسی صورت میں مصوری کے ہر دور میں موجود رہی لیکن اس صدی کے آغاز ہی سے اس نے ایک منظم تحریک کا روپ اختیار کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے مونٹ اس کے خالق تھے جنھوں نے کہا "فن کار کا مقصد تشریح کرنا نہیں ہے بلکہ محض اشیاء کے آہنگ سے مسرت حاصل کرنا ہے" آج سے کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ یورپ میں مظاہر فطرت کی مصوری دم توڑنے لگی اور Cubism کی تحریک نے ان مصوروں کی صفوں میں زبردست انتشار پیدا کر دیا تھا۔ ایسے عالم میں ہر حساس مصور نے اپنے آپ کو احساسات کے ایک ایسے لق و دق صحرا میں گھرا ہوا پایا جس کا اور چھور تصور میں بھی نہ ملتا تھا۔ اس وقت فن کار کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ اس صحرا پر کھو کر فنا ہو جائے یا ایک ہی جست میں اُسے پار کر جائے۔ یہ ایک ہی جست" فن مصوری میں ایبسٹریکٹ آرٹ کے نام سے منسوب ہوئی۔

یہ تو ہوئی اتنا ہمیں شاعری۔ لیکن جب کوئی عام سر مجموعہ کا شخصی اور خاص کردہ جو ایبسٹریکٹ آرٹ کے تمام روایات سے قطعی بے بہرہ ہو ایبسٹریکٹ آرٹ کے نمونوں کی نمائش دیکھنے جاتا ہے اور وہاں جو کچھ بھی دیکھتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں جو بھی تاثر پیدا ہوتا ہے وہ کچھ اس سے مختلف نہیں ہوتا کہ آرٹسٹ نے کینوس پر بے محابا برش پھیر دیا ہے، جہاں جی میں آیا رنگ کے دو تین دھبے لگا دئے ہیں، ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچ دی ہیں اور ..... اور .... فرانس کے ایک مشہور Surrealist مصور کا وہ لطیفہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے جس کے گھر چوری ہو گئی تھی۔ پولیس انسپکٹر اس سوال پر کہ کیا آپ چور کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔ حضرت نے دو روز کی مہلت مانگی اور دو روز بعد جب وہ اپنے اسٹوڈیو سے نکل کر پولیس اسٹیشن کی طرف چلے تو ان کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا کینوس

تھا۔ اس کینوس کو پکاسو انسپکٹر کی میز پر رکھتے ہوئے انھوں نے فرمایا "میں نے اپنے فن میں چور کی شخصیت کو پیش کر دیا ہے۔"

یہ لگے ہاتھوں آپ بھی اس چور کی جو مرئی شخصیت کی ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے۔ اس تصویر میں آپ نے ایک ٹوٹی ہوئی کشتی" (بہ مراد چور کی ذہنی کیفیت) بگڑے سر مئی رنگوں میں دسیع ساحل (بہ مراد چور کی زندگی کا جمود) اور ایک پتھر پر ٹوٹی ہوئی ٹھوکری (بہ مراد چور کی سنگ دلی اور وقت سے بے خبری) دکھائی تھی۔

اس تصویر کو دیکھ کر وہ قسمت کا مارا پولیس افسر چور کے بارے میں جو کچھ سمجھ سکا ہوگا وہی کچھ ایک عام انسان ایبسٹریکٹ آرٹ دیکھ کر سمجھتا ہوگا۔ کیوں کہ سٹورلزم میں تو پھر بھی کوئی نہ کوئی واضح شکل بنائی جاتی ہے، ایبسٹریکٹ آرٹ میں تو صرف رنگوں اور لکیروں کی ہم آہنگی ہی سے اپنا مقصد بیان کرتا ہوتا ہے۔ یہاں کوئی واضح شکل تو بنائی ہی نہیں جا سکتی۔ بہ الفاظ دیگر ایبسٹریکٹ آرٹ ہیئت کی ہر قید سے مکمل آزادی کا اعلان ہے۔

اس اعلان کی ترتیب کا سہرا ممتاز روسی مصور کانڈنسکی (جو انقلاب روس کے بعد فرانس چلے آئے تھے) اور پابلو مونڈریان کے سر ہے۔ جن دنوں کانڈنسکی (ماسکو ۱۸۶۶ - پیرس ۱۹۴۴) کا فن اپنے عروج پر تھا اس وقت یورپ میں مصوری کی دو تحریکیں بڑے زور شور سے چل رہی تھیں۔ اظہاریہ Expressionism اور کیوبی Cubism ——— کانڈنسکی ان دونوں سے مطمئن نہ تھا۔ ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ اس کے فن میں ایک عجیب و غریب تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔ یعنی اس وقت وہ اپنی تصویروں میں ہیئت کا اتنا پابند نہ رہا تھا۔ لیکن یہ تبدیلی ایسی تھی کہ کانڈنسکی تاثراتی مصوری کی حقیقت پسندی سے بھی منکر ہو گیا اور آخر ۱۹۱۰ء میں اس نے پہلی بار ایک ایسی تصویر بنائی جو غیر مربوط خطوط کے زبردست ٹکراؤ اور قطعی طور پر رنگوں کی غیر حقیقی آمیزش کا مجموعہ تھی۔ اس نے اسے ایبسٹریکٹ آرٹ کا نام دیا۔

فن مصوری میں ایبسٹریکٹ لفظ کے دو مفہوم لئے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایبسٹریکٹ لفظ بطور فعل استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مصور اپنے اصل موضوع سے دور ہٹ کر اس کے کسی ایک پہلو کو اپنا موضوع بنا لیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایبسٹریکٹ کو بطور صفت استعمال کیا جاتا ہے یعنی ایک ایسا فنی شاہکار جس کا اصل موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو۔ موجودہ فن مصوری میں ایبسٹریکٹ آرٹ سے یہی مراد لی جاتی ہے۔ انگلستان کے ممتاز دانش ور نقاد ہربرٹ ریڈ اس مفہوم کی وضاحت یوں کرتے ہیں:۔

"ایبسٹریکٹ آرٹ یاد کی عکاسی نہیں ہے بلکہ یاد سے شخصیتوں کو خارج کر کے اسے فنی سخن میں تحلیل کرنے کا نام ہے۔"

تو کیا ایبسٹریکٹ آرٹ فن برائے فن کا دوسرا روپ ہے؟ جی ہاں۔ یہ ہو بہو فن برائے فن ہے۔ یوں تو ہر زمانے میں فن برائے فن کا نظریہ پر مروجہ نظریے کے پہلو بہ پہلو موجود رہا ہے اور چاہے اس پر منطقی نقطۂ نگاہ سے کتنی ہی تنقید کیوں نہ کی جائے اس حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں کہ اس نظریے کے حامیوں نے بھی فن کی اتنی ہی خدمت کی ہے جتنی اس کے مخالفوں نے۔ لیکن ایبسٹریکٹ آرٹ کے شارح ہمارے لئے ایک مشکل پیدا کر دیتے ہیں۔ یعنی ہم سے یہ امید کی جاتی ہے کہ تصویر کے ذریعہ نہیں بلکہ تصویر کے عنوان کے ذریعہ فن کار جو کہنا چاہتا ہے اُسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن جب ہم کوئی فن شاہکار دیکھتے ہیں تو ہمیں اس وقت فن کار کے ذہنی اختلافات سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ہم اس کی تخلیق سے وہی مفہوم اخذ کر سکتے ہیں جو اُس نے جذباتی طور پر محسوس کیا ہو۔ اور اگر فن کار اپنے ذہنی رجحانات کو اپنے اندرونی جذبات پر غالب آنے دیتا ہے یا ترجیح دیتا ہے تو پھر وہ ناظر اور اپنے درمیان اپنے ذہنی عقیدے کی بنا پر ایک ایسی دیوار کھڑی کر لیتا ہے کہ فن نامہ و پیام کا ذریعہ نہیں رہ جاتا۔

فن کار بنیادی طور پر جذبات کا پُتلا ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے جذبات کی شدت اور خیال کی لا محدود وسعت کو ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا فن جمال کا حامل ہو جاتا ہے۔ اب فن کار فن برائے فن کا حامی ہو یا فن برائے زندگی کا دونوں ہی صورتوں

ہیں جو بات اس کے فن میں تاثر پیدا کرے گی وہ اس کے احساسات کی شدت اور قوتِ بیان ہوگی جبھی پکاسو کی Cubism ہو یا ڈالی کی Surrealism دونوں میں جو پوتنا پن ہے کیوں کہ ان کا اسلوب زندگی کی نقالی کرتا ہے۔

لیکن جب جدید آرٹ کے خالق سیزاں نے یہ کہا کہ ایبسٹریکٹ آرٹ حقیقت کی عکاسی نہیں ہے بلکہ ایک اور بہتر اور نئی مخلوق کی تُرد سے اپنی حقیقت خود تخلیق کرتا ہے تو سبھی جدید ایبسٹریکٹ مصوّروں نے اس تشریح کا سہارا لے کر اپنی تصویروں کو گورکھ دھندا بنا کے رکھ دیا۔ ناظر کو ایبسٹریکٹ آرٹ سے شاید کوئی بحث نہ ہو لیکن جس طرح اس طرزِ فن کے حامی اس مغلق کا سہارا لیتے ہیں وہ ناقابلِ فہم ہے۔ ایک طرف تو آپ اپنی تصویر میں کوئی بھی واضح شکل بنانے سے صریحاً انکار کرتے ہیں اور دوسری طرف انھیں تصویروں پر ایسے ایسے عنوانات سجاتے ہیں جو فلسفہ آمیز ہوتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں اپنی تصویروں کو کمپوزیشن نمبر ایک اور دو قرار دیتے؟ کیوں نہیں تصویر کا عنوان محض 'ایک تصویر' رکھ دیتے۔ یہ سوال ایسا ہے کہ اگر اس کی تہ تک پہنچا جائے تو دلوں کا چور نکل جائے۔

آیئے پہلے ہم اس حقیقت کا جائزہ لیں کہ جدید ایبسٹریکٹ آرٹ کسی بھی واضح یا مبہم شکل سے منہ کیوں موڑ گیا ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کے فن کاروں کے ذہن میں 'ہم سب کیا ہیں' کے بدلے 'ہم سب کیوں ہیں؟' کا سوال بڑی شدت کے ساتھ اُبھرا۔ اور جب اس مشکل سوال کا انھیں کوئی ظاہر خواہ جواب نہ ملا تو انھوں نے یکایک واضح پیرایۂ اظہار سے منہ موڑ لیا۔ اس سوال کا جواب ملتا کہاں سے؟ دو عالمگیر جنگوں نے یورپ کی سماجی قدروں کو دھواں بنا کر اڑا دیا تھا۔ دوسری جنگ کے بعد جس صورت میں یورپ کے فن کار نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر کسی فرد کو سماج میں منجمد قسم کا رد دے دیا جائے تو اس میں ایسے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ سماجی قدروں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے پر تُل جاتا ہے۔ اور جب یہی کیفیت کسی فن کار پر طاری ہوتی ہے تو اس کا ردِ عمل ایک عام فرد سے بہت زیادہ شدید ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوتِ تخلیق سے حقیقت کو سرے سے مٹا دینے پر تُل جاتا ہے۔ اور جب حقیقت پہلے ہی جنگ کی نذر ہو چکی ہو، جب ایک دوسرے پر اعتبار تو کیا خود پر بھی اعتماد باقی نہ رہا ہو تو فن کار خلا کو ہی مسخ کر کے انتقام لیتا ہے۔ چناں چہ ان حالات میں فن برائے فن کا نظریہ ایبسٹریکٹ آرٹ کی صورت میں یورپ پر چھا گیا اور اس میں ایسی شدت آئی کہ وہ اپنی ہی حدود سے تجاوز کر گیا۔ فرانس میں عجیب و غریب فنی تحریکوں نے جنم لیا۔ ہر تحریک نے گذشتہ تحریک کو اس طرح مٹا دیا جیسے وہ کبھی وجود میں آئی ہی نہ ہو۔ یورپ کے فن کار فن کے ذریعے اپنے وجود کا جواز ڈھونڈ رہے تھے اور اس تلاش میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ اپنے جذبات کے بجائے اپنے ذہنی عقیدوں کو پیش کرنے پر اُتر آئے۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ ایبسٹریکٹ آرٹ کے فن کاروں نے ایبسٹریکٹ مصوّروں کے نظریات اور عقاید کی آڑ لے کر ان کے فن کو بھی مضحکہ خیز بنا دیا۔ جب ایبسٹریکٹ آرٹ کو رجعت پسندانہ تحریک قرار دیا جانے لگا تو ایبسٹریکٹ مصوّروں نے ایک نئی تحریک غیر مقصدیت Non-Objectivity کے نام سے پیش کی۔ یہ سب سے زیادہ قائل کرنے والی دلیل تھی اور اس کے جواز میں ایبسٹریکٹ مصوّروں نے سنگیت کا نام لیا۔ یہی نہیں بلکہ اس ضمن میں فطرت کی مصوّری اور نیچر مورٹ کی مصوّری کا بھی حوالہ دیا جائے گا۔ وان گاگ، گوگاں، ٹرنر، ماتیے اور کئی دیگر عظیم مصوّروں کا نام ایک ہی سانس میں لے دیا۔ لیکن بات وہی رہی اور ایبسٹریکٹ آرٹ کی جنگ تصویروں کے ذریعے نہیں بلکہ تحریروں کے ذریعے اور بھی شدت سے لڑی جانے لگی۔

انگلستان کے عظیم ایبسٹریکٹ مصوّر ولکٹ پاسور سنڈے ٹائمز لنڈن کے ادبی سپلیمنٹ بتاریخ ۵۔ فروری ۱۹۶۱ء میں 'ایبسٹریکٹ آرٹ کیا ہے؟' کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

" ایبسٹریکٹ آرٹ نے مصوّری اور سنگ تراشی کو مقصدیت کے اعتبار سے وہی رتبہ عطا کیا ہے جو کوبسٹی کو حاصل ہے - ایبسٹریکٹ آرٹ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا فن برائے فن کا نظریہ - فن برائے فن کوئی منفی تحریک نہیں ہے - یہ تحریک فن کار کو اپنے فن کی عقلی جستجو سے الگ تھلگ کرنے کی بجائے اسے بھرپور دعوت دیتی ہے کہ وہ تخلیقی فن کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دے - "

اس حقیقت سے کون کافر انکار کر سکتا ہے کہ آنکھوں سے دیکھ اور سمجھ جانے والے ہر ایک فن کی تاریخ میں ہیئت کے معاملے میں جس قدر آزادی سے کام مصوّری اور فنِ سنگ تراشی میں لیا گیا ہے کہیں اور نہیں لیا گیا - لیکن شکایت کو کیوں بیچ میں گھسیٹا جاتا ہے - جب کوئی موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے تو کیا آپ اس وقت اس کے نیّت سے اس کی شخصیت کو خارج کر سکتے ہیں ؟ اگر نہیں تو پھر یہ غیر مقصدیت کیا چیز ہے ؟

ڈکٹر پاسمور کی اس منطق کے جواب میں ہندوستان کے ممتاز مصوّر ستیش گجرال کہتے ہیں " اگر آپ مصوّری کو موسیقی کے اصولوں پر ترتیب دینا چاہتے ہیں تو ضرور آپ کی مرضی - لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دھنوں کا آہنگ موسیقار کے جذباتِ زندگی کا حامل ہے یا اس آہنگ کی خود کوئی اپنی جداگانہ حیثیت ہے ؟ اصل بات یہ نہیں ہے کہ کوئی تصویر ہوں کے آہنگ پر قائم ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ تخلیق کی بنیاد انسان کے جذباتِ زندگی پر ہے یا فنی کاریگری پر ؟ "

ستیش گجرال کی یہ طرز نوائی ہمیں یکدم یورپی ایبسٹریکٹ آرٹ سے نکال کر ہندوستانی ایبسٹریکٹ آرٹ کی دنیا میں لے آتی ہے - ہندوستان میں یہ تحریک صرف ۱۹۶۰ء میں شروع ہوئی اور ابھی اپنے ابتدائی مرحلوں میں ہے - لیکن دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ ہندوستانی مصوّری میں ایبسٹریکشن کو کس حد تک دخل ہے ؟ آج تک ہمیں یہ حیثیت قوم کلی طور پر ادا ہونے کا خطرہ لاحق نہیں ہوا جیسا کہ یورپ کو ہو چکا ہے - لہٰذا ہم اندرونی طور پر اس شدت سے " ہم کیوں ہیں " کے سوال کا ردِ عمل اپنے اندر پیدا نہیں کر سکے جیسا یورپی مصوّروں نے کیا - پھر ہمارے ہاں سماجی یا روحانی قدریں ابھی وجودیت کی لہر کی پہنچ سے باہر ہیں - لہٰذا ہم مصوّری میں داخلی اظہار سے منہ موڑ کر محض زنگوں اور لکیروں کی ہم آہنگی سے کہاں تک تاثر پیدا کر سکتے ہیں - اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا - ہمارے فن کاروں نے یہ تحریک تو یورپ سے مستعار لے ہی لی لیکن بڑی بوڑھی یہ ہو گئی کہ یہاں اس تحریک میں جان ڈالنے کے لئے داں کی کچھ تصویریں بھی اپنا لی گئیں - چوں کہ ایبسٹریکٹ آرٹ بعض تاریخی حادثات کا نتیجہ ہے اور ہم ان حادثات سے دوچار نہیں ہوئے لہٰذا یہ ہمارے مزاج سے میل نہیں کھاتا - تاہم قریب قریب ہمارے سبھی نامور مصوّر اس تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں - یہی نہیں بعض فن کار جیسے رام کمار، رضا، مومن سامنت، ایرن دے، دیوانی کرشنا اور کشن کھنہ وغیرہم تو قطعی طور پر اس اسلوب کو اپنا چکے ہیں -

خود ستیش گجرال جو اس تحریک کے بہت نکتہ چیں ہیں اپنی حالیہ تخلیقات میں اس سے متاثر نظر آتے ہیں - گو انہیں خود اس سے انکار ہے - جب میں نے ان کی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جو بہت حد تک ایبسٹریکٹ تھی تو کہنے لگے " ہر تخلیقی فن پارہ کسی نہ کسی حد تک ایبسٹریکشن پر دار و مدار رکھتا ہے کیوں کہ تخلیق نام ہے حقیقت اور خیال کے امتزاج کا - ایک تخلیقی ذہن کے لئے یہ ناممکن ہے کہ محض حقیقت کو پیش کرنے پر اکتفا کر لے - وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہے کہ حقیقت کے زیادہ سے زیادہ پہلو اجاگر کرے - چنانچہ میری بھی یہی کوشش ہے - لیکن یہ سمجھنا کہ میں ایبسٹریکٹ آرٹ یعنی فن برائے فن کی طرف آ گیا ہوں غلط فہمی ہوگی - جس دن میں یہ دیکھوں گا کہ میرے آرٹ میں تاثر اور کیفیت نہیں بلکہ میں لکیروں اور رنگوں کا آہنگ ڈھونڈنے لگا ہوں اس دن میں مصوّری ترک کر دوں گا - "

ستیش گجرال کے اس بیان سے ایک بات تو واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ایبسٹریکٹ آرٹ کو بطور اسلوب اپنانا نہیں چاہیئے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایبسٹریکٹ آرٹ میں کسی فارم ہی کو دخل ہو لیکن تصویروں میں موڈ کا ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان کے نوجوان ایبسٹریکٹ مصور شری موہن سامنت جو آج کل امریکہ ہی میں مقیم ہیں۔ اب اپنی تصویروں سے اشاریت Symbolism کو بھی خارج کر چکے ہیں۔ موہن سامنت نے ۱۹۵۱ء میں نیویارک کی مینم ویلنٹائن گیلری میں جب اپنی ایبسٹریکٹ تصویروں کی نمائش کی تھی تو امریکہ کی مینم آرٹ نقاد ایملی گینارنے ہیرلڈ ٹریبون میں لکھا تھا "Arrived" کا خطاب دے دیا تھا لیکن یہ 'آپہنچنے' کی منزل دنیائے فن میں جہاں فن کار کے تخیل فن میں اولین سنگ میل ہے وہاں دشوار ترین گھاٹی بھی ہے۔

ہندوستانی مصوری کے متاز نقاد شری اجیت کمر جی نے آج سے پانچ سال پہلے اپنی کتاب "فائن آرٹ ان انڈیا" میں چند مصوروں کے فن پر بحث کی تھی جن میں موہن سامنت بھی شامل تھے۔ شری کمر جی اس کتاب میں لکھتے ہیں — "جدید ہندوستانی آرٹ ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے اور آہستہ آہستہ بین الاقوامی آرٹ کے وسیع حلقے میں شامل ہونے کی سخت جدوجہد کر رہا ہے۔ آج ہم ایک ایسی اُبھرتی ہوئی نسل سے دوچار ہیں جس کی ذہنی صلاحیت اپنی منزل کو پالینے کی جان لیوا لگن و دھن میں سرگرم ہے۔"

لیکن تعجب کی بات یہ نظر آتی ہے کہ اگر ہمارے ایبسٹریکٹ مصوروں کی منزل ایک ہی ہے یعنی ایبسٹریکٹ آرٹ کی تخیل تو وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور کیوں نظر آتے ہیں؟ ان کی تصویروں سے ایسا کیوں نظر نہیں آتا کہ یہ تحریک انھیں اس دھرتی سے ملی ہے؟ ایسا کیوں نظر آتا ہے کہ ہر مصور کے سامنے کوئی نہ کوئی بڑی لکیر ہے۔ اس وقت ان باتوں کا یہی جواب دیا جا سکتا ہے کہ محض دو سال کے عرصے میں یہ تحریک کسی روایت کی بنیاد نہیں ڈال سکتی۔ ابھی ہمارے فن کار ایک عجیب و غریب ذہنی کرب اور الجھن کا شکار نظر آتے ہیں۔ خیر ابھی تو ایبسٹریکٹ آرٹ کی پہلی دین ہے۔ جب آپ حقیقت کی چیر پھاڑ کریں گے اور ایک نئی اور عین منطق کی رو سے اپنی حقیقت خود تخلیق کریں گے تو ظاہر ہے کہ آپ اپنے ہی ذہنی تناؤ سے نہیں بچ سکیں گے۔ یہی کم سے کم یہ تو ہو کہ ہمارے فن کاروں کے انفرادی تجربات کسی نہ کسی حقیقت کی نشان دہی کر سکیں۔

اس وقت ہندوستانی ایبسٹریکٹ مصوری کے میدان میں میری آنکھیں رام کمار پر لگی ہوئی ہیں۔ رام کمار اپنے فن میں جس طرح ترقی کرتے کرتے ایبسٹریکٹ آرٹ تک پہنچے ہیں اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہر وہ فن کار جو اپنی تخیل میں سرگرم ہوتا ہے اس اتھاہ کرب سے بھی دوچار ہوتا ہے جسے کسی ایک دور سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم رام کمار جیسے سلجھے ہوئے فن کار سے کم از کم اتنا تو تقاضا کر ہی سکتے ہیں کہ اگرچہ یہ تحریک نئی ہے تو بھی ان کی تصویروں میں ان کا اپنا پن تو نظر آئے۔ یہ تو ماضی دور سے یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ اس تسلسل کی جڑیں اپنی زمین میں نہ ہوں۔

ہم اس بات کے قائل نہیں کہ کسی بھی نئی تحریک کو دو ایک سال کے قلیل عرصے میں مروجہ معیار پر پرکھا جائے۔ لیکن یہ مطالبہ تو کر سکتے ہیں کہ وہ تحریک بذاتِ خود ہمارے فن اور تمدنی سرمائے میں اضافہ کی توقع دلائے۔ نئی قدروں کی تخلیق بھی نئی تحریک ہی کرتی ہے۔ کیا کوئی بھی ہندوستانی مصور (مادھو یا ایبسٹریکٹ) یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ ہماری ایبسٹریکٹ مصوری یورپ اور فرانس کے ایبسٹریکٹ فنی شاہکاروں سے آگے بڑھ جائے گی؟

اس ضمن میں دیویک نے جس یقین کے ساتھ جو کچھ کہا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دیویک قدیم قدروں اور روایات کی عزت کرنے والوں میں سے ہیں لیکن فن میں جدت کے بھی قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا کوئی شخص یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ ۱۹۰۸ء سے لے کر اب تک یورپ کے ایبسٹریکٹ مصوروں نے جتنی بھی تصویریں بنائی ہیں وہ سب کی سب شاہکار ہیں؟ دیویک کے نزدیک فنی اعتبار سے سو برس پرانی تحریک بھی بعض اوقات قابل قدر شاہکار پیش کرنے

میں ناکام رہ سکتی ہے اور اپنی ابتداء میں ہی کوئی تحریک مجروح دیکھا سکتی ہے۔

مجروح کی بات دیویک نے بڑے پتے کی کہی ہے جس دن فن میں مجروح کا رومانی ہونا ختم ہو جائے گا اس دن فن ختم ہو جائے گا، آرائشِ جمال کی داستان ختم ہو جائے گی۔ انسانی روح کی نغاست کسی ایٹمی راکھ کے زہریلے اثر سے برباد ہو جائے گی۔ خیال کی وسعت لامحدود ہوتی ہے اور انسان کے ذہن کی اُپج اس کی شخصیت پر مبنی ہوتی ہے۔ اب اس لامحدود وسعت اور ذہنی اُپج کا مناسب امتزاج اگر فن کار کو حاصل ہو جائے تو وہ مجروح دکھا سکتا ہے ورنہ عجیب بدحالی کا شکار ہو کے رہ جانا ہے۔ کیا آپ کو اس امتزاج کی کوئی ٹھوس اور قائل کرنے والی مثال چاہیئے؟ تو لیجئے حاضر ہے

بے حد کے میدان میں پڑا کھیرا سوئے

اب یہ بے حد کا میدان ہی وہ امتزاج ہے، وہ آمدیش ہے جس سے دوچار ہونے پر اگر فن کار پیچ اُٹھا تو نہ فن برائے فن نہ فن برائے زندگی۔ کوئی نظریہ اس کے کام نہیں آئے گا اور اگر کہیں کی طرح مست الست ہو کر اسی میدان پہ چھا جائے تو اس کی تخلیق کو کوئی نام دے دیجئے۔ ایبسٹریکٹ یا اظہاریہ — تاثراتی یا تصوراتی — اس کی تخلیق خود پکار اُٹھے گی۔ وہ کسی بحث کا شکار نہ ہو سکے گی۔

---

سعادت نگیر

# غزل

( نذرِ حالی )

چمن میں، دشت میں، کوئے بتاں میں — مری وحشت ہوئی رسوا جہاں میں

ذرا سی روشنی! اے غنچۂ گل! — کہ ظلمت ہے فضائے گلستاں میں

سبب میری تڑپ کا کچھ نہ پوچھو! — کہ اک نشتر ہے یادِ زلفگاں میں

یہ جینا بھی کوئی جینا ہے اپنا — قفس میں ہم ہیں، دل ہے آشیاں میں

کہیں بجلی، کہیں ہے آتشِ گل — چراغوں کا سماں ہے گلستاں میں

حیاتِ عشق کا حاصل وہی ہے — جو حرفِ غم ہے میری داستاں میں

یہ اک اعجازِ اُلفت ہے وگرنہ — اثر اتنا کہاں میری زباں میں

ترے نغموں کا جادو! اللہ اللہ! — کہ گل کھلنے لگے فصلِ خزاں میں

سکوں ان کا ہے میرے ضبطِ غم سے — بڑی تاثیر ہے ورنہ فغاں میں

سناؤ آپ بیتی! اے سعادت
حلاوت کیا حدیثِ دیگراں میں

# دلِ لخت لخت

اور آخر گوتم شادی کرنے پر رضامند ہو ہی گیا۔ ویسے تو بظاہر شادی سے گریز کی کوئی وجہ نہیں جان پڑتی تھی۔ اندرا وہی لڑکی تھی جس سے اس نے خود محبت کی تھی اور جس کے ساتھ شادی کے فیصلہ کو اس نے قطعی قرار دیا تھا۔ پہلے تو، جیسا کہ ہوتا ہے پوری چھپے وہ اس سے ملا کرتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ اسے اپنے والدین کو سب کچھ بتانا پڑا۔ گوتم نے سن رکھا تھا کہ والدین ہمیشہ محبت کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں اور ہر نوجوان عاشق کی زندگی میں اس کی محبوبہ کے روپ میں محبت اور والدین کے روپ میں فرض کی آپس میں ٹھنی جاتی ہے۔ لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس کے والدین نے فوراً اس تجویز کو مان لیا اور گوتم کی مرضی کے مطابق شادی کرنے کو تیار ہو گئے۔ اپنی تجویز کی فوری قبولیت پر ایک بار تو اسے افسوس بھی ہوا۔ اس نے کیا کیا سبکیں بتائی تھیں کہ ماں باپ کے انکار کر دینے پر وہ کیا کرے گا۔ ہری چاچا سے ان پر دباؤ ڈلوائے گا۔ کھانا پینا چھوڑ کر عاشقانہ وضع اختیار کرے گا۔ خودکشی کی دھمکی دے گا۔ دونوں طرف سے سمجھوتے کی کوششیں ہوں گی وہ ماں باپ کی مرضی کے خلاف رسمِ ورواج میرج کرے گا۔ غرضیکہ اس نے کیا کیا سوچا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے والدین نے دانش مند اور آزمودہ جرنیلوں کی طرح پیش بینی کر کے اس کی تمام چالوں کو ناکام بنا دیا ہو۔ یہ کیسے والدین ہیں، گوتم نے سوچا، جو مخالفت ہی نہیں کرتے! محبت کا آدھا مزا تو ان تصادموں میں ہے جن کو وہ خود جنم دیتی ہے۔ اس محبت کا کیا مزا جس میں ٹکراؤ نہ ہو، کشمکش نہ ہو، جدوجہد نہ ہو اور نہ ہو! اس کا عشق بھی بالکل پھیکا نکلا۔ اس نے کیا کیا دعوے کئے تھے۔ اندرا کے لیے وہ ہر قربانی کرنے کو تیار تھا۔ لیکن یہ کیا! اس کے والدین نے اس سے قربانی کا موقع بھی چھین لیا تھا۔ والدین نے اس کی محبت کی مخالفت نہ کر کے اس کے عشق سے عظمت کا جزو ہی خارج کر دیا تھا۔ کیا، نوکھا پن رہ گیا تھا اب اس کے عشق میں؟ اس کی شادی بھی اب ان روایتی ٹھنڈی شادیوں میں سے ایک ہو گی جن کی تصویروں سے ہفتہ وار اخبارات بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ عین اس وقت جب کہ اس کی اتنی اہم مانگ پوری ہو رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کہیں نہ کہیں نہ کہیں کسی نے دھوکا کیا ہے۔

لیکن شادی سے گریز کی وجہ صرف اس کے عشق کا پھیکا پن ہی تو نہیں تھا۔ کچھ اور بھی تو تھا۔ دو سال ہو گئے تھے اس کی مانگ کو پورے ہوئے۔ لیکن یہ اچانک اس نے شادی کی بات سے کترانا کیوں شروع کر دیا تھا؟ پہلے تو نوکری کا سوال تھا وہ بھی اب پورا ہو چکا تھا۔ ایک انگریزی کمپنی میں اسے اچھی نوکری مل گئی تھی اور اچھا بنگلہ اور نوکر چاکر موٹر وغیرہ سب کچھ تھے۔ ان حالات میں اس کا شادی سے کترانا سب کو عجیب معلوم ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر اس مسئلہ کو صرف یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ میں ابھی شادی کی ذمہ داریوں کو

سنبھالنے کے قابل نہیں ہوا۔ لیکن جب وہ دیانتداری سے اپنے دل کو ٹٹولتا تو وہ خود اپنے سے یہ چھپا نہ سکتا کہ وہ اندرا سے دور جا چکا تھا اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر رتنا کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

رتنا سے اس کی ملاقات ایک بڑی پارٹی میں ہوئی تھی لیکن جس قسم کی لڑکیوں کو سوسائٹی گرلز کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے رتنا ان سب سے جدا تھی۔ تعارف کرائے جانے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے ایک دو رسمی باتیں کیں اور اتنے ہی سے گوتم جان گیا کہ رتنا لاکھوں میں اپنی قسم کی ایک ہی لڑکی تھی۔ جب گوتم پارٹی سے واپس آیا تو ایک ٹھوس قسم کی خوشی اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ناچ رہی تھی۔ کمرے میں پہونچ کر کپڑے بدلنے کے لئے مڑا تو نظر آدم قد آئینے پر اس کی نظر جا پڑی اور وہ ٹھٹھک کر وہیں رک گیا۔ آئینے میں دیکھا تو اپنے عکس کے بجائے وہاں رتنا کھڑی تھی۔ وہ خوبصورت تھی، بہت خوب صورت، لیکن اس میں جنسی کشش کے بجائے ایک قسم کی روحانی کشش تھی۔ اس کی آنکھیں اس صبیل کے پانی کی طرح شفاف تھیں جس میں پہاڑ کا عکس بھر کر اس کے اُجلے پن کو اور بھی نمایاں کر دیتا ہے۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی جو اس کے وجود کے نیز مری پن میں اضافہ کر رہی تھی۔ گوتم نے دیویوں کے بارے میں بھی سُن رکھا تھا آج اس نے اپنی آنکھوں سے ایسی دیوی کو دیکھ لیا تھا جس کی عبادت کرنے کے لئے ایک عمر تو کیا بار ہا جنم لینے کو تیار تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی منزل آن پہنچی ہو۔ اس کی روح کو مدتوں جس کی تلاش تھی وہی اس کے سامنے مسکرا رہی تھی۔ عمر تو اس کی یہی کوئی ۱۸-۲۰ برس کے قریب ہوگی لیکن اس کے چہرے سے وہ سنجیدگی اور متانت ٹپکتی تھی جو انسان کو مدتوں آغوشِ تہذیب میں پلنے پر بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ رتنا کے وجود میں ایک عجیب وقار تھا اور اس کے حسن میں ایک انوکھا جلال۔ رتنا کی ایک مسکراہٹ گوتم کی زندگی کا روکھا پن مٹانے کے لئے کافی تھی۔

وہ بار بار ملے اور پھر ان کا ملنا عام ہوگیا۔ وہ پارٹیوں میں ملتے، ایک دوسرے کے گھر پر ملتے اور کبھی کبھار اکیلے بھی۔ ہر ملاقات ان کو ایک دوسرے کے پاس لاتی رہی حتیٰ کہ ان کی قربت کی آنچ ایک دوسرے کے لئے شرطِ حیات بن گئی۔ گوتم کو رتنا کے ساتھ بے پناہ محبت و عقیدت تھی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ رتنا کے جذبات بھی اس کے لئے اتنے ہی شدید ہیں تو جیسے اچانک گوتم نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ کبھی اس نے اندرا سے بھی محبت کی تھی اور اس کے ساتھ شادی کا وعدہ بھی کیا تھا۔ جذبات چاہے کچھ بھی ہوں گوتم بے حد سمجھ دار، سنجیدہ، وفا شعار اور صاف گو واقع ہوا تھا۔ ایک دن اس نے رتنا کو بتا دیا کہ شاید اسے اس سے آگے نہ بڑھنا چاہئے کیونکہ اس نے اندرا سے پیار کیا تھا اور شادی کے لئے اندرا اس کا انتظار بھی کر رہی ہے۔

رتنا بھی عجیب لڑکی تھی۔ اس بات کو سن کر وہ جلی نہیں اُٹھی، روئی نہیں، چلائی نہیں، ہنس پڑی اور بڑے ضبط سے بولی:۔

"بڑی اچھی بات ہے۔ کبھی اپنے پیار کی کہانی تو سناؤ ہمیں۔"

اور ایک دن گوتم نے دیانت داری کے ساتھ ساری کہانی سُنا ڈالی۔

رتنا بڑے غور اور صبر سے سب کچھ سنتی رہی۔ پھیکے مسکراتی ہوئی آہ بھر کر بولی:۔

"واہ صاحب اتنی بھی جلدی کیا پڑی تھی آپ کو؟ کچھ تو انتظار کر لیا ہوتا۔"

اور پھر ایک دم اپنے آپ کو سنبھال کر بولی جیسے اپنی لغزش کو چھپانا چاہتی ہو۔

"میں مانتی ہوں آپ پر اندرا بہن کا حق ہے۔ میں اس کا حق نہیں چھینوں گی۔"

"بہن" گوتم بڑبڑا اُٹھا۔ کس نام سے رتنا اندرا کو موسوم کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں کوئی اور عورت کسی رقیب کے نام کو

بالکل برداشت نہ کرتی۔ لیکن کس احترام اور پیار سے رتنا اندرا کا ذکر کیا کرتی تھی۔ ایسی ہی باتیں گوتم کو رتنا کا اور بھی گرویدہ بنا دیتیں۔

ایک دو بار گوتم نے کہنا چاہا۔ "ہمیں ایک دوسرے سے ملنا نہیں چاہیئے۔ ورنہ ....."

رتنا اس کی بات کاٹتے ہوئے کہتی — "یہ تم کیا کہتے ہو میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ مجھے صرف اپنے آپ سے پیار کرنے دو۔"

اور گوتم کا بھرتا ہوا عزم یہ سہارا ہو کر پھر ٹوٹ جاتا۔

اب اندرا ان کی ملاقاتوں کی گفتگو کا ایک لازمی موضوع بن گئی تھی۔ ان کی قربت کے بہت قیمتی لمحوں میں رتنا مسکرا کر اچانک پوچھ بیٹھتی۔ "اندرا بہن کیسی ہیں؟ کبھی ان کی کوئی بات سنایا کرو۔" یہ بات گوتم کو بہت اداس کر دیتی اسے ایک دم رتنا پر غصہ بھی آتا۔ پیار کے سہانے لمحوں میں اس کی یہ بات کتنا بے مزہ پن پیدا کر دیتی تھی۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے کچھ اپنے جرم اور ندامت کا احساس ہوتا۔ وہ ایسا محسوس کرتا گویا رتنا نے اس کے جرم، اس کے پاپ پر آنکھ رکھ دی ہو۔ اگر گوتم کے دل کے اندر اندرا ایک بار داخل ہو چکی تھی، تو پھر کیوں گوتم نے رتنا کے دل کے کواڑ پر دستک دی؟

وہ اپنے آپ کو کوستا اور پھر کوستا اندرا کو ماضی کے ہولناک سائے کیوں اس کے حال اور مستقبل کو تاریک کئے جاتے ہیں؟

اور گوتم کو اداس دیکھ کر رتنا بڑے شوخ انداز میں اسے گویا چھیڑنے کے لئے کہتی (حالاں کہ عام طور پر چھیڑنا اس کی خصلت میں نہ تھا)

"کیوں اندرا بہن کی یاد آ گئی ہے کیا؟" اور پھر گویا ترس کھا کر گوتم کو دلاسا دیتے ہوئے کہتی:

"کوئی بات نہیں۔ انہیں بھی یہیں بلا لیں گے۔" اور گوتم پریشان ہو کر رتنا کی گود میں سر ڈال دیتا۔

دونوں جانتے تھے کہ ان کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہے جس کی وسعتیں گوتم اور رتنا دونوں کی اخلاقی قدروں کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ گوتم خود رتنا پر دل و جان سے مرتا تھا، اس کی عبادت کرتا تھا۔ اسے پا کر وہ کیا کچھ نہ پا لیتا۔ اس کی زندگی سہل ہو جاتی۔ لیکن .....

لیکن گوتم خود اپنے خلاف تھا۔ اس کا رویہ اپنے ساتھ بھی نہایت منصفانہ اور غیر جانبدارانہ قسم کا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جذبات چاہے کچھ بھی ہوں انصاف کی بنا پر اندرا کو اس پر تقدم حق حاصل تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ اندرا اس کی زندگی میں پہلے داخل ہوئی تھی اس لئے وہی اس کے دل کی ملکہ ہو سکتی تھی جیسے راستے کی دکان پر جو 'کیو' میں پہلے آتے اس کو ہی ہو جاتا ہے پہلے چینی لینے کا۔ گویا گوتم کو پیار بھی آٹے اور چینی کی طرح 'کیو' کے لئے مروجہ ضابطے سے ہی مل سکتا تھا۔ وہ یہ بات جانتے ہوئے بھی نظر انداز کرنا چاہتا تھا کہ ضابطہ، نظام اور ترتیب کا پیار سے کوئی علاقہ نہیں۔ محبوب تو سارے 'کیو' سارے قوانین اور ضابطے توڑ کر اپنے محبوب تک پہونچ جاتا ہے یا پھر چپکے سے چور دروازے سے داخل ہو جاتا ہے۔ کوئی قانون، ضابطہ اور حکم اسے قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ گھنٹوں اس کی خود اپنے آپ سے بحث ہوتی اور اس کے اندر کے دو گوتم اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔

"اندرا کو بھول جاؤ، رتنا تمہارا ازل سے انتظار کر رہی ہے، رتنا تمہارے لئے ہی بنی تھی۔"

"یہ بے وفائی ہے۔ اندرا کا حق تم پر افضل ہے۔ اندرا نے تمہیں پہلے ڈھونڈا ہے۔"

"ڈھونڈنے کی بات چھوڑو۔ تم شادی کرنا چاہتے ہو شادی اسی کے ساتھ ہو سکتی ہے جو تمہارے دل و دماغ میں بسا ہے۔ شادی تمہاری خوشی کی بات ہے۔"

"تم کسی کی آرزوؤں کا خون کر کے اپنی خوشیوں کا محل کیسے کھڑا کر سکتے ہو؟"

"یہ تمہاری زندگی کا سوال ہے۔ عمر بھر کی خوشی چاہتے ہو یا

عمر بھر کی قید ؟ رتنا کو چھوڑ کر تم کہیں اور تسکین نہیں پاؤ گے "

" یہ صرف تمہاری زندگی کا ہی سوال نہیں کسی اور کی بھی زندگی کا سوال ہے، حق و باطل کا سوال ہے، انصاف اور ظلم کا سوال ہے۔"

" اپنے دل کا خون نہ کرو۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مارو محبت کی آواز کو سنو۔"

" فرض کی پکار کو مت ٹھکراؤ۔"

فرض اور محبت، محبت اور فرض، اور پھر دونوں کو تولوں میں تو تو میں میں شروع ہو جاتی، ہا تھا پائی ہو جاتی اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو جاتے، کھلم کھلا لڑائی شروع ہو جاتی۔

اور پھر گوتم کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی۔ وہ کراہ اٹھتا۔ وہ دونوں گوتموں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جانے کو کہتا۔

لیکن یہ تو روز کا معمول ہو گیا تھا۔ جب بھی اسے اکیلا پاتے دونوں گوتم آہستہ سے اٹھتے اور کھلے بندوں اس پر زور آزمائی کرنا شروع کر دیتے جو ہمیشہ اسی دھینگا مشتی اور لڑائی پر ختم ہوتی۔

آخر ایک دن تنگ آ کر اس نے پیار کے عامی گوتم کو جو ب ڈانٹا۔ اسے سخت سست کہا اور اپنے دل سے نکل جانے کو کہا۔ وہ چپ چاپ منہ لٹکائے آنکھوں میں آنسو چھپائے نکل گیا۔

اس کے جانے سے گوتم کا دل پریشان ہو گیا، اداس ہو گیا اور گوتم اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کرنے لگا۔ لیکن اب وہ پکا فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر گوتم حق ہوتا اور خود اس کا بیٹا قتل کے جرم میں اس کے سامنے پیش ہوتا تو وہ بلا جھجک اسے پھانسی کی سزا دے دیتا۔ اپنے سگے بھی گوتم نے ایسا ہی کیا۔

اسی شام وہ رتنا کے پاس گیا اور رندھے ہوئے گلے سے اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ " رتنا! میں اگلے مہینے اندرا سے شادی کر رہا ہوں۔"

رتنا کے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ آ گئی جو اندرا کے نام پر ہمیشہ آیا کرتی تھی۔ لیکن آج اس مسکراہٹ میں وہ سب یاس و حزن چھپا ہوا تھا۔ وہ بے بسی اور بے چارگی تھی جو گوتم کے لئے جنم جنم کے ناکام انتظار نے اس کے اندر پیدا کر دی تھی۔ رتنا کی اس مخصوص مسکراہٹ نے اسے عام عورتوں کے زمرے سے الگ کر رکھا تھا۔ وہ بہت اونچائی پر بیٹھی ہوئی ایک دیوی لگ رہی تھی جسے انسانوں کے دنیاوی کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور جو انسان کی دعاؤں اور بد دعاؤں کے جواب میں یکساں طور پر ابدی مسکراہٹ ہی سے جواب دیتی ہے۔ اور پھر جیسے رتنا کے صدیوں کے رُکے ہوئے آنسوؤں کو راستہ مل گیا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بولی:-

" بہت خوشی کی بات ہے۔ ہمیں بھی بلائیے گا۔"

اور جس گوتم کو گوتم نے ابھی ابھی اپنے دل سے مار بھگایا تھا وہ چلاتا، دوڑتا اور اچھلتا ہوا واپس آ گیا اور دل کی چوکھٹ پر کھڑا ہو گیا۔

گوتم نے رندھے ہوئے گلے سے رتنا سے کہا:-

" رتنا اگر اب بھی تم صرف ایک بار ہاں کہہ دو تو میں اندرا کو چھوڑ کر تمہارا ہو سکتا ہوں۔"

رتنا کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں نے اپنے راستے بنا لئے تھے وہ ایک دم چونکی اور ایسے انداز میں بولی۔ جس میں حیرانی کے ساتھ کسی قدر تضحیک آمیز چبھنے کی تلخی بھی شامل تھی

" اندرا بہن کا تم پر حق ہے۔ میں کسی کا حق کیسے چھین سکتی ہوں؟ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں اندرا بہن کو سونپوں گی۔"

رتنا کے انداز میں ایسی قطعیت تھی کہ وہ لڑکا جو گوتم کے دل کی چوکھٹ پر کھڑا تھا، پھڑک کر بھاگ گیا۔ دوسرے لڑکے نے قہقہہ لگایا اور گوتم کے دل کے کواڑ بند کر دئے۔ اب گوتم کے دل پر اس دوسرے لڑکے کا پورا قبضہ تھا۔

شادی کے دن سے دو روز پہلے ایک بار پھر گوتم رتنا سے ملنے آیا۔ یہ دو کنوارے دلوں کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد دونوں کی منزلیں الگ الگ اور راستے الگ تھے۔ جیون کے سفر میں ایسے ساتھیوں کا بچھڑنا جانکاہ ہی تو ہوتا ہے۔ رتنا نے اپنے ہاتھوں سے گوتم کے قدم چھو کر اپنی مانگ بھری اور پھر گوتم کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہا ۔" اندرا بھی کو خوش رکھنا۔"

یہ آخری چوٹ تھی اور گوتم اس کا زور نہ سہہ سکا۔ وہ چکرا گیا۔ کبھی کسی نے اپنا خزانہ ایسے بھی لٹایا ہے ؟ راجپوت عورتیں بھی تو اسی ضبط اور خوشی کے ساتھ اپنے مردوں کو دشمن کی تلوار کی دھار پر ڈھکیلتی تھیں ۔ شاید رتنا پچھلے جنموں میں ہمیشہ راجپوتنی ہی پیدا ہوتی آئی تھی !

گوتم کی شادی میں رتنا نہیں آئی ۔ اور صرف یہی بات تھی جس سے گوتم کو اس کے عورت ہونے کا یقین آیا۔ اگر وہ شادی میں شرکت کر لیتی تو گوتم کو یقین ہو جاتا کہ یا تو رتنا مٹی کا بُت ہے یا سرے سے اسے گوتم سے کوئی لگاؤ ہی نہیں تھا۔ اِدھر خود گوتم کا یہ حال تھا کہ دو سال پہلے جس لڑکی کے ساتھ وہ سہول میرج کے خواب دیکھا کرتا تھا آج اس کے ساتھ منڈپ میں بیٹھے نہ جانے کیوں اس کے دماغ کو طلاق کے خیالات ڈسے جا رہے تھے !

ہندوستان میں شادی ہوتی ہے تو بچے گویا پیدا ہونے کے لئے تڑپ رہے ہوتے ہیں ۔ بس یہی غنیمت ہے کہ لڑکیاں اپنی ویسٹرنیزگی کا خاطر رکھتے ہوئے بچے جہیز میں نہیں لاتیں ۔ ورنہ ادھر شادی اُدھر مجسّمہ ۔ ہر ہندوستانی لڑکی کا حق اور فرض ہے کہ اس کی گود سدا ہری رہے اور وہ اپنے خاوند کو ماؤں سے دھڑا دھڑ مالا مال کرتی رہے ۔ اندرا بھی اس لحاظ سے خالص ہندوستانی لڑکی تھی اور پھر شاید ہر ہندوستانی ماں کی طرح اس کی ماں نے بھی ڈولی میں چڑھتے ہوئے اس کے کان میں پھونک دیا تھا کہ جب تک بچے نہیں ہوتا مرد پوری طرح قابو میں نہیں آتا ۔ جہاں تک بیوی اور خاوند کے رشتے کا اس بات سے تعلق تھا ظاہر ہے اندرا کوئی کسر نہ اُٹھانے والی تھی ۔ مختصر یہ کہ کم سے کم عرصے میں اندرا نے اپنے خاوند کو تین بچوں کا باپ بنا دیا۔

بچوں کے علاوہ اندرا گوتم کو وہ سب کچھ دیتی جس کی توقع بہترین بیویوں سے کی جا سکتی ہے ۔ وہ کام کرنے والی، پیار کرنے والی اور خاوند کی تعزیب خدمت کرنے والی لڑکیوں میں سے تھی ۔ وہ ایسی لڑکیوں میں سے تھی جو صرف شادی کے لئے ہی پیدا ہوتی ہیں ۔ جن کی انفرادیت شادی کے بعد ہی نکھرتی ہے ۔ جن کی شخصیت کا پودا گھر کی چار دیواری میں ہی پنپتا ہے اور بچوں اور خاوند کی بھلائی اور اہتمام جن کے لئے امرت سے کم نہیں ہوتا ۔ دوسرے لفظوں میں اندرا شادی اور گھر بار کے لئے 'ایڈمارک' تھی اور ایسی بیوی کس اجڑے دل کو شاداب نہیں کر سکتی ؟ خاص طور پر جب کہ اس کا کام صرف ماضی کے ساتھ کلی انلاق کا ثبوت دینا ہی ہو۔ اندرا نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی بے لوث خدمت اور پیار کے ذریعے گوتم کو ریشم کے دھاگوں سے جکڑ لیا۔ وہ گوتم کی ازدواجی زندگی میں اضافی ردپ سے آئی تھی ۔ گوتم کو اس بات کا پورا اعتراف تھا اور وہ سچے دل سے، پُرخلوص طریقے سے، اور روحانی وفاداری کے ساتھ اس بات کے لئے کوشاں رہتا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ اندرا کے پیار کا بدل تو دے سکے ۔ لیکن دل آخر دل ہے کوئی میلا کپڑا تو ہے نہیں کہ کبھی اس کھونٹی پر ٹانگا تو کبھی اس پر ۔ اگر جسم کی اپنی کمزوریاں ہیں تو دل اپنی جگہ مجبور ہے ۔ جسم وقتی ضرورتوں سے دب کر سمجھوتہ کر سکتا ہے لیکن دل کا تو اپنا شیوہ ہے ۔ جسم اور دل کی آپس میں کبھی نہیں بنتی اور چوں کہ جسم بڑا ہے اتنگڑا ہے اس لئے ہمیشہ دل پر غالب آ جاتا ہے ۔ بے چارہ دل اسی لئے تو ایک کونے میں سہما ہوا پڑا رہتا ہے ۔ اگر گوتم کا جسم تو اندرا کا غلام ہو چکا تھا لیکن دل میں کبھی کبھی چنگاری سلگ اُٹھتی ۔ جسم تو اندرا کا نام لے کر قسم کھاتا لیکن دل اب بھی رتنا کے لئے آہ بھر لیتا۔

شادی کے بعد رتنا سے وہ کبھی ملا نہیں تھا اور نہ ہی اس سے کبھی خط و کتابت ہوئی تھی ۔ ہاں اس کا دوست ہیرن جب بھی خط لکھتا کچھ نہ کچھ حال رتنا کا بھی لکھ دیتا۔ اسی سے اُسے معلوم ہوا تھا کہ رتنا نے ابھی تک شادی نہیں کی اور اپنے گھر میں وہ تقریباً اکیلی ہی رہتی ہے ۔ گوتم کی زندگی پُرسکون تھی ۔ گھر بار، بال بچے، نوکر چاکر اور موٹر وغیرہ غرضیکہ ہر چیز کی بہتات تھی لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھار اندرا کے ساتھ لطیف ترین لمحات میں بھی اسے کسی نامعلوم سے مقام پر کسی چیز کی بوجھ کے احساس سے گھٹن سی محسوس ہونے لگتی ۔ ایسا بوجھ جسے گوتم کبھی اُتارنا بھول گیا ہو اور جو زہری طرح آہستہ آہستہ اس کے جسم میں

سرایت کرتا جا رہا ہو۔

گوتم بظاہر کلی خاوند اور شفیق باپ تھا۔ اندرا کو بھی اپنے خاوند پر پورا اعتماد تھا اور اس کی پوری محبت حاصل ہونے پر فخر بھی۔ زندگی کی گاڑی آرام سے چل رہی تھی کہ اچانک ایک بھونچال سا لگا۔ ایک دن نئے سال کی شام کو گوتم جب دفتر سے واپس آیا تو اس کے چہرے پر تکان اور افسردگی کے نشان نمایاں تھے۔ گھر آتے ہی وہ بستر پر پڑ گیا اور ہلکے سے بخار اور سردرد کی شکایت کی۔ اندرا نے سوچا شاید زیادہ کام کی وجہ سے تھک گئے ہوں گے اور دوا کھانے سے ٹھیک ہو جائیں گے لیکن رات کو گوتم کے سر دردوں کا بخار چڑھ آیا اور وہ بے ہوشی کی حالت میں بھی کبھی کبھی بڑبڑا بھی رہا۔ دوسری صبح تو لیس یہ حال تھا کہ ڈاکٹروں کا تانتا لگ گیا۔ ڈاکٹروں کی رائے میں زیادہ فکر کی وجہ سے شاید اعصابی حملہ ہو گیا تھا۔ وہاں کا خیال تھا کہ چند دنوں کے مکمل آرام سے ٹھیک ہو جائے گا۔

شام کو گوتم نے اندرا کو اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ سے کنگھی کرتے ہوئے بولا: "اندرا! میں تمہارے پیار کے بدلے میں تمہیں کچھ نہ دے سکا۔" گوتم کے انداز میں ایک کرب انگیز اعتراف تھا اور ایسا اعتراف عام طور پر انسان تبھی کرتا ہے جب وہ اس دنیا سے منہ موڑ رہا ہو۔ اندرا اس اشارے سے گھبرا گئی اور بولی: "ہائے رام یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کے چرنوں میں سبھی کچھ پایا ہے۔" گوتم نے ایک بھرپور تاسف کی اور ایسی نظروں سے اندرا کی طرف دیکھا جس میں ازلی اداسی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے بولنے کے لئے خاص ہمت سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ اندرا یہ دیکھ کر کانپ اٹھی اور پھر گوتم نے بلندی سے اترتے ہوئے پنچھی کی طرح اندرا کو زور سے تھام لیا اور مدھم سی چیخ کے ساتھ بولا:۔

"میں چلا۔ اندرا مجھے معاف کر دو میں چلا۔"

اور اندرا کے جواب کا انتظار کئے بغیر گوتم چل گیا۔ اندرا رو نہ سکی، چیخ نہ سکی۔ بس پھٹے پھٹے دیدوں سے اس اندھیرے کو چیر کر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی جو اس کے گرد دھوئیں کی طرح بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس لئے اچانک اس جوانی میں ہندوستانی عورت کا دوہرا پن اپنے پورے بوجھ کے ساتھ اندرا پر آن گرا!

اس بات کو چھ مہینے گزر گئے لیکن اندرا ابھی تک یہ ماننے سے برابر انکار کئے جا رہی تھی کہ گوتم مر چکا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ بار ہا گوتم ایسے ہی دورے پر جایا کرتا تھا اور جاتے ہوئے کہتا "اچھا میں چلا" اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ شاید کچھ دیر لگ گئی ہو لیکن وہ آئیں گے ضرور۔ اس نے گوتم کی کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں کی۔ سہمے ہوئے بچے اگر کسی چیز کو ہاتھ لگانے لگتے تو انہیں ڈانٹتی "مت چھیڑو ان کی چیزیں۔ وہ آئیں گے تو غصہ کریں گے۔" اور معصوم بچے سوچتے کہ جیتے جی جس باپ نے کبھی غصہ نہ کیا ہو وہ موت کے بعد غصہ کیوں کرنے لگا۔ یتیم بچوں کو بھی ماں کی ویرانگی اور بے کسی پر ترس آنے لگا تھا۔ جب کھانا میز پر لگایا جاتا تو گوتم کی پلیٹ بھی لگتی اور اندرا گوتم کے انتظار میں نہ جانے کس سوچ میں کھوئی رہتی۔ پھر جب سب کھا کر اٹھ جاتے تو اندرا بھی بھوک اور غم سے نڈھال ایک دو نوالے منہ میں ڈال کر اٹھ بیٹھتی۔ اس طرح پہاڑ سا دن رات ہو جاتا اور رات کے اندھیرے پھر سحر کے اجالوں میں تحلیل ہو جاتے۔ اگر اندرا کی زندگی ویران اور اس کے دن افسردہ تھے تو کیا ہوا۔ نظام شام و سحر تو ایک افسردہ روح کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔ اگر ایک طاق ویران بھی ہو تو بزم چراغاں پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اندرا اپنے غم میں اکیلی، بالکل اکیلی تھی۔ اس کی زندگی جھوٹے انتظار کی ایک طویل شام تھی۔

ایک دن موسم بدلنے پر اندرا نے گوتم کے کپڑوں کو دھوپ دینے کے لئے نکالا۔ سب سے پہلے جو سوٹ اٹھایا وہ وہی تھا جو گوتم نے آخری دن پہنا ہوا تھا۔ اسے اٹھایا اور جیبیں ٹٹولیں تو اندر کی جیب میں اسے دو خط گوتم کے نام لکھے ہوئے ملے۔ اس نے ایک خط اٹھایا، یہ نئے سال سے کچھ ہی دن پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ لفافہ سادہ تھا۔ لکھا تھا۔

"گوتم! آج تک میں نے تمہیں خط نہیں لکھا اور یہ

شاید میرا آخری خط ہو۔ تم سے ملنے سے بہت پہلے میں نے اپنی شادی کا ایک سپنا دیکھا تھا اور جب اچانک اس پارٹی میں تم سے ملاقات ہوئی تو میں نے سوچا میرا سپنا پورا ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے تمہیں ہمیشہ اور ہر روپ میں چاہا ۔ اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے یہ خیال نہ آیا کہ زندگی میں تم مجھ سے کبھی جدا بھی ہو گے۔

لیکن جب تم نے بتایا کہ تم اندرا کی جائیداد بن چکے ہو تو میں نے ایک دم اپنی ہار مان لی۔ میں نے خود تمہیں اندرا کو سونپا ہے کیونکہ ہم دونوں سمجھتے تھے کہ اندرا کا تم پر حق ہے لیکن میں نہ جانتی تھی کہ میں اتنی بڑی قربانی کے قابل نہ تھی۔ میں تمہارے پیار کی آگ میں سلگ سلگ کر ختم ہو چکی ہوں اور اب تو یہی چاہتی ہوں کہ زندگی کا بوجھ اتار کر پھینک دوں۔ میں نے تمہیں پانے کے لئے بہت تپسیا کی ہے اور میں صدیوں تک تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔ لیکن دیکھنا اگلے جنم میں تم اتنی جلدی نہ کرنا۔

اندرا کو خوش رکھنا اس سے مجھے راحت ہو گی۔

رتنا "

اندرا بولتا گیا۔ جھپٹ کر اس نے دوسرا خط کھولا۔ یہ پہلے خط کے دو دن بعد کا لکھا ہوا تھا۔ یہ ہریش کا خط تھا۔ ہریش کے ہاتھ کا خط وہ پہچانتی تھی۔ خط میں لکھا تھا ۔

" رتنا کو زندگی کے اذیت ناک بخار سے نجات مل گئی۔ کل رات وہ ایسی سوئی کہ پھر نہ اٹھی۔ "

اندرا نے دونوں خطوں کو دوبارہ پڑھا۔ تاریخوں کو پھر سے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے دونوں پرزے گر گئے اور اسے کہیں دور سے گوتم کی آخری التجا سنائی دی " اندرا میں چلا ۔ مجھے معاف کر دو ۔ میں چلا ۔"

اندرا نے مڑ کر دیکھا تو گوتم سامنے تھا۔ ایک فریادی کی طرح بلتی نگاہوں سے اندرا کو دیکھ رہا تھا۔ اندرا گوتم سے چمٹ گئی اور کہا " میں نے تمہیں معاف کیا۔

اور پھر رکے ہوئے سیلاب امڈ آئے اور گوتم کی موت کے بعد آج پہلی بار اندرا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اب جانتی تھی ۔ گوتم اب کبھی نہیں آئے گا۔


# انڈین نیشنل بلیوگرافی

## انڈین نیشنل بلیوگرافی حالیہ ہندوستانی مطبوعات کا مستند ریکارڈ ہے

تاریخ میں پہلی بار انگریزی اور دیگر مندرجہ ذیل زبانوں کی عام مطبوعات کا صحیح اور مفصل ریکارڈ اب رومن رسم الخط میں دستیاب ہے ۔

آسامی، بنگالی، گجراتی، کنڑ، ملیالم، ہندی، مراٹھی، اڑیہ، پنجابی، سنسکرت، تامل، تیلگو اور اردو

پنجاب ریپلاونڈس کے عرصے میں سرکار نے متعدد اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں اقتصادیات، سیاسیات اور عمرانیات کے طلباء کے لئے بنیادی مواد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تمام کتابیں بھی اس بلیوگرافی میں شامل ہیں۔

مسائل :۔ ڈی ٹائی کوارٹو سائز ۸" × ۱۰" ۔ چھپا ہوا حصہ ۶" × ۹" / ۶۸

اشاعت :۔ چار سہ ماہی شمارے اور ایک کیلنڈر سال پر مشتمل سالانہ نمبر

قیمت :۔ سالانہ نمبر/۵۰ روپے فی جلد محصول ڈاک الگ ۔

سہ ماہی شمارہ ۱۰ روپے ۵۰ نئے پیسے ۔ محصول ڈاک الگ

رعایت :۔ ایک سہ ماہی شمارے کی کم سے کم چھ جلدیں اور سالانہ نمبر کی تین جلدیں بیک وقت خریدنے پر ۱۵ فی صدی رعایت دی جائے گی۔

دستیابی :۔ پہلا شمارہ اکتوبر۔دسمبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا پچھلے تمام شمارے چندے کی رقم ادا کر کے حاصل کئے جا سکتے ہیں ۔

ملنے کا پتہ

گورنمنٹ آف انڈیا سنٹرل ریفرنس لائبریری

معرفت نیشنل لائبریری بل دے ڈر کلکتہ ۲۷

ہنس راج رہبر

# تربیت

دونوں بچے سامنے گلی میں کھیل رہے تھے اور بل کھڑکی میں کھڑا انھیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں خاص طور پر اپنے بیٹے رپّو پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کی ہر ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہوائی جہاز کی گونج سنائی دی۔ دونوں بچے چونکے اور گیند چھوڑ کر اوپر کی طرف دیکھنے لگے۔

"دائی جاج! دائی جاج!" تتّی چلّایا اور اپنی جگہ پر ایک ٹانگ کے بل اُچھلنے لگا۔

"دو! دو!" رپّو نے کہا اور بغیر ہلے معصوم اشتیاق سے آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

"شاباش!" بل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اسے اپنے بیٹے پر فخر محسوس ہوا کیوں کہ اس نے مہذّب باپ کے مہذّب بچے کی طرح اپنے جذبات کو قابو میں رکھا تھا اور تتّی کی طرح بے تحاشا اُچھلنا شروع نہیں کر دیا تھا۔ تتّی ابتدائی دور کے وحشی انسان کا اور رپّو بیسویں صدی کے شائستہ انسان کا نمونہ تھا۔ دونوں کی حرکتوں سے تہذیب کے ارتقا کا فرق نمایاں تھا۔

باپ کا دل خوشی اور مسرّت سے ناچ اُٹھا۔

ہوائی جہاز دور نکل گئے، رفتہ رفتہ آواز مدھم ہوتی گئی۔ بالآخر سنائی دینا بند ہو گئی۔ بچے پھر گیند کی طرف متوجہ ہوئے۔

"یہ میلی ہے۔ بیلے ڈیڈی لائے تھے۔" رپّو نے گردن ٹیڑھی کر کے شان سے کہا

"لاؤ پھینکو، دونوں کھیلیں گے۔" تتّی نے بات بنائی اور گیند کا کھیل پھر شروع ہو گیا۔

گیند جب رپّو کے پاس آ جاتی تو وہ اسے پھینکنے میں تامل کرتا، ہاتھ میں تھامے نشانہ سادھتا رہتا اور تتّی کھڑا اس کا منہ تاکا کرتا۔ ایک بار اس نے دیر اور بھی زیادہ کر دی جو تتّی کو ناگوار گذری۔ چنانچہ جب گیند اس کے پاس آئی تو وہ اسے رپّو کی طرف پھینکنے کی بجائے آپ ہی آپ اُچھالنے اور کھیلنے لگا۔ رپّو نے لینے کی کوشش کی تو اس نے تڑا تڑ تڑا تڑ دو تین ہاتھ مارے اور رپّو روتا چلاتا ہوا گھر کی طرف دوڑا۔

بل نے یہ منظر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ غصّے سے تلملا اُٹھا۔ رپّو کو وہ نئے نئے کھلونے اس لئے لا کر دیتا تھا کہ وہ دوسرے بچّوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے فرحت محسوس کرے۔ اس میں احساسِ برتری پیدا ہو اور اس میں حسن اور ایثار کا جذبہ پرورش پائے۔ لیکن جب اسے تتّی کے ہاتھ سے پٹتے دیکھا تو بل کو بے حد رنج ہوا۔ جی میں آئی کہ تتّی کو پکڑ کر گردن سے پکڑے اور پھر رپّو سے کہے ــــ "مار بیٹا تو بھی مار"

لیکن دوسرے ہی لمحہ خیال آیا کہ بچّوں کی لڑائی میں کود نا مناسب نہیں ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ شرافت کی جو ساکھ برسوں میں قائم کی ہے دیکھتے ہی دیکھتے مٹّی میں مل جائے گی۔ گلی کوچے کے سب لوگ اسی کو بُرا کہیں گے۔ بچّے کا قصور کون دیکھے گا۔

اس نے ایک سمجھ دار آدمی کی طرح غصّہ ضبط کیا۔ آہستہ سے باہر نکلا اور تتّی سے کچھ کہنے کی بجائے اپنے بچّے کو پچکارتا ہوا اندر

لے گئیں۔

پپو بے تحاشا رو رہا تھا اور دونوں ہاتھوں چلا رہا تھا جیسے بیک وقت ہزاروں بھڑوں نے کاٹ کھایا ہو۔

بچے کا رونا سن کر ماں بھی ہاتھ کا کام چھوڑ کر رسوئی سے دوڑی ہوئی آئی اور پپو کو گود میں بٹھا کر اس کے گال سہلاتے ہوئے بولی۔

"ہے ہے کیسے ظالم بچے ہیں۔ دیکھو تو سہی انگلیوں کے نشان صاف ابھر آئے ہیں۔"

"میں کیا کروں تمھاری اولاد ہی ایسی ہے۔" بمل نے گھٹی گھٹی تلخی کا اظہار کیا اور ذرا توقف کے بعد پھر کہا۔ "یہ عمر میں تمّی سے ڈیڑھ دو سال بڑا ہے۔"

"ایک تمّی کیا، سبھی سے پٹ جاتا ہے۔ اس سے کچھ بنتا ہی نہیں" ماں نے روہانسو ہو کر کہا اور بچے کو چھاتی سے لگا لیا۔

"میں تو اور آگے کی سوچتا ہوں۔" بمل نے سرکی خفیف سی حرکت کے ساتھ فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اگر یہی حالت رہی تو وہ ساری عمر پٹتا ہی رہے گا۔"

"تم کبھی آگے کی سوچتے ہو اور کبھی پیچھے کی۔ پر یہ نہیں دیکھتے کہ محلے کے دوسرے بچے بچھاڑ ہی سے خونخوار ہیں۔ وہ موئے تو پیدا ہوتے ہی لڑنا سیکھ لیتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں بھی اسے لڑنا سکھاؤں۔"

"تم کیوں سکھاؤ گے بتر افت کو لاج نہیں لگ جائے گی۔" بیوی نے کہا اور سکے ہوئے بچے کو ساتھ لے کر رسوئی میں چلی گئی۔

بمل آہستہ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بظاہر ساکن اور خاموش تھا لیکن اس کے اندر لاوا کھول رہا تھا۔ بچے کے پٹنے کا منظر اب بھی نظروں کے سامنے تھا۔ بیوی کے الفاظ "محلے کے بچے بچھاڑ ہی سے خونخوار ہیں ....." اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ میں ایک باپ کے ناتے کبھی اپنے فرض سے کوتاہی تو نہیں کر رہا۔ چڑیا اپنے بچے کو چُگنا لینا اور شاہیں شکار پر جھپٹنا سکھاتا ہے۔ اور میں ..... میں ..... کم از کم اسے اپنی حفاظت کرنا تو سکھا دوں۔

یہ خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا لیکن وہ شعور کو اس کے مطابق نہیں بنا سکا اور اضطراب کی حالت میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"ہاں! اگر اس ماحول میں رہنا ہے تو اسے لڑنا بھی سیکھنا ہوگا۔" اس نے مٹھی تان کر ہوا میں لہرائی اور اپنے ارادے کا آواز بلند اعلان کیا۔

چنانچہ اس نے پپو کو پیٹ کر بھاگنے کی بجائے آگے بڑھ کر حملہ کرنے کے گُر سکھانا شروع کئے۔

"دیکھو بیٹا! اگر یوں انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر دو ہتڑ مارا جائے تو سامنے والا بچہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑتا ہے۔"

پہلے پہل بچے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ حیرت سے یہ تماشا دیکھتا اور باپ کے مصنوعی دو ہتڑ سے بستر پر گر کر منہ بسورتا رہا۔ مگر سات آٹھ دن کے بعد اس نے انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر دو ہتڑ بنانا سیکھ لیا اور جب اس کی چوٹ سے باپ واقعی اوندھے منہ چارپائی پر گر ٹھک گیا اور ٹوپی سر سے اُتر کر زمین پر جا گری تو پپو کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اسے اس کھیل میں واقعی مزا آیا۔ "دیکھا یوں گرجاتا ہے۔" بمل نے اپنی ٹوپی دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "جب تمّی یا کوئی دوسرا بچہ تمھیں مارے یا تمھاری چیز چھینے تو ڈرنا نہیں، بھاگنا نہیں۔ اسے یوں ہی مارنا۔ لو پھر ڈالو انگلیوں میں انگلیاں اور یوں ....."

وہ بچے سے چپت کھاتا اور جان بوجھ کر چارپائی یا صوفے پر گر پڑتا۔

جب یہ سلسلہ پندرہ بیس روز تک جاری رہا تو پپو دو ہتڑ بنانے اور ضرب لگانے میں مشاق ہو گیا اور اس کھیل سے اس کی دلچسپی یہاں تک بڑھ گئی کہ جب دیکھو انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے اور دو ہتڑ بنائے گھوم رہا ہے۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ماں، بہن، باپ جو بھی نظر آئے اس پر وار کر کے بڑی شان سے کہتا:

"دیکھو ڈیڈی یوں ....."

بمل بچے کو ہنستے اور مسکراتے دیکھ کر خوش ہوتا اور من ہی من میں سوچتا۔ "اب اس کا مستقبل محفوظ ہے۔"

انھیں دنوں اس کا دوست سریش اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ جالندھر سے آیا۔ انھیں پانچ سات دن دہلی میں رہنا تھا۔ بمل نے خط

میں کہہ دیا تھا کہ اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ٹھہرنا۔ میں اور میری بیوی آپ کی آمد کے منتظر رہیں گے۔ چنانچہ سرلیش اس کی بیوی اور ان کا بچہ اب بل کے مہمان تھے۔

دوسرے دن رپو اپنے مہمان ساتھی جتندی کو ساتھ لے کر کھیلنے نکلا وہ اس کا ہم عمر تھا اور جسم میں بھی کوئی زیادہ مضبوط نہیں تھا۔

"کہیں دور نہیں جانا، ادھر ہی کھیلنا۔" بل نے رپو سے کہا۔

"ڈیڈی ہم گلی میں کھیلیں گے۔" رپو نے جواب دیا اور بھجو کی کنڈے پر ہاتھ رکھ کر اسے بڑے چاؤ سے اپنے ساتھ لے گیا۔

"دیکھو جی، ہم عمروں میں قدرتی طور پر بچے کتنی جلدی ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں" بل نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہما سے کہا۔

سرلیش نے بھی کچھ کہنا ضروری سمجھا اور بات جب ایک بار چل پڑی تو بچوں کی نفسیات سے لے کر دہلی کے ماحول تک جا پہنچی۔

"کوئی بچہ رو رہا ہے۔" وہ چونکے

"جتندی کی آواز ہے۔" ماں نے تشویش کا اظہار کیا۔

پیشتر اس کے کہ کوئی اٹھ کر باہر جائے۔ جتندی روتا چلاتا اندر آیا

"کیوں کیوں، کیا ہوا؟" سرلیش نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔

"شاید گر پڑا ہے۔" بل نے ہمدردی جتائی۔

"کیوں بیٹا گر پڑے تھے؟" ماں نے پوچھا۔ مگر جتندی نے کچھ نہیں بتایا سسکیوں کے مارے اس کی زبان بند تھی۔

پیچھے پیچھے رپو بھی گیند اٹھا کر لے اندر آیا۔ وہ خوش تھا اور فاتحانہ ڈھنگ سے مسکرا رہا تھا۔

"کیوں رپو، جتندی گر پڑا ہے یا کسی نے مارا ہے؟"

"دیکھو ڈیڈی، اس نے گیند چھین لی اور میں نے یوں...."

وہ انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر دو ہتڑ کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا کہ بل نے اسے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔ "نہ بیٹا! اچھے بچے ایسے نہیں پیار سے کھیلتے ہیں، لڑا نہیں کرتے۔"

"ڈیڈی ام بھی کھیل رہے تھے۔ میں نے یوں...."

بچہ پھر اپنے کرتب کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا لیکن بل نے پھر اسے روک دیا اور کہا "جاؤ الماری سے اپنے کھلونے لے آؤ اور ان سے کھیلو۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ مہمان گھومنے چلے گئے اور بچے کو بھی بنا سنوار کر اپنے ساتھ لے گئے اور رات گئے سو گئے۔

صبح پھر دونوں بچے آپس میں ہل مل گئے اور کھیلتے کھیلتے باہر چلے گئے۔ جتندی تھوڑی ہی دیر میں پھر روتا چلاتا لوٹ آیا۔ اس مرتبہ حالت پہلے سے بھی خراب تھی۔ اس کا منہ اور کپڑے مٹی سے لت پت تھے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

ماں کو بڑا دکھ ہوا اور وہ اس کی ناک پونچھتے ہوئے بولی: "کیسے ظالم بچے ہیں، کس بری طرح سے مارا ہے۔"

"بہن، کیا کیا جائے۔" بل کی بیوی نے صفائی پیش کی — "محلے کے بچے سبھاؤ سی سے خونخوار ہیں۔ ہمارا فوا اس لڑائی کے مارے ناک میں دم ہے۔ پر کیا کریں مکان چھوڑ کر کہیں جایا بھی تو نہیں جاتا۔"

رپو بڑی شان سے اندر آیا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور اس نے بغیر کچھ پوچھے ہی بتانا شروع کیا۔

"ڈیڈی ام کھیل رہے تھے۔ میں نے یوں...."

"چپ چپ، گندا کہیں کا۔" بل نے اسے ڈانٹا۔

"کیا کریں ماحول ہی خراب ہے۔ لاکھ سمجھاتے پر بھی گندے بچوں سے گندی عادتیں سیکھ رہا ہے۔ لڑنا ان کے نزدیک کھیل ہے۔"

بل نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا اور مہمان بچے کے کپڑوں سے دھول جھاڑنے لگا۔

اندرجیت لال

# ایٹمی توانائی

انسانی زندگی میں انرجی (توانائی) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر زندگی کی کوئی کارروائی، حرکت یا عمل کی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بغیر ہمارے سب منصوبے بے کار ہو جاتے ہیں۔ خود انسان نہ تو توانائی پیدا کر سکتا ہے اور نہ اسے ختم کر سکتا ہے۔ ہاں اسے یہ ضرور اختیار ہے کہ اپنے شعور کے بھروسے پر اور اپنی ضرورت کے مطابق قدرت کی دی ہوئی توانائی کو استعمال کرے۔ یہ توانائی قدرت نے مختلف صورتوں میں ودیعت کر رکھی ہے جس سے ہم روزانہ کام لیتے ہیں۔ ایسی توانائی ہم حرارت، روشنی، بجلی اور آواز سے حاصل کرتے ہیں۔ حرارت براہ راست سورج سے اور کبھی چیز کو جلانے سے ملتی ہے۔ روشنی کا منبع سورج اور چاند ہیں۔ بجلی ہم Dynmo وغیرہ سے پیدا کرتے ہیں کوئی بار ہم ضرورت کے مطابق حرارت کو بجلی یا روشنی میں بھی تبدیل کر لیتے ہیں بس سے ظاہر ہے کہ قدرت کی دی ہوئی قوت کے علاوہ ہم مادوں سے بھی توانائی حاصل کر لیتے ہیں اور مادوں سے حاصل کی ہوئی توانائی ایک لحاظ سے مٹیسی سی ہوتی ہے۔ آج کے بلند پایہ سائنس دان آئنسٹائن نے مادہ اور انرجی کو ایک ہی تصور کرنے پر زور دیا ہے۔ دراصل مادہ اور انرجی دو الگ الگ مقداریا اجزا نہیں ہیں۔ ایک مخصوص مادہ سے مخصوص درجہ کی توانائی پیدا کی جا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں توانائی پیدا کرنے کے عمل کو یوں کہنا چاہیئے کہ مادہ کو توانائی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

چناں چہ انسان نے ہر ممکن طریقے سے اس انرجی (توانائی) سے پورا پورا فائدہ حاصل کیا ہے۔ کارخانے، ملیں، کلیں، مشینیں، کاریں، لاریاں، ہوائی جہاز، سمندری جہاز۔ اگر پیچھے پر چھیئے تو آج کے مشینی دور میں زندگی کی ساری حرکت توانائی کے دم قدم سے ہے۔ لیکن اتنی عظیم طاقت کو استعمال کرتے ہوئے بھی انسان نے آخر کار یہ محسوس کیا کہ یہ طاقت اس طاقت سے بہت کم ہے جس کی آج کے انسان کو ضرورت ہے۔ چناں چہ انسان نے اپنی تحقیق اور محنت سے زمین، ہوا، پانی، سوکھ کوئلہ اور تیل سے کم سے کم محنت کر کے اور ارزاں سے ارزاں طریقوں سے مزید توانائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود انسان نے محسوس کیا کہ ایک خاص حد سے آگے انرجی حاصل نہ ہو سکے گی۔ چناں چہ سائنس دانوں کے سالوں کے تجربے کے بعد ایک نئی طرز کی توانائی ظہور میں آئی جسے ایٹمی توانائی (اٹامک انرجی) کہا جاتا ہے۔

اس توانائی کے ظہور میں آنے سے پہلے سائنس دانوں کا یہ ایمان تھا کہ نظام قدرت میں زیادہ تر توانائی کا منبع صرف سورج ہی ہے۔ اس کی شعاعوں سے روشنی اور حرارت ملتی ہے۔ سورج کی کچھ حرارت پھل پودوں کی نشوونما میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ کچھ زمین کو گرم کرنے سمندر کے پانی اور ہوا کو حرارت دینے اور کچھ فضا کے ذرات کو گرم کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ چناں چہ سورج کی حرارت اور روشنی سے زیادہ سے زیادہ انرجی حاصل کرنے کے علاوہ جو کاوش ایٹمی توانائی

پیدا کر نے میں لگائی گئی اس کا سہرا ان سائنس دانوں کے سر جنھوں نے اس انرجی کو لوگوں سے روشناس کرایا۔ اس انرجی کو سائنسی اصطلاح میں Nuclear انرجی کہتے ہیں۔

نیوکلیر انرجی یا ایٹمی طاقت کا انکشاف ایک حسین اتفاق ہے۔ ۱۸۹۶ء میں ایک سائنس دان ہنری بکرل نے ایک دن یورینم کا ایک ٹکڑہ اپنی میز کے خانے میں رکھ دیا۔ میز کے اس خانے میں ایک بکس کے اندر فوٹو گرافی کی کچھ پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ جب وہ پلیٹیں باہر نکالی گئیں تو معلوم ہوا کہ وہ کالی پڑ چکی ہیں۔ سائنس دان کو پہلی بار معلوم ہوا کہ یورینم دھات سے ایسی شعاعیں نکلتی ہیں جو بکس کے اندر سے گزر کر فوٹو گرافی کی پلیٹوں کو سیاہ کر سکتی ہیں۔ دھاتوں سے شعاعیں نکلنے کے اس عمل کو تاب کاری یعنی Radio-Activity کا نام دیا گیا۔ اس کے بعد مادیہ جیر کے سائنس دانوں نے تاب کاری اور ایٹمی طاقت کی ماہیت کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے اور اسے انسانی زندگی میں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے لئے تجربے کئے۔

سائنس دانوں نے کیمیائی نقطۂ نگاہ سے دنیا کی سب مادّی چیزوں کو عناصر (Elements) میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جب سے دنیا معرضِ وجود میں آئی ہے تب سے یہ طاقت اس میں ودیعت ہے۔ ان مادّوں میں کئی قسم کی دھاتیں شامل ہیں۔ ہر دھات کی کیمیائی خصوصیت دوسری دھات سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ پھر بھی ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یورینیم، تانبہ، المونیم، کاربن، آکسیجن اور نائٹروجن سے کس قدر طاقت حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ ان میں اتنی وافر انرجی ہے یا نہیں جسے نیوکلیر طریقوں سے استعمال میں لایا جا سکے۔ چنانچہ یورینم، پلاٹینم تھیوریم میں ایسی دھاتیں ہیں جن سے ایٹمی طاقت حاصل کی گئی ہے۔ مزید برآں یہ ہے کہ ان تین دھاتوں سے طاقت حاصل کرنے میں نہ تو کسی کیمیائی عمل کی ضرورت ہے نہ آکسیجن کی اور نہ آگ کی۔ یہ طاقت یورینم کو بکھیرنے سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس عمل میں یورینم کو ننھے ننھے ذرات میں بکھیر دیا جاتا ہے۔ اور ان ذرات کو ہم ایٹم کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایٹم یورینم کا وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے جو بذات خود قائم رہ سکتا ہے۔ یہ ایٹمی ذرات اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ایک پن کی نوک میں لاکھوں ایٹم سما سکتے ہیں۔ یہ ذرات تاب کاری کی خاصیت رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یورینم کو جب ایٹم میں تبدیل کیا جاتا ہے تو کافی طاقت اس عمل میں صرف ہو جاتی ہے۔ اس طرح کچھ طاقت تابکاری کی صورت میں ضائع ہو جاتی ہے۔ پھر بھی ایک عظیم طاقت بچ جاتی ہے جسے ہم ایٹمی توانائی کا نام دے کر اپنے کام میں لا سکتے ہیں۔ سائنس دانوں کا ایمان ہے کہ ایک پونڈ یورینم کو بکھیرنے سے تقریباً ایک کروڑ کلو ہارس پاور (قوت) حاصل کی جا سکتی ہے۔

نیوکلیر طریقے سے یورینم سے جو طاقت حاصل کی جاتی ہے وہ یا تو عمومِ حرارت کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ چناں چہ جتنی تیزی اور شدت سے یہ انرجی خارج ہوگی اتنی تیزی اور شدت سے دھماکہ بھی پیدا ہوگا۔ یہی حالت ایٹمی بموں کی ہے۔ جن کے دھماکے اور تباہی کا اثر سینکڑوں بموں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو انرجی اس عمل سے پیدا کی جائے اس پر کنٹرول بھی رکھا جا سکے۔ دوسرے یہ بھی اختیار میں ہونا چاہیئے کہ ہم جب چاہیں اس کے ردِّ عمل کو روک سکیں۔ اس ردِّ عمل کو روکنے میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مادہ اندازے سے پہلے ہی دھماکے کی صورت اختیار کر لے۔ اس مقصد کے لئے یورپ و امریکہ کے ملک میں سائنس دانوں نے تجربات کئے۔ تاکہ اپنے اپنے ملک میں ایٹمی بھٹیاں تعمیر کی جائیں جن سے ہر ملک اپنے اپنے طور پر زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکے۔

اگرچہ ایٹمی طاقت باعثِ رحمت ہے تو دوسری طرف باعثِ زحمت بھی ہے کیونکہ اسے آئے دن ایٹمی بموں کے دھماکوں کے تجربات میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انسانی زندگی کے بقاء اور ترقی کے لئے اس قوت کو تعمیری کاموں میں صرف کیا جائے اور تباہ کن ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے بجائے ایٹمی قوت کو انسانی خدمت میں صرف کیا جائے۔ سائنس دان اسے علاج، صحت، کھیتی باڑی آمدورفت وغیرہ کے شعبوں میں استعمال کرنے کے وسیلے اور امکانات تلاش کر رہے ہیں اور اب تک اس میدان میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے بعض ایسی عملی دشواریاں بھی ہیں جن کی وجہ سے ایٹمی طاقت کا استعمال کچھ

ناگزیر سا ہو گیا ہے۔ دنیا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اسی لحاظ سے انسانی ضروریات کا بھی پورا کرنا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کے صنعتی دور میں وہ ضروریات محض صنعت سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ کارخانوں کو چلانے کے لئے کوئلہ، مٹی کا تیل اور پٹرول درکار ہے، اور یہ سب اشیاء قدرتی ہیں۔ ہم انھیں مصنوعی عمل سے بڑھا نہیں سکتے۔ چنانچہ ایٹمی طاقت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ آج کل برطانیہ، کینیڈا، امریکہ اور روس میں بڑے پیمانے پر ایٹمی بجلیاں تعمیر کی جا رہی ہیں جن کے سامنے ایٹمی طاقت کو کاروباری مقاصد اور صنعتی ترقی کے لئے استعمال کرنے کے بڑے بڑے منصوبے بھی ہیں اور عملی طور پر اس میں بڑی کامیابی بھی ہوئی ہے۔

سائنس دانوں نے چھوٹے پیمانے کے تجربات سے اور بھاری صنعتی بھٹیوں کے استعمال سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایٹمی طاقت کو نا گوں طریقوں سے ہماری ترقی اور خوشحالی کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ یورینیم، تھوریم اور ریڈیم سے ایک خاص قسم کی شعاعیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ان شعاعوں کو الفا، بیٹا اور گاما شعاعوں کا نام دیا گیا۔ گاما شعاعوں کی بدولت بیجوں میں نشوونما کی طاقت کو بڑی حد تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے ایسی شعاعوں سے ذرا عمدہ ترقی دینے کا ایک مرکز نئی دہلی کے پوسا انسٹی ٹیوٹ میں پچھلے دنوں سے کھل گیا ہے جہاں ان شعاعوں سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے تجربات کئے جا رہے ہیں۔

شعاع کاری بذات خود طب میں بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہے اگر شعاع کاری کے یہ تجربے کامیاب ہوتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب کینسر جیسی لاعلاج مرض کا بھی علاج اسی کے ذریعے سے کیا جائے گا۔ اسی طرح Bio-Chemistry فاسفورس اور آئیوڈائین کے ریڈیو آئسوٹوپ آج کل ڈاکٹری علاج میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ خون کی گردش کی رفتار بھی اس کی بدولت جانچی جا سکتی ہے۔ ہڈیوں کی کئی قسم کی بیماریوں کے لئے آج کل ریڈیو آئسوٹوپ کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ ریڈیو فاسفورس کی بدولت بچوں، کوڑھوں میں جو کیمیائی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ بھی جانچی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان میں بھی ایٹمی طاقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے وسیع منصوبے بنائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صنعتی ترقی کے لیے کوئی ترقی بھی معنوں میں ترقی نہیں کہلا سکتی۔ یہیں خصوصاً بجلی کی بڑی ضرورت ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ہماری بجلی کا خرچ صرف ستر ہ لاکھ کلوواٹ تھا۔ ہماری آبادی اور صنعتی کام بڑھ جانے اور تین پانچ سالہ منصوبوں کے چلنے سے ہماری کھپت ستاون لاکھ کلوواٹ ہو گئی ہے جبکہ ہم اب تک صرف دس فی صدی گاؤں میں بھی بجلی پہنچانے کے دعویدار نہیں ہو سکے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں لاکھوں کلوواٹ مزید بجلی کی ضرورت ہے۔ دیسے بھی پانی اور کوئلہ سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے اور آج بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں کئی دشواریاں اور مجبوریاں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پانی سے زیادہ سے زیادہ چار سو تیس لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بجلی ہماری ضرورت سے بہت کم ہے۔ یہی حال کوئلہ سے بجلی تیار کرنے کا ہے۔ کوئلہ ایک محدود وسیلہ ہے جسے مطلوبہ حد تک نہیں حاصل کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں دوسرے پنجسالہ پلان کے مطابق پانچ سو چالیس لاکھ ٹن سالانہ کوئلہ دستیاب کرنے کا منصوبہ کامیاب رہا اور امید ہے کہ ۱۹۶۰ء تک کوئلے کی پیداوار چار ہزار لاکھ ٹن سالانہ تک پہنچ جائے گی۔ لیکن بجلی پیدا کرنے کے علاوہ کوئلہ اور بہت سے کاموں میں استعمال ہوتا ہے، ان میں گھریلو، تجارتی اور صنعتی ضرورتیں شامل ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ بجلی کے لئے صرف دس سے پندرہ فی صدی کوئلہ صرف کیا جا سکتا ہے اور باقی ماندہ دو تہائی کاموں میں صرف کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دیگر ضروریات کو بالائے طاق نہیں رکھا جا سکتا۔

چنانچہ ایٹمی توانائی کمیشن اور مشہور سائنس دان ڈاکٹر بھابھا کی رہنمائی میں ہمارے ملک میں ایٹمی طاقت کے وسیلوں کو بڑھانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ہندوستان نے تارا پور میں ایٹمی توانائی کا ایک مرکز کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں ۵۱ کروڑ روپے کی لاگت سے یہ مرکز تعمیر کیا جائے گا۔ اور اس میں ستر ہ روپے فی کلوواٹ کے خرچ سے بجلی تیار کی جائے گی۔ اس مرکز میں یورینیم دھات کے استعمال سے بجلی تیار

کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایٹمی بھٹی ایک زرخیز ضریع کرنے پر کامیاب ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ تھوریم دھات ہندوستان میں یورنیم کے مقابلے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ لیکن تھوریم کو دوسری ایٹمی بھٹی کے لئے محفوظ رکھا جا رہا ہے اور جوں جوں یہ بھٹیاں کامیاب ہوں گی تھوریم کی تلاش کے منصوبے پر تیزی سے عمل درآمد کرنا ہوگا تاکہ یہ دھات ہماری تعمیر و ترقی میں معاون بن سکے۔ ایک ایٹمی بجلی گھر ہندوستان اور کینیڈا کے اشتراک عمل سے بن کر تیار ہو رہا ہے دوسرا ایٹمی بجلی گھر زیر تعمیر ہے۔

اگر ایٹمی طاقت وسیع پیمانے پر ہندوستان اور دوسرے ممالک میں استعمال کرنے کے منصوبے کامیاب ہوتے ہیں تو وہ دن دور نہیں جب ذرات میں چھپی ہوئی یہ بے پناہ اور عظیم طاقت بہت سی اقتصادی مشکلوں کو سلجھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

---

عزیز جاوید

# غزل

چشمِ بے اشک سے دامن کو بھگونا آیا
مسکراتے ہوئے اک عمر میں رونا آیا

درسِ خورشید گری خاک کو دیتا ہے وہی
خونِ دل راہِ وفا میں جسے بونا آیا

دلِ بے زخم کا طالب ہے ستم تو دیکھو
جب سے اس شوخ کو نشتر کا چبھونا آیا

میں نے مجروح کیا غیرتِ دل کو خود ہی
اکثر اوقات اسی جرم پہ رونا آیا

قلزمِ زیست کی موجیں نہیں دیتی ہیں خراج
جنھیں طوفاں کو سفینے میں ڈبونا آیا

دل تو وابستۂ امید ہے لیکن جاوید
کون ہے وہ جسے مایوس نہ ہونا آیا



# کیا آپ نہیں چاہتے کہ

آپ کا بچہ تندرست و توانا ہو؟
اُسے سازگار ماحول میسر آئے؟
اُس کی ضرورتوں پرورش کے وسائل وافر اور خاطرخواہ ہوں؟
آپ اپنے بچوں پر خاطرخواہ وقت اور توجہ صرف کریں؟
آپ، آپ کی بیوی اور بچے صحت مند ہیں اور مسرور زندگی گزاریں؟

مشورے کے لئے سرکار کے منظور شدہ کسی قریبی

## فیملی پلاننگ سنٹر میں تشریف لائیے

DA 61/576

پلان سے کیا ہوگا



فی کنبہ

## ۲۷۵ روپے زیادہ آمدنی

تیسرا پلان پورا ہونے تک فی کنبہ اوسط سالانہ آمدنی ۱۹۶۱-۶۲ء
کے ۱۶۵۰ روپے سے بڑھ کر ۱۹۲۵ روپے ہو جائے گی

پلان کو کامیاب بنائیے، تاکہ آپ کی آمدنی بڑھ سکے

ہر شخص کے لئے اچھی زندگی

تیسرا پنج سالہ پلان

۵۸۶۱/۶۰



## نرم دِل ماموں

پیارا ماموں بڑا پیار کرتا ہے۔
ماموں سے دل کی بات کہنے میں بھی
ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔
آندھرا کی اِس نوخیز اداکارہ دوشیزہ کے
دِل میں کیا ہے؟ —— وہ اپنے پیارے
ماما سے کہتی ہے، "مجھے چندر گرہی سے
بڑی خوبصورت ساڑھی لا دیجئے۔" وہ ماموں سے
یہ کہے بھی کیوں نا! نرم دِل ماموں پیار
جو کرتا ہے۔ کیا وہ نہیں کرتا!

నందగిరి బంగారుమామా

చంద్రగిరి చీరాలంపేవా

బంగారుమామా రంగారుమామా

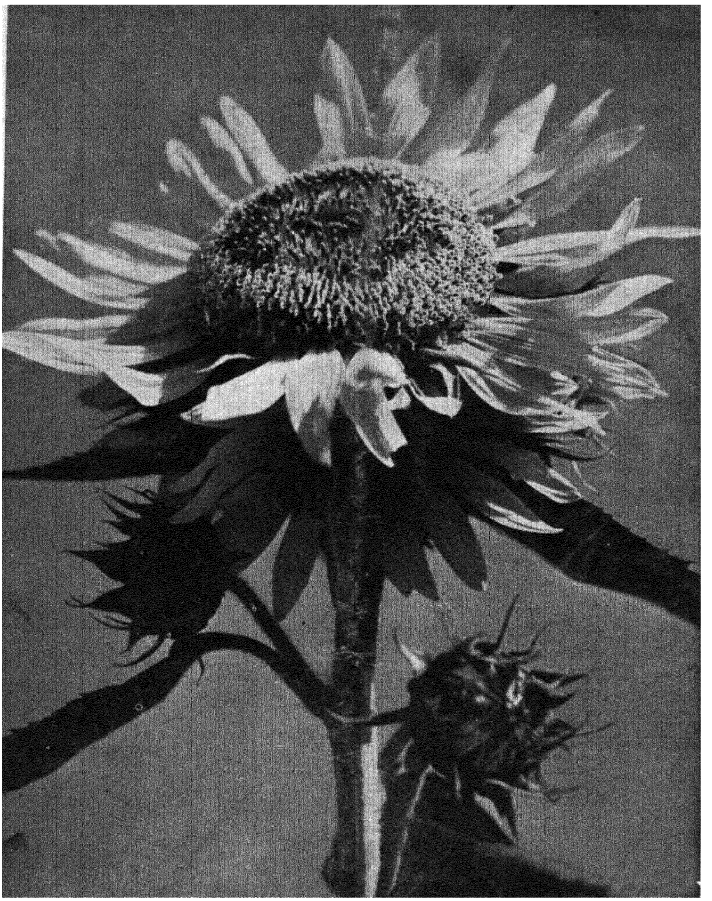
చంద్రగిరి చీరాలంపేవా



## ہاتھ کھڈی

ہمارا قومی ورثہ۔

DA 61/881



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**

# آج کل

چیتر شک سمت ۱۸۸۴
اپریل ۱۹۶۲ء

۶۰ نئے پیسے



# ہماری کتابیں



| نام کتاب | قیمت | ڈاک خرچ |
|---|---|---|
| پنڈت نہرو سے بات چیت ٹیبر منڈی | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے | ۳۵ نئے پیسے |
| تیسرا پنج سالہ پلان | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ایک روپیہ | ۲۵ نئے پیسے |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی | ۷۵ نئے پیسے | ۲۰ نئے پیسے |
| ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ۶۰ نئے پیسے | ۱۵ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ۳۵ نئے پیسے | ۱۰ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں | ۱۰ نئے پیسے | ۸ نئے پیسے |
| نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶ | (فی نمبر) | (فی نمبر) |

ملنے کا پتہ

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶**

اردو کا مقبول عوام معتبر ماہنامہ

# آج کل دہلی

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| مولانا ابوالنصر | عبدالغفار مکیل | ۳ |
| سُنہرے راستے | شہاب سرمدی | ۸ |
| غزل | آصف الدآبادی | ۹ |
| ہمدرد | کوثر چاندپوری | ۱۰ |
| صحیفۂ نغمات | عمران انصاری | ۱۴ |
| انڈونیشیا - سرزمین اعتدال | محمد فیاض | ۱۵ |
| تنکے کا سہارا | قمر تمکین | ۱۹ |
| پنجابی کے صوفی شعراء | شاکر پرشاد رحمتی | ۲۷ |
| موسیقار کی ڈائری کا ایک ورق | پران ناتھ | ۳۸ |
| غزل | نذرت کان پوری | ۴۱ |
| فنادی چپا | وجاہت علی سندیلوی | ۴۲ |


سرورق :- [illegible] اور چیتے
رسالے کی پشت پر :- [illegible]


چیترشک سمہ ۱۸۸۴

اپریل ۱۹۶۲ء

جلد ۳۰ نمبر ۹


مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

[illegible] عرشی طیبانی ایڈیٹر آج کل (ادارہ) اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی ۶


مجلس ادارت

| | |
|---|---|
| محمد حبیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | سری نگر |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| عبدالقادر سروری | حیدرآباد |

یو۔ ایس۔ موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی۔ این۔ ۱۰ یس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نجما ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرشی ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)
مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- مظفر شاہ



سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ یا ۱ ڈالر

فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- اشلنگ یا ۱۵ سنٹ

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

# ملاحظات

روس کے دو خلائی مسافروں کے بعد اب امریکہ کے ایک آدمی جان گلین بھی خلا میں جا کر اور زمین کے گرد چکر کاٹ کر واپس آ گئے ہیں۔ انھوں نے زمین کے تین چکر لگائے۔ اس طرح بالآخر امریکہ بھی خلائی سفر میں کامیاب ہو کر برابر کا شریک ہو گیا۔ روس کی طرح امریکہ کے اس خلائی جہاز کی رفتار بھی تقریباً ۱۷ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ امریکہ کی اس کامیابی پر دنیا بھر میں اظہار مسرت کیا گیا اور مبارک باد کے پیغامات بھیجے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ملکوں نے خلائی سفر کی تیاریوں پر قابو پا لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی معلومات سے نہ صرف خلائی سفر کو زیادہ سے زیادہ آسان بنایا جا سکتا ہے بلکہ اس دنیا کی خوش حالی میں اضافہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ کاش ان دونوں ملکوں میں اشتراک عمل اور خلائی سائنس کی ترقی میں باہمی امداد و تعاون کا جذبہ پیدا ہو تاکہ ان کی یہ قابل فخر ترقیاں عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ثابت ہو سکیں۔

مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ایک روزنامہ کے ایڈیٹر کو جو انٹرویو دیا تھا اس کے بعض حصے ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ جنگ سویز کی کامیابی کے جو نتائج نکلے ان پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ اس فتح نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ جو طاقتیں دوسرے ملکوں کی دولت کی اجارہ دار بن بیٹھی ہیں انھیں شکست بھی دی جا سکتی ہے۔ جنگ سویز نے ان لوگوں کو ایک نیا حوصلہ دیا کہ وہ افریقہ میں امپریلزم کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور آزادی حاصل کر کے دم لیں۔ اسوان بند کا ذکر کرتے ہوئے صدر ناصر نے بتایا کہ سامراج شاہی نے اعلان کیا تھا کہ یہ بند بنانا ممکن ہے لیکن اب اس ناممکن کام کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ مصر کی اقتصادی ترقی کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ گزشتہ آٹھ سال میں قومی آمدنی دوگنی ہو گئی ہے یعنی کوئی ۴ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔

ملک میں تیسرے عام انتخابات بخیر و خوبی ختم ہو گئے۔ دنیا کے کسی ملک میں اتنے بڑے پیمانے پر انتخابات نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں رائے دہندگان کی تعداد ۔۔۔ کروڑ ہے۔ رائے دہندگان کی اتنی بڑی تعداد کسی جمہوری ملک میں نہیں ہوئی۔ اس کام پر ۱۰ کروڑ روپے سے کچھ زیادہ خرچ آئے۔ کہتے ہیں بڑی خوشی کی بات ہے کہ انتخابات کے دوران میں کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔ اور یہ کام امن اور عافیت کے ساتھ پورا ہوا۔ اس طرح ہندوستان کے عوام نے ایک بار پھر جمہوری نظام حکومت پر اپنے کامل اعتماد کا اظہار کر دیا ہے۔

ممتاز ادیب اور ماہر نمایاں جناب امتیاز علی عرشی رام پوری کی ساہتیہ اکادمی نے ان کے مرتب کئے ہوئے 'دیوان غالب' پر پانچ ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ عرشی صاحب کی علمی و ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہر اعتبار سے اس اعزاز کے مستحق ہیں جس پر اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں اظہار مسرت کیا جائے گا۔ ادارۂ آج کل 'مہ نو' کو پر خلوص ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

اردو کے مشہور شاعر مخمور عرشی تلوک چند محروم کو حکومت پنجاب نے ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں ۱۱۰۰ روپیہ کے انعام خلعت اور دیگر اعزاز سے نوازا ہے۔ حکومت پنجاب کا یہ اقدام ہر لحاظ سے قابل توصیف اور خوش آئند ہے اور اردو دنیا میں مستحسن سمجھا جائے گا۔ اس سے ادیبوں اور شاعروں کی قدر افزائی کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ ہم محروم صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

عبدالغفار شکیل

# مولانا ابوالنصر

( مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے بھائی )

تصویریں کے خالق نے یکے بعد دیگرے دو تصویریں بنائیں۔ دونوں اپنی جگہ باوصف اور باکمال تھیں۔ دونوں میں ایک جوہر تھا ایک جاذبیت تھی اور ایک کیفیت بھی۔ اس وجہ سے اہل نظر کی نظر ان دونوں تصویروں کو دیکھ کر محو ہو جایا کرتی تھی۔ ان تصویروں میں اکثر باتیں مشترک تھیں لیکن ان کی قسمت ایک سی نہ تھی!

ایک کی قسمت میں صاف، واضح، روشن اور نمایاں ہونا لکھا تھا اور دوسری کی قسمت میں ایک ذرا سی مدھم روشنی اور پھر ہمیشہ کا دھندلاپن۔ زمانے ہی نے ایک کو ہمیشہ کے لئے روشن اور نمایاں بنایا اور زمانے ہی نے دوسری کو ہمیشہ کے لئے دھندلاپن بخش دیا۔

روشن اور نمایاں تصویر مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کی ہے اور دھندلی تصویر مولانا ابوالنصر غلام یٰسین آہ مرحوم کی جو مولانا آزاد کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ مولانا ابوالنصر کی زندگی کا چراغ اس دنیا کی تیز و تند ہواؤں میں زیادہ دیر تک نہ جل سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی اور حالات پر گمنامی کا اندھیرا چھا گیا اور اُن کی وہ دھندلی تصویر جو کسی زمانے میں لوگوں کے لئے مولانا ابوالکلام کی تصویر سے کم جاذبیت نہ رکھتی تھی وقت کے بہاؤ کے ساتھ مٹتی چلی گئی۔

دنیا میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں اور ہوں گی جن کو زمانہ اپنی لاکھ کوششوں کے باوجود صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں سکتا۔ وقتی طور پر زمانہ کسی کو کسی منزل پر نیچا کر کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ عارضی کامیابی اور یہ چند روزہ فتح و نصرت بذاتِ خود منقلب زمانہ کے لئے کیسے ابدیت کا باعث بن سکتی ہے؟ زمانہ مولانا ابوالنصر کو مٹا نہ سکا۔ ان کا پیکرِ فانی اس دنیا میں نہ رہا لیکن ان کے افکار، ان کا ادبی سرمایہ ایک ایسی چیز ہے جو کسی وقت بھی ان کی دھندلی تصویر کو نمایاں اور روشن کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ مکمل طور پر سامنے آ جائے۔

مولانا ابوالکلام کی ولادت ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ مولانا ابوالنصر مولانا ابوالکلام سے عمر میں دو تین برس بڑے تھے۔ اس حساب سے مولانا ابوالنصر کی ولادت ۱۸۸۵ یا ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ چوں کہ دونوں بھائیوں کی عمر میں ایسا کچھ زیادہ تفاوت نہ تھا اس لئے تقریباً دونوں ہم درس رہے۔ مبدءِ فیاض نے مولانا ابوالکلام کے لئے مذہب، علوم و فنون، ادب و انشا اور شاعری کی بے شمار راہیں کھول دی تھیں اور جن الطاف و عنایات سے انھیں نوازا تھا مولانا ابوالنصر بھی ان سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ مولانا ابوالنصر کی شخصیت میں بھی وہی ذہانت، وہی طباعی، وہی حافظہ اور وہی ذوقِ علم و کمال ودیعت کیا تھا جو مولانا ابوالکلام کی شخصیت میں تھا۔

مولانا ابوالنصر اردو، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں پر کافی عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک کتاب ترکی قواعد پر بھی لکھی تھی۔ نثر ہی سے انھیں تحریر و تقریر کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ اسلامیہ کالج کے بڑے ہال میں ایک بہت بڑے جلسے میں انھوں نے تقریر کی تھی۔ اس کے علاوہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے پریجنگ ہال میں وہ ہر ہفتہ جایا کرتے تھے اور ویسائی جلسوں سے بحث و مباحثے میں حصہ لیا کرتے تھے۔

مولانا ابوالنصر اکثر باتوں میں اپنے والد بزرگوار کے سچے جانشین اور قدم بہ قدم چلنے والے تھے۔ وعظ کی مجلسوں میں ٹھیک اسی اسلوب سے وعظ کیا کرتے تھے جو اُن کے والد بزرگوار کا تھا۔

مولانا ابوالنصر اپنی تعلیم سے فارغ ہوئے تو بیسویں صدی کی ابتداء میں لاہور سے مخزن نئی روشنی کے خیالات کا ترجمان بن کر منظرِ عام پر آیا۔ مولانا ابوالنصر اور مولانا ابوالکلام دونوں نے اپنی علمی صلاحیتوں کی جلوہ گری بھی بذریعہ تحریر شروع کی۔ جن لوگوں کے پاس رسالہ مخزن کے ابتدائی پرچے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان دونوں بھائیوں نے کیسے کیسے مضامین لکھے۔ مولانا ابوالنصر کے متعدد مضامین بیسویں صدی کی ابتداء میں ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ خصوصاً مخزن، خدنگ نظر، وکیل اور خاتون میں مولانا کے مضامین نکلے ہیں۔

مولانا ابوالنصر کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو جو "فکرات سوختہ" کے نام سے رسالہ خاتون علی گڑھ بابت جنوری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا:۔

"چاندنی رات ہے اور ایک حوض کے کنار سے اپنے کو پاتی ہوں۔ امواج نسیم سے متاثر ہونے والے اطراف حوض کے چمنی سطحے آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں اور درختوں شاخوں سمیت رہ رہ کر کانپ اُٹھتے ہیں۔ ایسے میں بلبل فقط وہ رات کا مداح، رات کے عمق قلب سے حزنیہ، محزنہ اور بلند صدا آواز کو نکال نکال کے موجودہ سکوت میں خلل ڈالنے لگا۔ وہ میری تمنائے روح میں قطرہ قطرہ غم ٹپکا کے اس آواز کو بڑھاتا تھا اور میری آنکھیں دیکھتی تھیں کہ آواز نے اس روشن تاریکی اور لامحدود آسمان کو لرزہ میں ڈال رکھا ہے۔ یہ نئے نہیں یہ نغمات موسیقی میرے قلب اور میری روح کو بریز کر رہے ہیں۔ جس وقت میں سن رہی تھی روح کوئی شے محسوس کر رہی تھی اور دل سسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس شکست اور بے آہنگ آواز کی تقلید میں مکدر جسم کے ساتھ فضائے شعر میں پرواز کروں لیکن ہیہات!

دفعتاً وہ آہنگ دار اور پُر لرزہ آواز اپنی حفاظت کے خیال سے موقوف ہو گئی اور میں اس مستی کی حالت میں باوجودیکہ اپنے کو محسوس کرتی تھی اس تصادمی سکوت کو محسوس کر چکی۔ وہ آواز میرے کان بہت ضعیف طریقے سے سن رہے تھے لیکن صرف اس پرسات کے پہلے قطرے نے میری موجودہ حالت کو جگا دیا۔

آخر میں میں نے مجروح، حقیر دل کے ساتھ دل سے اپنے کو کھینچا لیکن ایک بلبل کے نغمے تاریکیٔ شب کے سکوت کی گود میں متفکر آسمان کے سامنے جیسا کہ میں اب تک سن رہی ہوں۔"

(ابوالنصر ہلوی از لینڈاد)

مولانا ابوالنصر کو سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ انھوں نے حجاز، عراق، مزار بلجر، موصل، شام وغیرہ ممالک کا سفر کیا۔ اوپر جو نمونۂ نثر دیا گیا ہے دراصل وہ ترکی زبان سے ترجمہ ہے۔ مولانا جہاں کہیں بھی گئے اپنی اردو زبان کو نہیں بھولے۔ غیر ممالک جا کر بھی انھوں نے اردو میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ ان کے دیگر نثری مضامین میں اہلِ خطا کے مذاہب مشک، وغیرہ رسالہ مخزن کی ابتدائی جلدوں میں شائع ہو کر اس زمانے میں داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

مولانا ابوالنصر نے ایک کتاب عمر خیام کی سوانح عمری

متعلق بھی لکھی تھی جو لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے "غیطۃ الناظر" نامی عربی رسالے کا جس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات لکھے گئے تھے اور جس کو ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل مدرسۂ عالیہ کلکتہ نے ایڈٹ کرکے شائع کیا تھا ترجمہ اردو میں کیا۔

ایک اور انکشاف بھی مولانا ابوالنصر غلام یٰسین کے بارے میں سنیئے۔

مولانا ابوالنصر شاعر بھی تھے اور آہؔ تخلص کرتے تھے۔ حضرت داغ دہلوی سے انھیں تلمذ تھا۔ مولانا بلخ آبادی کہتے ہیں کہ مولانا ابوالنصر آہؔ صاحب دیوان تھے اور ان کے دیوان میں ہر صنف کلام میں متعدد اشعار موجود تھے لیکن زمانے کی دست برد کے ہاتھوں ان کا بیشتر کلام ضائع ہوگیا۔ غزلوں کے علاوہ مولانا ابوالنصر آہؔ نے ترکی، عربی اور انگریزی سے بے شمار نظمیں اردو میں ترجمہ کیں جن میں سے بعض انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔

مولانا ابوالنصر آہؔ کا کچھ کلام قدیم رسالوں اور گلدستوں میں بڑی تلاش و جستجو کے بعد دستیاب ہوا ہے جو تبرکاً یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

غزل

اشک حسرت ہیں بتے ہجر میں ڈھلنے کے لئے
ایک دریا میری آنکھوں سے اُبلنے کے لئے
کوئی تدبیر نہیں دم کے نکلنے کے لئے
کیا اُٹھا رکھتے ہیں بیمار سنبھلنے کے لئے
چاہیئے صورت پروانہ دل سوز طلب
ایک پر ایک گرا پڑتا ہے جلنے کے لئے
داغ کیوں تم نے دیا ہی کے رقیبوں سے مجھے
آتشِ ہجر نہ کم تھی مرے جلنے کے لئے
لے گئے ہو جو مرے ہوش و خرد صبر و قرار
داغ دے جاؤ کوئی دل کے بہلنے کے لئے
نزع میں دیکھئے کوئی حسرت و ارماں کا ہجوم
سب مرے ساتھ ہی تیار ہیں چلنے کے لئے

آبلے دل میں پڑے داغ جگر کے ہمراہ
کیا بہار آئی مری پھولنے پھلنے کے لئے
جان ہی عشق کے افتاد سے لے گی آخر
ایک ٹھوکر ہی کھائی تھی سنبھلنے کے لئے
دوپہر حسن کی اب ہو چکی اے مست شباب
سر پہ آیا ہے دوپٹا ترا ڈھلنے کے لئے
دیکھیں کیوں چاہنے والے تجھ کو
ہر طرف آنکھیں بھی ہیں ترسنے مچلنے کے لئے
جب بگڑتے ہیں سنبھالے سے سنبھلتے ہی نہیں
آپ بھی میری طبیعت ہیں مچلنے کے لئے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے کیوں پیر مغاں
سے ہے ڈھلنے کے لئے جام ہیں چلنے کے لئے
سے کہو لے ہم سے کوئی مشغلۂ تنہائی
تیری تصویر سے باتیں ہیں بہلنے کے لئے
لڑکھڑاتے ہیں کبھی رند تو دیکھ اے زاہد
یا علی منہ سے نکلتا ہے سنبھلنے کے لئے
کھائیں گے زہر حسینانِ جہاں آج اس پر
دامنی پوشاک منگاتے ہیں بدلنے کے لئے
بحر حسرت دانہ سے دم گھٹتا ہے
راہ پاتے نہیں ارمان نکلنے کے لئے
تم سلامت ہو تو آئے گی قیامت بھی کہیں
اک یہی چال اُٹھا رکھی ہے چلنے کے لئے
لوٹ جاؤ دل بے تاب ہمارا لے کر
کوئی حیلہ نہیں درکار مچلنے کے لئے
ہے مرے خانۂ تاریک میں یکساں شب و روز
اک چراغ آٹھ پہر چاہیئے جلنے کے لئے
شاعری داد طلب داد نہ دے جب کوئی آہؔ
پھر تو اک شغل ہے یہ دل کے بہلنے کے لئے

(ماخوذ از گلدستہ نیرنگ عالم کلکتہ اپریل ۱۸۹۹ء)

یہ غزل مولانا ابوالنصر آہ کے ابتدائی دور کی یادگار ہے۔ اور اس وقت کی ہے جب کہ ان کی عمر ۳۰ یا ۳۲ سال کی تھی۔ ابتدائی غزلوں میں آہ کا رنگ آنا لازمی بھی تھا۔ ایک اور غزل بھی کچھ اسی قبیل کی ہے:

کبھی وہ جان کا دشمن وہ قاتل یاد آتا ہے
کبھی بھولے خالی دیکھ کر دل یاد آتا ہے

چلے جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے ہم دشت غربت میں
وطن اپنا ہمیں منزل بہ منزل یاد آتا ہے[1]

پھنسے اک ان سے الفت کر کے ہم دو ہری مصیبت میں
اِدھر وہ یاد آتے ہیں اُدھر دل یاد آتا ہے

رہا پہلو میں جب تک ہم اسے سمجھا کئے دشمن
گنوا بیٹھے ہیں تو کم بخت اب دل یاد آتا ہے

گزرتا ہے نظر سے جب کوئی پھولا پھلا گلشن
تو پھر دل ہم کو اپنا رنگِ محفل یاد آتا ہے

مزے کی نیند گو آتی ہے آغازِ جوانی میں
مگر انجام میں یہ وقت غافل یاد آتا ہے

کبھی جس دل کو ظالم دمبدم تو یاد آتا تھا
اب اپنا ہم کو وہ آیا ہوا دل یاد آتا ہے

ہماری بے گناہی پر جھجکتا رہتی ہے قاتل سے
کبھی تم کو کوئی ناکام بسمل یاد آتا ہے

بُرا ہوتا ہے صدمہ ہم نشیں کے بچھڑ جانے کا
کلیجہ کوئی مل دیتا ہے جب دل یاد آتا ہے

مگر بتدریج کلام کا رنگ بھی بدلتا گیا۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

دل میں لازم ہے خیالِ روئے پُر تنویر بھی
چاہیے اس آئینے کو زنگ کی تعمیر بھی

سوئے زنداں جب ترا دیوانہ گھسیٹا چلا
پاؤں پڑنے کے لئے آگے بڑھی زنجیر بھی

روح سارے جسم کی آتی ہے کھنچ کر کان میں
سحر ہے ظالم تری جادو بھری تقریر بھی

آہ اس سفاک نے ہم پر کبھی کھایا نہ رحم
روتے جاتے ہیں ہمارے حال پر رہ گیر بھی

---

نہ توڑ دے تو دل شکستوں کے دل ڈر ہے گھر خدا کا گراتے ہوئے
خدا جانے کب دل میں آئے گئے انھیں آتے دیکھا نہ جاتے ہوئے

مری قبر پر آ کے کہتے ہیں وہ بہت نیند کے آپ ماتے ہوئے

---

کہتا ہوں جب کہ مجھ پہ نگاہِ کرم نہیں
کہتے ہیں ناز سے وہ خدا کی قسم نہیں

تیرے جفا و جور کا ہم کو الم نہیں
جینے کا اپنے رنج ہے مرنے کا غم نہیں

تکتے ہیں کاہ مجھ کو کبھی وہ رقیب کو
شوخی سے سرزنش میں شوخی بھی کم نہیں

دل کی تڑپ میں شوخیٔ جاناں کا ہے مزہ
اب آرزوئے وصل خدا کی قسم نہیں

تم ہو زباں دراز تو ہم بے زبان ہیں
تم ہم سے کم نہیں تو ہم تم سے کم نہیں

اردو ادب میں آہستہ آہستہ ایک انقلاب آ رہا تھا۔ شاعری میں اب مقصدیت شامل ہو رہی تھی اور مولانا آہ نے بھی ادب کی نئی شاہراہ پر چلنے کی کوشش کی۔ ذیل کے قطعات ملاحظہ ہوں:۔

یہ تم کو کیا ہوا ہے اسیرانِ ہم صفیر
اُٹھتے نہیں بلائے سے بھی سوگئے ہو کیا

ہم تو وہی ہیں اگلے تپھار سے نیا زمند
چپ چاپ کیوں ہو ہم سے خفا ہو گئے ہو کیا

---

پیری میں رو رہا ہے جوانی کو پیر مرد
یعنی وہ اگلے رنگ کے اب کھیل ہی نہیں

اک خواب تھا زمانۂ ماضی کی چاہتیں
اگلا سا اب ملاپ نہیں میل ہی نہیں

[1] یہ غزل مولانا ابوالنصر نے بغداد سے بھیجی تھی۔

ہر سمت سے آرہی ہے آواز — اللہ جلا بشر برے نہیں
اللہ ہماری شرم رکھ لے — تیرے ہی تو ہیں اگر برے نہیں

---

زاغا کشتی ہے بہر صورت فیروز شاہ کی
اس نے پنجے کاٹ دی اور اس نے رفتے کاٹ دی
گو کہ ان کا جاگنا بھی خفتنوں کے ساتھ ہے
پر یہیں دیکھو کہ ہم نے رات سونے کاٹ دی

---

اسراف کی دھوم ہر کہیں ہے — پابندیٔ رسم دل نشیں ہے
اور اس کا نہیں خیال دل میں — اب گھر میں ہمارے کچھ نہیں ہے

---

آرام کی چیزوں سے میسّر نہیں آرام
دنیا میں ہر اک طرح سے مشکل ہے بشر کو
تھک تھک کے رہے جاتے ہیں کیوں راہ طلب میں
کیا سر پہ کوئی لے کے چلے پائے سفر کو

---

شاعری اصلاً غلط کوئی نہیں — جھوٹ کہنا شاعروں کا کام ہے
سب نجیس گندوں کے ہیں گندے خیال — شاعروں سے شاعری بدنام ہے

(مخزن بابت اگست ۱۹۰۴ء)

ایک غزل کے چند منتخب شعر اور سن لیجئے:

ایک ہے سرور اک ناشاد ہے — بزمِ ہستی کی عجب روداد ہے
قید میں جلتا نہیں بلبل کا دل — یہ چراغِ خانۂ صیاد ہے
ایک عالم کی اڑائی اس نے نیند — اب مری فریاد کی فریاد ہے
بن پڑے تو تم بھی دیں جو درد دل — دشمنِ جاں حسنِ آدم زاد ہے
چرکِ شب دیکھئے کیوں کر کٹے — ہر ستارہ دیدۂ جلاد ہے
جس کو سب کہتے ہیں آہِ نیم جاں — یہ وہی تو خانماں برباد ہے

سیر و سیاحت کے شوق نے مولانا ابوالمظفر کو اپنے وطن سے دور کر دیا لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ پھر وطن دیکھنا نصیب ہوگا بھی یا نہیں چنانچہ مولانا اپنی جوانی ہی میں اپنے وطن سے دور دیارِ غیر میں عالمِ جاودانی کے سفر پر چلے گئے۔ ان کا مولد کہیں تھا مدفن کہیں بنا نہ معلوم کیا کیا امنگیں مولانا کے دل میں جوان ہونے کے لئے بے تاب تھیں۔ کیا کیا ارمان تھے جو شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے اور کیا کیا خواہشیں تھیں جو اُن کے دم کے ساتھ دم توڑ گئیں۔ دیکھئے خود مولانا ابوالمظفر کا یہ شعر ان کے دل کی آواز سنا رہا ہے ؎

زندگی میں تھیں ہزاروں خواہشیں
مر کے بھی مٹی مری برباد ہے

گویا یہ ایک پیشین گوئی تھی۔ جو خود انھوں نے اپنے متعلق کی تھی۔ اگر قدرت نے مولانا کو کچھ اور زندگی دی ہوتی تو شاید وہ ایک روشن ستارہ بن کر اُبھرتے۔

---

## ضروری گذارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھئے۔
۲۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جب کہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ان کے ہمراہ ہوں۔

شہاب سرمدی

# سُونے راستے

دن کو گھمسان تھی
شہر کی زندگی
شام آئی تو ایسا لگا
جیسے رستے میں ڈاکہ پڑا
اور بھولی دُلھن لٹ گئی۔

شام آئی ٹھٹھکتی جھجھکتی ہوئی
جیسے پردیس میں اجنبی۔
جیسے پنچھی کوئی
پائے برسوں میں پنجرے کی چٹکی کھلی۔

شام آئی تو اک شمع سی بجھ گئی
جیسے مالا میں پھولوں کی پھیکی ہنسی۔
جیسے بچھڑے سے بھیری
مصلحت کی سجھائی ہوئی دوستی
جس میں سب ہے، مگر ایک جل مُنسی۔

شام آئی تو کھلتی کلی رُک گئی
جیسے بچے کو احساسِ بے چارگی
جیسے جذبات کی نبض ڈوبی ہوئی
ہر تمنا خجل
آرزو مضمحل
جیسے دنداں میں پھیلی ہوئی چاندنی۔

اب جدھر جائیے،
جس طرف دیکھئے "
صف بہ صف، خم بہ خم
روشنی روشنی۔
دُور تک جال بجلی کا پھیلا ہوا
ایک رَو سرخ تاروں میں دوڑی ہوئی،
جیسے رگ رگ میں سوزِ رمِ زندگی"
پھیلتی آگ کو اور دے کر ہوا
جیسے جنگل منانا ہو دیپاولی

شہر کے اُس طرف
دُھوم سی اک مچی
کارخانوں میں لے کے انگڑائیاں
ویو پیکر مشینیں تھرکنے لگیں۔
شہر کے اِس طرف
وقت نے ایک کروٹ جو لی
شام چپ ہو گئی سو گیا آدمی۔
پھوس میں گھٹ گیا بھونپڑوں کا دُھواں
کوٹھیوں پر نئی اوس گرنے لگی
بند پھاٹک پہ ہیں اونگھتے سنتری

جیسے بے وقت کی راگنی
جیسے تہذیب حاضر میں لے کی کمی

ہیں اکیلا ہمی
میری دیوانگی ، میری دیوانگی
مجھکو معلوم ہے
ریت والوں نے کب پریت کو بھیک دی
پھر بھی دیکھے کوئی
طرفہ ترماجرا
ہیں جدھر چل پڑا
راستہ تھک گیا
رات آگے بڑھی

اب کسی موڑ پر کوئی ملتا نہیں
ہر سڑک دم بخود
ہر گلی سوگئی
روشنی سے یہ چھنتی ہوئی چاندنی
پیڑ پاتوں تلے جال بنتی ہوئی
یہ اندھیرے اُجالے اُلجھتے ہوئے
جیسے مبہم سوالات کی چھاؤنی
جیسے ٹھکرائیں اوہام کے لشکری
یہ بھیانک سے
چاہے جو کچھ کہے
دور نزدیک سے جو بھی آہٹ ملے
ہیں سمجھتا ہوں اری نہیں زندگی ۔
کیا ہوا نیند آنکھوں سے گر اُڑ گئی ؟
صبح کے واسطے
نرم و تازہ ہوا کے لئے
آج یہ بھی ہمی ——



آصف الہ آبادی

# غزل

دعویٔ ہوش ہے ساقی کی نظر ہونے تک
شمع کی قدر ہے محفل میں سحر ہونے تک
آج محسوس ہوا جانِ گلستاں تھا یہی
آشیاں کچھ بھی نہ تھا نذرِ شرر ہونے تک
التفاتِ نگہِ یار ہے تیغِ عریاں
سر کہاں معرکۂ عشق کے سر ہونے تک
ذرّہ ذرّہ نظر آنے لگا دامن کشِ دل
لٹ گئے ہم تری محفل میں گذر ہونے تک
دل جو تڑپے گا تو آنکھوں سے گریں گے آنسو
حسن خنداں ہے مرے خاک بسر ہونے تک
درِ جاناں پہ جو پہونچا پھر اُسے ہوش کہاں
حرم و دیر ہیں بیگانۂ در ہونے تک
رازِ آسودگیٔ دل ہے ہتی دامانی
دولتِ فقر ہے محرومِ گہر ہونے تک
کہنہ مشقی کی ضرورت ہے یہاں اے آصفؔ
شعر کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

کوثر چاندپوری

# سہرا

ہندوستانی مسلمانوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جن رسوم کی پابندی کی جاتی ہے ان میں سے بعض ایسی ہیں جو مغل بادشاہوں کے ساتھ آئی تھیں۔ مثلاً ساچق اور حنابندی وغیرہ بعض ایسی ہیں جن کو اہل ہند کی دل جوئی اور ان سے میل جول بڑھانے کی غرض سے اختیار کر لیا گیا تھا۔ مثلاً منگنی اور سہرا یا ایسی ہی دوسری رسمیں۔ کچھ رسمیں ایسی بھی ہیں جن کو ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے مذہبی ماحول کو سامنے رکھ کر ہندوستان ہی میں ایجاد کر لیا تھا۔ جیسے بیوی کی ہمنگ، جس کو متبرک سمجھ کر شادی کا پہلا خیمہ قرار دے لیا گیا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ جہانگیر کی چہیتی بیوی اجود ھیا بائی جو راجپوت قوم سے تعلق رکھتی تھی، نور جہاں بیگم سے خوش نہ تھی۔ نور جہاں اسے دہتھان زادی کے نام سے یاد کیا کرتی تھی اور اکثر اسی طرح چھیڑا کرتی تھی۔ اجود ھیا بائی نے تنگ آکر حضرت خاتون جنّت کے نام سے فاتحہ دلانے کا آغاز کیا۔ اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ کوری ہنڈیوں میں نیاز کا کھانا جمایا جاتا تھا جو ٹیک اور سہاگن عورتوں ہی کو کھلایا جاتا تھا۔ جو لوگ بلائے جاتے تھے وہ پاک وصاف ہو کر کھانے میں شریک ہوتے تھے۔ اجود ھیا بائی نے بیوی کی ہمنگ پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ ایسی تمام بیگمات شرکت کر سکتی ہیں جو اپنے شوہروں پر قائم ہوں۔ نور جہاں شہنشاہ جہانگیر کی نہایت محبوب بیوی ضرور تھی لیکن میتر اتفق کے تحت ہو جانے پر وہ اس کے عقد میں آئی تھی اس لئے اجود ھیا بائی کی شرط پر پوری نہ اترتی تھی۔ چنانچہ وہ شریک نہ ہو سکی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ نور جہاں نے اجود ھیا بائی کو دہتھان زادی کہنا چھوڑ دیا، اسی وقت سے یہ رسم رائج ہے اور شادی بیاہ کے اچھے کام کے شروع میں ادا کی جاتی ہے[1]

اجود ھیا بیگم نے شادی کے بعد اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا، آخر تک ہندو ہی رہی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ رسم کسی مسلمان کے متاثر سے متاثر وجود میں آئی ہوگی۔ بہت سی رسمیں اکبر نے اپنے عہد حکومت میں ہندو دور سے اتحاد کی خاطر اپنائی تھیں۔ اکبر مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ روشن خیال اور اتحاد پسند تھا۔ وہ مذہب کی بنا پر حکومت کرنا پسند نہیں کرتا تھا نہ کسی فریق رعایا پر زیادتی روا رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دربار میں بہت سے ایسے قاعدے جاری کئے جو ہندو راجاؤں کے ساتھ مخصوص تھے۔ ہندوؤں سے جزیہ لینے کا طریقہ بھی اسی کے حکم سے بند ہوا۔ شادی کے سلسلے میں اس نے چند قوانین نافذ کئے تھے جن کی نگرانی کے لئے 'طوی بیگی' کے نام سے ایک عہدیدار مقرر کر دیا گیا تھا[2]

سہرے کا رواج بھی مسلمانوں میں کبھی نہیں رہا۔ یہ خالص ہندوستانی رسم ہے، یہاں تک کہ اس لفظ ہی کو فارسی کا لفظ نہیں سمجھا گیا اور اکثر فارسی لغات مثلاً برہان قاطع منتخب اللغات اور غیاث اللغات

---

[1] تاریخ الخواتین ص ۶۵

[2] آئین اکبری جلد اوّل ص ۱۴۹ طوی ترکی زبان کا لفظ ہے۔ فارسی میں 'توی' بھی لکھا جاتا ہے۔

وغیرہ میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اپنی ترکیب کے لحاظ سے "سہرا" یقیناً فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان ہی میں بنایا گیا ہو۔ چنانچہ امتیاز خاں خالص نے جو صفا ہانی اور ایرانی الاصل تھا ایک سفر میں اسے نظم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے

ماہ من از جیاد خشں بسکہ آب و تاب شد[1]
سہرہ چو بست عارضش پنجۂ آفتاب شد

یہ واضح رہے کہ امتیاز خاں خالص اورنگ زیب کی طرف سے صوبۂ عظیم آباد کا دیوان تھا اور شاہ عالم کے عہد حکومت میں ایران جاتے ہوئے خدایار خاں مرزبان سند کے اشارے سے قتل کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۱۲۲ھ کا ہے[2]

امتیاز خاں خالص پیدائش کے لحاظ سے ایرانی ضرور تھا لیکن عرصہ تک ہندوستان میں رہا تھا۔ یہاں کے رسم و رواج سے بھی اس نے آگاہی حاصل کر لی ہوگی۔ اس لئے اپنے سفر میں جس کیفیت کا اظہار کیا ہے اس کا مشاہدہ ہندوستان ہی میں ہو سکتا تھا کیونکہ ایران میں سہرا باندھا ہی نہ جاتا تھا۔ وہاں کسی محبوب کو وہ شدتِ حیا سے پنجۂ آفتاب بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی دیکھے اس کیفیت کی عکاسی ممکن نہ تھی۔ بہرحال اورنگ زیب کے زمانے میں "سہرے" کا لفظ فارسی اہلِ زبان نے قبول کر لیا تھا۔ رسم کے اعتبار سے "سہرا" باندھنے کا دستور کافی قدیم تھا جیسا کہ آگے چل کر میں بتاؤں گا اور اس کی حیثیت بالکل مذہبی تھی، البتہ اس بات کا ثبوت مجھے نہیں مل سکا کہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے دورِ حکومت میں بھی کسی شاعر نے "سہرے" کا لفظ استعمال کیا یا نہیں۔ میں نے ان ادوار کے اکثر شعراء کا کلام دیکھا مگر "سہرا" کہیں نہیں ملا۔ بہت ممکن ہے کہ خالص ہی کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یہ لفظ بنا لیا گیا ہو۔ ارباب تحقیق نے 'سہرے' پر مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

سہرا موتیوں، مقیش کے تاروں یا طرح طرح کے پھولوں کی لڑیوں سے بنایا جاتا ہے اور دولھا کے سر پر شب گشت کے وقت اور دلھن کے سر پر جلوے یعنی رونمائی کے وقت نقاب کے طور پر باندھا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں سہرے کی رسم مذہبی حیثیت رکھتی ہے اور احکام شاستر کے پیشِ نظر ادا کی جاتی ہے، اس کا مقصد محض دولھا اور دلھن کے چہروں کو نگاہوں سے مخفی رکھنا ہے، شاستر کی رو سے شادی کے وقت دولھا و دلھن کو معمولی انسان نہیں سمجھا جاتا بلکہ قدرتِ الٰہی کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔ اسی لئے دلھن کو لکشمی اور دولھا کو پرمیشر سے موسوم کیا گیا ہے، کیونکہ انھیں دونوں کی ذات افزائشِ نسل کی ضامن ہوتی ہے[3] سہرے کی نقاب سے ان کے چہروں کو پوشیدہ رکھ کر عوام کو شاستر کے عقیدے کی جانب متوجہ کرنا مقصود ہے۔ سہرا باندھنے کے موقع پر نیز شادی کی دوسری رسموں کی ادائگی کے وقت شاعروں کی وہ جماعت جسے بھاٹ کہتے ہیں دولھا کی تعریف میں اشعار پڑھا کرتی تھی، اور چونکہ سہرا بھی شادی ہی کے سلسلہ کی ایک رسم تھی اس لئے سہرے اور دولھا کے حسن و جمال کی تعریف بھی کی جاتی تھی۔ یہی رواج بعد کو سہرے کی تعریف و توصیف میں مستقل طور پر نظمیں لکھنے کا موجب[4] ہوا۔ سہرے کا مطلب وقتی تہنیت اور مبارک باد کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ اردو میں سب سے پہلے سہرا کس نے لکھا اور کس کا اس کا موجد کہنا چاہیئے۔ لیکن اس کی ساخت کے اعتبار سے یہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہرا مرثیہ کے راستے سے اردو میں آیا ہے۔ کم سے کم اس کی ساخت میں مرثیے کا پورا اتباع کیا گیا۔ چنانچہ سہرے میں گوشکی پھبی کا بیان کیا جاتا ہے تو اسے حسبِ حال سہرا، ہمسری، ساچق اور وداع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان چاروں اقسام کا بیان عام طور پر مرثیوں میں ہوتا ہے[5]

سہرے کی لفظی تحقیق کے سلسلے میں ارباب لغت کے بیانات بہت مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سہرا اصل میں شوہر تھا پھر بگڑ کر شہرہ اور آخر میں سہرہ ہو گیا۔

---

[1] بہارِ عجم
[2] تذکرہ حسینی ص ۱۱۱ و شمع انجمن ص ۱۴۱
[3] تاریخ الوزائط ص ۷۹
[4] مجموعۂ استفسار و جواب ۳۷۳
[5] خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم

فرہنگ آصفیہ کے مصنّف کی رائے میں سہرے کی اصل سرہار ہے کیونکہ سر "فرق" کے معنی میں ہندی بول چال میں داخل ہے جس کو ہار سے مرکب کر لیا گیا ہے۔ شروع میں اس کو سرہار کہا گیا ہوگا۔ پھر ہائے ہوز کو گرا کر 'سہار' بنا لیا گیا ہوگا۔ اس کے بعد الف نے قلب مکانی کی منزل سے گزر کر اپنی جگہ تبدیل کر لی ہوگی اور اس طرح "سہرا" بن گیا ہوگا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سہرے کی اصل سہ ہار ہے۔ ممکن ہے شروع میں تین ہار کا سہرا باندھا جاتا ہو۔ اگرچہ سہ ہار اور "سہار" میں تھوڑا ہی فرق ہے اور یہ بات بھی خلاف قیاس نہیں ہے کہ ابتدا میں تین ہار کے سہرے کا رواج رہا ہو لیکن سہ ہار میں کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ فارسی اور دوسرا ہندی ہے، یعنی ہار اور دو مختلف زبانوں کے الفاظ کو ملا کر اس طرح ایک مفرد لفظ بنا لینا صحیح نہیں۔

میری رائے میں یہ اعتراض سہرا اور سہ ہار کے اس رشتہ کو منقطع نہیں کرتا جو سب سے زیادہ قرینِ عقل ہے۔ کیونکہ اول تو بہارِ عجم اور مجمع النفائس کے مصنفین نے لفظ ہار کو چاہے وہ موتیوں کی لڑی کے لئے استعمال کیا جائے، چاہے پھولوں کے ہار کے لئے، فارسی قرار دیا ہے اور ملا منیر کے کلام سے استشہاد کیا گیا ہے جو کہتے ہیں

بہ ذکرِ خلق شا ہنشاہ دوراں
ز بارِ گل ملائک سبحہ گردان[1]

ایک جگہ اور کہتے ہیں

گستہ بارِ مروارید در بر[2]

ہندی میں ہار کو مالا کہتے ہیں جس کی عربی 'سبحہ' ہے۔ اگر نے پھولوں کے ہار کی جگہ پھول مالا رائج کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ لفظ مقبول نہ ہو سکا اور جیسا تیجری رام زنگی کی طرح زبان میں جذب ہونے سے رہ گیا۔ بہرکیف ہار کو عربی میں عِقد اور ہندی میں مالا کہتے ہیں اس اعتبار سے سہرت کی اصل 'سہ ہار' ہی کو تسلیم کر لینا زیادہ مناسب ہے۔

بہارِ عجم میں سہرے کو بھی فارسی قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"سہرہ' بالکسر در اصل سیرا بیائے مجہول و آخرہ الف است چیزے باشد کہ در ہند کہ از مروارید و از مقیش و از گلہا نیز سازند و ہنگام عروسی بر سرِ داماد سے بندند۔"

امتیاز خاں خاؔلص کا وہ شعر جو پہلے لکھا جا چکا ہے، صاحب بہارِ عجم نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے

علامہ نیاز فتحپوری تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ سہرا ممکن ہے کہ سنسکرت کے کسی لفظ کی بگڑی ہوئی صورت ہو یا پھر عربی سے لیا گیا ہو جس میں سہر کے معنی رات کو جاگنے کے ہیں اور سہرہ اس جلسہ یا اجتماع کو کہتے ہیں جو شادی کے وقت قائم کیا جائے[3]

مجھے علامہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ سہرے کو سنسکرت میں 'بہال سنگ' کہتے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔ بہال پیشانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور "سنگ" دونوں کنپٹیوں کے درمیانی فاصلہ کو کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سنسکرت کے اکثر الفاظ ذرا سے تغیر کے بعد اردو میں رائج ہو چکے ہیں مثلاً چندرما کی جگہ چاند اور سوریہ کی جگہ سورج۔ لیکن یہاں سنگ کو کنتاہی منع کیا جائے اس سے 'سہرا' نہیں بن سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ "بہال سنگ" کے معنی کو سامنے رکھ کر اس سے "سرہار" بنا لیا گیا ہو جو پیشانی پر ایک کان سے دوسرے کان تک باندھا جاتا ہوگا۔ پھر یہی لفظ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے 'سہار' کی درمیانی صورت سے گزر کر 'سہرا' بن گیا ہو۔

رہا عربی الفاظ سہرا اور سہرہ کا معاملہ تو اس کو بھی 'سہرے' کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ 'جلسۂ سہرہ' 'رت جگے' کا مترادف ہو سکتا ہے سہرے کا نہیں اور شادی میں یہ رسوم جس ترتیب سے ادا کی جاتی ہیں اس کے اعتبار سے سہرے کا نمبر بہت بعد میں

---

[1] بہارِ عجم جلد دوم ص ۵۴۷
[2] مجمع النفائس
[3] مجموعۂ استفسار و جواب جلد اوّل ص ۳۷۲

آتا ہے۔

شادی کی ابتدائی رسم 'بیوی کی صبح' ہے اس کے بعد رت جگا یعنی شب بیداری جو دولھا اور دلھن دونوں کے گھر منائی جاتی ہے۔ تیسرا مہر مہتے، کی رسم کا ہے پھر ساچق یعنی بری کا، یہ رسم ترکوں کے ساتھ باہر سے آئی ہے اور ساچق کے موقعہ پر سب دھوم دھام سے جلوس نکالا جاتا ہے وہ بھی ترکوں ہی کی نقل ہے۔ بابر نے اپنی توزک کے صفحہ ۲۳۷ پر اس رسم کا ذکر کیا ہے۔ اکبر نے اپنے پوتے کی شادی میں ساچق کی رسم کو نہایت پُرتکلف طریقے پر انجام دیا تھا۔ اس جلوس میں آرائش کا نہایت قیمتی سامان تھا۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ نقد بھی تھا۔ درباری امرا بھی جلوس کے ساتھ تھے۔ ساچق کے بعد مہندی یعنی حنابندی کا نمبر آتا ہے پھر شب گشت کا اس کے بعد کہیں سہرے کی نوبت آتی ہے۔

غالب اور ذوق سے پہلے اردو شعراء کے کسی دیوان میں کوئی نظم 'سہرے' کی تہنیت اور مبارک باد کے طور پر نظر نہیں آتی، شادی پر قطعات ضرور نظم کئے گئے ہیں مگر ان میں "سہرے" کی خصوصیت نہیں ہے، نہ یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایسے قطعات اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ہیں۔ نعمت خاں عالی نے ایک بچہ پر قطعہ کا مگر خاں کی دوسری شادی پر نظم کیا تھا۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے:

بارِ دیگر کدخدا شد خانِ عالی منزلت
با کمال عزّ و تمکیں با وقار زیب و زین[1]

اس قطعہ میں نہایت فنی کاریگری اندازِ میر جعفر زٹلی کی بھونڈی گئی ہے اور اکثر علوم کی اصطلاحات صرف کرکے اسے اتنا مشکل بنا دیا گیا ہے کہ علامہ آزاد بلگرامی کو اس کی شرح لکھنے کی زحمت گوارا کرنا پڑی۔ اس قطعہ میں بھی سہرے کا لفظ نہیں ملتا۔

اردو کے موجودہ مجلوعہ، ذخیرے کے پیش نظر یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ سب سے پہلے مرزا غالب نے سہرے کے نام سے ایک مستقل نظم بادشاہ کے ایما پر لکھی، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے

سہرہ لکھا گیا ذرا امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

یہ تاریخی سہرا مرزا جواں بخت کی شادی پر لکھا گیا تھا جو شاہ ظفر کے بیٹے تھے اور نواب زینت محل کے بطن سے پیدا ہوئے تھے مقطع میں شاعرانہ تعلی تھی اور اشارہ استادِ شاہ حضرت ذوق کی طرف تھا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ کو خیال ہوا کہ غالب نے براہ راست ہم پر چوٹ کی ہے یعنی اس سے بہتر سہرا کہنے والا کوئی نہیں اور ہم نے ذوق کو ملک الشعراء بنا کر سخن فہمی اور مرتبہ شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔ ذوق آئے تو بادشاہ نے سہرا دکھا کر کہا کہ آپ بھی سہرا کہیئے اور ابھی کہیئے۔ ذوق نے وہیں بیٹھ کر ۱۵ شعر کا سہرا کہہ دیا اور مقطع میں غالب کی شاعرانہ تعلی کا جواب بھی اسی رعونت اور اشاریت کے ساتھ دے دیا۔

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ذوق کا سہرا اسی دن شہر بھر میں پھیل گیا اور دلی کے ہر گلی کوچے میں گایا جانے لگا۔ غالب کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ لکھا۔ سارا جھگڑا مقطع سے پیدا ہوا تھا۔ غالب اس کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں

مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

اس کے بعد غالب اور ذوق کے اتباع میں سہرا کہنے کا رواج عام ہوگیا جو اب تک موجود ہے لیکن بہرحال ہے بھٹیوں کی ایک ترقی یافتہ شکل۔

غالب اور ذوق کے سہروں کو دیکھ کر سہرے کے متعلق کچھ اور باتوں کا علم بھی ہوتا ہے مثلاً موتیوں کی لڑیوں کے ساتھ ہی سہرے میں پھولوں کی لڑیاں بھی ہوتی تھیں یا موتیوں اور پھولوں کے سہرے الگ الگ باندھے جاتے تھے۔

---

[1] خزانہ عامرہ صفحہ ۳۳۰ دیوانِ عالی کے بعض نسخوں میں "عالی منزلت" کی جگہ "والا منزلت" مرقوم ہے اور یہی صحیح ہے۔

جی میں آتا ہوں نہ موتی کہ یہیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
سہرے کی لمبائی قبا کے دامن سے نہیں بڑھتی تھی
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
سہرا کشتی میں رکھ کر لایا جاتا تھا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

شادی کے موقعہ پر دستار کو باندھی ہی جاتی تھی اور اسی پر سہرا باندھا جاتا تھا لیکن سادہ سہرے پر طرہ بھی ہوتا تھا اور گلے میں بدھی یا ہار یا تھ میں کنگن پہنائے جاتے تھے

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

بدھی اور کنگن ممکن ہے پھولوں ہی کے بنائے جاتے ہوں
سہرا گانے کا رواج تو بھاٹوں ہی کی ایجاد ہے مگر ڈومنیاں بھی گاتی تھیں۔

سہرے کی لڑی کا ٹوٹ جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کو بہت بُری فال خیال کیا جاتا تھا۔

ہو نہ ہو لعل دولھا کی ماتھا۔ مرا ٹھنکا
اچھا نہیں بی ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا [1]

---

[1] تاریخ ریختی مسعود حسن صاحب صفحہ ۷۶

عمران انصاری

## صحیفۂ نغمات

جس بات سے خلوص میں آتی ہے کچھ کمی
ہم سے بصد خلوص وہی بات ہو گئی
عمرانؔ ان لبوں سے ادا ہو کے یہ غزل
میرے لئے صحیفۂ نغمات ہو گئی

ذکرِ خلوص سن تو رہا ہوں مگر حضور!
پہلے کوئی خلوص کے قابل بنائے دل
عمرانؔ عرض ہے یہ خدائے جمال سے
کب تک جہاں میں بارِ محبت اُٹھائے دل

آسمانوں پہ اہلِ زمیں آ گئے
ہم جہاں سے چلے تھے وہیں آ گئے
جس جگہ راہ و ہم و گماں بھی نہیں
ہم وہاں لے کے عزم و یقیں آ گئے
تم نے ہم کو جہاں سے بھی آواز دی
تم ہی کہہ دو وہاں ہم نہیں آ گئے؟
بزمِ شعر و ادب، بزمِ ماتم ہے اب
نکتہ داں چل بسے نکتہ چیں آ گئے

محمد فیاض

# انڈونیشیا — سرزمینِ اعتدال

خلیج بنگال سے جنوب مشرق کی سمت بحرِ ہند میں خط استوا پر حلقہ کئے ہوئے جزیروں کی ایک لمبی چوڑی دنیا بستی ہے۔ ایک عرصہ تک جغرافیہ کے طالب علم اس خطہ کو جزائر مشرقی ہند یا ڈچ ایسٹ انڈیز کے نام سے جانتے رہے تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ہمارے کرّہ نے کسمسا کر جو کروٹ لی اور اپنا جغرافیہ بدلا تو بہت سی نئی سرحدیں، نئے آئین اور دنیا کے نقشہ پر بہت سے علاقوں نے اپنا رنگ بدل دیا۔ جزائر شرقِ ہند نے بھی ہالینڈ کا نوآبادیاتی پیلے رنگ کا چولا بدل کر آزاد ملک کا اپنا گہرے سبز رنگ کا جامہ پہنا اور ڈچ ایسٹ انڈیز کی جگہ انڈونیشیا کے نام سے ایک نئی جمہوریہ قائم ہوئی۔ دنیا نے سمجھا کہ اس کی تاریخ میں ایک نئے ملک کا اضافہ ہوا۔ لیکن انڈونیشیا کی اپنی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ نسلِ آدم۔

جو لوگ ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے نہیں چڑتے ہیں وہ 'آدم جاوا' کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ 'آدم جاوا' اس نظریہ کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی فراہم کرتے ہیں اور موجودہ نسلِ انسانی کو سب سے پچھلے دم گرد کرہ زمین سے نکلنے والے انسان نما جانور سے قریب ترین سے جاتے ہیں۔ سائنسی ان 'آدم جاوا' کو Pithecanthropus Erectus کہتے ہیں اور یہ چین کے Sinanthropus Erectus اور یورپ کے Neandarthial Man دونوں سے عمر میں بڑے تھے۔ اس انسانی (؟) ڈھانچے کی عمر کا اندازہ پانچ لاکھ سال کیا جاتا ہے۔ آج سے پانچ لاکھ سال پہلے کیا ہوا۔ کون جانتا ہے البتہ قیاس ہے کہ آج سے کم از کم چالیس ہزار سال قبل ان جزیروں میں انسانی آبادی پائی جاتی تھی۔

انڈونیشیا کے قدیم ترین باشندے سیاہ فام ناٹے قد کے گھنگریالے بالوں والے حبشیوں (نیگرو) سے ملتے جلتے آدی باسی تھے اور چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں ان جزائر میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کی مجموعی تعداد جزیروں کے رقبے کو دیکھتے ہوئے اتنی قلیل تھی کہ آبادی کا تصور جیسا کہ اب ہمارے ذہن میں ہے (!!) اس وقت ناممکن تھا۔ قدیم نسل کے یہ باشندے اب تہذیب سے بہت دور قدیم آدی باسی زندگی بسر کرتے ہوئے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

دورِ مسیحی کے آغاز سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے موجودہ انڈونیشیا کے خطہ سے منگول نسل کی ایک شاخ کے لوگ بہاجرین کی صورت میں متعدد قافلوں میں بٹ کر آب و دانہ کی تلاش میں جنوب کی طرف روانہ ہوئے اور برما اور جزیرہ نما ملایا کی راہ سے ان جزائر تک پہونچے۔ ان قافلوں میں سے کچھ تو ملایا کے سرسبز و شاداب علاقے میں بس گئے اور کچھ نے آگے بڑھ کر سمندر پار مجموعہ الجزائر میں متعدد ٹولیوں میں آکر بود و باش اختیار کر لی۔

آج سے پندرہ ہزار سال پہلے کی تاریخ پر قدامت کی دھند چھائی ہوئی ہے۔ تاریخ کے اس دھندلے خاکے میں رنگ آمیزی کے لئے

دیو مالا کے تعینُّ کا سہارا لینا پڑے گا۔

کہتے ہیں کہ سیدھے سادے، بھولے بھالے انسانوں کا یہ قافلہ جس وقت طلایا کی سرحد پر آکر رکا تو ہمالیہ کے دیو استھان سے ایک دیوتا اپنے آسمانی سفر پر ادھر سے گزر رہا تھا اس نے ان انسانوں پر مسکرا کر نظر ڈالی اور جیسا کہ دیوتاؤں کی عادت ہے اس نے ان دھرتی باسیوں کی قسمت بھانپ لی اور خوشی کی لہر میں آکر اپنے گلے سے نرمدا کی مالا اتار کر سمندر میں پھینک دی جو اُن کے قدموں پر آکر گر گئی۔ دیوتا کی اس فراخ دلی پر ادھر دیو استھان میں طبل بجی تو ادھر انسانی سمج سے ایک صدائے آفریں بلند ہوئی۔ کسی نے کہا: "وہ دیکھو!" لوگوں نے دیکھا اور افق پر جزیروں کی ایک دنیا خالی پڑی ہوئی بود و باش کی دعوت دے رہی تھی، گھر کی تلاش میں سرگرداں انسانوں کو ایک نیا گھر مل گیا تھا اور کیسا گھر!

موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے چھوٹے بڑے تین ہزار جزیرے تقریباً تین ہزار میل کی لمبائی میں پھیلے ہوئے، کچھ تو چھوٹے کہ کسی کو نام دینے کا خیال نہیں آیا اور جہاں چند درختوں کے علاوہ آبادی کا نام نہیں۔ اور ان میں سب سے بڑا بورنیو کہ اگر آسٹریلیا کو براعظم مان لیا جائے اور گرین لینڈ کو برف سے ڈھکے ہوئے تین الگ الگ جزیرے تو دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ۔ پھر اس گھر میں قدرت کا وہ سب کچھ موجود ہے۔ وہ تمام قدرتی وسائل جو دنیا میں ہمیشہ سے قوموں کے لئے عظمت اور ترقی کے ذرائع ثابت ہوئے ہیں اس سرزمین کا سینہ ہیرے، سونا چاندی، تانبہ، ٹن، لوہا، کوئلہ اور تیل سے پٹا پڑا ہے۔ استوائی آب و ہوا کے ساتھ ہمارے ذہن میں انتہائی گرمی اور بارش کا جو تصور ہے وہ یہاں آکر غلط ثابت ہوتا ہے۔ پورے ملک میں چند جگہوں کو چھوڑ کر کہیں بھی درجۂ حرارت سال میں کبھی ۷۰ درجے سے کم نہیں ہوتا اور نہ بارش غیر معمولی طور پر موسلا دھار۔ خاص کر پہاڑی مقامات پر اور یہاں ہر جزیرے کے بیچوں بیچ ریڑھ کی ہڈی کی طرح پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے) آب و ہوا خنک اور دل فریب ہے۔ زمین اتنی زرخیز کہ جو چیز اگتی ہے وہ شدت سے اگتی ہے۔ یہاں خزاں نہیں ہوتی۔ سبزہ و درخت سب سدا بہار رہتے ہیں۔ یہ ملک وہ خصوصاً جاوا اور بالی کے جزیرے قدرتی مناظر کی جنت ہیں۔ سماترا میں گھنے جنگلات ایک ناقابلِ عبور دیوار کی طرح کھڑے ہیں جن میں عجیب و غریب آرکڈ انسانی دسترس سے باہر چھپتے ہیں اور انسان کو دعوتِ ہم دیتے ہیں۔ جاوا میں زینہ وار دھان کے کھیت نہ جانے کب سے مصوروں کے لئے موضوعِ تصویر مہیا کر رہے ہیں۔ ناریل، سپاری، چائے، قہوہ، ربڑ، تمباکو، گنا سب کچھ افراط سے پیدا ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہاں کے مسالے ہیں۔ سیاہ مرچ، لونگ، جائفل، جوز، جواتری وغیرہ وغیرہ جن کی خوشبوؤں نے دنیا کے کونے کونے سے تاجروں کو یہاں کھینچ بلایا۔ ان مسالوں کی تجارت اور اس تجارت کے منافع کی تلاش میں اس سرزمین میں پہلے ہندو، عرب، فرانسیسی، پرتگالی، انگریز اور ولندیز کی سبھی کا گزر رہا۔ یہاں آئی چنگ، مارکوپولو اور ابن بطوطہ بھی پہنچے ہیں۔ چین کے بدھ عالم اور یورپ کے مستشرقین سب نے یہاں سے فیض حاصل کیا ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں بسنے کی غرض سے آئے۔ کلنگا کے شاہزادے کے سپاہیوں نے 'خانِ اعظم' کا دبدبہ قائم کرنے کے لئے یہاں چڑھائی کی تو لشکر کا ایک شہزادہ یہاں بدھ بھکشو بن کر آیا۔ عرب اور گجراتی تاجروں نے یہاں اسلام کا پیغام سنایا اور پرتگالیوں نے صلیبی جنگ کے نعرے لگائے اور آخر میں (کوئی بیس سو سال پہلے) ولندیزیوں نے یہاں اپنے گھر سے دور ایک گھر بسایا اور دنیا کی زبردست نوآبادی قائم کی۔ ان سبھوں کی کارگزاریوں نے انڈونیشیا کی تاریخ میں بیسیوں رنگوں کا ایک عجیب و غریب نمونہ بنایا جس تاریخ کے صفحوں میں آپ کو خن و ہنر، ترقی و عظمت پستی و مصیبت، امن و جنگ، دیانت و دیوی اور بزدلی و کینگی سب کی ہنستی روتی داستانیں ملیں گی۔

انڈونیشیا اپنی ۹ کروڑ آبادی کے ساتھ دنیا کے ملکوں میں اس وقت چھٹے نمبر پر ہے۔ اس آبادی کے ۹۰ فی صدی سے زیادہ لوگ اسلام کے پیرو ہیں اور اس لحاظ سے مسلم ممالک میں

اس کا درجہ پاکستان کے بعد آتا ہے لیکن ملک کی زرخیزی اور تمدنی وسائل کے اعتبار سے یہ مجموعہ الجزائر، ایشیا بلکہ دنیا کے امیر ترین ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ گزرے وقتوں میں دنیا کے زبردست ملکوں نے اپنی نوآبادیوں سے اتنا مالی فائدہ نہیں اٹھایا جتنا کہ ولندیزیوں نے انڈونیشیا سے۔

جاوا انڈونیشی جزائر میں رقبہ کے لحاظ سے بورنیو، ساترا اور ایرین کے بعد آتا ہے لیکن پورے ملک کی آبادی کے تیسرے حصائی (۱۵ کروڑ) لوگ اسی جزیرے میں آباد ہیں تاریخی اعتبار سے بھی جاوا کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ زمین کی شادابی، زرخیزی اور تدریجی مناظر کی دلکشی میں شاید ہی کوئی دوسرا جزیرہ جاوا کا مقابلہ کر سکے۔ ملک کے اہم ترین آثار قدیمہ جاوا ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ملک کی سب سے بڑی سلطنت کا مرکز تاریخ میں جاوا ہی تھا۔ انڈونیشی ثقافت کو عروج اسی جزیرے میں حاصل ہوا۔ ہندوستان سے آکر بسنے والے کچھ سب سے پہلے جاوا ہی پہونچے تھے۔ ہندومت کا پرچار سب سے پہلے جاوا ہی میں ہوا تھا۔ سامراج کے قدم بھی سب سے پہلے یہیں جمے تھے۔ انڈونیشیا کے مسلم مبلغ جاوا ہی میں سب سے زیادہ سرگرم کار تھے۔ حریت کی جنگ بھی اسی جزیرے پر ہوئی۔ اور قیام جمہوریہ کے بعد وار السلطنت بھی اسی جزیرے کے بشر جاکرتہ کو بنایا گیا۔ لوگوں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ جاوا کے باشندے بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور پورے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس جزیرے میں بیک وقت ملک کے ہر علاقے اور دائرے کے لوگ آکر بس گئے ہیں۔

جاوا کی آب و ہوا میں ایک سلامت روی اور اعتدال پایا جاتا ہے اور یہ خصوصیت اس کے باشندوں کو بھی خواہ وہ کسی بھی جزیرے سے آکر بسے ہوں ودیعت کی گئی ہے۔ جاوا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک کہیں موسم گرم کا موسم نہیں ملے گا۔ جاکرتہ موسم کے ایک ایسے بھنور میں ہے کہ یہاں جیسے تازہ ہوا کا گزر ہی نہیں۔ یہاں کی گرمی میں حبس اور امس گھٹن ہے کہ جاکرتہ نواسی اس کو صرف چند دن برداشت کرتے ہیں اور ساتویں روز ایمرجنسی وارڈ کو شہر سنسان ہو جاتا ہے۔ اس روز شہر سے باہر جانے والی سڑکوں پر لوگوں کا ایک طرف رخ ہوتا ہے۔ شہر سے باہر صرف دس کیلو میٹر دور آب و ہوا بدل جاتی ہے۔ ہوا خنک اور فرحت بخش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وسط جاوا میں آپ ڈننگ پلیٹو پہونچ جائیے تو سال کے کسی وقت برف باری بھی دیکھ سکتے ہیں۔

قدرتی مناظر بھی آپ جیسے جیسے سفر کرتے جائیں بدلتے جائیں گے۔ سامنی میدانوں میں سرسبز لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیت، دور دور پر کیلوں کے جھرمٹوں میں چھپے ہوئے گاؤں، میدان سے ہٹ کر چٹیلی پہاڑیاں جن پر جا بجا سینچل کے تناور درخت، اونچی پہاڑیاں چائے کے باغوں کا دبیز مخملی غلاف اوڑھے، میلوں لمبائی میں پیش قطار درقطار دیڑکے قارم۔ وادیوں میں ناریل کے گھنے گھنے سرسبز رنگ کے جھنڈ اور ان کے پس منظر میں دھان کے زینہ دار مخملی کھیت، ان میں بچھلے ہوئے شیشے کی طرح جھلکتا ہوا پانی۔ زمین کا چپہ چپہ سبز فرنوں سے بھرا ہوا۔ یہ سارا منظر ایسا ہے کہ تھیسی وآ قرمن کے الفاظ بھول کر بس دیکھتے چلے جائیے۔ اور جب جاکرتہ کی گھٹن میں واپس آئیے تو اسی سڑی ہوئی گرمی میں پسینے کی چپچپی برداشت کرتے ہوئے سرد آہوں کے ساتھ جن الفاظ اور جن خیالات میں جی چاہے ان مناظر کی دل فریبی اور آب و ہوا کی فرحت کو یاد کر لیجئے۔ البتہ یہ تاثر آپ نہ جھلا سکیں گے کہ انڈونیشی منظر میں آپ کو کوئی ایسی چیز نہ ملے گی جو حیرت انگیز ہو جہاں آپ گرد و پیش کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ یہاں قدرت ہر جگہ اور ہر درجے میں ایک اعتدال اور سلامت روی لئے ہوئے ہے۔ پہاڑ، دریا، جھرنے جھیلیں، دلدل اور وادیاں سب ایک سبک سا حسن رکھتی ہیں اور قدرت کا یہی اعتدال یہاں کے لوگوں کی طبیعت میں جھلکتا ہے۔ امن پسندی، صلح جوئی، انکسار اور رواداری ان کی طبیعت ثانیہ ہے، ان کی چال ڈھال اور طرز گفتگو میں ایک سلامت روی ہے جس کو دیکھ کر یورپ کے لوگوں کو صدیوں سے کاہلی اور سستی کا دھوکہ رہا ہے اور "استوائی آرام طلبی" ضرب المثل بن گئی ہے، یورپ کے نقطۂ نظر سے یہ سلامت روی دیکھنے والے کو بے صبر کر دیتی

وہ اس سست رفتاری پر جھنجھلا جاتے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کی ہماہمی اور روزمرہ کی جد و جہد حیات کے مدّ نظر یہ جھنجھلاہٹ حق بجانب ہے۔ خود انڈونیشی زندگی میں یہ اعتدال اور سکون جزو حیات ہے اور ایک غیر ملکی یہاں چند سال رہ کر اس کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ اسے اس سست رفتاری کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

انڈونیشی لوگوں کی یہ [illegible] اور رواداری تھی جس نے باہر سے آئے ہوئے [illegible] عنصر کا خیر مقدم کیا اور ان خارجی عناصر کو اس طرح جذب کیا کہ یہاں پہونچ کر ہر چیز انڈونیشی سانچے میں ڈھل گئی۔ لیکن یہ تو دوسری داستان ہے۔

---


# 'آج کل' کا 'فنِ تعمیر نمبر'

## اگست ۱۹۶۲ء میں شائع ہوگا

اس خصوصی نمبر کے لئے مندرجہ ذیل عنوانات پر مضامین درکار ہیں۔ جو حضرات مضامین لکھنا چاہتے ہیں وہ ایڈیٹر 'آج کل' سے خط و کتابت کریں۔

۱۔ ہندوستان کا قدیم فنِ تعمیر (موہن جوداڑو۔ ہڑپّا وغیرہ)
۲۔ بودھ فنِ تعمیر
۳۔ جین فنِ تعمیر
۴۔ غاروں کے تعمیراتی شاہکار
۵۔ جنوبی ہند کا فنِ تعمیر
۶۔ ہند آریائی فنِ تعمیر
۷۔ چولکیا طرزِ تعمیرات
۸۔ پٹھان اور مغل فنِ تعمیر
۹۔ پہاڑی فنِ تعمیر
۱۰۔ مشرق میں ہندوستانی فنِ تعمیر کے اثرات
۱۱۔ جدید ہندوستانی فنِ تعمیر
۱۲۔ آزادی کے بعد کی عمارتیں

پتہ:۔ ایڈیٹر، 'آج کل' (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

قمر تمکین

# تنکے کا سہارا

ایرٹ نے دل بھر دیا تھا کیسا مگر نہ جانے کیسی افسردگی اس کے پورے وجود پر طاری تھی کہ شام ہوتے وقت تک اس کا دل ہلکا نہ ہو سکا۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود اس نے اسی شام کو کنسرٹ میں جانا منظور کر لیا تھا مگر اب سوچ رہا تھا کہ کاش کوئی ایسا بہانہ ملتا کہ وہ نہ جاتا۔

ایرٹ وائلن کا ماہر ہے وہ دل لگا کر اپنے فن سے خلوص کے ساتھ محنت کرتا ہے۔ مگر جب کنسرٹ کا وقت آتا ہے تو اس میں ایک طرح کی بددلی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جب ڈائس پر دیا ہوئے اسٹیج پر آکر اپنا وائلن لے کر کوئی دھن چھیڑتا ہے تو چند ہی منٹ میں لوگ باتیں شروع کر دیتے ہیں کچھ بھی بھن کی آواز ہال میں پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے، ایرٹ کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور پھر وہ جلدی جلدی نغمہ ختم کر کے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

وہ ایک وائلن نواز ہے۔ مگر ایک ناکام فن کار۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر روتا ہے۔ پھر ساز چھیڑتا ہے اور کان لگا کر ہوا کی لہروں کو محسوس کرتا ہے۔ اب کیا کمی ہے۔ اب کیا کمی ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ پھر پوری توجہ سے جدوجہد کرتا ہے مگر نتیجہ وہی کا وہی۔

وہ وائلن بجانا چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی تو ایک چیز تھی جس سے اس کو دلچسپی تھی۔ جس سے وہ کچھ پیسے کما سکتا تھا۔ لیکن اگر اس طرح وہ ہر کنسرٹ میں ناکام ہوتا رہا تو لوگ اس کو بھول جائیں گے۔ اس کا ذکر تو لوگوں نے اب کم کر دیا تھا۔ اب جو کچھ دو چار ہیبیوں کی آمدنی تھی وہ بھی بند ہونے والی تھی۔ اس کے برخلاف شترل ایک کامیاب وائلن نواز سمجھا جاتا تھا۔ شترل ایرٹ کے مقابلے میں بہت جونیئر تھا۔ اس کو فن کے تمام پہلوؤں پر عبور بھی نہیں حاصل تھا۔ مگر پھر بھی وہ جیسے ہی کنسرٹ ہال میں داخل ہوتا تالیاں بجنے لگتیں اور لوگ دیر تک بیہوت ہو کر سنتے رہتے۔ اس کی آمدنی بھی خاصی تھی اور اس کے ساتھ عقیدت مندوں کی ہمیشہ ایک فوج چلتی تھی۔

پچھلے دنوں کئی مقابلے ہوئے۔ دو تین تو ملک بھی تقریبیں عمیں اور پھر سماجی اجتماعات۔ مگر سب سے زیادہ دل چسپ شہر کے مشہور گرجس کا یہ کنسرٹ تھا۔ اس میں حصہ لینے کے لئے باہر کے لوگ بھی آرہے تھے۔ ایک مشہور وائلن نواز بھی آرہا تھا۔ منتظمین نے بڑے پیش پیش کے ساتھ کنسرٹ میں ایرٹ کا نام بھی شامل کر لیا مگر اس کا نام شروع ہی میں مبتدیوں کی فہرست میں رکھا گیا تاکہ لوگوں کو زیادہ بدمزیت نہ ہو۔

ایرٹ نے بڑی تیاری کی۔ سارا وقت وائلن بجانے پر صرف کر دیا۔ بھوک پیاس سب بھول کر وہ مستقل اس جدوجہد میں مصروف رہا کہ کسی طرح آج کی شام اپنی امید بھر لے۔ اس کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ گذشتہ دس برس سے شہر کے ممتاز فن کاروں میں اس کا شمار تھا۔ اس کے باوجود اس کی ہتک کی گئی تھی اور اس کا نام نوآموزوں کی طرح پروگرام کے شروع میں رکھا گیا تھا۔ اس کنسرٹ کی تیاری

کے سلسلے میں ایلرٹ دو دن تک دفتر بھی نہیں گیا۔

شام کو وہ اچھی طرح تیار ہو کر اور بہترین سوٹ پہن کر گرلز کالج گیا اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے جاننے والوں سے ملاقات کی [illegible] میں راجی آباد کھائی دیا اس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے اور ایک اخباری رپورٹر بھی جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ شرلی آیا اس کے ساتھ بھی کئی لوگ تھے۔ ایک اخباری نمائندہ اور ماہنامہ رسالے کا نقاد۔ یہ سب لوگ وہ تھے جو فن کار کے حسب خواہش تبصرے کرتے تھے۔ صرف ایلرٹ ہی اکیلا تھا وہ چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

گرلز کالج کی تقریبات کی سکرٹری جو تمکنت وقار کے ساتھ خوبصورتی اور نفاست کا ایک دلکش مجموعہ معلوم ہوتی تھی اسٹیج پر آئی۔ اس نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے فن کاروں کے نام سنائے اور ان کا تفصیلی تعارف حاضرین سے کرایا۔ سرسری طور پر چند لفظوں میں اس نے ایلرٹ کا بھی ذکر کیا۔ پھر ایک کونے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایلرٹ کے نام کا اعلان کیا۔

وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اسٹیج پر آیا اس نے وائلن اٹھا کر ماہر موسیقار کی طرح کندھے پر رکھا اور کسی طرف دیکھے بغیر ایک نئی دھن چھیڑ دی۔

مجمع پر سکوت طاری تھا۔ لوگ خاموشی سے متاثر انداز میں بہوت بیٹھے تھے فضا میں دل آویز نغمے کی لہریں بکھر رہی تھیں۔

"ارے یہ کیا ——" ایلرٹ چونک گیا۔ سامنے کی قطار میں بیٹھی ہوئی دو لڑکیاں شرلی سے کچھ کھسر پھسر کر رہی تھیں اور شرلی نے ایلرٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمسخر آمیز لہجے میں کچھ کہا۔ ایلرٹ کا دھیان بٹ گیا۔ اس کو غصہ آ گیا۔ مگر ان چند ہی سیکنڈوں میں اس کی دھن کا سلسلہ منتشر ہو چکا تھا۔ تار بے ترتیبی سے بجنے لگے تھے۔ ہال میں نغمے کا جادو ٹوٹ گیا۔ لوگوں نے بلی جیسی سانسیں لیں اور ایک طرف کچھ سرگوشیاں بھی سلگائی جانے لگیں اور پھر ہلکی سی جھنجھناہٹ ہال میں پھیل گئی۔ ایلرٹ بالکل ہی بدحواس ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی سنگیت ختم کر کے اپنا پروگرام ادھورا چھوڑ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے پاس پندرہ منٹ تھے مگر وہ دس منٹ بھی اسٹیج پر نہ ٹھہر سکا۔

"یہ میری آخری کوشش تھی۔ اب میں چھوڑ دوں گا۔ مجھے وائلن بجانا نہیں آتا ہے۔ ناکام کوششوں اور وقت کی بربادی سے کیا حاصل؟ یہ غلط ہے کہ میرے فن کی قدر نہیں ہوتی۔ اصل میں کمزوری خود مجھ میں ہے مجھ کو کچھ نہیں آتا۔" وہ بے کار پڑا اتنہائی سے یہی سب کچھ سوچتا رہا۔

دوسرے دن اس نے دفتر میں لوگوں سے کنسرٹ کی تعریف سنی۔ جب اپنی ٹیبل پر پہونچا تو دل نہ چاہنے کے باوجود اس نے اخبار کا مقامی خبروں کا صفحہ کھولا جس میں شرلی اور اوجن کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ رپورٹر نے لکھا تھا کہ شرلی کو کئی بار اسٹیج پر بلایا گیا۔ کالج کی کلب سکرٹری نے اس کو بہترین مظاہرے کا تمغہ دیا اور اس کے آٹوگراف لئے گئے۔

ایلرٹ دن بھر کیا پورے ہفتے بہت چڑچڑا رہا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اب وائلن کبھی نہیں بجائے گا۔

لیکن ایسا ہوا کہ وہ اپنے ارادے پر قائم نہ رہ سکا۔ ایک دن جب وہ بہت ہی دل شکستہ اور افسردہ سا تھا تو اس کو ایک خط ملا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ کام ختم کر کے میز پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ اسی کی ازلی تنہائی آج اس کو کاٹے کھا رہی تھی۔ اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنا دکھ کہہ سکتا۔ اس نے وائلن بجانے کو اپنا بہترین مشغلہ بنا رکھا تھا۔ ان مخملی لمحات میں جبکہ خود اپنی زندگی بڑا بوجھ معلوم ہوتی تو وہ وائلن اٹھا لیتا اور بڑے خلوص کے ساتھ درد بھرے دل کی آواز کو تاروں سے ہم آہنگ کر کے فضا میں منتشر کر دیتا۔ مگر اب بہت دنوں سے وائلن بھی اس کا ساتھی نہ تھا۔ اس کی تنہائی اور بڑھ گئی تھی۔

وہ دن بھی کچھ بہت ڈیاوہ اداس تھا۔ شروع مارچ کا زمانہ تھا درختوں سے پتے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ چاروں طرف عجیب ویرانی سی برس رہی تھی۔ ایسے میں ایلرٹ کو وہ خط ملا۔

وہ خط بہت خوبصورت نسوانی تحریر میں تھا۔ مگر بھیجنے والے کا پتہ اور نام درج نہ تھا چند ہی سطریں تھیں مگر ان میں سب کچھ موجود تھا۔

ڈیر ایلرٹ

تم ایک بہت اچھے مگر بہت ہی لاپروا فن کار ہو۔ میں نے

کالج کے کنسرٹ میں تمہارا مظاہرہ دیکھا۔ بہت ہی گہرا اثر لیا۔ مگر تم جلدی چلے کیوں گئے۔ میں کون ہوں یہ بتانا مناسب نہیں ہے لیکن "خزاں کی شام" کے کنسرٹ میں تم ضرور آؤ۔ لکھنؤ برننگ کی ٹیمیں بھی بجاؤ گے۔ مجھے بہت پسند ہے۔ یہ امید بے جا نہیں ہے کہ تم ضرور آؤ گے مگر تم پورے وقت وہاں رہو تو شاید میں تم سے مل سکوں اور اپنا تعارف کراؤں۔ . . . . "

خط بھیجنے والی کوئی لڑکی تھی۔ خط انگریزی میں تھا۔ اس وجہ سے واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ بھیجنے والا مرد ہے یا عورت۔ ممکن ہے کہ وہ اس کالج کی طالبہ ہو۔ البرٹ نے سوچا۔

مگر وہ کنسرٹ میں کیسے جائے گا۔ اس کے پاس تو کوئی دعوت نامہ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اس شام کو دیر تک گہری سوچ میں رہا۔ لیکن ایک بات اور وہ بھی ہوئی اور وہ یہ کہ اس نے خط کو احتیاط سے اپنے سرہانے رکھ لیا اور بہت دنوں بعد واپس بجایا۔

اس کی اُلجھن دُور ہو گئی۔ دوسرے دن اس کو خزاں کی شام" کا دعوت نامہ ملا۔ اور ایک بار پھر وہ بڑے انہماک کے ساتھ کنسرٹ کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دفتر سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی۔ پہلے تو اس نے نئی اور پرانی تمام دُھنیں بجا ڈالیں پھر دن دن بھر دنیا کے ماہر فن کاروں کی نقلیں اُتارتا رہا۔ پھر اس نے دو ایک نئی کمپوزیشنیں لیں اور ان میں سے اس نے نئے ریکارڈوں کی نئی دُھنیں معلوم کیں۔ پورا ہفتہ اس تیاری میں گزر گیا۔

پھر کنسرٹ کی شام آ گئی۔

اس دن البرٹ نے کسی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ کون کون آیا اور کس کے ساتھ کون اور کتنے لوگ تھے۔ شہر کے معززین پیش پیش کون کون موجود تھا۔ ان سب باتوں کی البرٹ نے مطلق پروا نہ کی۔ اس کو صرف ایک خیال تھا کہ اس بھرے مجمع میں کوئی اس کا بھی تھا جو صرف اس کا منتظر تھا۔ اس واحد پرستار کو مایوس نہیں کرنا ہے۔ آج خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ پورے وقت تک اسٹیج پر ٹھہرے گا۔ ممکن ہے خط لکھنے والا اس سے آ کر ملے۔

" اے میرے ان جانے دوست کاش میں تم کو مایوس نہ کروں۔" اس نے بہت عجیب انداز میں سوچا

وہ مستقل سوچ میں تھا۔ چاروں طرف سے بے خبر۔ مگر چونکا اس وقت جب اس کا نام پکارا گیا۔ شاید کچھ لوگ ہنسے۔ کچھ نے بیزاری کا اظہار کیا۔ ممکن ہے کہ رپورٹروں نے اپنی نوٹ بکیں بند کر لی ہوں۔ لڑکیوں نے اپنے ناخنوں کی پالش کھرچنا شروع کر دی ہو۔ اگلی صفوں میں لوگوں نے پہلو بدلے ہوں — مگر البرٹ ان سب سے بے نیاز اسٹیج پر پہونچا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ اس کی نظریں ہال کے وسط میں ہتھیں مگر وہ دیکھ کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

بڑی سرعت کے ساتھ تاروں میں ارتعاش شروع ہو گیا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ چند ہی منٹوں میں البرٹ نے تاروں کو خزاں کے المیہ ماحول سے ہم آہنگ کر دیا۔ ایک دفعہ اس نے تو ور سے ایک تار کو رگڑا اور پورا اسٹیج چیختا ہوا معلوم ہونے لگا۔ دوبارہ اس نے انتہائی مہارت سے آواز کو بالکل ہی مخالف انداز میں موڑ کر کسی غمناک تصور سے وابستہ کر دیا۔ آخری بار جب وہ ترچھا ہو کر بیزی سے مڑا اور آخری تاثر پیدا کرنے کے لئے اس نے "لکھنؤ برننگ" شروع کیا تو اچانک پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگا — اگلے تین منٹوں میں وہ مائق سر نکالتا رہا۔ پھر ایک زوردار جھٹکا دے کے ساتھ اس نے مضراب اور تاروں کا تعلق ختم کر دیا۔

بیس منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے پانچ منٹ زیادہ لے لئے۔ مگر پورے ہال میں صرف تالیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

البرٹ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کتنی دیر ہوئی اور اس کے فن کے مظاہرے کا لوگوں پر کیا اثر پڑا۔ وہ اندھیرے میں ایک جگہ کھڑا ہوا بے خیالی میں لوگوں کو دیکھتا رہا اور پھر بلا کسی خاص خیال کے ایک طرف کو چل پڑا۔

جب وہ دفتر گیا تو اس کو لوگوں نے مبارک باد دی۔ اس نے بے خیالی میں یہ سب کچھ سنا۔ اس نے اخباروں کے ان کالموں پر بھی توجہ نہ دی جن میں اس کا مدحیہ انداز میں ذکر تھا۔ اس بار وہ ہمیشہ سے

زیادہ چپ اور مغموم تھا۔

مگر اس کو پھر ایک خط اس انداز کا ملا۔ لکھنے والے نے اس کی تعریف کی تھی اور افسوس ظاہر کیا تھا کہ وہ ایبرٹ سے نہ مل سکا۔ مگر خط میں یہ بھی تھا کہ وہ سال کے الوداعی جلسے میں ضرور آئے۔ الوداعی جلسے میں ابھی گگ بھگ پندرہ دن تھے۔ مگر پھر بھی ایبرٹ نے پوری تن دہی کے ساتھ ریاض شروع کر دیا۔

الوداعی جلسے میں اس کو بہت سے لوگ ملے۔ کئی ایک نے گذشتہ جلسے کی مبارک باد دی۔ کئی اخباری نمائندوں نے اس سے دل چسپی لی۔ اور دو تین لڑکیوں نے بھی اس سے تعارف حاصل کیا۔ مگر ان سب میں وہ نامعلوم شخصیت نہ تھی جس کے تصور میں ایبرٹ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ اگر وہ کوئی لڑکی ہے اور خوبصورت لڑکی تو پھر ٹھیک ہے۔ لیکن اگر وہ کوئی اور ہے تو..... آخر کس طرح وہ اس موہوم سہارے سے دامن چھڑا سکے گا۔ اس اُلجھن کا کوئی علاج نہ نکل سکا۔

اس جلسے میں بھی ایبرٹ سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ بار بار تالیاں بجتی رہیں۔ لوگوں نے کئی بار اس کو اسٹیج پر آنے اور نئی نئی دھنیں بجانے کو کہا۔ دوسرے دن اخبارات نے اس کی تعریف لکھی۔

ایبرٹ کی یہ کامیابیاں بہت ہی حوصلہ افزا ثابت ہوئیں۔ اب وہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنے پرستاروں میں گھرا رہتا۔ کئی نقادوں نے اس پر اچھے تبصرے کئے اور موسم گرما کی شاندار تفریحوں میں تمام پہاڑی شہروں سے شملہ، مسوری، دارجلنگ اور نینی تال سے اس کو بلاوے آئے۔

پھر برسات آ گئی۔ کنسرٹ اور میوزک کانفرنس دو ڈھائی ماہ کے لئے بند ہو گئیں۔ مگر ایبرٹ اب خوش اور بہت ہی خوش تھا۔ وہ ایک کامیاب فن کار تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اور کوئی کانفرنس یا کنسرٹ اس کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مگر زندگی میں پھر بھی ایک خلش تھی۔ ایک تشنگی۔ سب کچھ پا جانے کے بعد بھی کچھ نہ پانے کا احساس۔ وہ کون ہے جو میرا پرستار ہے۔ جو ہر جگہ ہوتا ہے پھر بھی مجھ سے نہیں ملتا۔ مگر ہر کانفرنس اور کنسرٹ کے بعد مجھ کو مبارک باد کا خط بھیجتا ہے۔ ایبرٹ اس راز کا حل نہ ڈھونڈھ سکا۔

شاید یہ قصہ یہیں پر ختم ہو جاتا لیکن نئے سیزن کے شروع میں ایبرٹ کو پھر وہی لفافہ ملا۔ وہی جانی پہچانی خوبصورت تحریر۔ اس نے جلدی سے کھول کر پڑھا:

ڈیر ایبرٹ

تم اب ایک کامیاب فن کار ہو۔ میری دلی مبارک باد قبول کرو۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے ایک بار تمہیں ایک کنسرٹ میں گرد بڑا دیا تھا اور تم بدحواس ہو کر پریشان ہو گئے تھے۔ تمہاری اس ناکامی کا مجھے سخت افسوس ہے۔ میں نادم تھا کہ وہ محض میری وجہ سے ہوا۔ میں نے تم کو اس طرح گمنام خط لکھ کر فن کی خاطر زندہ رہنے پر مجبور کیا تم میں بڑی اہلیت ہے اور اب تم پرچ پرچ بڑے آرٹسٹ ہو گئے ہو۔ شاید اب تم کو ان خطوں کی مزید ضرورت نہ ہو۔

تمہارا مشفق


سرِیتا ماہنامہ

سماجی تعمیرِ نو کا ترجمان

● سماجی اور گھریلو زندگی کی صحیح عکاسی کرنے والی کہانیاں
● اہم اور پے چیدہ سیاسی اور انفرادی مسائل پر خیال انگیز مضامین
● دل نشیں نظمیں اور جذباتی غزلیں
● طنز و مزاح
● عورتوں کے سلجھے ہوئے مضامین

فی شمارہ ۷۵ نئے پیسے

زرِ سالانہ ایک سال ۶ روپئے — دو سال ۱۱ روپئے

مینجر: سرِیتا اُردو۔ جھنڈے والان، رانی جھانسی روڈ۔ نئی دِلّی۔

مجھے اگلے شمارہ سے ایک سال / دو سال کے لئے خریدار بنا لیجئے۔ زرِ چندہ کے لئے وہ شمارہ وی۔ پی۔ پی سے روانہ کیجئے۔

نام _____

پتہ _____

شاکر پریشار متی

# پنجابی کے صوفی شعراء

پنجابی زبان و ادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود پانچ دریاؤں کی یہ سرزمین، جسے ویدک گرنتھوں میں 'سپت سندھو' کے نام سے پکارا جاتا رہا ہے۔ قدیم ہند آریائی ثقافت کی ابتداء سے لے کر اسلامی فاتح اقوام کے دورِ عروج تک پنجاب کی دھرتی بیسیوں تہذیبوں کی آماجگاہ رہی ہے۔

سیاسی اعتبار سے بھی جغرافیائی انقلابات پنجاب میں رونما ہوئے اتنے شاید ہندوستان کے کسی اور خطے پر نہیں ہوئے۔ پنجاب کے قدیم آبادکار 'دراوڑ' اور نو وارد آریہ ایک مدت تک یہاں برسرِ پیکار رہے۔ اس کے بعد ایرانی، پارسی، یونانی، باختری اور پارتھی۔ کُشان (یوچی) چینی، اسیری، ہُون، شک، گوجر، ساہی، جاٹ اور بعد ازاں محمد بن قاسم کی تسخیرِ سندھ کے بعد سے افغان و مغل، تورانی اور ترکی اور کئی دوسری قومیں یہاں آئیں اور بالآخر یہیں بس گئیں۔ پنجاب کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور مذہبی نشوونما میں ان سب کا تھوڑا بہت ہاتھ ضرور رہا ہے۔

اس نوع کی سیاسی اور تہذیبی کشمکش میں ایک عرصہ تک پنجاب کی حالت دگرگوں رہی ہے۔ آج جس علاقہ کو ہم پنجاب کے نام سے موسوم کرتے ہیں، تاریخی اعتبار سے یہ علاقہ پہلی بار ۱۹۴۹ء کے بعد ہی ایک سیاسی اکائی کے روپ میں متعدد ہو سکا۔

مندرجہ بالا کوائف کی روشنی میں پنجابی زبان و ادب کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اپنے ابتدائی ایام میں پنجابی زبان اس دور کی 'اپ بھرنشی' میں کچھ اس طرح خلط ملط تھی کہ اس کے علیحدہ وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن دسویں صدی کے آثار، عتبہ اور اس دور کے حالات و کوائف کی تحقیق و تفتیش سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں پنجابی زبان واضح طور پر اپنا علیحدہ روپ دھار چکی تھی اور کس حد تک بطور زبان اس کی منفرد حیثیت قائم ہو چکی تھی۔ مگر اس دور کی پنجابی اور آج کی پنجابی میں بڑا فرق ہے۔ مگر تھی وہ پنجابی ہی جسے محققین اور ماہرین لسانیات نے 'ہندوی' کا نام دیا ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کے الفاظ میں آج کی پنجابی اور اردو دونوں اس قدیم پنجابی کی ہی ترقی یافتہ شکلیں ہیں اور پنجابی اور اردو دونوں ہی طور پر ایک ہی زبان ہے۔

مسلمان جب شمال کی طرف سے اس برِ صغیر میں داخل ہوئے تو ان کی ابتدائی بستیاں سندھ اور ملتان میں قائم ہوئیں۔ اس کے بعد لاہور غزنوی سلطنت کا مرکز بنا اور ایک سو ستر سال تک اہلِ غزنی کی حکومت رہی تو اس دور میں یقیناً کوئی ایسی زبان مروج ہوئی ہوگی جو مقامی باشندوں اور ہر سے آنے والوں کے درمیان افہام و تفہیم کا کام دیتی ہوگی۔ یہ زبان بلاشبہ آج کی پنجابی کا قدیم روپ ہی ہوگی جسے ماہرین لسانیات نے کہیں 'لاہوری' اور کہیں 'ہندوی' کا نام دیا ہے۔

جس ہندوی زبان کو مسلمانوں نے ہندیوں اور بالخصوص شمالی ہند کے باشندوں کے ساتھ بات چیت، اپنے دھرم، کلچر اور ادب کے پرچار کا ذریعہ بنایا اس میں یقیناً اس وقت بھی کافی مقدار میں نثر ی اور شعری ادب تخلیق ہوا ہوگا۔ مگر نا قدر جوگیوں اور سنتوں کی غیر معمولی باتوں کے علاوہ کوئی اور ادبی سرمایہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ بدیں وجہ ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ شمالی ہند کی اس بول چال کی زبان میں باقاعدہ تخلیق ادب کی شروعات سب سے پہلے بدیسی مسلمانوں نے ہی کی۔

پنجابی کی اس ابتدائی شکل ہندوی کو جن مسلمانوں نے شعر گوئی کا ذریعہ بنایا۔ ان میں سب سے پہلا نام 'مسعود ابن سعد' کا ہے۔ جو محمود غزنوی کے پوتے ابراہیم سلطان کے دربار میں تھا۔ ۱۱۲۸ء اور ۱۱۳۰ء کے درمیان اس نے وفات پائی۔ حضرت امیر خسرو (۱۲۵۳ء — ۱۳۲۵ء) نے مسعود کو فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوی میں بھی صاحب دیوان مانا ہے۔ صاحب دیوان در عبارت ہندوی و پارسی' اہم مسعود کا ہندوی دیوان دستیاب نہیں ہو سکا اور اسی باعث اس امر کی مسلمہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ مسعود کی ہندوی زبان کی شکل کیا تھی۔ مشہور ماہر لسانیات ہیم چندر رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے کہا ہے کہ بہت ممکن ہے مسعود بن سعد کی ہندوی برج بھاشا یا بعد کی ہندستانی کے مطابق ہوتے ہوئے بارھویں صدی کی عوام الناس میں مروّجہ 'اپ بھرنش' ہی رہی ہو۔ اگرچہ اپ بھرنش' کا ادبی سلسلہ تیرھویں صدی تک چلتا ہے لیکن بارھویں صدی سے ہی اپ بھرنش' عوام سے دُور محض ادبی تخلیقات کے لئے مخصوص ہو چکی تھی۔ عام لوگوں میں جدید ہند آریائی زبانوں کا قدیم روپ ہی مروّج رہا ہوگا۔ اس لئے فارسی کے عالم مسعود نے اگر ہندوی میں شعر کہے ہیں تو بلاشبہ وہ پنجابی نما ہندوی ہی رہی ہوگی جو جدید پنجابی کی ابتدائی شکل ہے۔ اس کے بعد جب غوری عہد میں لاہور کی بجائے دہلی حکومت کا مرکز بنا تو اس زبان نے وہاں پہونچ کر برج بھاشا اور دوسری زبانوں کے اثرات قبول کر کے بالآخر اردو کی شکل اختیار کر لی۔

غزنویوں نے پنجاب پر ایک سو ستر سال تک حکومت کی۔ اس زمانہ میں لاہور پنجاب کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے علمی اور تہذیبی مرکز بن گیا تھا اور یہاں دُور دُور سے علماء، فضلاء اور صوفیاء کرام آکر جمع ہوگئے تھے۔ غلام محمد شیخ شیرہ دی نے اپنی تصنیف 'حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار' میں ایسے علماء و فضلاء کی ایک طویل اور مفصل فہرست درج کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان میں سب سے عظیم شخصیت شیخ علی بن عثمان ہجویری کی ہے جو آخر عمر میں غزنی سے لاہور آگئے تھے۔ انھیں کے مزار پر خواجہ معین الدین چشتی اور فرید الدین گنج شکر نے چلے کھینچے اور نظام الدین اولیا نے انھیں سے روحانی استفادہ حاصل کیا۔ شیخ اسماعیل لاہوری' شیخ ابوالحسن اور بہت سی دوسری برگزیدہ ہستیاں اسی زمانے میں لاہور میں وارد ہوئیں اور انھیں کی بدولت یہاں اسلام پھیلا ابتدائی عہد میں یہ صوفیاء عام طور پر تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے۔ لیکن ان کا اسلام محض 'اقرار باللسان' کا اسلام نہ تھا۔ ان کا طریقہ ترسیل صرف وعظ و مناظرہ نہ تھا بلکہ خدمت خلق اور لوگوں سے بہتر کا رابطہ قائم کرنا تھا پھر بھی اس دور کے بزرگوں نے نماز، روزہ اور دوسرے شعائر ظاہری پر بہت زور دیا ہے۔

پنجاب کے صوفیاء نے ہندوستان کے دیگر حصوں کے صوفیاء کرام کی طرح شروع شروع میں ایک مدت تک فارسی کو ہی اظہار خیال کا ذریعہ بنائے رکھا اور فارسی میں ہی تبلیغ و تلقین اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ ابتداء میں ہندوستان میں تصوف پر لکھی جانے والی تمام کتابیں فارسی زبان میں ہیں جن میں 'کشف المحجوب' 'کشف الاسرار' اور 'مفتاح العارفین' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں نے ایک عرصہ تک متصوفانہ فکر کو متاثر کیا ہے۔ ان ابتدائی تصنیفات میں فارسی اسلوب اور طرز نگارش، علم العروض اور علم البیان کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن اس کے بعد پنجاب کے صوفیاء نے وعظ و تبلیغ اور اظہار خیال کے لئے مقامی زبان پنجابی کی طرف رجوع کیا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے خیالات سے فیض یاب ہو سکیں۔ محققین اس بات پر

متفق ہیں کہ موجودہ پنجابی زبان کے جنم داتا یہی بزرگ تھے اور انھیں کی نافہ آہو موجودہ پنجابی ادب کے وہ مراکز تھے جہاں سے موجودہ پنجابی ادب دو بڑوں اور کائیوں کی شکل میں معرض وجود میں آیا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا اس مقام پر پہونچا کہ اس میں باقاعدہ نظم و نثر میں کتابیں لکھی جانے لگیں ۔ پنجابی زبان کی صوفی شاعری بلا مبالغہ پنجابی ادب کا عظیم ترین اور گراں قدر سرمایہ ہے ۔ ان صوفی شعراء کے طفیل ہی پنجابی زبان حکومت اور اہل ثروت کی سرپرستی کے بغیر ترقی و ترویج کے مدارج طے کرتی ہوئی عظمت کی بلندیوں سے روشناس ہوئی ۔

چناں چہ اسی سلسلے میں تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر نے پنجابی زبان میں کچھ کلام کہا لیکن باقاعدہ طور پر پنجابی میں لکھنے کی ابتداء پندرھویں صدی عیسوی میں شیخ ابراہیم فریدثانی نے کی ۔ اس کے بعد پنجابی ادب میں صوفی شاعروں نے بیش بہا اضافے کئے ہیں اور اس کی ایک مستقل اور عظیم الشان روایت ہے ۔

اس سے پیشتر کہ پنجابی کے صوفی شعراء کے کلام کا جائزہ لیا جائے یہ مناسب ہے کہ پنجابی کی صوفیانہ شاعری کی بعض اہم خصوصیات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے

مذکورہ بالا کوائف کی روشنی میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ پنجابی ادب کی ابتداء صوفی شعراء سے ہوئی ۔ ایک طرف تو ان صوفی شعراء نے ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے پنجابی زبان کو بالعموم اور پنجابی شاعری کو بالخصوص بہت کچھ دیا ۔ دوسری طرف خود ان صوفیاء و کرام نے پنجابی زبان پر پنجاب کی معاشرت اور مقامی باشندوں کی بود و باش اور ان کے خیالات و روایات سے بہت زیادہ اثر قبول کیا اور بالآخر اپنی تمام انفرادیت اور اجنبیت کھو کر پنجاب کے مخصوص رنگ میں رنگ گئے ۔ چناں چہ فرید الدین گنج شکر اور فرید ثانی کی شاعری میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جو انہماک نظر آتا ہے ، بعد کے صوفی شعراء میں ان کا یکسر فقدان ہے ۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ بعد کے صوفی شعراء نے اشاعت اسلام کی طرف سے توجہ کم کر کے ملک میں رائج الوقت مختلف مذاہب اور دیگر فلسفیانہ مسائل کی چھان بین اور تحقیق و استفادہ کی طرف خاص توجہ منعطف کر دی ۔ حضرت میاں میر اور ابوالفضل جیسے صوفیاء اور علماء اسی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں ۔ تاریخ شاہد ہے کہ ابوالفضل اور فیضی کے افکار و طریقت پر ویدوں اور اپنشدوں کے نقوش بہت گہرے ہیں ۔

شاہ جہان کے عہد میں شہزادہ دارا شکوہ کی سرپرستی میں صوفیاء نے ہندو مت ، ویدوں اور اپنشدوں سے بڑی کشادہ دلی سے استفادہ کیا اور کافی اثر قبول کیا ۔ ان صوفیاء نے طریقت کو عام طور پر ، شریعت سے اگلی اور کسی حد تک افضل و برتر منزل قرار دیا اور شریعت اور اس کے شعائر سے واضح انحراف کی جھلک ان کے افکار اور کلام میں نمایاں ہے ۔ نماز ، روزہ وغیرہ ظاہری رسوم کی پابندیاں نظر انداز کر کے صوفیاء نے مقابلۃً زیادہ انہماک و توجہ سے غیر اسلامی شعائر کی طرف رجوع کیا ۔ اور بھگتی ، کرم اور اہنسا جیسے غیر اسلامی نظریات سے خاطر خواہ اثر قبول کیا ۔ شاہ حسین اور قاضی لاہور کی سرمد شہید صوفیاء کے انھیں غیر شرعی رجحانات پر دلالت کرتی ہے ۔

سترھویں صدی عیسوی میں شہنشاہ اورنگ زیب اور اس کے راسخ العقیدہ درباریوں کی تعصب اور تنگ نظری نے بہت سے صوفیوں کو شہنشاہ کی سخت گیر پالیسی سے بدظن کر دیا اور وہ بھگتی کرم اور ہندو سادھو سنتوں سے زیادہ دل چسپی لینے لگے ۔ مشہور صوفی شاعر بلھے شاہ اور ان کے مرشد شاہ عنایت اسی دور کی پیداوار ہیں ۔

الغرض پنجابی صوفی شعراء نے ہمیشہ مذہبی تعصب اور تنگ نظری کو بالائے طاق رکھ کر مذہبی رواداری ، کشادہ دلی ، مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں باہمی میل جول اور مساوات و اخوت کا پرچار کیا ۔ یہی خصوصیات ہیں جو انھیں دیگر صوفیاء سے ممتاز کرتی ہیں ۔ اور تمام مذاہب کے ماننے والوں میں انھیں مقبول بناتی ہیں ۔ یہ رجحانات

پنجاب کی سرزمین پر تصوف میں نئے اضافوں کا باعث بنے ہیں لیکن یہ ہر صوفی کی شاعری اور اس کی تعلیم کی اہم خصوصیت قرار نہیں پا سکتے کیونکہ اس مشترکہ خصوصیت کے باوجود ہر ایک کا ایک اپنا شاعرانہ رنگ اور منفرد انداز فکر، اس کے نظریات اور کلام پر غالب ہے۔

شریمتی لاجونتی رامانے اپنے تحقیقی مقالہ Punjabi Sufi Poets میں صوفیاء کرام کو نظریات کے اعتبار سے تین دبستانوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دبستان ان صوفیاء کا ہے جو تبدیلی مذہب کو مزموم خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن مجید سب سے افضل کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فلاح اور ہدایت کے لئے حضرت محمدؐ پر نازل کی۔ جو ان صوفیاء نے مذہبی تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن انھوں نے وصل حقیقی کے لئے اسلام اور اس کے اصولوں پر ایمان لانا لازمی قرار دیا۔ حضرت فرید اور کافی حد تک صوفی شاعر علی حیدر، صوفیاء کے اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسرا دبستان ان صوفیاء کا ہے جنھوں نے عملی طور پر مختلف مذاہب کے اختلافات کو کم کرنے کی کوشش کی۔ مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت ختم کرکے باہمی رواداری کی تلقین کی۔ انھوں نے ہندو مت اور ویدوں کا مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کے اچھے اُپدیشوں کو اپنے صوفیانہ رنگ میں اپنایا بھی ہے۔ بلھے شاہ اسی دبستان کا نمائندہ صوفی ہے۔

تیسرا دبستان ان صوفیاء کا ہے جو کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ تھے۔ یہ نہ تو تصوف کی مجسم ایجوں میں اُترتے اور نہ ہی اس کے مسائل و فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا۔ انھوں نے مختلف حفاظ اور نظریات سے چند سطحی باتیں اخذ کیں اور انھیں کا پرچار کرتے رہے۔ یہ لوگ اپنی سیدھی سادی باتوں اور جاہلانہ و عامیانہ خیالات کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نچلے طبقے میں کافی مقبول ہوئے۔ لیکن اصولی مسائل تصوف میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں کیا۔ یہ لوگ اُلٹا بعض جاہلانہ باتوں کو فروغ دینے کا باعث بنے۔ انھیں صوفیوں، فقیروں اور پیروں کا وارث شاہ نے اپنی مشہور تصنیف 'ہیر' میں رانجھا کی زبان میں کافی مذاق اڑایا ہے اور ان کی ریاکارانہ گوشہ نشینی کا پردہ چاک کیا ہے۔

پنجابی زبان کے صوفی شعراء کے کلام میں ہمیں ان کے عصر کی سماجی اور معاشی حالات کی واضح جھلک ملتی ہے۔ ان کی شاعری ان کے دور کی معاشی کیفیات کا پرتو ہے اور یہ خصوصیت صرف صوفیانہ شاعری ہی میں ملتی ہے۔ باوجود سالکان طریقت اور محبوب حقیقی کے جویا ہونے کے پنجابی صوفی شعراء نے دنیاوی حقائق سے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ عام دنیاوی معاملات پر ان کی نظر رہی ہے اور اپنے عارفانہ رنگ میں وہ انھیں بیان کرتے رہے۔ علی حیدر، بلھے شاہ اور وارث شاہ کے کلام میں ان کے دور کی سیاسی افراتفری کے متعلق کافی اشارات ملتے ہیں۔

دیہات میں نشو و نما پانے کی وجہ سے پنجابی صوفیانہ شاعری میں اس وقت کی دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی پوری عکاسی ملتی ہے۔ زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اردو اور فارسی کی صوفیانہ شاعر کی طرح پنجابی میں ہمیں پُرشکوہ الفاظ، دُور از کار تشبیہات استعارے اور اُلجھے ہوئے خیالات نہیں ملتے۔ انھوں نے ہمیشہ رائج الوقت پیشوں اور صنعتوں کی اصطلاحات کو تشبیہوں اور استعاروں کے لئے استعمال کیا۔ فارسی کی صوفیانہ شاعری میں محبوب مجازی کے لئے 'لیلیٰ' اور 'مجنوں' دونوں تلمیحات آتی ہیں۔ یعنی محبوب مجازی کو مؤنث اور مذکر دونوں طرح باندھا گیا ہے۔ لیکن پنجابی میں اس کے برعکس صرف مذکر باندھا گیا ہے اور صوفیاء نے اپنے لئے مؤنث الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انھوں نے پنجاب کی عوامی کہانیوں اور مشہور رومانی داستانوں کے کرداروں کو بطور تلمیحات کے برتا ہے۔ ان کے نزدیک عاشقان حقیقی کی حالت ہجر و فراق کی ماری ہوئی سُسّی، ہیر اور سوہنی کی مانند ہے جو ہمیشہ اپنے محبوب کی یاد میں تڑپتی رہیں اور آخر موت کے بعد ہی انھیں وصال نصیب ہوا۔ پنجابی صوفی شاعروں نے بڑی خوبی کے ساتھ پنجاب کی المیہ رومانی داستانوں کو اپنے صوفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے اور عام بول چال کے الفاظ کو بھی بڑے فنی کارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ مختصر یہ کہ پنجابی صوفی شعراء کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ وہ اپنے خیالات کے پُرخلوص اظہار سے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کریں۔ لہٰذا انھوں نے شاعری کے فنی محاسن سے قطع نظر اس کے مقصدی پہلو کو زیادہ مدنظر رکھا۔

## اصنافِ سخن

پنجابی کی صوفیانہ شاعری کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اردو کی صوفیانہ

شاعری کے برعکس پنجابی شعراء نے زیادہ تر ہندوستانی اصناف کو ہی اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ مثنوی، غزل، رباعی، مسدس وغیرہ فارسی اصناف کی بجائے پنجابی صوفی شعراء نے مندرجہ ذیل اصناف کو اپنایا۔

**کافی** ـــ کافی کے متعلق محققین میں ابھی تک اختلاف رائے موجود ہے۔ غالباً یہ لفظ قافیہ سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کے کوئی مخصوص اوزان مقرر نہیں۔ پنجابی کی صوفیانہ شاعری عام طور پر قافیوں کی صورت میں ہی ملتی ہے۔ کافیاں مختلف چھندوں میں لکھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات کافیوں کی ترتیب میں راگوں کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ پنجابی ادب کے مشہور محقق ڈاکٹر موہن سنگھ نے مختلف شواہد و قلمی نسخوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ کافی فی الواقع ایک راگ ہے اور ہندی شاعرہ سہجو بائی کے کچھ پد راگ کافی میں ملتے ہیں۔

**سی حرفی** ـــ سی حرفی پنجابی کی خاص صنفِ سخن ہے۔ یہ صنف ہندوستان کی کسی دوسری صوبائی زبان میں نہیں ملتی۔ بلکہ عربی، فارسی شاعری میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سی حرفی کے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں۔ عموماً حروفِ تہجی میں سے ہر حرف کے تحت چار مصرعے کہے جاتے ہیں اور پہلے مصرعہ کا پہلا لفظ اسی حرف سے شروع ہوتا ہے۔ ہندی شاعری میں دیوناگری کے ۵۲ حروف کی روایت سے 'بادن اکھری' بھی سی حرفی سے ملتی جلتی صنف ہے۔ سی حرفی کو چوں کہ مسلمان شعراء نے زیادہ رواج دیا اور وہ شعراء فارسی رسم الخط میں لکھتے تھے۔ اس لئے پنجابی میں تمام سی حرفیاں فارسی حروفِ تہجی کی رعایت سے لکھی گئی ہیں۔ گورمکھی رسم الخط میں لکھی گئی غیر مسلم شعراء کی سی حرفیوں میں بھی فارسی حروف کو ہی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ صوفی شعراء میں سب سے پہلے سی حرفی ملتان کے علاقہ کے مشہور صوفی شاعر سلطان باہو (۱۶۲۹ تا ۱۹۶۰ء) کی ملتی ہے۔

**دوہڑے** ـــ حضرت بابا فرید اور شاہ حسین جیسے صوفی شعراء نے اس صنف کو بطورِ خاص اپنایا ہے۔ اردو اور فارسی رباعی کی طرح دوہڑے میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ چاروں عموماً ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پنجابی میں دوہڑے سب سے پہلے حضرت فرید نے لکھے ہیں اور انھوں نے اس صنف کو ناتھ پنتھی جوگی کویوں سے لیا ہے۔

**شلوک** ـــ دوہڑے کی طرح شلوک بھی خالص ہندوستانی صنف ہے۔ شیخ فرید نے دوہڑوں کے ساتھ ساتھ شلوک بھی لکھے ہیں۔ ان کی روایت بھی ناتھ پنتھی جوگیوں سے مستعار لی گئی ہے۔ اپ بھرنش میں دوہے اور شلوک کی روایت بہت پرانی ہے۔ صوفیا نے اسی ورثہ سے استفادہ کیا ہے۔

**وار** ـــ یہ صنف انگریزی کے 'بیلے' کے مترادف ہے۔ وار دراصل طویل نظم کا نام ہے جس میں کئی بند ہوتے ہیں جن کو پوڑی کہتے ہیں۔ مسلمان صوفیا نے تو اس کا استعمال بہت کم کیا ہے البتہ رویتی شعراء نے اس صنف میں کافی لکھا ہے (پنجابی ادب میں نہایت ہی لکھی ہوئی 'نادرشاہ کی وار' کو خاص اہمیت حاصل ہے) سکھ شعراء نے اپنے گورؤں کی شان اور سکھ سورماؤں کی مدح میں بہت سی واریں لکھی ہیں۔ بھائی گورداس نے روحانی مضامین کے لئے اسی صنف کو منتخب کیا۔

**بارہ ماہ** ـ صوفی شعراء نے سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر مہینے میں اپنے محبوبِ حقیقی کی جدائی میں اپنی ذہنی اور جسمانی کیفیت بیان کی ہے اور آخر میں وصل کی آرزو کی ہے۔ تقریباً سبھی صوفی شعراء نے 'بارہ ماہے' لکھے ہیں۔ ان میں بلھے شاہ کا 'بارہ ماہ' ادبی اور فنی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ 'بارہ ماہ' انگریزی کے Shepherd Song کی طرز پر خالص ہندوستانی ہے جو سنسکرت کے 'شٹ رتو ورنن کاویہ' کی قدیمی روایت کی تقلید میں دیسی زبانوں میں رائج ہوئی۔

**اٹھوارہ** ـــ اس صنف میں شاعر ہفتہ کے سات دنوں میں اپنے محبوب کے انتظار میں اپنی کیفیت بیان کرتا ہے جب ساتویں دن اسے وصل نصیب نہیں ہوتا تو آٹھویں دن وہ اس کے وصل کے لئے دست بدعا ہوتا ہے تو اس کی مراد پوری ہوتی ہے۔ بلھے شاہ کا لکھا ہوا اٹھوارہ فطرت نگاری اور کیفیت بھرکے اظہار کے لئے بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ اٹھوارے بہت کم صوفی شعراء نے لکھے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے پنجابی ادب میں صوفیانہ شاعری کی ایک مستقل روایت ہے اور صوفیانہ شاعری پنجابی ادب کا عظیم ترین

سرمایہ ہے۔ پنجابی صوفی شعراء کے کلام سے متعارف ہونے کے لئے ہم تاریخی اعتبار سے پنجابی ادب کے مختلف ادوار کی ذیل میں اس عہد کے اہم اور مقبول صوفی شعراء کے کلام کا مختصر جائزہ لیں گے۔

ابتدائی دور : شیخ فریدالدین گنج شکر۔ شیخ ابراہیم فرید ثانی گورونانک لال : شاہ حسین۔ سلطان باہو

متوسط کال : بلھے شاہ۔ علی حیدر۔ وزیر

آدھنک کال (دورِ جدید) غلام جیلانی، میراں شاہ، خواجہ غلام فرید محمود بوٹا بگوتی۔ ہدایت اللہ۔ غلام حسین کیلانی

منموہن وغیرہ

## حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر (۱۱۷۳ء تا ۱۲۶۵ء)

پنجابی کے اوّلین شاعر حضرت فرید ۱۱۷۳ء میں مقام کوتھوال ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ گورو گرنتھ صاحب میں فرید کے نام سے جو ذاتی (کلام) شامل کی گئی ہے اس کے بارے میں تحقیقین میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اکثر اہل الرائے ادیبوں نے اس کی زبان و بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس میں گورو نانک کے ہم عصر حضرت بابا فرید کی بارھویں پشت میں حضرت ابراہیم فرید ثانی کا کلام بھی شامل ہے۔ مشہور تاریخ دان مسٹر میکالف نے بھی گورو گرنتھ میں شامل فرید کے کلام کو فرید ثانی کی تخلیق ہی ثابت کیا ہے۔ حضرت فرید گنج شکر و شیخ ابراہیم فرید۔ یہ دونوں نام ابھی تک تصفیہ طلب ہیں۔ بہرکیف پنجابی شاعری میں فرید کو وہی مقام حاصل ہے جو انگریزی میں شیکسپیئر کو، فارسی میں رودکی کو اور اردو میں ولی دکنی کو۔ آپ کا کلام عارفانہ رنگ میں ہے۔ فرید دراصل آدرش وادی اور ریاسیت پسند شاعر ہیں۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہی ان کا مقصود ہے۔ اسی لئے آپ کی شاعری میں جذبہ کم اور اپدیش زیادہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

فرید ایں جانیا دکھ مجھ کو، دکھ سبائی اے جگ
اُچے پرت کے ویکھیا، گھر گھر ایہا اگ

(فرید! میں نے سمجھا تھا کہ دکھ اور تکلیف میری ذات کو ہی ہے۔ لیکن یہ دکھ اور درد تو ساری دنیا میں مشترک ہے۔ اونچے برج پر چڑھ کے جو نظر غائر دیکھا تو مجھے ساری دنیا میں ہی آگ جلتی ہوئی نظر آئی)

فریدا کالے میڈے کپڑے کالا میڈا ویس
گنہ ہیں بھریا میں پھراں لوک کہن درویش

(فرید! میرے کپڑے کالے رنگ کے ہیں۔ میں ہمیشہ سیاہ لباس میں ہی ملبوس رہتا ہوں۔ میں گنہ گار ہوں اسی لئے مارا پھرتا ہوں اور لوگ مجھے درویش کہتے ہیں)

فریدا گلیئے چکڑ دور گھر نال پیارے مینہوں
چلاں تے بھے کھسی رہاں تاں تٹے مینہوں

(اے فرید! گلی میں کیچڑ ہے، گھر دور ہے اور پیارے سے دوستی ہے۔ چلتا ہوں تو کھسل جاتا ہے، نہ چلوں تو دوستی ٹوٹتی ہے)

باوجود ان کے عارفانہ اپدیشوں اور زہد و ریاضت کی تلقین کے حضرت فرید شرعی رسوم و شعائر کی پابندیوں سے باہر نہیں جا سکے۔ "راحت القلوب" اور "اسرار الاولیا" کے مطابق وہ خود بھی پکے نمازی اور شرعی آداب کے پابند تھے اس لئے وہ کہتے ہیں

فریدا بے نوا نکتیا ایہہ نہ بھلی ریت
کب ہی چل نہ آئیا پنجے وقت مسیت

(اے فرید! تو بے نماز ہے تو کتا ہے۔ اور یہ ریت اچھی نہیں۔ خدا کی بندگی میں نماز گزارنے کے لئے تو پانچوں وقت مسجد میں نہیں آتا)

اور

اُٹھ فریدا اجو ساج جمع نواج گزار
جو سر سائیں ناں نوے سو سر کپے اُتار

(اے فرید! اُٹھ کر وضو کر اور صبح کی نماز گزار۔ ورنہ جو سر اس محبوب حقیقی کے آگے نہیں جھکتا اسے کاٹ کر اتار پھینکنا چاہئے)

حضرت فرید کے کلام کے کچھ اور نمونے ڈاکٹر عبادتی نے اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ" میں دئے ہیں۔ جواہر فریدی میں آپ کے کشف و کرامات اور ریاضت سے متعلق پوری واقفیت ملتی ہے۔ آپ دہلی کے مشہور بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مرید تھے اور آپ نے آخری عمر ضلع منٹگمری کے قصبہ پاک پٹن میں گزاری اور وہیں ۱۲۶۵ء میں وفات پائی۔ پنجابی کے علاوہ آپ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔

## شاہ حسین (۱۵۳۸ - ۱۵۹۹ء)

اسلام کی شروع سے وہ تاریخ جو پر بغاوت کرنے والا پنجابی کا پہلا صوفی شاعر حسین ہے۔ حسین ۱۵۳۸ء میں لاہور کے ایک جلاہے کے گھر پیدا ہوا۔ دس برس کی عمر میں اس نے قرآن حفظ کر لیا۔ درگاہ حضرت داتا گنج بخش میں اس نے تصوف کی تعلیم پائی اور بارہ سال اسی طرح گزار دئے۔ 'خزینۃ الاصفیاء' میں درج ہے کہ دن میں وہ راوی کنارے جنگلوں میں گھومتا رہتا اور رات کو شیخ علی محذوم گنج بخش ہجویری کے مزار پر کھڑا تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتا۔ اسی مزار پر اسے ایک رات یہ احساس ہوا کہ اس نے رازِ الٰہی کو پا لیا ہے۔ اس کے بعد حسین نے معاشرے کے تمام اصول توڑ کر ناچ گانا شروع کر دیا۔ حسین سُرخ لباس پہنتا تھا اور داڑھی مونچھ منڈواتا تھا۔ دینی مسائل سے غفلت اور بے راہ روی نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دئے۔ مفتیوں اور قاضیوں نے اُسے کافر کہنا شروع کیا۔ حسین کی یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ اکبر کے عہد میں پیدا ہوا جسے صوفیوں سے محبت تھی۔ داراشکوہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر شاہ حسین کو جانتا تھا۔ حسین کے کشف و کرامات سے متعلق کئی افسانے مشہور ہیں۔ داراشکوہ نے 'شطیات' میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ شہزادہ سلیم جو بعد میں جہانگیر کے نام سے بادشاہ بنا اس کی فوق العادت روحانی طاقت اور تقدس کا بڑا قائل تھا۔

شاہ حسین کو صوفیاء کے فرقہ ملامتیہ کا امام سمجھا جاتا ہے۔ گوکل چند نارنگ نے اپنی تصنیف میں انھیں قادری لکھا ہے جو غلط ہے حسین کا تعارف کا شاید کوئی معتبر نسخہ ڈاکٹر لاجونتی کی نظر سے نہیں گزرا۔ ہندوؤں کے ایک لڑکے مادھو لعل کے ساتھ حسین کے واہمۂ عشق کی کہانی بھی ڈاکٹر لاجونتی نے بیان کی ہے جو بڑی حد تک غلط ہے۔ مادھو مسلمان تھا جو کسی وقت حسین کا مرید ہوا اور بعد میں شہور خلیفوں میں سے ایک مانا گیا۔ حسین نے ۱۵۹۹ء میں وفات پائی۔ اس کا مزار لاہور کے قریب باغبان پورہ میں ہے جہاں ہر سال بسنت کے دن میلا لگتا ہے۔

بہ حیثیت شاعر شاہ حسین اپنی کافیوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ شاہ حسین کی کافیاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ جذباتِ عشق اور بھرپور گیتا کے اظہار کے لئے شاہ حسین نے نہایت سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے تشبیہیں اور استعارے بالعموم گھریلو زندگی سے لئے ہیں۔ اس کی کافیوں میں شعریت کا عنصر غالب ہے۔ ایک مشہور کافی ملاحظہ ہو:

درد وچھوڑے دا حال نی میں کیہنوں آکھاں
سُولاں مار دوانی کیتی۔ برہوں پیا خیال
نی میں کیہنوں آکھاں ؟
جنگل جنگل پھراں ڈھونڈدی اجے نہ آیا ہینوں حال
نی میں کیہنوں آکھاں ؟
دُکھی دھوئیں شامیاں وانگ جاں پھولاں تاں لال
کہے حسین فقیر ربانا دیکھ نمانیاں دا حال
نی میں کیہنوں آکھاں ؟

(اپنے دردِ ہجر کا حال میں کسے سناؤں ؟ ان دکھوں نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ جدائی کے خیال نے مجھ پر تسلط جما لیا ہے۔ میں اپنا حال کسے سناؤں ؟
میں جنگل جنگل آوارہ پھرتی ہوں۔ میرا ہمنوال (محبوب) ابھی تک نہیں آیا۔ میں اپنا حال کسے سناؤں ؟
سلگتی ہوئی آگ سے سیاہ دھواں اُٹھ رہا ہے۔ جب بھی میں اس آگ کو کریدتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ شعلے سُرخ کوئلے نظر آتے ہیں۔
خدا کا فقیر حسین کہتا ہے، بے کسوں کے حال پر رحم کر۔ میں اپنا حال کسے سناؤں ؟)

شاہ حسین کی دنیا میں کتنا اضطراب ہے جس کی گونج اس کی شاعری میں سنائی دیتی ہے:

روندا ہوں نہ سوندا ای
جس تن درداں دی آہ، سوئی تن دوندا ای
کنڈیاری دی سیج اوپر
سُکھیا کوئی نال سوندا ای

(شب و روز گریہ و زاری کیا کرتا ہے۔ کبھی بھی اسے نیند نہیں آتی جس تن میں درد کی آہ بن ہو وہی تن گریہ و زاری کرتا ہے۔

کانوں کی اس سیج پر آج تک سکھ کی نیند کوئی نہیں سو سکا)

شاہ حسین خدا کو رانجھا اور خود کو رانجھے کی جوگن' ہم کر دیکھا تا ہے اپنے محبوب حقیقی کو بھی وہ اپنا سہاگ سمجھتا ہے

رانجھن میڈا بیں رانجھن دی
کھیڑیاں ونں کوڑی جھاک
لوگ جانیں ہیر کملی ہوئی
ہیرے دا ور چاک

(رانجھا میرا ہے اور میں رانجھے کی ہو چکی ہوں۔ ان کھیڑوں کو خواہ مخواہ کی جھوٹی امید لگی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہیر دیوانی ہے مگر ہیر کا سہاگ تو رانجھا چاک (چرواہا) ہی ہے)

مؤثر اور دل کش اسلوب اور موسیقی ہی شاہ حسین کی کافیوں کی جان ہے۔ محبوب کے فراق میں 'سوز۔ جوگن' کی اضطرابی کیفیت دیکھئے:

سجن بن راتاں ہوئیاں وڈیاں
مانس جھڑ جھڑ پنجر ہویا کن گنیاں بڑیاں
عشق چھپایا چھپدا ناہیں برہوں تناواں گڈیاں
رانجھا جوگی میں جوگیانی کیہہ کر چھڈیاں
کہے حسین فقیر سائیں دا تیرے دامن لگیاں

(ساجن کے فراق میں راتیں لمبی ہو گئی ہیں۔ جسم سوکھ کر ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ ہڈیاں کڑکڑاتی ہیں۔ عشق کو لاکھ چھپاؤ یہ نہیں چھپتا۔ فراق نے اپنی لمبا ہیں گاڑ دیں۔

رانجھا جوگی ہے اور میں اس کی جوگن۔ اس نے مجھے کیا کر دیا ہے خدا کا فقیر شاہ حسین کہتا ہے۔ اب تو میں نے تیرا دامن پکڑ لیا ہے)

## سلطان باہو (۹۰-۱۶۲۹ء)

شاہ حسین سے بھی زیادہ جارحیت آمیز انداز میں اسلامی شرع سے بغاوت کرنے والا صوفی شاعر سلطان باہو ہے جو ۱۶۲۹ء میں ضلع جھنگ کے مقام آواں میں پیدا ہوا۔ اس کا مزار شاہ جھوٹ کے قریب ہے۔ سلطان باہو کے آباؤ اجداد اپنے علاقے میں بہت با عزت سمجھے جاتے تھے۔ چناں چہ شاہ جہاں نے انھیں جاگیر عطا کی تھی۔ سلطان باہو کا پنجابی کلام جو تھوڑا بہت دست یاب ہے وہ اس کے سجادہ نشینوں کی وجہ سے ہے جو ارد گرد کی دیہاتی آبادی اور ان کے مریدوں کو اپنے پیسے متعارف رکھتے تھے۔ باہو کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ اس نے عربی فارسی میں کوئی ایک سو چالیس چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی شاعری میں باہی رواداری، مساوات، نفس کشی اور خود شناسی کی تلقین کی گئی ہے۔ اس نے محبوب حقیقی تک پہونچنے کے لئے مرشد کی اہمیت اور عقیدت پر خاص زور دیا ہے اور خود ایسی دنیا میں رہنے کی آرزو کی ہے جہاں 'میں' اور 'میرا' کے جھگڑے نہ ہوں۔

باہو کی سی حرفیوں کا ہر مصرعہ لفظ 'ہو' پر جو اللہ کے لئے استعمال ہوتا ہے ختم ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری میں یہ طرز سلطان باہو کی ایجاد ہے۔ باہو کا انداز بیان سادہ اور بے تکلف ہے۔ زبان جھنگ کے علاقے کی پنجابی ہے جو اپنی شیرینی اور لطافت کے لئے مشہور ہے۔ سلطان باہو کی ایک مقبول سی حرفی کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیے۔ ظاہری رسوم و شعائر سے گریز کرتے ہوئے اس نے محبوب حقیقی کو ہی منتہائے مقصود قرار دیا ہے۔

ن۔ نہ میں عالم، نہ میں فاضل، نہ متقی نہ قاضی ہُو
نہ دل میرا دوزخ منگے نہ شوق بہشتیں راضی ہُو
نہ میں تیہے روزے رکھے نہ میں پاک نمازی ہُو
ناہیں وصال اللہ دے باہُو دنیا کوڑی بازی ہُو

(نہ میں عالم ہوں نہ فاضل نہ متقی نہ قاضی میرا دل نہ دوزخ مانگتا ہے اور نہ شوقِ بہشت پر راضی ہے۔ نہ میں نے تیس روزے رکھے نہ میں پاک نمازی ہوں۔ اے باہو اللہ کے وصال کے بغیر دنیا جھوٹا کھیل ہے)

سلطان باہو کا پنجابی کلام بہت کم ملتا ہے جو حرف چند سی حرفیوں پر مشتمل ہے۔

## بلھے شاہ (۱۷۵۲-۱۶۸۰ء)

بلھے شاہ کا شمار متقدمین صوفی پنجابی کے سب سے بڑے صوفی شعراء میں ہوتا ہے۔ بلھے شاہ ۱۶۸۰ء میں قصور کے مقام پانڈوکی کے ایک سید گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مکمل کرنے کے بعد لاہور آ کر بلھے شاہ اپنے زمانے کے مشہور صوفی بزرگ حضرت عنایت قادری کے مرید ہو گئے۔ شاہ عنایت چھوٹی ذات کے فقیر ہونے کے باوجود بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ بلھے شاہ کو ان کا فیضِ تربیت

طا اور وہ اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود شاہ عنایت کا حد سے زیادہ گرویدہ و شیفتہ رہا۔ بلھے شاہ کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں وہ محبوب حقیقی کی تلاش میں رہتا ہے۔ دوسرا دور میں اسے کبھی کبھی محبوب حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے اور تیسرا دور وصال کا مظہر ہے۔ بلھے شاہ نے بڑے عام فہم اسلوب میں زندگی کی عمیق ترین حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔ یہ حقیقتیں چوں کہ اس کے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کے باعث آشکار ہوئی تھیں اس لئے ان میں تاثیر بھی ہے اور اظہار و بیان کی دلکشی بھی یہی وجہ ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے بلھے شاہ پنجاب کے دوسرے صوفی شعراء سے مختلف ہے۔ وہ پنجابی کردار کی اس مضبوط زندہ اور پاکیزہ نوعیت کا نمائندہ ہے جس میں جذباتیت کم اور حقیقت پسندی زیادہ ہے۔ بلھے شاہ کی کافیاں آج بھی بہت مقبول ہیں اور قوالیوں میں اکثر گائی جاتی ہیں۔

بلھے شاہ کی کافیاں عقیدہ وحدت الوجود پر کھلی شہادت ہیں۔ اس نے بلا امتیاز رنگ و نسل اور مذہب ہر فرد میں اسی ذاتِ ربانی کو جلوہ گر پایا۔ ایک کافی ملاحظہ ہو:

کہتے ملاں ہو بہندے ہو　　کہتے سنت فرض وسیندے ہو
کہتے رام دہائی دیندے ہو　　کہتے ماتھے تلک لگائی دا

ہن کی تینوں آپ چھپائی دا

بندر ابن میں گئو چیراوے　　لنکا چڑھ کے ناد بجاوے
کہتے دا بن حاجی آوے　　واہ واہ رنگ وٹائی دا

ہن کی تینوں آپ چھپائی دا

بلھے شاہ عرف کہتے کا حاجی یا طالب ہی اس محبوب حقیقی کے جلوے نہیں دیکھتا بلکہ اس کے فریب بندرابن میں گائیں چرانے والا (کرشن) اور لنکا میں ناد بجانے والا (رام) بھی اسی ذاتِ باری کا پرتو اور مظہر ہے۔ انھیں ہر رنگ میں اسی کے جلوے نظر آتے ہیں۔

سیو ہن ساجن میں پائیونی
ہر ہردے وچ سمائیونی

(اے میری سہیلیو! میں نے اب محبوب کو پا لیا ہے۔ اب وہ 'ہر' میرے دل میں سما گیا ہے)

بلھے شاہ کی کافیوں میں ادب کی چاشنی اور تاثیر کی فراوانی ہے۔ ان کے ابیات دل و دماغ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بلھے نے بڑی لمبی عمر پائی اور ۱۷۵۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔

## علی حیدر (۱۷۷۷ء - ۱۶۸۰ء)

علی حیدر ضلع ملتان کے قصبہ 'تاضیہ' میں ۱۶۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کے حالات تفصیلی طور پر نہیں ملتے۔ علی حیدر نے زیادہ تر سی حرفیاں لکھی ہیں جن کی زبان ملتانی ہے مگر اس میں عربی فارسی کے الفاظ یہ کثرت استعمال ہوئے ہیں جس سے اس کی علمیت صاف جھلکتی ہے اس کی سی حرفیوں کی زبان بڑی مرصع اور پُر تاثیر ہے۔ علی حیدر نے صرف عشق حقیقی کے نغمے ہی نہیں الاپے بلکہ اپنے گرد و پیش پر بھی اس کی گہری نظر رہی ہے۔ اس کے عہد میں نادر شاہ کے حملے نے اس کے ہم وطنوں کو جس طرح تہ تیغ کیا تھا اس سے وہ تڑپ اٹھا اور ہندوستانیوں کو جھنجھوڑتے ہوئے اس نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا:

ب　بکھ نہیں جو کھا مر کچھ شرم نہ ہندوستانیاں نوں
کیا حیا نہیں انہاں راجیاں نوں کجھ رہا نہیں تورانیاں نوں
بھیڑے بھر بھر وین خزانے پئے فارسیاں خراسانیاں نوں
داڑھیاں چا منائیاں آکھیو حیف ہے انہاں زنانیاں نوں

(کہیں زہر بھی نہیں کہ کھا کر مر جائیں۔ ان ہندوستانیوں کو شرم نہیں آتی نہ ان راجاؤں کو حیا ہے اور نہ تورانیوں کو کچھ عزت کا پاس ہے۔ کم بخت فارسیوں اور خراسانیوں کو بھر بھر کر خزانے دے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے تو داڑھیاں منڈوا رکھی ہیں۔ ان مردنما عورتوں پر حیف ہے)

تورانیوں کا اشارہ نظام الملک کی طرف ہے جو نادر شاہ سے مل گیا تھا اور فارسی و خراسانی نادر شاہ اور اس کی افواج ہیں۔

علی حیدر کی دیگر سی حرفیوں میں اسلامی رنگ زیادہ ہے۔

## ہاشم

ہاشم کے حالات زندگی سے متعلق بہت سی متضاد باتیں مشہور ہیں لیکن اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ وہ امرت سر کے ایک گاؤں جگدیو میں ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوا اور ستر سال کی عمر میں ۱۸۲۳ء میں انتقال کیا۔ ۱۴ سال کی عمر میں اس نے فارسی اور عربی پر عبور پا لیا۔ باپ کی

وفات کے بعد گاؤں والوں نے اس کی صوفیانہ صلاحیتوں کے پیشِ نظر اسے فکرِ معاش سے آزاد کر دیا۔ اس کی شاعری کی شہرت چھوٹی عمر ہی سے دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ ڈاکٹر موہن سنگھ لکھتے ہیں کہ جب میں وہ ہمارا جہ رنجیت سنگھ کا درباری شاعر ہو گیا تھا۔ ہاشم نے پنجابی، فارسی اور ہندی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی تصانیف کی فہرست اس طرح ہے:

فارسی: غزلیات و قصہ یوسف زلیخا

ہندی: گیان پرکاش اور چند دوہڑے

پنجابی: قصہ سوہنی مہینوال۔ قصہ سسی پنوں۔ قصہ شیریں فرہاد کی حرفی۔ دوہڑے۔ ہیر رانجھا۔ چند قصیدے۔ پارچ سی حرفیاں اور گورکھی رسم الخط میں علم الطب پر چند کتابیں۔

ہاشم کی تصنیفات میں سسی پنوں اور دوہڑے سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں جذبات کی شدت اور خلوص ہے۔ الفاظ کا انتخاب، مؤثر اسلوب اور بلند خیالی اس کی خصوصیات ہیں۔ ہاشم کی سسی کا ایک بند جس میں سسی کو جھلستی ہوئی ریت پر سرگرداں دکھایا گیا ہے ملاحظہ ہو:

چمکی آن دوپہراں ویلے گرمی گرم بہارے
تپدی وادی آسمانوں پنچھی آن اُتارے
آتشی وادریا کھلوتا مچھ مارو دریچ سارے
ہاشم پھر پچھا نہ مڑدی ہوں پنوں پنوں پکارے

(دوپہر کے وقت گرمی خوب چمکی۔ تپتی ہوئی ہوا جیسی جس نے آسمان کے پرندوں کو مار گرایا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے آگ کا دریا ہر سُو مار رہا ہو۔ ہاشم اسسی واپس نہ آئی اور اس کے ریشمی روپ سے پنوں پنوں کی آواز آ رہی ہے)

ہاشم کے بعد پنجابی ادب کے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں ویسے تو بہت سے صوفی شعراء ہوئے مگر ان کے کلام میں کوئی جدت نہ تھی۔ اس لئے وہ زیادہ مشہور نہ ہو سکے۔ ان میں چند نام یہ ہیں: غلام جیلانی لائل پوری، میراں شاہ جالندھری، غلام حسین، معصوم، کریم علی، محمد بوٹا بگسراتی، کریم بخش وغیرہ۔

البتہ ان صوفی شعراء میں دو اور نام قابلِ ذکر ہیں: میاں ہدایت اللہ اور خواجہ غلام فرید۔ دورِ جدید کی صوفیانہ شاعری میں ان دونوں شعراء کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔

## میاں ہدایت اللہ

انیسویں صدی کے وسط میں لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کے دوہڑوں کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے محلہ چابڑیاں میں پہلے درزی کا کام کرتا تھا۔ ہدایت اللہ نے زیادہ تر دوہڑے اور سہ حرفیاں لکھی ہیں۔ اس کا ایک بارہ ماہ بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ بارہ ماہ کا ایک بند ملاحظہ ہو:

ماگھ مہینے ہاہی باہنوں جو کچھ ہیں سنگ بیتی ہے
شالا دشمن نال نہ ہووے جیہی مجھوڑے کیتی ہے
کولہو وانگ جان تتی دی پیڑ عشق نے لیتی ہے
جانن اوہو گی ہدایت نہ ہر عشق جنہ پیتی ہے

(ماگھ کے مہینہ میں دوست کے فراق میں جو کچھ مجھ پر بیتی ہے خدا نہ کرے دشمن کے ساتھ وہ ہو جو فراق نے میرے ساتھ کیا۔ مجھ غریب کی جان کو کولھو کی طرح عشق نے پیس دی ہے۔ اے ہدایت! یہ بات وہی جانتے ہیں جنھوں نے عشق کا زہر پیا ہے)

۱۹۲۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔

## خواجہ غلام فرید

صوفیانہ شاعری کے دورِ جدید میں سب سے اہم شخصیت بلاشبہ بہاول پور کے خواجہ غلام فرید کی ہے۔ تصوف اور شاعری دونوں میں آپ کا مقام نہایت بلند ہے۔ خواجہ فرید ایک جیّد عالم کے ساتھ ساتھ ایک بلند مرتبت صوفی بھی تھے۔ آپ نے ملتانی زبان میں جو پنجابی کی ہی ایک شکل ہے کافیاں لکھی ہیں۔ آپ کی کافیاں طرزِ بیان اور حسنِ اسلوب کا بہترین نمونہ ہیں۔ معانی کے اعتبار سے ان میں بڑی جاذبیت اور گہرائی ہے۔ موصوف کو چونکہ خود بھی موسیقی میں بڑی دسترس تھی اس لئے اپنی کافیوں میں ترنم پیدا کرنے کے لئے آپ نے کافیوں میں کچھ نئے اختراعات بھی کی ہیں۔

خواجہ فرید کے عقائد کے مطابق صورت و اشکال کے تنوع، رنگا رنگی اور اختلاف کے پس پردہ وہی 'حسنِ واحد' کارفرما ہے جو نت نئے روپ بھرتا ہے۔ کبھی رانجھے، کبھی ہیر اور کبھی کھیڑوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی پربھا کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے تو کبھی ملاپ کی راہوں میں آملتا ہے۔ کہیں ھوالموجود ہے کہیں محل نشیں اور کہیں فریاد و جرس۔ یہ بوقلمونی اور کثرت صرف ایک فریبِ نظر ہے ورنہ یہ حسنِ مستور دیدۂ بینا کے لئے ہر صورت میں جلوہ گر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ان کی ایک کافی:

سب صورتاں وچ وسدا ڈھولا ماہی — دل ساڈی کھسدا ڈھولا ماہی
رنگ برنگی اس دے ڈیرے — آپے رانجھن آپے ہیر تے آپے کھیڑے
ٹک چھپ چھیدنہ ڈسدا ڈھولا ماہی
آپے بجرتے آپے میلا — آپے قیس تے آپے لیلیٰ
آپ آواز جرس دا ڈھولا ماہی

(ہر صورت میں محبوب رہتا ہے اور ہمارا دل چھین لیتا ہے۔ اس کے رنگ رنگ کے ٹھکانے ہیں۔ وہ خود ہی رانجھا ہے، خود ہیر اور خود ہی کھیڑا۔ محبوب چھپ چھپ کر اپنے بھید پوشیدہ رکھتا ہے خود ہی بجر ہے اور خود وصال۔ خود قیس ہے اور خود ہی لیلیٰ ہے۔ یہی محبوب خود آوازِ جرس بھی ہے)

خواجہ فرید کے بے شمار اشعار ساون اور بہار کے موضوع پر ہیں۔ لیکن اس طرح کہ خود خواجہ فرید فطرت کے اس دل کش منظر کا حصّہ ہے:

آپ کے کلام پر سندھی کا بھی کافی اثر ہے۔ پنجابی کافیاں اور دوہڑوں کے علاوہ آپ نے ہندی میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں جن میں ہندی بانی اور کرشن جی سے عقیدت کا جا بجا اظہار کیا ہے۔

پنجابی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا اثر اتنا گہرا ہے کہ بسا اوقات رومانی اور قصّہ گو شعراء بھی صوفیانہ رنگ میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اس لئے لوگ اغلب صوفیاء خیال کرتے ہیں اور ان کے رومانی قصّوں اور عشقیہ کلام میں تصوّف کی باریکیاں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ خود وارث شاہ اور ہیر کے ساتھ یہی سلوک ہوتا آیا ہے۔ وارث غالباً ایک حقیقت پسند رومانی شاعر ہے۔ صوفیا کے کسی گروہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ ملّاؤں اور پیروں فقیروں کا مذاق اڑاتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض جگہ صوفیانہ رنگ اس کے کلام میں جھلکتا ہے جس سے نقاد اور محقق دھوکا کھا جاتے ہیں۔ آج کی پنجابی شاعری میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے بھی صوفیانہ شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں طبع آزمائی کی ہے۔ پروفیسر موہن سنگھ ماہر اور پرجوت کور کی کئی نظموں پر صوفیانہ شاعری کا اثر صاف جھلکتا ہے جو بڑی حد تک تتبع کی دلیل ہے۔ ان کی کئی نظمیں بلھے شاہ اور شاہ حسین کی کافیوں کے ٹیپ کے مصرعوں کے طرز پر لکھی گئی ہیں تاہم تقسیمِ پنجاب نے صوفیانہ شاعری کی اس عظیم اور مستقل روایت کو معدوم کر دیا ہے۔

---

اس مضمون کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ The History of Punjabi Literature — ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ
۲۔ Punjabi Sufi Poets — ڈاکٹر لاجونتی رامانا کرشنا
۳۔ The Sufis, work in the early development of Urdu Language. — ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۴۔ صوفی مت۔ سادھنا اور ساہتیہ۔ ڈاکٹر رام پوجن تیواڑی
۵۔ اُتری بھارت کی سنت پرمپرا۔ پرشورام چترویدی
۶۔ بھارتیہ آریہ بھاشا اور ہندی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی
۷۔ حسنات العارفین (شطحیات) اردو ترجمہ مولوی محمد عمر خاں لاہور
۸۔ تحقیقاتِ چشتی۔ مولوی ذوار احمد چشتی لاہور
۹۔ باغِ اولیاء ہند۔ مولوی محمد دین لاہور
۱۰۔ پنجاب میں اردو۔ پروفیسر محمود شیرانی
۱۱۔ پنجابی ادب۔ محمد سرور کراچی
۱۲۔ کلیاتِ بلھے شاہ۔ شائع کردہ پنجابی اکادمی لاہور
۱۳۔ شاہ حسین۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ (امرتسر)

# موسیقار کی ڈائری کا ایک ورق

پیدا تو میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا جہاں دور دور تک موسیقی کا کوئی ذکر نہ تھا۔ لیکن مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو موسیقی سے قدرتی لگاؤ تھا۔ ہم دونوں مل کر سہگل کے ریکارڈ سُنا کرتے، اور اُن کے گانے کی نقل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی مجھ سے اچھا گا لیتا تھا اور لوگ اس کے گانے کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس سے مجھ میں رشک کا جذبہ پیدا ہوا اور پھر میں نے بڑے ذوق شوق سے اپنے طور پر گانے کی مشق شروع کر دی۔ اس وقت میری عمر دس گیارہ سال کی ہوگی۔ میری ماں گانے بجانے کے بہت خلاف تھیں مگر وہ یہ خیال کر کے چپ ہو جاتی تھیں کہ یہ محض بچوں کا کھیل ہے۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ میں موسیقی کو ہی اپنا پیشہ بنانے والا ہوں تو یقیناً وہ اس 'بچوں کے کھیل' کو کبھی گوارا نہ کرتیں۔

اس طرح میرا شوق روز بروز بڑھتا ہی گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری توجہ پڑھائی سے ہٹتی گئی اور جس بھائی کو دیکھ کر مجھے موسیقی کا شوق پیدا ہوا تھا وہ تو اس سے باز آ گئے اور اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہو کر ڈاکٹر بن گئے، مگر میں اسی کوچے میں سرگرداں رہا اور آج بھی ہوں۔

پنجاب میں ہری ولبھ کا میلہ بہت مشہور ہے جہاں دُور دُور سے موسیقار آ کر جمع ہوا کرتے تھے اور بچے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ پہلی ہی بار مجھے اس میلے میں جانے کا موقع ملا اور جب میں نے ان فن کاروں کو سُنا تو میری آتشِ شوق اور بھڑک اُٹھی۔ اس سے پہلے مجھے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ گانے کے کتنے ڈھنگ ہوتے ہیں اور یہ کتنے رنگوں میں گایا جاتا ہے۔ ہری ولبھ کے میلے میں مختلف فن کاروں کی گائیکی سن کر میری آنکھیں کھلیں اور موسیقی کی اس بے پناہ وسعت کی جھلک پا کر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور میں کچھ ایسا کھو گیا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل معلوم ہوا کہ ان میں سے کون سی گائیکی کو اپنانا چاہیئے۔

ہندوستانی موسیقی کی اس عجیب و غریب دنیا کو دیکھ کر میری آنکھیں تو خیرہ ہو ہی چکی تھیں، اس کے ساتھ ہی اس کے ایک مضمون نے پہلو نے مجھے بہت ہی متاثر کیا۔ مجھے پہلی بار ہندوستانی اتحاد کی حقیقت کا احساس ہوا۔ میں نے مسلمان استادوں کے ترتیب دئے ہوئے کرشن بھگتی کے 'خیال' اور دیوی کی استتی کو سنا۔ جن سے بھرپور جذبۂ عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے پہلوخاں نیلورخاں کے ترتیب دیئے ہوئے میاں کی ٹوڈی کے خیال کو مشہور موسیقار امان علی خاں کی زبان سے سننے کا موقع ملا جو برسوں میرے ورد زباں رہا اور جو آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے ؎

اے ری - اے، اب گن دے، ہے دیوی
دیا نی بھوانی سکل جگ مانی
ہمیشا سرہروں دیوی ورگا، شاردا سرسوتی
اب ور دے

اسی طرح بہت سے ہندو استادوں کو حسن اور حسین کے گن گاتے سنا۔ ایک ایسا ہی ٹوڈی کا چھوٹا خیال ہے:

اللہ جانے مولا جانے علی نبی پہ نور برسن لہو
جگ میں حسن حسین چین دو
بیچ تن پاک دوازدہ امام مجھ عاجز پہ کرم کرو
کرو پاک پروردگار سائیں

دلچسپ امتحانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بزرگانِ دین سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ ہندو اور مسلمان استادانِ فن کی بڑی دین ہے۔ اور موسیقی کے خزانے میں قابلِ رشک اضافہ۔ اس کی دو مثالیں میرے پیشِ نظر ہیں۔ ایک تو خواجہ میر درد کا ترتیب دیا ہوا ملتانی ٹوڈی کا خیال ہے۔ جسے میں نے اپنے استاد سے سیکھا تھا۔

جاکو من اللہ سنگ لاگ ہے جو پا جیے پا جیے پھر نہ دوجو
چلو دل مل دیکھیں کون ہے خواجہ میر درد
جن جھوک پیا بس مار رکھی سو کہاں سوت جاگ میں مرد
کجھو ہوت سوئے ورن کجھو ہوت جرد

اور ایک دوسری چیز پوربی کی ہتھائی ہے۔ جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں ہے:

یا محبوب الٰہی میر چشتی حضرت سلطان المشائخ
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء
کرتار آپ بنا یو نور سے معمور
صورت سجائے یا زر زری زر بخش

آج بھی ہندو موسیقار اسی عقیدت کے ساتھ یہ دونوں بڑے خیال گاتے ہیں۔ موسیقی کی دنیا میں ہندو اور مسلمانوں کی یہ ایک جیتی کوئی نئی چیز نہیں بلکہ سینکڑوں سال سے چلی آتی ہے۔ مثلاً بہت دنوں پہلے بنارس کے بھجنوں سے پورے شمالی ہندوستان کی فضا گونج اٹھتی تھی مشہور بھجن 'ہے گووند ہے گوپال اب کی بار پار کرو' کی آواز آج بھی سینکڑوں گھروں میں صبح صبح سنائی دیتی ہے۔ ایسے ہی امیر خسرو کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ موسیقی کو ان کی جو دین ہے وہ آج بھی اسی طرح قابلِ قدر سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت اس ہندو مسلم یک جہتی کا جو احساس تھا وہ آج بھی ایک زندہ حقیقت کی طرح قائم ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں مجھے پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر کو بھی سننے کا موقع ملا۔ اور ان سے میں بہت متاثر ہوا۔ چند سال تک میں نے پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر کی گائیکی کو اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن جب میں دلیپ چندر ویدی سے متعارف ہوا تو میں دوسرے رنگ میں آ گیا۔ بات یہ تھی کہ اس وقت تک میں اپنے لئے کوئی مخصوص راستہ متعین نہ کر پایا تھا۔

بہرحال اس وقت تک میرے گھر والوں کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ میں موسیقی کو ہی اپنی زندگی کا مقصد قرار دے چکا ہوں

اس وقت موسیقی کے مختلف راستے میرے سامنے تھے اور میں گویا چوراہے پر کھڑا تھا جہاں میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کون سا راستہ اختیار کروں۔

دلیپ چندر ویدی سے تو میں متعارف ہو ہی چکا تھا، ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ کئی مرتبہ میں نے سوامی ہرتک کا گانا گھنٹوں ان سے سنا۔ تان ان کی ایسی تھی جیسے ریت کی دیوار۔ ان کا پڑھت کا ڈھنگ بھی پیچیدہ تھا۔ اور ان کی گائیکی کے نظام کو سمجھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

اس وقت اور بھی بڑے بڑے استادانِ فن موجود تھے اور ان میں سے ہر استاد اپنے میدان میں یگانۂ روزگار تھا جیسے کرانہ کے استاد عبدالکریم خاں، مشتاق علی خاں، پیارے خاں، بے بے خاں، مبارک علی خاں، دلّی کے استاد عبدالکریم خاں، استاد رجب علی خاں اور استاد فیاض خاں وغیرہ۔ موسیقی سے دل چسپی رکھنے والا مشکل سے ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے استاد عبدالکریم خاں کو نہ سنا ہو۔ یہاں تک کہ جنوبی ہند کے لوگ بھی ان کے گانے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ — خاں صاحب نے بھی بہت سے کرناٹک راگوں کو ہندوستانی موسیقی کے سانچے میں ڈھالا اور مروج کیا۔ تاریخ میں یہ موقع بہت دنوں کے بعد آیا تھا کہ جنوبی اور شمالی ہند کے مابین موسیقی کے میدان میں یہ لین دین ہوا۔ استاد عبدالکریم خاں کا مخصوص

انداز یہ تھا کہ جیسے ٹیپ کے سا تھ پر جا کر ٹھہرتے تو ایک ایسی پُر سکون کیفیت طاری ہوتی جو کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

میں نے استاد عاشق علی خاں کے ڈھنگ کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔ عاشق علی خاں صاحب اتنے خوش گلو نہ تھے مگر ان کو اپنے مخصوص انداز میں فن پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ ایسی روکھی آواز اور اس پہ ایسا پُر تاثیر گانا، اس کی مثال ملنا مشکل ہی ہے۔

دلّی کے استاد عبدالکریم خاں ٹھمری گائیکی کے ماہر تھے۔ استھائی انترے کے اتار چڑھاؤ میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اسی طرح استاد رجب علی خاں بھی ایک مشہور موسیقار تھے۔ وہ اتنا تیار گانا گاتے تھے کبھی دھیمی لے میں گانا شروع نہ کرتے تھے بلکہ مدھیہ لے میں شروع ہو کر درت میں آجاتے تھے اور گھنٹوں لگاتار تانوں کی پھلجھاڑ ہوتی رہتی تھی۔

آگرہ گھرانے کو چار چاند لگانے والے استاد فیاض خاں کو کس نے نہ سنا ہوگا! انھوں نے موسیقی کو ایک ڈھنگ دیا جو اپنی اہلیت کو کھوئے بغیر عام لوگوں میں مقبول ہوا۔ 'ہولی دھمار' کو انھوں نے ایسی شکل دی، جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ قوم کے الاپ کا تو جواب ہی نہ تھا۔ ان کے طرز اداپر لوگ سر دُھنتے تھے۔ مثلاً ان کی گائی ہوئی بھیرو کی ٹھمری 'بناؤ بتیاں چلو کاہے کو جھوٹی' یا نٹ بہاگ کا خیال، 'بھجن بھجن پائل باجے' زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا۔

اس زمانے میں مجھے کراڑ کے استاد عبدالوحید خاں کو بھی لاہور میں سننے کا موقع ملا۔ اس وقت میں نے پوربی خیال 'یاد ایوں گم لگا' سنا۔ اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ پوربی راگنی کے 'کھُردرے رس' کی کیفیت طاری ہے۔ خان صاحب کے گانے کے انداز میں عبادت کا احساس ہوتا تھا جس سے یہ معلوم ہوا کہ موسیقی کا اعلیٰ مقصد یہی ہے۔ ان کے ٹھمرکے لگاؤ میں عبد کا عنصر پایا جاتا تھا۔ جس سے ایک قسم کا روحانی سکون حاصل ہوتا تھا۔

اس زمانے میں گو بہ عام طور سے کچھ دیر بعد ہی ٹیپ پر آجاتے تھے مگر استاد عبدالوحید خاں نے اس طرز کو بدل ڈالا اور گانے میں ایک عجیب و غریب ٹھہراؤ پیدا کیا۔ ان کے ہاں الاپ تانوں کی بجائے راگ کی بڑھت بول اور پھلاوے میں ہوتی تھی۔ اور ہر سُر کی جُداگانہ کیفیت پوری طرح عیاں ہو جاتی تھی۔

اب میں نے سمجھ لیا تھا کہ مجھے اپنے راستے کا نشان مل گیا ہے۔ میری تلاش پوری ہوئی اور میں چوبیس گھنٹے اسی فکر میں رہتا کہ میں کیسے ان کا شاگرد بنوں۔ استاد کے رویہ سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ انھیں اس بات کا ذرا بھی شوق نہیں کہ شاگردوں کی تعداد بڑھائی جائے پھر نہ تو میں کوئی پیشہ ور خاندانی گویّا تھا اور نہ میری عمر ہی ایسی تھی کہ استاد میری طرف متوجہ ہوتے۔ لیکن میں بھی اپنی دُھن کا پکا تھا پرچھائیں کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہنے لگا۔ جب کبھی استاد تعلیم دینے باہر نکلتے میں بھی ان کے ساتھ ہو لیتا اور وہ اپنے شاگردوں کو جو کچھ بتاتے اس کو بڑے دھیان سے سنتا۔ کئی مرتبہ میں نے گلیوں میں کھڑے ہو کر گھنٹوں تک ان کا گانا سنا۔ اس طرح آٹھ سال تک میں ان کے پیچھے پھرتا رہا۔ بالآخر ایک ضعیفہ کی امداد اور سفارشش سے میری مقصد برآری ہوئی۔ انھوں نے میرے حال پر رحم کھا کر استاد سے سفارش کی اور استاد نے مجھے اپنی شاگردی میں قبول کر لیا۔

اب تو میں چوبیس گھنٹے استاد کی خدمت میں رہنے لگا۔ ان کی چلیس بھرتا، پیر دباتا اور ان کے حکم سے ہی کھاتا پیتا اور سوتا تھا۔ تعلیم کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، استاد جب چاہتے تان پورہ ملاتے اور سبق شروع ہو جاتا۔ بعض اوقات وہ صبح تین بجے ہی اُٹھا دیتے اور تعلیم شروع ہو جاتی اور گھنٹوں یہ سلسلہ قائم رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مہینوں تعلیم کا موقع نہ آتا۔ برسوں استاد نے صرف یمن راگ کے پلٹے کروائے۔ اگر کہیں سُر اور تال میں ذرا بھی چوک ہوتی تو استاد جھلا اُٹھتے اور کبھی کبھی مار بھی بیٹھتے۔ لیکن ان کی اس مار میں محبت کا لطف تھا۔ انھیں پلٹوں سے مجھے سُر اور تال کا گیان ہوا اور اس مار کی وجہ سے میں کسی لائق بن پایا۔ باقاعدہ سبق کے علاوہ میں نے اور طرح سے بھی استاد سے بہت کچھ پایا۔ یعنی جب وہ دوسروں کو کچھ بتاتے یا خود گاتے یا دیگر موسیقاروں سے فن پر گفتگو کرتے تو میں ان کی سب باتوں کو دھیان سے سُن کر

اپنانے کی کوشش کرتا۔ کچھ راگ ایسے ہیں جو ان سے مجھے اسی طرح حاصل ہوئے اور کچھ راگ ایسے ہیں جیسے ملتانی جس کے سُر کی باریکیوں کو انھوں نے مجھے سینکڑوں بار سمجھایا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ سُر سے ڈرنے سے کام نہیں چلتا۔ پران ناتھ! تمھیں سُر کو پسیا کرنا چاہیئے تب ہی سُر لگے ہیں اتر سکتا ہے۔ ان کے محبوب راگوں میں ملتانی راگ شامل ہے۔ اور خواجہ میر درد کی چیز۔

جاکو من اللہ سنگ لاگ رہے ... الخ

بڑے شوق سے گھنٹوں گاتے تھے۔ بھیم پلاسی، پوریہ، درباری، پٹ دیپ، میاں کی توڑی اور درگا راگ بھی ان کو بہت پسند تھے۔ آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ استاد نے فرمایا کہ "اب تم تال سُر سمجھنے لگے ہو، بس اب ریاض میں لگ جاؤ۔"

خانصاحب بڑے سچے اور بے غرض انسان تھے۔ یادِ خدا سے کبھی غافل نہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ان کے پیر حضرت خواجہ سید علی اختر نیر عالم کا عرس تھا۔ ان کا یہ طریقہ تھا کہ ایسے موقعوں پر قوالوں کو دینے کے لئے نوٹوں کی گڈیاں بنا کر رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے پاس نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جب نوٹ ختم ہو گئے تو انھوں نے اپنی مسفریل اور شیروانی تک اتار کر قوالوں کو بخش دی۔ صبح ہوتے ہوتے یہ عالم ہوا کہ قوالوں نے اصرار کیا کہ استاد بھی کچھ سنائیں۔ چنانچہ بیزنگ دوں سکے پر استاد نے قوالوں کے یا بجے کے سُر دبا کر ویسی راگ چھیڑ دیا اور گھنٹوں بڑی عقیدت کے ساتھ گاتے رہے۔ بول یہ تھے:

"بھیرو ری علی احمد دین دیال" ایک سماں بندھ گیا۔ قوال اور دیگر سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی اور سب لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔

غرضیکہ برسوں استاد کی خدمت میں رہنے اور سخت ریاض کرنے کے بعد مجھے کچھ حاصل ہوا اور آج میں بھی گویوں کی صف میں شامل ہوں اور اپنے طور پر فن کی خدمت انجام دے رہا ہوں لیکن آج صورت حال بدل چکی ہے۔ اب استاد اور شاگرد کا وہ رشتہ باقی نہیں رہا، محض ایک پیشہ ہو کر رہ گیا ہے اور آپسی میں

نذرت کان پوری

# غزل

ہر سانس پہ اک تیر، یہ غم یاد رہے گا
دنیا ترا انداز ستم یاد رہے گا

یہ سجدۂ پُر شوق نہ بھولیں گے کبھی ہم
یہ نقشِ کفِ پائے صنم یاد رہے گا

تم آنکھ، دھڑکتا ہوا دل دیکھ رہا ہوں
تم کو مرا افسانۂ غم یاد رہے گا

اک سجدہ بصد شوق کیا ہم نے وہاں بھی
بُت خانہ یہ تعزیبِ حرم یاد رہے گا

کس کرب سے گزرا ہے محبت کا زمانہ
ہر حال میں یہ دورِ کرم یاد رہے گا

ہر حادثۂ دہر سے گزرا ہوں میں، لیکن
جو اس نے دیا ہے وہی غم یاد رہے گا

ٹوٹا سا دیا گھر میں نہیں ہے کہ جلا لیں
یہ وقت بھی اے شامِ الم یاد رہے گا

وہ روحانی تعلق نہیں رہا اور نہ آج کی زندگی میں کسی کے پاس اتنا وقت ہے کہ اس قدر ریاض کر سکے جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔ پہلے تو یہ صورت حال تھی کہ ہم ہر وقت استاد کے اشارے کے منتظر رہتے تھے اور ان کی خوشنودیٔ مزاج کے خواہاں۔ مگر آج استاد کو اپنے شاگردوں کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔

وجاہت علی سندیلوی

# فسادی چچا

ایک ایسے محلے میں جو شہر کی ہماہمی سے دور ایک کونے میں تھا اور جہاں صرف چھوٹی موٹی دکانوں کے علاوہ نہ کوئی بازار تھا، نہ سنیما، نہ کلب نہ کافی ہاؤس اور جہاں زیادہ تر بیوی، بچوں والے کلرک، مزدور اور تجارت پیشہ لوگ رہتے جنہیں سویرے سے شام تک اپنی روٹی کمانے ہی سے فرصت نہ ملتی۔ صرف ایک فسادی چچا کا دم تھا جو اپنی لگائی، بجھائی جھوٹ، فساد اور بات کا بتنگڑ بنا دینے سے آئے دن نت نئی "تو تو میں میں" جھگڑے اور ہنگامے کھڑے کر کے محلے والوں کی بھڑے ہوئے پانی جیسی زندگی میں کچھ بھری ہوئی موجیں بلکہ اکثر اچھے بھلے طوفان اٹھا دیا کرتے تھے۔

اپنی حد سے زیادہ غیر ذمہ دار حرکتوں کے باعث خود فسادی چچا کی شخصیت محلے والوں کے درمیان ایک شدید اخلاقی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ کچھ عاقبت اندیش اچھی شامتِ اعمال، وبالِ جان بلکہ قربِ قیامت کی نشانی سمجھ کر ان کا وجود پورے محلے کے لئے ایک انتہائی خطرناک علامت سمجھتے۔ برخلاف اس کے کچھ من چلے اچھی حرکت اور زندگی کا بھیلکے دار ایک دل چسپ تماشہ اور زندہ دلی کا سرچشمہ مانتے اور ان کی موجودگی کو محلے کی ذہنی صحت کے لئے اسی قدر لازمی قرار دیتے جیسے جسمانی صحت کے لئے گندے نالے یا کوڑے خانے کو۔ لیکن فسادی چچا اپنے فساد کے فن میں اس بلندی پر فائز تھے یا ستارۂ اقبال میں ایسے پہونچے ہوئے بزرگ تھے کہ وہ اپنے متعلق دوسروں کے خیالات اور پسند و ناپسند سے بالکل بے نیاز رہتے ہوئے جس میں چنگاری ڈالنے، پھانس کو بانس بنانے، لڑائی جھگڑا کروانے، بگڑی ہوئی اچھلوانے، سنے سنائے جھوٹ گھڑنے اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرانے اور عجیب و غریب شگوفے چھوڑنے سے کبھی باز نہیں آتے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ باوجود اس کے کہ لوگ ان سے اور ان کے حربوں سے مزہ سے زیادہ واقف ہو چکے تھے لیکن وہ ہر مرتبہ اپنی چابک دستی کا جوہر دکھاتے ہوئے اپنا نیا وار کچھ اس غیر متوقع انداز اور زاویے سے کرتے کہ وہ ہرگز خالی نہ جاتا اور چوکنے سے چوکنے انسان پر بھی جب وہ اپنا جال ڈالتے تو وہ محض ایک عبید زبوں بن کر رہ جاتا۔ لوگ تلملاتے، چیختے، اور چلاتے لیکن پھر دل ہی دل میں فسادی چچا کی فتی ہمارت اور بے وقوف بنانے کی صلاحیت کی جمہوراً داد بھی دیتے۔ سچ پوچھئے تو پورے محلے کی اجتماعی ذہانت کے وہ تنہا جواب تھے۔

پہلے وہ ابا الحسن چچا کہلاتے لیکن پھر کثرتِ استعمال سے وہ صرف بوچا رہ گئے تھے اور کچھ عرصہ لبھان کا یہ نام بھی کچھ غیر فروری ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ عام طور سے ان کی پیٹھ پیچھے لوگ انھیں فسادی چچا کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ خود بھی اس کو برا نہیں سمجھتے بلکہ ایک طرح سے اسے اپنی کارگزاریوں کا اعتراف سمجھ کر اپنے متعلق خود بھی استعمال کر لیا کرتے۔ اکثر جب مزہ سے میں ہوتے تو فرماتے "دیکھو بھتیجے! تمھارا فسادی چچا کہتا ہے....." یا "اپنے باپوں کی سُن چکے اب اپنے فسادی چچا کی بھی سنو!....."

وغیرہ وغیرہ۔

اپنی حرکات ناشائستہ سے وہ قریب قریب محلے کے سبھی لوگوں کو کبھی نہ کسی طریقے سے گھائل کر چکے تھے اور اسی کے باعث فسادی چچا نہیں معلوم کب کے محلے سے نکالے جا چکے تھے۔ مگر ان میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ دوسروں کو مرمٹانے کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لینے کے باوجود وہ خود کبھی کسی سے نہ لڑتے۔ اپنے متعلق دل جلوں کی کڑوی کسیلی باتیں بھی وہ مسکرا کر پی جاتے۔ اگر کبھی ان کی چوری پکڑی جاتی یعنی ان کی اٹھائی ہوئی کسی ہوائی کے متعلق فریقین ان کے پاس سامنا کرانے پہونچ جاتے تو وہ نادم ہونے کے بجائے ہنستے اور خوش ہوتے اور اپنی لاقانونی سے کچھ ایسی مضحکہ خیز صورت پیدا کرنے کی کوشش کرتے کہ جس میں غصہ اور گرمی بڑی حد تک غیر ضروری اور بے محل معلوم ہونے لگتی۔ وہ ایسے نازک موقعوں پر کچھ اس قسم کی باتیں کرتے۔ "ابی تمھارے فسادی چچا نے یہ کہہ دیا تو کیا قیامت آگئی؟" "تم کہتے ہو کہ میں نے یا تم نے یہ نہیں یہ کہا تھا تو خیر یوں ہی سہی۔" "تھوڑی دیر کے لئے تم ہی سچے بن جاؤ گے تو میرا کیا بگڑ جائے گا" "واہ میاں واہ! اتنی سی بات پر بھڑک اٹھے!" "خیر تمھارا جو جی چاہے میرے متعلق سمجھ لو۔ لیکن یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ میں نے کیسی باون تولے پاؤ رتی کی بات کہی تھی!" وغیرہ وغیرہ اور پھر گھما پھرا کر اپنی چرب زبانی سے کچھ ایسا رنگ جما دیتے کہ آخر میں پلا انھیں کے ہاتھ رہتا۔

ایک دفعہ مولوی کبن صاحب اور ان کی دکان کے سامنے دار رمیش پیہم لڑتے ہوئے فسادی چچا کے یہاں پہونچے۔ رمیش نے فخر اور افسوس سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیوں چچا میں نے کب مولوی صاحب کو بے ایمان اور دغاباز کہا تھا؟ یہ آپ سے ان کے کان کیسے بھر دئے؟"

چچا نے بڑے تحمل دل سے جواب دیا۔ "اچھا میاں! تو تم سچے اور میں جھوٹا اور میری سات پشتیں جھوٹی! اب تو خوش ہو کہ مسکراؤ۔"

اب کبن صاحب نے زبان بلکہ حلق کھولا "لیکن آپ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ رمیش بے ایمان اور دغاباز کہتا ہے؟"

چچا نے جاہی بیٹھتے ہوئے کہا "لیکن اب اگر یہ آپ کے منھ پر آپ کو بے ایمان اور دغاباز نہیں کہتا ہے تو میں کیا کروں؟"

رمیش چہکا۔ "اس کے کیا معنی چچا؟ کہ اب یہ آپ کے منھ پر آپ کو بے ایمان اور دغاباز نہیں کہتا؟ کیا میں نے ان کی غیبت میں ان کو بے ایمان اور دغاباز کہا تھا؟"

چچا نے چبا چبا کر تے ہوئے کہا۔ "تم نے کہا یا نہیں کہا۔ اس کا فیصلہ تو ابھی ہو سکتا ہے لیکن چونکہ تم دونوں ہی کا خیر خواہ ہوں اور تمھارے باہمی تعلقات اور زیادہ خراب نہیں کرنا چاہتا ہوں لہذا میں سارا الزام اپنے ہی سر لینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

رمیش نے جھلا کر کہا۔ "چچا آپ ہم دونوں کی فکر نہ کیجئے اور نہ گھما پھرا کر بات کرنے سے کوئی فائدہ ہے۔ فیصلہ ہو سکتا ہے تو ہو جائے۔"

کبن صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں صاحب فیصلہ یا صفائی جو کچھ ہونا ہو ابھی ہو جانا چاہئے۔ میرے لئے یہ دغابازی اور بے ایمانی کا اتہام ناقابل برداشت ہے۔"

چچا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ایک دم سے رمیش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ "اچھا تو تم کہہ دو کہ کبن صاحب دغاباز اور بے ایمان نہیں ہیں!"

رمیش "میں کیوں کہہ دوں" چچا نے قہقہہ لگایا تو رمیش چڑ گیا۔ "میں تو یہاں صرف اس صفائی کے لئے آیا ہوں کہ میں نے آپ سے کبھی نہیں کہا کہ یہ دغاباز اور بے ایمان ہیں۔"

چچا بھی تیز ہو گئے۔ "تو کہہ دو نہ کہ یہ دغاباز اور بے ایمان نہیں ہیں۔ بات ابھی صاف ہو جائے۔ صرف ذرا سی زبان ہلا کر تم سچے بن جاؤ اور میں جھوٹا۔"

رمیش۔ "الٹے پھر کی باتیں تو میں جانتا نہیں۔ آپ صرف یہ بتائیے کہ میں نے آپ سے کبھی صاحب کا تذکرہ کب اور کیسے کیا تھا؟"

چچا بولے۔ "کبن صاحب کو تمھارا جو جی چاہے تم سمجھو لیکن وہ ایسے نا سمجھ بھی نہیں ہیں کہ وہ تمھارے اس قسم کے داؤ پیچ کو بھی نہ سمجھیں۔"

رمیش تعجب سے "داؤ پیچ کیا؟"

چچا۔ "جب تم یہ کہنے کو تیار نہیں کہ وہ راست باز اور ایمان

رہیں تو تمہارا ان کے متعلق جو خیال ہے وہ صاف ہی ہو چکا - اب تم زبان سے کہو یا نہ کہو!"

کبن صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ رمیش بولا "کیسا مطلب آپ کا؟ اچھا میں کہے دیتا ہوں ...."

چچا نے بات کاٹ کر کہا - "ہاں ہاں کہو کہ تمہیں دکان کے حسابات پر پورا پورا بھروسہ ہے اور کبن صاحب نے اپنے بھتیجے اور خالو کے نام جو ادھار کھاتہ کھول رکھا ہے اس کو تم بالکل صحیح سمجھتے ہو؟"

رمیش - "دیکھئے اس وقت حساب اور کھاتوں کی باتیں جانے دیجئے۔ وہ ہمارا نجی معاملہ ہے اور اس کے متعلق مجھے کبن صاحب سے یقیناً کچھ اختلاف ہے۔"

کبن صاحب - "آپ کا اختلاف آپ کی غلط فہمی ہے۔ مجھے اگر ٹھیک سے حساب لکھنا نہیں آتا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ میں دغا باز اور بے ایمان ہوں۔ رہا میرے بھتیجے اور خالو کے ادھار کے کھاتے تو وہ کوئی آپ کی چوری سے تو کھولے نہیں گئے اور کیا خود آپ نے ادھار کے کوئی ایک کھاتے نہیں کھلوائے؟"

رمیش - "حساب ٹھیک نہیں ہے تو پھر ہر چیز مشکوک ہے اور میں نے کوئی اپنے رشتہ داروں کو تو ادھار کے کھاتے کھلوا نہیں دئے۔"

چنگاری بھڑک اٹھی تھی اور چچا نے ہوا دے کر اسے جلد ہی شعلہ بنا دیا۔ رمیش اور کبن صاحب جب کوئی دو تھپڑ ایک دوسرے کو دغا باز، بے ایمان اور نہیں معلوم کیا کیا کہے چکے تو موقع محل دیکھ کر چچا نے ایک نیا پلٹا کھایا۔ مسکراتے ہوئے کبن صاحب سے بولے۔ "ہاں صاحب میں نے کب آپ سے کہا تھا کہ رمیش آپ کو دغا باز اور بے ایمان کہتا ہے؟"

کبن صاحب نے اس مخل قش میں اس غیر متوقع سوال کا جواب تفصیل سے دینا غیر ضروری سمجھا "ابھی وہ تو میرے منہ پر مجھے دغا باز اور بے ایمان کہہ رہا ہے اور میں ابھی اس کی دغا بازی اور بے ایمانی کھول کر رکھ دوں تو آپ عش عش کر جائیں۔"

اور پھر جب رمیش اور کبن صاحب کے درمیان زبانی توتو میں میں کے بعد آستینیں چڑھنے لگیں تو انتہائی شفقت بزرگانہ سے فسادی چچا بیچ میں آگئے۔ کافی جھگڑے کے بعد جب دونوں تھک ہار چکے تو اپنے گھر سے رخصت کرتے وقت انھوں نے آخری شگوفہ یہ چھوڑا۔ "ایک ساتھ نہیں نبھتی ہے تو اپنا اپنا کاروبار الگ کر لو اور پھر شریف آدمی کیا کبھی ناتھا پائی پر اتر آتے ہیں؟ معاملہ نہیں سلجھتا ہے تو آخر یہ عدالتیں کس مرض کی دوا ہیں!"

دوسرے دن کبن صاحب اور رمیش کی دکان کا بٹوارہ ہو گیا اور دونوں ہی نے چند دنوں بعد ایک دوسرے پر دعوے کر دئے۔ فسادی چچا کا نام دونوں ہی کی فہرست گواہان میں جلی حرفوں میں سب سے اوپر درج تھا۔

خود میں نے فسادی چچا کی شہرت تو کافی سنی تھی اور ایک دو مرتبہ کچھ لوگوں نے ان کی جھلک بھی دکھائی تھی لیکن ان سے شرف نیاز حاصل کرنے کا کوئی باقاعدہ موقع ابھی تک ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ان کے حلے میں بلکہ ان کے مکان کے بہت قریب مجھے کرائے پر ایک کمرہ ملا تو کئی دوستوں، واقف کاروں اور خیر خواہوں نے سمجھایا کہ اگر مجھے اپنی عزت آبرو پیاری ہے اور بیچ بازار میں اپنی ٹوپی اچھلوانا منظور نہیں ہے تو فسادی چچا کے ہمسایہ بننے کے خیال فاسد سے باز آؤں کسی نے ان کی شان میں یہ قصیدہ پڑھا کہ وہ پرلے درجے کے جھوٹے اور فسادی ہیں اور دوستوں اور عزیزوں کے درمیان جوتا چپلواد ینے میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ کسی نے باقاعدہ اعداد و شمار پیش کئے کہ انھوں نے اتنی لگی بھری شادیاں چھڑوا دیں، اتنی فوجداریاں کروا دیں اور اتنے جھوٹے مقدمے چلوا دئے۔ کسی نے ان کا یہ کارنامہ بیان کیا کہ انھوں نے ایک بارات کا فی مدت کے بعد واپس کروا دی تھی۔ کسی نے اسی کے جوڑ کا یہ جوابی حملہ بیان کیا کہ انھوں نے ایک صاحب کے یہاں بن بلائی بارات بھجوا دی تھی۔ کسی نے ان کے متعلق یہ داستان سنائی کہ انھوں نے ایک مرنے والے کے یہاں جنازہ اٹھنے سے پیشتر ایک وارنٹ کو جیل اور دوسرے کو اسپتال پہنچوا دیا تھا۔ ایک صاحب نے ان کا یہ لطیفہ بیان کیا کہ ایک جلسے میں انھوں نے ایک خود ساختہ

خلیۂ صدارت پھیر اکر تقسیم کروا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے صدر جلسہ کو اصلی خلیۂ صدارت لے کر اور جوتے چھوڑ کر جلسے سے بھاگنا اور کئی دن تک روپوش رہنا پڑا تھا وغیرہ وغیرہ۔

فسادی چچا کے متعلق یہ باتیں اور اس قسم کی دوسری بہت سی باتیں سن کر میں ان سے دور بھاگنے کی بجائے اُن سے ملنے کے لئے اور بھی بے چین ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے خیال میں انتہائی عقلمندی اور اپنے کان بھرنے والوں کے خیال میں انتہائی بے وقوفی سے یہ جواب دیا۔ "جی! جب کوئی شخص اتنا بڑا اور مشہور جھوٹا۔ فسادی اور فتنہ پرداز واقع ہوا ہے تو اس کے جھانسے میں آ جانا ویسا ہی ہے جیسے کسی بچی کے ایسے کھیے سے ٹکرا جانا کہ جس پر خطرہ ہے کا سائن بورڈ خود سے چمک رہا ہو۔" میرے اس جواب پر میرے ایک بہت بڑے ہمدرد بزرگ اُچھلے۔ "ابی آپ فسادی چچا کو سمجھتے کیا ہیں؟ حرفوں کے بنے ہیں حرفوں کے! شیطان کے کان بھی وہ آئے استرے سے کاٹتے ہیں۔ ابی ان کی زد میں آیا ہوا شکار بھاگنا تو درکنار منہ کھول کر پانی بھی نہیں مانگتا۔" میں نے اس جواب کو اپنے لئے ایک چیلنج تصور کرتے ہوئے عرض کیا، تو پھر ایسے بزرگ سے کچھ نہ سیکھنا یقیناً کفرانِ نعمت ہوگا۔ حضرت غالب اسی قسم کے ایک مسئلہ کا حل بہت پہلے پیش کر چکے ہیں ؎

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

مجھے اپنے نئے کمرے میں آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ اچانک سامنے دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک پستہ قد، وجیہہ، گورے چٹے اور سفید داڑھی بزرگ اندر جھانکتے نظر آئے۔ صورت شکل اور وضع قطع سے وہ ایسے معلوم ہوتے کہ ع

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

انھوں نے فرمایا "سلام علیکم! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

میں فوراً پہچان گیا کہ وہ فسادی چچا ہیں۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے عرض کیا "وعلیکم السلام! آیئے آیئے مزید تشریف لائیے" اور لپک کر ان سے مصافحہ کرتے ہوئے انھیں کمرے کی سب سے آرام دہ کرسی پر بٹھایا۔ اس وقت وہ خلوص اور محبت کا ایک حسین مرقع دکھائی پڑتے تھے۔

بڑی شفقت سے میرا نام، پتہ اور خاندانی حالات پوچھتے رہے اور اس کے بعد کچھ بے تکلفی سے بولے۔ "کیوں میاں، آپ کو اپنا کمرہ پسند آیا؟"

میں نے عرض کیا۔ "جی ہاں کمرہ تو غنیمت ہے لیکن غالباً یہ جنت کے کسی انجینئر کے مشورے سے تعمیر کیا گیا ہے کیوں کہ جنت ہی کی طرح اس سے متعلق کسی باورچی خانے، پائخانے یا غسل خانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہے؟" میرے اس جملے سے بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔ "ہاں نہ یہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا بیٹا۔ مطلب یہ ہے کہ نہ یہ کسی مکان سے متعلق ہے اور نہ کوئی دوسرا جزو اس سے متعلق! اچھا تو پھر کام کیسے چلتا ہے۔ میرے لائق جو خدمت ہو میں اس کے لئے بسر و چشم حاضر ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کھانا ہوٹل میں کھاتا ہوں اس کا خمیازہ محلے کے سب سے بڑے جمہوری ادارے یعنی ہم پولس میں بھگتتا ہوں۔ غسل خانے کی یاد تازہ کرنے کے لئے سامنے نشک پر نلی لگا ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا ہے کہ سڑک پر بیٹھ کر اپنے برہنہ جسم کی نمائش کروں لہٰذا بصورتِ موجود صرف غسل خانے کی تکلیف ہے۔"

فسادی چچا پہلے کچھ ہنسے۔ پھر سنجیدگی سے کہنے لگے:

"میاں یہ تکلیف تو چٹکی بجاتے دور ہو سکتی ہے۔ دیکھئے آپ کے کمرے سے بالکل ملا ہوا دکھن جانب جو سُرخ مکان ہے اس میں مرزا بہادر بیگ رہتے ہیں۔ اکیلے آدمی ہیں لہٰذا ان کے لئے مکان کا صرف اوپری حصہ کافی ہے اور اسی کو بند کر کے وہ سویرے کام پر چلے جاتے ہیں۔ نیچے کا حصہ میں غسل خانہ اور فلش ہے وہ محلے والوں ہی کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ آس پاس کے لوگوں میں جس کا جی چاہتا ہے اُسے استعمال کرتا ہے بلکہ آپ سے قبل اس کمرے میں جو طالب علم رہتا تھا۔ وہ بھی نہانے

دھونے کے لئے وہیں جاتا۔ آپ بے تکلف وہاں چلے جائیے گا اور احتیاطاً آج یا کل ہی میں آپ کو مرزا صاحب سے متعارف بھی کرا دوں گا۔"

میں نے مزید احتیاط کے لئے پوچھا "تو مجھے بروٹے میں جا کر کسی کو پکارنا ہوگا؟" بولے: "پکاریئے گا کس کو؟ دن میں وہاں رہتا ہی کون ہے البتہ خدانخواستہ رات میں کوئی ضرورت پیش آ جائے تو مرزا صاحب کو پکار لیجئے گا۔"

اس کے بعد فسادی چچا دنیا کی بے ثباتی، موجودہ زمانے کے اخلاق کی پستی اور دوستوں کی طوطا چشمی کا تذکرہ کرتے رہے اور کافی دیر کے بعد جب وہ جانے کے لئے اٹھے تو مجھے ایک حد تک یقین ہو چکا تھا کہ وہ ایک شریف اور بامروت انسان ہیں اور محض غلط فہمی کی بنا پر انھیں فسادی چچا کا لقب دے کر مطعون اور بدنام کر دیا گیا ہے۔ وہ ظالم نہیں بلکہ مظلوم نظر آئے۔

دوسرے روز نو بجے سویرے جب ایک پُرلطف غسل کی امید میں میں گنگناتا ہوا اپنے کمرے کے دکھن جانب شرخ مکان میں بروٹھا لے کر کے اندر داخل ہوا تو ——— فضا میں دو یا شاید تین وحشت زدہ نسوانی چیخیں گونجیں اور پھر میں نے اپنے آپ کو بھاگتا اور اپنے تعاقب میں ایک نٹ باز قسم کے انسان کو جو بہادر بیگ ہی معلوم ہوتے تھے۔ دوڑتا ہوا پایا۔ بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں پہونچ کر میں نے دروازہ بند کر لیا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر اور اپنے مشورہ فعل سے آدھے محلے کو جمع کر کے بہادر بیگ نے میری شان میں جو فی البدیہہ اور بے ساختہ قصیدہ پڑھا وہ یقیناً اپنی نوعیت سے فردوسی کے شاہنامے قسم کی کوئی چیز تھی۔ آخر میں جب ضبط کا یارا نہ رہا تو میں نے سلاخوں والی کھڑکی کا پٹ کھول کر عرض کیا: "آپ کے اس قصیدے کا ثواب یقیناً فسادی چچا کی روح پُرفتور کو پہنچے گا۔ میں بالکل بے قصور ہوں" اور میں نے فسادی چچا کی دعوتِ غسل کا پورا قصہ سنا دیا۔ چچا کا نام آتے ہی پورا مجمع قہقہے لگانے لگا حتیٰ کہ بہادر بیگ سے بھی ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور خدا خدا کر کے بات آئی گئی ہوئی۔ واقعی چچا نے پانی کے بجائے مجھے خود اپنے خون سے نہانے کا انتظام کر دیا تھا! مجھے خفت اور شرمندگی سے زیادہ خود اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کہ میں چچا کے ایسے صاف اور کھلے ہوئے چرکے میں کیسے آ گیا؟

دوسرے روز چچا ملے۔ پہلے تو دل کھول کر خوب ہنسے۔ پھر معذرت خواہ لہجے میں بولے "تمہارے سر کی قسم مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مرزا بہادر بیگ کا بچہ پرسوں ہی اپنے وطن سے ایک چھوڑ دو دو بیویاں لے آیا ہے۔ خیر تم چلو تو غسل کے لئے میرے گھر آ سکتے ہو۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر اس دوسری دعوت کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور چلا آیا۔

اس واقعہ کے بعد بھی چچا میرے یہاں آتے رہے لیکن مجھے پہلے سے بھی زیادہ محتاط دیکھ کر خود بھی اپنی باتوں میں بڑی احتیاط برتنے لگے تھے۔ اس کے باوجود ہم دونوں کے درمیان ایک غائر قسم کا خلوص اور لگاؤ تھا مگر اس کو نہ میں ظاہر کرتا اور نہ وہ۔

ایک روز جبکہ میں دفتر جا رہا تھا مجھے راستے میں ملے اور بڑے رقت انگیز لہجے میں بولے: "میاں آج میری کمر ٹوٹ گئی۔ میرا بچپن کا دوست اور ساتھی رام ناتھ چل بسا۔ بے چارہ پندرہ دن سے فالج میں مبتلا تھا۔ ہاتھ پیر کیا زبان تک ہلانے سے معذور تھا۔ خیر اس کی تو مٹی سدھار تھ ہو گئی لیکن میرا لطفِ زندگی ختم ہو گیا۔ عجب باغ و بہار طبیعت پائی تھی اس نے۔"

میں نے انھیں دلاسہ دیتے ہوئے کچھ ملے کے تو فرمایا: "آؤ کھڑے کھڑے تم بھی نہ ہو لو اس کے گھر۔ محلے کا معاملہ ہے۔ ایک دوسرے کے غم میں ضرور شریک ہونا چاہئے۔"

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کروں؟ ساتھ ہی رام ناتھ کا مکان تھا فسادی کے ساتھ میں بھی اندر چلا گیا۔ لیکن دل میں اس یقین کے ساتھ کہ رام ناتھ جی مرے ہر گز نہ ہوں گے مگر وہاں پہونچ کر فسادی چچا

کا قول صحیح پایا۔ رام ناتھ جی واقعی مرگئے تھے اور ان کی نعش کو شمشان بھومی لے جانے کی تیاری کی جارہی ہیں۔ چچا ارتھی کے سرہانے کھڑے نادر قطار رو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد سسکیاں لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "اچھا تم جاؤ۔ دفتر کو دیر ہورہی ہوگی۔ البتہ راستے میں چوراہے پر ڈکشت جی کی دکان پر اور آگے بڑھ کر تانک چند وکیل کو ضرور اطلاع کرتے جانا کہ رام ناتھ آج سویرے گزر گئے اور ارتھی بس اٹھنے ہی والی ہے۔"

میں نے چچا کی ہدایت کے بموجب ڈکشت جی اور تانک چند وکیل کو اطلاع دے دی اور جب ان دونوں نے پوچھا کہ آخر مرحوم ہوا کیا تھے تو انتہائی سادہ لوحی سے کہہ دیا۔ پندرہ دن سے فالج میں مبتلا تھے شام کو دفتر سے آیا تو کچھ دیر بعد ایک صاحب تشریف لائے اور پوچھا۔ "کیوں صاحب رام ناتھ جی کیا فالج سے مرے تھے؟" میرے منہ سے بے اختیارانہ نکلا "جی ہاں!" کچھ دیر میں چونکا تو وہ صاحب جا چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک اور دوسرے بزرگ تشریف لائے۔ "آپ کو معلوم ہے کہ رام ناتھ کا کس مرض میں دیہانت ہوا ہے؟" میں نے انتہائی معاندانہ لہجے سے جواب دیا "جی نہیں۔" اور یہ جواب سنتے ہی وہ بزرگ بھی تیزی سے روانہ ہوگئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے اور رام ناتھ کی موت کا سبب ہر کوئی مجھ سے کیوں پوچھ رہا ہے؟

دوسرے روز سویرے دس بارہ آدمیوں کا ایک غول انتہائی بے تکلفی سے میرے چھوٹے سے کمرے میں گھس آیا۔ ایک گول مٹول شخص نے کڑک کر مجھ سے پوچھا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ رام ناتھ کس مرض میں مرے؟" میں نے گریہ سی ہنستے ہوئے کہا "جی نہیں!" اور فوراً غول کے ایک گروہ سے آوازیں بلند ہوئیں "جھوٹا!" "مکار!" "توڑ لیا گیا ہے یہ کم بخت۔" دوسرے گروہ نے فوراً لقمہ دیا۔ "سچ کہہ رہا ہے یہ۔ بہتان تراشا گیا تھا اس پر" "یہ رام ناتھ کو کیسے جانے؟"

پہلے گروہ کے ایک بڑی بڑی مونچھوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے سورما نے آستین چڑھاتے ہوئے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "آپ نے ڈکشت جی اور تانک چند سے یہ نہیں کہا تھا کہ رام ناتھ فالج میں مرے ہیں؟"

میں نے پسینہ پونچھتے اور ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں کہا تھا!" اور پھر دونوں گروہوں سے عجیب عجیب آوازوں کا ایک شور و غوغا اٹھا۔

"دیکھا آپ نے؟" "گھڑی میں کچھ اور گھڑی میں کچھ۔ اسی بے ایمان کا کیا اعتبار؟" "سچ کبھی چھپتا نہیں۔" "جعلی وصیت نامہ پر شاید اس کے بھی دستخط ہیں۔" "وصیت نامہ جعلی کیسے ہوسکتا ہے؟" "جعلی نہیں تو کیا اصلی ہے؟" وغیرہ وغیرہ اور پھر کسی صاحب نے کسی صاحب کے ایک چپت جمادی جو بارشوں کا پہلا قطرہ ثابت ہوا یعنی اس کے بعد ایک گروہ دوسرے گروہ پر پل پڑا اور باقاعدہ مار پیٹ شروع ہوگئی۔ میری میز، کرسیاں، کتابیں، گلدستیاں، جوتے گلاس، صراحی، غیب وغیرہ اسلحات جنگ کا کام دے رہے تھے!

اس سے قبل تو میں نے سڑک سے بھاگ کر اپنے کمرے میں پناہ لی تھی لیکن اس موقع پر اپنے کمرے سے بھاگ کر مجھے سڑک پر پناہ لینی پڑی!

چچا دی کا یہ سب سے تیز اور آخری حملہ تھا کیونکہ اپنے کمرے کے میدان جنگ بنائے جانے کے چند ہی گھنٹوں بعد اپنے ساتھی کے باقیات صالحات کو لے کر میں ایسا بھاگا کہ محلے والے اب تک میرا پتا پوچھتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے کمرے میں جو دو گروہ لڑ رہے تھے وہ رام ناتھ کے ورثا اور ان کے متعلقین تھے اور ان کے درمیان مرحوم کا ایک وصیت نامہ بنائے مخاصمت تھا اور اس کے اصلی یا جعلی ہونے کا بہت کچھ دار و مدار مرحوم کا مرض الموت تھا۔

---

آپ کا
تار

آپ بھارت کی
کسی بھی زبان
میں تار
بھیج سکتے ہیں۔



ہاں،
پیغام کا
دیو ناگری رسم الخط
میں لکھا ہونا
ضروری ہے۔

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے۔

محکمۂ ڈاک و تار۔



# بچت کی بچت جلدی کی جلدی

کام بہت ضروری ہو، جبھی تو آپ تار بھیجتے ہیں۔
تو پھر پتہ پورا لکھوں نہیں لکھتے۔ پتہ پورا لکھنے سے تار یقیناً جلدی پہنچتا ہے۔
پتہ ادھورا ہونے کی صورت میں تار کے دیر سے پہنچنے کا امکان ہے۔
آپ پیسے بھی بچا سکتے ہیں اور تار بھی جلدی پہنچ سکتا ہے۔ وہ کیسے؟ تار ٹیلی فون نمبر کے پتہ پر دیجئے۔
پتہ یوں لکھئے مثلاً "برنچ زرائن ٹی۔ ایف۔ ۳۱۶۷۰ دلی" جیسے ہی تار دلی پہنچے گا اُسے ٹیلی فون پر پڑھ کر سنا دیا جائے گا۔

پتہ میں "ٹی۔ ایف۔ ۳۱۶۷۰" کو ایک ہی لفظ مان کر دام لگائے جاتے ہیں۔

## ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمۂ ڈاک و تار



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

Regd. No. D-509

# آج کل

ویشاکھ شک سمت ۱۸۸۴
مئی سنہ ۱۹۶۲ء

۶۰ نئے پیسے



# ہماری اُردو کتابیں



| نام کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ہندوستانی ڈراما | صفدر آہ | ۳ روپے ۷۵ نئے پیسے |
| جوالا مکھی (ناول) | انشت گوپال شیوڑے | ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت | ٹیبر منڈی | ۲ روپے |
| ابوالکلام آزاد | ــــــ | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ڈاکٹر سی۔ وی رمن | ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ــــــ | ایک روپیہ |
| بھارت کی لوک کہانیاں | ــــــ | ایک روپیہ |
| دیش بیس کی لوک کہانیاں | ــــــ | ۷۵ نئے پیسے |
| کلکی یا تہذیب کا مستقبل | ڈاکٹر ایس۔ رادھاکرشنن | ۷۵ نئے پیسے |
| بھارت آج اور کل | جواہر لال نہرو | ۷۵ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | ــــــ | ۷۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | ــــــ | ۴۰ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | ــــــ | ۳۵ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں نمبر ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷ | ــــــ | فی نمبر ۱۰ نئے پیسے |

ــــــ پیکنگ اور ڈاک خرچ کے لئے کم سے کم ملنے پیسے یا قیمت کا ۱۲½ فیصدی مزید بھیجئے۔ ــــــ
رجسٹری کے لئے ۵۰ نئے پیسے اس کے علاوہ ہوں گے۔ ۲۵ روپے یا اس سے زائد کی کتابیں منگوانے پر محصول ڈاک معاف

ــــــ کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کیجئے ــــــ

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

# آج کل دہلی

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| غزل | آثر لکھنوی | ۳ |
| وحشی شاہجہانپوری | عبدالمجید حیرت | ۴ |
| ہم | جاوید بششٹ | ۱۵ |
| حیدرآباد | رشیدالدین | ۱۷ |
| فن کاروں کا کورس | شمس ملہانی | ۲۷ |
| گرو | رضیہ سجاد ظہیر | ۲۹ |
| سگریٹ | صدیق نظر | ۳۳ |
| ذاکر صاحب سے ایک ملاقات | سمت پکاش شوق | ۳۴ |
| شہر حیدرآباد | وقار خلیل | ۳۷ |
| نئی تاریخی پہلی منزل | شانتی سروپ بھٹناگر | ۳۸ |
| یہ سینے یہ پیڑا پن | حسن عسکری کاظمی | ۴۱ |
| نئی کتابیں | خ - م<br>م - ش | ۴۳ |


سرورق ۱ - ٹیسو کے پھول

رسالے کی پشت پر :- چیلی نیر بھیرن کو


ولیشاکھ شک ۱۸۸۴

مئی ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ — نمبر ۱۰



مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

مرتب و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند



سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۲ پنس



مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد مجیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | سری نگر |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| عبدالقادر سروری | حیدرآباد |

یو - ایس - موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

جی - این - ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)

جی نجنا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)

(مدیر مسئول)

اسسٹنٹ ایڈیٹر ... مظفر شہ



پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

# ملاحظات

الجیریا اور فرانس کے مابین جنگ بندی کے معاہدے پر دنیا بھر میں خوشی کا اظہار کیا گیا۔ بالآخر فرانس الجیریائی مظلوموں کی قربانیوں کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گیا۔ الجیریا کی جنگ آزادی تاریخ میں بے مثال ہے۔ یہ جنگ ۷ سال تک جاری رہی جس میں دس لاکھ باشندے شہید ہوئے ان کے علاوہ نہ جانے کتنے مردوں اور عورتوں نے آزادیٔ وطن کی خاطر کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں۔ یہ سب مجاہدین آزادی دنیا کے آزادی پسند اور انسانیت دوست لوگوں کے خراج عقیدت کے مستحق ہیں۔ الجیریا کی فتح دراصل انسانی اقدار کی ایک زبردست فتح ہے اور اس کے لئے الجیریا کے عوام نے جو قیمت ادا کی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مستقل قریب میں الجیریا مکمل آزادی حاصل کر کے آزاد قوموں کے شانہ بشانہ تعمیر و ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکے گا۔ اور دنیا کے امن و سلامتی کے تحفظ کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

ملک کے حالیہ عام انتخابات اور گزشتہ دو انتخابات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت اور بالغ رائے دہندگی کے اصول کی جڑیں مضبوط ہو گئی ہیں اور عوام اس طریقۂ حکومت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال ہندوستان کی جمہوری روایات کے لئے خوش آئند اور مستقبل کی کامیابیوں کا پیش خیمہ ہے۔ چیف الیکشن کمشنر کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق پہلے عام انتخاب میں پورے ملک میں ۱۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ووٹر تھے اور دوسرے انتخاب میں یہ تعداد ۱۹ کروڑ ۲۰ لاکھ ہو گئی اور تیسرے انتخاب میں یہ تعداد ۲۱ کروڑ ہو گئی اور اس اعتبار سے حق رائے دہندگی استعمال کرنے والوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا یعنی بالترتیب ۸ کروڑ ۲۲ لاکھ، ۱۰ کروڑ ۱۰ لاکھ اور ۱۲ کروڑ۔

ترقی پذیر معیشت میں ایک طرف عوام کی آمدنی بڑھتی ہے تو دوسری طرف حکومت کے اخراجات میں بھی اضافہ ہوتا ہے جن کو ٹیکس بڑھا کر پورا کرتی ہے۔ یہی صورت حال ہمارے ملک میں بھی ہے جہاں منصوبہ بندی کے ذریعہ ہم ترقی کے منازل طے کرتے جا رہے ہیں۔ مرکزی وزیر مالیات نے پچھلی لوک سبھا میں نئے سال کا بجٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ۶۳-۱۹۶۲ء میں مرکز اور ریاستوں کا منصوبوں کا خرچ ۱۴ ارب ۶۴ کروڑ روپیہ کر دیا جائے گا۔ اور اگر اس میں سال رواں کا ۱۲ ارب ۴۱ کروڑ روپیہ شامل کر دیا جائے تو تیسرے پنج سالہ منصوبے کے ابتدائی دو برسوں میں منصوبے کی ۷۵ ارب روپیہ کی کل رقم میں سے دو تہائی خرچ کی جائے گی۔ سرمایہ کے اخراجات اور قرضوں کے لین دین میں ایک ارب ۲۶ کروڑ روپے کا خسارہ رہ جاتا ہے جبکہ آئندہ سال کی عام آمدنی اور خرچ میں ۶۳ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے کا خسارہ دکھایا گیا ہے۔ اس خسارے کا ایک خاصا حصہ ٹیکسوں سے پورا کیا جائے گا۔

# غزل

چشمِ ساقی سے تھا شغلِ مے پرستی ایک دن
رہنِ بادہ تھا نہ اپنا ذوقِ مستی ایک دن

وائے بر انساں کہ ہے اپنے تلوّن کا شکار
حق پرستی ایک دن باطل پرستی ایک دن

حسرتیں بے خانماں ہیں آرزوئیں بے دیار
کیا خبر تھی یوں لٹے گی دل کی بستی ایک دن

ہوشیار اے بادۂ نخوت کے ماتے ہوشیار
چھین لے تجھ سے نہ تجھکو خود پرستی ایک دن

اب خموشی ہے ہماری ان کے طعنوں کا جواب
یا دباں کرتی تھی کیا کیا پیش دستی ایک دن

گھما گھمی اب کہاں ویران ہے سنسان ہے
یا ترے جلوے تھے اور اس دل کی بستی ایک دن

نیازیوں سے دیں لے اے بندۂ حرص و ہوا
خاک پھنوائے نہ تجھ سے زر پرستی ایک دن

باندھے تھے منصوبے کیا کیا یہ کسے معلوم تھا
زیست سستی ہوگی اور اس درجہ سستی ایک دن

موت کہتے ہیں جسے اک رُخ ہے وہ بھی زیست کا
رختِ ہستی خود کرے گی چاک ہستی ایک دن

سر بلندی پر اترتا کیوں ہے مانندِ حباب
تجھکو لے ڈوبے نہ تیری چیرہ دستی ایک دن

اب نہ وہ شیوہ بیانی ہے نہ وہ دم خم اثرؔ
یا زباں تلوار کے مانند تھی ایک دن

# وحشی شاہجہانپوری

پورا نام سید ظہور احمد — آیئے کچھ دیر مرحوم کی یاد تازہ کریں مرحوم تقسیم سے کچھ پہلے تک سلامت تھے۔ دہلی میں قیام تھا۔ ان کا ایک گھر دہلی میں بھی تھا۔ وہیں انتقال فرمایا اور وہیں حضرت نظام الدین میں دفن ہوئے — پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

افسوس ہے کہ پندرہ بیس برس میں ہمارے ادبی، شعری حلقے بھی مرحوم کو بھلا بیٹھے، حالانکہ مرحوم اپنے دور میں ایک ممتاز ادیب تھے، شاعر تھے، صحافی تھے اور ایک رسالہ "عجلتی" کے ایڈیٹر۔

راقم الحروف نے وحشی صاحب کو پہلے پہل خواجہ محمد شفیع کی اردو مجلس میں دیکھا تھا۔ مرحوم اس مجلس میں یا عموم خواجہ حسن نظامی مرحوم کے ساتھ آتے تھے اور بعض اوقات خواجہ صاحب کے ساتھ جناب واحدی دہلوی بھی شریک مجلس ہوتے تھے۔ راقم آج مرحوم وحشی صاحب کو اس سے بھی یاد کر رہا ہے کہ وہ اس پر کرم فرماتے تھے کبھی راستے میں مل جاتے تو ٹھہر جاتے، محبت سے باتیں کرتے اور پھر آگے بڑھتے۔ افسوس کہ راقم حقیر نے ان سے کچھ استفادہ نہ کیا۔ حالانکہ وہ بڑے ذی علم تھے پوشش مند تھے اور ادب و شعر کے مبصر سے۔ ہاں لوگ اس طبیعت کے۔

حضرت وحشی نے نثر و نظم میں بہت کچھ لکھا ہوگا لیکن غالباً ان کی کوئی ادبی کاوش ان کی حیات کے بعد منظر عام پر نہیں آئی۔ ایک کتاب مرحوم نے اپنی حیات میں چھپوا دی تھی اور وہ ہے "طلسم افکار" — چھپی سائز، صفحات ۲۵۴ — مرحوم کی خود نوشت سرگذشت، مگر بیشتر اپنی ہی شاعری پر مشتمل — یہ کتاب اس لحاظ سے اور بھی قابل قدر ہے کہ مرحوم کی واحد تصنیف ہے اور اب نایاب۔ کتاب "تجلی پرنٹنگ ورکس" میں چھپی ہے۔ سال اشاعت کتاب پر درج نہیں۔ شاید "تجلی پرنٹنگ ورکس" مرحوم ہی کی ملکیت تھا۔ اور اگر تھا تو خدا ہی جانے کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ بہرحال آیئے "طلسم افکار" کو کہیں کہیں سے اس نظر سے دیکھیں کہ مرحوم کا دنیا اس وقت کیا تھی اور وہ خود شعر و ادب میں کس فکر و نظر کے مالک تھے۔

مرحوم کی اولاد کا حال معلوم نہیں۔ سنا ہے ان کے ایک صاحبزادے اپنے وطن ہی میں مقیم ہیں اور معاشی اعتبار سے عرائض نویس۔ افسوس ہے کہ ہمارا معاشرہ اگر کسی صاحب فکر و فن پر توجہ بھی کرتا ہے تو صرف اسی تک، اس سے آگے الا ماشاء اللہ اس طرح نہ سلام کہتے، غنچے ہوں گے کہ بن کھلے مرجھا گئے۔

سنئے چند — "اگر پوچھئے تو اردو شاعری کا میدان بہت محدود ہے۔ کیسی ہی محنت سے شعر کہا جائے آخر یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مضمون اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے — اگر آپ ان اوراق کو التفات خاص کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے تو کم از کم طرز ادا میں عام روش سے علیحدگی ضرور محسوس فرمائیں گے — میرے خیال میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک دیوان یا مجموعہ کلام

اس طرح ترتیب دیا گیا ہے :

آغا زخیال ـــــ میں شاعری کا مدعی نہیں۔ شاعری کو اپنے لئے ذریعۂ افتخار نہیں سمجھتا۔ نہ کسی کا شاگرد ہوں، نہ کسی کا استاد۔ نہ غالب و مومن کا پیرو ہوں نہ آتش و ناسخ سے وابستگی رکھتا ہوں۔ بہت سی باتیں ہیں جنھیں میں نے اپنی غزل میں ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً

(۱) میں واسوخت کا مخالف ہوں، اگرچہ میرا ہم تخلص وحشی یزدی واسوخت لکھنے میں کمال رکھتا تھا۔ واسوخت کے معنی ہیں محبوب سے ناراض ہونا۔ میں اس خیال کو شانِ محبت اور شانِ وفا کے منافی سمجھتا ہوں

(۲) میں رقابت کے مضمون کو لذت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ یہ تخیل بازاری انتہائی بے حسی اور پست ہمتی پر مبنی ہے۔

(۳) میں غزل میں بازاری آدمیوں کی بول چال اور بھلائی زبان پسند نہیں کرتا ـــ میری مخاطب کوئی تربیت یافتہ جھٹیارن نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی ہستی ہوتی ہے جو فصیح و بلیغ اور لطیف سے لطیف اشاروں کو سمجھتی ہے۔

(۴) صنائع و بدائع اور الفاظِ متاسبہ کا استعمال گناہِ کبیرہ سمجھتا ہوں۔ الا یہ کہ کوئی معمولی سی خوبی بے ارادہ قلم سے نکل جائے

(۵) دو یتیں اشعار کے سوا میں نے اپنی غزلوں میں ایسا کوئی شعر نہیں کہا جو مجازی تکلفات تک محدود ہو۔

(۶) حرفِ علت، بالخصوص الف کا گرنا سخت ناپسند ہے۔

(۷) "بغضۃ" اور "گرشتہ" کی بجائے "بغضی" کو الف کی طرح کھینچ کر پڑھنا ناپسند ہے۔

(۸) میری غزل میں جانِ من، میری جان، معشوقۂ دل ربا، مرتفع جیسے رکیک الفاظ نہیں ہیں۔

(۹) میرے یہاں تو سے فی صدی اشعار جذبات، کیفیات واردات، مشاہدات و محسوسات پر مبنی ہیں۔

(۱۰) میں نے تخیل کے لئے زبان اور بیان کے تخیل کو برباد نہیں کیا ہے۔

(۱۱) میرا شعر فکری توجہ کا طالب ہے۔ اس لئے کہ بہت سوچ سمجھ کر کہا گیا ہے۔

مجھے ذیل کے اشعار خصوصیت کے ساتھ پسند ہیں (یہاں یہ سب اشعار نہیں، ان کا بھی انتخاب ہے ـ جرت)

ناکردہ ہم نے جرم کا اقرار کر لیا
جب کچھ علاج رخصتِ بے جا نہ ہو سکا

پہلے تو نہ تھی اتنی وحشت مجھے زنداں میں
پھر فصلِ بہار آئی شاید چمنستاں میں

اس وعدے کا مطلب کیا سمجھوں آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
ابرو پہ ہے بل، ہونٹوں پہ ہنسی، انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

(اس دور کی مشہور غزل ـ جرت)

وہ آئیں گے مگر کوئی یہ اے تاخیر پرور دست
لیکن مریضِ غم کو امیدِ سحر کہاں

تم سے نگہِ شرم کو روکا نہیں جاتا
کہتی ہے ہر بزم یہ افسانہ کسی کا

اب اے ہجومِ شوق، تری کیا علاج ہے
پوچھا ہے اس نے حال دلِ بے قرار کا

احساس کچھ ہوا نہ ترے لطفِ عام کو
حالانکہ بن گیا کوئی مورت سوال کی

کیا انتظارِ مرگ میں بیٹھا ہوں مطمئن
گویا اب اور کوئی مصیبت نہیں رہی

شاید غبارِ غم کا یہی اک علاج ہے
کچھ دیر رو لے، تو طبیعت سنبھل گئی

اب دل کو یہ مسرت موہوم بھی نہیں
وہ دن کہاں گئے کہ ترا انتظار تھا

مجھ سے حالِ دلِ محروم نہ پوچھ پوچھ
تجھے جو بات ہے معلوم نہ پوچھ

اس سے کیا کہیے، یارب، گلۂ جور و ناز
جو ابھی اپنی اداؤں سے خبردار نہیں

اس طرف کچھ سوچ کر روٹھے ہیں یار
اس طرف ہمیارِ غم کچھ کہہ کے غافل ہو گیا

دل کی حرکت بند ہے بے نور ہیں آنکھیں
آثار یہ کہتے ہیں کہ اب وقتِ سحر ہے

چشم ساقی تک رہی ہر چیز اپنے حال پر
پھر نہ شیشے پر وہ عالم تھا نہ پیمانے میں تھا

بناوٹ سے بھی ملنا ہو تو میں سچا سمجھتا ہوں
مرے دل کو نہیں آتا کسی سے بدگماں ہونا...؟؟

کچھ ذاتی اشارات ـــــ "بچپن سات سال کی عمر میں میرا اردو خط بہت اچھا تھا - میری عمر دس سال کی تھی کہ میرے پدر بزرگوار غفرانمآب نے رحلت فرمائی ـــ ۱۹۰۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوا حضرت غلام محمد فاروقی عباسی مدرس اعلیٰ تھے، مولانا اردو فارسی عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ـــ عروض سے فارغ ہونے کے بعد عربی میں میں نے بھی شعر کہنا شروع کیا - مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم ندوۃ العلماء میں نائب ناظم تھے ـــ مولوی تجمل حسین فیض آباد، مولوی کرم الدین دانا ہمسرامی، مولوی مصطفےٰ حسین مصطفےٰ بلیاوی، مولوی محمد احمد تلہری، مولوی احمد حسین لکھنوی، سب اردو کے شاعر ـــ ایک دفعہ شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس سرہٗ کے خلف الرشید حضرت مولانا احمد میاں چندلمحے کے لئے دارالعلوم آئے تو میں نے ان کے خیر مقدم میں عربی میں فی البدیہہ ایک مختصر سا قصیدہ کہہ ڈالا - اس پر مولانا نے مجھے بہت سا انعام بھیجا - حضرت استاذ اردو مضامین کا ترجمہ عربی میں کراتے تھے۔ میں ہمیشہ نثر کا ترجمہ نثر اور نظم کا ترجمہ نظم میں کرتا تھا۔

عمر کا تیرھواں اور مدرسے میں داخلے کا دوسرا سال تھا کہ مدرسے میں ایک محفل میلاد منعقد ہوئی - مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے عربی میں ایک نعتیہ قصیدہ لکھنے کا حکم دیا اور میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔

جب تک دارالعلوم میں رہا، اردو میں دس بیس اشعار کے سوا کچھ نہیں کہا - اس زمانے میں میری فارسی نثر و نظم تھی، تاہم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی مرحوم کے ایک جلسے میں شرکت پر میں نے فارسی میں ایک مسدس پڑھا۔

شاہ سلیمان پھلواروی کے مشورے پر جب میں مولوی فاضل کے لئے لاہور پہنچا تو وہاں کی فضا نے عربی شاعری ختم کرادی البتہ قاضی ظفر الحسن، مولوی عبداللہ ٹونکی اور مولانا اصغر علی روحی سے جب ملاقات ہوتی تو عربی شعر و سخن کا چرچا رہتا۔

میں نے حضرت مفتی حکیم سلیم اللہ صاحب مرحوم سے، جو بڑے فاضل اور لائق طبیب تھے، طب پڑھی ہے۔

ایک دفعہ مولانا روحی کے سامنے تخلص کا ذکر آگیا۔ مولانا نے غور و فکر کے بعد وحشی تخلص تجویز کیا ـــ اس تخلص میں بھی کوئی خرابی نہیں۔ غزلیت اور شعریت بہت کافی ہے۔ سودا، داغ، صفیر مشاہیر شعراء کے تخلص میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے

ایک دفعہ انجمن اشاعت القرآن کے ایک عظیم الشان جلسے میں تو میری نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کا ایک ایک شعر دس دس بار پڑھوایا گیا اور ہر بار ڈائس پر روپے کی بارش ہوتی تھی۔

اسی اثنا میں فخر پنجاب شیخ عبدالقادر صاحب سے، جو اس وقت انگریزی اخبار "ٹریبیون" اور رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر اور اسلامیہ کالج کے پروفیسر تھے، ملاقات ہوئی اور میں آٹھویں دسویں ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔

ایک دفعہ میری ایک نظم پر شیخ صاحب نے کہا: "دیکھو ہندوستان میں اس وقت کم از کم دس ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ شاعر موجود ہیں لیکن اگر نثر لکھنا نہ سیکھ جائیں تو سو بھی مشکل سے نکلیں گے۔ پس تم شاعر بننے کی کوشش نہ کرو، نثر نگار بنو" ـــ اس واقعے کے بعد میں نے دو سال کے عرصے میں تقریباً دس ہزار صفحے نثر کے لکھے لیکن شعر ایک بھی نہیں کہا - اب میرے جذبات دل جوانی کی منزل میں تھے۔

۱۹۰۶ء میں کچھ دنوں کا پیشور رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر حکیم الطاف احمد آزاد انصاری سے ملاقات ہوئی - وہ ایسی گرمجوشی سے ملے کہ روزانہ ملاقات ہونے لگی - حکیم صاحب اردو کے بہترین شاعر ہیں - حکیم صاحب کی شاعری میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو دلی سے لے کر آج تک کسی شاعر کے کلام میں نہیں اور وہ یہ ہے کہ ان کا ہر شعر ترکیب نحوی میں بالکل نثر کے مطابق ہے۔

۱۹۰۷ء میں زیادہ تر گورکھپور میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ابتدا میں جناب مولوی سید سبحان اللہ صاحب رئیس اعظم گورکھپور کے

دولت کدے پر صوف اعلیٰ درجے کے معنی فہم ہیں۔ اساتذہ کے ہزارہا اشعار یاد۔ یہیں گورکھپور میں مولوی احسان اللہ صاحب عتبا سی وکیل، منشی قطب الدین صاحب اور مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل کے یہاں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔

۱۹۰۸ء میں کان پور میں چند ماہ شیخ علیم اللہ صاحب سودا گر مرحوم کے یہاں قیام رہا۔ ان دنوں متعدد اخلاقی نظمیں کہیں۔ اس زمانے میں میرے خیالات عجیب تھے۔ دل دنیا سے بیزار، موت کو یاد کرتا اور تنہائی میں روتا۔"

**ایک لطیفہ** ——— "سامنے بالاخانے میں ایک خوبصورت جوان عورت اکثر میری طرف متوجہ رہتی۔ میں نے اس پر ایک نظم کہی، ایک شعر یہ

نفس دیتا ہے مجھے ترغیب تو کہتا ہوں میں
پیجیے کس طرح یہ شربت کا زہر آلود جام

پھر کان پور سے بمبئی چلا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں شاہجہان پور میں مستقل قیام اختیار کیا۔ شاہجہان پور میں شاعری کا بہت چرچا ہے۔ میں نے بھی نظمیں لکھیں اور پبلک جلسوں میں پڑھیں۔ لیکن میں شعراء میں روشناس تھا۔ ایک دفعہ میں نے ایک صاحب کی غزل بنادی اور وہ مشاعرے میں بہت کامیاب رہی۔ ایک بار اور ایسا ہی ہوا اور اس طرح خواص تک میرا چرچا پہنچا۔ اب وہاں ایک مشاعرہ ہوا منشی حسین احمد صاحب امان کا مکان تھا۔ شریکِ مجلس، سید حسین احمد بیتاب، حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ، منشی صدیق حسن اسدؔ، منشی افضال حسن رسواؔ اور منشی احمد حسین، شوقؔ۔ اس مشاعرے میں میری غزل بھی پسند کی گئی۔

اسدؔ صاحب نے بہترین دماغ پایا ہے۔ فارسی میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ فنِ شعر سے واقف ہیں اور بڑے پائے کے شاعر۔ ماسٹر سید منظور علی، فن تعلیم کے ماہر اور بہت اچھے شاعر۔ رسواؔ مرحوم میرے کلام کے بڑے قدرداں تھے اور بڑے خوش گلو۔

ایک مشاعرے میں مجھے شاہجہان پور کی ایک قابل شاعرہ خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا ——— تخلص حجاب، بینائی سے محروم جلال لکھنوی کی شاگرد، کلام بے تکلف اور برجستہ۔ ایسی ذہین، طباع شاعرہ خاتون اس زمانے میں نہ دیکھی، نہ سنی۔

لکھنؤ کی ایک صحبت جس میں حضرت عزیز لکھنوی، محشر، سراج عزم، حسرت شریک تھے۔ حضرتِ محشر نے میرا یہ مطلع بار بار سہ پڑھوایا

محنت یہ رائگاں نہ ہوا اے چارہ گر کہیں
پھر لے نہ جائے لذتِ زخمِ جگر کہیں

میں نے کسی قدر انگریزی شاعری سے بھی واقفیت حاصل کی۔ میں ہندی نہیں جانتا مگر مجھے ہر زبان کی شاعری پسند ہے۔ میرے خیال میں اردو شاعری سب سے کم درجہ رکھتی ہے۔ تخیل کی نزاکت اور بلند پروازی میں فارسی کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ہندی میں جذبات و کیفیات کی فراوانی ہے۔ انگریزی اور عربی میں سادگی اور صداقت ہے ——— میرا خیال ہے کہ کوئی شاعر اور نثر نگار اس وقت تک نہ صحیح اردو بول سکتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے، جب تک وہ عربی، فارسی سے بہ قدرِ ضرورت واقف نہ ہو۔

میں نے ہزارہا شعر کہے لیکن کبھی استاد کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں شاعر کو تلمیذ الرحمٰن سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک شعر کے یہ معنی ہیں کہ شاعر کے دل میں جو جذبہ پیدا ہو، جو کیفیت رونما ہو، یا دماغ میں جو تخیل قائم ہو، وہ اسے بہترین اسلوب اور ستھرے الفاظ میں، جس حد تک ادا ہو سکے، ادا کر دے۔

اب ۱۹۱۵ء کا زمانہ تھا۔ سندیلے کے ایک مشاعرے کے لئے دو تین دن کی محنت میں گیارہ شعر کی ایک غزل تیار کی۔ ہر شعر ظاہری اور معنوی اعتبار سے بہتر تھا۔ لیکن یہاں معلوم ہوا کہ مشاعروں میں غزل پڑھنا اور اسے کامیاب بنانا ایک خاص فن ہے جو زبردست قوتِ اکتساب اور صرفِ زر کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ——— بہرحال سندیلے کے اس مشاعرے میں نوح ناروی، ہرگوا بیاری اور فیش رامپوری پہلے ہی سے آئے ہوئے تھے۔ انھیں کے ساتھ ہمارا بھی قیام رہا۔ یہ حضرات میرے لئے اجنبی تھے۔ مشاعرے میں لکھنؤ کے شاعر زیادہ تھے۔ مثلاً انجم، بہار، آرزو، یاس، دہلی کے مشہور شاعر حضرت سائل بھی رونق افروز تھے اور حجاب صاحبہ بھی۔ مگر میں غزل نہیں پڑھ

سکا، نہ کسی نے فرمائش کی، نہ خود مجھے یہ جرأت ہوئی۔ صبح دس بجے کے بعد البتہ میری باری آئی اور جب میں غزل پڑھ چکا تو بیسیوں دیسیوں کے حاضرین نے دو تین بار واہ وا، ماشاءاللہ کہہ کر لگے شاعر کے لئے میدان صاف کر دیا۔

غزل کی تک بندی سے بڑا تلاطم ہوا۔ تکافی کی صورت یہی تھی کہ شعراء سے تعلق پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ میں نے آرزو صاحب کو سینکڑوں سلام کر ڈالے — اور حضرت تہر گوالیاری، بہار لکھنوی، یاس عظیم آبادی اور باغ سہسلی سے زبردستی خط و کتابت کا تعلق پیدا کر لیا۔

اپولو میں ایک مشاعرہ تھا۔ میں اس زمانے میں اپنا مکان بنوا رہا تھا۔ حضرت بیباک کے اصرار پر ان کے ساتھ ہو لیا۔ غزل روادی میں کہی مگر مشاعرے میں بہت سرسبز ہوئی بلکہ حاصل مشاعرہ ہوئی ۱۹۱۶ء کے ابتدائی مہینے تھے۔ سید منظور علی صاحب ارشاد کے یہاں مشاعرہ۔ میری غزل یہاں بھی بہت کامیاب رہی۔

۱۹۱۶ء کا اختتام تھا۔ رمز نظری پڑھے خوش گو اور مشاق شعرا میں اور اکثر اصرار پر ان کے مشاعرے میں بھی شریک ہوا — اس مشاعرہ میں غزل کہنے کے بعد میں نے عرصے تک کچھ نہیں کہا۔ وجہ یہ کہ یہ ہی محبوب جو ہی ایک عرصہ تک بیمار رہی اور آخر داغ مفارقت دے گئی۔

شاہجہان پور میں عبدالرافع خاں صاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر کی ذات منتظمات سے تھی۔ عربی فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے سخن فہم تھے۔ شعر بھی خوب کہتے تھے لیکن اپنا کلام اپنے نام کے ساتھ بہت کم منسوب ہونے دیتے تھے۔ مجھ سے محبت فرماتے تھے۔

۱۹۱۶ء ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ میں لکھنؤ آ گیا اور یہیں مستقل رہنے بھی لگا — یہ سے ہم چاشت مولوی سید عبدالغفور صاحب سشتر مدد کار نامی نذوہ خوب شعر کہتے ہیں بڑے گو ہیں۔ یہاں ایک مشاعرہ میں میرے ساتھ مولانا اکرام اللہ صاحب بھی تھے جو بڑے سخن فہم ہیں۔

۱۹۱۸ء میں کیننگ کالج میں ایک مشاعرہ تھا۔ مولانا جالیہ عوم دہلوی کے اصرار پر میں بھی شریک ہوا۔ اس مشاعرے میں مولانا شرر، اصغر گونڈوی، مولانا صفی، سراج اور عزم بھی تھے، مگر میں محسوس کیا کہ میرا لکھنوی نہ ہونا میری غزل کا سب سے بڑا عیب تھا ——

اسی سال ندوۃ العلماء میں میلاد کے ایک جلسے میں میں نے ایک نظم پڑھی۔ نامور انشاپرداز مولانا عبدالحلیم شرر نے داد تحسین میں بہت ہی مبالغہ فرمایا۔

۱۹۱۹ء میں لکھنؤ کو الوداع کہا اور روزنامہ زمانہ کی ادارت کے لئے کلکتے آ گیا مگر وہاں صرف ۲ مہینے ۱۰ دن رہا۔ آپ ہوا موافق نہ رہی۔ وہاں دفتر میں مولانا عبدالباقی مقیم تھے، بڑے خوش ذوق و سخن فہم تھے۔ وہ اکثر میرا کلام سنتے اور داد دیتے۔ فرماتے۔

کلکتے سے واپس شاہجہان پور اور شاہجہان پور سے دہلی چلا آیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دہلی سے میرا کیا تعلق ہے۔ میرے بزرگ بخارا سے دہلی آئے اور انہوں نے صدیوں دہلی میں قیام کیا۔ چتلی قبر کے محلے میں ہمارا مکان تھا۔ میرے بزرگوں میں بعض شاہی عہدوں پر ممتاز تھے اور بعض فیضی میں شاہی کی عزت رکھتے تھے۔ ممکن ہے اب بھی میرے رشتہ دار موجود ہوں لیکن مجھے علم نہیں۔ غدر میں میرے بزرگ دہلی سے کرنال اور کرنال سے شاہجہان پور آ بسے۔ ۱۹۱۹ء سے خود میں دہلی میں مقیم ہوں۔ میری شادی بھی دہلی میں ہوئی — اب میرے دل میں شاعری کا چنداں شوق نہ تھا۔ مگر شاہجہان پور کے ایک مشاعرے میں شریک ہوا۔ مشاعرے کے بانی پنڈت جگ موہن ناتھ رضیہ شوق ڈپٹی کلکٹر تھے جو خود بھی بڑے سخن فہم اور صاحب ذوق تھے۔ اس مشاعرے میں بہار، سراج، یاس، بیخود موہانی بھی تھے۔ اگلے دن شام کے قریب بیباک، یاس، بیخود اور مجھے پڑھنے کا موقع ملا۔ میرے بعض اشعار پسند کئے گئے۔ مگر یہی غزل دہلی کے ایک مشاعرے میں بہت زیادہ کامیاب رہی۔ یہاں تک کہ میرے مکرم دوست پروفیسر اکبر حیدر نے جو میرے کلام کی بہت قدر کرتے ہیں میری غزل کا ایک شعر ایک جلال تصویر پر لکھ کر اپنے نشست کے کمرے میں آویزاں کرایا۔

ایک روز میں بھیا احسان الٰہی کے مکان میں بیٹھا تھا، دہلی کے نامور انشاپرداز حضرت خواجہ حسن نظامی بھی تشریف لے گئے

---

لہ کاش یہ خطوط منظر عام پر آتے۔

تھے۔ اتنے میں رائے بہادر لالہ پارس داس صاحب خزانچی صوبہ دہلی تشریف لائے۔ انھوں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ کل یتیم خانے کا جلسہ ہے۔ کسی اچھے شاعر کا پتہ بتائیے جو ایک نظم تیار کر دے۔ خواجہ صاحب نے میری طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ تو کوئی کھوسٹ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے پھر میری طرف اشارہ کیا۔ میں نے نظم لکھنے سے انکار کیا۔ رائے بہادر نے کہا۔ معاوضہ لے لیجئے میں نے کہا۔ اگر تیس شعر چاہئیں تو تیس روپے ہوں گے بولے شرط یہ ہے کہ نظم اعلیٰ درجے کی ہو۔ پوچھا فیصلہ کون کرے گا۔ بولے خواجہ صاحب۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ میں شاعر نہیں ہوں۔ فیصلہ پبلک کرے گی۔ میں نے دو گھنٹے۔ ۴۵ منٹ میں یہ نظم لکھ لی۔ جلسے میں میں نے ابھی بیتن چار شعر ہی پڑھے تھے کہ پارس داس صاحب اور رائے بہادر سلطان سنگھ اور دوسرے بہت سے حاضرین زار زار رونے لگے اور جلسے میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ نظم ختم ہونے پر جین کمیٹی نے میرا شکریہ ادا کیا ..... اس دن سے رائے بہادر پارس داس میرے دوست ہو گئے اور ایسے دوست کہ دنیا میں ان کے برابر دوست تھے اور ان میں سے ایک دوست میں تھا۔ لالہ پارس داس بڑے خوش اخلاق، ملنسار، شعر و سخن اور ادبیات کے شائق تھے۔ میری شاعری کے بڑے قدر دان، مشاعروں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی اس کے بعد حیدرآباد گئے اور وہاں سے لکھا کہ میری یہی فارسی غزل ہمارا جہاز کشتی پر شاد نے بھی بہت پسند فرمائی۔ ۱۹۲۲ء میں بزم خسروی کے ہوتے پر میں نے ایک غزل کہی۔ اس مشاعرے میں شیخ احسان الحق بھی تھے۔ شیخ صاحب بڑے سخن فہم اور نکتہ رس ہیں۔ فلسفی تخلص فرماتے ہیں مگر اپنا شاعر ہونا چھپاتے ہیں۔ اس مشاعرے میں سائل دہلوی، بزم اکبرآبادی، ساحر دہلوی، برق دہلوی، روش دہلوی، آزاد انصاری شریک تھے۔ میری غزل سب سے بڑھ کر کامیاب ہوئی۔

اسی اثنا میں حضرت مولانا قاضی مولانا محمد خلیل صاحب رئیس بریلی سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ قاضی صاحب عربی فارسی کے فاضل ہزار ڈیڑھ ہزار اشعار تک محدود ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کی عنایتیں روز بروز میرے حال پر افزوں ہو رہی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے سوا میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو اپنے احباب و رفقا کو ہر ممکن طریقے سے بڑھائے اور فائدہ پہنچائے ـــــ ایک دفعہ خواجہ صاحب کے یہاں بہار کے نامور شاعر مولانا شفق مقیم تھے۔ مولانا شفق کے شاگرد منشی صاحب بھی ان کے پاس آتے جاتے تھے ..... جب میں خواجہ صاحب کے یہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں خواجہ صاحب مولانا شفق، جناب منشی اور ایک خوبصورت جوان عورت جو تانا سا بضا اور گداز بدن کی بنا پر ایک ملکہ معلوم ہوتی تھی موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ وہ دہلی کی مشہور رقاصہ اور مطربہ خورشید ہیں۔ منشی صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ خود بھی شعر کہتی ہیں۔

اسی واقعہ پر چند روز گزرے تھے کہ خواجہ صاحب نے مجھے قوالی کے ایک جلسے میں مدعو کیا۔ ملا واحدی صاحب، عبیا احسان الحق اور پندرہ بیس آدمی اور موجود تھے۔ میں نے درمیانی وقفے میں فارسی میں ایک غزل کہی۔ اب یہ غزل دہلی کے اکثر قوالوں کی زبان پر ہے۔ اسی غزل کو ایک مجلس میں سن کر حضرت شاہ عبدالصمد صاحب قبلہ مجھ سے غائبانہ واقف ہوئے اور پھر ممدوح نے مجھ سے ملاقات فرمائی اور میرے افسانۂ زندگی میں جدید ابواب کا اضافہ کیا۔

خواجہ حسن نظامی اس کے بعد حیدرآباد گئے اور وہاں سے لکھا کہ میری یہی فارسی غزل ہمارا جہاز کشتی پر شاد نے بھی بہت پسند فرمائی۔ ۱۹۲۲ء میں بزم خسروی کے ہوتے پر میں نے ایک غزل کہی۔ اس مشاعرے میں شیخ احسان الحق بھی تھے۔ شیخ صاحب بڑے سخن فہم اور نکتہ رس ہیں۔ فلسفی تخلص فرماتے ہیں مگر اپنا شاعر ہونا چھپاتے ہیں۔ اس مشاعرے میں سائل دہلوی، بزم اکبرآبادی، ساحر دہلوی، برق دہلوی، روش دہلوی، آزاد انصاری شریک تھے۔ میری غزل سب سے بڑھ کر کامیاب ہوئی۔

اسی اثنا میں حضرت مولانا قاضی مولانا محمد خلیل صاحب رئیس بریلی سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ قاضی صاحب عربی فارسی کے فاضل

ہیں اور بہتر ہیں سخن فہم - اساتذۂ قدیم کا کلام یہ کرشمت یاد ہے - مجھے قاضی صاحب نے فارسی کے عجیب و غریب اشعار سنائے - خیال آیا کہ فارسی کی سی نزاکت خیال اردو میں بھی کیوں نہ پیدا کی جائے - چنانچہ ذیل کا شعر اسی احساس کے تحت لکھا

ادائیں اس کی پیشانی کو تعلیمِ شکن کیوں دیں
کہ ارباب قضا معروف ہیں میرے ستانے میں

ستمبر کے مہینے میں ایک کامیاب مشاعرہ لالہ پارس داس کے یہاں ہوا - مجمع دو ڈھائی ہزار سے کم نہ ہوگا - صبح تک خواجہ صاحب، بھیّا احسان الحق، لالہ پارس داس، پنڈت ہرگوپال، لالہ ستیہ داس، پروفیسر اکبر حیدری، ساغر صاحب اور حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی بیٹھے رہے - افسوس اب وہ رات کہاں، وہ بات کہاں اور رائے بہادر کی ذات کہاں -

ایک دن خیال آیا کہ اگر شاعری کا موجودہ انداز بدل دیا جائے اور اس میں کول چپ پیرائے میں کام کی باتیں لکھی جائیں تو اردو ادب کی ایک بہت بڑی خدمت انجام پائے - چنانچہ ایک غزل کہی، اس کا ایک شعر:

کام بگڑے ہیں مرے کوتاہیٔ تدبیر سے
مجھ کو ہو تسکین کیونکر شکوۂ تقدیر سے

لیکن حالات نے اجازت نہ دی کہ اس خیال کو اور وسعت دیتا -

۱۹۳۲ء میں ایک مشاعرہ میرے عزیز دوست پنڈت ہرگوپال رسیؔ ترکان دروازہ دہلی کے مکان پر ہوا - اس میں منشی وزیر خاں، لالہ رام تلک لالہ جمنا پرشاد شریک ہوئے تھے - اسی مشاعرے کا سارا ذخیرہ لالہ پارس داس صاحب کے پاس رہا - میرے کاغذات میں صرف دو تین مصرعے لکھے - ان کی اشاعت بہ ظاہر متانت کے خلاف معلوم ہوتی ہے، لیکن سچ پوچھئے تو غزل لکھنا ہی متانت کے خلاف ہے - پھر کیا وجہ ہے کہ چند نما شئے مدعیانِ تہذیب کی چین جبیں سے ڈر کر انہیں شائع نہ کیا جائے - سعدیؒ اور جامیؒ کے یہاں تو اس سے زیادہ شوخیاں موجود ہیں -

۱۹۳۳ء میں ایک بخار پھیلا - جس میں غضب کی اعضا شکنی ہوتی تھی - بعض مریضوں کا بدن سُرخ ہو جاتا تھا - بعض کی بینائی میں فتور آجاتا تھا - حالات کی بنا پر لنگڑا بخار، لال بخار، اس کے مختلف نام تھے - دہلی میں اس بخار سے شاید ہی کوئی محفوظ رہا ہو - میں اور میرا سارا گھر اس بخار میں مبتلا تھا - اسی عالم میں دوستوں نے ایک جلسہ کیا اور ان کے اصرار پر میں نے ایک نظم کہی - مطلع یہ تھا:

دلّی میں یہ مہینہ قیامت سے کم نہ تھا
ایسا کوئی نہ تھا کہ گرفتارِ غم نہ تھا

میں جان، کو نونِ خفیفہ کے ساتھ کبھی نہیں لکھتا مگر اس نظم میں اس طرح لکھا ہے -

شاید ستمبر کا مہینہ تھا کہ مولانا گرامی مرحوم، فارسی کے مایۂ ناز شاعر دہلی تشریف لائے - ڈپٹی بلونت رائے نے جو مجھ سے بڑی محبت رکھتے ہیں، مولانا کو اور کھلے میں دعوت دی - اس دعوت میں پیرزادہ محمد حسین، عارف، سشی، خواجہ حسن نظامیؒ پنڈت امرناتھ ساحر اور رائے بہادر پارس داس شریک تھے - حضرت گرامی نے دیر تک اپنے کلام سے نوازا - اس تقریب پر میں نے بھی ایک فارسی نظم کہی اور سنائی -

دسمبر میں پنڈت امرناتھ صاحب ساحر کے یہاں سالانہ مشاعرہ ہوا - پنڈت صاحب دہلی کی قدیم تہذیب و وضعداری کا نمونہ ہیں - آج دہلی میں شعر و سخن کا جو کچھ چرچا ہے وہ انہی کے دم سے ہے اس مشاعرے میں اردو کے ساتھ فارسی کی بھی طرح دی جاتی ہے میں نے فارسی میں طبع آزمائی کی - اس موقع پر حافظ ذاکر علی بی اے ایل - ایل - بی شاہجہان پور سے تعزیتاً آئے ہوئے تھے اور میرے ہمان تھے - میری غزل بہت پسند کی گئی -

چاندنی چوک میں ایک خوب صورت بالاخانے پر میرا قیام تھا - یہاں ہماری ہمسایوں میں ایک خوش رو، خوش خو مسیحی خاتون نے آمد و رفت شروع کی - لیکن چند ملاقاتوں کے بعد انہیں کچھ حسنِ ظن پیدا ہوا جسے دور کرنے کے لئے میں نے ایک نظم کہی، غزل کا ایک بند:

ہے آنکھ پُر خمار، تو میری بلا سے ہو
ہے زلف مشکبار، تو میری بلا سے ہو

عارض ہے تابدار تو میری بلا سے ہو
دنیا ہے بے قرار تو میری بلا سے ہو
قابو میں دل ہے اور جہاں ہوں وہیں ہوں میں
عاشق مزاج ہوں مگر آشفتہ نہیں ہوں میں

آخری شعر:

البتہ مجھ کو شوق بہت دل لگی کا ہے
میری لغت میں نام یہی زندگی کا ہے

دہلی میں 'خدمت خلق' کے ایک جلسے میں میری نظم کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، بیان سے باہر ہے۔

میں نے ایک بار پنڈت امرناتھ صاحب ساحر کے یہاں سالانہ مشاعرے میں فارسی کی ایک غزل پڑھی۔ مرزا احمد علی بیگ مرحوم اس مشاعرے کے صدر تھے۔ بڑے سخن فہم اور سخن سنج۔ میرا کلام بہت پسند فرماتے تھے۔

پنڈت صاحب ہی کے یہاں ایک اور مشاعرے میں حکیم احمد علی آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ حکیم صاحب دہلی کے نامور شاعر حافظ ویراں کے نواسے ہیں اور اپنی جگہ بڑے صاحب ذوق۔

پنڈت صاحب کا اگلا سالانہ مشاعرہ لالہ پارس داس صاحب کے دیوان خانے میں منعقد ہوا۔ اس میں نواب شجاع الدین تاباں، حکیم اسد علی منتظر تھے۔ یہاں بھی میں نے فارسی غزل پڑھی اور وہ بے حد مقبول ہوئی۔

عمائد دہلی میں لالہ سری رام ایم۔اے، بڑے خوش مذاق، خوش مزاج، پاکیزہ رو اور پاکیزہ خو رئیس تھے۔ شعر و سخن کے انتہائی شیدائی، 'خمخانۂ جاوید' ان کے ذوق ادب کی بہترین یادگار ہے۔ صاحب موصوف نے ایک دن مجھے مدعو کیا۔ اس محفل میں حکیم اجمل خاں صاحب، سائل دہلوی اور حضرت کیفی دتاتریہ لشترلیف رکھتے تھے۔ میں نے غزل پڑھی:

اس وعدے کا مطلب کیا سمجھوں آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
ابرو پہ ہے بل ہونٹوں پہ ہنسی، انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

غزل بہت پسند کی گئی۔

میں نے کبھی اپنا کلام کسی اخبار یا رسالے میں شائع نہیں کیا مگر بعض دوستوں نے یہ غزل شائع کرادی۔ خدا کی شان دیکھئے کہ اس قدر مقبول ہوئی کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں جہاں یہ غزل سنی نہ گئی ہو۔ ملک کے بڑے بڑے موسیقی دانوں نے اسے گایا ہے اور گراموفون ریکارڈ میں بھری گئی ہے۔

ایک دن حضرت شاہ عبدالصمد کے ہاں قوالی ہو رہی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو حضرت نے فرمایا کہ ایک غزل اور سنتے جاؤ۔ میں نے سنا تو وہ اپنی غزل تھی۔ ایک دن ایسا ہی واقعہ وکیل ذکر الرحمٰن صاحب کے یہاں ہوا۔

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں[1] بڑے جامع الصفات بزرگ تھے۔ فن طب کے مجدد و امام، عربی فارسی کے ادیب، اعلیٰ درجے کے سخن گو اور سخن فہم۔ میری پہلی غزل سننے کے بعد ایسی قدر و منزلت سے پیش آئے کہ اس کا اثر آج تک دل میں محسوس کرتا ہوں ـــــ جامعہ ملیہ کا سالانہ جلسہ تھا اور مشاعرہ۔ حکیم صاحب نے میرے لئے سواری بھیجی۔ ملاقات ہوئی تو فرمایا "آپ کی ملاقات کا یہی انداز رہے گا؟" میں نے عرض کیا کہ وقت بتا دیں روزانہ حاضر ہو جایا کروں گا۔ فرمایا "رات کو ۹ سے ۱۱ بجے تک"۔

سنگم تھیٹر میں ترک مشراب کے متعلق ایک جلسہ تھا۔ اس میں کئی ہزار آدمی شریک ہوئے۔ مولانا محمد علی[2] اور لالہ پارس داس کے اصرار پر مجھے بھی کچھ پڑھنا پڑا۔ مولانا محمد علی مجھ سے بہت محبت رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ آپ موقع نہ ملنے سے منظر عام پر نہ آسکے اور آپ سے کم درجے کے لوگ پبلک میں مشہور ہو گئے۔

ایک دن صبح ۹ بجے میرا خلاق حسین دہلوی جو بڑے خوش گو اور خوش نوا شاعر ہیں، تشریف لائے اور حکیم اجمل خاں صاحب کے ہاں مشاعرے میں مدعو کر گئے۔ میں نے بھی شام تک غزل کہہ لی۔ اس مجلس میں ادیب، شاعر اور فلسفی بلکہ ظریف اعظم قاری سرفراز حسین عرفی بھی تھے اور نواب صاحب لوہارو بھی۔

---

[1] یہاں عین ساقط ہے (ع۔م)

پنڈت امرناتھ ساحر کے یہاں ماہانہ مشاعرہ تھا۔ میری یاد میں سب سے بڑا ماہانہ مشاعرہ۔ اس مشاعرے میں مولوی شرف الدین صاحب یاس ٹونکی کے علاوہ برق، زار، سحر، اکبر اور مجرم بھی تھے۔

ایک دن حکیم اجمل خاں صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ حسابی محمد صابر صاحب مالک کوٹھی حاجی علی جان اور دوسرے حضرات تشریف لائے۔ حکیم صاحب کی فرمائش پر پہلے میں نے کچھ عرض کیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے اپنی بیاض منگوائی اور حسب دستور سائل صاحب سے اپنی چند غزلیں پڑھوائیں۔ مجھے یہ شعر پسند آیا۔

یاد ایام ہے کہ من از بہر تقدیم نیاز
ہم جبینے داشتم، ہم آستانے داشتم

دوسرے دن جب گیا تو اس شعر پر تضمین لکھ کر لے گیا جسے حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا۔

حضرت مسیح الملک کے یہاں جو پریوٹیٹ مشاعرے ہوتے تھے ان میں یہی طریق عمل تھا کہ چند گھنٹے پہلے ایک دو دن پہلے طرح کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اس مجلس میں ڈپٹی نثار احمد مرحوم (علی گڑھ) بھی تھے علی گڑھ میں اپنے محترم دوست مولانا اکرام اللہ خاں صاحب کا مہمان تھا۔ فارسی کی ایک غزل وہاں بھی سنا دی ہو گئی۔

ایک دن حکیم اجمل خاں صاحب نے فرمایا، نواب صاحب رام پور آئے ہوئے ہیں۔ کل شام میرے یہاں مدعو ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کو سرکار کے روبرو پیش کروں۔ مگر تم ایک غزل لکھ لو۔ طرح حکیم صاحب نے دی۔ گھر پہنچا تو رات کے ۱۲ بج چکے تھے۔ صبح اٹھ کر غزل شروع کی اور شام کے ۸ بجے حکیم صاحب کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ آج اسی دولت کدے کا عالم ہی اور تھا۔ مجھے دیکھ کر حکیم صاحب نے مسکرا کر فرمایا "آپ آ گئے۔" اس کے بعد حکیم صاحب مجھے نواب صاحب کی خدمت میں لے گئے۔ میں مودبانہ کھڑا تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا "بیٹھ جاؤ۔" نواب صاحب کا پورا اسٹاف موجود تھا۔ حکیم صاحب نے تعارف کراتے ہوئے میرے متعلق ایسے تعریفی الفاظ فرمائے کہ سننے والوں نے مجھ سے کہا کہ حکیم صاحب نے نواب صاحب سے ایسے پرزور الفاظ میں کسی کا تعارف نہیں فرمایا۔

حکیم صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ یہ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ نواب صاحب نے پہلے منطق کے متعلق سوال کیا۔ میں نے عرض کیا کہ منطق سے دل چسپی نہ مجھے طالب علمی کے زمانے میں تھی نہ اب ہے۔ پھر حکیم صاحب نے اجازت حاصل کی کہ میں کچھ پڑھوں۔ میں نے دو چار شعر فارسی میں عرض کرنا چاہے تو فرمایا کہ اہل زبان یہاں موجود ہیں (یہ ایک ایرانی مجتہد صاحب کی طرف اشارہ تھا) ان کے سامنے کیا پڑھو گے۔ میں نے تامل کیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کیا مضائقہ ہے میں نے چند خیر مقدمی اشعار پڑھے۔ مجتہد صاحب نے کئی اشعار پر تحسین کی صدا بلند کی (افسوس کہ یہ فارسی اشعار کھو گئے) اس کے بعد نواب صاحب کی فرمائش پر حکیم صاحب نے دی ہوئی طرح میں غزل پیش کی۔ جسے نواب صاحب نے بہت توجہ سے سنا۔ دو تین اشعار پر فرمایا۔ "بہت اچھے، بہت اچھے!" جب کسی شعر پر نواب صاحب داد دیتے تو حاضرین بھی مرحبا، سبحان اللہ کی صدائیں بلند کرتے ورنہ خاموشی رہتی۔

اس غزل کا ایک شعر:

اے صبا، اک آخری ارمان باقی ہے ابھی
دل کے یہ ذرّے نہ ہو جائیں پریشاں، دیکھنا

اس غزل کے بعد نواب صاحب نے فرمایا کہ بھائی کچھ عربی کا کلام بھی سناؤ۔ میں نے عرض کیا زبانی کچھ یاد نہیں۔ بیاض لایا نہیں۔ فرمایا ہاں بھائی، کیوں لاتے۔ خیال کیا ہوگا کہ وہاں عربی کون سمجھے گا، خیر ایک آدھ شعر تو سناؤ۔ حکیم صاحب نے فرمایا، کیا حرج ہے۔ چنانچہ میں نے دو شعر پڑھے۔ دوسرے دن چند دو ایک شعر پیش کئے۔

حاجی علی نفیس حیدرآبادی واعظ قوال کے نام سے مشہور دہلی آئے ہوئے تھے۔ احباب کے اصرار پر میں نے انھیں ایک فارسی غزل دی۔ قوالی میں بہت کامیاب رہی۔

میں پندرہ سولہ سال سے ریاستی شکایات میں مبتلا ہوں۔ ہزاروں دورے پڑ چکے ہیں۔ سیکڑوں بار نزع کا عالم طاری ہو چکا ہے لیکن بقول غالب "موت آتی ہے پر نہیں آتی"۔ خیال آیا کہ مسیح الملک سے دردِ دل کہا جائے۔ چنانچہ میں نے اس طرح اظہارِ خیال کیا

صاحب بگو کہ من نہ روم از درِ مسیح
حتّٰی کہ او مرا بخشد یا کند مسیح
دشمن ہزار حیف کہ از دست می رود
مردے چنیں سخن و رد خوش لہجہ و فصیح

حکیم صاحب اپنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے، زانوؤں پر تکیہ، تکیے پر کہنیاں، ہتھیلیوں پر رخسار رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ لوگ کرسیوں پر دور دور بیٹھے۔ حضرت سائل نے یہ قطعہ سنایا۔ حکیم صاحب دیر تک مسکراتے رہے۔ فرمایا، خوب اشعار ہیں، لیکن آخری شعر سے مجھے اختلاف ہے۔ ایسا نہ ہوگا۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو فرمایا آپ صبح ۸ بجے آجائیں۔ مجھے آنے میں کچھ دیر ہوئی تو آدمی بھیجا میں گلی قاسم جان پہنچا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ میں ساتھ ہولیا۔ حکیم صاحب پہلے نواب شجاع الدین خاں کے یہاں گئے۔ پھر موٹر میں سوار ہوگئے، مجھے پاس بٹھالیا۔ نبض دیکھی اور نسخہ تحریر فرمایا۔

پنڈت ساحر کے یہاں پھر ایک سالانہ مشاعرہ۔ شام سے ۹ بجے تک تین دفعہ موٹر بھیجی۔ آخر جانا پڑا۔ مشاعرے میں جگر و اصغر بھی تھے۔ میں ۱۲ بجے رات گھر آگیا، مگر نیند نہ آئی۔ اسی عالم میں ایک غزل لکھی اور صبح اسی پر ایک خمسہ۔ مرزا محمد علی بیگ صدر تھے۔ کہیں ۲ بجے کے بعد میری باری آئی۔ ہر شعر پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے۔ ایک شعر پر تو صاحب صدر نے میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

انہی دنوں ارباب دہلی نے کاڑھے کے متعلق ایک عظیم الشان جلسہ کیا۔ قاری عباس حسین صاحب نے شرکت پر مجبور کیا۔ مصرع طرح پر میں نے بھی ایک نظم کہی۔ اس نظم کا پہلا بند:

ترقی کی راہیں دکھائے گا کاڑھا تدابیر دولت بتائے گا کاڑھا
غم تنگ دستی مٹائے گا کاڑھا کفایت شعاری سکھائے گا کاڑھا
بسی جز رسی کے سکھائے گا کاڑھا

ایک دن لالہ پارس داس صاحب کے یہاں بدیہہ گوئی کی بیٹھی۔ ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا اور طرح "ہمارا گلے گلے ہزار آگ لگے"

اس برجستہ مشاعرے میں بھی میری غزل بہت مقبول ہوئی۔ اگرچہ خود مجھے وہ پسند نہیں۔ مقطع یہ تھا:

چمن میں جب نہ رہا اپنا آشیاں وحشی
مری بلا سے اگر لاکھ بار آگ لگے

ایک دن وکیل ذاکر الجلیل صاحب کے یہاں مدعو تھا۔ مرحوم بڑے زیرہ دل، ظریف، بلیغ اور کثیر الاحباب تھے۔ مرنے سے چند روز پہلے اگرچہ بالکل تندرست تھے مگر مایوسی کے کلمات ان کی زبان پر آجاتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ اپنا کلام سنائیے۔ میں نے یہ مطلع پڑھا:

اب مناسب ہے کہ وحشی ترک دنیا کیجئے
آبِ خضر وا سے پہلے فکرِ فردا کیجئے

شعر کا سننا تھا کہ زار زار رونے لگے اور بڑی دیر تک روتے رہے۔

میسح الملک حکیم جمیل خاں صاحب وفا تخلص کرتے ہیں۔ بڑے سنجیدہ فہم۔ جلوت میں سنجیدہ، خلوت میں خوش طبع۔ نکتہ رس، ذہین و طباع ہیں، شعر میں زبان و خیال کی سادگی زیادہ پسند ہے، اسی لئے ان کے بعض اشعار میں ایسی سادگی اور صفائی ہوتی ہے کہ سرسری نظر میں میرا دھوکا ہوتا ہے۔ آپ کی غزل کا مجموعہ "دیوانِ وفا" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اپنے والد حکیم اجمل خاں صاحب کی طرح آپ بھی متفرق شعرے کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں۔ شاید ۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ آپ کے ہاں ایک ایسی ہی مجلس منعقد ہوئی۔ طرح تھی "حیا کے ساتھ"۔ حضرات شیدا، شوق، لالہ مصدی لال اور مرزا اعجاز حسین اعجاز وکیل شریک تھے۔ میں نے یہ غزل پڑھی:

اے دل یہ انقباضِ نہاں کی دلیل ہے
ہنس کا نہ دیکھنا نگہِ آشنا کے ساتھ

حکیم اجمل خاں صاحب کے ہاں ایک اور شعری محفل میں خان بہادر شیخ امیر علی، سیشن جج، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، خواجہ عبدالمجید برادر نسبتی خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر محمد شفیع پی۔ ایچ۔ ڈی، لالہ مصدی لال، مولانا ابوالکمال حمید اللہ بیگ ماہر موسیقی بھی جنھوں نے شعر خوانی کے بعد اپنے کمال کا مظاہرہ کیا۔

مولانا مظہر الدین شیرکوٹی الک، خبانہ الامان، میرے قدیم کرمفرما ہیں۔ وہ بھی اپنے ہاں کبھی کبھی مجلسِ شعری منعقد کرتے ہیں۔ مولانا

کے یہاں میں نے بھی ایک مرتبہ غزل پڑھی۔ ایک شعر:

دیکھا دیکھی آ بیٹھے ہیں بازی گاہِ اُلفت میں
لیکن یہ معلوم نہیں کچھ کھوئیں گے یا پائیں گے

ایک دن ماہر صاحب دہلوی کے یہاں بیٹھا ہوا تھا جنتی محمد نصیر تھانوی نے کچھ اشعار سنائے۔ افسوس ہے کہ منشی موصوف ایک ہی ہفتے کی بیماری میں داغِ مفارقت دے گئے حالانکہ وقت سے پہلے بہترین تندرستی رکھتے تھے۔

اچھا صاحب اب رخصت، اگر زندہ رہا اور کچھ عرض کرنے کا موقع ملا تو اگلے ایڈیشن میں پیش کروں گا..... اگر میرے مخصوص ذوقِ سخن سے آپ نے کچھ ناگواری محسوس کی ہو تو اس کی معافی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے ضرور معاف فرمادیں گے۔ مجھے کہ میری عمر ان اوراق سے بھی کم ہے اور ممکن ہے کہ جب یہ نوشتہ آپ کے سامنے ہو، نویسندہ دنیا کی نظر سے اوجھل ہو چکا ہو" (اور واقعہ بھی یہی ہے کہ وحشی صاحب زندہ نہیں ۔برسوں سے نہیں ۔جرت)

اگر ناظرین کرام کو اس طویل کلام نے تھکا دیا ہو تو حضرتِ وحشی کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں، تکان دور ہو جائے گی:

شاید غبارِ غم کا یہی اک علاج ہے
کچھ دیر رو لئے تو طبیعت سنبھل گئی

ناکردہ ہم نے جرم کا اقرار کر لیا جب کچھ علاج بے نمکیِ بے جا نہ ہو سکا

پہلے تو نہ تھی اتنی وحشت مجھے زنداں میں
پھر فصلِ بہار آئی شاید چمنستاں میں

مرگِ دشمن پہ یہ خوشی اے دوست آخر اک دن تجھے بھی مرنا ہے

جس کے لئے شبنم نے بہائے نہ ہوں آنسو
ہم نے کوئی ایسا گلِ خنداں نہیں دیکھا

پوچھی ہے ان سے داد، امین کی سرگزشت
تمہید کچھ تو چاہیئے آخر سوال کی

اس خوف سے کہ ہو نہ مکدر ترا مزاج
جرأت نہیں ہوئی نہ کبھی عرضِ حال کی

ہم کو ہنگامۂ ہستی کی جزا تی ہے جب کھلی آنکھ تو پھر یاد قیامت دیکھی

یا یہ کہو کہ آگ میں پروانہ جل گیا
یا یہ کہو کہ جبر کی طاقت نہیں رہی

شہیدانِ وفا کی حسرتیں بھی یاد کر لینا
اگر فرصت ملے نظارۂ گورِ غریباں کی

دامن لالہ و گل ہو کہ نقابِ مہ و مہر
دیکھنے والے تمہیں دیکھ لیا کرتے ہیں

اُلجھے ہوئے ہیں تارِ نفس میں جنوں کے ہاتھ
فرصت کہاں کہ تارِ گریباں نکالئے

وہ شوق کب ہوا وہ امنگیں کہاں گئیں
دل تھا یہ عشق تھا کہ جوانی کا جوش تھا

جا رہے ہو سوئے دے خانۂ جانِ وحشی
راہ میں کوئی شناسا نہ کہیں مل جائے

یہ تو سب کچھ ہے مگر اے وحشی کوتاہ بیں
کام سے پہلے ذرا انجام سوچا کیجئے

کس رعونت سے چلے تھے خرد و وہم و خیال
نہ ملا بار کسی کو ترے کاشانے میں

دل کی حرکت بند ہے بے نور ہیں آنکھیں آثار یہ کہتے کہ مرا وقت سحر ہے

تھا رے ناوکِ مژگاں کا نام سنتا تھا
جگر نہ تھی کہ ناوک ہیں میری قسمت میں

جنوں ہیں بھی نہ تھا کہ کہن سے کم وحشی
کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام عہدِ الفت میں

تا چند ایک منظر، اکتا گئیں نگاہیں
اب اپنے پہ ستا رے اے آسماں بدل دے

کلامِ فارسی

ہر کہ در خوبرایں نعمتِ عظمیٰ نہ بود
شاد باش اے دلِ وحشی کہ ترا غم دادند

ظاہر ناذکِ من نشترِ احساں نہ خورد
تشنہ لب میرم و شرمندۂ دریا نہ شوم

ایں عمر کہ مستعار دارم وقفِ غمِ روزگار دارم

جاوید دششٹ

# ہم

ہم کہ آدم ہیں، ابنِ آدم ہیں
سب فرشتے پڑے ہیں سجدے میں

جذبِ تقدیس کے امیں ہم ہیں
ایک ابلیس ہم سے برہم ہے

خیر و شر سب ہمارے دم سے ہے
پھر بھی کیسے بُرا کہیں اس کو

نیشتر ہم ہیں، انگبیں ہم ہیں
آج تک جو ہمارا ہمدم ہے

یوں تو یزداں کا بھی جواب نہیں
ایک رحمان، دوسرا ابلیس

اہرمن کی بھی بات کیا کہنا
خیر ہی خیر ایک شر ہی شر

کس کے اعلیٰ کہیں کسے ادنیٰ
اور ہم خیر و شر کا سنگم ہیں

دن ہے دن، رات رات کیا کہنا
ہے امانت کا بار بھی ہم پر

کائناتِ حیات پُر اسرار
فہم و ادراک و آگہی سے پرے
رازِ تخلیق، وحدتِ اضداد
کون اب اس کا انکشاف کرے

محرمِ راز، محرمِ اسرار
عشق ہے وہ بھی اک محیّر راز
پھوٹ پڑتا ہے نغمۂ عرفاں
چھیڑتا ہے وہ جب جنوں کا ساز

دل کا عرفان، روح کا وجدان
یہ حقیقت، یہ معرفت ابہام
جامِ جوشِ جنوں لنڈھاتے ہی
ہونے لگتا ہے عشق کو الہام

ہم، ہماری انا، ہمارا دل
تشنگی سے حیات تابندہ
روحِ انسانیت، غمِ انساں
گرمیٔ عشق ہی سے ہے زندہ

زندگی — سرخوشی و سرمستی
ہنس کے ہر غم قبول کرتی ہے
اور غم کو خوشی بنانے میں
چُوکتی ہے نہ بھول کرتی ہے

بحر و بر پر خرد کا قبضہ ہے
آسماں پر بھی اس کی نظریں ہیں
علم و فن کے کمال کی سوگند!
چاند تارے بھی اس کی زد میں ہیں

اڑ رہی ہے خرد خلاؤں میں
جامِ تسخیرِ کائنات لئے
تاکہ محفل میں چاند تاروں کی
زہرہ و مشتری کے ساتھ پیئے

ہم کہ مسجود ہیں فرشتوں کے
جُز فلک احترام کرتے ہیں
ہم کہ مشتِ غبار ہیں پھر بھی
چاند تارے سلام کرتے ہیں

رشید الدین

# حیدرآباد

## ( ایک قدیم اور عظیم شہر )

حیدرآباد کو قطب شاہی سلطنت کے چوتھے بادشاہ محمد قلی قطب شاہ نے ۱۵۹۱ء میں بسایا تھا۔ جس زمانے میں گولکنڈے میں قطب شاہیوں کی حکومت قائم تھی حیدرآباد موسیٰ ندی کے کنارے آباد ایک چھوٹا سا موضع تھا جس کا نام پھلم تھا، جہاں محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی رہا کرتی تھی اور اس کی رہائش ہی اصل میں اس شہر کی بنیاد کی محرکہ ہوئی۔ جب محمد قلی قطب شاہ بادشاہ ہوا تو اس نے بھاگ متی کے نام پر ایک نیا دارالحکومت بھاگ نگر بسایا۔ بعد کو جب بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب دیا گیا تو اس کا نام بھی بدل کر حیدرآباد رکھ دیا گیا اور جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے صرف اپنی محبوبہ کا دل رکھنے ہی کو اپنے آبائی پلنے تخت گولکنڈے کو چھوڑ کر ایک نیا پایۂ تخت نہیں بنایا، بلکہ اس شہر کی تعمیر اور آرائش میں اس نے خصوصی دلچسپی لی۔ محمد قلی قطب شاہ کا ذہن ایک فن کار کا ذہن تھا جس نے اس شہر کا بڑا اچھا نقشہ تیار کیا اور اس نقشے کو روبہ عمل بھی لایا۔ محمد قلی قطب شاہ اردو زبان کا پہلا شاعر ہے۔ یہ تمانی تخلص کرتا تھا۔ اردو کے علاوہ وہ تلنگی اور فارسی میں بھی شاعری کرتا تھا اور بڑا فراخ دل اور وسیع النظر تھا۔ اس شہر کی تعمیر کے بعد اس نے ایک مناجات لکھی تھی جس میں ایک جگہ وہ کہتا ہے :

" اے خدا! تو میرے شہر کو لوگوں سے اس طرح معمور کردے جس طرح تو نے سمندر میں مچھلیاں بھر دی ہیں۔"

تاریخ قطب شاہی میں اس کی آب و ہوا اور محل وقوع کے متعلق درج ہے کہ اس کی آب و ہوا بہت دل کش اور لطیف ہے اور یہ مقام مبارک اور مسعود ہے اسی لئے حیدرآباد کو فرخندہ بنیاد کہا جاتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے سب سے پہلے وسط شہر میں جہاں بھاگ متی کا گھر تھا چار مینار کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے چاروں طرف چار بازار اور شاہراہیں قائم کیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ان بازاروں میں چودہ ہزار دوکانیں تھیں۔ چاروں طرف ترسیلے کی شکل کی عمارت ہے جو ۱۸۹ فٹ بلند ہے۔ یہ عمارت مرغی پتھر اور چونے سے بنائی گئی ہے۔ اس کے چاروں طرف چار مینار، اندرون میان میں ایک مسجد، ایک خانقاہ ایک مدرسہ اور ایک حوض ہے۔ اس کے مینار ۱۹۰ فٹ بلند ہیں۔ وسطی عمارت ۷۰ فٹ عریض اور ۸۰ فٹ بلند چار محرابوں پر مشتمل ہے۔ جن کے درمیان ایک گنبد کی چھت ہے۔ اس چھت پر ایک دو منزلہ عمارت بنائی گئی ہے۔ جس کی پہلی منزل پر مدرسہ اور خانقاہ اور دوسری منزل

پرسجوا اور حوض تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان کے اوپر پہنچنے کے لئے چاروں
جانب سے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ چیزیں باہر سے نظر نہیں
آتیں۔ چار مینار کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے زمانے میں کئی
عالی شان محل تعمیر کروائے تھے جو ہیں قابل ذکر دولت خانہ عالی، چندن محل
گگن محل، سفید محل، حیدر محل، داد محل، کوہ نور محل اور قطب محل
ہیں۔ ان عالیشان محلوں کے علاوہ جن کا آج کوئی نشان نہیں۔ محمد قلی قطب شاہ
نے اپنے زمانے میں بیشمار مساجد، حمام، مسجدیں، عاشور خانے، لنگر خانے
مدرسے، مہمان خانے، کارواں سرائے اور دواخانے بھی بنوائے۔
جامع مسجد، بادشاہی عاشور خانہ اور محلہ دارالشفاء ان ہی باقیات الصالحات
میں سے ہیں۔ اس طرح محمد قلی قطب شاہ کی تعمیر کردہ عمارتوں کی ایک
طویل فہرست ہے جو آج صرف کتابوں کے اوراق ہی میں موجود ہیں اور
جن کا کہیں نشان نہیں۔ اس زمانے کی عمارتوں میں صرف چار مینار
اب تک صحیح و سالم حالت میں ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے
ادارۂ ادبیات اردو واقع ایوان اردو میں اس زمانے کے حیدرآباد
شہر کا ایک بڑا نقشہ موجود ہے جس کے دیکھنے سے اس زمانے کے
حیدرآباد کا ایک خاکہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔

۱۶۱۲ء میں محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بھتیجا اور
داماد سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ کا
کوئی لڑکا نہیں تھا اس لئے اس نے اپنے بھتیجے کی پرورش خاص طور
پر ایک ولی عہد کی طرح کی تھی اور اسے اپنی لڑکی بھی دی تھی۔ چنانچہ
اس کا جانشین بھی سارے اعلیٰ اوصاف کا مالک تھا۔ محمد قلی قطب شاہ
کی طرح سلطان قلی قطب شاہ بھی بہت وسیع النظر اور فراخ دل تھا۔
اپنے چچا کی طرح یہ بھی شاعر تھا۔ علی اللہ تخلص کرتا تھا اور اردو
اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اسے بھی تعمیر کا بہت شوق
تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اپنے زمانے میں حیدرآباد میں متعدد
مسجدیں اور محل وغیرہ تعمیر کئے۔ اس کے دور کا سب سے اہم تعمیری
کارنامہ مکہ مسجد کا سنگ بنیاد ہے۔ آج بھی یہ حیدرآباد کی سب سے
بڑی اور خوبصورت مسجد ہے۔ مکہ مسجد اورنگ زیب کے زمانے میں
پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس مسجد کا مستطیل حصہ ۲۲۵ فٹ طویل
۱۸۰ فٹ عریض اور ۷۰ فٹ بلند ہے۔ اس کی چھت پندرہ گنبدوں
پر مشتمل ہے۔ اور یہ گنبد اس خوبی سے بنائے گئے ہیں کہ باہر سے نظر
آتے ہیں اور نہ اندر سے۔ یہ گنبد جن ستونوں پر قائم ہیں ان کو بڑی
بڑی کمانوں اور محرابوں کی شکل دے دی گئی ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد ۱۲۲۶ھ میں اس کا بیٹا
عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا ہی خدا ترس، نیک نفس
اور عالم بادشاہ تھا۔ عبداللہ قطب شاہ شاعر بھی تھا جس کے کلیات
شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی سیدھی سادی اور کمزور طبیعت سے فائدہ اٹھا
کر محمد سعید اردستانی، مہتمانی نے جسے بعد میں امیر الملک اور میر جملہ
کے خطابات ملے اور سپہ سالاری اور وزارت عظمیٰ کی مسندیں ملیں،
اپنے اختیارات بہت بڑھالئے اور بادشاہ اس کے مشورے کے بغیر
کوئی کام نہ کرتا تھا۔ میر جملہ کردار کا اچھا آدمی نہ تھا وہ بہت خود غرض
حریص اور موقع پرست تھا۔ چنانچہ جو موقع ملتے ہی اس نے عبداللہ قطب شاہ
کے خلاف اورنگ زیب سے جو اس زمانے میں اورنگ آباد میں
بطور صوبیدار دکن مقیم تھا سازش کرلی۔ مگر عین موقعہ پر
عبداللہ قطب شاہ کو سازش کا پتہ چل گیا۔ اس طرح وہ قتل ہونے سے
تو بچ گیا مگر مغل سپاہیوں نے حیدرآباد شہر کو جی بھر کر لوٹا اور اس کی
اینٹ سے اینٹ بجادی۔ مگر بعد میں عبداللہ قطب شاہ نے اس شہر
کو پھر ویسا ہی بارونق بنادیا۔

۱۶۷۲ء میں عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہوگیا۔ کیونکہ اس کا کوئی
لڑکا نہیں تھا اس لئے امراء نے اس کے سب سے چھوٹے داماد ابوالحسن
کو تاناشاہ کے لقب سے بادشاہ بنادیا۔ ابوالحسن تاناشاہ قطب شاہی
سلطنت کا آخری بادشاہ تھا جس نے چودہ سال حکومت کی اور پھر اس
پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب دکن میں مرہٹوں
کو شکست دے کر ایک منظم سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر بیجاپور
اور گولکنڈہ (حیدرآباد) کی سلطنتوں کی وجہ سے وہ اپنے اس مقصد میں
کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ سلطنتیں مرہٹوں کو مدد دیتی تھیں۔
چنانچہ اورنگ زیب نے پہلے ان ریاستوں کو ہی مغلوب کرنے کی سوچی۔
اور پہلے بیجاپور اور پھر گولکنڈہ پر قبضہ کرلیا۔ ۱۶۸۷ء تا ۱۷۲۴ء

یعنی ۳۷ سال تک حیدرآباد مغلوں کا دست نگر رہا جبکہ ۱۷۲۴ء میں نظام الملک آصف اول نے مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد دکن کے آخری مغل صوبیدار عماد الملک میاں خان کو شکست دے کر دکن میں آصف جاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ مگر انھوں نے حیدرآباد کو نہیں بلکہ اورنگ آباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اپنی ریاست میں تلنگانہ مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے علاقے شامل تھے۔ پھر بھی وہ حیدرآباد آتے جاتے اور یہاں قیام کرتے رہتے تھے۔ چناں چہ اپنے قیام کے لئے انھوں نے یہاں ایک حویلی بھی بنوائی تھی جو حویلی نظام الملک کے نام سے مشہور ہوئی اور آج بھی موجود ہے۔ نظام الملک آصف جاہ اوّل کے بعد ان کے جانشینی کے بڑے جھگڑے رہے۔ اور بالترتیب ناصر جنگ، مظفر جنگ اور صلابت جنگ بادشاہ ہوئے۔ مگر انھیں آصف جاہی بادشاہوں کے زمرے میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ نظام الملک ثانی، میر نظام علی خاں کو کہا جاتا ہے جنھوں نے ۱۷۵۰ء میں صلابت جنگ کو الگ کر کے خود تخت سنبھالا پھر انھوں نے پایۂ تخت حیدرآباد منتقل کیا اور یہاں منصب محل اور عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔ ایک زمانے سے پایۂ تخت نہ رہنے کی وجہ سے اس شہر کی رونق جاتی رہی تھی مگر نظام علی خاں نے یہاں پھر سے رونق اور چہل پہل قائم کر دی۔ نظام علی خاں بھی تعمیر کا شوق رکھتے تھے حویلی رکھ الدولہ، پنج محلہ اور پرانی حویلی ان ہی کے زمانے میں بنائی گئی۔

نظام علی خاں آصف ثانی کے بعد سکندر جاہ (نظام ثالث) ان کے بعد ناصر الدولہ نظام رابع اور افضل الدولہ نظام خامس ریاست حیدرآباد کے حکمران ہوئے۔ ان لوگوں کے زمانے میں کوئی خاص تعمیری یا دیگر قسم کے قابل ذکر کام نہیں ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں جب افضل الدولہ کا انتقال ہوا تو ان کے فرزند میر محبوب علی خاں صرف دو سال کے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہندوستان پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط ہو چکا تھا اور تمام دیسی ریاستوں نے انگریزوں کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا۔ چناں چہ ریاست حیدرآباد بھی جو سب سے بڑی دیسی ریاست تھی انگریزوں کے اقتدار کو تسلیم کرتی تھی۔ انگریزوں اور حکام حیدرآباد کے تعلقات بھی ہمیشہ بہت ہی خوش گوار رہے۔ کیونکہ میر محبوب علی خاں ابھی بالکل چھوٹے تھے اس لئے حکومت کا کام رشید الدین خاں مختار الملک سر سالار جنگ اول اور سر آسمان جاہ نے سنبھالا۔ ان ہی کے زمانے میں ہندوستانیوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی لڑی۔ جسے انگریزوں نے اسی زمانے میں غدر کا نام دیا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد میر محبوب علی خاں نے عنان حکومت خود سنبھال لی۔ بعد میں ان کے وزیر اعظم چند ولی شاہ رہے۔ محبوب علی خاں کے زمانے میں روشن خیالی عام ہو رہی تھی۔ چناں چہ حیدرآباد اس زمانے میں بہت کچھ موجودہ زمانے سے روشناس ہوا اور یہاں انگریزی کا بھی رواج ہو گیا۔ میر محبوب علی خاں کے زمانے ہی میں حیدرآباد کی سرکاری زبان فارسی سے اردو ہوئی۔ میر محبوب علی خاں کے زمانے میں بہت کچھ جدید عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں۔ جن میں موسیٰ ندی کے کنارے علالت العالیہ کی عمارت خاص طور پر قابل ذکر ہے جو اس وقت آذھرا پردیش ہائی کورٹ کہلاتی ہے۔ باغ عام بھی ان ہی کے زمانے میں بنایا گیا۔ یہ ایک بہت ہی وسیع و عریض اور خوش نما تفریح گاہ ہے جہاں شام کو عوام کا جمگھٹا رہتا ہے۔ کنگ کوٹھی جہاں میر عثمان علی خاں نظام سابع اپنے زمانۂ بادشاہت میں اور اب بھی قیام پذیر ہیں انھوں نے ہی خریدی تھی۔

۱۹۱۱ء میں میر محبوب علی خاں نظام سادس کا انتقال ہو گیا اور ان کے فرزند میر عثمان علی خاں نظام سابع تخت نشین ہوئے جو ۱۹۴۸ء تک یعنی ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں شامل ہونے تک حیدرآباد کے حکمران رہے۔ یہ آصف جاہی خاندان کے چھٹے اور آخری بادشاہ ہیں۔ ان کے زمانے میں حیدرآباد نے بہت ترقی کی۔ انھیں جدید حیدرآباد کا بانی کہا جاتا ہے اور یہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ میر عثمان علی خاں ایک وسیع المنظر علم دوست اور روشن خیال حکمران رہے ہیں۔ ان ہی کے زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کا خاکہ تیار ہوا اور ہندوستان میں اردو یونیورسٹی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی ان ہی کے نام پر بنائی گئی تھی اور اب بھی ان ہی کے نام سے باقی ہے۔ اس کی عمارت فن تعمیر میں ایشیا کی عظیم عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ شہر سے دور پر سکون ماحول میں چھتر کی یہ بلند و بالا اور مستحکم

عمارت میر عثمان علی خاں کی یاد دلاتی رہے گی۔ آصفیہ لائبریری جو اب اسٹیٹ لائبریری کے نام سے موسوم ہے انھوں نے ہی بنوائی تھی۔ اس کے علاوہ موسیٰ ندی کے کنارے عدالت العالیہ دائی کورٹ) کے روبرو دواخانہ عثمانیہ کی سہ منزلہ شاندار عمارت بھی ان ہی کے زمانے میں بنائی گئی۔ موسیٰ ندی کی طغیانی سے بچنے کے لئے دو مشہور تالاب عثمان ساگر اور حمایت ساگر بھی ان کے زمانے ہی میں بنائے گئے۔ عثمان ساگر جو عثمان علی خاں کے نام پر بنایا گیا ہے۔ چونکہ موضع گنڈی پیٹھ میں واقع ہے اس لئے گنڈی پیٹھ کا تالاب بھی کہلاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا تالاب ہے یہاں سے شہر حیدرآباد کو نلوں کے ذریعہ پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ حمایت ساگر ان کے بڑے صاحبزادے حمایت علی خاں، اعظم جاہ کے نام پر بنایا گیا ہے ان کے زمانے میں ایک پختہ مارکیٹ بھی بنائی گئی جو ان کے چھوٹے صاحبزادے شجاعت علی خاں معظم جاہ کے نام پر معظم جاہی مارکیٹ کہلاتی ہے۔ یہ عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہے اور اس میں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے۔ معظم جاہی مارکیٹ میں ہزوریات زندگی کی جملہ چیزیں ملتی ہیں۔ عثمان علی خاں کے زمانے میں حیدرآباد میں دارالترجمہ بھی قائم کیا گیا تھا جس میں ہندوستان بھر سے اردو کے چوٹی کے عالم، شاعر اور ادیب اکٹھے کئے گئے تھے اور جہاں سے ہر قسم کی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ حیدرآباد میں موجودہ شہروں کی ساری خصوصیات میر عثمان علی خان کے زمانے میں ہی آئیں۔ میر عثمان علی خاں نے باغ عامہ میں اپنے جشن سیمیں کے موقع پر ایک عالی شان عمارت (جوبلی ہال) بھی تعمیر کی تھی جہاں ان دنوں آندھرا پردیش ودھان سبھا کے اجلاس ہوتے ہیں۔ میر عثمان علی خاں خود بھی شاعر ہیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر لکھتے ہیں اور انگریزی پر بھی اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی ۸۰ ویں سال گرہ منائی گئی۔

حیدرآباد شروع ہی سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ جس شہر کا بانی ہی تین زبانوں کا شاعر ہو اس شہر میں علم و فضل کیوں نہ پھیلے گا۔ قطب شاہی خاندان کے سب ہی بادشاہ علم دوست اور فیاض تھے۔ جن کے زیر سایہ کئی شاعر و ادیب اور عالم و فاضل پروان چڑھے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ معانی، سلطان محمد قلی قطب شاہ ظل اللہ اور عبداللہ قطب شاہ تو خود بھی شاعر تھے۔ آصف جاہی بادشاہوں کا بھی یہی حال تھا۔ اس خاندان کے بھی دو بادشاہ میر عثمان علی خاں اور میر محبوب علی خاں شاعر تھے۔ چونکہ آخر آخر میں جب ریاستیں ختم ہو گئیں تھیں اس لئے ہندوستان کے سارے اردو داں طبقے کی نظر حیدرآباد پر ہی پڑتی تھی اور چونکہ اسے شاہی سرپرستی حاصل تھی اس لئے ہندوستان کے منتخبہ شاعر، ادیب اور عالم فاضل یہاں جمع ہو گئے تھے اور حیدرآباد اردو کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔

آج بھی حیدرآباد میں موجودہ دور کے بڑے اچھے اور بلند پایہ محقق نقاد، شاعر اور ادیب موجود ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر جمال القادر سروری، سید محمد نصیر الدین ہاشمی اور تمکین کاظمی (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا) حیدرآباد کے مشہور محقق ہیں۔ جنھوں نے دکنی ادب پر کام کر کے خصوصیت کے ساتھ نام پیدا کیا۔ حیدرآباد کے دیگر نقادوں اور نثر نویسوں میں رائے جانکی پرشاد، ابوظفر عبدالواحد فضل الرحمٰن، ڈاکٹر جعفر حسین، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر نصیر سلطانہ، خلیفہ عبدالحکیم، مجید اللہ، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، حسینی شاہد عالم خوندمیری، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، ڈاکٹر شریف الحسنا، ڈاکٹر خالدہ یوسف اور ڈاکٹر سید جعفر وغیرہ شامل ہیں۔ جن نثر نگاروں نے شہرت سے آگر حیدرآباد کو فیض پہنچایا یا ان میں مولوی عبدالحق، وحیدالدین سلیم، عظمت اللہ خاں، پوشش بلگرامی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور غلام یزدانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افسانہ نگاروں کی بھی ایک لمبی قطار حیدرآباد سے تعلق رکھتی ہے جن میں عزیز احمد، اختر شفاق حسین، جہاں بانو نقوی زینت ساجدہ، ابراہیم جلیس، رشید قریشی، عاتق شاہ، اقبال متین جیلانی بانو، عوض سعید، واجدہ تبسم، اکرام جاوید اور رضا البلدہ وغیرہ شامل ہیں۔ طنز نگاروں میں ناکارہ حیدرآبادی شامل ہیں۔ باہر سے آکر بسنے والے طنز نگاروں میں آوارہ، فرحت اللہ بیگ اور عصمت اللہ بیگ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ شاعروں کی بھی حیدرآباد میں کمی نہیں۔ خاص حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے شاعروں میں امجد حیدرآبادی، جذب عالم پوری، ضیا یتیم خاں باقی، تہنیت نوا نذیر احمد ہمتانی، عزیز یار جنگ، مخدوم محی الدین، سلیمان اریب کنول پرشاد کنول، تیرت نذیم، سرور ڈنڈا، قمر ساحری، لطیف ساجد

ابن احمد تاب، منور علی شارب، س۔ ل۔ عشرت، تاج قریشی، طالب رزاقی، شاذ تمکنت، رومی علی اصغر، بشیر انشا، بشیر خورشید نفیس، سعادت نظیر اور سیدہ جمیدہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ جن شاعروں نے باہر سے آکر حیدرآباد کو فیض پہنچایا ان کی تعداد بھی خاصی ہے جن میں داغ، امیر مینائی، جلیل مانک پوری، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، مرزا یگانہ چنگیزی، صفی اورنگ آبادی، منظم طباطبائی، مرزا رسوا، ماہر القادری، حبیب حیدرآبادی اور حیرت بدایونی وغیرہ شامل ہیں۔ جن نوجوان شعراء نے حیدرآباد میں رہ کر اس سرزمین سے کچھ حاصل کیا ان میں سکندر علی وجد، شاہد صدیقی، قاضی سلیم، وحید اختر، باقر مہدی، ظہیر سید، حمایت علی شاعر، یوسف ناظم اور اقبال عظیم وغیرہ شامل ہیں۔

حیدرآباد میں اردو کا مستقبل آج بھی بڑا روشن ہے۔ ہندستان کی پندرہ ریاستوں میں آندھرا پردیش ہی وہ واحد ریاست ہے جہاں سلسلے کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا گیا ہے آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کتابیں بھی شائع کر رہی ہے اور اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو بھی سالانہ انعامات دے رہی ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے ۱۹۵۶ء کے بعد بطور خاص ایک الگ محکمۂ ترجمہ قائم کیا ہے جس میں اردو کو بھی شامل ہے اور یہاں حکومت کی ان کارروائیوں کو جن کا تعلق عوام سے ہے، اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر کے حکام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور حکومتی کارروائیوں کا اردو ترجمہ عوام کی سہولت کے لئے کیا جاتا ہے اس طرح یہاں اردو کی دفتری حیثیت کو آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مدارس اور کالجوں میں بھی یہاں اردو کو ایک اہم مقام حاصل ہے حکومت کے علاوہ بہت سے عوامی ادارے بھی یہاں اردو کے لئے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ دائرے جائفی پریشاد کی صدارت میں اردو مجلس حیدرآباد میں اردو کے لئے بڑا مفید کام کر رہی ہے اس کی ایک سہ ماہی رسالہ تحریر بھی شائع ہوتا ہے۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش بھی اپنے طور پر برابر عمل ہے۔ اس کے زیر انتظام حال ہی میں ایک اردو ہال تعمیر کیا گیا ہے جہاں اردو سے متعلق تقریبات منائی جاتی ہیں۔ اس کے تحت ایک اردو کالج بھی ہے جو بہت کامیابی سے چل رہا ہے۔ انجمن نے حیدرآباد کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی تصنیفات بھی شائع کرنا شروع کیا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا ادارۂ ادبیات اردو بھی اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے کی اپنی عالی شان عمارت 'ایوانِ اردو' حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے جہاں اردو کا ایک بہت بڑا کتب خانہ ہے جس میں اردو کی بڑی نادر کتابیں اور قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا دارالمطالعہ بھی بہت بڑا ہے جس میں اردو کے بہت سے اخبار اور رسالے آتے ہیں۔ اسی عمارت میں ایوالکلام اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی ہے جہاں اردو زبان و ادب پر تحقیق کا کام ہوتا ہے اور ریسرچ اسکالروں کو فی ماہ دو سو روپیہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو سے اردو زبان کے امتحانات بھی ہوتے ہیں اور اسناد دی جاتی ہیں اس ادارے سے مختلف علمی و ادبی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور ایک ادبی ماہنامہ 'سب رس' بھی نکلتا ہے۔ مکتبۂ صبا نوجوان صحافی اور شاعر سلیمان اریب کا پبلشنگ ہاؤس ہے جہاں سے وہ صباری ادبی ماہنامہ 'صبا' نکالتے ہیں۔ حیدرآباد میں فارسی زبان کی ایک انجمن 'بزمِ سعدی' بھی ہے جس کے ممتاز نوجوان شاعر قمر ساحری ہیں۔ یہ انجمن اردو اور فارسی کے لئے بہت مفید کام کر رہی ہے۔

حیدرآباد میں اردو صحافت بڑی مستحکم ہے۔ یہاں سے سات اردو روزنامے، سات ماہنامے، ایک سہ ماہی رسالہ، ایک سہ روزہ اور دو ہفت روزہ رسائل شائع ہوتے ہیں۔ یہاں چھاپے خانے بھی بہت زیادہ ہیں۔ یہاں کتابت بھی بہت نفیس ہوتی ہے۔ حیدرآباد کی اردو کتابت و طباعت دور دور تک مشہور ہے۔ یہاں کاتبوں کی باضابطہ ایک انجمن ہے۔ اردو کے علاوہ حیدرآباد سے انگریزی، تلگو اور ہندی کے بھی کئی اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں۔ یہاں اردو، تلگو اور ہندی میں بڑی ہم آہنگی ہے اور اکثر تینوں زبانوں کے مشترکہ مشاعرے اور پروگرام ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے دیگر تاریخی شہروں کی طرح حیدرآباد بھی اپنے دامن میں اپنی مخصوص تاریخ اور تہذیب سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ ایک قدیم اور عظیم شہر ہے۔ یہ نئی اور پرانی تہذیب کا سنگم اور ہندو مسلم تہذیب کی مشترکہ یادگار ہے۔ اس شہر پر جہاں مسلمان بادشاہ حکمران رہے وہاں یہیں ان کے مشیروں اور کرتا دھرتاؤں میں اکثر ہندو تھا، لالہ منارام، چندولعل شاداں اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد جیسے نام بھی ملتے ہیں۔ سنجیدگی، متانت، بھائی چارگی اور خوش اخلاقی یہاں کی تہذیب سے عبارت ہے۔ یہاں کی بنی قدیم مسجدیں، گنبد اور عمارتیں ہیں قدم قدم پر اس بات کی یاد دلاتی رہتی ہیں کہ یہ ایک تاریخی شہر ہے اور اپنے جلو میں ایک داستان لئے ہوئے ہے۔

مگر حیدرآباد بعض دیگر شہروں کی طرح صرف تاریخی اور قدیم ہو کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں نمایاں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور قدیم کے ساتھ ساتھ وہ ایک جدید شہر بھی بنتا گیا۔ حیدرآباد نے تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دیا ہے اور نئے زمانے کی اچھائیوں کو اپنایا ہے۔ اس وقت حیدرآباد دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک پرانا حیدرآباد کہلاتا ہے اور دوسرا نیا حیدرآباد۔ ان دونوں کے درمیان موسیٰ ندی بہتی ہے اور نیا پل، پرانا پل و چادر گھاٹ کا پل ان دونوں کو ملاتے ہیں۔ قدیم حیدرآباد قطب شاہیوں کے زمانے کا حیدرآباد ہے جس میں چارمینار، مکہ مسجد، دارالشفاء، بادشاہی عاشورخانہ، ڈبیرپورہ کی میرعالم، حویلی نظام الملک اور ایسی ہی قدیم عمارتیں ہیں۔ نئے حیدرآباد میں جو بعد میں گرشت آبادی سے خود بخود بنتا گیا تمام دفاتر، نئی نئی عمارتیں اور کشادہ و پُررونق شاہراہیں اور تفریح گاہیں وغیرہ ہیں۔ نئے حیدرآباد کے رہنے والے بھی مغربی تہذیب کے پرستار اور روشن خیال ہیں۔ آندھرا پردیش کا پایۂ تخت بننے کے بعد سے (۱۹۵۶ء) اس کے رقبے اور آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ چناں چہ اب سکندرآباد کو بھی جو پہلے ایک الگ شہر تھا اور جہاں انگریزی فوجیں رہتی تھیں حیدرآباد میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور اس طرح عظیم تر حیدرآباد وجود میں آگیا ہے۔

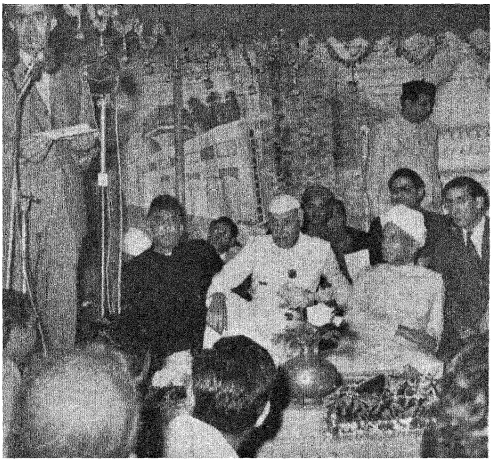
حالیہ مردم شماری کی رو سے عظیم تر حیدرآباد کی آبادی ۱۴ لاکھ ہے اور یہ 'بی' کلاس شہروں کی فہرست میں شامل ہے۔ حیدرآباد میں نئی وضع کی بڑی بڑی عمارتیں، کشادہ سڑکیں اور رنگا رنگ پارک و شاہراہیں ہیں۔ یہ بڑا پرسکون، ستھرا اور سنجیدہ شہر ہے۔ حیدرآباد میں دو ریلوے اسٹیشن اور ایک ہوائی اڈا ہے۔ اس کے علاوہ سارے شہر میں بسوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔

حیدرآباد صرف ایک سنجیدہ اور خاموش شہر ہی نہیں ہے بلکہ یہاں موجودہ دور کی بہت سی صنعتیں بھی قائم ہیں۔ چنانچہ یہاں تمباکو، کاغذ، شکر، پھٹے سیمنٹ، فرنیچر، اوزار اور دوائیوں کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہیں جن میں وزیر سلطان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ، سرویپیر پلز لمیٹڈ، میتو پال سیمنٹ فیکٹری، نظام شاہی ملز لمیٹڈ، انڈین میٹل ورکس، پراگا ٹولس کمپنی اور کارخانہ زندہ طلسمات وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۴۸ء کے بعد یہاں فلمی صنعت بھی قائم ہو گئی ہے۔ جہاں پہلے دو تین ہندی فلمیں بنیں اور اب تلک فلمیں بن رہی ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ حیدرآباد مستقبل میں تلگو فلم انڈسٹری کا ایک بہت بڑا مرکز بن جائے گا۔

اس وقت حیدرآباد ہندوستان کی ایک اہم اور بڑی ریاست آندھرا پردیش کا پایۂ تخت ہے۔ قطب شاہی سلطنت کے پایۂ تخت سے لے کر جمہوری ہندوستان کی ایک ریاست کا پایۂ تخت بننے تک حیدرآباد نے کئی منزلیں طے کیں اور اس کی زندگی میں کئی اچھے اور بُرے وقت آئے مگر وہ برابر ترقی کرتا گیا۔ حیدرآباد ایک ایسا شہر ہے جہاں قدیم اور جدید دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ آج وہ اپنے پیچھے اپنی ۴۰۰ سالہ جلیل القدر تاریخ رکھتا ہے اور اپنے آگے ایک عظیم الشان مستقبل کو دیکھ رہا ہے جب وہ جدید ہندوستان میں اپنی وفاداری، سنجیدگی، بھائی چارگی، خلوص اور ایسی ہی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اس طرح ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے گا۔

---

# عُرس حضرت امیر خسروؒ

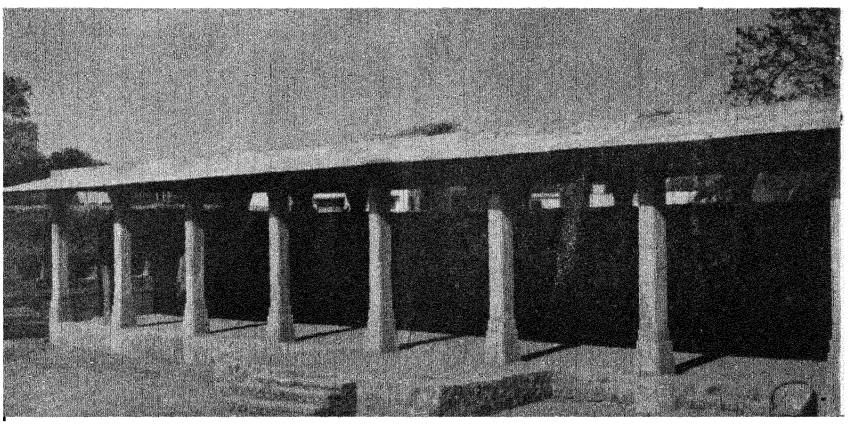


ایرانی سفارت خانے کے کلچرل اتاشی استقبالیہ خطبہ پڑھ رہے ہیں۔
ڈاکٹر رادھا کرشنن، پنڈت جواہر لال نہرو اور بخشی غلام محمد تشریف فرما ہیں۔



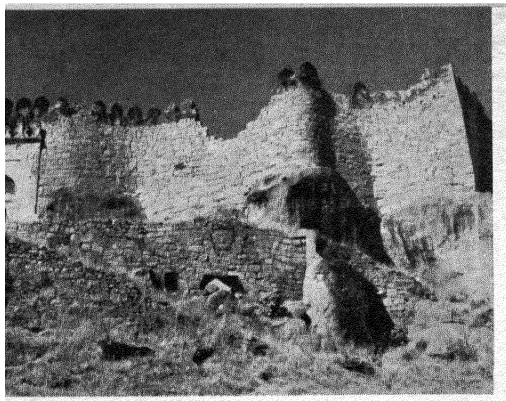

'عُرس محل' کا سنگِ تعمیر

'عُرس محل' — جس کا افتتاح نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے فرمایا۔

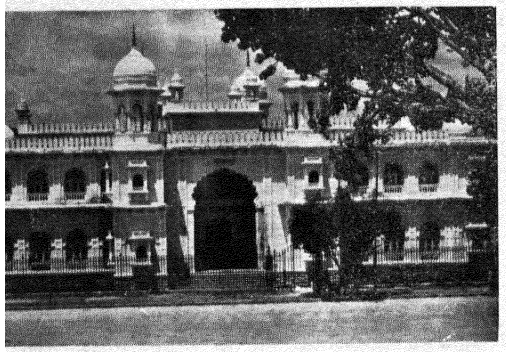


# حیدر آباد

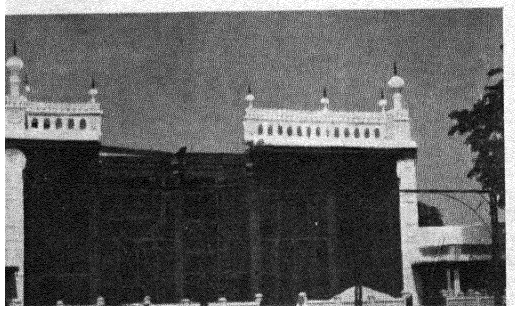
( متعلقہ مضمون صفحہ ۱۷ پر ملاحظہ فرمائیں )



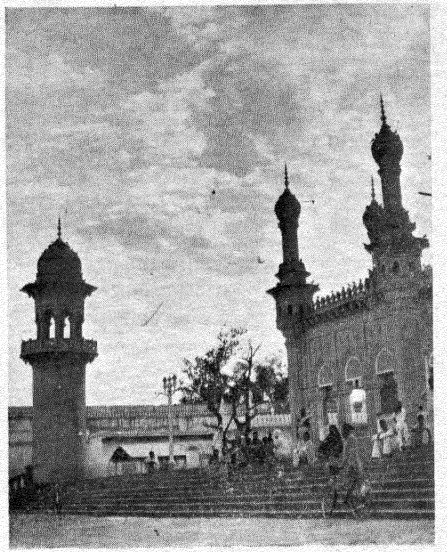
قلعہ گولکنڈہ



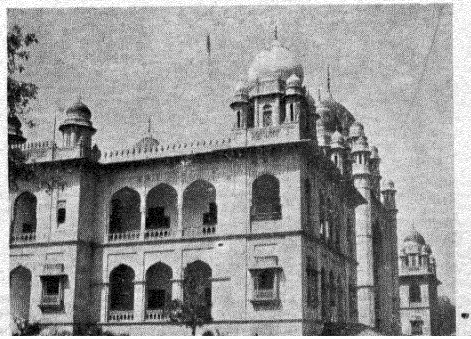
بادشاہی عاشر



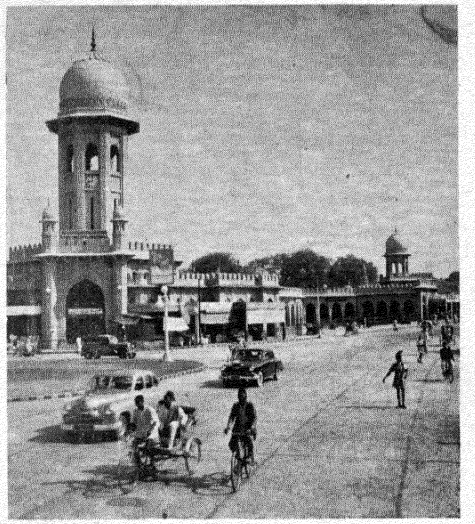
حیدرآباد میوزیم



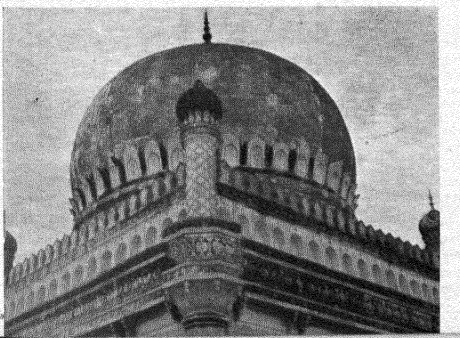
مکہ مسجد



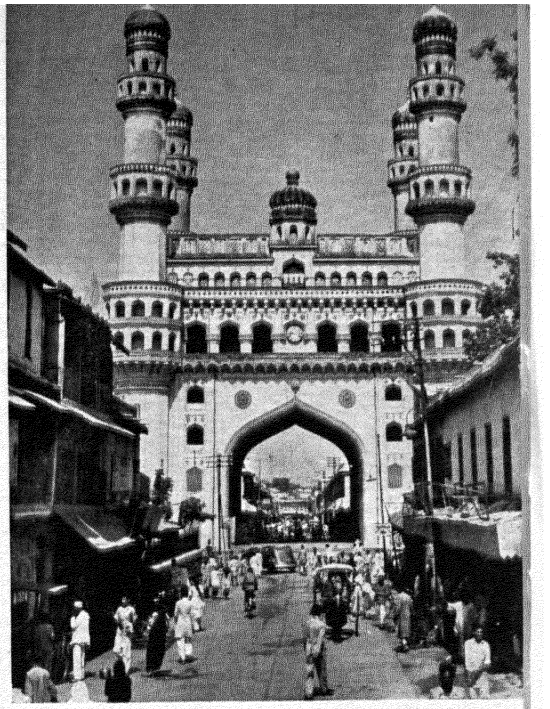
ہائی کورٹ



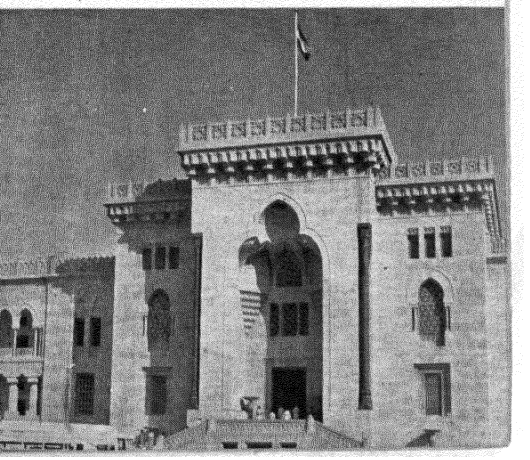
معظم جاہی مارکیٹ



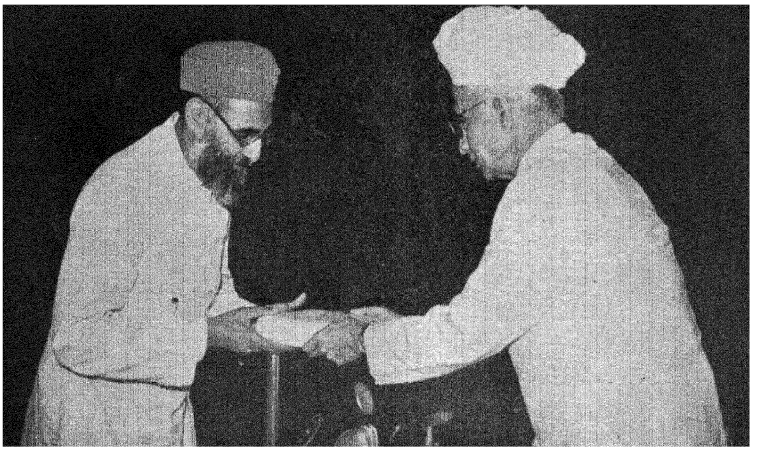
سلطان محمد قطب شاہ کا مقبرہ



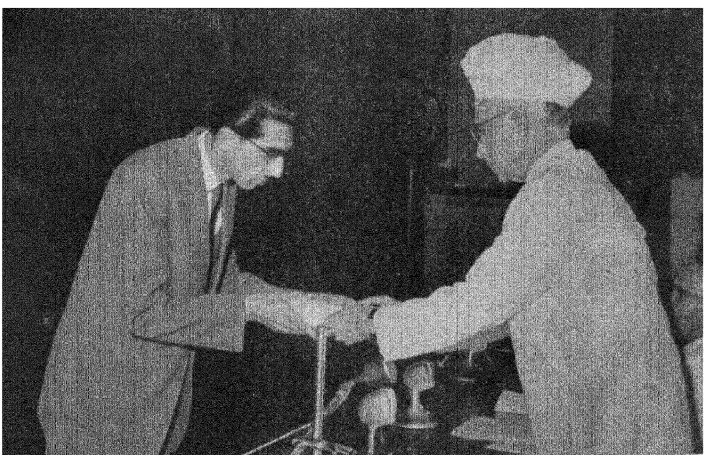
چارمینار



عثمانیہ یونی ورسٹی



نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن امتیاز علی عرشی کو ساہتیہ اکادمی کا انعام عطا فرما رہے ہیں۔



رحمان راہی
ساہتیہ اکادمی
کا انعام
لے رہے ہیں

شمسی طہرانی

# فن کاروں کا کورس

شاخِ گل، برگِ حنا، غنچۂ نسرین و سمن — موسمِ گل ہیں مہکتی ہوئی کلیوں کی پھبن
قلبِ شبنم پہ مچلتی ہوئی سورج کی کرن — دستِ فردوس کی چٹکی ہیں وہ دامانِ چمن
جشنِ نکہت کدۂ صبحِ گلستاں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

ہم نہ بہکیں تو حسینوں سے تصادم بھی نہ ہو — ہم نہ لہکیں تو فضاؤں پہ تبسم بھی نہ ہو
ہم نہ چہکیں تو عنادل کا ترنم بھی نہ ہو — ہم نہ مہکیں تو بوئے گل کا تلاطم بھی نہ ہو
جلوۂ حسنِ طلسماتِ بہاراں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

گوشۂ باغ نہ گلرخ نہ گلابی نہ گلاب — شیخ و شاہد نہ شبستاں نہ شگوفے نہ شباب
سرو و سنبل نہ سمن زار نہ ساقی، نہ سحاب — رامش و رنگ، نہ رم جھم نہ روانی نہ رباب
حُسنِ فطرت کا کسی دل میں بھی ارماں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

منعقد جشنِ خرابات سرِ شام نہ ہو — زینتِ ساغرِ زرّیں مئے گلفام نہ ہو
پائے رنداں پہ سرِ گردشِ ایام نہ ہو — دولتِ حافظ و دارائی خیام نہ ہو
شانِ رحمت کدۂ بادہ فروشاں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

ہم سے ہی کاوشِ افسون و فنوں کاری ہے — ہم سے ہی کاہشِ سرمستی و سرشاری ہے
ہم سے ہی ولولۂ شوخی و طرّاری ہے — ہم سے ہی جلوۂ رنگیں کی طلبگاری ہے
بزمِ عشرت نہ رہے شہرِ نگاراں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

ہم اگر سبزۂ خوابیدہ کی قسمت نہ جگائیں ہم اگر نرگسِ شہلا سے نگاہیں نہ ملائیں
ہم اگر غنچۂ تمنا سرِ گلشن نہ بہائیں ہم اگر گُل کو تبسم کی ادائیں نہ سکھائیں
سوزِ بلبل نہ رہے سازِ بہاراں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

چرخ پر دولۂ انگیز گھٹائیں نہ رہیں سانۂ باراں کی طرب ریز صدائیں نہ رہیں
موسمِ گُل کی جنوں خیز ہوائیں نہ رہیں صحنِ گلشن کی دل آویز فضائیں نہ رہیں
رنگ و مستی کا جہاں میں کوئی ساماں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

ہم اگر تلخیٔ غم سے زمانہ نہ مٹائیں رشتۂ عمر جو ہم اپنا امید سے نہ ملائیں
ہم اگر دغدغۂ روزِ جزا کو نہ ہٹائیں ہم اگر قصۂ لب بستۂ خوباں نہ سنائیں
داستانِ خضر و چشمۂ حیواں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

آرزوئے رخِ شمشاد قداں ہے ہم سے سرمیں سودائے خمِ زلفِ بتاں ہے ہم سے
حسنِ خود عشق کی جاں تگراں ہے ہم سے عالمِ پیر بھی تازہ جواں ہے ہم سے
زینتِ انجمنِ حسنِ گریزاں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

قلب کو محرمِ اسرار بنائے پھر کون؟ آنکھ سے دولتِ انوار لٹائے پھر کون؟
شام کا حسنِ مجسم بار بڑھائے پھر کون؟ صبح کا جلوۂ سرشار دکھائے پھر کون؟
شامِ رنگیں نہ رہے صبحِ درخشاں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

ہم کتابِ دلِ انساں کا جو اُلٹیں نہ ورق ہم جو انساں کو سکھائیں نہ سیاست کا سبق
ہم اگر اپنی جبینوں سے نہ ٹپکائیں عرق رد ہے تقدیر کریں رنگِ عمل سے جو نہ فق
جہدِ پیہم کی تڑپ قلب میں غلطاں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

رضیہ سجاد ظہیر

# گُر

حامد کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ رات جو کوفت اسے ہوئی وہ کوئی نئی بات تو نہ تھی مگر اس سے ایک بار پھر اس کو پریشانی پیدا ہو گئی تھی کہ آخر لوگ اسے کیوں بُرا سمجھتے ہیں۔ ویسے کسی نے اس سے خود تو نہیں کہا تھا کہ وہ بُرا ہے مگر اِدھر اُدھر سے اڑتی ہوئی اس کے کان میں بھی پڑ ہی جایا کرتی تھی اور وہ حیران رہ جاتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ صورت شکل اس کی اچھی تھی۔ کپڑے وہ سلیقے سے پہنتا تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا کسی سے بدتمیزی اور بدتہذیبی نہیں کرتا تھا دوسروں کو کھلاتا پلاتا ــــ اپنی موٹر میں گھماتا، آڑے وقت پر قرض دیتا ــ پھر یہ کیا بات تھی کہ کسی محض میں وہ کسی کے پاس دس منٹ بھی جم کر بیٹھ جاتا تو وہ شخص کھسکنے لگتا ــــ اور پھر کوئی معمولی یا کوئی بڑا بہانہ بنا کر کسی اور گروہ میں جا ملتا اور وہاں سے بیٹھا بیٹھا ایسی سہمی ہوئی نظروں سے حامد کو کبھی نہارتا کہ لیتا کہ گویا کوئی بلا تھا جو چمٹ جاتا۔ حامد کا دل کہتا یہ سب تجھ سے جلتے ہیں۔ یہ سب احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں، یہ خود غرض ہیں، یہ خود انتہائی غیر دل چسپ ہیں۔ مگر عقل کہتی ایک دو آدمی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو سکتے ہیں، دو چار دس انسان ایک ساتھ احساسِ کمتری میں کیوں کر مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی اس کو ماننا ہی پڑتا ــ کہ ان میں سے زیادہ تر لوگ خود غرض نہیں تھے اور دل چسپ بھی تھے ورنہ وہ خود کیوں کر ان میں شامل ہوئے بغیر بے قرار تھا۔

دفتر جانے کے لئے وہ پھاٹک سے نکلا ہی تھا کہ اس کے دوست چوبڑہ کا نوکر ایک پرچہ لئے ہوئے آیا۔ اس نے موٹر روک کر پرچہ پڑھا، لکھا تھا "آج رات کو ۷ بجے مشہور افسانہ نگار شہباز صاحب میرے ہاں آ رہے ہیں۔ تم بھی آ جاؤ۔"

حامد نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر نوکر سے کہا۔ "صاحب سے سلام کہنا اور کہنا کہ ضرور آؤں گا۔ اس وقت دفتر کو دیر ہو رہی ہے ورنہ میں پرچہ لکھ دیتا ــ کہہ دینا ــ اچھا!"

چھٹے کے بعد حامد نے اپنا سب سے اچھا آنکھ موہری والا سوٹ پہنا۔ جیب میں ریشمی رومال تر چھا کر کے لگایا۔ گردن پر اوڈی کلون کی پھوار ڈالی۔ سفید اور سیاہ نوک دار جوتے پہنے اور موٹر لے کر روانہ ہو گیا۔

چوبڑہ کے گھر پہنچا تو وہاں کچھ مہمان آ چکے تھے لیکن شہباز صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ جو مہمان آ چکے تھے اُن میں تسنیم بھی تھی، جو ایک مقامی کالج میں تاریخ پڑھاتی اور اردو میں افسانے لکھتی تھی۔ اس وقت وہ عنابی سوتی ساری پہنے، سیاہ شال اوڑھے ایک صوفے پر شاعر نریندر کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور بہت ہی ہلکے پھلکے موڈ میں تھی وہ اسی صوفے پر نریندر اور تسنیم کے بیچ میں ٹھس کر بیٹھ گیا۔ اس نے گفتگو کو دل چسپ بنانے کے لئے غالب کے دو شعر بھی پڑھے جن میں سے ایک ناموزوں تھا! تسنیم نے تقریباً سات منٹ تک اس کی گفتگو نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ سُنی۔ اور پھر میٹھی چپس لینے اندر چلی گئی!

حامد نے یہ سنا تو غصب ہو اور ہی چاہتا تھا کہ چوپڑہ اندر کمرے سے نکل کے آیا اور نریندر کی طرف بڑھا۔ نریندر صوفہ سے اٹھ کر چھوٹی میز کے پاس حامد کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے ـــــ حامد صوفہ پر اکیلا رہ گیا۔

اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو دیکھا آتش دان کے پاس ریوتی اور علیہ کسی بات پر زور سے بحث کر رہے تھے۔ انور آتش دان پر کہنی ٹکائے کھڑا تھا۔ بیچ بیچ میں ہنس دے رہا تھا۔ بلکشی ایک اسٹول پر بیٹھی کبھی دوسرے اسٹول کو آگے جھکائے کبھی کبھی قہقہوں کی گھنٹیاں بجا دیتی تھی۔ دونوں مردوں کے ہاتھوں میں گلاس اور دونوں عورتوں کے ہاتھوں میں گرم گرم کافی کے پیالے تھے۔ اس نے بہت میں خوب گرمی آگئی تھی۔ حامد اٹھ کر اس گروپ میں شامل ہونے والا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور مہمان خاص اندر آئے۔ ان کے ساتھ ان کی لڑکی بھی تھی جس کی عمر کوئی سولہ سترہ سال ہوگی۔ سب ان کی طرف ایک دم بڑھے۔ حامد نے کوشش کی کہ وہ علیہ اور انور سے آگے بڑھ جائے اور سب سے پہلے ان سے ہاتھ ملائے مگر بلکشی اور کمار بیچ میں آگئے اور ان سے کاوا کاٹنے کی کوشش میں حامد شہباز صاحب کی لڑکی سے ٹکرا گیا۔ لڑکی نے زور کی "اوہ" کی۔ شہباز صاحب ذرا آگے آگئے تھے۔ گردن گھما کر انھوں نے لڑکی کو دیکھا اور پھر مسکرا کے لوگوں میں شامل ہو گئے۔

محفل اب بیٹھتی جا رہی تھی۔ چوپڑہ ایک ایک کر کے لوگوں کو مہمانوں سے ملوا رہا تھا۔ حامد نے تعارف ہوتے وقت دل ہی دل میں فسانے کے خیال سے کہا۔ "میں نے آپ کا وہ افسانہ پڑھا ہے "بھٹیلے کی پرچھائیاں"۔ صاحب کیا مزے کا افسانہ ہے وہ جس میں ..... جس میں ـــ" اور وہ ہکلانے لگا کیونکہ اسے بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ اس افسانے میں لڑکی نے بے وفائی کی تھی یا لڑکے نے دھوکا دیا تھا .....

شہباز صاحب حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگے کیوں کہ انھوں نے اس نام کا کوئی افسانہ کبھی لکھا ہی نہیں تھا! ان کی لڑکی گردن پھیر کر کھس کھس کرنے لگی۔ نسیم نے پیٹیو چپس، علیہ نے کافی کے پیالے پر نظریں جما لیں اور انور کی شریر نگاہیں کمرے کا چکر کاٹنے لگیں۔

جب لوگ کھانے پینے لگے تو حامد کو یکایک یہ سوجھی کہ اس نے ایک سب سے خوبصورت گلاس کو اٹھایا اور بڑے ادب سے شہباز صاحب کے سامنے پیش کیا۔ وہ اپنی اس ذہنی اپج پر بے حد خوش تھا۔ ذرا ان لوگوں کو دیکھو کسی کو یہ نہ سوجھی کہ معزز مہمان کی تو پہلے تواضع کرے۔ بس اب وہ گلاس ان کو دے گا تو ظاہر ہے وہ اسے اپنے پاس بٹھا ہی لیں گے۔ وہ ان سے خوب باتیں کرے گا اور سب لوگ اس کا منہ تکیں گے! وہ دل میں قہقہہ مار نے ہی والا تھا کہ شہباز صاحب نے اپنے سامنے بڑھتا ہوا گلاس دیکھ کر بڑے اخلاق سے مسکرائے اور بولے "حامد صاحب، میں تو نہیں پیتا ہوں آپ پیئیں۔"

ظاہر ہے معزز مہمان کو پیش ہونے والا گلاس خود پینے لگنا تو بدتہذیبی کی انتہا ہوتی۔ اس لئے اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس بھرے ہوئے گلاس کو وہ کب کرے؟ بیچ کمرے میں کھڑا ہوا ہاتھ میں گلاس لئے وہ بڑا عجیب لگ رہا تھا کہ انور نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر گلاس لیتے ہوئے پھس سے کہا۔ "لاؤ یار۔ ادھر دو۔ پہنت ہیں اس کے قدردان ـــ" اور اس سے گلاس لے لیا۔

اب بیچ گلاس کے بیچ کمرے میں کھڑا ہوا وہ اور بھی عجیب لگ رہا تھا۔ اس کی اپنی جگہ بھی بھر گئی تھی کیونکہ کشمی وہاں بیٹھ گئی تھی۔ وہ تو بیچارے تسیم کو اس پر ترس آگیا۔ ایک کونے سے بولی "حامد بھائی ـــ ادھر آجائیے ـــ"

جس چھوٹے سے تخت پر وہ بیٹھی شکیل سے باتیں کر رہی تھی وہاں ایک آدمی کی جگہ نکالی جا سکتی تھی۔ وہ ذرا سا کھسکی، شکیل ذرا سا کھسکا اور حامد اُلٹے پاؤں وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ اب یہ اور بات تھی کہ وہاں سے وہ گردن اونچی کر کے شہباز صاحب کو ہنستے، بولتے یا سنجیدہ گفتگو کرتے دیکھ سکتا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹہ اس محفل میں بیٹھنے کے بعد حامد اس نتیجے پر پہنچا کہ شہباز صاحب کا سا دل چسپ انسان اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب محفل اٹھی اور چوپڑہ نے اس سے کہا کہ وہ شہباز صاحب

کو اپنی موٹر پر ان کی جائے قیام پر پہنچا دے، تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ شہباز صاحب کی لڑکی پہلے ہی کسی اور خاتون کے ساتھ جا چکی تھی۔ حامد نے بڑی مشکل سے شیلا اور انور کو ٹالا جن کے گھر بھی ادھر ہی تھے۔ جلدی سے شہباز صاحب کو اپنی موٹر میں تقریباً دھکیلا اور روانہ ہو گیا۔

زیادہ تمہید میں وقت ضائع ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے اس نے روانہ ہوتے ہی گفتگو شروع کر دی۔ "شہباز صاحب مجھے آپ سے مل کر اتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ دیکھئے اس کو خوشامد نہ سمجھئے گا میں سچ سچ یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ ایسا دل چسپ شخص میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

شہباز صاحب گردن جھکائے سگریٹ سلگا رہے تھے، سر ٹیڑھا کر کے انھوں نے کنکھیوں سے حامد کو دیکھا، مسکرائے، چپ رہے۔

حامد نے بیٹ پر پہلو بدلا۔ "بات یہ ہے کہ..... کہ..... گستاخی معاف۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی اس دل چسپ شخصیت کا راز کیا ہے؟" شہباز صاحب نے تعجب سے حامد کی طرف دیکھا۔ پھر ایک پل کچھ سوچا۔ سگریٹ کا کش کھینچا۔ بولے کچھ نہیں۔ حامد بھی چپ رہا۔

اب کی شہباز صاحب نے پہلو بدلا، حامد کی طرف ہو بیٹھے اور کہنے لگے۔ "دیکھئے حامد صاحب، دنیا میں ہر شخص اپنے آپ ہی کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے اور اپنے ہی آپ میں سب سے زیادہ دل چسپی رکھتا ہے۔ اس لئے اگر آپ لوگوں سے ان کے ہی متعلق بات کریں گے تو ظاہر ہے آپ ہر دل عزیز ہوں گے۔ ٹھیک ہے نا۔"

"جی ہاں۔ یہ تو صاف سی بات ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہ ہو تو اس سے کیسے بات کی جائے۔"

"تو اس سے پوچھئے، سوال کیجئے! نوجوان عورتیں اپنے لباس وغیرہ سے دل چسپی رکھتی ہیں، ذرا سی دار عورتوں کو بچوں سے اور گھر سے دل چسپی ہوتی ہے۔ اور شاعر ادیب تو اپنی تخلیقات سے عشق کرتے ہیں۔" وہ ذرا مسکرائے۔ حامد بھی ہنسا۔ ہاں بھرتے ہوئے سر ہلانے لگا۔

"تو اگر آپ ان چیزوں کے بارے میں سوالات کریں یا تعریف کریں تو بات چیت کچھ آپ کی طرف سے ہو گی، کچھ ان کی طرف سے اور گفتگو کا مزہ اسی میں ہے کہ کبھی کہئے اور کبھی سنئے۔ اور دل چسپ گفتگو شخصیت کی جان ہوتی ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے۔"

"جی ہاں — جی ہاں —" حامد جلدی سے بولا۔ "وہ تو صاف ظاہر ہے۔ آج شام ہی میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نے اپنی باتوں سے کس طرح ساری محفل پر جادو سا کر دیا تھا۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے یہ گر بتا دیا۔"

اس بات کے دوسرے ہی دن اتفاق سے حامد یوں ہی اپنے دوست عمر خان کے یہاں گیا تو اسے دروازے ہی سے کچھ ایسا لگا کہ ڈرائنگ روم میں کئی لوگ ہیں۔ وہ گیلری کی طرف بڑھا تو عمر خان کی بیٹھے نظر آئی جو فون کر رہا تھا۔ "کیا؟ حامد صاحب گھر پر نہیں ہیں؟ کہاں گئے ہیں؟ نہیں معلوم؟ اچھا خیر —" ٹیلیفون بند کر کے وہ ڈرائنگ روم کی طرف مڑا ہی تھا کہ اسے حامد نظر آیا۔ پلک کر وہ اس سے لپٹ گیا۔ "ارے یار تمہیں ہی ٹیلی فون کر رہا تھا ابھی، تمہاری بھابی سے مع بکھ گیا تھا کہ تم کو فون کر دیں مگر وہ بھول گئیں۔" پھر وہ اسے گھسیٹتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ اور پیسے سے بولا — "دوست، پندرہ بیس روپے ہوں تو دے دو۔ کچھ مہمان لیز بلائے آ گئے۔ پرسوں واپس کر دوں گا۔"

حامد نے فوراً بیس روپے نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دئے۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی وہ ادھر اُدھر نظریں ڈال رہا تھا کہ بیگم عرفان آئیں اور شرمندگی سے بولیں۔ "حامد معاف کرنا، میں تمہیں فون کرنا بھول گئی۔ تم تو جانتے ہی ہو میں سدا کی بھلکڑ ہوں۔ معاف تو کرو ہی دو گے نہ — آؤ تمہیں عرفان کی بہن صفیہ سے ملاؤں —"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آتش دان کے پاس لے گئی۔ جہاں ایک چھوٹی سی نیچی میز پر رکھے ہوئے ایک گول مگی کشن پر ایک دبلی پتلی، نازک اندام، اکہرے حسین لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے پاس رکھے ہوئے صوفہ کے ہتھے پر چوڑا بیٹھا قمالیں پر جوتے کھسر کھسر کر کے رگڑتے

ہوئے ہاتھ نچا نچا کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اور وہ ہنسی کے مارے دُہری ہوئی جا رہی تھی!

حامد کا تعارف ہوا تو چوپڑا اپنی جگہ چھوڑ کر نسیم کے پاس جا بیٹھا۔ حامد چوپڑہ کی جگہ تو بیٹھ گیا مگر اس کی ٹانگیں ذرا چھوٹی تھیں اس نے بھی چوپڑا کے انداز میں فرش پر کھسر پھسر کرنا چاہا تو صوفے کا ہتھا اس کے نیچے سے نکل گیا۔ اور اس گڑبڑ میں صفیہ نے اس سے نہ جانے کیا کہا۔ وہ سُن ہی نہیں سکا! بہرحال اس نے صفیہ کا لباس تو دیکھ ہی لیا تھا، بڑے اخلاق سے مسکرا کے کہا۔ "آپ کا بلاؤز بڑا خوبصورت ہے، کیا آپ نے خود سیا ہے؟"

اس بلاؤز کا گلا بے حد بڑا تھا اور آستینیں تھیں ہی نہیں۔ صفیہ نے ذرا سا کسمسا کے اور تیوری پر بل ڈال کے فوراً ساری کا پلو اپنے وجود پر کچھ اس طرح لپیٹا کہ وہ سارا بلاؤز چھپ گیا جس کی تعریف ہوئی تھی۔ حامد کو احساس ہوا کہ شاید کچھ غلطی ہوگئی — موضوع بدل کر پوچھا — "آپ کہاں پڑھتی ہیں؟"

"میں پڑھ چکی۔" صفیہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو آپ کیسے کام کرتی ہیں؟ آپ ایسی تیز اور ذہین لڑکی بے کار تو نہیں رہ سکتی۔"

حامد نے سوچا۔ اس بات میں سوال بھی ہے اور تعریف بھی گڑ کے دونوں حصّے پورے ہوتے ہیں۔ یہ رہی نہ بات!

"میں کام نہیں کرتی۔" صفیہ نے مختصر سے جواب دیا۔ وہ اس طرح پہلو بدل رہی تھی جیسے کسی جال میں پھنس گئی ہو۔ چاروں طرف سے لوگ اس کو ترس بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر اس نے سامنے میز پر رکھے ہوئے ایک رسالے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو حامد نے چوتھا سوال کر دیا۔ "رسالوں سے آپ کو دلچسپی ہے؟"

اب صفیہ کا چہرہ آدھا سیگریٹ سے دھواں نکل چکا تھا کہ ایک خوبصورت نوجوان اندر کمرے سے نکل کر آیا۔ اس کی گود میں سال بھر کی ایک رونق ہوئی بچی تھی جو فوراً صفیہ کی گود میں منتقل ہوگئی! حامد حیران رہ گیا!

صفیہ کو بچی میں مصروف دیکھ کر چوپڑہ نے حامد کو اپنی طرف اشارہ کیا۔ اس تخت پر دونوں طرف چوپڑہ اور نسیم دو تھے اور بیچ میں، پیچھے کی طرف گاؤ تکیہ سے لگی ایک خاتون بیٹھی تھیں، کھچڑی بال مگر بہت شگفتہ چہرہ اور روشن آنکھیں۔ سبز ساری اور سیاہ بلاؤز پہنے وہ بڑی خوش مزاجی سے نسیم سے کچھ بحث کر رہی تھیں۔ تعارف ہوتے ہی حامد چوپڑہ کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔ "آپ لوگ کس بات پر بحث کر رہے تھے؟" حامد نے احتیاطاً یہ سوال کیا تھا تاکہ ان خاتون کی دل چسپی کے موضوع کا پتہ چل جائے تو پھر وہ ویسی ہی بات کرے۔

وہ طشتری میں سے پان نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے بولیں، "ذرا بچوں کی سائیکالوجی پر کچھ بات ہو رہی تھی۔"

"خوب۔ خوب۔" حامد نے کہا۔ "ظاہر ہے بچوں کے متعلق وہی بہتر رائے دے سکتا ہے جسے تجربہ ہو — آپ کے اپنے کتنے بچے ہیں؟" — اور پھر اس نے یوں چاروں طرف دیکھا جیسے اپنے اس جملہ کی تعریف سننا چاہتا ہو۔ پھر اس نے دیکھا کہ ان خاتون کے چہرے پر ایک کھسیانی سی مسکراہٹ آئی — چوپڑہ نے زور سے قہقہہ لگایا — "دیکھ لیا آپ نے — اب یہی بات میں آپ سے کہتا ہوں مس منو چا تو آپ مانتی ہی نہیں۔"

حامد کو پسینے چھوٹنے لگے۔ ہکلا کے بولا "معاف کیجئے گا... میں.... میں... میرا مطلب تھا کہ....."

"کوئی بات نہیں — کوئی بات نہیں۔" ان خاتون نے کہا۔ مگر ان کے تیور اس سے ظاہر ہو رہے تھے کہ انھوں نے فوراً ساری سنبھالی۔ تخت سے اتریں اور اندر چلی گئیں۔

اب حامد کو عرفان پر غصہ آنے لگا۔ نہ جانے اُسے ان ظالموں کے حوالے کر کے خود وہ کہاں غائب ہوگیا تھا۔ اس کو ڈھونڈنے کے خیال سے وہ اُٹھنے ہی والا تھا کہ ایک کونے سے انور کی آواز آئی۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین — بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج شاعر سہیلی صاحب بھی یہاں موجود ہیں اور ہم لوگوں کے اصرار پر اپنا کلام سنائیں گے۔" سب نے تالیاں بجائیں اور پھر چپ ہوگئے!

شعر و شاعری کے بعد جب کھانے کا سلسلہ چلا تو حامد ادھر اُدھر سے کترا تا ہیل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ اور جب ان کے پاس بیٹھی ہوئی تسنیم کوئی چیز لینے اندر گئی۔ تو وہ فوراً اس کی جگہ پر بیٹھ گیا اور بولا:

"ہیل صاحب، مجھے آپ کا کلام سننے اور آپ سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔" یہاں تک وہ ہمہ پایا تھا کہ اسے تسنیم آتی دکھائی دی۔ اور جگہ پر قبضہ رکھنے کے لئے اس نے پھر جلدی سے بات شروع کر دی۔ "ہیل صاحب یہ آپ شاعر لوگ جو عشقیہ چیزیں لکھتے ہیں تو سچ مچ آپ کو عشق ہوتا ہے یا کہ....."

ہیل صاحب سوکھا سا منہ بنا کر بولے "ارے نہیں صاحب سچ مچ کسی کو عشق ہو جائے تو دیوالہ نکل جائے۔ دیکھا دیکھی کی بات ہوتی ہے۔"

چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگ ہنسنے لگے، حامد نے ان کی ہنسی کی پروا کئے بغیر دوسرا سوال کر دیا "اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں ہیل صاحب کہ آپ لوگ اتنے اچھے شعر کیسے کہہ لیتے ہیں۔ کمال ہے صاحب۔"

ہیل صاحب کی پل بھر کی خاموشی میں حامد نے دو تین سوال اور کر ڈالے:

"ترقی پسندی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ہیل صاحب؟"

"آپ کو ایک نظم کا اوسطاً کتنا مل جاتا ہے؟"

"چوبیس گھنٹوں میں کتنے گھنٹے آپ شعر کہنے میں لگا سکتے ہیں؟"

شاعر چپ چاپ سینڈوچ کھاتا رہا!

حامد آٹھواں سوال کرنے ہی والا تھا کہ صفیہ نے ایک کونے سے چیخ ماری — "ارے بھئو" کچھ لوگ دوڑے، کچھ کھڑے ہو گئے، ایک دو عورتوں نے چیخیں ماریں۔ محفل تتر بتر ہو گئی۔

جاوید نے باہر نکلتے وقت کئی دبانوں کو پھس پھس کہتے سنا "بھئی اس وقت بھئو کی خیریت نے بڑی پوریت سے بچایا!"

موٹر کے ایکسیلیٹر پر زور سے پاؤں مارتے وقت حامد کا دماغ زور زور سے یہ سوچ رہا تھا کہ شباز صاحب نے جو گر بتائے اس میں اصل گُر کی بات وہ مزدور چھپا گئے۔ ورنہ تو.....

## سگریٹ

صدیق نظر

میرے ہاتھوں میں جلتا سگرٹ ہے
جس کے نیلے دھوئیں کا مرغولہ
ایک لمحہ کے بعد فانی ہے
جس کے ہر دائرے میں شکل تری
عہدِ ماضی کے دوش پر رقصاں
"راہِ تخئیل سے گزرتی ہے"

سوچتا ہوں تو یاد آتے ہیں
زندگی کے وہ کیف زا لمحات
وہ محبت کے دن خوشی کی وہ رات
جب مرے ہاتھ میں تھا تیرا ہات
زندگی نذر کر رہی تھی مجھے
قول و اقرار کی جواں سوغات
تھے محبت کے نرم ہونٹوں پر
تازہ و انداز کے حسیں نغمات
گوشۂ دل میں میرے بجتی تھی
روز و شب تیرے پیار کی بارات

میرے ہاتھوں میں جلتا سگرٹ ہے
جس کے نیلے دھوئیں کا مرغولہ
میری آنکھوں کے گرد ناچتا ہے
جس کی اک مختصر کہانی ہے
جس کا ہر پیچ و تاب فانی ہے

سوچتا ہوں کہ عرصۂ غم میں
زندگی خود بھی ایک سگرٹ ہے
وہ بھی جلتی ہے یہ بھی جلتا ہے
قصۂ زیست یوں ہی چلتا ہے

# فراق سے ایک ملاقات

حضرت فراق گورکھپوری یوم جمہوریت کے مشاعرہ میں شرکت کرنے گزشتہ ۲۴ جنوری ۱۹۶۲ کو دلی تشریف لائے تھے۔ ۲۵ جنوری کو موصوف نے میری درخواست پر یہ گراں قدر انٹرویو مرحمت فرمایا جس کا میں ذاتی طور پر ممنون ہوں۔

**شوق:۔** فراق صاحب! اپنی شاعری میں آپ نے کون سے مقاصد مدنظر رکھے ہیں؟

**فراق:۔** اپنی غزلوں میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ وجود حسن و محبت اور واردات زندگی کے تصور سے یہاں تک کہ مناظر کے بھی تصور سے اپنے شعور و وجدان میں گیرائی اور گہرائی پیدا کروں، ہلمارت پیدا کروں، شرافت جذبات پیدا کروں، نرمی اور معصومی پیدا کروں اور سوز و گداز کی وہ کیفیتیں پیدا کروں جو آفاقی کلچر کی نمائندگی کر سکیں۔ موجودہ صدی کی پہلی دہائی کی اردو شاعری کے شعور اور لہجے میں اکاد کا شاذ کو چھوڑ کر ایک خشونت اور کرختگی، سطحیت اور عدم سنجیدگی اور بہت سی ناخوش گوار باتیں پائی جاتی تھیں۔ نفسی آن بان پر پورا زور صرف کر دیا جاتا تھا۔ حسن و عشق کی پرستش مفقود تھی۔ شاعر کا ایمان زندگی پر نہیں تھا، مذہب اور خدا پر بھلے ہی ہو۔ لہجے میں گھلاوٹ نہیں تھی۔ جنسی تعلقات کی لطافت و پاکیزگی کا احساس نہیں تھا۔ انھیں خرابیوں کی اصلاح میں نے اپنی غزل کا مقصد اور نصب العین بنایا۔ غزلوں میں کہیں کہیں اور نظموں میں متعدد موقعوں پر مناظر قدرت کے روحانی پہلو، ان کی رمزیت، انسانی زندگی سے ان کی ہم آہنگی، ان سے پیدا ہونے والی داخلی کیفیات، ان کی خوبیوں کی اور فضا آفرینی کا اظہار میں نے کیا ہے۔ 'روپ' کی رباعیوں میں گھریلو زندگی کی الوہیت اور عورت کی دیوتائیت کو اجاگر کرنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ الفاظ اور فقروں کی متی کو نئے سرے سے گوندھنے کی کوشش کی تاکہ شاعری کا ایک نیا جینیرن بن سکے۔ ایک نئی داخلیت اور ایک زیادہ پچی ہوئی خارجیت پیدا کرنے کی کوشش میں نے اپنی شاعری میں کی ہے۔ دعوت عمل سے میں نے شاعری کو عدم نہیں رکھا۔ لیکن جو دعوت فکر میری شاعری میں ہے وہ محض دعوت عمل نہیں ہے نہ محض برائے عمل ہے۔ بلکہ وجدد اور عمل دونوں کے جمالیاتی پہلو کی وہ معصوری ہے جس میں قدیم سنسکرت ادب اور دنیا کے بہترین ادب کی تھرتھراہٹیں سنائی اور دکھائی دیں۔ من اور زبان کے لحاظ سے میری کوشش یہ رہی ہے کہ ایک نیا نغمہ پیدا ہو جائے۔ الفاظ میں نئی جھنکاریں پیدا

ہو جائیں اور شاعری انسانیت کی آواز سے ہم آہنگ ہو جائے۔

**شوق:۔** دکھ، درد، رنج، مصیبت، غم و الم کا زندگی میں کیا مقام ہے؟

**فراق:۔** میرا ایک شعر ہے ؎

اک غم وہ ہے انساں کو جو رہنے نہ دے انساں
اک غم وہ ہے انساں کو جو انساں بنا دے

میرا ایک دوسرا شعر ہے ؎

حیات عشق کے اہم تھوں اہم حیات نہیں
غم و خوشی کے لئے آدمی کی ذات نہیں

تو سوال غم و خوشی کا نہیں ہے بلکہ ایک ایسی طمانیت کا ہے جو ماورائے غم و مسرت ہے اور جو غم و نشاط کو اپنے اندر جاری و ساری رکھتی ہے۔ نشاطِ وجود کا ہی دوسرا پہلو غم و سنجیدگی ہے۔ ہمیں ایک نئے بچپن کی تلاش ہے یا یوں کہئے کہ ہمیں اپنے ہی پرانے بچپن کی تلاش ہے۔ ہمیں اس بلوغیت رسیدہ طفلی کی ضرورت ہے جس کے دوش پر ابدیت خیز و برکت کا ناقہ رکھ دیتی ہے۔ جب درد میں انتہائی راحت سموئے اور انتہائی راحت و سکون میں جب درد سموئے زندگی اس وقت زندگی بنتی ہے۔

**شوق:۔** حیات بعد ممات کے متعلق آپ کیا سوچتے ہیں؟

**فراق:۔** اس باب میں میرا کوئی بنا ٹھاٹکا عقیدہ نہیں ہے۔ بالفرض اگر مر جانے کے بعد کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم روح کہیں یا مثالی جسم کہیں کچھ عرصہ تک یا بہت عرصہ تک قائم بھی رہے تو ابدی یا دائمی طور پر ایسا نہیں ہو سکتا۔ فرد واحد کے دوام کا میں قائل نہیں ہوں جیسے دریا یا سمندر کی موجوں کو دوام نہیں ہے۔

**شوق:۔** اخلاقی زندگی اور اخلاقی فرائض کا فلسفہ کیا ہے؟

**فراق:۔** کسی آسمانی کتاب یا کسی خدا یا پیغمبر کے احکام پر میں اخلاق کو مبنی نہیں سمجھتا اور نہ انھیں اخلاق کا محرک سمجھتا ہوں۔ اخلاق کا ایک عملی پہلو ہے اور وہ تاریکی اور ارتفاقی ہے۔ دوسرا پہلو اخلاق کا وہ ہے جسے ہم روحانی پہلو کہتے ہیں۔ مثلاً عملی طور پر خدمتِ خلق اخلاق کا ایک پہلو ہے۔ وجدانی طور پر ٹسٹکنتلا کا وہ تصور جس نے کالیداس کے وجدان میں جنم لیا یا شاعرِ اعظم ہومر کے وہ اشعار جن کا تعلق عمل سے نہیں ہے بلکہ محض وجدانی محسوسات سے ہے یا وہ وجدانی کیفیت جو موسیقی سے اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے اخلاق کے دوسرے غیر عملی پہلو ہیں جنھیں میں روحانی پہلو کہتا ہوں میری ایک رباعی ہے:

جاگ اٹھے گی رُوح تم سو جاؤ گے
سرچشمۂ زندگی میں دھو جاؤ گے
کھو جاؤ گے جب مناظرِ فطرت میں
اپنے سے بہت قریب ہو جاؤ گے

ایک دوسری رباعی میں اخلاق کے بیک وقت عملی اور وجدانی یا روحانی پہلو پر میں نے یوں روشنی ڈالی ہے

خلقت کو سنوارنے سے عبادت کیا ہے
دنیا کا شباب آئے جنّت کیا ہے
ماں کے کدۂ جہاں کا ذرّہ ذرّہ
سرشارِ عجائب ہو حقیقت کیا ہے

حقیقتاً اخلاق کا عملی پہلو ایک درمیانی منزل ہے۔ آخری منزل اخلاق کا کچھ کرنا نہیں ہے بلکہ کچھ ہونا ہے۔ وہ دن تو آکر رہے گا۔ انسان کی اجتماعی کوششوں سے افلاس، ظلم، بے رحمی، بے انصافی اور فریب قریب تمام دوسری بدعتیں مٹ جائیں گی۔ اس وقت ہم خدمتِ خلق صرف اپنے وجدان اور عالمِ وجود سے کر سکیں گے۔ یعنی داخلی زندگی کے لئے ایک ایسی آب و ہوا پیدا کرتے رہیں گے جس سے شورِ انسانی میں اور انسانی

کردار میں خوشبو اور تروتازگی پیدا ہوتی رہے۔ یہی سبب ہے کہ خارجی عمل کے لحاظ سے بلکہ نیت اور ارادے کے لحاظ سے جو لوگ اچھے انسان ہیں ان سے زیادہ عزت و احترام ان رشیوں اور مہاتماؤں اور اُن فن کاروں اور شاعروں کا ہم کرتے ہیں جو دنیا اور زندگی کی فضا کو روحانی عمل سے شاداب رکھتے ہیں۔ ایک انگریز مفکر نے کہا ہے کہ فن اخلاق سے بھی زیادہ یا اخلاق ہے۔ میں اکثر اخلاقی زندگی کی مثال کسی ایسے منظر یا سایہ دار درخت سے دیتا ہوں جس کی چھاؤں میں ہم اپنی تھکن مٹاتے ہیں اور سکون پاتے ہیں، دھرتی، آکاش، دریا اور پہاڑ، پھلتا پھولتا بچہ، بچیاں، انسان، جوان، سنسار میں جو کچھ بھی ہے اس کا وجود ہی ایک اخلاقی عمل ہے بلکہ فنونِ لطیفہ میں اور شاعری وادب میں تو بداخلاقی کا بھی تابناک پہلو دکھلایا گیا ہے۔ اقبالؔ نے اپنی اس نظم میں جہاں ابلیس جبرئیل سے خطاب کرتا ہے۔ ابلیس کی طرف سے کہا ہے ع

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

پرانا بھارت میں دھرم راج یدھشٹر جب جنت پہنچے تو کوروؤں کو بھی جنت ہی میں دیکھا ہے۔ راون بھی رام کے ہاتھوں مر کر سیدھا جنت پہنچا۔ دائمی عذاب کا تصور یدا خلاقی پر مبنی ہے۔ البتہ دنیا میں ظلم اور بے انصافی کے خلاف لڑنا عملی اخلاق کا ایک درخشاں پہلو ہے۔ روس کے ایک مشہور ادیب نے کہا ہے کہ پھانسی کے تختے پر ہر مجرم حضرت عیسیٰ سے مشابہ ہوتا ہے۔ قاتل کو پھانسی دے چکنے کے بعد اس سے نفرت نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہے بیرا فلسفۂ اخلاق۔ یہ بھی بیرا کا شعر یاد آگیا ؎

قتل کے بعد غصہ کیسا ہے لاش مری اٹھانے دو
ہم بھی جان سے جاتے رہے ہیں آؤ تم بھی جانے دو

میری ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ اضافی اور عملی لحاظ سے نیکی اور بدی کا تفرقہ مٹا دیں اور لوگوں کو منمانی کرنے کی آزادی دے دیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ بدی کو بُرا سمجھو لیکن بدی کرنے والے سے نفرت نہ کرو۔ بے غصہ کے ہوئے بدی کے خلاف لڑنا بلند ترین اخلاق ہے۔ کیمونسٹوں سے میرا اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ وہ ظلم اور ظالموں کے خلاف لڑیں بلکہ اس لئے کہ گالیاں اور دانت نہ پیسیں۔ سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے خلاف اسی طرح لڑیں جیسے انگریزی سامراج کے خلاف گاندھی جی لڑے یا غلامی کے خلاف جس طرح نیپولین جواہر لال نہرو لڑ رہے ہیں۔ اس طرح جد و جہد کریں۔ لڑیں نہیں۔ اخلاق عملی اخلاقی مقاصد سے بلند تر حقیقت ہے۔

شوق :- فراق صاحب! دنیا میں مذہب کا کیا مستقبل ہے؟

فراق :- وہ تمام مذاہب مٹ جائیں گے جو اپنے سے مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو جہنمی سمجھتے ہیں۔ سب سے پہلے تعلیم دنیا کو صرف ہندو مذہب نے دی۔ یہ تعلیم عام ہو جائے گی اور انسانیت کا ورثہ بن جائے گی۔ میرے نزدیک ہندو مذہب کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ خدا کے وجود پر ایمان لانا بالکل ضروری نہیں بلکہ شعور میں روحانیت پیدا کرنا، نظریے میں روحانیت پیدا کرنا محسوسات میں روحانیت پیدا کرنا ضروری ہے۔

شوق :- اور آپ کے خیال میں روحانیت کس وقت پیدا ہوتی ہے؟

فراق :- روحانیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہماری انسانیت میں لطافت پیدا ہوتی چلی جائے۔ پوری انسانیت ایک ملت بن جائے گی۔ یہ ملت ہندو ملت یا اسلامی ملت نہ ہوگی بلکہ انسانی ملت ہوگی۔ بلند ہندو فکریات عقیدوں سے آزاد ہو کر اس ملت

کا خواب دیکھتی رہی۔ ہم کو اپنی زندگی سے کثافت کا بوجھ کم کرنا ہے۔ بے حسی یا کم حسی یا غلط حسی سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ میں مادی ترقی کو لامحدود نہیں سمجھتا۔ اس کے بدلے ہمیں زندگی میں ایک داخلی انقلاب پیدا کرنا ہے۔ ہم جو ہیں اگر وہی رہے تو دوسرے سیارے پر آباد ہو کر اور ستاروں پر پہونچ کر بھی ہم کوئی تارے نہیں توڑ لائیں گے۔ بجری اور بیٹھی نیندیں جو سکون ہے اور پُر شعوری روحانی تشنج ہے اُسے بیدار زندگی میں منتقل کرنا ہے۔ بہرحال تقسیم اور قسمتے وہ چیزیں ہیں جنھیں مٹنا ہے ع

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

---

وقار جلیل

# شہر حیدرآباد

مرا شہر ہے ایک شہرِ نگاراں — جہانِ وفا، محفلِ گلعذاراں
ہر اک خواب تعبیرِ حسنِ بہاراں — یہ ارضِ مہ و مہر، یہ بزمِ یاراں
مرا دلبر صد رشکِ سرو و سمن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

یہیں عظمتِ فکر و تہذیبِ فن ہے — یہیں شعر و نغمے کا البیلا پن ہے
یہیں ہر ادا لطفت کا ہر سُو چلن ہے — یہیں زندگی کا ہر اک بانکپن ہے
ہر اک دل یہیں مثلِ گل خندہ زن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

یہ بزمِ غزالاں یہ سروِ خراماں — یہ طاؤسِ رقصاں، یہ ابرِ بہاراں
یہ صبحِ خراماں، یہ شامِ فروزاں — یہ پُکھراج و نیلم، یہ گلزار و ایواں
محبتوں کی مہکی ہوئی انجمن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

جہاں اعتبارِ ریاضِ سخن ہے — جہاں ہر خوشی گُل رُخ و گلبدن ہے
جہاں ہر نفس، ہر قدم باپکن ہے — جہاں آرزو راز دارِ چمن ہے
وہ دلدار ہے، دل ربا ہے، سجن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

دیارِ دکن، عظمتِ قطب شاہاں — دیارِ دکن، صولتِ کچ کُلاہاں
دیارِ دکن، قسمتِ خوش نگاہاں — دیارِ دکن، دولتِ دادخواہاں
ہر اک لب پہ نامِ دیارِ دکن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

شانتی رنجن بھٹا چاریہ

# منشی تاریخی چرن متر

تاریخی چرن متر ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ جناب محمد عتیق صدیقی نے "گلکرسٹ اور اس کا عہد" میں لکھا ہے:

"کالج کونسل (فورٹ ولیم کالج) کی کاروائی مورخہ ۲۹۔ اپریل ۱۸۰۱ء سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کالج کے ہندوستانی شعبے میں حسب ذیل منشیوں کا تقرر عمل میں آیا تھا ——

چیف منشی میر بہادر علی حسینی، تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار، سکنڈ منشی تاریخی چرن متر تنخواہ ایک سو روپیہ ماہوار ——"

اور پھر آگے چل کر صفحہ ۱۹۷ پر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی جو فہرست دی ہے اس میں تاریخی چرن متر کا نام بھی درج کیا ہے اور لکھا ہے:

"۴۔ اپریل ۱۸۰۱ء کو تاریخی چرن متر کی تنخواہ اسی روپیہ ہوئی اور وہ چیف منشی مقرر ہوئے ——"

لیکن یہ درست نہیں ہے۔ چیف منشی کی تنخواہ اسی روپیہ نہیں بلکہ دو سو روپیہ تھی۔ اور ۴۔ مئی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج کے مختلف شعبوں میں پنڈت اور منشی رکھے گئے۔ اس دن کی رپورٹ میں درج ہے کہ تاریخی چرن متر ایک سو روپیہ ماہوار پر نائب منشی مقرر ہوئے اور اس وقت چیف منشی میر بہادر علی حسینی تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میر بہادر علی زیادہ عرصہ تک اس عہدے پر قائم نہیں رہے، کیونکہ ۱۹۔ دسمبر ۱۸۰۹ء کی رپورٹ کے مطابق میر شیر علی افسوس ہیڈ منشی تھے نہ کہ میر بہادر علی حسینی۔ ۱۹۔ دسمبر ۱۸۰۹ء کو ہندوستانی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ منشی میر شیر علی افسوس کے انتقال پر کالج کمیٹی نے منشی تاریخی چرن متر کو دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ہیڈ منشی مقرر کیا۔ رپورٹ میں یہ بات صاف درج ہے:-

At a Council held on 1st February 1810, Meer Sher Ulee Ufsos Head moonshee in the Hindoostanee Dept: having departed this life on the 19th of December 1809—Resolved that the following promotion and appointments in the Dept. take effect from the 21st December, vize Taranee Churan, appointed Head Moonshee on 21st December in the room of Meer Sheer Ulee deceased[1]

تاریخی چرن متر ہندوستانی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ منشی کی حیثیت سے مئی ۱۸۳۰ء تک یعنی ۲۱ سال کے طویل عرصہ تک ملازمت کرتے رہے اور اس کے بعد ۵۸ سال کی عمر میں ایک سو روپیہ پنشن پر ریٹائر ہوئے[2]۔ اس کے بعد تاریخی چرن ہمارا جہ کاشی کے دربار میں ملازم ہوئے۔ راجہ راوھا کانت دیپ کی کوشش سے انھیں

---

[1] Home Dept: Miscellaneous P-186-No: 561

[2] رپورٹ میں لکھا گیا ہے

The following situation to cease from 1st June 1830.

یہ کام ملا - کاشی جا نے کے بعد بھی راجہ راد ھا کانت وتیب سے ان کی خط و کتابت رہی بتاریخ ۱۸- مئی ۱۸۳۴ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاشی کے کمشنر تھے اور راجہ ان کی بہت عزت کرتے تھے -

یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اردو کی کسی ادبی تاریخ میں تاریخی چیرن متر کا حال درج نہیں ہے حتیٰ کہ محمد عتیق صدیقی نے بھی 'گل کرسٹ اور اس کا عہد' میں ہندوستانی ڈیپارٹمنٹ کے اس چیف منشی کا تذکرہ نہیں کیا ہے - اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس معاملے میں انھوں نے تحقیق کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں ہم کو دیگر تمام منشیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتی ہیں کیوں کہ مصنف نے اُن سب کا تذکرہ کیا ہے - مثلاً میر امن، بہادر علی حسینی، حفیظ الدین، میر شیر علی افسوس وغیرہ - لیکن انھوں نے تاریخی چرن متر کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں لکھا جو کتاب کی سب سے بڑی کمزوری ہے کیوں کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے "تاریخی چرن متر ایک طویل عرصے تک فورٹ ولیم کالج کے چیف منشی رہے - اس سے ظاہر ہے کہ آپ کو اردو اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا ورنہ اس دور میں آپ اتنے عرصہ تک اس اہم عہدے پر ملازم نہ رہتے -

تاریخی چیرن متر بنگلہ، اردو، ہندی اور فارسی کے عالم تھے - آپ نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران میں اردو ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا علم یہیں آج نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں ادبی تذکرے آپ کے باب میں خاموش ہیں - تاریخی چرن متر نے اردو اور ہندی کی کئی کتابیں لکھیں - اور کالج کے ہندوستانی محکمے میں جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان میں آپ کا نمایاں حصہ رہا - سالکھاری ڈلہ (کلکتہ کا ایک محلہ) بدن پالی پرگنہ[1] کے ایک اشتہار سے ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس پریس سے ۱۸۲۵ء میں آپ کی ایک کتاب "گولا دھا"

---

[1] دیکھئے بنگلہ ہفتہ وار سماچار درپن ۱۸۲۵ء

نامی شائع ہوئی تھی - یہ کتاب ناگری حروف میں شائع کی گئی اور یہ درجہ پنجم کے لئے تھی - جناب محمد عتیق صدیقی نے ان کتابوں کی ایک فہرست دی ہے جن پر کہ ہندوستانی مصنفوں کو انعامات دینے کے لئے ڈاکٹر گل کرسٹ نے کالج کونسل کو لکھا تھا - اس فہرست میں تاریخی چرن متر کا نام بھی ہے لکھتے ہیں:-

" نام کتاب - نقلیات نمانی - صفحات تین سو - رقم انعام چھ سو روپیہ - مصنف تاریخی چرن متر مولوی امانت اللہ سدل مسر پنڈت، میر بہادر علی حسینی میر شیر علی افسوس، شری لال کب اور غلام اشرف "

گل کرسٹ نے انعام کی تجویز کرتے ہوئے لکھا ہے :-

" اوّل الذکر تین متر جمین خصوصیت کے ساتھ انعام کے مستحق ہیں کیونکہ بنگالی، عربی اور سنسکرت سے ترجمہ کرنے کا سارا بوجھ ان ہی پر تھا اور ان میں بھی تاریخی چیرن متر نے سب سے زیادہ محنت کی ہے - "

فورٹ ولیم کالج کے علاوہ تاریخی چیرن متر کا تعلق اسکول بک سوسائٹی[1] سے بھی رہا ہے - میں نے کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کی کئی سالانہ رپورٹیں دیکھی ہیں - ۱۸-۱۸۱۷ء کی رپورٹ میں مولوی عبدالواحد کے علاوہ چار بنگالیوں کے نام ہیں (۱) تاریخی چرن متر (۲) رادھا کانت دیپ (۳) رام کمل سین (۴) مرتنج ودیا لنکار - اور ان میں تاریخی چرن متر کو سب سے بلند مقام حاصل ہے - یعنی وہ اس کے سکریٹری ہیں - اسکول بک سوسائٹی کی ۱۸-۱۸۱۷ء سے لے کر ۳۱-۱۸۳۰ء کی رپورٹوں میں میں نے تاریخی چرن متر کا نام پایا ہے اور ان رپورٹوں سے حسب ذیل باتوں کا علم حاصل ہوا - ۱۸-۱۸۱۷ء کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ :-

" بابو تاریخی چرن متر نے جو کہ اسکول بک سوسائٹی کے دیسی سیکرٹری ہیں اور مترجم کی حیثیت سے مقبول ہیں

---

[1] اسکول بک سوسائٹی ۴- جولائی ۱۸۱۷ء کو قائم ہوئی - یہ ادارہ اسکولوں کے لئے کتابیں تصنیف کرنے، شائع کرنے اور تقسیم کرنے کا کام کرتا تھا -

ان کہانیوں کا جس کا تذکرہ اس سے قبل کیا جا چکا ہے بنگلہ سے اب ہندوستانی میں ترجمہ کیا گیا ہے، پریس کے لئے تیار ہے اور چار ہزار جلدیں شائع کرنے کے لئے آرڈر دیا گیا ہے تاکہ وہ موجودہ اور آیندہ کے لئے کام آئیں۔"

دوسرے سال یعنی ۱۹-۱۸۱۸ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چار ہزار جلدیں ختم ہو گئی ہیں اور وہ چار ہزار ناگری حروف میں چھاپی گئی ہیں۔ اس یا ایک ہزار جلدیں اردو حسروف (Well shaped Persian nustaleeq) میں چھاپی گئی تھیں اور وہ بھی ختم ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے پھر سے دو ہزار جلدیں اردو میں چھاپنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ اب چھاپی جا رہی ہیں۔ ۲۰-۱۸۱۹ء کی رپورٹ میں تاریخی چیرن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

"That the thanks of this meeting be cordially given to the native member and officer of the Society, and more especially to Baboo Tarinee Churn Mitra for his constant labours on the society account."

۲۱-۱۸۲۰ء کی رپورٹ سے ہمارے علم میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ "اردو رسالہ" جسے گل کرسٹ نے تصنیف کیا تھا اس کی دو ہزار جلدیں پریس سے آئی ہیں۔ اور چوں کہ کیپٹن روبک کا انتقال ہو چکا ہے اسلئے بابو تاریخی چرن متر کو اس کتاب کے سلسلے میں کافی محنت کرنی پڑی اور آپ کی نگرانی میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ کیپٹن روبک کی کتاب 'کھڑی بولی کی کہانیاں' جو کہ مرحوم مکمل نہیں کر پائے تھے اس کو بابو تاریخی چیرن متر نے مکمل کیا ہے اور اب وہ پریس میں ہے۔

اس کے بعد ۳۱-۱۸۳۰ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی چرن متر نے ایک 'انگریزی ہندوستانی لغت' کا مسودہ کمیٹی کو پیش کیا جسے کمیٹی نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا ہے۔



کورس کی کتاب تھی۔ عتیق صاحب نے لکھا ہے:۔

" گل کرسٹ کی یہ کتاب کئی اعتبار سے قابل ذکر ہے جس میں Aesops fables کے کچھ قصوں کا ہندوستانی فارسی، عربی، برج بھاشا، بنگلہ اور سنسکرت میں ترجمہ تھا۔ ان زبانوں میں خود گل کرسٹ نے ترجمہ نہیں کیا تھا بلکہ کتاب کے سرورق کی عبارت کے مطابق مختلف لوگوں نے یہ ترجمے کئے تھے۔ مترجمین کی تفصیل یا ان کے نام درج نہیں کئے گئے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ ہندوستانی، فارسی، عربی، بنگلہ اور سنسکرت کے شعبوں کے منشیوں ہی نے یہ ترجمے کئے ہوں گے۔"

میں اپنی تحقیق کے دوران میں یہ پتہ لگانے میں کامیاب ہوا ہوں کہ مندرجہ بالا کتاب کا کس نے کس زبان میں ترجمہ کیا۔ اس مشہور کتاب کا بنگلہ، اردو اور فارسی ترجمہ کرنے میں تاریخی چرن متر نے بڑا حصہ لیا ہے۔ جان گل کرسٹ نے تفصیل یوں لکھی ہے:۔ ان دیسی عالموں کے نام جن لوگوں کو اس کتاب کے ترجمے کے لئے مقرر کیا گیا حسب ذیل ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| ۱- | تاریخی چیرن متر | زبان بنگلہ، فارسی اور ہندوستانی |
| ۲- | میر بہادر علی حسینی | 〃 فارسی اور ہندوستانی |
| ۳- | میر شیر علی افسوس | 〃 〃 〃 |
| ۴- | مولوی امانت اللہ | 〃 عربی اور فارسی |
| ۵- | سدل مسر | 〃 سنسکرت |
| ۶- | شری لال کب | 〃 بھاکا |
| ۷- | غلام اشرف | 〃 فارسی |

تاریخی چرن متر کے انتقال کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا۔ شاید کاشی میں ۱۸۳۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

حسن عسکری کاظمی

# یہ سینے، یہ چٹانیں

مٹیالی، سیلی اور سپاٹ دھرتی کا سینہ چوٹ اور دھمک سے چھلنی ہو رہا تھا اور ٹھیکیدار کا سینہ ہر چوٹ پر پھول رہا تھا جیسے ابھی کوئی تیل کا فوارہ پھوٹ پڑے گا یا چمکتے ہوئے ہیرے یا دمکتے ہوئے سونے کی کوئی ہتھ لگ پڑے گی جو ٹھیکیدار کی ملکیت بن جائے گی یا جیسے ابھی اسٹیٹ بنک کا آہنی دروازہ ٹوٹ جائے گا اور کرنسی برس پڑے گی۔

"کیا کر رہا ہے رامو، چل، جلدی جلدی کام کر۔ حرام خور۔"

ٹھیکیدار کے صبر کا پیمانہ چھوٹ گیا۔ وہ کہیں دور اونچی چٹان سے برس پڑا۔

پھاوڑے، سیلیاں اور کدال ایک ساتھ اٹھے اور مضبوط چٹیل چٹانوں نے ہار مان لی اور پگھلنا شروع ہو گئیں۔ تڑاک۔ تڑاک۔۔۔

اور ٹھیکیدار کی سرخ چٹانوں کی طرح کھوکھلی اور سپاٹ پتلیاں مدھم پڑنے لگیں۔ اجنبی ڈورے آنکھوں سے پرے چلے گئے۔

پھر پسینے سے کالے مٹیالے جسم چمچمانے لگے۔ ننھے اور ناتواں بازوؤں میں بھی بھی کی ابھری ہوئی چھلیاں پھر نیند کے جھونکے میں آنے لگیں۔ پیٹ کی سکیڑیں دہری ہونے لگیں — تو ٹھیکیدار کا جبر کا گھوڑا پھر بپک اٹھا۔ چٹانی آنکھیں جاگ گئیں۔ اجنبی ڈورے کو دوڑے اور شعلے برسنے لگے۔

"او بے کیا کرتا ہے۔۔۔۔۔ اور ایک موٹی سی گالی کی پیڑھی پر قہر کی چابک برساتی ٹھیکیدار کے منہ سے پھوٹ پڑی اور ننھی مضبوط، چمپئی، ننگی کھوپڑیوں سے ٹکرا کر ہانپتے ہوئے سینوں سے ہم جانے کی بات کہتی ہوئی پھر ٹھیکیدار کے منہ میں لوٹ آئی۔

یہ اخلاق کے ڈورے تو زندگی سے ناتہ جوڑے ہوئے تھے اور یہی زندگی کے تانے بانے تھے۔ ابھی رامو کی رادھا آتی ہوگی۔ وہ روز بارہ بجے آتی ہے۔ اپنے نازک سیندوری ہاتھوں سے پروسی ہوئی مٹیالی موٹی موٹی روٹیاں لاتی ہے۔ اور رامو اس کے عوض دن بھر کی کمائی روزی، روٹی میں کنکر کے دانوں تلے آجاتے ہی اس کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر رادھا کی سرد آنکھوں کے گنگوتری اس گرمی سے پگھل جاتے ہیں اور گنگا بہہ نکلتی ہے۔ چٹانوں کے اندر بھی راستے بن جاتے ہیں۔

"کاش ٹھیکیدار۔۔۔۔۔" اور رامو صرف اتنا ہی سوچ پاتا کہ ٹھیکیدار پھر دور سے چیخ اٹھتا۔

"اے رامو۔۔۔۔ حرام زادے۔۔۔۔۔ مجدوری کرتا ہے یا استی۔ چل کام کر وقت ہو گیا۔"

اور رادھا جھوٹے برتنوں کی تھالی اپنے سینے سے لگائے چلی جاتی۔ سوامی کا جھوٹا تو مانگ کا سیندور ہے — سہاگ کی امانت ہے۔

'رادھاؤں' کے جاتے ہی پھاوڑے اور سیلیاں پھر تنی جاتیں ایک — دو — تین — سینکڑوں — ہزاروں۔ اور چٹانیں

تڑپنے لگتیں۔ ٹھیکیدار کا سینہ پھولنے لگتا۔
یہ سینے اور یہ چٹانیں ....
راجو صرف اتنا ہی سوچ پاتا۔ ٹھک۔ ٹھک۔ تڑاک ...
تڑاک۔ چلاّ اُٹھتے اور گنگا کا خاموش شور ھا پانی راستہ بدل کر منھ پھیر لیتا۔
اور کام کرتے کرتے اچانک ایک دن بلیاں رک گئیں۔ کدالیں سہم سی گئیں۔ پھاوڑے اٹکنے سے لگے۔ ٹھیکیدار کا سویا ہوا ذہن چٹکے کھانے لگا۔
" کیا ہے رامو — کام کیوں رک گیا ؟ — بول !" ٹھیکیدار اپنی ساری قوت سے گرج اُٹھا۔
" سرکار کھجانا —" رامو کی کدال کی ٹن ٹن نے کسی خزانے کا بھید پالیا تھا۔
اور ٹھیکیدار نے ایک افیم کی گولی میٹھے متوک کے لعاب میں گھول کر اپنے گلے کے نیچے اتار لی۔
" روک دے کام — رامو — میں آرہا ہوں۔" ٹھیکیدار کی آواز یہیں نہ جانے کہاں سے خزانے کی نرم کھنک آگئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا آپہونچا۔
" کہاں ہے کھجانا — لا کدال مجھے دے — میں کھودوں گا ادھر ہو کام چور خزانہ میرا ہے۔"
اور نہ جانے کہاں سے ٹھیکیدار کی قوت لوٹ آئی۔ اس کے مرے ہوئے بازوؤں کی مچھلیاں خزانے کے مقناطیس سے کھنچ کر اُبل پڑیں۔
ایک — دو — تین — کئی بار کدال چٹانوں کے اندر چھپے ہوئے خزانے سے ٹکرائی۔
' ٹن — ٹن — ٹن ' اور کسی مزدور نے پیچھے سے کہہ دیا — "یہ کھجانا ہمارا ہے۔"
مگر ٹھیکیدار نے سنی اَن سنی ایک کر دی۔
ٹن — ٹن — تڑاک — تڑاک
خزانے کو چھپائے ہوئے چٹان ٹوٹ گئی۔ کدال کی نوک لوہے سے ٹکرائی اور ایک چنگاری پھوٹ پڑی۔ ایک انوکھی روشنی کی لہر کوند گئی اور آناً فاناً سرد ہو گئی۔ ٹھیکیدار کے ہاتھوں پر بھی ہوئی کدال پھر بھسر پور نیچے گری اور ٹکرائی۔ پھر چنگاری نہیں پھوٹی جیسے کسی سنت لکڑی کے ٹکڑے سے ٹکرا گئی ہو۔
اور مزدور لپک پڑے — "یہ کھجانا ہمارا ہے — یہ کھجانا ہمارا ہے۔"
پھر کئی کدالیں ایک ساتھ اٹھ گئیں۔ بجلی کوندی اور ٹھیکیدار پیچھے ہٹ گیا۔
رامو نے جلدی جلدی ٹوٹی ہوئی چٹانیں ہٹائیں جیسے ماں کی چھاتی میں منہ کا بسیرا تلاش کر رہا ہو۔
سامنے خزانہ تھا جو صرف رامو کا تھا۔ اس کے تمام ساتھیوں کا تھا۔ کئی سو برس پرانی چٹانوں کے نیچے۔ کئی پرانی اور نئی تہذیبوں کی تہہ میں — جو آج بھی اسی طرح زندہ تھا۔
مزدور بے چین ہو اُٹھے۔ رامو نے بڑھ کر خزانے پر اپنا سینہ رکھ دیا۔ ٹھیکیدار کی سانس اُکھڑنے لگی اور مزدور جھک گئے۔
اور کئی ہزار برس پرانی اور زنگ خوردہ کدال اور مضبوط چٹیلی اور سوکھی انسانی کھوپڑی سے پٹ گئے۔
جیسے خاموش زبان سے کہہ رہے ہوں — دیکھو ہم امر ہیں۔

# نئی کتابیں

## عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور

سلسلۂ اشاعتِ مخطوطاتِ اردو - دہلی یونی ورسٹی - نبرا
تالیف نواب اعظم الدولہ بیر محمد خاں بہادر سرور مع مقدمہ از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی پروفیسر و صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۳۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کپڑے کی مضبوط جلد ہے اور ٹائپ بیں دبیز کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت بیس روپے۔

تذکرۂ سرور آٹھ سو سے زیادہ شعرائے اردو کے حالات اور کلام پر مشتمل ہے۔ حالات فارسی میں ہیں۔ اس نسخے کا متن انڈیا آفس لائبریری لندن کے نسخۂ تذکرۂ سرور کے عکس سے تیار کیا گیا ہے۔ ایک مختصر مگر مبسوط مقدمہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے قلم سے شاملِ کتاب ہے جس میں تذکرۂ سرور کے متون، سرور کے حالاتِ زندگی تذکرے کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ درج ہے۔ اب تک یہ مفید اور تاریخی تذکرہ مغرب کی لائبریریوں کی زینت تھا۔ اسے شائع کرکے دہلی یونی ورسٹی نے اردو کے ادبی سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

## دیوانِ میر

مرتبہ سردار جعفری - ناشر ہندستانی بک ٹرسٹ کھتان بھون دوسری منزل، بے ٹاٹا روڈ۔ بمبئی ۔ فرہنگ ہندی الگ چھپا ہے۔ قیمت مع فرہنگ بیس روپے۔ کتاب خوب صورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ نفیس کپڑے کی جلد سے مزین ہے۔ ہر صفحہ اردو کے سامنے کا صفحہ ہندی رسم الخط میں چھپا ہے۔ دونوں ہندی یا اردو جاننے والے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ادارہ دیوانِ غالب اسی اسلوب سے شائع کر چکا ہے۔ ایک مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ کتاب کے شروع میں مرتب کے قلم سے ہے۔

## گلِ تر

مخدوم محی الدین کا مجموعۂ کلام - ناشر مکتبۂ دعبا ۷ اجنبر گاہ حیدرآباد دکن۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔ صفحات ۸۸۔

مخدوم اردو زبان کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ان کا خلوص ہے، ان کا بیدار سماجی شعور ہے۔ خود ان کا قول ہے کہ سماجی تقاضے پُراسرار طور پر شعر لکھواتے ہیں۔ ان کے یہاں ماسکو، نیا چین، تلنگانہ پر نظمیں ہیں وہاں بھاگ متی، پیار کی چاندنی اور احساس کی رات پر لطیف جذبات کا اظہار ملتا ہے۔

## عروسِ فطرت

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اردو کے نہایت ممتاز ادیب و شاعر ہیں۔ ان کی نیچرل نظموں کا مجموعہ 'عروسِ فطرت' کے نام سے مکتبۂ نرالی دنیا بازار سیتا رام دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت تین روپے۔

آثر صاحب کی قادر الکلامی سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ غزل ہو یا نظم دونوں اصنافِ سخن پر آپ کو یکساں قدرت ہے۔ اس مجموعے میں ۳۹ نظمیں شامل ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس مجموعے

کی اردو کے حلقوں میں یا عموم اور خاص اس میں یا خصوص قسم کی جائے گی۔

## سخنِ مختصر

فرزدق کے بعد غالب کا یہ دوسرا مختصر مجموعہ شائع ہوا ہے۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ قیمت دو روپے۔

کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور بڑی صاف ستھری ہے۔ جذبی ذہین بیدار کے مالک ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں اسی ذہنی بیداری کی جلوہ سامانیاں ملتی ہیں ؎

آج بھی سر سے گزر جاتی ہیں امواجِ بلا
آج بھی اپنے ابھرنے کے نشاں ملتے ہیں

اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ اور سب جذبی کی انفرادیت کی آئینہ دار۔

## مُصنفینِ اُردو

مرتبہ سید وزیر حسین زیدی۔ ناشر غالب بک ڈپو گنپت روڈ لاہور۔ قیمت ڈھائی روپے۔ ہر صفحہ آرٹ پیپر پر بلاک میں چھپا ہے۔ میر امن دہلوی سے شوکت تھانوی تک ۵۰ نثر نگاروں کے حالات، نمونۂ نثر اور تصویر اس خوب صورت کتاب میں درج ہیں۔ اس سے قبل اسی قسم کا ایک مختصر تذکرہ شعراء کے باب میں مرتب نے ہندوستان ہی میں تقسیم سے قبل شائع کیا تھا۔

## ساگرِ سنگیت

مصنفہ سی۔ آر۔ داس۔ مترجم مؤلف لکھنوی۔ ناشر آدرش کتاب گھر ۲۹-۱۵۲۵ فیض گنج، دریا گنج دہلی۔ قیمت ایک روپیہ دو آنے پیسے۔

اصل تصنیف نظم میں ہے۔ ترجمہ نثر میں ہے۔ ترجمہ رواں اور سلیس ہے۔ مؤلف صاحب تخلیق و ترجمہ پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔ ان کا یہ ترجمہ بنگالی ادب کے ایک شاہکار سے اردو حلقوں کو روشناس کرائے گا۔

## نوائے سروش

مصنف جمیل سنبھلی۔ مصنف نے تاج پریس باری روڈ گیا کے پتے سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

جمیل صاحب بڑے مشاق تاریخ گو ہیں۔ تعمیہ اور تخمیس کے بغیر اپنی تاریخیں قابلِ داد ہیں۔ اس دور میں یہ فن مٹتا جا رہا ہے صرف ایک تاریخ مثال کے طور پر درج ہے۔

مولوی محمد یعقوب صاحب کے فرزند کی تاریخ ولادت ہے

پانچو مریو سنے ورخانۂ یعقوب آمد

۱۳۵۸ ہجری

کتاب کا تاریخی نام بھی قابلِ داد ہے:۔

مجموعۂ قطعاتِ تواریخ

۱۹۶۱ عیسوی

کتاب کی قیمت تین روپے ہے۔

## اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ

اختر شیرانی
بیگانہ چنگیزی

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے یہ دو انتخاب شائع کئے ہیں۔ اس سے قبل بھی متعدد شعراء کے انتخاب چھپ چکے ہیں۔ دونوں انتخابوں میں سے ہر انتخاب کی قیمت ۵۰ نئے پیسے ہے۔

## عروسِ تمنا

پروفیسر حامدی کاشمیری کا مجموعۂ کلام۔ ناشر ادارۂ ادب بھوری کدل سری نگر کشمیر۔

حامدی صاحب افسانوں اور ناول کی دنیا میں تو نام پیدا کر ہی چکے تھے۔ اب ان کی یہ تصنیف بہ صنفِ نظم شائع ہوئی ہے۔ حامدی درد مند دل رکھتے ہیں اسی لئے ان کے یہاں اس قسم کے نشتر ملتے ہیں

چھو گئی تھی کبھی دل کو تری بھولی سی نظر
وہ نظر اب مری تعذیر ہوئی جاتی ہے

قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

## مضراب

شباب للت کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ۔ کرشنا برادرز پبلشرز لمیٹڈ یا مکتبہ اردو ادب، لکھی چھاؤنی جموں۔

شباب للت کی خوش گوئی اُن کے کلام سے آشکارا ہے۔ غزلیں اور نظمیں دونوں اس کتاب کی زینت ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ہائے تقدیر میں لکھے ہوئے دانوں کی کشش
آخر سنجانِ چمن دام تک آ پہنچے ہیں
ہے اعتبار طبعی شامل مری روش میں شباب
کبھی میں فسردہ دل ہرچہ باد باد نہیں

لیکن ان کی نظموں میں غزلوں سے زیادہ خلوص اور بلندی ہے۔ اسے فالِ نیک سمجھنا چاہیئے۔

## بدیہیات

ساحر ہوشیارپوری کا مجموعۂ کلام۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی۔ قیمت تین روپے

## Pilgrimage of Eternity

اقبال کے جاوید نامے کا انگریزی ترجمہ از شیخ محمود احمد۔ دیباچہ از جسٹس عبدالرحمٰن۔ ترجمہ بھی منظوم ہے اور اقبال کی معرکہ آلارا تصنیف کو جو ڈانٹے کی Divine Comedy کے ہم پلہ سمجھتے ہیں لکھی گئی انگریزی جاننے والوں سے متعارف کرائے گا۔ قیمت باڑہ روپے ملنے کا پتہ انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر کلب روڈ لاہور ۲ (ع م)

## نئے ڈرامے

مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ صفحات ۱۴۲۔ قیمت پانچ روپے۔ کتابت، طباعت اوسط۔

اس مجموعے میں مختلف ڈرامانگاروں کے بارہ ڈرامے شامل ہیں اور سب کے سب جدید اسٹیج کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر منتخب کئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے مرتب نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ان دنوں ملک میں اسٹیج کے احیاء کی وجہ سے ایسے ڈراموں کی تلاش ہونے لگی ہے جو اسٹیج کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ یہ ڈرامے زیادہ تر عہدِ حاضر کے سماجی مسائل سے متعلق ہیں۔ اسے جدید اُردو ڈراما کا نمائندہ انتخاب کہا جا سکتا ہے۔

## پردیسی کے خطوط

مصنف۔ بھون گورکھپوری، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔ صفحات ۲۱۶۔ قیمت دو روپے ۷۵ نئے پیسے۔ کتابت طباعت عمدہ۔ یہ بھون گورکھپوری کے بارہ خطوط کا مجموعہ ہے جن میں انھوں نے زندگی اور ادب کے مختلف مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ بھون صاحب ایک بلند پایہ ادیب و نقاد ہیں اور انھوں نے مختلف موضوعات پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بصیرت افروز ہے اور دل چسپ بھی۔ ان خطوط کے مخاطب کم عمر لوگ ہیں۔ لکھوں کہ بقول مصنف "میں نے اپنے سے کم عمر لوگوں کو اس لئے مخاطب کرنا مناسب سمجھا کہ میری آواز زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہو سکے گی۔"

## فن اور فن کار

مصنفہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ۔ ناشر مجلسِ تحقیقات اردو جبلپور صفحات ۱۰۹۔ قیمت مجلد تین روپے۔ غیر مجلد دو روپے ۵۰ نئے پیسے کتابت طباعت اوسط۔

یہ مجموعہ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جن میں جدید موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے قدیم ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس سے مصنفہ کی وسعتِ مطالعہ اور سائنسی اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ یقین ہے کہ یہ مجموعۂ مضامین اردو ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

## عظمتِ رفتہ

از ضیاء الدین احمد برنی۔ ناشر تعلیمی مرکز کراچی ۱۔ صفحات ۵۱۲۔ قیمت دس روپے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور خوبصورت جلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

اس میں ۹۳ شخصیتوں کے سوانح حیات درج ہیں جن کو مصنف نے بڑے دل چسپ انداز میں قلم بند کیا ہے۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو کسی نہ کسی میدان میں صاحبِ عظمت ہوئے اور تاریخ میں اپنا انمٹ نشان چھوڑ گئے۔ جو زندگی کی اعلیٰ قدروں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ کتاب میں بعض نوابات فوٹو درج ہیں۔ ہر لحاظ سے یہ کتاب

اردو کے سوانحی ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔

## مولانا ابوالکلام آزاد۔ کتاب التذکرہ

جامع پروفیسر ہمایوں کبیر۔ مترجم ڈاکٹر سید ولی الدین۔ ناشر ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بخیریت آباد، حیدرآباد صفحات ۴۸۹۔ قیمت چھ روپے۔ کتاب ٹائپ میں خوبصورت چھپی ہے۔

زیر نظر کتاب ملک و بیرون ملک کے اکابر کے ان مضامین پر مشتمل ہے، جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اور مختلف عنوانات سے اس جلیل القدر ہستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مضامین انگریزی میں لکھے گئے۔ فاضل مترجم نے انھیں اردو میں منتقل کرکے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔

## محمد بن قاسم سے حملۂ بابر تک

مصنف۔ نیاز فتحپوری۔ ناشر یونیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ صفحات ۴۲۷۔ قیمت چھ روپے پچاس نئے پیسے۔ کتابت طباعت اچھی۔

اس کتاب میں تیرہ ابواب ہیں، جن کے تحت محمد بن قاسم کے حملہ سے لے کر ظہیر بابر تک تاریخ اسلامی ہند کا سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ہر دور کے سیاسی، انتظامی، سماجی اور تہذیبی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاص کر مفید مطالعہ ہے۔

## تاریخ اسلام حصہ اوّل

از الحاج مولانا بشیر علی نقی نقوی۔ ناشر سید حیدر حسین اسسٹنٹ سیکرٹری امامیہ مشن لکھنؤ۔ صفحات ۱۸۱۔ قیمت دو روپے

کتاب میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر بعثت رسول کریمؐ تک اسلامی تاریخ کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ امامیہ مشن نے اسلامی تاریخ کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی یہ پہلی کڑی ہے۔

## پوسٹ مارٹم

مصنف عبدالاحد صاحب تخلص بھوپالی۔ ناشر فخر ادب پبلیکیشنز پری گھاٹ۔ بھوپال۔ صفحات ۱۸۳۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے

کتابت طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔

زیر نظر کتاب طنزیہ اور مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں بڑے توازن کے ساتھ مختلف شخصیتوں کا خاکہ ان کے سماجی پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے اور اپنے مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

چند سال ہوئے اسی نام سے عرشی طبیانی صاحب کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔

## ویبک کی کہانی

از جمیل خان۔ ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ صفحات ۱۴۳۔ قیمت دو روپے۔ کتابت، طباعت اوسط۔

اردو میں حیوانی دنیا سے متعلق کتابوں کی بہت کمی ہے۔ فاضل مصنف نے ویبک کی کہانی لکھ کر ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب میں ویبک کی زندگی اور اس کے خواص سے متعلق دلچسپ معلومات درج ہیں۔

## گرو دیو ٹیگور

مصنف دویک بھٹا چاریہ۔ مترجم شہباز حسین۔ ناشر میڈرڈ پولیٹن یک کمپنی پرائیویٹ لیمٹڈ۔ ۱۔ نیتاجی سبھاش مارگ دہلی ۶۔ صفحات ۱۰۴۔ قیمت چار روپے۔ کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔

اس کتاب میں شاعر اعظم ٹیگور کی گوناگوں شخصیت اور ان کے فن و ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے نظریات و خیالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعارف شامل ہے۔ ترجمہ نہایت رواں اور سلیس ہے۔

## سوامی وویکانند

شائع کردہ سری رام کرشن مشن نئی دہلی۔ صفحات ۱۰۶۔ قیمت ایک روپیہ۔ کتابت، طباعت عمدہ۔

یہ سوامی وویکانند کی زندگی کی کہانی ہے۔ جسے انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ رواں اور سلیس ہے۔ سوامی جی کے حالات

اور ان کے پیغام سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

## پاکستان کی بساط سیاست

مصنف خواجہ غلام محمد - کوچہ روح اللہ خاں دہلی ۶ - صفحات ۱۹۱ - قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے - طباعت، کتابت اچھی۔

اس کتاب میں پاکستان کے حالات و واقعات اور وہاں کے اہل الرائے حضرات کے خیالات اور پاکستانی اخبارات کے اقتباسات یکجا کرکے شائع کئے گئے ہیں - سیاست سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب مفید مطالعہ ہوگی۔

## حاجی بغلول (ناول)

مصنف منشی سجاد حسین - مرتبہ جمیل جالبی - ناشر مشتاق بک ڈپو نزد اردو کالج - شاہراہ روڈ - کراچی ۱ - صفحات ۲۹۶ - قیمت چار روپے پچاس نئے پیسے - کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اور سیٹ

'حاجی بغلول' ایڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین کا مشہور مزاحیہ ناول ہے جس کو مرتب نے مقدمہ اور فرہنگ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

## یہودی کی لڑکی / خوبصورت بلا

از آغا حشر کاشمیری - ناشر عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ ۱ - ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - کتابت طباعت اوسط - آغا حشر کے ان دو مشہور و مقبول ڈراموں کے نئے ایڈیشن شائع کئے گئے ہیں۔

(م - ش)

---

# 'آج کل' کا 'فن تعمیر' نمبر

## اگست ۱۹۶۲ء میں شائع ہوگا

اس خصوصی نمبر کے لئے مندرجہ ذیل عنوانات پر مضمون درکار ہیں - جو حضرات مضامین لکھنا چاہتے ہیں وہ ایڈیٹر 'آج کل' سے خط و کتابت کریں۔

۱ - ہندوستان کا قدیم فن تعمیر (موہن جوداڑو، ہڑپا وغیرہ)
۲ - بودھ فن تعمیر
۳ - جین فن تعمیر
۴ - غاروں کے تعمیراتی شاہکار
۵ - جنوبی ہند کا فن تعمیر
۶ - ہند آریائی فن تعمیر
۷ - چولکیا طرز تعمیرات
۸ - پٹھان اور مغل فن تعمیر
۹ - پہاڑی فن تعمیر
۱۰ - مشرق میں ہندوستانی فن تعمیر کے اثرات
۱۱ - جدید ہندوستانی فن تعمیر
۱۲ - آزادی کے بعد کی عمارتیں

پتہ:- ایڈیٹر 'آج کل' (اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶)



पीळो तो थोड़ म्हारी गोरी पाणी हे चाली
सारो ही गांम लुभायो गढ़ा मारूजी
अल्ला ने पल्लां साहिब मोर पपैया
घूंघट ऊपर नणदल वाई रो वीर

## موہنی مُورت

پیلو اوڑھے یہ راجستھانی دوشیزہ پانی بھرنے جا رہی ہے۔
باس کی ساڑھی کے پلو پر پپیہے اور مور بنے ہوئے ہیں۔ جہاں
جہاں سے یہ گزرتی ہے، گاؤں والے اس موہنی مُورت
کو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔

# ہاتھ کھڈی

ہمارا قومی ورثہ

# ہندوستانی ڈراما

( از :- ڈاکٹر صفدر آہ )

ڈاکٹر صفدر آہ دنیائے ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ گراں مایہ تصنیف ڈراما کے میدان میں ان کے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ فاضل مصنف نے اس تصنیف کو نصابی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈرامے کی تاریخ اور مغربی و ہندوستانی فن ڈراما سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں مصنف نے اداکاری سے بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں ڈراما اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر ہے۔

صفحات :- ۳۴۷ — قیمت :- تین روپے ۷۵ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶



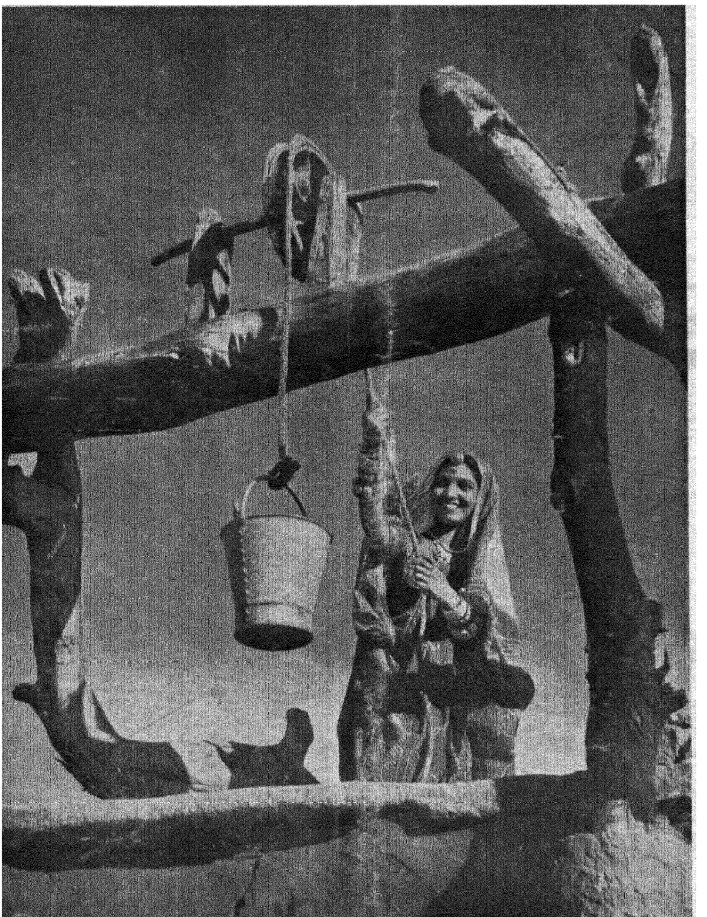
# باہر کے ملکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹ - اسٹریٹ نمبر ۳۴ - پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲ - رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵ - بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا - ۳۱ گرینج روڈ، سنگاپور

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**

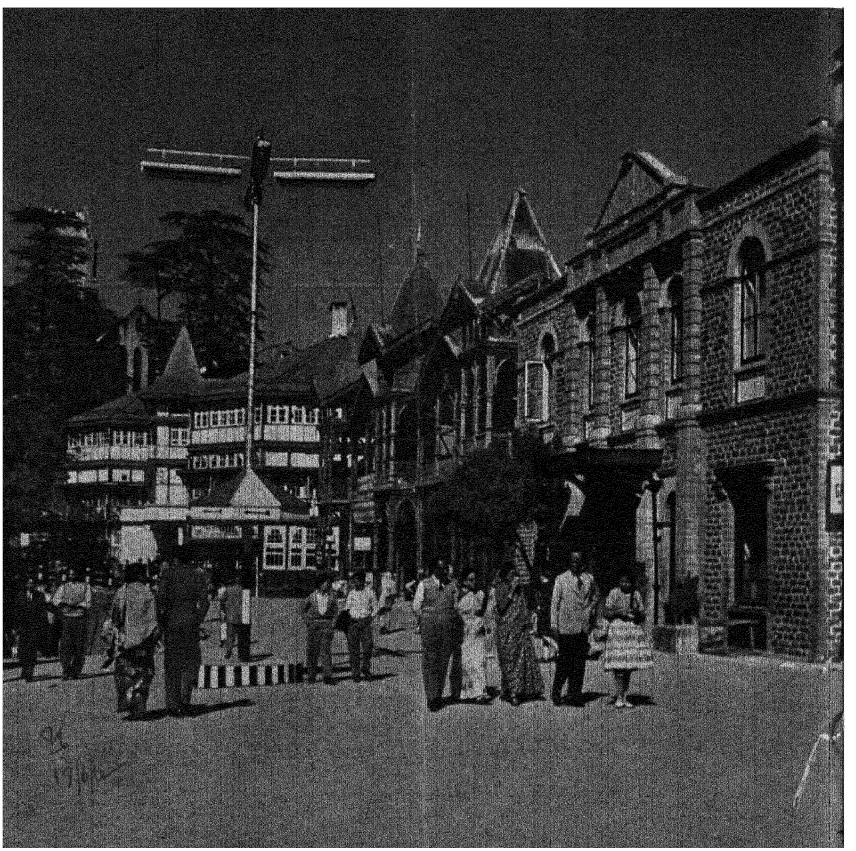
# آج کل

جنوری ۱۸۸۴ء

جون ۱۹۶۲ء

Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN)

۶۰ نئے پیسے



# ہماری اُردو کتابیں



| نام کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ہندوستانی ڈراما | مفدر آہ | ۳ روپے ۷۵ نئے پیسے |
| جوالامکھی (ناول) | انونت گوپال شیوڑے | ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت | ٹیبر منڈی | ۲ روپے |
| ابوالکلام آزاد | —— | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ڈاکٹر سی۔ وی رمن | ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | —— | ایک روپیہ |
| بھارت کی لوک کہانیاں | —— | ایک روپیہ |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | —— | ۷۵ نئے پیسے |
| کلکی یا تہذیب کا مستقبل | ڈاکٹر ایس۔ رادھاکرشنن | ۷۵ نئے پیسے |
| بھارت ۔ آج اور کل | جواہر لال نہرو | ۷۵ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | —— | ۷۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | —— | ۴۰ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | —— | ۳۵ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں نمبر ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷ | —— | فی نمبر ۱۰ نئے پیسے |

—— پیکنگ اور ڈاک خرچ کے لئے کم سے کم ملائے پیسے یا قیمت کا پ ۱۲ فیصدی مزید بھیجئے۔ ——
رجسٹری کے لئے ۵۰ نئے پیسے اس کے علاوہ ہوں گے۔ ۲۵ روپے یا اس زائد کی کتابیں منگوانے پر محصول ڈاک معاف

—— کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کیجئے ——

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| غالب کا تنقیدی شعور | اعجاز حسین | ۳ |
| شاہ کار | واثق فرازی | ۱۰ |
| لچھمی کا عجائب گھر | علی عباس حسینی | ۱۱ |
| زعفران زار کشمیر | اطہر حسین جعفری | ۱۵ |
| غزل | پیام فتحپوری | ۱۸ |
| غزل | وحی عارف | ۱۸ |
| ڈاکٹر دشویشوریہ | شاہدہ سپید | ۱۹ |
| آثار تیموری | محمد یونس خالدی | ۲۷ |
| منصوبے | عشرت قادری | ۳۳ |
| شکست | محمد حسن | ۳۴ |
| غزل | راجیندر بہادر موج | ۴۴ |
| ریڈیم | سردار لال نشتر | ۴۵ |


سرورق :- شملہ کا ایک پُر رونق بازار ۔۔۔

رسالے کا پشت پر :- ' آج کل گرمی کی ہے رفت رگرم '


جیشٹھ شک سمت ۱۸۸۴

# جون سنہ ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰ - نمبر ۱۱



مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملیانی ایڈیٹر ' آج کل ' (اردو) اوڈیسگریٹ دہلی ۶



اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آج کل دہلی



مجلس ادارت

| | |
|---|---|
| محمد مجیب | جامعہ ملیہ دہلی |
| محی الدین قادری زور | سری نگر |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| عبدالقادر سروری | حیدرآباد |

یو - ایس - مہن اڈیشنل ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

جی - این - ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)

جی نجنا تھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)

(مدیر مسئول)

اسسٹنٹ ایڈیٹر - مظفر شاہ



| | | |
|---|---|---|
| سالانہ چندہ :- | ہندوستان میں :- | سات روپے |
| | پاکستان میں :- | سات روپے (پاک) |
| غیر ممالک کے لئے :- | | ۱۰ شلنگ یا ڈیڑھ ڈالر |
| فی پرچہ :- | ہندوستان میں :- | ۶۰ نئے پیسے |
| | پاکستان میں :- | ۶۰ پیسے (پاک) |
| | غیر ممالک کے لئے :- | اشلنگ یا ۱۵ سنٹ |

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۱۱۰۲ دہلی

# ملاحظات

گوشتہ ماہ ڈاکٹر راجندر پرساد صدر جمہوریہ کے عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔ آپ جمہوریۂ ہند کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اور بارہ سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ موصوف انکسار اور شرافت کا مجسمہ ہیں۔ آپ نے سادہ طرز زندگی کی ایک اعلیٰ مثال پیش کی ہے، جو ہر زمانہ میں ملک والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ جنگ آزادی میں آپ نے تن من دھن سے حصہ لیا اور اپنی محنت اور خلوص کی بدولت صف اوّل کے لیڈروں میں شامل ہوگئے۔ آزادی کے بعد آپ کی ذہانت سنجیدگی اور تجربہ کاری سے ملک فیض یاب ہوتا رہا۔ آپ ہی کی سرکردگی میں ملک کا دستور تیار ہوا۔ ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے میں بھی آپ پیش پیش رہے۔ اپنے دور صدارت میں آپ نظام حکومت کی بہتری، منصوبہ بندی اور جمہوری و دستوری روایات کے استحکام کی مساعی میں برابر کے شریک رہے۔ اگرچہ آپ صدر کے عہدہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے ہیں۔ مگر آپ کی ذات ملک والوں کے لئے سرچشمۂ فیض رہے گی اور قوم آپ کے پرخلوص مشوروں سے برابر مستفید ہوتی رہے گی۔

۲۸۔ اپریل کو راشٹرپتی بھون کی ایک شاندار تقریب میں صدر جمہوریہ نے ملک کی ان نامور ہستیوں کو اعزازات اور سندات عطا کیں جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ سنسکرت اور عربی کے جن عالموں کو اعزازی سند ملی ہیں ان میں عربی کے عالم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی بھی ہیں۔ پدم بھوشن کا انعام پانے والوں میں مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور علامہ نیاز فتحپوری شامل ہیں ان تینوں حضرات کو اعزاز دے کر حکومت نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے جس پر علمی و ادبی حلقوں میں اطمینان مسرت کیا گیا ہے۔ ہم ایک مرتبہ پھر ان بزرگوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور ان کی درازئ عمر کے لئے دعا گو ہیں۔

ملک کی عام صنعتی ترقی کے لئے جہاں بڑی بڑی صنعتیں قائم کی جارہی ہیں وہاں چھوٹی صنعتوں کی ہمت افزائی اور استحکام کے لئے بھی کوششیں جاری ہیں۔ اس وقت یہ کوشش ہو رہی ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تعمیر کا کام وسیع پیمانے پر انجام دیا جائے تاکہ ان کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ دوسرے پنج سالہ پلان کے دوران میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے ایسی صنعتوں کے لئے ۵۶ کروڑ روپے کی رقم مہیا کی گئی تھی۔ اسی طرح تیسرے پلان کے تحت ان کے لئے ایک ارب ۱۵ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ نجی طور پر لگایا جانے والا سرمایہ دو ارب ہوگا۔ ان وسیع کوششوں کا یہ نتیجہ ہوگا کہ یہ صنعتیں جو ابھی دستکاریوں تک محدود ہیں، بڑی بڑی صنعتوں کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوں گی اور ملک کی ہمہ گیر صنعتی ترقی میں ایک اہم رول ادا کرسکیں گی۔

---

اعجاز حسین

# غالب کا تنقیدی شعور

مضمون شروع کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں غالب کو بہ حیثیت نقاد نہیں پیش کرنا چاہتا۔ کیوں کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ تنقید کا کوئی ایسا واضح نظریہ رکھتے تھے جو دورِ جدید سے اردو میں جگہ پانے لگا تھا۔ تنقید کے انداز تحریر وغیرہ جو فن نقد کے لئے ضروری عناصر ہیں وہ کسی قید و بند کے ساتھ غالب کے یہاں نہیں نظر آتے مگر فن شعر و ادب کے بارے میں جو خیالات انھوں نے جا بجا اپنے خطوط میں ظاہر کئے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شعور میں ایسے عناصر موجود تھے جو رجحِ تنقید کے لئے ضروری ہیں۔ آج کل یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ہر اچھے شاعر اور ادیب کے پاس کوئی نظریۂ ادب یا تنقیدی شعور ضرور ہوتا ہے جو تخلیقی عمل میں اس کی رہنمائی کرتا ہے، لیکن اس سے یہ بھی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ غالب جدید مفہوم میں نقاد تھے، یہ ضرور ہے کہ وہ ایک ایسا تنقیدی شعور رکھتے تھے جو کئی لحاظ سے قابلِ قدر تھا۔ ان کی نظر الفاظ کی اہمیت، زبان کی نشو و نما، شعر کی خصوصیات پر تو تھی ہی اس کے علاوہ انھیں رائے میں انفرادیت، اجتہاد، نفسِ مضمون پر غور و فکر خیالات کی بلندی و پستی پر تبصرہ، مرزا کے تنقیدی شعور کی نشان دہی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ ان کے ان خیالات کو یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ شاعرانہ تعلّی یا کسی استادی کی نمائش کا نتیجہ ہیں۔ چوں کہ عبارتیں مدلّل ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے ضبطِ تحریر میں آئی ہیں اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غالب نے جو کچھ کہا وہ ان کی سوچی سمجھی رائے ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ فکر و فن کے بارے میں اپنے طور پر سوچا کرتے تھے۔ بڑے اور اچھے شاعر شعر کے مقبول و با اثر ہونے کے اسباب پر غور کر کے اس نتیجے پر پہونچتے تھے کہ کیوں یہ فن کار یا اس کی تخلیق داد و تحسین کی مستحق ہے، کیوں کوئی شاعر یا شعر یا وجود عوام میں مقبول ہونے کے خواص میں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد وہ اپنی رائے قائم کرتے تھے جس میں اصول تنقید کی جھلک اور نقاد کی انفرادیت نمایاں ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی نہیں بلکہ ہمیشہ ان کی رائے زنی سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است، کے وہ قائل نہ تھے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مستند شاعروں اور ادیبوں کی باتوں کو سند نہ مانتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی ادیب کی غلطی کو اس لئے جائز نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عرفِ عام میں بڑا فن کار سمجھا جاتا ہے۔ غرض یہ اور اس قسم کی دوسری خصوصیات جن کا غالب کے ذہن و مذاق سے براہِ راست واسطہ ہے، ہم کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ غالب کے پاس ایک ایسا ذہنی شعور تھا جو ان سے پہلے کسی شاعر یا ادیب کے یہاں کم نظر آتا ہے۔ اگر تھا بھی تو ان میں سے کسی نے نثر میں نمایاں کرنے کی زحمت نہیں کی۔ ہم اس سے بے خبر نہیں کہ لوگوں نے تذکروں میں شعرا کی

خصوصیاتِ کلام پر تبصرہ کیا ہے مگر شعر کی وجدانی یا رسمی تعریف سے زیادہ آگے بات نہیں بڑھتی، عموماً صفائی، پختگی، گہری کلام تک بات ہوتی ہے۔ رائے دینے کے وقت ذاتی تعلقات بھی تذکرہ نویسوں کے پیشِ نظر رہے، نہ ان کا ذہن بے لوث معلوم ہوتا ہے نہ پسندیدگی و ناپسندیدگی کی واضح و منطقی وجہ بتائی جاتی ہے، وجدانی کیفیت اصول بن کر سامنے نہیں آتی، کامیاب یا عظیم تخلیق کے سلسلہ میں شائد ہی کسی نے نثر میں ایسی خصوصیات کا ذکر کیا ہو جن کے ہونے یا نہ ہونے سے فن یا شعر بلندی یا پستی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ غالب نے جا بجا اپنے ایسے خیالات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی ابتداء کر کے دوسروں کے ذہن کو بڑی خوبصورتی سے بیدار کرنے کی فکر کی۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اس فن میں کہیں کوئی سیر حاصل بحث نہیں کی مگر جس طرح بات کہی ہے وہ غالباً زیادہ وضاحت کی محتاج بھی نہیں۔

ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے ——— لاحول ولا قوۃ الا باللہ! میں ہیں جب سے ہیں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیشِ نظر رکھ لئے ہوں ..... بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔"

اس اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب ان شعراء کو کسی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو صرف قافیہ کے بل بوتے پر شاعری کیا کرتے ہیں، جن کو قافیہ مضمون سوچنے پر مائل کرتا ہے جن کے پاس نہ مشاہدہ کی انفرادیت ہے نہ تخیل کا سرمایہ وہ خالی الذہن ہیں۔ قافیہ، ردیف سے مل کر جب استعداد کسی بات کی طرف لے جاتا ہے اور بات شعر کے سانچے میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر آجاتی ہے۔ اس لئے یہاں جامع عبارت میں غالب نے کہہ دیا کہ "شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں" یعنی ضرورت اس بات کی ہے کہ شاعر، نیا ئے فکر میں، نئے مضمون کی تلاش کرے جو خیالات کی ندرت و گہرائی سے شعر کو قابلِ توجہ بنا دے۔ اگر یہ خصوصیت نہیں ہے تو شاعری قافیہ پیمائی کی مترادف ہے۔ غالب کا یہ سوچنا اور اتنی بنیادی بات کا اس طرح پیش کرنا ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ عجب نہیں کہ مقدمۂ شعر و شاعری میں معنی و خیال کی بحث اسی تعلیم یا اشارہ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔ جب حالی یہ کہتے ہیں کہ "سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوت تخیلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں امیجینیشن (Imagination) کہتے ہیں۔ یہ قوت شاعر میں جس قدر اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جس قدر ادنیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔" تو ہم کو غالب کا یہ مقولہ یاد آتا ہے کہ شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں، کیونکہ معنی آفرینی بغیر تخیل کی بلند پروازی کے ممکن نہیں اور غالب کا منشاء بھی یہی معلوم ہوتا ہے جس کو شاعری کی بنیاد سمجھ کر غالب نے عمر بھر خامہ فرسائی کی۔

غالب کے تنقیدی شعور نے طائرِ فکر کو خلاء میں بے قید و بند نہیں چھوڑا۔ وہ خیال کی بنیاد کسی حقیقت پر جانچتے ہیں۔ خیالی اور فرضی باتوں سے بجائے بلندیٔ تخیل کے بازی گری کا اظہار ہوتا ہے جو نہ شاعری کا مقصد ہے اور نہ کسی مفید مطلب کا باعث۔ شاعری علم و حکمت کے ادراک کا نام ہے اس لئے ضروری ہے کہ ذہنِ انسانی کے فروغ کے لئے کوئی ایسی بات کہی جائے جو حقیقت و عمل کا پرتو لئے ہو۔ جس امر پر روشنی ڈالی گئی ہو جو مسئلہ زیرِ بحث ہو اس میں استدلال کی گنجائش ہو۔ خیالات و فن کو اہم بنانے کے لئے غالب نے اس بات پر کافی زور دیا ہے اور اس کا اقرار کیا ہے کہ پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں ایک بڑا دیوان جمع ہوگیا..... آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اور اق یک قلم چاک کئے۔" یہ اقتباس اس خط کا ہے جو مرزا غالب نے عبدالرزاق شاکر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "قبلہ ابتدائے فکر و سخن میں بیدل و اسیر و شوکت

کے طرز پر رنجیدہ لکھتا تھا۔" بعد میں اس طرز تخیل کو غالب نے اتنا تیز و یکہ سمجھا کہ اپنے آپ کو بھی معاف نہ کیا۔ اوراق دیوان چاک کر دئے اور اس دیوان کو دور کیا۔ جو اب تک جمع ہو گیا تھا دوسرے الفاظ میں غالب یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ خیالی و فرضی باتیں ویسی ہی بے مایہ ہیں جیسی بچوں کی سوجھ بوجھ یعنی طفلانہ بازی گری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ جب تک تمیز نہ تھی بیدل وغیرہ کی نقالی بڑی وقیع معلوم ہوئی لیکن جب شعور بالغ ہوا تو محسوس ہوا کہ یہ اقدام شاعری کے لئے نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ مہلک ہے۔ اس فضاء سے صرف طائر لاہوتی کی پرواز ہی کی نہیں آتی بلکہ اس کا دم گھٹتا ہے۔ اگر یہ رویہ قائم رہ جائے تو شاعری و نظر بندی میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا شاعر تلمیذ الرحمان ہونے کے بجائے کسی شعبدہ گر کا آلہ کار معلوم ہوگا۔ کسی خیال کو اگر منطق کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا تو وہ بھی قابل اعتنا نہیں۔ اس کا اشارہ وہ ایک تحریر میں اس طرح کرتے ہیں کہ فن کے فروغ کے لئے بظاہر اس میں عمومیت نہیں معلوم ہوتی مگر غور کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ مفتی میر عباس سے ایک خط میں اپنی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" فارسی کے ساتھ ایک مناسبت الذنی و سرمدی لایا ہوں، مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔"

غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز ہے اور اس نازش کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کا منطقی شعور ان کا ابدی راہ بر ہے۔ اس میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ خیالات قلم بند کرنے میں اس کا لحاظ رکھنا لازمی ہے کہ مسئلہ یا گفتگو صرف جذبات یا الفاظ کا سہارا لے کر اگر نظم کے جائیں گے تو اثر دیر پا نہ ہوگا بات اسی وقت پُر اثر دل نشیں ہو سکتی ہے جب اس کو دلیل و حقیقت کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ عقل و فہم کے لئے اختلاف و اتفاق کے راستے کھلے ہوں اگر کسی مسئلہ پر منطقی انداز سے گفتگو نہیں ہو سکتی تو راہ غور و فکر مسدود ہو جائے گی اور مسئلہ غیر اہم ہو جائے گا۔

غالب کا منطقی شعور صرف نظریاتی نہ تھا بلکہ عملی بھی تھا۔ اس کا ثبوت ہم کو اس وقت ملتا ہے جب وہ اپنے اشعار کی تشریح کرنے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔ مثال کے لئے ان کے سمجھانے کا انداز حسب ذیل شعر کی وضاحت میں ملاحظہ ہو

" اک شعلہ ہے وہ دلیل سحر سو خموش ہے
ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے"

لکھتے ہیں " اک شعلہ ہے وہ دلیل سحر سو خموش ہے " یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے، یہ مبتدا ہے، شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا، ظلمت غلیظ سحر نما پیدا گویا خلق ہی نہیں ہوتی۔ ہاں دلیل صبح کی نور پر ہے بھی ہوئی شمع اس رات کے شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا وہ خود ایک سبب ہے۔ منجملہ اسباب تاریکی کے پس دیکھا چاہیئے کہ جس گھر میں علامت صبح مویدظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔"

کسی ادب پرور اثر پیدا کرنے والے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مخصوص زبان کی نشو و نما سے، اس کے مزاج اور اصول کے مذاق سے پوری طرح واقف ہو۔ اگر ان اوصاف سے بے بہرہ ہے تو اس کی رائے ناقص ہی رہے گی خواہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفہ دان، مؤرخ یا عالم ہو، وہ الفاظ کے معنی و مفہوم صرف لغات کی عینک سے دیکھے گا۔ معاشرہ کے رسم و رواج سے بے گانگی فن کار کی باتوں کی تہ تک نہ پہونچنے دے گی۔ مثلاً اگر کوئی شخص آشیاں کے معنی صرف گھونسلا جانتا ہے یا گل کے معنی صرف گلاب کا پھول سمجھتا ہے یا غبار کو صرف گرد یا دھول خیال کرتا ہے تو وہ اردو شاعری کے بالمن سے ناآشنا رہے گا۔ ایسا شخص اگر ہماری شاعری پر ریویو کرتا ہے تو ممکن ہے غصہ نہ آئے مگر یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ

'سخن شناس نہ ای دلبرا خطا اینجا است'، غالب کو اس کا پورا احساس ہے۔ بہ حیثیت شاعر نہیں بلکہ صاحب شعور ہونے کے لحاظ سے جب ہم ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ راز آشکار ہو جاتا ہے۔ ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں :

" نیم گناہ، نیم نگاہ و نیم نازیہ روزمرہ اہل زبان ہے۔ نیم بہ معنی ادنک و رنہ گناہ کا ادھا اور نگاہ کی اور ھوڑا اور ناز ادھا ہملات ہیں ہے چیزوں کا مناصفہ کیا ....."

اگر نیم کے معنی صرف نصف کے لئے جائیں جو عموماً لغات میں ملتے ہیں تو واقعی یہ فقرہ سے ہملات کے سوا اور کیا سمجھے جا سکتے ہیں۔ غالب نے جرأت سے کام لے کر کہہ دیا کہ یہ روزمرہ اہل زبان ہے۔ ان کے کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ لغات میں چاہے "نیم" کے معنی صرف 'نصف' ہی لکھا ہو مگر اہل زبان اسے 'ادنک' یعنی کچھ یا تھوڑے کے مفہوم میں بھی استعمال کرتے ہیں اس لئے ایسے موقع پر ہم لغات کو پس پشت ڈال کر اہل زبان کی طرف نظر کریں گے، جن جن مفہوم میں جمہور نے استعمال کیا ہے وہ سب ہم کو ماننا چاہیئے خواہ گرامر اور لغات خاموش ہی کیوں نہ ہوں۔

اس بات کے متعلق کہ جہاں لغات و گرامر خاموش ہوں وہاں اُلجھن دور کرنے کے لئے بطور کار اہل زبان کی طرف رجوع کرنا چاہیئے غالب نے ایک اور موقع پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بعض مقامات پر اہل زبان لغات و گرامر سے زیادہ اہم و کارآمد ہو جاتے ہیں دیکھئے ہیں تو یہ معمولی بات ہے مگر ذہن کی دور رسی کا وہ سراغ اس بات سے ملتا ہے جو یہ محسوس کرتا ہے کہ لغت، قواعد، ضوابط زبان کے لئے حرف آخر نہیں بلکہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے شعوری و غیر شعوری طور پر زبان و رواج کے مزاج و مذاق سے متاثر ہو کر الفاظ و فقرات میں وہ معنی پہنائے جو محسوسات و خیالات کی پوری ترجمانی کر سکیں قطع نظر اس کے کہ وہ لغات میں ہیں یا نہیں گرامر کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں یا نہیں اس ضمن میں مرزا رحیم بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

" تو نے سنا نہیں جو عرفی و فیضی میں گفتگو ہوئی ....

لغات فارسی اور ترکیب الفاظ پر کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور نطق آشنا ہو گیا ہوں اپنے گھر کی بڑھیوں سے لغات فارسی اور یہی ترکیبیں سنتا رہا ہوں۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے حضرت عرفی نے فرمایا، تقصیر معاف خاقانی و انوری کا ماخذ گھر کی پیرزالوں کا ہے۔ ہمارے اہل تمیز کہاں سے لاؤں جو دیکھیں کہ یہ حال قلم رو ہند کے صاحب کمالوں کا ہے" اس خیال کی مزید وضاحت ہم کو غالب کی ایک دوسری تحریر میں بھی ملتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کچھ لوگوں میں بعض الفاظ کے تذکیر و تانیث پر بحث تھی اس مسئلہ کو قدر بلگرامی نے مرزا غالب کی خدمت میں پیش کر کے فیصلہ کی درخواست کی۔ مرزا غالب نے جواب میں تحریر فرمایا کہ "فیتر کے نزدیک نقاب 'قلم' وہی مذکر ہیں ..... فارسی میں تانیث و تذکیر کہاں پس اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں ..... یعنی ہم تم اور مجموع مشرفا و شعرائے دہلی و لکھنؤ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے، زیادہ جھگڑا بے فائدہ۔" اس عبارت سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اہل زبان لغات و قواعد سے بالاتر ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب سمجھتے تھے کہ زبان کی نشو و نما کسی ایک گروہ سے وابستہ نہیں اس کا تعلق جمہور سے ہے ایک دو آدمی سے نہیں۔ مشرفاء و شعرا کی قید لگا کر غالب نے یہ بھی بتا دیا کہ کون لوگ اس کے اہل ہیں اور کن کی زبان مستند سمجھی جا سکتی ہے کس طبقہ کا فیصلہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔

تنقید کے لئے جرأت رندانہ وہ ضروری خصوصیت ہے جس کے بغیر انفرادیت و شخصیت کا نمایاں ہونا دشوار ہے۔ یہ عنصر جس حسن و شدت کے ساتھ آتا ہے آتا ہی ناقد ممیز و ممتاز ہونے کی امید کر سکتا ہے۔ اسی جرأت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ادیب اپنی قوت تخیل کو کسی عصبیت یا شخصیت سے مرعوب نہ ہونے دے، نہ اس بات سے اپنی فکر مجروح ہونے دے کہ فلاں شخص مسلم الثبوت استاد ہے۔ اس کی ہر بات صحیح ہوگی وہ شخص غلطی نہیں کر سکتا یا یہ سوچ کر دریدہ دہن ہو جائے کہ کوئی شاعر یا ادیب اس کے ہم مذاق یا ہم خیال نہیں

اس لئے اس کی جیب جوئی فرض ہو گئی ہے۔ یہ جرأت دلیل و منطق کے علاوہ علمیت کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ خصوصیت کافی ہے۔ یہاں ہم ان کی اس جرأتِ رندانہ کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو میدانِ نظم میں ہر طرف بکھری پڑی ہے اس لئے کہ اس پر تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعلّی شاعرانہ اندازِ فکر کا نتیجہ ہے۔ شاعروں کے لئے یہ ایک رسمی و روایتی بات ہو گئی تھی حالانکہ یہ صحیح نہیں مگر اس وقت اس پر بحث بھی مقصود نہیں۔ یہاں ہم صرف ان کی وہ باتیں یا رائیں پیش کرنا چاہتے ہیں جو نثر میں ملتی ہیں جن پر روایتی یا سفری خصوصیات کی پرچھائیاں ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان عبارتوں کی متانت و سنجیدگی ذہن کو کسی بہانے کی طرف نہیں لے جا سکتی۔ بعض تاریخی واقعات بھی ہماری تائید کرتے ہیں۔ مثلاً اس واقعہ کو یاد کر لیجئے جب غدر کے بعد برہان قاطع پر رائے زنی کر کے غالب نے ایک دنیا کو اپنے خلاف کر لیا تھا۔ مخالفین کا ہر طرف سے یلغار تھا مگر غالب پھر بھی اپنی رائے پر قائم رہے ان کو اس کا ڈر بالکل نہ ہوا کہ اس لغت نویس کے ہزارہا مقلّد ہیں اور مقلدین کی علمی بنیاد اسی لغت پر قائم ہے۔ وہ ان الفاظ کے معنی وغیرہ پر رائے زنی و نکتہ چینی میں ہمیشہ بے باک رہے ہیں جو ان کے نزدیک غلط و گمراہ کن تھے۔ اس لغت کے مرتب کرنے والے کو غالب نے جی کھول کر بُرا بھلا کہا۔ اس کی لغزشوں کو نمایاں کر کے اسے رسوائے عام کر دیا۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو صاحبِ بیان نہیں مگر اس سلسلہ میں انھوں نے جس طرح بیباک ہو کر جملہ لغت نویسوں کی قلعی اتاری ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔ ان ہی کی زبان سے سنیئے:

یوم بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں کیا عقیدہ ہے۔ اگرچہ قاطع برہان میں جا بجا لکھتا آیا ہوں مگر اب ہندی کی چینی کر کے لکھتا ہوں کہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں ہاں علم صرف و نحو عربی میں یہ قدر تحصیل مسلّم اور استاد ہیں۔ علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں۔ جس نے چاہا ہے اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کی جو فرہنگیں حضرت نے لکھی ہیں مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کئے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا ہے؟ قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے۔"

اس خط میں کچھ آگے بڑھ کر مکتوب الیہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک لطیفہ لکھتا ہوں اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے۔ جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور جامہ مانند پیاز ہیں۔ تو یہ تو اور لباس در لباس، دہم در دہم اور قیاس در قیاس، پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا، مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ لباس ہی لباس دیکھو گے، شخص معدوم۔ فرہنگ کی ورق گردانی کرتے رہو، ورق ہی ورق نظر آئیں گے معنی موہوم۔ ظرافت بر مدار تحقیق نہیں ہے۔ آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں جو میرے دل نشین ہے فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی فارسی میں نہ سراسر غلط ہے، البتہ اکثر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔"

اس اقتباس میں جو بے باکی اور دلیل آپ نے مرزا سے سنی وہ علاوہ سنِ بیان کے حقیقت پر مبنی ہے۔ جن لوگوں نے لغات کا مطالعہ و معاینہ نہ کیا ہوگا، وہ مرزا غالب کی رائے سے متفق ہوں گے کہ واقعی فرہنگ طرازوں نے تحقیق میں بڑی کوتاہی

کی ہے عقل سے کم کام لیا ہے نقل سے زیادہ۔ اس تحریر میں جرأت کے ساتھ ساتھ متانت اور اصابت رائے بھی قابلِ احترام ہے اور ہمارے نزدیک تنقید نگاری کی اولیں شرط یہی ہے۔

میں نے اوپر بھی ذکر کیا ہے کہ مرزا غالب کو روایت تقلید کے سخت خلاف تھے اور اس بات سے مرعوب بھی نہ تھے کہ اگلے زمانے میں کسی مشہور استاد نے چونکہ یہ بات لکھ دی ہے اس کی قدامت و استادی کے سامنے بے چون و چرا سر جھکا لیا جائے۔ ان کا قول تھا کہ

"یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے کیا آگے آدمی احمق نہیں ہوتے تھے۔"

پھر ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ "نظر شگفتن اور گوش شگفتن ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا فوزالدین نیشاپوری نے لکھا ہو۔" اس انداز بیان کا یہ تیور صاف بتا رہا ہے کہ اگر غلط نیشاپوری سے بھی ہوئی ہو تو ماننا ضروری نہیں۔ بزرگوں کی غلطی پر آمنا و صدقنا نہ کہنے کی ایک مثال یہ بھی قابلِ ذکر ہے۔

ایک خط میں چودھری عبدالغفور کو غالب لکھتے ہیں کہ "دارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر نسبتہً جگہ اعتراض کیا ہے اور بجا اعتراض کیا ہے۔"

مرزا غالب کے تنقیدی شعور کا ایک پہلو یہ بھی قابلِ قدر ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں تکلف نہیں کرتے۔ اس کو ان کی ذہنی ایمان داری آپ سمجھیں یا بڑا پن خیال کریں بہرحال قابلِ قدر خصوصیت ہے۔ مثال کے لئے ایک موقع ملاحظہ ہو۔ مرزا یم بیگ کو ایک خط لکھتے ہوئے اعتراف قصور کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

"آویزہ و افسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں واہ خاں شرمسار ہے۔"

اسی طرح ایک دوسرے خط میں اپنی بزرگ کو مخاطب کر کے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"بھائی تمہارے ذہن نے خوب انتقال کیا میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا، بہ ہند آمدند سے زایراں دیار ..... آمدند کی جگہ آمدند بہ صیغۂ بستر اڑ مکسال باہر معلوم ہوا رسیدند و رہند زایراں دیار، اس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی پوستی کلیچہ راہ میں واقع ہوا۔ پھر رسیدند و رہند بیجا، تمہارا تعرف مستحسن۔ جس طرح تم نے لکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔"

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ باوجود غور و خوض کے مجھے یہ صحیح اندازہ نہیں ہو سکا کہ مرزا غالب ادبی لحاظ سے فصاحت کے زیادہ دل دادہ تھے یا بلاغت کے گرویدہ تھے۔ اس کا فیصلہ دراصل آسان بھی نہیں اس لئے کہ فصاحت و بلاغت کی حدیں ایسی ملی ہوئی ہیں کہ ان کا ایک دوسرے سے جدا کرنا کوشش سے ناخن الگ کرنا ہے۔ عوام میں جو مفہوم فصاحت و بلاغت کا سمجھا گیا ہے وہ ہمیشہ سے زیر بحث رہا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی پیچیدگی و مغائرت کی وجہ سے اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ آسانی سے جامع و مانع ادبی تخصیص ہو بھی نہیں سکتی لیکن پھر بھی ذہن میں جو ایک نقشہ ان دونوں صفات کا ہے اس کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو مرزا غالب کبھی فصاحت پر زور دیتے ہیں کبھی بلاغت پر۔ بایں ہمہ میری رائے میں ان کی پسندیدگی کی میزان میں فصاحت کا پلہ گراں نظر آتا ہے۔ طرز ادا میں وہ ان ہی شعراء کے زیادہ قائل معلوم ہوتے ہیں جو زبان کے اعتبار سے صاف اور پُر معنی شعر کہتے ہیں۔ ایک خط میں سعدالدین شفق کو لکھتے ہیں:

"رودکی، اسدی، فردوسی کا شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کے طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو اب طرزیں تین ٹھہریں ..... ممتاز و اختر و بیخبر ہم کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی

ہے..... کیا کہنا ہے خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہندی ہے، دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد، اضاف، اضاف، ..... وہ چیز نہ ہوئی ہیں سب پارسیوں کے آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں لیکن اہل ہند نے بھی وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی علیہ الرحمۃ

بدنام ہوں گے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سنو ذرا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا

مومن

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نا سخ کے یہاں کم تر آتش کے یہاں بیش تر یہ تیز نشتر ہیں۔"

ان باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ فصاحت کلام کو بہ نسبت بلاغت کے زیادہ مرغوب رکھتے تھے مگر بعض مقامات ان کی تحریروں میں ایسے بھی نظر آتے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو بلاغت زیادہ پسند تھی، مثال کے لئے ان خط کی عبارت ملاحظہ ہو جو انھوں نے ۱۳ جنوری ۹۸ء کو منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا اپنے اس شعر کی تشریح کرتے ہیں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لکھتے ہیں:

"یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں کہتا ہوں

یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد۔"

معنی و بیان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی ایسے پہلو کو محذوف یا مقدر کر دینا جو مفہوم میں تازگی پیدا کر سکے بلاغت کا خاص جزو ہے۔ غالب کے یہاں اس حسن بیاں کے نمونے بہت ہیں۔ ایسا نہیں کہ مقدر اتفاقی ہو۔ ان کے دیوان میں ایسے اشعار کافی ہیں جن میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ ان باتوں سے شک ہوتا ہے کہ ذہنی طور پر وہ بلاغت کے دلدادہ تھے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آخر عمر میں مرزا صاحب نے ایسے اشعار پر زیادہ توجہ کی جو آسان اور طرزِ بیان کی دل کشی کے اعلیٰ نمونے ہیں اور نثر میں بھی انھوں نے خط نویسی کی بنیاد سہل الفاظ، مروجہ روزمرہ، رواں دواں عبارت پر قائم کی تو قیاس یقین کے قریب ہو جاتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ غالب کو بلاغت سے زیادہ فصاحت مرغوب تھی حالاں کہ ان کی فارسی اور اردو شاعری میں اشارت کنایت اور مقتضائے حال کے موافق بات کہنے کو وہ اہمیت حاصل ہے جس نے انھیں دوسرے شعرا میں ممتاز کر دیا ہے۔

بہر حال غالب کے تنقیدی شعور کی جو جھلکیاں ان کے خطوط میں نظر آتی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ وہ نہ صرف زبان اور لغت کی صحت، محاورے اور روزمرے کے مناسب استعمال سے واقف تھے بلکہ فن کی پیچیدگیوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ مواد و ہیئت میں مطابقت کی جستجو کرتے تھے، خامیوں اور خوبیوں پر مدلل رائے رکھتے اور اصلاً ہر نقاد یہی کرتا ہے۔

# شاہ کار

فسوں طرازیٔ محبوبِ خوش ادا کی قسم

کمالِ حسنِ غزالاں بھی ہم نے دیکھا ہے
فروغِ سروِ چراغاں بھی ہم نے دیکھا ہے
جمالِ ماہ و رخشاں بھی ہم نے دیکھا ہے
مگر یہ شرط ہے اُس ماہ وش کی آب کہاں
کہ خالِ عارضِ گلرنگ کا جواب کہاں

اسے نشاطِ سحر، نزہتِ چمن کہیئے
بہار کہیئے، شبِ ماہ کی پھبن کہیئے
گلوں کی آن، ستاروں کا بانکپن کہیئے
وہی ہے نقشِ سویدائے خاطرِ عالم
وہی گہر ہے، وہی کہکشاں، وہی شبنم

لٹکتے، جھومتے سرشار آبشاروں میں
سرودِ نے ہیں، ہوا کے لطیف دھاروں میں
نگارِ وقت کے وجد آفریں اشاروں میں
سنی ہے گوشِ سخنور نے گفتگو اس کی
افق افق کے ہے سینے میں آرزو اس کی

بغیر اس کے یہ افسانۂ گلو کیا ہے
حدیثِ رقص و بیانِ مئے و سبو کیا ہے
یہ لذتِ خلشِ تیغِ آرزو کیا ہے
جو وہ نہیں تو یہ تعبیرِ مدعا کیسی
ہمارے آئینۂ فکر میں جلا کیسی

زہے نصیب وہ قاتل بھی جاں نواز بھی ہے
فروغِ بزم و چراغِ حریمِ راز بھی ہے
دیارِ شوق کا محمود بھی ایاز بھی ہے
حلاوتِ نگہِ سحر فن بھی رکھتا ہے
لُٹے متاعِ سکوں وہ چلن بھی رکھتا ہے

اسی کے لب کو لبِ گل فروش کہتے ہیں
اسی کے حُسن کو محشر بدوش کہتے ہیں
اسی کو رہزنِ تمکین و ہوش کہتے ہیں
وہ برقِ شعلہ فشاں ہے وہ موجِ شبنم ہے
جمال و جبر کا اک دل نواز سنگم ہے

علی عباس حسینی

# لچھمی کا عجائب گھر

لچھمی بوڑھیا کو گاؤں والے عام طور پر لچھمی کہتے تھے۔ کوئی مدتوں پہلے کا تھا کہ اس کی عمر کیا ہے۔ بوڑھے چھوس بھی یہی کہتے کہ ہم نے اسے سدا سے ایسا ہی دیکھا۔ یہی سفید الجھے ہوئے بال، یہی پیشانی پر موٹی موٹی لکیریں، یہی جھریاں پڑا پوپلا منہ اور یہی سوکھی لمبی ٹہنی۔ بس اپنی یاد میں اتنا فرق آیا ہے کہ پہلے یہ پیٹ سن جیسے بال ذرا دائیں بائیں اور پھیلے ہوئے تھے۔ اب وہ چھوٹے ہو کر دونوں طرف سے سمٹ گئے ہیں۔ مگر چلی آ رہی ہے یہ بوڑھیا اور اس کی چھوس کی جھونپڑی پرکھوں کے سے سے۔

جھونپڑی گاؤں کے ایک کونے پر تھی۔ پشت پر ایک ٹیلا، سامنے شفاف نما ایک کھیت، ان کی اگل بغل جھیل۔ جھونپڑی کیا تھی مٹی کی نونا لگی ہوئی دیواروں پر چھوس کے چھپر سے ڈھکی ہوئی ایک کوٹھری تھی۔ اندر جانے کے لئے بس ایک پانچ فٹ اونچا، گز بھر چوڑا دروازہ، نہ کوئی کھڑکی نہ سوکھا۔ داخل ہوتے ہی ہوا کا بھی دم گھٹتے لگتا۔ یہی "کال کوٹھری" لچھمی کا گودام بھی تھی، رسوئی گھر بھی اور آرام کا کمرہ بھی۔ یہیں اس کی وہ تجوری تھی جس کے پُر ہونے کی وجہ سے وہ لکھپتی کہلاتی تھی۔

اس کوٹھری کا سارا سامان دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک جھلنگے سے کھٹ پر ایک میلا پھٹا گدا۔ اس کی پائینتی ایک موٹا کھدر کا گاؤں کے گڈریے کا بُنا ہوا کمبل۔ ایک الگنی پر ایک پیوند لگی ساڑی اور کھادی کے کرتے کا ایک نسلوکا۔ ایک کونے میں مٹی کے دو مٹکے اور تین گھڑے ان میں کچھ اناج، آٹا اور دو ایسی رکھی ہوئی۔ دروازے کی ایک بغل میں رسوئی کا سامان، مٹی کا ایک چولھا، لوہے کا ایک گگرا، ایک جگہ جگہ سے پچکا ہوا بے لونی کا لوٹا، مٹی کی ایک ہانڈی، ایک توا، ایک نفاخی اور ایک چمٹا۔ دوسری بغل میں ایک چرخا۔ ایک ڈبیا میں کچھ کپاس اور تھوڑی سی دھنکی روئی۔

کوٹھری کا چھپر دروازے کے رُخ پر دو گز آگے نکلا ہوا تھا۔ یہیں گویا برآمدہ تھا۔ لچھمی نے اس حصے کو آس پاس کی مٹی سیمنٹ کر کوٹ پیٹ دی تھی جس سے ایک چبوترا بن گیا تھا۔ اس چبوترے پر دن میں وہ خود بیٹھ کر چرخا چلاتی یا چٹائی بچھا کر لیٹی رہتی۔ رات میں وہ اس کے پائنتی جاگنے والوں کا بسیرا بن جاتا۔ یہیں اس کی بکری مُنّی بیٹھ کر جگالی کرتی، اونگھتی اور کان جھٹ جھٹا کر اپنے منہ کے قریب بھنکنے والی کھیوں کو بھگاتی۔ یہیں لچھمی کا نیم دستی پنکھا "جبرا" بیٹھا اونگھا کرتا۔ یہیں اس کی سلمئی رنگ کی بلی "خیلا" آنکھیں بند کئے خرخر کرتی اور یہیں برسات میں اس کا مرغ "بلنکے خاں" اپنے سارے محلوں کے ساتھ بیٹھ کر کڑکڑ اتا رہتا۔ اس زندہ عجائب گھر کا ایک اور رکن "بالک رام" کوٹھری کی چھت میں بانس اور چھپر کے درمیان بیٹھا لچھمی کی تجوری کی نگہبانی کرتا۔ اس کے اردگرد بانس کے پیچھے چھپکلیوں میں لپٹی لچھمی کی چھوٹی بڑی رقمیں رکھی رہتیں۔ ان تک

سی نے لکھی کے کسی کی رسائی نا ممکن تھی۔ وہ لکھی کی سوکھی انگلیوں کی خوشبو سے مانوس تھا۔ وہی تو اس کے لئے مُنّی کا دودھ ایک چینی میں ہر روز صبح شام اپنے بکھ۔ کے نیچے رکھ دیتی تھیں۔ اس احسان نے زہر کو امرت میں بدل دیا تھا۔ ناگ "بالک" بن گیا تھا اور لکھی "مامتا" لکھی کی آمدنی کے کئی ذریعے تھے۔ وہ کئی کھیتوں کی مالکہ تھی جو اس نے بٹائی پر اٹھا رکھے تھے۔ ان میں گیہوں، چنا، جو، مٹر اور ارہر کی کاشت ہوتی تھی۔ فصل کٹنے پر لکھی کا حصہ ایماندار دادی سے چھان بنا کر ہرکارہ کا اس کے گھر پہنچا جاتا تھا۔ یہ ایمانداری کسی خدا ترسی یا رحم کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ پورے گاؤں پر لکھی کا ڈر چھایا ہوا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ وہ جادو گرنی ہے اور وہ دلیل میں پیش کرتے اس کے زندہ عجائب گھر کو۔

وہ کہتے کون نہیں جانتا کہ ہر ہری چیز کو دیکھ کر بڑھی کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ وہ پن کلیت اُسے چرے گی۔ مگر بوڑھیا کی منّی نہ تو ادرک کے ہلہلاتے کھیتوں کی طرف دیکھتی ہے اور نہ خود لکھی نے جو بڑھیا کے سامنے ترکاریاں لگا رکھی ہیں اس کی ایک پتی توڑی ہے۔ وہ تو کھیتوں میں گھس کر نکائی کا کام کرتی ہے یعنی وہی گھاس کھاتی ہے جو پودوں کو بڑھنے اور پنپنے سے روکتی ہے۔ بڑی کیا ہے کہ کوئی ملائے مسجدی ہے کہ ہر قدم پر جائز ناجائز حلال حرام دیکھتی چلتی ہے۔ کتے کا راتب چھیچھڑا اور ہڈی ہے۔ مگر لکھی کا جبڑا سیر شام روٹی دال پر قناعت کرتا ہے اور سوائے مخصوص دنوں کے کسی نے اسے گاؤں میں اندھیرے اُجالے کسی کھیتا سے دوسرا لڑاتے بھی نہیں دیکھا۔ لکھی کا بیڑا مدھم ہی اس کے لئے دو محبوب ہے۔ وہ سنگیستان پر سر رکھے وہیں پڑا رہتا ہے۔ پتی کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا ان بلاؤ ہے۔ اتنی خونخوار ہے کہ کتے تک اس سے ڈرتا ہے۔ کوئی کہتا اس پر کسی جن یا پریت کا سایہ ہے لکھی کا بیڑ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں یہ حالت ہے کہ کتے بھی زہر مہرہ سے چاٹ کر لیٹ جاتا ہے تو پتی جیبا خرخراتی آنتیں اور اس کے پیسے سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ پتی کی زبان نکال کر اپنا منہ اور پنجے چاٹ کر صاف کرتیں اور یوں گویا فضل فرما کر اوپن ہو

کر مٹکتی ہوئی چلتیں اور دودھ پلانے والی منی کی گود میں جا کر لیٹ رہتیں۔

بالکے خاں اور ان کی بیویوں کی عادت تھی کہ وہ برسات کے علاوہ ساٹھے والے نیم پر رات کو بسیرا کرتے اور دن میں آس پاس کے کھیتوں میں چگتے رہتے۔ جب کسی مرغی کے درد اُٹھتے تو وہ کڑکڑاتی، کو لھے مٹکاتی پتی کو ٹکٹکیوں سے دیکھتی بوڑھیا کی کوٹھری میں چلی جاتی اور وہیں اپنا حصہ رکھ کر باہر چلی آتی۔ واپسی میں برآمدے کو وہ دبے پاؤں پار کرتی۔ ہاں چبوترے کے کنارے پہنچے ہی وہ خوشخبری کا نعرہ پیٹتی اٹھتی ہوئی اپنی ہم جنسوں کے پاس لپیٹ جاتی۔ نذر چڑھانے کے علاوہ مرغیوں کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اگر وہ بغیر اطلاع راج محل میں داخلے کی کوشش کرتیں تو خیسلا جھپٹ کر سامنے آجاتی اور مرغی چیختی، چلاتی، پھڑپھڑاتی، بھاگتی۔ جب کبھی ایسا حادثہ پیش آتا تو بالکے خاں دوسرے محلوں کو چھوڑ کر بے تحاشا دوڑ پڑتے اور پر پھیپھڑا کر اور گردن پھلا کر پتی کا مقابلہ کرنے کے لئے جھک جاتے۔ دونوں ایک۔ دوسرے پر وار کرنے کے لئے پینترے بدلتے ہی ہوتے کہ جبڑا بھر کر بیچ میں آجاتا اور بوڑھیا چونک کر ڈانٹتی، "کیا شور مچا رکھا ہے پاجیو! چلو اپنی اپنی جگہ" اس کی آواز سنتے ہی پتی منہ موڑ لیتی سے اُچک کر پر آمدے میں آبیٹھتی اور بالکے خاں کٹ کٹ کرتے سارے محلوں کو پاس بلا لیتے اور بلی کو زہر کی نگاہوں سے دیکھتے۔ گردن ٹیڑھی کئے، پنجوں کے بل بیٹھے، کھیتوں کی طرف دیکھا کرتے۔

مُنّی نے یہ انڈے گاؤں کے ٹھاکر صاحب روزانہ منگایا کرتے اور یہ لکھی کی مستقل آمدنی کا ذریعہ تھے۔ زائد نکلے کی فروخت اور انڈوں کے پیسوں کے علاوہ لکھی کو کوڑی جھنڈار سے بھی کچھ آمدنی تھی۔ اس کے کارندے لکھی کو روزی دے جاتے اور وہی اس کا کھانا ہوا سوت پہنچا آکر لے جایا کرتے۔ ان چیزوں سے اس کو جو کچھ ملتا وہ اس چھپر میں لپیٹ کر باتس کے بنے ہوئے ٹوکری میں رکھ دیتی جہاں بالک رام کا پہرا تھا اور کوئی دوسرا اس کی دستاس کو نہیں چھو سکتا تھا۔

گاؤں کے کوئی جانے میں بدھوتی کی حالت میں اکثر لکھی کی

دوسے کے متعلق پھلجھڑیاں چھٹتیں۔ سال میں دو بار سو نمبر دو بناتی چپلی آتی ہے۔ کیا کرے گی یہ سب بار دو پیر۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ پرانے منصوبے بھی بناتے "چلو کسی اندھیری رات میں کشتانی ایک ایک ہاتھ میں ختم کئے جا سکتے ہیں۔ بوڑھیا کا گلا گھونٹ دینا کون سی بڑی بات ہے۔ پھر اس نے جو کپڑا گاڑ چھپا رکھا ہے وہ سب یاروں ہی کا ہے۔" دو ایک شاطروں نے جھونپڑی کے قریب تک جانے کی ہمت بھی کی مگر وہاں پہنچتے پہنچتے فشار ہوا ہو جاتا۔ ایک نہ معلوم سا ڈر دل پر چھا جاتا اور ایک دوسرے کو بزدل کہتے پلٹ آتے۔

مگر جھونپڑی کے ہمسایے میں دو جاندار بھی تھے۔ ان کا لاپرواہ ان کے ڈر پر غالب آ گیا۔ ان میں سے ایک تو نیولا تھا جو جھونپڑی کی پشت والے ٹیلے پر رہتا تھا۔ یہ بانکے خاں اور ان کے حسین کہ بھیتر بلائی نظروں سے دیکھتے۔ اس کو ان کے انڈوں کی بڑی فکر تھی۔ وہ بھی فطرتاً ان کا رسیا ہے۔ ایک دن یہ نیولا انڈوں کی ٹوہ لگا آ برآمد ہو پہنچ گیا۔ اس وقت لکھی اپنی چٹائی پر لیٹی سو رہی تھی اور جرا اور کھیل بھی اد کھلے گئے تھے۔ نیولے نے موقع کو غنیمت جانا اور جھٹ کوٹھری میں جا گھسا۔ وہاں سامنے ہی بسکٹ کے نیچے ایک ڈبیا میں چار انڈے دکھائی دئے۔ گو چور کا دل آدھا ہوتا ہے مگر نیولے نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اس نے جھپٹ کر ایک انڈے پر منہ مار دیا۔ اسے خبر نہ تھی کہ کوئی اوپر سے کچھ کھلا باندھے اسے گھور رہا ہے۔ نیولے نے انڈا دانتوں سے کترا ہی تھا کہ بابا رام نے پیٹ سے اپنے کو بسکٹ پر گرا کر دونوں پنجوں کی پکاری ماری۔ نسوں سے آتی ہوئی پرانی دشمنی لاپرواہ پر غالب آ گئی۔ نیولے نے انڈا منہ سے گرا دیا اور پینترا بدل کر وہ سانپ پر حملہ کرنے لگا۔ اس ردوبدل میں جو کھٹ پٹ ہوئی تو جرا آنکھ کھول کر غرایا۔ لکھی بڑبڑائی "اپاہج! پڑا سو رہا ہے دیکھتا نہیں کو ٹھڑی میں کیا ہو رہا ہے!" قبل اس کے کہ جرا اٹھ کر لڑائی سے کوٹھڑی کی طرف بڑھے، نیولا لنگ مارتی اور اندر پہنچ گئی۔ نیولے نے جیسے ہی اس نئے محافظ کی صورت دیکھی وہ کوٹھڑی سے نکل کر بھاگا۔ بوڑھیا نے جرا کو للکارا "پکڑ لا! اب لے کیا تھا، نیولے اور لکھی کی دوڑ ہونے لگی۔ نیولا جھانسیاں دینے میں بہت ہوشیار تھا۔ اکیلا جرا ہوتا تو وہ غالباً اسے نہ پکڑ سکتا مگر نیولے نے بھی اس دوڑ میں حصہ لیا اور وہ اڑنے، کھونے، جسم کو سمیٹنے، اعضا کو گھما لینے میں نیولے سے بھی دو قدم آگے تھی۔ نیولا اس کے پنجے کی پوٹ سے اپنے کو بچانے کے سلسلے میں ایک کانٹے دار پودے سے ٹکرایا اور قلا بازیاں کھا گیا۔ جرا نے پکڑ کر گردن منہ میں بھر لی اور اسے لا کر بوڑھیا کے سامنے ڈال دیا اور اس طرح دم ہلانے لگا جیسے جرم کو بخشوانے میں اس نے انتہائی کامیابی حاصل کی ہے۔

مگر نیولا اپنے حصے کو آسانی سے نظر انداز کر دئے جانے پر تیار نہ تھی اس نے مالکن کی سوکھی ٹہنیوں میں اپنی پیٹھ رگڑنا کر اس ہم میں اپنے حصے کی طرف متوجہ کیا۔ لکھی نے اپنی گیدڑ بھری آنکھوں سے اسے مسکرا کر دیکھا اور سر ہلاتی ہوئی نیولے پر جھک پڑی۔

وہ فقرہ تقریباً ختم کر رہا تھا۔ اس کی باچھوں میں انڈے کی جگہ خون بھرا تھا۔ گرسنے میں اس کے تیز دانتوں نے اس کی زبان کو مجروح کر دیا تھا۔ وہ اپنی چوٹی چوٹی آنکھیں وحشت سے بلا جلا کر گھما رہا تھا۔ گویا موقع کی تلاش میں تھا کہ ان بپاہیوں کی ذرا آنکھ جھپکے اور وہ چپکے کر کھل بھاگے۔ لکھی نے اس کی گردن پکڑ کر اسے ہلکے سے دو ٹہوکے لگائے۔ "تم نے چوری کی، ڈاکا ڈالا! پکڑے گئے تو! اب کہو جرا کو حکم دے دوں تمہیں تکے بوٹی کر ڈالے؟ میرے جانوروں کے ساتھ بھائی چارہ بن کر رہتا تھا اور یہ حرکت!" جرا غرایا، نیولا نے "نہ" کے لہجے میں زمین پر پنجہ مارا۔ لکھی نے کانپتے ہوئے نیولے کو پھر ایک ٹھاپ مارا "اچھا جاؤ، اب کے چھوڑے دیتی ہوں، پھر کبھی کوٹھڑی میں نہ گھسنا۔" اور اس نے نیولے کو چھوڑ دیا۔ جرا نے غصے سے جھرجھری لی، خیلا نے پھر زمین پر پنجہ مارا اور نیولا "چیں" کر کے تماشا اپنے ٹیلے کی طرف بھاگ گیا۔

دوسرا غار آور ایک گیدڑ تھا۔ یہ جھونپڑی کی داہنی جانب جو جنگل نما حصہ تھا اس میں اکثر انوں کو "ایہاں، وہاں" کی پکار پر اپنے ہم جنسوں کو اکثر دعوت شعر خوانی دیا کرتا تھا۔ ایک رات جب زور کی بارش ہو رہی تھی اور اس کا دیوان خانہ بھی گڑھیا کی صورت اختیار کرنے لگا تھا تو وہ ہمت کر کے جھونپڑی کے برآمدے

تک پہنچا۔ کوٹھڑی کے بھڑے دروازے سے روشنی چھنتے دیکھ کر اور اس کے پاس ہی سے مرغیوں کی بُو پاکر اس نے دبے پاؤں اندر داخل ہونے کی جسارت کی۔ وہاں جو منظر ڈالی تو لکھی سوتی دکھائی دی۔ کتا اور بلی دکھائی نہ دئے۔ البتہ سامنے ہی کئی مرغیاں منظر آئیں۔ کئی دن کا بھوکا تھا۔ منہ سے رال ٹپک پڑی۔ وہ بے ساختہ ایک مرغی پر جھپٹ پڑا۔ مرغی کی دم ہی منہ میں آئی اور وہ چیخ کر پھڑپھڑائی بانکے خاں نے اڑکر پورے زور سے لات ماری۔ داہنی کھانگ آنکھ کے ایک کونے میں لگی۔ دیکھا کہ بلا۔ دیکھ ہی جیرانے پلنگ کے پنجے سے نکل کر ٹانگ پر حملہ کیا۔ گیدڑ اُچھلا، لکھی اٹھ ہی تھی وہ اس کے سینے پر گرا۔ بوڑھیا آہ کرکے گری۔ اس کا سر پایہ سے ٹکرایا اور وہ نیم بے ہوش ہوکر بے سُدھ ہوگئی۔ ادھر نیلا اور بانکے نے ایک ساتھ گیدڑ پر حملہ کیا۔ نیلا کے پنجے نے جبڑے کے پاس سے ایک بوٹی نوچ لی۔ وہ پلنگ سے نیچے کود کر بھاگا۔ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ بانکے خاں نے پھر اڑکر لات ماری۔ ادھر منّی نے اس زور کی ٹکر لگائی کہ وہ دروازے سے اُچھل کر باہر کیچڑ میں جا کر گرا اور کیچڑ سے لت پت کانپتا کانپتا بے تحاشا بھاگا۔

بالک بیچاری مارتا ہوا پلنگ پر سر سراتا ہوا چڑھا اور لکھی کے جسم کے کھلے ہوئے حصّوں پر رینگا۔ جبرا خوشی سے جھونکا اور لکھی کا منہ چاٹنے لگا۔ نیلا نے خُرخُر کرکے اس کے جھری دار گالوں پر پیٹھ اور دم رگڑی۔ ان کے بال لکھی کے نتھنوں میں گھسے اور وہ چھینکتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ بانکے نے پر پھیٹ پھٹا کر نعرۂ فتح بلند کیا اور منّی نے بھی خوشی میں 'میں میں' کرکے ساز ملایا۔ لکھی نے ڈانٹا۔ "کیا شور مچا رکھا ہے پاجیو۔! چلو اپنی اپنی جگہ۔"

بالک سرکا، نیلا دبکی۔ جبرا دم دبا کر کھسکا۔ منّی کان چھٹا کر کونے میں بیٹھ گئی۔ بانکے خاں ایک پر لٹکا کر ایک مرغی کے گرد ناچا۔ لکھی نے اپنے جانب گھر پر پیار کی نظر ڈالی اور ایمنان کی سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں۔


## فنِ تعمیر نمبر

'آج کل' کا ماہ اگست ۱۹۶۲ء کا شمارہ 'فنِ تعمیر' نمبر ہوگا

دیدہ زیب سرورق اور خوبصورت رنگین و سادہ تصاویر سے مزین یہ خصوصی شمارہ ۴۴ صفحات پر مشتمل ہوگا ہندوستانی فنِ تعمیر کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات سے متعلق دلچسپ اور پُر از معلومات مضامین شاملِ اشاعت ہوں گے۔

قیمت صرف ایک روپیہ — یہ شمارہ خریداروں کو سالانہ چندے ہی میں ملے گا

آج ہی خریدار بن جائیے تاکہ آپ بھی یہ شمارہ سالانہ چندہ میں ہی حاصل کرسکیں

---

'آج کل' کا سالانہ چندہ صرف سات روپے ہے

ایجنٹ حضرات زائد کاپیوں کے لئے ابھی سے آرڈر بھیج دیں

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

اطہر حسین جعفری

# زعفران زار کشمیر

اکتوبر اور نومبر کے مہینے میں جب زعفران کے کھیتوں میں پھول کثرت سے کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور پودوں میں سرخ اور نارنجی رنگ کے زیرے دانی کلیوں کی لمبی چوڑی چادریں خوش رنگ خوش نما قالینوں کی طرح پڑی ہوتی ہیں تو پمپور (قدیم پدماپور) کا وسیع اور ہموار میدان ایک ناقابلِ فراموش منظر پیش کرتا ہے۔ جس کا اثر عرصہ تک دل پر قائم رہتا ہے۔ اور جب کاشتکار کے مہینے میں اہلِ کشمیر بہار گری اور خزاں کے ان مناظر کو رخصت کرنے کے لئے جن کا لطف اس زمینی فردوس میں اٹھا چکے ہیں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں تو چاند کی نکھری ہوئی روشنی میں اس کا یہ اثر دوچند ہو جاتا ہے۔ پھولوں کی کلیاں اتنی نازک ہوتی ہیں کہ چلتنی ان کے رنگ میں ایک خاص قسم کی دمک پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے ہی موقع کے لئے کسی ایرانی شاعر نے کہا ہے ع

زعفرانی دیدہ باید راہِ ہندستان گرفت

یعنی زعفران کے پھولوں کا لطف اٹھانے کے لئے ہندوستان کے لئے روانہ ہو جانا چاہیئے کیونکہ جاڑے کا زمانہ قریب آ گیا ہے جو ایرانی سیاح کے مزاج کے ناموافق ہوگا۔

کالی داس نے اپنے متعدد غیر فانی شاہکاروں میں زعفران کے کھیتوں کے حسن کو سراہا ہے۔ مشہور ہے کہ اسکندر اعظم کے یونانی سپاہی جب اس میدان سے گزر رہے تھے تو وہاں اودے رنگ کے نفیس اور خوش نما پھولوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ ابوالفضل اپنی تصنیف "آئینِ اکبری" میں لکھتا ہے: "زعفران کے پھولوں کا منظر ایسا دل کش ہوتا ہے کہ ایک بے شغف سے بھی جو مشکل ہی سے کسی بات سے خوش ہوتا ہے داد تحسین لئے بغیر نہیں رہتا"۔ غلام سرور کہ قدیم زمانہ سے لے کر اب تک پمپور کے زعفران کے پھولوں کا حسین منظر نزدیک اور دور کے لوگوں کو کھینچ ہی لاتا ہے۔

زعفران کا پھول گلدستہ کے لئے مشہور ہے۔ اس بات کا بیّن ثبوت کہ زعفران ہمیشہ سے شاہانہ پھول سمجھا جاتا ہے اور لوگوں کی نگاہ میں اب تک اس کی وہی قدر و منزلت ہے جس کا وہ مستحق ہے، یہ ہے کہ وہ زمانۂ دراز سے ہندوؤں، یونانیوں رومیوں اور دوسرے لوگوں کے دیوتاؤں کی پوجا کے ضروری سامان کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے۔

قدیم گرئیکو بیکٹرین بادشاہ کی پرواز زعفران سے رنگی ہوتی تھی یہاں تک کہ ستروہیں صدی تک ہیرائڈیز کے اعلیٰ عہدہ دار زعفرانی رنگ کی قمیص پہنتے تھے۔ لفظ کنکو جس سے دکن کی عورتیں پیشانی پر ٹیکا لگاتی ہیں کم کم سے مشتق ہے۔ ہندو زعفران کو فالِ نیک کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کی کوئی تقریب نہیں ہوتی جس کے موقع پر راستہ میں زعفران کا پانی نہ چھڑکا جاتا ہو یا ماتھوں پر زعفرانی تلک نہ لگایا جاتا ہو۔ نہاتا گاندھی نے بھی ڈانڈی مارچ شروع کرتے وقت ماتھے پر کم کم ہی کا ٹیکا لگایا تھا۔ قدیم زمانہ سے ہی کشمیر زعفران کا تنہا اجارہ دار قرار پا گیا ہے۔ اسی وجہ سے

ا سے کشمیر ج بھی کہتے ہیں۔ قدیم یونانیوں کے عہد میں زعفران کو شاہی رنگ کا درجہ دیا گیا تھا۔ بلھن، کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشبو سُنگھنے یا مُسہل کے طور پر زعفران کا استعمال کشمیر کے امراء کے لئے مخصوص تھا۔ یونان کے ایوانوں، درباروں اور تھیٹروں میں اور رومی حماموں میں زعفران کا خوشبو پانی چھڑکا جاتا تھا مشہور ہے کہ نیرو کے شہر میں داخلہ کے موقع پر سڑکوں پر زعفران کا پانی چھڑکا ہوا تھا۔ زعفران یونانی علاج کے علاوہ کشمیر میں اب تک دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ کشمیری، ایرانی اور ہسپانوی اب بھی اس کے زرد رنگ سے زردہ پکاتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ماہرین عرب کے ہاتھوں ہسپانیہ میں زعفران کی کاشت کی بنیاد پڑی تھی۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اٹھارویں صدی تک انگلستان میں بھی لندن سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ایک وسیع میدان میں زعفران کی کاشت ہوتی تھی۔ چناں چہ والڈن کا قصبہ جہاں خاص طور پر زعفران کا کاروبار ہوتا تھا اب تک "زعفران والڈن" کے نام سے مشہور ہے۔ بقول ہیکلوپیڈیا انگلستان میں سب سے پہلے زعفران کے پودے کی ایک گٹھی "نرپولی" کا ایک سیاح اپنی چھڑی کے سوراخ میں چھپا کر لایا تھا۔

زعفران کے مبداء کی داستان راج ترنگنی میں یوں لکھی ہے کہ اس کا پھول "تکشک ناگ" نے جو پمپور میں رہتا تھا ایک وید کو تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ اس ناگ کی آنکھ میں کچھ تکلیف ہوئی تو وہ علاج کی غرض سے وید مذکور کے پاس گیا۔ لیکن اس کی دوا سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ عاجز آکر وید نے ناگ سے سوال کیا کہ کیا تم آدمی ہو؟ جب معلوم ہوا کہ وہ آدمی نہیں بلکہ دراصل ناگ ہے تو وید فوراً تاڑ گیا کہ دوا کے کام نہ کرنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس کے منہ سے جو زہریلی بھاپ نکلتی تھی وہ دوا کے اثر کو زائل کر دیتی تھی۔ چناں چہ وید نے اس کی آنکھوں پر ایک پٹی باندھ دی تو وہ آنکھ بھی ہو گئی۔ اس کے صلے میں شکرانہ کے طور پر ناگ نے وید کو زعفران کی ایک گٹھی پیش کی۔ اس کے بعد پمپور میں زعفران کی کاشت پھیل گئی۔ تکشک ناگ کی پوجا اب بھی زعفران نام کے گاؤں کے قریب پانی کے ایک بڑے تالاب کے کنارے ہوتی ہے۔ آئینِ اکبری میں مذکور ہے کہ زعفران کی کاشت کی ابتداء کے زمانہ میں ابوالفضل اس تالاب کو دیکھنے گیا تھا مدت دراز سے کشمیر اور زعفران کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ پروفیسر لیمی دھرکلاتے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ کاہلیداس کا مولد (جنم بھوم) کشمیر ہی تھا اسی امر کو پیش کیا ہے۔ کالی داس نے اپنی تصانیف میں زعفران کی کاشت اور اس کے فوائد کا اس تفصیل سے ذکر کیا ہے جو کسی کشمیر کے باشندے ہی کے بس کی بات ہے۔

زعفران کی کاشت بذات خود ایک فن ہے۔ بونے کی غرض سے اس کی گٹھی یا پوٹھی جمع کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی دھلوان زمین کی ضرورت ہوتی ہے جہاں سے تین سال کے بعد نکال کر پھر کیاریوں میں لگائی جاتی ہے۔ ان کیاریوں کے لئے ضروری ہے کہ ۴ سال تک ان میں نہ کھاد ڈالی جائے اور نہ سینچی جائیں۔

کیاری میں گاڑ دینے کے بعد بغیر کاشتکار کی دیکھ بھال کے پوٹھی ۴ سال تک کام دیتی رہتی ہے۔ پرانی گلتی جاتی ہے اور نئی اس کی جگہ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پوٹھیوں کے لگانے کا زمانہ جولائی اور اگست ہے۔ اس کے بعد کاشت کار کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ کیاری کو کبھی کبھی گوڑتا اور نکالے کے گرد نالی بنا کر اسے سینچتا رہے۔

پھول ۱۵۔ اکتوبر تک کھلنا شروع ہوتا ہے اور دو دے رنگ کی کلیاں اور زعفران کی بھینی بھینی بُو پمپور کے خشک اداس میدان کو ایک نادر پھلواڑی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھولوں کے جمع ہو جانے کے بعد ان میں سے زعفران علیحدہ کرنے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ پھولوں کو دھوپ میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کے اندر سے تین تین لمبے ریشے نکال لئے جاتے ہیں۔ ریشہ کا سرا نارنجی رنگ کا ہوتا ہے جسے اوّل درجے کا شاہی زعفران کہا جاتا ہے۔ لمبے ریشہ کا نچلا سفید حصّہ بھی زعفران ہی ہوتا ہے مگر سستے والے زعفران کے مقابلے میں ادنیٰ درجہ کا۔ خشک اور جمع ہو جانے کے بعد "موگرا" کہلاتا ہے۔ جب موگرا خشک پھولوں سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے تو ان کو آہستہ آہستہ لکڑی سے پیٹ پیٹ کر چٹلک

لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کُل کا کُل پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پنکھڑیاں پانی کی سطح پر تیرنے لگتی ہیں اور اصل زعفران تہ نشین ہو جاتی ہے اور پھر اسے پانی سے نکال لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں جو پتیاں سطح پر آ جاتی ہیں ان کو پھر خشک کر کے بیچا جاتا ہے۔ اسی طرح کئی مرتبہ کیا جاتا ہے۔ ہر مرتبہ اس کی قیمت گھٹتی جاتی ہے اور پتی ہلکی کہلاتی ہے۔ زعفران میں ملاوٹ پیدا کرنے کے متعدد طریقے ہوتے ہیں۔ جس کی مقدار معلوم کرنے کے لئے بڑی تجربہ کار نگاہ اور قوی قوتِ ذائقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

کشمیر میں زعفران کی کاشت اور تجارت متعدد انقلابات کی نشانہ گاہ رہی ہے۔ قدیم ہندو عہد میں اس کی ٹیکہ داری کشمیر کے ہاتھ میں رہی جس سے نہ صرف ہزاروں بندگانِ خدا کی روزی چلتی تھی بلکہ ریاست کو بھی زبردست مالی فائدہ پہونچتا تھا۔ ویسا ہی غیر آئینی اور پُر آشوب زمانے میں اس کا کاروبار گھٹ جانے کے بعد مغل فرمانرواؤں کے عہد میں اس نے اپنی سابقہ عظمت پھر حاصل کر لی جو زعفران کو دوا کے طور پر کام میں لانے کے علاوہ کھانوں میں ذائقہ اور رنگ میں اضافہ کرنے کی غرض سے استعمال کرتے تھے۔ ابو الفضل کا قول ہے کہ اس کے زمانے میں زعفران کی کاشت کا رقبہ دس سے بارہ ہزار بیگھے تک پہونچ گیا تھا۔ اس کے بعد افغانی دور میں اس کی کاشت پھر گھٹ گئی۔ مگر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں اس نے پھر پنپنا کھایا۔ وہ ان کی پوٹھیاں کشتوار سے حاصل کرتے تھے کیوں کہ گزشتہ قحط کے زمانوں میں لوگوں نے ان سے پیٹ پالا تھا۔ ادامی کے پہلے بندوبست میں زعفران کی زیر کاشت اراضی صرف ۱۳۲ ایکڑ رہ گئی تھی۔ قیمت کے چڑھ جانے اور ہندوستان سے اس کی مانگ بڑھ جانے سے زعفران کی تجارت نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس کی برآمد میں ہر سال اضافہ ہوتا جاتا ہے جس سے امید پائی جاتی ہے کہ اس کی کاشت کا رقبہ جلد بڑھ جائے گا۔

---

## ضروری گزارش

۱۔ کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھئے

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ان کے ہمراہ ہوں۔

## غزل

راس آجائیں جو دل کو وہی غم اچھے ہیں
ہوں ستم بھی تو بہ آئینِ کرم اچھے ہیں

مسکرانے سے بھی افسردگیٔ دل نہ گئی
ایسے بیمار تبسم سے تو غم اچھے ہیں

دل کشی رکھتے ہیں کیا کیا خم گیسوئے حیات
پھر بھی اے دوست تری زلف کے خم اچھے ہیں

یوں زمانے کے بھی پیارے ہیں ہمیں غم لیکن
جو ترے نام پہ ملتے ہیں وہ غم اچھے ہیں

ہم کو انسانوں سے نسبت ہے غرض کیا اس سے
اہلِ دیر اچھے ہیں یا اہلِ حرم اچھے ہیں

زیست کی راہ میں بن جائیں جو منزل کے چراغ
نقشِ اچھے ہیں وہی نقشِ قدم اچھے ہیں

گلستانِ امن و محبت کے کھلے ہم سے پیام
اہلِ شمشیر سے ہم اہلِ قلم اچھے ہیں



## غزل

خیالِ دیر نہ شوقِ حرم نے ساتھ دیا
جہاں گئے ترے نقشِ قدم نے ساتھ دیا

حوادثِ غمِ آفاق راس آ ہی گئے
بقدرِ ذوقِ طلب تیرے غم نے ساتھ دیا

تھے دل میں کتنے ہی اندیشہ ہائے دُور و دراز
چلے تو راہ کے ہر پیچ و خم نے ساتھ دیا

شبِ سیاہ میں مشکل تھی جستجوئے سحر
خیالِ جلوۂ روئے صنم نے ساتھ دیا

کہاں کہاں نہ کسی کے ستم سہے ہم نے
کہاں کہاں نہ امیدِ کرم نے ساتھ دیا

یہ اور بات ہے دنیا ہمارا ساتھ نہ دے
بڑے خلوص سے دنیا کا ہم نے ساتھ دیا

رہِ حیات کی دشواریاں نہ عارفؔ پوچھ
چلے تو ساتھ بہت، کم سے کم نے ساتھ دیا

شاہدہ سعید

# ڈاکٹر وشویشوریہ

۱۴- اپریل کو بنگلور میں جو لوگ پنڈت ڈاکٹر وشویشوریہ کے والد کی برسی کی رسومات انجام دینے آئے تو یہ عجیب اتفاق تھا کہ انھیں بیٹے کا کریا کرم کرنے کے لئے رکنا پڑا۔ ڈاکٹر وشویشوریہ کی موت اس لحاظ سے بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ وہ بھی سال کے اسی دن پرلوک سدھارے جو ان کے والد کا یوم وفات تھا۔ ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

ان کی موت کے متعلق ان کے معالج کا یہ خیال تھا کہ یہ ان کی قوتِ ارادی تھی جس نے ان کے دل کی حرکت قائم رکھی۔ ورنہ شاید وہ بہت پہلے رخصت ہو جاتے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر وشویشوریہ عظیم اور بے مثال قوتِ ارادی کے مالک تھے، اور ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے جو موت اور زندگی کی کشمکش کو خاطر میں نہیں لاتیں اور جن کے نقشِ عمل کو وقت کا بے رحم ہاتھ نہیں چھو سکتا۔

ان کے کردار، شخصیت اور مزاج کی تشکیل میں مختلف اثرات کارفرما تھے۔ ان کا جنم ۱۵- ستمبر ۱۸۶۱ء کو مُدن پلّی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک نچلے متوسط طبقہ کے کرّہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں بنگلور سے تقریباً ۳۶ میل کی دوری پر ہے۔

اس کے والد سری نواس شاستری مرحوم بہت بڑے عالم اور سخت مذہبی آدمی تھے۔ ان کا زیادہ وقت مقدس مذہبی کتابوں کے مطالعے اور تر تھ استھانوں کی یاترا میں صرف ہوتا تھا، اس لئے ان کی والدہ وینکا چمّا نے وشویشوریہ کی شخصیت اور کردار کی نشو و نما پر گہرا اور فیصلہ کن اثر ڈالا۔ انھوں نے ملک کی زندگی میں جو ممتاز مقام حاصل کیا اس میں ان کی والدہ کی قوت ارادی، دور اندیشی اور جذبۂ ایثار کا بڑا دخل تھا۔ وینکا چمّا اپنے چھوٹے سے گاؤں کی سماجی زندگی میں بڑا اثر رکھتی تھیں۔

جب وشویشوریہ پانچ سال کے تھے اور ان کے والد دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اس دوران میں چوری کی ایک معمولی واردات ہو گئی، لیکن اس بظاہر معمولی واقعہ کا ان کی والدہ نے اتنا اثر لیا کہ انھوں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اب گاؤں رہنے کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا گاؤں چھوڑ کر وہاں سے تین میل دُور چکبالا پور نام کے ایک قصبہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد وہ اکثر اس گاؤں میں آتی جاتی رہیں، لیکن وہاں انھوں نے دوبارہ سکونت اختیار نہیں کی۔

چکبالا پور میں ہی وشویشوریہ کی تعلیم و تربیت کی باقاعدہ شروعات ہوئی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ کم عمری سے ہی وہ متین، سنجیدہ اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ ان کی فرض شناسی اور نیک چلنی نے اسکول کے ایک ممتاز استاد سری نادھ مئی نائیڈو کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے انھیں روزانہ شام کو اپنے گھر پڑھنے کے لئے آنے کا مشورہ دیا اور مسٹر نائیڈو نے ان کے

کے اندر اچھی کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ایک عالی دماغ اور بلند کردار ماں اور ایک شفیق مہربان استاد پانے کے علاوہ وشویشوریہ کی ایک اور خوش نصیبی یہ تھی کہ انھیں ایک شفیق اور خیر خواہ ماموں کا سایۂ کرم بھی نصیب ہوا۔ ان کے ماموں رمیہ نے بھی ان کی زندگی کی تعمیر میں اہم حصہ لیا۔ اور ان کے مشورے سے ہی وشویشوریہ نے ریاست میسور کی ملازمت اختیار کی۔

ایک بار وشویشوریہ اپنی ماں کے ساتھ ایک قریب کے گاؤں میں گئے اور وہاں دو مہینے گزارے۔ ان کے ماموں کو جب ان کی اسکول سے دو ماہ کی غیر حاضری کا پتہ چلا تو انھوں نے اپنی بہن کو ایک سخت خط لکھا:

"کیا تم وشویشوریہ کو چرواہا بنانا چاہتی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں اس کی تعلیم کی کوئی فکر نہیں ہے۔"

اس خط کا یہ اثر ہوا کہ وینکا چلا فوراً اپنے بیٹے کے ساتھ چکبالہ پور واپس آگئیں۔

جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو وشویشوریہ کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ ایک تیز تھپیا تراکے بیچ راپچور میں ان کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد ۱۸۷۵ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے بنگلور گئے جہاں انھوں نے سنٹرل کالج میں داخلہ لیا اور ۱۸۸۰ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ سنٹرل کالج میں ان کی طالب علمی کی زندگی کے دو رُخ تھے۔ ایک طرف انھیں کالج کی زندگی میں امتیاز حاصل تھا، ان کے ہم جماعت ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور وہ خود وہاں کے علمی ماحول سے بڑے خوش اور مطمئن تھے لیکن اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ ان کے نجی حالات پریشان کن اور تکلیف دہ تھے۔ نہ رہائش کی آسانیاں میسر تھیں اور نہ اخراجات کے لئے کوئی معقول ذریعہ، صرف دو خوبیاں ان کا سرمایہ تھیں حوصلہ مندی اور اولوالعزمی۔ ان حالات میں بھی وہ اپنے مستقبل سے مایوس نہیں تھے۔

اس زمانے میں سنٹرل کالج بنگلور کے پرنسپل مسٹر چارلس وائرس تھے۔ داخلہ کے بعد سے ہی انھیں وشویشوریہ کی ترقی سے گہری دلچسپی رہی۔ اکثر وہ انھیں ریاضی کے مشکل سوال حل کرنے کے لئے دیا کرتے اور ان کی فرض شناسی اور پابندیٔ وقت سے متاثر ہو کر مسٹر وائرس نے انھیں ویسبرٹ ڈکشنری کا اپنا ذاتی نسخہ انعام میں دیا۔ وشویشوریہ نے اس ڈکشنری کو جو ۱۸۸۰ کی مطبوعہ تھی، اپنے استاد کی مقدس نشانی سمجھ کر ساری زندگی اپنی میز پر رکھا۔ مسٹر وائرس کا ایک اور انعام جو انھیں بہت عزیز تھا وہ دو سنہری کڑیاں تھیں جو اسی طرح انھیں انعام میں ملی تھیں۔

بچپن سے ہی وشویشوریہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے بڑے دبلے پتلے اور کمزور نظر آتے تھے۔ ایک بار انکے سنسکرت کے پنڈت نے زندگی اور طویل عمر کا ذکر کرتے ہوئے ان کی طرف اشارہ کیا:

"اسے دیکھو اس کا بیس کے سن تک پہنچنا مشکل ہے۔"

لیکن پنڈت جی کی اس پیشینگوئی کے باوجود وشویشوریہ ۱۰۱ سال کے سن تک پہنچے اور ۱۵ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ہندستان میں ان کا صد سالہ جشنِ ولادت بڑے اہتمام سے منایا گیا۔

جب ۱۸۸۰ء میں انھوں نے بی۔ اے کیا تو خوش قسمتی سے اسی زمانے میں ریاست میسور کے دیوان مسٹر رنگ چارلو نے میسور کے ان طلباء کے لئے وظیفے جاری کئے جو میسور سے باہر جا کر اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے۔ جب وشویشوریہ دیوان رنگ چارلو کے گھر پر ان سے ملے تو وہ پہلی نظر میں ہی اس ہونہار اور بلند اقبال طالب علم کے گرویدہ ہو گئے۔ انھوں نے اس کی پیشت پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ وہ ریاست میسور کے وظیفہ سے پونا میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں۔

چنانچہ وشویشوریہ نے پونا کے کالج آف سائنس میں داخلہ لیا اور نومبر ۱۸۸۳ء میں وہاں سے انھوں نے انجینئرنگ کی ڈگری لی اور ساری بمبئی پریزیڈنسی میں اوّل آئے۔ فروری

۱۸۸۴ء میں انھوں نے اسسٹنٹ انجینر کی حیثیت سے حکومت بمبئی کے محکمۂ تعمیرات عامہ کی ملازمت قبول کرلی اور سپرنٹنڈنگ انجینر ہوکر وہاں سے ۱۹۰۸ء میں اپنی مرضی سے ریٹائر ہوئے۔

پونا میں اپنی ملازمت کے دوران میں انھیں کئی یوروپین افسروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور سب نے ان کی ذہانت کارکردگی اور فرض شناسی کو سراہا۔ ان کا دائرۂ عمل محض ملازمت تک محدود نہیں تھا، وہ سماجی زندگی میں بھی ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے دوسرے رفقاء کے تعاون سے پونا میں کن کلب کی بنیاد ڈالی۔ ان کے دوستوں اور رفیقوں کے حلقہ میں گوکھلے، رینا ڈے اور تلک جیسی ممتاز ہستیاں شامل تھیں۔ گوکھلے اور رینا ڈے تو کن کلب کی مجلس انتظامیہ میں بھی شامل تھے۔

حکومت بمبئی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وشویشوریہ غیر ممالک کے دورے پر چلے گئے۔ وطن واپس آنے کے بعد کسی ادارے کی ملازمت قبول کرنے کے بجائے انھوں نے آزاد مشیر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ انھیں کام کی تلاش کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ اس وقت تک ان کی اتنی شہرت ہوچکی تھی کہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی خدمات کی مانگ صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھی بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ان کے مشوروں اور ان کی تجویزوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔

اسی زمانے میں میسور کے دیوان ٹی آنند راؤ نے انھیں خط لکھا:

"آپ کی اعلیٰ صفات اور خدمات کے ساتھ ساتھ اس امر کے پیش نظر بھی کہ آپ میسوری ہیں، ہز ہائی نس کو آپ کی خدمات حاصل کرکے مسرت ہوگی۔ ہز ہائی نس کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ آپ معاوضہ سے زیادہ عوامی خدمت کو اہمیت دیتے ہیں۔"

چناں چہ وشویشوریہ چیف انجینر کی حیثیت سے ریاست میسور سے وابستہ ہوگئے اور تین سال بعد مہاراجہ نے انھیں ٹی۔ آنند راؤ کے بعد ریاست کے دیوان کے منصب پر فائز کیا۔

میسور کے دیوان کی حیثیت سے چھ سال کی مختصر مدت میں ان کے کارناموں کی طویل فہرست ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ کرشن راج ساگر بانڈھ، بلوفی ورکس، اسٹیٹ بینک آف میسور، ریلوے اور ایسے ہی دیگر ادارے اور تعمیرات ان کے دور انتظام کی یادگار ہیں۔ ان میں سے بعض ترقیاتی منصوبے ایسے تھے جنھیں برطانوی ہند اور ریاستی ہند میں اوّلیت کا شرف حاصل تھا۔

اسی دور میں انھوں نے میسور میں بڑی صنعتوں کے قیام کے لئے بھی کئی تجویزیں بنائیں اور ان پر عمل کیا۔ بھدراوتی کا لوہے اور فولاد کا کارخانہ اور لکّا وتی کی برقابی اسکیم بھی ان کے دور کی یادگار ہیں۔ اپنے عرصۂ اقتدار میں انھوں نے میسور کی صنعتی ترقی کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں مجموعی طور پر رنگ بھرنے کے لئے تقریباً پچاس سال کا عرصہ درکار ہے۔ نئے نئے تجربے، نئی تجویزیں اور نئے تصوّرات، ان کو عملی جامہ پہنانے میں انھیں خاص دلچسپی تھی۔

ان کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو یہ تھا کہ وہ ہمیشہ کام کو معاوضہ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے میسور کے دیوان کے منصب سے سبکدوش ہونے سے پہلے مہاراجہ کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ ان کے مشاہرے میں اضافہ کریں لیکن اس پیشکش کو انھوں نے یہ کہہ کر قبول نہیں کیا

"میں اپنے مشاہرے کے اضافہ کے بارے میں مسٹر کیمبل کو لکھ چکا ہوں۔ میں پچھلے اٹھارہ مہینوں سے اس تجویز کا مخالف رہا ہوں اور اب بھی میری رائے یہی ہے۔"

انھوں نے ہمیشہ اپنے کام کو عبادت سے کم نہیں سمجھا۔ مسئلہ خواہ کتنا ہی پیچیدہ اور الجھا ہوا کیوں نہ ہو، ان کی عقابی نظر اس کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کی دل چسپیاں گوناگوں اور وسیع تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام میں ذرا سی بے توجہی برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ اس اصول کے حامی تھے کہ جو کچھ بھی کرنا ہو اسے بخوبی انجام دیا جائے۔

وشویشوریہ اپنے اصولوں کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ بیسو کے دیوان ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنے رشتہ داروں کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان سے کسی رعایت، سفارش یا مراعات کی توقع نہ رکھیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے عہدۂ اقتدار میں ان کے رشتہ داروں کے لئے ریاست میسور کی ملازمت حاصل کرنا زیادہ مشکل ہو گیا ہوگا۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ وہ سنگ دل تھے یا وہ نیا منی سے کام لینا نہیں جانتے تھے۔ انھیں اپنے عزیزوں کے معاشی حالات کا علم تھا اور ضرورت مند عزیزوں کے لئے اور خصوصاً ان نوجوانوں کے لئے جو اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ماہ بہ ماہ ایک معقول رقم کا بندوبست اپنی جیب سے کر دیتے تھے۔

لوگ اکثر ان سے پوچھتے تھے کہ ان کی طویل عمر اور کامیابی کا راز کیا ہے؟ ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا محنت، عادت و اطوار میں توازن اور اعتدال، آرام اور سادگی، اطمینان اور شگفتہ طبعی یہی میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔

اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے تک وہ لوگوں سے پہلے سے معینہ وقت پر ہی ملاقات کرتے تھے۔ اگر ملاقات کسی مشاورت کے لئے ہوتی تو وہ پہلے سے موضوع اور مسئلے کا بغور اور گہرا مطالعہ کر لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی مخصوص پوشاک زیب تن کر کے ملاقات کے لئے تیار ہو جاتے۔ خوش لباسی بھی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ وہ اپنے ملنے والوں سے بھی یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنے مسائل اور حقائق سے پوری طرح آگاہ ہو کر ان سے مشورہ لینے آئیں۔

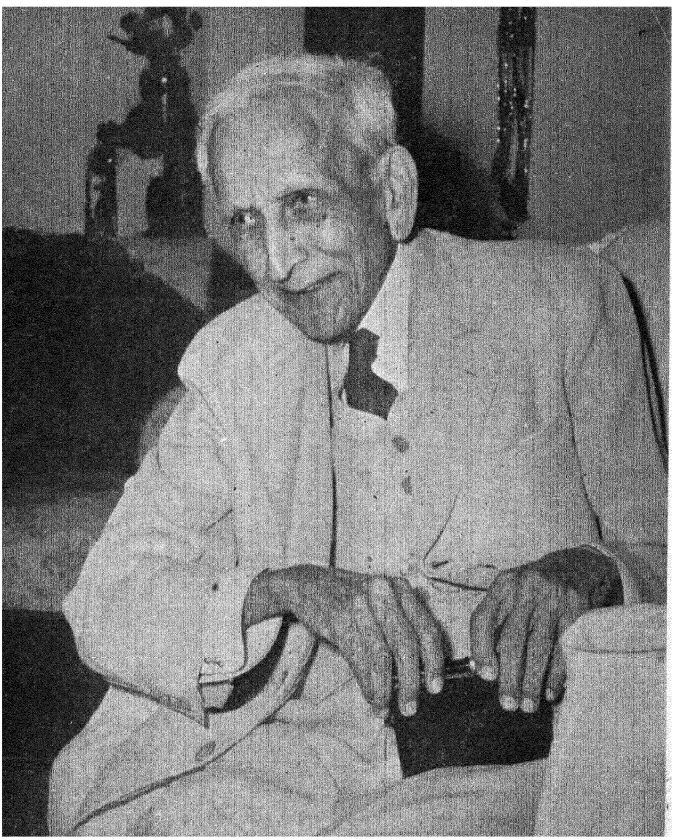
ان کی ذہنی قوت، جسمانی طاقت اور امید پرستی کا کوئی حساب نہ تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو آسانی سے اپنے اصول اور عقیدے میں ترمیم کر لیتے ہیں۔ وہ شملہ بیان مقرر تو نہ تھے لیکن اپنی تقریر بڑی صفائی اور اعتماد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

وہ جذباتی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ خود جتنی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے تھے اتنی ہی محنت اور جانفشانی کی توقع وہ اپنے ماتحتوں سے بھی رکھتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جو آدمی محض اپنی ذاتی کوششوں سے کامیابی حاصل کرتا ہے وہ دوسروں سے بھی خلوص، جوش اور محنت کی امید رکھتا ہے۔

وشویشوریہ صرف ایک اچھے انجینئر، سیاست دان اور معلم ہی نہ تھے بلکہ معاشی معاملات میں اچھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ انھیں ہندستان میں معاشی منصوبہ بندی کا پیش رو کہنا مناسب ہوگا۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا خواب یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو صنعتی طور پر ترقی یافتہ اور خوش حال دیکھیں۔ وہ پہلے ہندستانی تھے جس نے ۱۹۳۴ء میں ہندستان کی معاشی منصوبہ بندی پر ایک کتاب لکھی اس سے پہلے ۱۹۲۰ء میں وہ 'ہندستان کی نئی تعمیر' پر بھی ایک اہم کتاب لکھ چکے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے ملک کو وہ نعرے دئے جو ہمارے ملک کی موجودہ معاشی اور صنعتی ترقی کی روح رواں کہے جا سکتے ہیں۔ وہ نعرے یہ ہیں۔ "پیداوار بڑھاؤ ورنہ ختم ہو جاؤ گے۔" "صنعتی ترقی کرو ورنہ مٹ جاؤ گے۔"

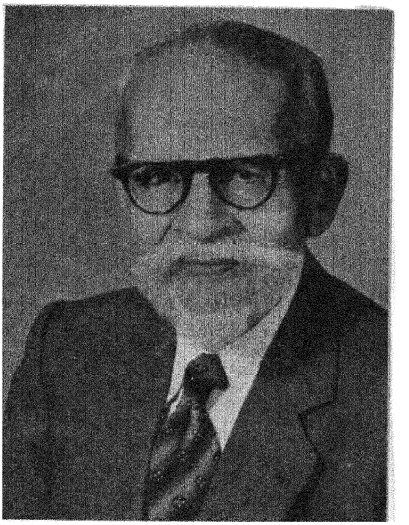
وشویشوریہ کی زندگی اس بات کی روشن مثال ہے کہ اگر کوئی انسان چاہے تو نہ صرف طویل عمر حاصل کر سکتا ہے بلکہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنا اور اپنے ملک کا مستقبل سنوار سکتا ہے۔ انھوں نے یکسوئی، خلوص اور دل لگی کے ساتھ ملک کی خدمت کی اور اپنے آخری سانس تک اپنے علم اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے تاکہ وہ اپنے 'دور اور اپنے' ملک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکیں۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں بھی وہ ایٹمی سائنس کی تازہ ترین ترقی سے بخوبی آگاہ تھے اور ملک کے عام معاشی حالات اور خصوصاً لوہے اور فولاد کے کارخانوں کی ترقی سے پوری طرح باخبر تھے۔ وہ ان قابل قدر ہستیوں میں سے تھے جن کی شخصیت میں اصول اور عمل کا تضاد نہیں ہوتا، جن کے اصول کاغذی پھولوں کی طرح محض آرائش کے لئے نہیں ہوتے بلکہ جو اپنے اصولوں میں اپنے خونِ جگر سے حقیقت کا رنگ بھرتے ہیں۔ اس لئے ہندستان کی صنعتی ترقی اور تعمیر کی تاریخ میں ان کا نام ابد تک درخشاں رہے گا۔

---



ڈاکٹر وشولیشوریہ

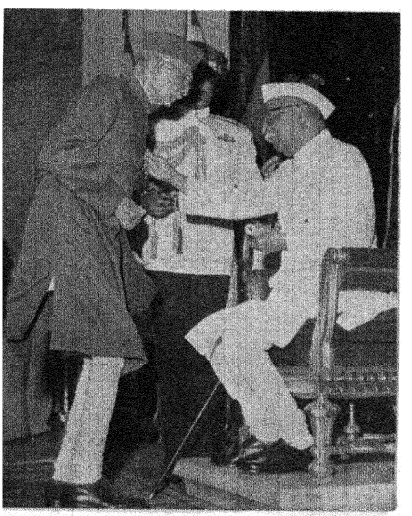
آپ کے باب میں شاہدہ سعید کا مضمون صفحہ ۱۹ پر ملاحظہ فرمائیں



ڈاکٹر عبدالستار صدیقی
جنھیں عربی کے عالم کی حیثیت سے
راشٹرپتی نے اعزازی سند عطا کی

پدم بھوشن کا اعزاز پانے والے اُردو کے ادیب
**آتش لکھنوی** اور **نیاز فتحپوری**





محمد یونس خالدی

# آثارِ تیموری

ہندستان کی تاریخ میں تیموری بادشاہوں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ظہیرالدین بابر سے سراج الدین ظفر تک کوئی بادشاہ ایسا نہیں کہ جس کو نظرانداز کیا جاسکے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اگر ان میں کوئی مجموعۂ محاسن تھا تو کسی کو مجموعۂ معائب بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ عابد شب زندہ دار کے مقابلہ میں رندِ لاابالی بھی نظر آجاتے ہیں۔ لیکن طبائع کے اختلاف کے باوجود ایک مسئلہ میں ذوق کا اشتراک حیرت خیز ضرور ہے، وہ ہے ادب سے دل چسپی اور ادب پروری! اس کی پوری تفصیل تاریخ و تذکرہ میں آج تک محفوظ ہے اور اس کا تذکرہ کبھی زبانوں پر بھی آجاتا ہے اور تاریخ و تذکرہ کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فارسی ادب کے ساتھ ہندی ادب نے اس عہد میں کس قدر ترقی کی اور تیموری بادشاہوں نے ہندی ادب کو آگے بڑھانے میں کس قدر حصہ لیا۔

ظہیرالدین بابر کا دور، تاریخ کا ایک سنہرا دور ہے۔ اکبر کے دور کی ہشرت عالمگیر ہشرت ہے، جہانگیر کی دل چسپیاں ڈھکی چھپی دلچسپیاں نہیں، شاہجہاں ہندی ادب کا صرف سرپرست ہی نہ تھا بلکہ وہ باکمال ادیب اور شاعر بھی تھا۔ غریب عالمگیر پر چا ہے کتنی تہمتیں لگائی جائیں لیکن ادب کی سرپرستی میں، تاریخ کی روشنی میں اسے جو مقام حاصل ہے، اس سے انکار تاریخی حقائق کا انکار ہے۔ مگر ان متذکرہ بالا بادشاہوں میں کسی ایک بادشاہ کا نام اردو کے سرپرست کی حیثیت سے نہیں لیا جاسکتا، ان میں سے نہ تو کسی نے اردو کی سرپرستی کی اور نہ اردو کو سینہ سے لگایا — یہ بات دوسری ہے کہ

> "اردو کا لفظ ترکی ہے اور معنوں کے لحاظ فارسی میں پہنچا اور بابر کے ساتھ ہندستان آیا۔ اس کے معنی امراؤ سلاطین کی فرودگاہ (لشکرگاہ) یا کیمپ ہے، چنانچہ شاہجہاں اور بعد کے بادشاہوں کے کیمپ اردو معلّٰی کے نام سے موسوم تھے اور قلعۂ دہلی کے طرح بازار کا نام بھی اردو بازار تھا[1]"

اس لئے اس کو زبان کی حیثیت سے جاننے کا یا سرپرستی کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، رہا اردو زبان میں شعر کہنے کا سوال، تو اس کی تاریخ قدیم تاریخ ہے۔ اس زبان میں شاعری کا آغاز کس سن میں ہوا اور اردو کا سب سے پہلا شاعر کون تھا؟ یہ مسئلہ ابھی تک تحقیق کا محتاج ہے، لیکن یہ بات مزید صحیح ہے کہ

> "اس زبان کا بیج اس سرزمین میں اس وقت پڑا کہ جب مسلمان اور ہندوؤں میں یک جائی ہوئی[2]"

اور اس یک جائی کا ایک خوش گوار نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی زبان سے آشنا ہونے لگے۔ ہندی، فارسی زبان کو قبول کرنے لگی اور فارسی میں ہندی کے الفاظ آنے لگے۔ شمار نے

---

[1] اردو ادب کی مختصر تاریخ (دفتر مطبوعہ) ص ۱ مرتبہ مولوی عبدالحق

[2] " " " " ص ۲ " "

دونوں زبانوں سے کام لیا۔

"رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر یہ تقاضائے فطرت دونوں اور دو زبانوں کے میل جول سے خود بہ خود ایک زبان پیدا ہو گئی جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔[1]"

زبان کے اس اشتراک نے متمدن قومیت کی بھی بنیاد رکھی۔ نئی تہذیب نے جنم لینا شروع کیا۔ نیا کلچر، نیا معاشرہ عالم وجود میں آنے لگا۔

اس زبان کی ابتدائی نشو و نما خانقاہوں میں ہوئی، وہاں اہل اللہ کی گود میں کھیلی، پروان چڑھی، پھر دھیرے دھیرے خانقاہوں سے نکلی۔ گلیوں، کوچوں، بازاروں میں پھیرتی ہوئی غیر شعوری طور پر درباروں تک پہنچ گئی اور وہ تیموری سلاطین کہ جن کے درباروں کی زبان فارسی تھی۔ قلعوں میں اگر راج تھا تو فارسی کے بعد ترکی اور ہندی کا راج تھا۔ وہ اگر فرغانہ تھے تو ترکی، فارسی اور ہندی پر فریفتہ تھے اور اس عوامی زبان کھلے جی کے پاس کوئی جگہ نہ تھی! وہ بھی یہ زبان بولنے لگے۔ "جلوۂ خضر" (از صفیر بلگرامی) کی روشنی میں بابر بادشاہ بھی کسی کسی وقت اس زبان میں باتیں کرنے کے لئے مجبور ہو جایا کرتا تھا۔ اور جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بھی ہمہ اٹھتا تھا کہ

"پوچھی جو گھڑی، مجھ سے براہ عادت
تو وصل کی ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانا نہیں، خوش ہر ساعت[2]"

اور جہانگیر کی طرف سے جہانگیری کرنے والی مہر النساء بنت مرزا غیاث الدین بھی عالم عیش و نشاط میں یہ صد ناز و انداز پکار اٹھی تھی کہ

دیں جگر زخم جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بے باک میں ہم
نقش پا کی نظر، اے راحت جان عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم[3]"

سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی صاحب زادی شاہ نواز خاں بدیع الزماں کی نواسی "دل رس بانو بیگم" کی صاحب دل بیٹی زیب النساء بھی کبھی کبھی اسی زبان میں داستان غم دہرانے لگتی تھی اور عالم بے خودی میں اس کی زبان سے نکل جایا کرتا تھا کہ

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی
اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسو کی
ہر ایک پہ تم جور جو کرتے رہو پیارے
ڈھر کے ہے مرا دل، نہ لگے آہ کسو کی
نہ نامہ، نہ پیغام زبانی نہ نشانی
حالت سے کوئی کیوں ہو آگاہ کسو کی
جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے
صنم جو تجھ ہوا آشنا، وہ جی سے گیا
خدا کسی کے تئیں تجھ سے آشنا نہ کرے

---

[1] اردو ادب کی مختصر تاریخ (دفتر مطبوعہ) ص ۵ مرتبہ مولوی عبدالحق

[2] جلوۂ خضر حصہ اول (مصنفہ حضرت صفیر بلگرامی) ص ۴۷

[3] ۱۶۱۱ء میں نور جہاں بن کر جہانگیر کے عقد میں آئی۔ ۱۶۲۷ء تک ملکۂ ہند بنی رہی اور اپنی سال ہوگی کے اپنی اداؤں کی جہانگیری جو گزارے۔ ۱۶۴۶ء میں لاہور میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

[4] جلوۂ خضر حصہ اول حاشیہ ص ۹۴

[5] اورنگ زیب عالمگیر کے صاحب دل ہونے کا ثبوت اورنگ آباد (دکھن) میں بی بی کا مقبرہ ہے، جسے دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے

یہ پتھر کا نہیں مقبرہ — یہ دل ہے اس بادشاہ کا
جسے جگت بے دل کہتا تھا — "بی بی کا مقبرہ"

(دفتر مطبوعہ) پروفیسر ولی دکھنی و دیا شنکر

آکر ہماری نعش پہ کیسا یار کر چلے
خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے
خواہی پیادہ، خواہ سبو، کھیو کمال
ہم اپنی خاک پہ تجھے مختار کر چلے
کہتے ہو تم، نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی"

یہ داستان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے دور کی داستان ہے اور پھر اس کی صحت پر یقین کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد تیموری خاندان کا زوال شروع ہوا اور پھر

"یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سلطنت مغلیہ کا دورِ انحطاط اردو زبان کے عہدِ زرّیں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ زمانے کی جب ستم ظریفی ہے کہ ادھر سلطنت مغلیہ کے اقبال کا یہ آفتاب عالم تاب غروب ہوتا ہے اور ادھر اردو زبان کے اقبال کا ستارہ نصف النہار پر ضوفشانی کرتا ہوا اقصائے عالم کو منوّر کرتا ہے . . ."[1]

اور جو —

"ترقی اس کی تقدیر میں لکھی تھی وہ سلطنت کے تنزّل کے پردے میں تھی"[2]

زبان کی ترقّی کے ساتھ اردو شاعری کا عروج بھی حیرت خیز ہے، اور

"یہ ظاہر و عجیب سی بات ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی ماحول جس نے دہلی میں اردو شاعری کو نشو و نما دیا، جب زوال پذیر ہونے لگا تو اردو شاعری فروغ پانے لگی . . ."[3]

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اردو کا مزاج خالص عوامی مزاج تھا اور اس کی ترقی کے لئے ابتلا و آزمائش کے ساتھ عوامی دور کی ضرورت وقت کی اہم ضرورت تھی — ہندستان کی تاریخ کی روشنی میں تیموری بادشاہوں میں پہلا عوامی بادشاہ نصیر الدین، روشن اختر محمد شاہ (۱۷۰۱ - ۱۷۴۸ء) تھا۔ جس کے دورِ حکومت کا آغاز ۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ میں ہوا اور خاتمہ ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ میں۔ یہ پہلا بادشاہ ہے کہ جس نے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے اردو کا سہارا لیا اور اردو دیکھی جانے لگی، مگر یہ یاد رہے کہ سرکاری زبان پھر بھی نہ بن سکی۔ اس دور میں اس کا نام اردوئے معلّیٰ تھا بلکہ اس کو ریختہ کہا جاتا تھا۔

"ریختہ کے کئی معنی ہیں، ایک معنی سنگین عمارت کے ہیں اور اس سے اس کا استعمال چونے اور گچ پر ہونے لگا جس سے عمارت سنگین اور پختہ ہو جاتی ہے۔ یہ تعمیرات کی اصطلاح ہے۔ ایک دوسرے معنی گری پڑی چیز کے ہیں۔ اسی سے بعض معمّمّوں نے یہ معنی پیدا کئے ہیں، کہ چونکہ اس زبان میں الفاظ پریشان جمع ہیں، اس لئے اس کا نام ریختہ ہو گیا — اور ایک معنی ڈھالنے اور بنانے کے ہیں اور غالباً انھیں معنوں سے موسیقی کی اصطلاح "ریختہ" بنی، جس کا اطلاق اس "سرود" پر ہوتا ہے جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے مقرّر تال اور راگ کے اعتبار سے مستعمل ہوتے ہیں۔ اس اصطلاح کے متعلق یہ خیال ہے کہ یہ امیر خسرو کی وضع کی ہوئی ہے چناں چہ ان کی مشہور غزل

"زحال مسکیں، مکن تغافل، دورائے نیناں، بنائے بتیاں"

اس کی سند میں پیش کی جاتی ہے"[4]

اور میر تقی میر نے بھی اپنے تذکرہ نکات الشعراء کے خاتمہ میں ریختہ کی یہی تعریف کی ہے کہ

"اوّل آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی۔ چناں چہ

---

[1] جلوہ خضر حصّہ اول حاشیہ ص ۵۶
[2] نقد ادب (سید علی حیدر ایم۔ اے) ص ۱۹
[3] جلوۂ خضر جلد دوم ص ۹
[4] اردو کی ادبی تاریخ (پروفیسر عبدالقادر سروری) ص ۱۳۳

[1] اردو ادب کی مختصر تاریخ (دہلی) بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق ص ۲، ۳

قطعہ حضرت امیر علیہ الرحمۃ نوشتہ شد[1]
دوم آنکہ نصف معرعش ہندی و نصف فارسی۔ چناں چہ
شعر میر[2] کہ نوشتہ آمد[3]

یکسں ایک زمانہ کے بعد اس کا الحاق اردو نظم کے لئے ہونے لگا۔ اور یہ استعمال غالب کے زمانہ تک پایا جاتا ہے۔

محمد شاہی دور ریختہ کے باکمال شعراء کا دور تھا ——— شاہ بہم الدین مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، میر محمد شاکر ناجی، مصطفےٰ خاں یک رنگ، اشرف علی خاں فغاں، شاہ ظہور الدین حاتم اور حضرت مرزا مظہر جان جاں اسی دور کے مشاہیر شعرا تھے۔ محمد شاہ کے متعلق حضرت ولی گجراتی (دکنی) نے فرمایا تھا کہ

دل وؔلی کا لے لیا دؔلی نے چھیں
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اس دور کے بعد جو دور آتا ہے وہ مجاہد الدین احمد شاہ بادشاہ (۱۷۴۸ - ۱۷۵۴ء) کا دور تھا۔ یہ دور انتہائی پُر آشوب دور تھا لیکن اس کے دربار میں شعراء کو عزت حاصل تھی، اور اشرف علی خاں فغاں ان کے کوکے (دودھ شریک بھائی) تھے۔ چھ سال حکومت کرنے کے بعد نظام الملک کے پوتے عماد الملک شہاب الدین کے ہاتھوں ان کو بینائی کھونی پڑی اور تختِ سلطنت سے معزول ہونا پڑا۔ عماد الملک نے احمد شاہ کو معزول کرنے کے بعد عزیز الدین عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ ان کا دور مرہٹہ گردی کے شباب کا دور تھا اس لئے ان کی ادبی دل چسپیوں کی تفصیل بھی نہ معلوم ہو سکی۔ تذکروں سے ان کے شعری ذوق کی نشان دہی ضرور ہوتی ہے۔ اس بادشاہ کو بھی عماد الملک کی سازشوں کا شکار ہونا پڑا اور جامِ شہادت نوش کر کے اپنے فرزند ابو المظفر جلال الدین شاہ عالم ثانی آفتاب (۱۷۶۹ - ۱۸۰۶ء) کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی۔ تیموری بادشاہوں میں یہ بادشاہ عربی، فارسی سنسکرت، ترکی، ہندی، اردو، بھاشا اور پنجابی زبانوں کا عالم تھا۔ اور فارسی، ہندی اور اردو کا مستند صاحب دیوان شاعر بھی تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس کی مملکت کا رقبہ ۱۸۰۳ء کے بعد اسی مشہور کہاوت کی روشنی میں کہ

"حکم شاہ عالم از دہلی تا پالم"

تھا۔ لیکن اسی زمانہ میں 'ریختہ' زبان کے معنی میں استعمال کی گئی اور اسی نے اردو کا نام پایا۔ سب سے پہلے میر تقی میرؔ نے نکات الشعراء میں

"یہ زبان اردوئے معلّٰی شاہ جہان دہلی"[1]

پھر مصحفی نے اردو کا لفظ زبان اردو کے لئے لکھا اور کہا کہ

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

مصحفی کے بعد میر انشاء اللہ خاں انشا نے دریائے لطافت میں انیسیں معنوں میں اردو کا لفظ استعمال کیا اور اسی زمانہ سے اردو عام طور پر زبان اردو کے لئے استعمال ہونے لگی ——— مگر اس کی معنویت کے آثار بھی نمایاں ہونے شروع ہو گئے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں دلی اُجڑنے لگی اور لکھنؤ بسنے لگا۔ باکمالوں نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ خان آرزو، مرزا محمد رفیع سوداؔ

---

[1] قطعہ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

زرگر بسر چو ماہ پارہ — کچھ گڑھ گئے سوارے پکارا
فتد دل سی گرفت و بگسلت — پھر کچھ نہ گھڑا، نہ کچھ سنوارا
(نکات الشعراء (میر تقی میر) ص ۲)

[2] شعر میر معز فطرت، موسوی خاں

از زلف سیاہ، بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے
(نکات الشعراء (میر تقی میر) ص ۴۴)

[3] نکات الشعراء میر تقی میر (مرتبہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم) ص ۱۸۶

[1] نکات الشعراء (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں) ص ۱

میر تقی میر، سید محمد میر سوز، مرزا جعفر علی حسرت، غلام ہمدانی مصحفی میر غلام حسین ضاحک، میر حسن حسن، شیخ قلندر بخش جرأت، میر انشاء اللہ خاں انشا، سعادت یار خاں رنگین وغیرہ وغیرہ لکھنؤ پہنچے۔ یہاں نواب محبت خاں ابن حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی سرکار، ادب نواز سرکار تھی۔ نواب امجد الدولہ اور نواب سعادت علی خاں کے دربار تو واقعی دربار تھے، اور پھر لکھنؤ میں تیموری دربار کے آثار موجود تھے۔ وہ دربار شاہ زادہ مرزا سلیمان شکوہ (متوفی ۱۸۳۷ء) خلف شاہ عالم ثانی آفتاب کا دربار تھا۔ اسی زمانہ میں بنارس میں ایک [illegible] دربار کی داغ بیل پڑی۔ اس کے بانی شاہزادہ مرزا [illegible] عرف مرزا جوان بخت بہادر جہاندار (متوفی ۱۸۰۶ء) ولی عہد اول شاہ عالم ثانی آفتاب تھے۔ ان کی جہاں داری کی داستانیں تاریخ نے پوری طرح محفوظ نہ رکھی ہیں۔ اس جہاندار نے اردو کی پوری طرح سرپرستی کی۔ اردو دوستی کا حق ادا کیا، اس کے فروغ میں کافی حصہ لیا۔ تیموری شاہ زادوں میں اس ذوق کو پروان چڑھایا۔ اسی لئے 'آثار تیموری' میں جہاندار اور سلیمان کے آثار نمایاں ہیں۔ اسی دور میں اردو معلیٰ کے قدم کلکتہ میں پہنچے اور مدراس کو بھی شاہ زادہ محمد ظہیر الدین مرزا عالی بخت الظفری (۱۷۶۰ - ۱۸۱۸ء) نے قلعہ معلیٰ کی زبان سے نوازا۔ یہ بات سچ ہے کہ شاہ عالم ثانی آفتاب کا زمانہ آفتاب تیموری کے غروب اور آفتاب اردو کے جلال کا زمانہ تھا۔ اسی لئے اس آفتاب اردو کی ضیا باری شاہ زادہ مرزا حسن بخت احسن خلف شاہ عالم ثانی کے ذریعہ کابل میں ہونے لگی۔

لیکن یہ دلی کا اجڑنا، دلی کا اجڑتا نہ تھا بلکہ پورے ملک کی تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ اس کو اگر کسی نے محسوس کیا تو ایک خانقاہ نشین نے محسوس کیا اور اس وقت محسوس کیا جب کہ دلی پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہو رہی تھیں۔ کوئی قدر دان سخن بھی نہ تھا۔ خان آرزو، سودا، میر تقی میر دلی چھوڑ چکے تھے۔ وہ خانقاہ نشیں خواجہ میر درد تھے۔

ان کے پائے استقلال کو ذرہ برابر لغزش نہ ہوئی۔ وہ مرتے دم تک دلی میں رہے۔ انھوں نے دلی میں اردو زبان کی آبرو رکھی اور اپنے وجود سے نئی زندگی اور نئی توانائی بخشی — اس دور میں قلعہ معلیٰ میں اگر کسی زبان کی راجدھانی تھی تو وہ زبان اردو زبان تھی اور ہر شاہزادہ اس زبان پر فریفتہ تھا۔ تیموری شاہزادوں میں اکثریت ایسے شاہزادوں کی تھی۔ جو خود بھی شاعر تھے اور قلعہ معلیٰ میں "تیموری دبستان شاعری" کے قائم کرنے والے تھے۔ ان شاہ زادوں میں احسن بخت احسن ظہیر الدین ظفری، معز الدین ثابت، جوان بخت جہاندار و غلام فخر الدین حشمت، جلال الدین زیب، عزیز الدین سرور ایزد بخش سلطان، سلیمان شکوہ سلیمان، اکبر شاہ ثانی شائع غیاث الدین شہرت، مرزا حاجی شہرت، قمر الدین شہید، بہادر شاہ ظفر، رحمت بخش عاشق، مرزا کوچک بخت کوچک فرخندہ بخت جہاں قمر، احمد بخش منصف، دارا بخت وفا، مرزا غلام فخر الدین ہادی کو خاص شہرت حاصل تھی۔ یہ سب 'تیموری دبستان شاعری' کی جان تھے اور شاہ عالم ثانی کے دامن میں ان کے ننھے قلمرو معلیٰ میں گونجنے لگے تھے۔ لیکن یہ دبستان شاعری معراج کمال تک پہنچا تو ابو الظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ - ۱۸۶۲ء) کے دور میں پہنچا۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی (۱۸۳۷ء) کے بعد یا یوں کہیئے کہ

"انیسویں صدی کے ربع دوم میں دہلی کی فضا پھر ایک مرتبہ نئے لغز سنجوں کے ترانوں سے گونجنے لگی"[1]

یہ زمانہ کمال تیور کے آخری سنبھالے کا زمانہ تھا اور قلعہ معلیٰ شعر و شاعری کا مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ شاہ زادوں میں ایک بھی شاہزادہ ایسا نہ تھا کہ جس کو شعر فہمی اور شعر گوئی کا ذوق نہ ہو اور مشاعروں میں حصہ نہ لیتا ہو۔ پھر وقت کے سبھی

---

[1] اردو کی ادبی تاریخ (پروفیسر عبدالحق اور سروری) ص ۱۹۳

شعراء درباری شاعر تھے، صرف ایک حکیم مومن خاں مومنؔ کا دامن ان آلودگیوں سے پاک تھا اور وہ اپنے کو دربار سے وابستہ نہ کر سکے حالاں کہ ان کے معاصرین میں شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ (۱۷۸۹ء - ۱۸۵۴ء) کو استاد شہ کا لقب حاصل تھا اور مرزا غالب (۱۷۹۶ - ۱۸۶۹ء) تلطفِ معلّیٰ میں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات سے یاد کیے جاتے تھے۔ اسی دور میں دلّی میں انقلاب آیا اور ایسا انقلاب آیا کہ جس انقلاب نے قلعۂ معلّیٰ کی بساط الٹی پورے ملک کا شیرازہ منتشر ہوا، ہندستان کی زمین پکار اٹھی کہ

زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

دَور دَور دارو گیر کے سلسلے کا آغاز ہوا، عزت والے ذلیل کیے جانے لگے۔ شاہ زادے چن چن کر گرفتار کیے گئے۔ ان میں سے کچھ شاہ زادے میجر ہڈسن کی گولی کا نشانہ بنے اور کچھ نے چاندنی چوک دلّی کی کوتوالی کے چبوترہ پر تختہ دار چوما۔ اور جو باقی بچے وہ جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ آخری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ رنگون میں نظر بند کیے گئے اور اس مظلوم بادشاہ کو

"دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں"

لیکن یہ اردو زبان جو منہ سے لگ چکی تھی، وہ نہ چھٹی۔ وہاں بھی اسی زبان میں وہ اپنی داستانِ زندگی دہراتے رہے اور غم کے افسانے سناتے رہے۔ بہادر شاہ ظفر کے علاوہ یہ تیموری خاندان کے چشم و چراغ جہاں جہاں گئے اپنی پیاری زبان اردو کو اپنے ساتھ لے کر گئے۔ حیدر آباد، رام پور، بنارس میں جو آثار باقی ہیں وہ گو شہ گمنامی میں رہتے ہوئے اس زبان کے امین ہیں۔ یہ زبان ہندستان کی پیاری زبان اور باہمی میل جول کی نشانی تھی۔ اسی زبان سے محبت ان کا ایمان تھا اور 'آثارِ تیموری' اس کا زندہ ثبوت ہے۔

---

## مدھیہ پردیش میں آثارِ قدیمہ کی دریافت

مدھیہ پردیش کے ضلع سوگر میں پرن کے مقام پر ۱۹۶۱-۱۹۶۰ء میں کی ہوئی کھدائیوں میں چار قدیم ادوار کی تہذیبوں کے آثار ملے ہیں۔ جن کا تعلق پیتل کے دور سے لے کر عہدِ وسطیٰ تک ہے۔ برآمد شدہ آثار میں لائقِ ذکر نقش نگار بنے ہوئے مٹی کے برتن، سُرخ مٹی کی بنی ہوئی جانوروں کی شبیہیں، مالائیں، تانبے کے سکّے، سام گپتا، ناگ خاندان اور ہند ساسانی حکمرانوں کے دور کے سکّے اور لوہے کی دیگر اشیاء شامل ہیں۔

ان آثار سے پیتل کے زمانہ سے عہدِ وسطیٰ تک ایک مضبوط کلچرل تسلسل قائم ہو گیا ہے

عشرت قادری

# منصوبے

یہ مرا دیش! کسانوں کا، جیالوں کا وطن
یہ مرا ہند، ہلوں اور کدالوں کا وطن

جنگلوں کی، یہ پہاڑوں کی، گپھاؤں کی زمیں
سادھوؤں، سنت، رشی، لوک کتھاؤں کی زمیں

گنگناتی ہوئی بہتی ہیں جہاں گنگ و جمن
شانتی، امن، محبت کا سکھاتی ہیں چلن

مسکراتا ہے جہاں دھان کی فصلوں کا شباب
کھیتیاں جھومتی ہیں، نہروں میں کھلتے ہیں گلاب

یہ مرا دیش! کلاؤں کی، اجنتا کی زمیں
یہ مرا ہند! یہ گجرا ہو، الورا کی زمیں

ایک جیون ہے نیا، آنکھ جدھر اٹھتی ہے
لہلہاتی ہوئی آشائیں ہیں، ہریالی ہے

کال رُکتا تھا جہاں، آج، انھیں کھیتوں میں
بالیاں جھومتی ہیں روپ کا آنچل تانیں

گاؤں کی اُکتی ہوئی دھرتی ہوئی ہے آباد
کارخانوں سے نکلتا ہے پگھل کر فولاد

یہ مرا دیش! یہ کشمیر و ہماچل کی زمیں
یہ مرا ہند! یہ گاندھی کی اہنسا کی زمیں

ہیراکڈ، ناوڑہ، ہیوی یہ بھلائی، یہ ملیں
پاؤں میں پائلیں باندھے ہوئے بہتی نہریں

بھاکڑہ، نیپا نگر، سندری اور چیر جن
لاکھ منصوبے چھپائے ہوئے زیرِ دامن

جگمگاتے ہوئے بھارت کا پتہ دیتے ہیں
اپنی جاگی ہوئی قسمت کا پتہ دیتے ہیں

ان کلاؤں کو نگر اور سنورنا ہے ابھی
روپ کچھ اور بھی دھرتی کا نکھرنا ہے ابھی

آؤ رے ہند کے مزدور، کسانو! آؤ
اے کلاکارو! اٹھو! ویر جوانو آؤ

محمد حسن

# شکست

( پانچ مناظر کا ایک المیہ )

کردار

فرخ — ایک ماہر فن ڈاکٹر عمر ۳۰ سال

پرکاش — اس کا دوست جو ہم عمر ہے

نیلم — ایک نوجوان اندھی لڑکی

نوکر — بوڑھا وفادار ملازم

زمانہ : موجودہ — وقت : صبح ۱۰ بجے سے پہلے

فرخ کے کمرے کے باہر برآمدے میں پرکاش کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور نوکر سے گفتگو کر رہا ہے

[ ستار پر غمگین نغمہ دور سے آرہا ہے آواز قریب آتی جاتی ہے ]

**پرکاش** یار عجب اناڑی سے پالا پڑا ہے - کیوں مسٹر تم ڈاکٹر کے یہاں کب سے نوکر ہو ؟

**نوکر** - سرکار بہت دن گزر گئے - آپ ذرا دیر ٹھہر جائیں — ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں

**پرکاش** - ( بات کاٹ کر ) کیا ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب لگا رکھی ہے - تم جانتے نہیں ہو بڑے میاں وہ میرا لنگوٹیا یار ہے - اس سے کہو فرخ ، تمہارا باپ پرکاش آیا ہے پھر دیکھنا دوڑا ہوا چلا آئے گا

**نوکر** - لیکن سرکار ذرا دیر . . . . .

**پرکاش** کیا یار ذرا دیر ذرا دیر کی رٹ لگا ئی ہے - دو گھنٹے ہو گئے دیکھو بڑے میاں تم نے جاکر خبر نہ کی تو میں خود گھس جاؤں گا۔

**نوکر** - نہیں بابو جی نہیں۔

**پرکاش** - بھئی کمال ہے - خود بھی جاکر خبر نہیں کرتے مجھے بھی کمرے میں نہیں جانے دیتے - کیا مذاق ہے - میرا یار ہے ڈاکٹر فرخ - ساتھ اسکول میں کھیلے ہیں - ساتھ میڈیکل کالج میں دھما چوکڑی مچائی ہے - اب اتنے دنوں بعد ملنے آیا ہوں اس سے ، اور تم تھا نیدار بن کے کھڑے ہو گئے - چلو مجھے اس کا پتہ دو - میں اپنے آپ بھگت لوں گا

**نوکر** بابو جی ذرا دیر اور —

**پرکاش** - میں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہروں گا

**نوکر** - آپ ستار کی آواز سن رہے ہیں ؟

**پرکاش** - ہاں ستار کی آواز سن رہا ہوں پھر —

**نوکر** - جب تک یہ ستار کی آواز بند نہیں ہوتی اس وقت تک میں کمرے میں نہیں جا سکتا -

**پرکاش** - خوب ستار تو فرخ ہمیشہ سے بجاتا ہے -

**نوکر** - اور بجاتے ہیں تو اس بے خبری سے بجاتے ہیں کہ انہیں تن بدن کا ہوش نہیں رہتا - اس وقت وہ اپنے آپے

ہیں نہیں ہو سکتے بابو جی - اس وقت ان سے کچھ کہنا بے کار ہے ۔

(ستار کی آواز دور ہی ہو جاتی ہے)

پرکاش - خوب بجاتا ہے ظالم - اچھا میاں تم جاؤ میں انتظار کروں گا -

نوکر - اچھا بابو جی — میں ابھی خبر کرتا ہوں - آپ ذرا دیر بیٹھیے -

پرکاش - تم جاؤ (جانے کی آواز) بلاٹی - کم بخت اڑ گیا تھا - میں خود کمرے میں جا کر دیکھوں گا - یہ لاٹ صاحب کیا کر رہے ہیں -

(ستار پر بڑا طوفانی راگ چھڑا ہوا ہے - عین اس وقت اب لمحہ اپنے شباب پر پہونچتا ہے، پرکاش دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتا ہے - سجا ہوا کمرہ ہے - اس کے اندر ایک طرف قالین پر فرخ بیٹھا ستار بجا رہا ہے)

پرکاش - فرخ (کوئی جواب نہیں ملتا - ستار بج رہا ہے) فرخ! (چیخ کر) فرخ [ستار ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے]

فرخ - کون ہے ؟

پرکاش - میں ہوں پرکاش -

فرخ - (سوچتے ہوئے) پرکاش [ایک دم پرکاش کی طرف پورا چہرہ گھما کر دیکھتا ہے]

پرکاش - یہ تمہیں کیا ہو گیا فرخ ؟

فرخ - (نفرت اور درد کے ساتھ) میرا چہرہ بڑا ہیبت ناک ہو گیا ہے - تمہارا خوبصورت اور نوجوان دوست فرخ بڑا بدصورت ہو گیا ہے - جاؤ تم بھی اس سے منہ موڑ کر چلے جاؤ -

پرکاش - مجھے معاف کر دو دوست —

فرخ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا پرکاش - میں بدصورت ہوں میرے چہرے پر زخم کا لمبا سا نشان ہے - میرے چہرے کا ایک حصہ جل کر ایسا ہیبت ناک ہو گیا ہے کہ جو دیکھتا ہے چیخ اٹھتا ہے - یہ سب باتیں تو اس دن معلوم ہو گئی تھیں جب میں لڑائی کے میدان سے لوٹ کر آیا تھا - ملٹری اسپتال سے نکلتے ہی آئینے نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا -

پرکاش - مگر یہ سب کیسے ہوا فرخ ؟

فرخ - بہت معمولی سی بات ہے - جنگ کی خندق بم کا خوفناک دھماکا اور ایک غریب بے آسرا سپاہی - ہو سکتا تھا کہ میرے بدن کے چیتھڑے اڑ جاتے - مگر بدقسمتی سے میں زندہ بچ گیا - یہ جھلسا ہوا چہرہ، سیاہ داغ، زخموں کے بھیانک نشان — یہ ہے تمہارا فرخ -

پرکاش - یاد چھوڑو بھی ان باتوں کو - میں تو دن رات کے کام کاج کے چکر سے بور ہو گیا - سوچا چلو اپنے یار سے مل آئیں - پرانے زمانے کی باتیں کریں گے - بھگوان کی قسم کیا جوانی گزاری ہم لوگوں نے - یاد ہے کیسا رومانٹک زمانہ تھا - ثریا کی یاد میں رات کو موم بتی کی دھندلی روشنی میں میاں فرخ ستار بجاتے تھے — اور میں جانے کیا الٹے سیدھے گیت گایا کرتا تھا (ہنستا ہے) کیا غزل تھی یار - "کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

فرخ ہاں پرکاش - میرے لئے اب پرانی یادوں کے سوا سب کچھ جل کر بھسم ہو گیا ہے - بس وہی موم بتی کی دھندلی روشنی ہے - ستار ہے اور بیتی ہوئی باتوں کے بگولے ہیں -

پرکاش - ثریا کی کچھ خیر خبر ہے ؟

فرخ - نہیں -

پرکاش - تم دونوں نے تو بیاہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا یار

فرخ - تم سمجھتے کیوں نہیں پرکاش - اس بھیانک چہرے کے ساتھ میں ثریا کے پاس شادی کا پیغام لے کر جاتا ؟

پرکاش - لیکن دنیا میں خوب صورت چہرہ ہی تو محبت کا پاسپورٹ نہیں ہے -

فرخ — جب میں اسپتال کی میز پر مردوں کی چیر پھاڑ کرتا ہوں ان کی پسلیوں کی ہڈیوں کو الگ کر کے گنتا ہوں۔ ان کے گوشت کے ایک ایک ٹکڑے کو کاٹ کاٹ کر دیکھتا ہوں تو میں بھی سوچتا ہوں یہ خوبصورتی کیا ہے یہ حسن اور اس کے چرچے کیا ہیں۔ یہ مسکراہٹوں کے جال، یہ دل فریب لب و رخسار یہ سب مجھے تماشا لگتے ہیں۔ یکسی زندگی آپریشن تھیٹر نہیں ہے۔

پرکاش — تم نے ثریا کو بے پناہ پیار کی دولت بخشی تھی وہ بھلا کبھی اسے بھول سکتی ہے؟

فرخ — پرکاش شاعرانہ جذبہ ہم تم اس دنیا کے رہنے والے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دنیا میں کسی میں اتنی سمائی نہیں ہے کہ مجھ ایسے بدصورت انسان سے پیار کر سکے مجھے تنہا رہنا ہے۔ ہاں ہر روز میں اپنی تنہائی کو اس اندھیرے کمرے میں دور کر لیتا ہوں۔ ہر رات کو موم بتی کی اس خواب ناک روشنی میں ستار کے اس نغمہ کے ساتھ میں اپنے پرانے رفیقوں کی محفل سجاتا ہوں اور چند لمحوں کے لئے اپنے ہیبت ناک چہرے کو اتار پھینکتا ہوں۔ میرے لئے یہی دولت بہت ہے۔

(دروازے پر دستک)

فرخ — اندر آ جاؤ

(کچھ ہوتی آتی ہے)

نیلم — (روتے ہوئے) آپ نے کیوں مجھے ٹھوکریں کھانے کے لئے بچایا ہے۔ آپ نے مجھے مر جانے دیا ہوتا۔ ایک اندھی لڑکی کو بچا کر آپ کو اپنی رحم دلی کا ڈھنڈورا پیٹنا تھا۔ اللہ کے واسطے مجھے زہر دے دیجئے۔ مجھے موت چاہیئے۔

(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

فرخ — کیا ہوا نیلم — دیکھو اس قدر پریشان نہ ہو۔ تم تو بڑی بہادر لڑکی ہو

نیلم — یہ سب جھوٹ ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ میں بہت بزدل ہوں۔ کمزور ہوں۔ میری آنکھیں نہیں ہیں۔

فرخ — نیلم، نیلم، میری بہادر نیلم۔ آؤ میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔

نیلم — نہیں، نہیں، کہیں نہیں بیٹھوں گی۔ جب قدم بڑھاتی ہوں تبھی ٹھوکر کھاتی ہوں۔ دیر سے آپ کے کمرے کی طرف آنا چاہتی تھی مگر قدم قدم پر نہ جانے کس کس چیز سے ٹکراتی ہوں۔

فرخ — تم نے مجھے بلایا ہوتا۔

نیلم — میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔ میں کب تک اس اندھیرے میں بھٹکتی رہوں گی۔ میں کہتی ہوں آپ نے مجھے پناہ دی۔ آپ نے مجھے کیوں نہ مر جانے دیا؟

فرخ — مایوسی کی باتیں نہیں کیا کرتے نیلم۔

نیلم — نہیں، نہیں، نہیں۔ میں اس طرح زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے میری آنکھیں واپس دے دیجئے۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ آپ میرا اتنا کام نہیں کر سکتے؟ تو پھر مجھے مر جانے دیجئے۔ میں دنیا میں تماشا بننا نہیں چاہتی۔

(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

فرخ — نہ رو نیلم نہ رو۔

پرکاش — تمہاری آنکھیں اچھی ہو جائیں گی۔

نیلم — آپ کون ہیں؟

پرکاش — میں پرکاش ہوں۔

فرخ — میرا بچپن کا دوست اور کالج کا ساتھی۔

نیلم — میں بہت بری ہوں، ڈاکٹر! بابو بہت بری ہوں۔ میں یہ بھی تو نہیں دیکھ پاتی کہ آپ کے پاس دوسرا آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے یہ سب باتیں نہیں کہنی چاہئیں تھیں۔ میں بہت بری ہوں۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

فرخ — نہیں نیلم۔ یہ دوسرے آدمی نہیں ہیں۔ یہ اپنا پرکاش ہے

نیلم - کیا سوچتے ہوں گے اپنے جی میں - مجھے صاف کہیئے ڈاکٹر بابو - میں نے پتہ نہیں کیا کیا کہہ ڈالا -

فرخ - (ہنس کر) پگلی -

نیلم - پرکاش بابو - ڈاکٹر بابو تو فرشتہ ہیں فرشتہ - انھوں نے مجھے اس وقت آسرا دیا جب ساری دنیا نے مجھے ٹھکرا دیا تھا - میں موت کی گود میں پناہ لینے جا رہی تھی - انھوں نے بڑھ کر مجھے آسرا دیا - بے آسرا کو آسرا اور ایک مفلس لڑکی کو عزت دی -

فرخ - پرکاش - اس پگلی کی باتوں پر نہ جانا - کبھی میری تعریف کرتی ہے - کبھی مجھے بڑا بھلا کہتی ہے - دیوانی ہے دیوانی -

نیلم - بچپن ہی سے دیوانی ہی تھی - جب میرے باپ کی لاش ریل کے ٹکڑے جانے لگی - ڈاکٹر بابو کے پاس آئی تھی تو بچپن میں پاگل تھی - میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا - میں اپنے باپ کے پیچھے پیچھے موت کی گود میں چلی جاتی مگر ڈاکٹر بابو نے، اس بے آسرا لڑکی کو بچا لیا - مجھے اپنے گھر میں رکھا - اچھے سے، اچھا کھانے کو دیا - میرے آرام کا ایسے دھیان رکھا کہ مجھے میں ہی گھر کی مالکن ہوں - مجھے اتنا چاہیں دیا کہ یہ عالم دنیا بھی مجھے پیاری لگنے لگی - میرا بھی جی چاہنے لگا کہ کاش میری آنکھیں ہوتیں - میں بھی اس دنیا کو دیکھ سکتی - کاش یہ

پرکاش - کیا یہ سب آنکھوں والے دنیا کو دیکھ سکتے ہیں - آنکھوں والوں میں بھی بہت سے اندھے ہوتے ہیں نیلم -

نیلم - لیکن وہ دنیا میں بیڑ سہارے چل سکتے ہیں - وہ قدم قدم پر ٹھوکر تو نہیں کھاتے -

پرکاش - نہیں بھئی بہت سے آنکھوں والے ٹھوکر کھاتے ہیں -

نیلم - وہ اپنے احسان کرنے والوں کی صورت تو دیکھ پاتے ہیں وہ ان کی خدمت تو کر پاتے ہیں - میں تو ڈاکٹر بابو کو دیکھ بھی نہیں سکتی - میں دیکھنا چاہتی تھی کہ فرشتے کیسے ہوتے ہیں ؟

فرخ - نہیں نیلم - ایسی باتیں مت کرو -

نیلم - کیوں نہ کروں - میں ہمیشہ آپ ہی میری خدمت کرتے رہیں اور میں کچھ نہ کروں - نیلم نے دودھ نہیں پیا ہے تو اسپتال سے ڈاکٹر بابو سیدھے گھر چلے آرہے ہیں - نیلم کی پڑھائی کا وقت ہے تو ڈاکٹر بابو نے سارے کام چھوڑ دیئے ہیں — ہائے اللہ نیلم سارے زمانے کا بوجھ بن کر رہ گئی ہے -

فرخ - اور یہ نوکر کہہ رہا تھا کہ تم نے کھانا نہیں کھایا ہے -

نیلم - ہاں نہیں کھایا ہے پھر!

فرخ - آخر — کیوں نہیں کھایا

نیلم - میری مرضی - بھوک نہیں لگی - نہیں کھایا -

فرخ - اس گھر میں ہر بات میں تمہاری مرضی نہیں چلتی — جانتی ہو نا ؟

نیلم - جانتی ہوں مگر کھانا نہیں کھاؤں گی -

فرخ - کھانا تمہیں ضرور کھانا ہوگا - تم بھوک ہڑتال کر کے میرے گھر میں جان دینا چاہتی ہو ؟

نیلم - میں ہرگز کھانا نہیں کھاؤں گی، ہرگز نہیں کھاؤں گی - نہیں تو مجھ سے وعدہ کیجئے -

فرخ - کیسا وعدہ کروں ؟

نیلم - وعدہ کیجئے کہ آپ میری آنکھیں مجھے واپس دلا دیں گے -

فرخ - میں خدا نہیں ہوں نیلم، خدا کا حقیر بندہ ہوں -

نیلم - وعدہ کیجئے - آپ اس کی کوشش کریں گے -

پرکاش - یہ بات ٹھیک ہے - کوشش کا وعدہ کرنے میں کیسا ہرج ہے -

نیلم - وعدہ کیجئے — لے لیجئے -

فرخ - دیکھو نیلم میں کوئی وعدہ نہیں کرتا - تم جانتی ہو نیلم میں تمہیں کس قدر عزیز رکھتا ہوں - کیا تمہیں مجھ پر اتنا بھی بھروسہ نہیں -

نیلم - پورا بھروسہ ہے۔ مگر مجھے اپنی آنکھیں واپس مل جانیں۔ میں اس اندھیرے میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

فرخ - تم لوگ ڈاکٹر کو سمجھتے کیا ہو۔ وہ تو ایک معمولی سا پرزہ ہے جو ایک بڑے کارخانے میں اپنی جگہ کام کر رہا ہے۔ اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ وہ بالکل بے بس ہے۔ وہ محض شفا نہیں دے سکتا۔ کبھی کبھی شفا کا آسرا بھی نہیں دے سکتا۔

نیلم - خدا کے لئے مجھے مایوس نہ کرو۔ میں صرف اسی امید پر زندہ ہوں کہ ایک بار پھر محسن کو دیکھ سکوں گی اور اس کے قدموں میں آنکھیں بچھا کر۔۔۔۔۔۔۔

فرخ - (بات کاٹ کر) میں تمہارا محسن نہیں ہوں نیلم۔ میں نے اپنے اوپر احسان کیا ہے۔ تم میری پناہ میں نہ آئی ہوتیں تو میں انسانیت پر سے بھروسہ کھو بیٹھتا۔

پرکاش - میرے خیال میں آپ دونوں کھانا کھا لیجئے۔

فرخ - چلو نیلم۔ میرے ہاتھ کا سہارا لے لو۔ چلو میں تمہیں تمہارے کمرے تک پہونچا دوں۔

نیلم - اچھا تو آپ کی مرضی۔

فرخ - مجھے غلط نہ سمجھو نیلم۔

نیلم - تو مجھے عمر بھر اسی طرح اندھیرے میں بھٹکنا ہوگا۔ مجھے میری آنکھیں واپس نہیں ملیں گی۔ چلئے میں تیار ہوں۔ آپ کہاں ہیں۔ آیئے مجھے سہارا دیجئے۔ مجھے کمرے تک پہونچا دیجئے ڈاکٹر بابو۔

[ دونوں چلے جاتے ہیں۔ کمرے میں صرف پرکاش رہ جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد گھنٹہ بجاتا ہے ]

نوکر - آپ نے بلایا تھا۔

پرکاش - جی ہاں۔ میں نے بلایا تھا۔ بڑے میاں کیا تمہارے گھر مہمان کی خاطر کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے؟

نوکر - جی سرکار۔ ہم تو مہمانوں کی بڑی خاطر کرتے ہیں۔

پرکاش - خاطر کرتے ہو۔ ارے بھئی اتنی دیر سے بیٹھا ہوا ہوں۔ کھانے کا ذکر آتا ہے اور کوئی مجھے کھانے کو نہیں پوچھتا۔ نہ جل پان ہے نہ چائے پانی ہے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔

نوکر - ابھی نیلم بی بی نے کھانا نہیں کھایا ہے صاحب۔

پرکاش - تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مہمان بھی فاقے مرجائیں خوب۔ بڑا اچھا دستور ہے تمہارا۔

نوکر - آپ نہیں جانتے بابو صاحب۔ ڈاکٹر بابو اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے جب تک نیلم بی بی نہ کھالیں۔ ان کا جی ذرا بھی میلا نہیں ہونے دیتے۔ بے چاری غریب لڑکی تھی۔ خدا کی قسم بابو جی، جب یہاں آئی تھی تو بدن پر ثابت کپڑا تک نہ تھا چیتھڑے لگے تھے چیتھڑے۔ ڈاکٹر بابو نے بے چاری اندھی لاوارث لڑکی پر رحم کھا کر اسے رانی بنا دیا۔ اس کی ذرا تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔

پرکاش - وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔

نوکر - ہاں بابو جی۔ اور سچ بھی تو ہے۔ ان بے چاروں کا اب کون بیٹھا ہے دنیا میں۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ لے دے کے یہی لاوارث لڑکی ہے۔

پرکاش - تم نے وہ مثل سنی ہے بڑے میاں۔

نوکر - کون سی مثل سرکار

پرکاش - قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔

نوکر - سنی تو ہے۔

پرکاش - تم ہو قاضی جی کے گھر کے چوہے، سمجھے میرے دوست؟ میں بھوک بھوک چلا رہا ہوں اور تم مجھے دنیا بھر کے بکھیڑے سنا رہے ہو۔ دیکھو بھائی چاہے نیلم بی بی کھانا کھائیں یا نہ کھائیں۔ فاقہ کریں یا بھوک ہڑتال کریں۔ تم میرے کھانے کا فوراً انتظام کرو۔ میں دنیا کے سارے عذاب سہہ لوں گا، بھوکا نہیں رہ سکتا۔

فرخ - میں پہلے ہی جانتا تھا۔ اودھم مچانا شروع کر دیا نہ —
اچھا اچھا بڑے میاں تم جاؤ۔ اس کم بخت کے کھانے کا
انتظام کرو۔

نوکر - بہت اچھا حضور۔

فرخ - یار تم ایک اپج نہیں بدلے پرکاش۔ بالکل وہی ہو۔
وہی بھوک بھوک چلاتے ہو۔ اسی طرح بالکل اسی طرح۔

پرکاش - تم تو بہت بدل گئے ہو فرخ۔ میں تو ابھی تک تمہارے
معمہ پر غور کر رہا ہوں۔

فرخ کون سا معمہ ؟

پرکاش بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ راز کیا ہے۔ یہ خاتون کون ہیں؟

فرخ - یہ بے آسرا اندھی لڑکی ہے میں نے اپنے گھر میں پناہ دی۔

پرکاش - اس سے شادی کرو گے ؟

فرخ - نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اگر یہ سمجھوں گا کہ میرے لئے اس
کے دل میں ذرا سی بھی جگہ ہے تو ضرور شادی کروں گا۔

پرکاش - چلو تمہارے دل میں تو اس کے لئے جگہ ہے۔

فرخ - میرے دل کی کیا بات کرتے ہو۔ اس اندھی لڑکی کی
طرح میرا دل بھی بے سہارا ہے۔ اسے کسی کا سہارا چاہیئے

پرکاش - اس پر تو مجھے اور تعجب ہوتا ہے۔

فرخ - کیا کسی بے آسرا آدمی کا سہارا بننا اچنبھے کی بات ہے۔

پرکاش - گڑبڑ مت کرو۔ میری بات کا جواب دو۔ تم نیلم کو
عزیز رکھتے ہو۔

فرخ - بہت زیادہ۔

پرکاش - اس کی ہر خوشی کا خیال رکھتے ہو۔ اس کے دل پر کبھی
میل نہیں آنے دیتے

فرخ - ہاں۔

پرکاش - پھر بھی اس کی سب سے بڑی خوشی کو پورا کیوں نہیں کرتے

فرخ - کون سی خوشی ؟

پرکاش - وہ اپنی آنکھیں تم سے واپس مانگتی ہے۔ تم اسے بینائی
دے سکتے ہو۔ یہ مت کہو کہ تم مجبور ہو۔ مجھے معلوم ہے
کہ تم آنکھوں کا کتنا اچھا آپریشن کر چکے ہو۔ کالج میں بھی تمہارا
خاص سبجکٹ سرجری ہی تھا۔

فرخ - پرکاش !!

پرکاش - میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہیں اس کی ہر خواہش عزیز
ہے مگر اس کی سب سے بڑی تمنا کو تم پاؤں تلے روندنے
سے بھی نہیں چوکتے۔

فرخ - اس کی وجہ پوچھتے ہو۔

پرکاش - ہاں۔

فرخ - پرکاش تمہارا دوست فرخ کمینہ، ذلیل اور خود غرض
ہے۔ کیا اس کی یہی وجہ کافی نہیں ہے۔

پرکاش - تم اور خود غرض ؟

فرخ - ہاں میں خود غرض ہوں۔ میں وہ ڈوبنے والا انسان
ہوں جو تنکے کا سہارا لے کر دریا پار کرنا چاہتا ہے
میں نے نیلم کو اس لئے نہیں بچایا کہ وہ بے سہارا تھی۔
میں نے اسے اس لئے پناہ دی کہ میں بے سہارا تھا۔
اور اگر تمہاری اس بڑی چوڑی دنیا میں کوئی ایسا دل ہے
جو مجھ سے عقیدت رکھتا ہے تو وہ نیلم کا دل ہے۔ میں
بہت مفلس ہوں پرکاش۔ کیا تم چاہتے ہو
(آواز بلند ہو جاتی ہے) کہ اسے بھی آنکھیں مل جائیں
وہ بھی میرے خوفناک چہرے کو دیکھ کر تمہاری طرح
چیخ مارے اور نفرت سے منہ پھیر کر ہمیشہ کے لئے میری
زندگی سے باہر چلی جائے۔ تم چاہتے ہو میں اسے آنکھیں
دے دوں۔ اور اپنی دنیا کی ساری روشنیاں گل کر
دوں۔ میری دنیا ہمیشہ کے لئے ویران ہو جائے۔ یہاں
کوئی ستار نہ چھڑے۔ یہاں کوئی گیت نہ گائے۔
یہاں کوئی پھول نہ کھلے (چیخ کر) میں ایسا نہیں ہونے
دوں گا۔ اسے ہرگز آنکھیں نہیں ملیں گی۔

پرکاش - میرے دوست۔ میرے دکھی دوست۔

فرخ - (تھکے ہوئے انداز میں) میں بھی انسان ہوں۔ مجھے

بھی خوش ہونے کا حق حاصل ہے۔ میرے جینے میں بھی دل ہے تم چاہتے ہو کہ میں اس دل کو پاش پاش کر کے اسے جینے سے باہر پھینک دوں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا پرکاش۔

(نوکر گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ سرکار ۔ سرکار

پرکاش۔ فرخ۔ کیا ہوا ہے نصیں۔ کیا ہو گیا ہے تمیں۔

نوکر۔ ڈاکٹر بابو کو بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا۔ اب ذرا نہیں ہلتے پرکاش دیجئے۔ میں اسپتال سے کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔

پرکاش۔ کیا یہ دورہ پہلے بھی پڑا تھا۔

نوکر۔ ہاں کبھی کبھی پڑ جاتا ہے۔

پرکاش۔ بے چارا فرخ۔ بے چارا

(دوسرا منظر)

(وہی کمرہ۔ پیانو پر فرخ پریشان سا بیٹھا ہوا ہے۔ پیانو کے سُر بے ڈھنگے اور بے ترتیب انداز سے بج رہے ہیں۔ کبھی تیزی سے کبھی آہستہ۔ جیسے کوئی اپنے پریشان دماغ کو پیانو کے ان بے ترتیب سروں سے تسکین پہونچانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو)

(دروازے پر دستک)

نیلم۔ میں اندر آ سکتی ہوں؟

(کوئی جواب نہیں ملتا۔ پیانو کے سُر ایک لمحہ کے لئے بجتے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر اسی طرح فرخ پیانو کے مختلف پردوں پر انگلیاں پھیرنے لگتا ہے)

نیلم۔ ڈاکٹر بابو (رک کر) ڈاکٹر صاحب

فرخ۔ (چونک کر) کون؟ ارے تم ہو نیلم۔ آؤ اندر چلی آؤ باتیں ہاتھ پر میز رکھی ہے اس سے بچتی ہوئی۔

نیلم۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر بابو۔ یہ آپ کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں؟

فرخ۔ کچھ بھی نہیں ہوا نیلم۔

(پیانو کے سُر بھر بج اُٹھتے ہیں)

نیلم۔ آپ تو مجھ سے بات نہیں کرتے۔ اسپتال سے آ کر سیدھے کمرے میں بند ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ مجھے دوست کی طرح ستار نہیں سکھاتے۔

فرخ۔ میں نے ستار نہیں سکھایا۔ اچھا۔ ابھی ستار منگاتا ہوں۔

نیلم۔ مجھے ستار کی فکر نہیں ہے۔

فرخ۔ تو پھر۔

نیلم۔ آپ اس قدر کھوئے کھوئے کیوں ہیں۔ آپ اپنے کو اتنا دُکھ کیوں پہونچا رہے ہیں۔

فرخ۔ کچھ بھی تو نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ..... دراصل بات یہ ہے کہ ان دنوں فرصت نہیں ملتی۔

نیلم۔ کھانا کھانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔

فرخ۔ ہاں۔ تم اسپتال کا کام نہیں جانتیں۔ کبھی ڈاکٹر کو سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔

نیلم۔ اچھا۔ اب اُٹھئے۔ چل کر کھانا کھا لیجئے۔

فرخ۔ مجھے تنگ نہ کرو نیلم۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔

نیلم۔ آپ تنگ کر رہے ہیں مجھے۔ میں بے چاری آپ کو کیسے تنگ کروں گی۔ اب اس وقت کیا کام کر رہے ہیں کہ آپ کو فرصت نہیں ہے۔

فرخ۔ میں اس وقت بھی بہت کچھ کر رہا ہوں۔

نیلم۔ میں بھی تو سنوں

فرخ سوچ رہا ہوں۔ بہت کچھ سوچ رہا ہوں

نیلم۔ (قہقہہ لگا کر) آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ کو میری جان کی قسم چل کر کھانا کھائیے۔

فرخ۔ میں کہتا ہوں نیلم مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے سوچنے دو۔

نیلم۔ اب آخر آپ کیا چاہتے کیا ہیں۔ آپ چاہتے ہیں میں چلی جاؤں ایک اندھی بے آسرا لڑکی کو پھر بے رحم دنیا میں پھینک دینا چاہتے ہیں۔

فرخ - میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو۔

نیلم - اچھا تو یوں ہی سہی۔ میں ابھی چلی جاؤں گی چاہے مجھے دروازے کی ٹھوکریں ہی کیوں نہ کھانا پڑیں۔ اچھا خدا حافظ۔

فرخ - کہاں جا رہی ہے پگلی ؟

نیلم - مجھے چھوڑ دیجئے۔ مجھے جانے دیجئے۔

فرخ - نہیں نیلم۔ مجھے ابھی تجھ سے بہت باتیں کرنی ہیں۔ میری بات کا جواب دینا ہوگا۔

نیلم - آپ کو فرصت کہاں ہے مجھ سے بات کرنے کی۔

فرخ - فرض کرو نیلم میں جادوگر ہوں اور اپنے جادو سے سب کچھ پا سکتا ہوں۔

نیلم - (ہنستے ہوئے) جادوگر

فرخ - ہاں — اور جادو سے میں نیلم کو اس کی آنکھیں واپس دلا دوں۔

نیلم - پھر سچ کہا میں دوبارہ دیکھ سکوں گی ؟

فرخ - فرض کرو تم کو تمہاری آنکھیں واپس مل جائیں تو کیا کرو گی

نیلم - میں اپنے ڈاکٹر بابو کے قدموں پر۔ . . . .

فرخ - (بات کاٹ کر) نیلم ایسا مت کہو۔ کیا تم اس کے بعد بھی مجھ سے قریب رہ سکو گی۔ ہاں لو میں بہت بُرا ہوں۔ میں بہت ہی بدصورت ہوں۔ کیا تم پھر بھی مجھ سے نفرت نہیں کرو گی۔

نیلم - یہ نہیں ہو سکتا ڈاکٹر بابو۔ ایسے ہیرا دل والے سے کوئی نفرت کر سکتا ہے۔ تم بدصورت نہیں ہو سکتے۔

فرخ - کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟

نیلم - ہاں ڈاکٹر بابو اگر میری آنکھیں تمہیں بدصورت پائیں گی تو میں ان آنکھوں کو پھوڑ ڈالوں گی۔ انہیں نکال کر تمہارے قدموں پر چڑھا دوں گی

فرخ - نیلم۔ ایسا نہ کہو۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

نیلم - تم انسان نہیں ہو بابو فرشتہ ہو۔ اگر تم انسان ہوتے تو ایسے انسانوں کو سجدہ کرنا روا ہے۔

فرخ - میں نے فیصلہ کر لیا ہے نیلم۔

پرکاش - (طبلہ بجاتے ہوئے) ہیں ہیں فیصلہ تو کر لیا۔ اب یہ بھی بتاؤ کہ فیصلہ کیا ہوا ؟

فرخ - پرکاش۔ تم آ گئے۔ اچھے وقت پر آئے ہو۔

نیلم - پرکاش بابو۔ میری آنکھیں . . . . .

فرخ - (بات کاٹ کر) ہاں پرکاش نیلم کو اس کی آنکھیں ملیں گی۔ تین چار دن میں میں آپریشن کروں گا۔ نیلم اب اندھی نہیں رہے گی۔

نیلم - اب میں ڈاکٹر بابو کو دیکھ سکوں گی۔

پرکاش - مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ ارے بڑے میاں کہاں چلے گئے۔ نہ کھانے والے کا کوئی ذکر ہے نہ مٹھائی کا چرچا ہے۔

فرخ - چلو ہم سب کھانے کی کمرے کی طرف چلیں۔ آج سے ایک ماہ بعد جب ہم اس کمرے میں پھر آئیں گے تو نیلم کی آنکھیں ہوں گی۔

( تیسرا منظر )

( ایک ماہ بعد اسی کمرے میں )

[ قدرے وقفہ کے بعد خاموشی۔ پھر گھنٹہ کے پانچ بجانے کی آواز۔ بعد کو گھنٹہ کی ٹک ٹک ہونے کی آواز۔ تھوڑی دیر کے بعد سوائے ٹک ٹک کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا ]

فرخ - پرکاش۔

پرکاش - کیا بات ہے دوست ؟

فرخ - میرا جی ڈر رہا ہے پرکاش۔ آخر وہ لمحہ آ پہونچا، جس کا مجھے ڈر تھا۔ منزل قریب آ گئی۔

پرکاش - کس بات سے گھبراتے ہو۔ تم نے بہادروں کی طرح زندگی کو جھیلا ہے۔ ایسے ہمت نہ ہارو۔

فرخ - آپریشن کامیاب ہو گیا۔ اب سے ایک گھنٹہ کے بعد

نیلم کی آنکھوں کی پٹی کھول دی جائے گی۔ پھر کیا ہوگا پرکاش پھر میرا کیا ہوگا۔

پرکاش۔ اس کی آنکھوں کی پٹیاں آج کھلیں گی۔

فرخ۔ آج اور ابھی۔ اب سے ایک گھنٹے کے بعد۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے دیکھے۔ تم اسپتال جاکر اپنے سامنے اس کی آنکھوں سے پٹیاں کھلوانا۔ میں ابھی چند روز اس سے نہ ملوں گا۔

پرکاش۔ جیسے تمہاری مرضی

فرخ۔ تم اسے تسلیں دلانا۔ آسمان کا سب سے خوبصورت منظر دکھانا۔ اسپتال کے کمرے کی بائیں کھڑکی سے شفق کے خوبصورت رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دریچہ کھولنا۔ پھر ڈوبتے ہوئے سورج کا وہ دل فریب رنگ اس کی آنکھوں کے سامنے بکھر جائے گا۔

پرکاش۔ اور تم کیا کرو گے یہاں

فرخ۔ مجھے ابھی بہت کام ہے۔ مجھے ابھی اس کمرے کو سجانا ہے۔ صبح جب تم اسے لے کر یہاں آؤ گے تو یہ کمرے دلہن کی طرح سجائے جا چکے ہوں گے۔ پھر رات کو مجھے پوسٹ آپریٹو کی رپورٹ لکھنی ہے۔

پرکاش۔ کیا تمہیں اسپتال جانا ہے۔

فرخ۔ ہاں میں نیلم کے کمرے میں صرف چند گز کے فاصلے پر ہوں گا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا ہوں گا کہ نیلم کی نئی آنکھوں نے پہلی بار اس دنیا میں کیا دیکھا ہوگا۔ اس نے اس دنیا کے بارے میں کیا کچھ سوچا ہوگا۔ اب تم جاؤ پرکاش وقت ہوگیا ہے۔ خدا حافظ

پرکاش۔ اچھا میں چلتا ہوں

فرخ۔ بڑے میاں! بڑے میاں!!

نوکر۔ سرکار۔ ابھی آیا سرکار

فرخ۔ تم بہت سست کام کرتے ہو بڑے میاں۔ ابھی تک گول کمرے کے گلدان میں پھول تک نہیں لگے ہیں۔ یہ پردے نہیں بدلے گئے ہیں۔ آخر یہ نئے مخملی پردے کس دن کام آئیں گے۔ یہ قالین ابھی تک اس طرح پٹا پڑا ہے۔ چلو، جلدی کرو۔

نوکر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا سرکار

فرخ۔ ٹھیک ہو جائے گا تمہارا سر۔ ابھی اتنا بہت سا کام پڑا ہے اور وقت بہت کم ہے۔ تم جانتے نہیں ہو آج میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہے۔ آج نیلم کو اس کی آنکھیں واپس مل جائیں گی۔

نوکر۔ جی ہاں سرکار۔ خدا مبارک کرے۔ آپ کے قدموں کی برکت سے نیلم بٹیا کی بگڑی بن جائے گی۔

فرخ۔ اس کوٹھی کے ایک ایک در و دیوار کو سجا دو۔ ہر کمرے کو دلہن بنا دو۔ ہر گلدان کو پھولوں سے گلزار کر دو۔ ہر فانوس کو روشنی سے جگمگا دو۔ آج میرے سنہرے خوابوں کی تعبیر کا دن ہے۔ نیلم آئے تو دیکھے دنیا کس قدر خوبصورت ہے۔

## ( چوتھا منظر )

[ اسپتال کا کمرہ — نیلم اپنے بستر پر لیٹی ہوئی پٹیوں کے کھلنے کا انتظار کر رہی ہے ]

( گھنٹہ چھ بجاتا ہے۔ پھر ٹک ٹک کی آواز وقت کے احساس کو زیادہ نمایاں کرنے لگتی ہے )

نیلم۔ ( خوشی سے بے چین ہو کر ) چھ بج گئے۔ نرس ڈاکٹر تم سب لوگ کہاں ہو؟ کہاں ہو؟ تم سب لوگ میری آنکھوں سے پٹیاں کھولو۔ مجھے میری آنکھیں واپس دے دو۔ آؤ، جلدی آؤ۔

پرکاش۔ نیلم۔ اس قدر جلدی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم خاموشی کے ساتھ لیٹی رہو۔

نیلم۔ میں نہ جانے کب سے اس طرح خاموشی کے ساتھ لیٹی ہوں۔ اس گھڑی کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ اب

ہیں بالکل صبر نہیں کروں گی - ایک لمحہ بھی صبر نہیں کروں گی - میری آنکھوں سے پٹیاں کھولو -

پرکاش - سب لوگ آگئے ہیں - تم فکر نہ کرو - خاموشی سے ایمبولنس کے ساتھ -

نیلم - تو پھر دیر کیوں کر رہے ہیں - پٹیاں کھولئے - جلدی کیجئے -

پرکاش - ابھی تمھاری آنکھوں سے پٹیاں کھولی جائیں گی -

نیلم - خدایا تیرا شکر ہے - خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے - پٹیاں کھولنا شروع کیجئے ڈاکٹر صاحب -

پرکاش - تو تیار ہو جاؤ - پٹیاں کھولی جا رہی ہیں - (پٹیاں کھولی جاتی ہیں)

نیلم - آخر کار میں ڈاکٹر بابو کو دیکھ سکوں گی - میں انھیں دیکھوں گی -

پرکاش - آنکھیں کھولو نیلم - آہستہ آہستہ آنکھیں کھولو -

نیلم - میں دیکھ سکتی ہوں - آہ میرے خدا میں دیکھ سکتی ہوں - ڈاکٹر بابو - ڈاکٹر بابو تم کہاں ہو - میں دیکھ سکتی ہوں کوئی مجھے بتاتا کیوں نہیں ہے - کہاں ہیں ڈاکٹر بابو ؟

پرکاش - وہ یہاں نہیں ہیں نیلم - ایسی بچی نہ بنو - اب ہم گھر چلیں گے تو ڈاکٹر بابو سے ملیں گے -

نیلم - ڈاکٹر بابو نے میری آنکھیں واپس دلا دیں - اتنی بڑی خوشی بخشی ہے - انھوں نے، اور میری زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی کے وقت وہ آئے کیوں نہیں ہیں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گی - کبھی بھی معاف نہیں کروں گی -

پرکاش - نہیں نیلم وہ تم سے بھی زیادہ خوش ہیں - انھوں نے تمھارے لئے سارے گھر کو دلہن کی طرح سجا رکھا ہے -

نیلم - سچ !

پرکاش - ابھی ہم گھر چلیں گے - تم خود دیکھ لینا -

نیلم - پرکاش بابو - دنیا واقعی خوبصورت ہے - وہ سامنے ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی - یہ رنگینی - یہ سجاوٹ کیسی کیسی پیاری ہے یہ دنیا - میں نے تو اس کی رنگا رنگی بالکل ہی کھو دی تھی - مجھے ڈاکٹر بابو کے پاس لے چلو - میں اپنے دیوتا کے قدموں پر گر کر ان کا شکریہ ادا کروں گی -

پرکاش - ہاں ہم جلدی ہی چلیں گے -

## ( پانچواں منظر )

[ ڈاکٹر کے گھر کا ڈرائنگ روم ]

نیلم - اوہ - کتنا سجایا ہے یہ گھر - یہاں کی ہر چیز سجی ہوئی ہے -

نوکر - جی - جی مبارک ہو - آنکھیں مبارک ہوں -

نیلم - ہاں بابا - ڈاکٹر بابو کی مہربانی سے مجھے سچ مچ آنکھیں مل گئیں - میں اب وہ دیکھ سکتی ہوں - یہ گلاب کے گچھے اوہ - میں تو ان کی خوشبو ہی سونگھے جاتی تھی انھیں کبھی دیکھ نہ سکی - محل کے خوبصورت پردے - یہ گلدان یہ فانوس - آج میری زندگی کا سب سے پیارا دن ہے - ڈاکٹر بابو — ڈاکٹر بابو - تم سچ مچ فرشتہ ہو - کہاں ہیں ڈاکٹر بابو ؟

پرکاش - ہاں بڑے میاں، فرخ کہاں ہیں ؟

(نوکر خاموش رہتا ہے)

نیلم - بولتے کیوں نہیں - چپ کیوں ہو ؟

نوکر - کچھ بھی تو نہیں -

نیلم - خدا را کچھ تو کہو - میرے ڈاکٹر بابو کو کیا ہوا

پرکاش - کہاں ہے فرخ ؟

نوکر - یہ خط دے گئے ہیں

پرکاش - خط - کیا خط ہے یہ - لاؤ دیکھوں (پڑھتا ہے)

مائی ڈیر پرکاش

آج نیلم کو آنکھیں مل گئی ہوں گی۔ اسے میری مبارک باد پہونچا دینا۔ میں جا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ نیلم کے دل میں جو میرا تصور ہے اسے مجروح کروں اور وہ اکیلا دل جسے میں اپنی محبت سے معمور رکھنا چاہتا تھا۔ مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ تم بھی یہ راز اس پر ظاہر نہ کرنا کہ اس کا محسن ایسا بدصورت اور خود غرض انسان ہے جس سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ میں نے خلوص سے جو تاج محل بنایا ہے اسے اس طرح نیست و نابود نہ کر دینا۔ میں ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ زندگی بہت سفاک ہے اور انسان سب کچھ نہیں پا سکتا۔ اب میں نے اپنی مجبوریوں سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ خدا حافظ

تمہارا
فرخ

نیلم۔ ڈاکٹر بابو! ڈاکٹر بابو!!

---

راجیندر بہادر موج

# غزل

ممکن نہیں جو پانا شاہی وسروری میں
اک کیف مستقل ہے وہ تیری بندگی میں

وہ جس کو ڈھونڈتی ہے حدِ خودی میں دنیا
میں اس کو پا چکا ہوں لمحاتِ بیخودی میں

فکرِ حصولِ جنت، افکارِ دین و دنیا
کیا کیا کرے اک انساں تھوڑی سی زندگی میں

کانٹوں کے ساتھ اُلجھے طوفاں کے ساتھ کھیلے
ایسے بھی دَور آئے پھولوں کی زندگی میں

دنیا ابھی نہیں ہے انسانیت سے خالی
ہمدرد دلربا ہے اب بھی لیکن کسی کسی میں

ان کی طلب نے اب تو یہ حال کر دیا ہے
اپنی ہنسی خوشی ہے ان کی ہنسی خوشی میں

صرف اتنی ہے حقیقت ہنگامۂ جہاں کی
جس خاک سے اُٹھے ہیں مل جائیں گے اُسی میں

پنہاں تھے اس کے جلوے ہر ایک شے میں لیکن
اُلجھی رہیں نگاہیں دنیا کی دل کشی میں

تو اس کو ڈھونڈتا ہے دیر و حرم میں ناداں
جو مسکرا رہا ہے ہر پھول ہر کلی میں

دنیائے آرزو کا اے موج یہ تلاطم
ایسا نہ ہو کہ گم ہو کشتیٔ دل اسی میں

سردار ی لال نشتر

# ریڈیم

ریڈیم ایک قسم کی دھات ہے جس کا رنگ چاندی کے مانند سفید چمک دار ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ اپنے جسم سے خاص قسم کی شعاعیں خارج کرتی ہے۔ اس لئے اس کا نام ریڈیم بمعنی "مشع یا لامع رکھا گیا ہے۔ چناں چہ یہ نام اسم بامسمّٰی ہے۔

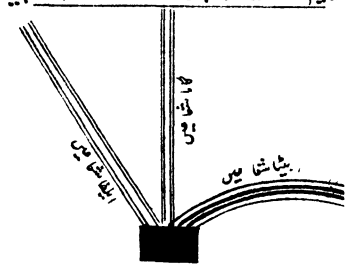
ریڈیم جس معدنی چیز سے نکالا جاتا ہے اُسے معدنی یورنیم آکسائیڈ (Native Uranium Oxide) یا پچ بلینڈ (Pitch-Blende) کہتے ہیں۔ جو ایک قسم کے نہایت بیش قیمت سیاہ کون تار' کا کیمیاوی مرکب ہے۔ اس معدنی 'پچ بلینڈ' کے سینکڑوں ٹن وزن سے سخت و شدید محنت اور نہایت پیچیدہ کیمیاوی عمل کے بعد صرف چند ملی گرام ریڈیم نکلتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ دھات دنیا کی تمام دھاتوں سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ یہ با حیات اور زندہ دھاتوں سے اس قدر کم یاب ہے کہ زمین سے اب تک کل ۴ ۳۔ اونس بہ مشکل حاصل کی گئی ہے۔ جو ایک کرکٹ کی گیند کو بھر دینے کے لئے بہ مشکل کافی ہے۔ اس لئے دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز کارومان ڈیپی سے خالی نہ ہوگا۔

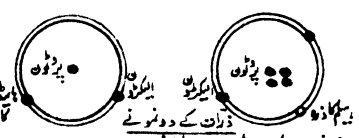
ریڈیم کی دریافت کا سہرا ایک پولستانی خاتون میڈم کیوری کے سر ہے جس نے آسٹریا میں اس دھات کے نمکوں کو 'پچ بلینڈ' سے ۱۸۹۸ء میں سب سے پہلے حاصل کیا۔ بعد ازاں ۱۹۱۱ء میں ان نمکوں سے ریڈیم نکالا گیا۔ ریڈیم کا عمل یہ ہے کہ خود بخود اس مسلسل طریقہ پر تین اقسام کی حرارت شعاعوں کی صورت میں خارج کرتا رہتا ہے۔ یہ شعاعیں اہل سائنس کی اصطلاح میں ایلفا شعاعیں (Alpha Rays) بیٹا شعاعیں (Beta Rays) اور گاما شعاعیں (Gama Rays) کہی جاتی ہیں۔ حقیقت میں ایلفا اور بیٹا مثبت اور منفی برقی ذرات ہیں جو ریڈیم سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ ایلفا شعاع سے جو ذرات نکلتے ہیں ان میں چار پروٹون اور دو الیکٹرون ہوتے ہیں اور ان دونوں قسم کے برقی ذرات کی سرعت رفتار سینکڑوں میل فی سیکنڈ ہے۔ گاما شعاعیں بھی صرف چھوٹی لہروں والی ایکس ریز شعاعیں ہیں۔

مندرجہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوگا کہ ریڈیم کی تینوں قسم کی شعاعیں برقی طاقت میں کس طرح مبدّل اور منفعتم ہو جاتی ہیں۔ چونکہ ایلفا اور بیٹا شعاعیں ایک دوسرے کے برعکس یعنی مثبت و منفی برقی طاقت رکھتی ہیں اس لئے مخالف سمتوں

ہیں خارج ہوتی ہیں - ان میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی -

## ریڈیم کی شعاعیں جو برقی طاقت سے خارج ہوتی ہیں




الفا شعاعیں کہربائی ہمدروں کا مجموعہ ہیں - یہ بیس ہزار میل فی لمحہ حرکت کرتی ہیں - ان کی طاقتِ نفوذ بہت ہی کم ہے - یعنی یہ معمولی کاغذ کی موٹائی میں سے بھی بآسانی نہیں گزر سکتیں - بیٹا شعاعیں انسانی بدن میں نصف انچ تک اتر جاتی ہیں اور سیسے اور پلاٹینم کی چادر میں ۱/۴ انچ نفوذ کر جاتی ہیں - ان کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے جو تقریباً معمولی روشنی کی شعاعوں کی رفتار کے برابر ہے - ان کی طاقتِ نفوذ الفا شعاعوں سے تقریباً سوگنا زیادہ ہے - یعنی یہ کسی دھات کی پتلی سطح کو بہ آسانی عبور کر سکتی ہیں - جسم پر ان کا اثر بہت مہلک ہوتا ہے - یعنی جو حصۂ جسم ان کے زیرِ اثر ہو وہ گل سڑ کر مردہ ہو جاتا ہے - گاما شعاعیں ایکس ریز اور اور بالائے بنفشی شعاعیں (Ultraviolet Rays) کے مشابہ ہیں - ان کی رفتار روشنی کی شعاعوں کی رفتار کے برابر ہے لیکن ان کی لہر کی لمبائی (Wave-Length) ایکس ریز کی لہر کی لمبائی سے بہت کم ہے - یہ شعاعیں شیشے کی ایک فٹ موٹی چادر کو پار کر جاتی ہیں -

سائنس اور طب کی دنیا اب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو چکی ہے کہ ریڈیم سے اس قدر تیز زبردست اور زود اثر ریڈیو برقی (Radio-Electric) شعاعیں خارج ہوتی ہیں جو انتہا درجہ کی مہلک بھی ہیں اور مفید و کارآمد بھی - انسان میں براہِ راست ان شعاعوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے اس لئے 'ریڈیم' اسے ہلاک کر دیتا ہے - لیکن اگر یہی شعاعیں 'پردہ' کے اندر سے استعمال کی جاتی ہیں تو بعض خطرناک امراض خصوصاً سرطان کے امراض میں مفید ثابت ہوتی ہیں -

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آفتاب کے تورو حرارت کا سرچشمہ ریڈیم ہی ہے - آفتاب میں 'ہیلیم' کا وجود پہلے ہی سے معلوم کر لیا گیا تھا - یقین کیا جاتا ہے کہ آفتاب کے گرد ہنزار میل کا جو 'آتشیں ہالہ' ہے جس سے کہ روشنی کے طوفان ابلتے رہتے ہیں وہ حقیقت میں 'ہیلیم' کی شعاعوں کا ہی عکس ہے - یہ بھی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ایک گرام ریڈیم سال بھر میں ۱۶۰۰۰۰۰ وزن حرارت پیدا کرتا ہے - یہ حرارت تقریباً پندرہ من برف کو کھولا سکتی ہے - اس سے خود ریڈیم میں ۲۵۰۰ کی کمی ہو جاتی ہے - ریڈیم تقریباً پانچ ہزار برس میں اپنی حرارت اور روشنی کھو کر سیسہ بن جاتا ہے - آفتاب کا وزن تقریباً دو ہزار ہا سکسٹلین ٹن یعنی زمین سے تقریباً ۳ لاکھ ۳۳ ہزار گنا وزنی ہے - اب اندازہ کیجئے کہ اتنے عظیم الشان کرہ کو ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں برس سے منور رکھنے کے لئے ریڈیم کے کتنے بڑے خزانے کی ضرورت ہوگی -

یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ سورج کی روشنی اور حرارت احتراق کا نتیجہ نہیں ہے - یعنی آفتاب میں چمک دمک کسی جھڑکے والے مواد سے نہیں ہے - ریڈیم کی حرارت بھی احتراق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کی مخفی طاقت کا نتیجہ

ہے۔ سورج کی شعاعیں جو ۹ کروڑ ۳ لاکھ میل کا فاصلہ طے کرکے زمین تک پہنچتی ہیں۔ وہ ریڈیم کی گاما شعاعوں سے بہت مشابہ ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ شعاع گاما ہی ہو جسے سورج کی کرن لکھتے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اگر حسبہ ریڈیم سے ہزاروں برس تک بے شمار حرارت وقوت لی جاسکتی ہے۔ مگر اس سے خود اس کے جوہر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہزاروں برس کے بعد البتہ وہ سیسے کے قالب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ریڈیم تنزل کرکے پولونیم بن جاتا ہے اور پھر سیسے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ریڈیم کی پیدائش، بچپن، جوانی، انحطاط، بڑھاپا اور موت کے لئے بھی چھ ارب سال کی مدت درکار ہے۔

جہاں ریڈیم کئی مہلک امراض کے خلاف جنگ کرنے میں انسان کا سب سے بڑا دوست ہے وہاں وہ دوسری طرف یہ سب سے زیادہ خطرناک اور ہلاکت آفریں دشمن بھی ہے۔ اگر اس کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ انسانی جسمانی نظام ناک یا حلق میں چلا جائے یا کسی اور ذریعے سے داخل ہو جائے تو دنیا کا کوئی ڈاکٹر یا سرجن اسے نکال نہیں سکتا۔ وہ ذرہ اپنی جلتی ہوئی تیز اور تند ریڈیو بریتی شعاعیں خارج کرتا رہے گا یہاں تک کہ انسان اس کے اثر سے مرجائے گا اور اگر یہ ذرہ اپنی جسامت میں ایک اونس کا بیس کروڑواں حصہ یا اس سے زیادہ ہوگا تو وہ فوراً ہلاک کرے گا

چونکہ ریڈیم کی شعاعیں اپنے اثر میں بے حد دور رس اور مہلک ہوتی ہیں اس لئے جو ڈاکٹر ریڈیم کے ذریعے علاج کرتے ہیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کو لمبے لمبے چمٹوں کے ذریعے پکڑتے یا چھوتے ہیں۔ وہ جست کا دستانہ اور پورا لباس پہنے رہتے ہیں اور خود بھی ریڈیم کے سامنے نہیں جاتے بلکہ جست کے ایک موٹے پردے کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تاکہ ان کے جسم کے کسی حصہ تک ریڈیم کی شعاعیں نہ پہنچ سکیں۔

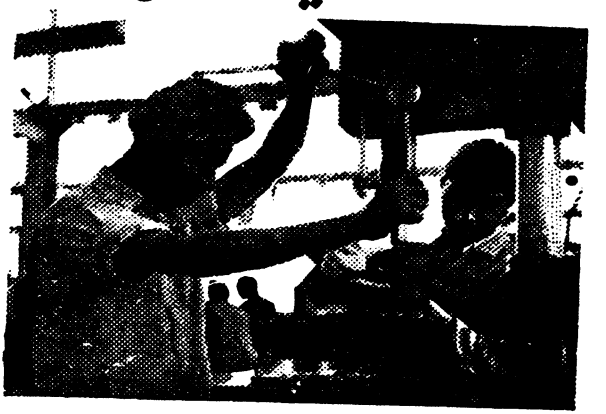
ریڈیم کی گاما شعاعوں کی اہم خاصیت یہ ہے کہ یہ جسم کے مہلک پھوڑوں (Malignant Tumours) مثلاً سرطان یا کینسر وغیرہ کو جلا کر خشک کر دیتی ہیں اور تندرست حصۂ جسم پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جتنی ان شعاعوں کی لہر کی لمبائی کم ہوگی اتنی ہی یہ زیادہ مؤثر ہوں گی۔ کیوں کہ کم لمبی لہر والی شعاعیں طاقتِ نفوذ زیادہ رکھنے کے باعث موٹی دیوار کو آسانی سے عبور کر لیتی ہیں اور سرطان وغیرہ کو بہت جلد خشک کر دیتی ہیں۔ دنیا کے وہ شفاخانے یا دوسرے ادارے جو ریڈیم کے چند ذرات کے مالک ہیں ان کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ لندن کے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں صرف چار گرام ریڈیم ہے (جس کی قیمت فی گرام ۳۵ ہزار پونڈ ہے) جو سرطان کے علاج کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ہر ہفتہ ان چار گرام ریڈیم کو رد و بدل کر دیا جاتا ہے۔ صرف ایک گرام ایک ہفتہ تک استعمال میں رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے ایک خاص برتن میں ڈال کر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ دوبارہ استعمال کے وقت تک اپنی پوری طاقت اور اثر کو حاصل کرلے۔

سائنسی دانوں نے تجربات سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ ۸۰۰ برس کی مدت میں ریڈیم کی شعاعیں اپنی نصف طاقت کھو دیتی ہیں اس لئے جن اسپتالوں کے پاس یہ بیش قیمت دھات موجود ہے ان کو نئے ریڈیم کے لئے پریشان اور فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ریڈیم کیسی ہوش ربا اور طلسمی دھات ہے۔ یہی وہ سنگِ پارس ہے جو کم سے کم ۴۷۰۰ برس تک مسلسل حرارت اور طاقت بخش سکتا ہے۔ یہی وہ سرچشمۂ حسن و ضیا ہے جس سے چاند، ستارے اور سورج تابندہ و درخشاں ہیں۔ یہی وہ طاقت و توانائی کا لازوال خزانہ ہے جس سے جمادات، نباتات اور معدنیات میں حرکت و حرارت پائی جاتی ہے اور یہی وہ اکسیر حیات ہے جس کی مدد سے سرطان، نقرس، اعصابی درد، جراحت حرارت خون اور ہیضہ کا کامیاب علاج کیا جاسکتا ہے۔

پلان سے کیا ہوگا

# روزگار کے زیادہ مواقع



تیسرے پنج سالہ پلان سے

- بھرپور کھیتی اور زمین کو ترقی دینے کی بدولت ۳۵ لاکھ افراد کو زراعتی حلقے میں روزگار ملے گا اور
- ۱۰۵ لاکھ افراد کو صنعت، ٹرانسپورٹ، تجارت، سرکاری اور سماجی خدمات سے متعلق شعبوں میں روزگار حاصل ہوگا

اس کے معنی یہ ہوئے کہ
آپ کو روزگار کے نئے اور بہتر مواقع
حاصل ہوں گے

پلان کو کامیاب بنایئے۔ اس کا نتیجہ ہوگا

**ہر شخص کے لئے اچھی زندگی**

تیسرا پنج سالہ پلان

DAV. 1181

# ہندوستانی ڈراما

(از :- ڈاکٹر صفدر آہ)

ڈاکٹر صفدر آہ دنیائے ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ گراں مایہ تصنیف ڈراما کے میدان میں ان کے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ فاضل مصنف نے اس تصنیف کو نصابی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈرامے کی تاریخ اور مغربی و ہندوستانی فنِ ڈراما سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں مصنف نے اداکاری سے بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں ڈراما اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر ہے۔

صفحات :- ۳۴۷ — قیمت :- تین روپے ۷۵ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

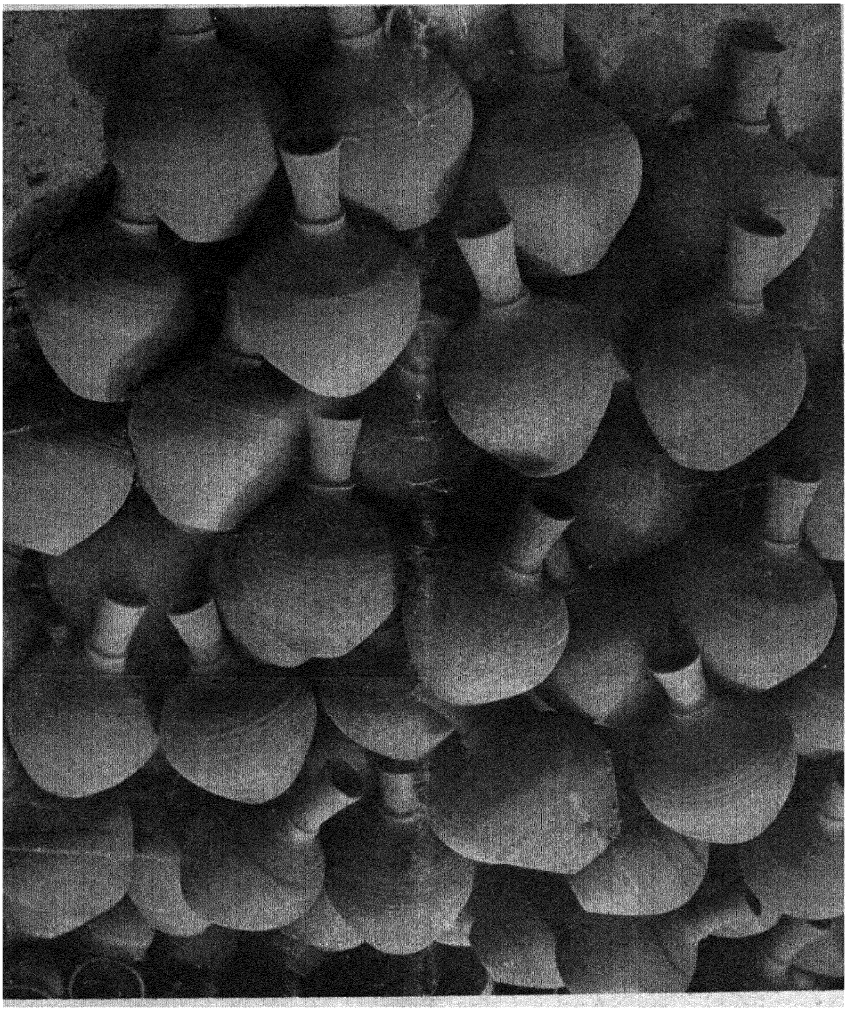
# باہر کے مُلکوں میں آج کل کی ایجنسیاں .

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹ - اسٹریٹ نمبر ۳۴ - پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲ - رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵ - بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا - ۳۱ گرینج روڈ، سنگاپور

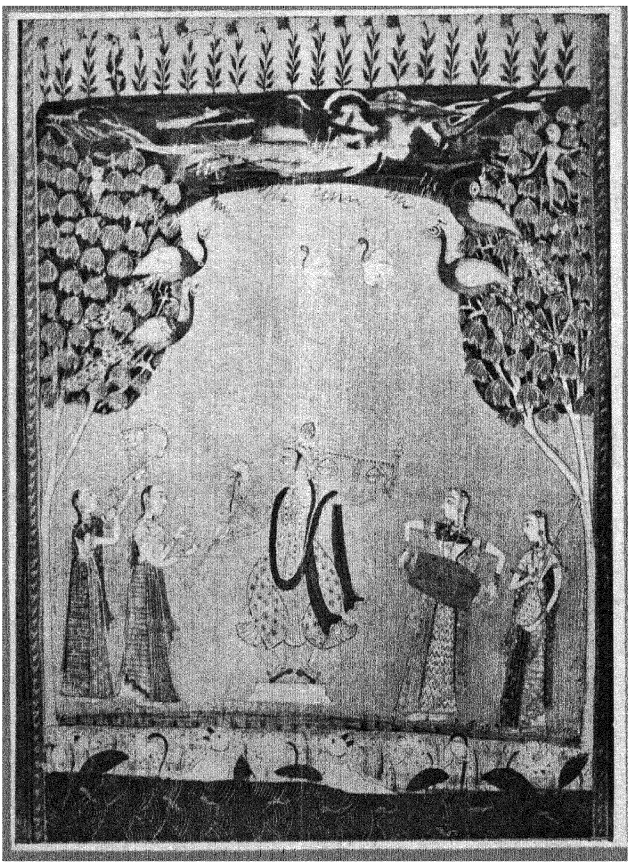
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی



Edited and Published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
and Printed by the Delhi Printing Works, Delhi.

**Regd. No. D-509**

# آج کل



اشاڑھ شک سمت ۱۸۸۵
جولائی ۱۹۶۳ء

۶۰ پیسے

# ہماری اُردو کتابیں



| نام کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ہندوستانی ڈراما | صفدر آہ | ۳ روپے ۷۵ نئے پیسے |
| جوالامکھی (ناول) | اننت گوپال شیوڑے | ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت | ٹیبر منڈی | ۲ روپے |
| ابوالکلام آزاد | —— | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ڈاکٹر سی۔ وی رمن | ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے |
| ہندوستان کا دستور | —— | ایک روپیہ |
| بھارت کی لوک کہانیاں | —— | ایک روپیہ |
| دیس دیس کی لوک کہانیاں | —— | ۷۵ نئے پیسے |
| کلکی یا تہذیب کا مستقبل | ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن | ۷۵ نئے پیسے |
| بھارت۔ آج اور کل | جواہر لال نہرو | ۷۵ نئے پیسے |
| اپنے گھر کو آگ سے بچائیں | —— | ۷۵ نئے پیسے |
| کیلنڈر کی اصلاح | —— | ۴۰ نئے پیسے |
| ناپ تول کا میٹری نظام | —— | ۳۵ نئے پیسے |
| جواہر لال نہرو کی تقریریں نمبر ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷ | —— | فی نمبر ۱۰ نئے پیسے |

—— پیکنگ اور ڈاک خرچ کے لئے کم سے کم نئے پیسے یا قیمت کا ۱۲½ فیصدی مزید بھیجئے۔ ——
رجسٹری کے لئے ۵۰ نئے پیسے اس کے علاوہ ہوں گے۔ ۲۵ روپے یا اس سے زائد کی کتابیں منگوانے پر محصول ڈاک معاف

—— کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کیجئے ——

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن ۱۰ اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

# آج کل دہلی

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| نقش و نگار | سکندر علی وجد | ۳ |
| دیوانِ نوادر | قاضی عبدالودود | ۴ |
| غزل | تمنا بجنوری | ۸ |
| تذکرۂ نکات الشعراء | حنیف نقوی | ۹ |
| غزل | دانش ریزوانی | ۱۷ |
| بہاروں کو سلام | اختر بانڈوی | ۱۸ |
| ہمارے نئے صدر | آر۔ آر دواکر | ۱۹ |
| ڈاکٹر ذاکر حسین | گوپی ناتھ امن | ۲۷ |
| مغلوں کا سامان آرایش | محبوب اللہ مجیب | ۳۳ |
| فدّادی | زکی انور | ۳۷ |
| غزل | حرمت الاکرام | ۴۲ |
| ہیروں کا شہر | غلام ربانی | ۴۳ |
| ڈال ڈال کے پات | — | ۴۷ |


سرورق :- میگھ ملہار

رسالے کی پشت پر :- برسات


مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد مجیب | جامعہ ملیہ، دہلی |
| محی الدین قادری زور | سری نگر |
| گوپی ناتھ امن | دہلی |
| خواجہ احمد فاروقی | دہلی |
| عبدالقادر سروری | حیدرآباد |

یو۔ ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

جی۔ این۔ ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)

جی تنجانا تھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال کندرشن ایڈیٹر شعبہ اردو (نیکرڈی)

مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ مظفر شاہ



اشاعت شمارہ سنہ ۱۸۸۴

جولائی ۱۹۶۲ء

جلد ۲۰۔ نمبر ۱۲

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- اشلنگ یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- اشلنگ یا ۱۰ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز۔ ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال کندرشن طیانی ایڈیٹر، آج کل، اردو ادارہ سیکرٹریٹ دہلی ۶

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

# ملاحظات

جمہوریۂ ہند کی صدارت کے لئے ڈاکٹر رادھا کرشنن اور نائب صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتخاب پر ملک بھر میں اظہار مسرت کیا گیا اور ہر طبقہ و خیال کے لوگوں نے اطمینان ظاہر کیا۔ جو ان دونوں فاضلوں کی ہر دل عزیزی کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں۔ ایک ممتاز فلسفی کی حیثیت سے وہ بین اقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ہندوستانی فلسفہ کی توضیح ان کا زبردست کارنامہ ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے مشرق و مغرب کی بنیادی قدروں کو اُجاگر کرکے ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی۔ وہ ہندوستان کے سفیر کی حیثیت سے بھی بہت کامیاب رہے اور نائب صدر کی حیثیت سے بھی۔ اُنھوں نے ہندوستان کی وکالت بڑی کامیابی کے ساتھ کی اور وسیع النظری اور رواداری کی تلقین کرتے رہے۔ ان کا علم و فضل، رواداری وسیع النظری اور انسان دوستی ملک کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین علم و ادب کے میدان میں جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ایک ممتاز ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیمی مسائل کو سلجھانے میں گزرا۔ وہ قومی تحریک سے شروع سے وابستہ رہے اور ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ مہاتما گاندھی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے گجرات ودیا پیٹھ کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شامل ہوئے اور اس کے بعد متواتر بیس سال تک اس قومی یونیورسٹی کے روح رواں رہے۔ گاندھی جی کی تحریک پر آپ نے بنیادی تعلیم کا اسکیم مرتب کی۔ آزادی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور یونیورسٹی کے نازک دور میں اس کی زمام کار آپ نے سنبھالی۔ پھر پانچ سال تک بہار کے گورنر رہے اور وہاں بھی ہر دل عزیز رہے۔

آج ملک ترقی و ترقی کے دور سے گزر رہا ہے اور اقتصادی و معاشی ترقی کے ساتھ ملک میں اچھی اور زیادہ سے زیادہ تعلیم کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ان دونوں بزرگوں کا تعلق تعلیمی سرگرمیوں سے رہا ہے۔ یقینی ہے کہ ان کے زیر سرکردگی تعلیم کی ہمہ گیر ترقی ہوگی۔

آزادی کے بعد سے تعلیم کے میدان میں ملک نے کافی ترقی کی ہے اور مختلف قسم کی دشواریوں کے باوجود ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اطمینان بخش ہے لیکن ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ اسی خیال سے تیسرے پنجسالہ پلان میں تعلیم کی ترویج و ترقی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مرکزی وزیر تعلیم کا یہ اعلان خوش آیند ہے کہ تیسرے منصوبے میں ۶ سال سے ۱۱ سال تک کی عمر کے ۸۵-۸۰ فی صدی بچوں کے لئے لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے گا اور ۱۹۷۶ء تک ۱۴ سال تک کی عمر کے سب بچوں کے لئے تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔

اگرچہ ہندوستانی کوہ پیماؤں کی دوسری مہم موسم کی خرابی کے باعث ایورسٹ سر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی ۲۸ ہزار فیٹ کی بلندی پر موسم کی انتہائی شدت کے باوجود تین رکنی ٹیم نے ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے جو بے نظیر ہے اور اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان لوگوں نے انتہائی ہمت، جرأت، بہادری اور ضبط و نظم کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ مہم جاری ہے گی اور امید ہے کہ یہ ناکامی ان کے لئے پیمانہ کا کام دے گی۔

سکندر علی وجد

# نقش و نگار

چند لکیروں نے ریگِ ساحل پر
حیرت افزا مراسلے لکھے

کیسی اچھی کشیدہ کاری کی
کیا انوکھے خیال پیش کیے

جوش میں کرکے خامہ فرسائی
حل طلب مسئلے بکھیر دیے

خوش نما ہے زمین کا دامن
فکر انگیز بیل بوٹوں سے

دل نشیں شاہکارِ حسنِ عمل
دیکھیے لاکھ بار جی نہ بھرے

شکل کوئی یہاں نہیں بے جا
کچھ تو معنی ہیں ان لکیروں کے

فرصتِ یک نظر، یہ خطِ غبار
قلبِ دریا کے راز کون پڑھے

موج آئی، طلسم ٹوٹ گیا
سارے نقش و نگار ڈوب گئے

حسنِ فطرت یہ چاہتا ہے کوئی
دیر تک اس کی تاک میں نہ رہے

قاضی عبدالودود

# دیوانِ نوازش

نوازش حسین عرف میرزا خانی تخلص یہ نوازش کا ترجمہ مصحفی کے تذکرۂ ہندی (سال اتمام ۱۲۰۹ھ) یا اس سے قبل کے کسی تذکرے میں نہیں ہے۔ مصحفی کے دریائی الفصحا میں جس کا آغاز ۱۲۲۱ھ میں ہوا تھا، ان کا ترجمہ موجود ہے: "والد حسین علی خاں ابن نواب ناصر خاں صوبہ دار کابل و پشاور۔ خود اکبر آباد متولد شد، و در لکھنؤ نشو و نما یافتہ از سن پنجرہ سالگی شوق موزونی شعر... و در مدتی کم تتبع و خواندن سخن شیخ میر سوز است، و خود را شاگرد ایشاں می گوید۔ دیوان اول بطور ایشاں گفتہ و علاوہ یک دیوان دیگر ہم جمع نمودہ" تذکرۂ تاجر میں نوازش کے بارے میں مرقوم ہے: "شاگرد بلکہ قائم مقام میر سوز"... خود فرماتے تھے کہ میں نے ایک دن سوز سے پوچھا کہ میں کیسا کہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ مبالغہ کے شعر جیسے تم کہتے ہو ویسا نہیں کہہ سکتا۔ ایک دن مؤلف سے کہنے لگے کہ ایک مدت کا کہا ذرا تم یاد کر رکھو اور میں نے کہا کہ جو اپنی موزونی کا کہا یاد سے بازار کے گا... تو مایا یہ قول ہے کہ سوزان در حق تو نیز خواہد گفت۔ چند روز سے ترک شعر کرنے و بہ ریاضت ایام لے کا پیش نظر لعیت رکھتے ہیں۔ کہا ہے کہ لکھنؤ میں ہی آ بسا تھا۔"

میرا خیال ہے کہ نوازش ۱۱۹۲ھ کے قریب متولد ہوئے ہوں گے دیوان مزید شاگرد تاج و نسخہ کتب خانہ خدا بخش پٹنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نوازش کا سال وفات ۱۲۷۱ھ ہے۔ ان کا دیوانی بہت کمیاب ہے۔ اس نسخے سے پہلے کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں ہے، اور جس کا تعارف اس مقالے میں کرایا جا رہا ہے، کسی دوسرے نسخے کے وجود کا مجھے علم نہیں۔ مؤلف نور اللغات نے نوازش کے اشعار جو تذکروں سے ماخوذ نہیں جا بجا سند میں پیش کئے ہیں، ان کے پیش نظر دیوان کا کوئی نسخہ رہا ہو تو عجب نہیں۔ نسخۂ خدا بخش ۲۸۷ اوراق کا ہے۔ ان میں سے ورق اول کے صفحہ ۱ میں دیباچہ نثر ہے اور ورق آخر کا صفحہ ۲ سادہ ہے۔ سطر ۱۳ سطر کا ہے، لیکن بہت کم صفحے ایسے ہوں گے جن میں ۱۳ اشعار ہیں۔ اشعار کی مجموعی تعداد کم و بیش ۶۵۰۰ ہوگی۔ دیباچہ فارسی میں ہے اور نوازش کے رشحات قلم سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی کتابت بھی خود نوازش نے کی ہے۔ دیباچہ اس پر مشتمل ہے کہ نوازش نے یہ دیوان امیر حسن خاں کی فرمائش سے انتخاب کر دیا۔ دیباچے کے آخر میں ۷ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ مرقوم ہے۔ ۴ کے بعد کے ہندسے ضائع ہو گئے ہیں۔

دیوان نوازش میں سوز کے خاص رنگ کے علاوہ درد و میر کا اشعار بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ طرز تاج کے اشعار اگرچہ تو بہت کم ہیں ان کے دیوان میں بہت سے ایسے الفاظ اور طرز استعمال ملتے ہیں، جو تاج اور ان کے تلامذہ کے یہاں نہیں ملتے۔ ایک عجیب اور بے سوز میں بھی ہے یہ ہے کہ غزل میں ایسے لفظ کھپا تا چاہتے ہیں جو غزل کے مزاج کے خلاف ہیں۔ مقالۂ ہذا سے کسی حد تک اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ کیسے کیسے لفظ اور طرز استعمال دیوان میں پائے

جاتے ہیں۔

غزلوں کا آغاز ورق اب سے ہوتا ہے اور ورق ۲۱۰ پر ست دوسرے اصنافِ سخن کی ابتدا ہوتی ہے۔ پہلے پہلی غزل کے بیت اول اور اس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

بیت ہر دوئے ضم گھر ہے دل نادان کا
اپنا کیا دل جو پیپ مطلع ہے سر دیوان کا

شیر سے بھرتے ہیں فرے اس کے کچھ مردانہ دا[1]

یوں تو ہر نامرد ہے قائل سر شہ مردان کا

گو نہ یاد ہیں بالاضافت سات اہل طلان فن
ہے کھلا عامی مقید کب ہے اس اعلان کا

شاعری کا کر رہے ہیں دعویٰ اکثر بے تمیز
جس طرح کہنا نہیں، ہے معتبر ہذیان کا

گھر ہی بیٹھے اپنے کر لیں لوگ رو بہ بازیاں
شیر قالیں ہیں بہت کم شیر ہے میدان کا

جز نہیں ہے کل اسلام اپنا حب پیغمبر
اے نوازش یہ طریقہ ہے مرے ایمان کا

شکر شاہ اودھ کی مجھ کو کرنی تھی نہ سیر
کب سے میں بھولا ہوا تھا پھر وطن یاد آگیا

سقف گردوں کے تلے بیٹھے کیا بارش میں
پھٹ پڑتی ہے جدا لگتی ہے یوں چھپر جدا

پیچ اگر کھیئے نوازش تو کہیں یاروں سے
میرے اشعار جدا ہیں مری گفتار جدا

سب کو خورشید قیامت کا نوازش تھا گماں
کل جو وہ بام شوالے پہ نمودار ہوا

ایک کو دوسرے کی تھی نہ خبر دیکھے اُسے
مجمع میلہ[2] جو تھا محشر کا بازار ہوا

یاں بھی اک بت سے پڑھایا دل نے تیرے خدا
لکھنؤ سے تھا ہوا حکم اس پہ گدگا پار کا

[1] کذا [2] چھپا یا ؟

بدر کامل اب ایلچ ایام کا ٹانگھن[1] دیکھا
اس پہ جمتے نہ کسی کا کبھی آسن دیکھا

بڑے تم ہو بلے کیا ہے موقع فن چرانے کا
عالم اس شوخ کے کوچے میں یہ ہے گھن[2] پس کا

چھوڑ کر بوسۂ رخ صنف سے چوسے جو قدم
میر صاحب نے دیا علم مجھے انگلس کا

دل کے قرضے کی تو تاش میں ابھی تجھ پہ کروں
خوف ہو سادسش عالم سے نہ گر شمس کا

اس جواں کی مجھے الفت کا ہے تو مانع شیخ
مانتا پر کوئی کہنا ہوں میں اس پاجس[3] کا

قصد ٹھہرا کے کیا اس نے ترے واپس کا
کچھ خیال اب نہیں ہم کو نزی اس خرقش[4] کا

لکھنؤ ہے وہ جسے کہتے ہیں زر ریز مکان
ہر گلی کو میں برستے یو نحیس کیچن دیکھا

کی تھی عشق کو ان ہلکے پھلکے لوگوں کی آگ
بدن پہ سوز دروں سے ہے ہر جگہ پھپھلکا[5]

یار بھی کونڈا ہے اپنی پارسائی کا
میں بالپن سے زلف سیہ کا ہوں بالکا

کھلا نہ رخ پہ ترے کچھ یہ گول گال رہا
چاشنی خورکی کے نہیں دستر خوان کا

جھلملا نور مشعب میں جو ہو پیروں کا
یاد ہے گردن میں اس کی ڈالنا وہ بانہ کا

ہر اک ہے یوں تو نوازش تو لد استاد
پہ وضع سوز میں کچھ تو ہی انتخاب ہوا

[1] کذا
[2] یہ اور اس کے بعد کے دو شعر ایک ہی غزل کے ہیں
[3] حرف قبل سین مفتوح
[4] ف مکسور
[5] تو فی قل بلبل وغیرہ / بار دلیف

گھر میں ترے کودا کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا
جو ہم سے ہوا فعل[1] وہ رستم سے نہ ہوگا

رکھ کے گھر میں مجھے دل لوگے یہ کب تھا معلوم
ملک انگریز میں تھا طور ستا ملکس کا

اس ستمگر کو ہم نے یار کیا آپ سے جبر اختیار کیا

سن نوازش اسے سر جیب تامل سے نکال
دامن فکر پہ ہے ریختہ ادراک ٹانکا

کہا جو غیرت لیلیٰ امین نوازش نے
یہ اڑ گئی تھیں میں نے بھی کیا سٹان کہا

فارسی غزل : یا ہو گئی کچھ آج ہی آوازِ جُرسِ بند
سن سن غزل اپنی جو پڑی بزم میں پست
ہر شعر مرا مرثیے کا سا ہے مگر بند

اے نوازش یہی معنی بھی ہیں شاگردی کے
اور بھی تو نے کیا پیرۂ استاد بلند

ہے نوازش یہ فقط تاثیر شاگردی سوز
شمع ساں جو بتو کو ہے آتش زبانی پر گھمنڈ

ایسے دیووں سے نوازش نہ اُلجھ سودا ہے
چھوڑنا ہی تجھے منظور ہے تو میر کو چھوڑ

زنداں سے تنگ تو ہے نوازش وہ یار دیں
ہے لکھنؤ میں نام مکاں دل کشا غلط

ناظرانِ حال مرگرم افترا سازی کے ہیں
سچ ہے کہنے ہی کے قابل ان کے دربار کی وضع

مجھ کو تکلیف نہ جانے کی وہاں شئے ہمدم
ہیں جہاں شہر میں سب مہر بہ زر فولادی جمع

انھیں لوگوں سے ہیں باندھے ہزبان اردو
ہاں لباس شعراء میں ہوئے بند عاقبت جمع

ان کا منہ نوچ لوں آتا ہے نوازش جی میں
جب کہ استاد سے کہتے ہیں مجھے بہتر لوگ

قافیہ جلد نوازش بزمیں جسرأت
اپنے انداز کے باندھے ہیں غزل نوازنکال

کہاں تجھ سے نوازش لوگ پیدا جو کہتے ہو مجھے اے ہریاں تم
کرم صاحب کا کس لائق ہے بندہ بیاں کرتے ہو اپنی خوبیاں تم

پڑھے کے مجلس میں نوازش میں غزل سوز کی وضع
مرثیہ خواں کی طرح سب کو رُلا جاتا ہوں

فصلِ بہار کیسی سمجھیں گے وہ یہ وحشت
یہ فصلِ گل جنھوں نے دھوپ میں جائے لہیں

یہ لکھنؤ ہے نوازش جو یاں اڑی سو اڑی
جو کانوں کان نہ سنیئے یہ کا پتور نہیں

دیکھ اس گرمی کو تاریخ نے نوازش سے کہا
اب کے پانی بھی یقیں[2] حشر دبرسات میں

لے مرتے ہیں یہ جنھیں سب میں مردوں اس پر جب
رشک پستی کوئی انوکھا پیدا ہو

یہ نئی زمانہ نوازش نہیں ہے ختم
پر لکھنؤ میں دیر نہیں انقلاب کو

شعر میں عمداً نوازش کے نہیں بند تھت
ورنہ پستی بیشتر ہے سیر اسے قاموس کی

کیا نوازش کر لیا دیوان رنگیں ہی نے تو
کس کا یاں دیتا سخن تیرے سخن پر رونگ ہے

یاراں چندا پنے نوازش وہاں پہ ہیں
آباد یہ دعا ہے سدا لکھنؤ رہے

لکھنؤ کی نہ دلایاد نوازش مجھ کو
گیا پری لوگ تھے ہم اس سے جدا لئے ہوئے

دیوانہ ہوں انداز کا میں اس کے نوازش
سر ٹیکا ہزاروں نے پہ سودا کو نہ پہنچے

---

[1] یہ مشہور شعر ہے۔ مصرع ۲ زبانوں پر اس طرح ہے،
جو کام ہوا ہم سے ا[illegible] [2] کوڈا

[2] ناموزوں، دیوان تاریخ سے تصحیح ہو سکے گی۔

ہے رخنہ ساز ایماں وہ زادۂ فرنگی
اسلام اب کہاں ہے عالم فراموش ہے

سبزہ ہے، گھاس ہے اور ہوا ہے — باقی ساقی کی ایک جا ہے
اور منہ کو چھپا کے جانے والے — سب ہے ہے کی کیا تھا آخ کیا ہے

غزل ان قافیوں میں تیسری بھی ایک میں لکھوں
تجھے بھی سوز سے آخر تو شاگردی کا ناتا ہے

غزل سوز نواز سخن وہیں میں نے بھی پڑھی
تیسری جگہ حضرت سودا کے قصیدے سے نکلے

اسی باز نوائے حضرت دل تم کڑھ کب آئے
کہ چھوڑ کے پہلی جوں ناگنی نکھرتی ہو

قسم جو کھایئے تو طالع نواز شش کی
کسی کی بگڑی ہوئی بات کم سنورتی ہے

ربا عیات:

یہ سنگ ملافن بلا اب ٹل جائے — بینائے دل شکستہ یارب چڑھ جائے
پھر منہ نہ کرے جو لکھنؤ سے نکلے — بانسہ صبا دیا الٰہی اڑ جائے

ایک ایک کا رنگت میں نہیں گو ثانی — گورے کالے ہیں دونوں ہم کے بانی
گورے کا مجھے مشق ہے اب قید فرنگ — کالا بھی دکھا چکا ہے کالا پانی

وہ شادی و ماتمت خوشی عیدج — ہے آج کا روز روز عید دین مجھے

قطعات تاریخ: سید دلدار علی (عالم مشہود) از سر آمد

وجب کی آٹھ کب انیسویں کو — محمد مذہب شیعہ کا چھے[1]
نجم الدین، تاریخ بجالی محمد مہدی

تا بحشر ہے بحال اب بھی محمد مہدی[2]
وفات جرأت یا خاتمۂ آج جرأت کا انتقال ہوا۔

موت غلام حیدر

"بولا بسی ہزار سے چالیس — گن لے نکلی غلام حیدر سے جان[3]

---

[1] = ۱۲۳۳+۱ = ۱۲۳۴ [2] ۱۲۲۸ [3] = ۱۱۷۸؟
[4] = ۱۲۲۳+۱=۱۲۲۴، صحیح سال وفات یہی ہے کذا
[5] غلام حیدر = ۱۲۹۳ جان یعنی ۵۴ = ۱۲۳۹؟

"نکتہ" مثنث، بہت سے ہیں، فارسی اشعار کی تضمین ہوئی ہے جن میں سے ایک بھی نواز مشن کا نہیں معلوم ہوتا نہ اس کو پوچھ ہمدم یہ اس کے وصف ہیں سارے
حریف پختہ کار سے رند عالم سوز و عیار
بوقت جنگ دانا بہ بوقت صلح تا دانے
ہے غیر تو جز جان عالم — یا سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بد گمانی

راست پوچھو تو سرو نہیں میری تقصیر — حسن سبزے خط سبز مرا گرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

مخمسات — مخمس دو قسم کے ہیں۔ ایک تو معمولی، دوسرے وہ جن کے ہر بند کے آنے میں ایک ہی مصرع آتا ہے خواہ فارسی ہو خواہ اردو۔ قسم اول کے مخمسوں میں سب سے زیادہ سوز کی غزلوں کی تضمینیں ہیں۔ (۵) میر (۲) درد (۳)، مصحفی (۲) خسرو (۲) جرأت (۱) عیشی (۱)، مظہر (۱) نوازش قسم دوم مصرع مصحفی "واں پڑی آنکھ جہاں اپنا گذارہ ہی نہیں" مصرع ؟ "انھیں کے واسطے یہ سر پہ بال رکھتے ہیں۔"
مصرع "لاچار ہو کے یار ہمارے گلے پڑا۔"

مسدسات بھی دو قسم کے ہیں، ایک معمولی، دوسری وہ جس کے ہر بند کے آنے میں ایک ہی شعر آتا ہے: قسم اول کے مسدسوں میں سے ایک واسوخت ہے۔

قسم دوم کے مسدسات میں انشاء اور قائم کے ایک ایک اور سوز کے دو مسدسوں کی تضمین ہوئی ہے:

کیسی ہی کہیوں ہم میں تم سے لڑائیاں ہوں
جب کھلکھلا کے ہنس دو ہیں صفائیاں ہوں
یقول عذر تو واں ہو جہاں حلال بھی ہو
بجان پاک صفائیاں جو کچھ خیال بھی ہو
چوکے آپ سے ملا نہ کرے — دوستی اس سے پھر بلا نہ کرے
لو ہم تو چلے مسافر کو — ہمسو دیجو سلام عاشق کو

اور بھی کئی مسدس ہیں مگر فی الحال یہ پتا نہیں کہ کن شعرا

کے دشت کی تسخیر ہوتی ہے۔

منشیات دو ہیں۔ ایک محمد مہدی کو پیش کی گئی مئے، اس میں اکبر (کذا) پور میر بہ (کذا) کی زبان کا نمونہ دیا گیا ہے، دوسری بطور قہوہ کی فرمائش سے ختم ہوئی تھی، اس کی بیت آخر اور دیوان بھی پر تمام ہوتا ہے، یہ ہے۔

دن کو مرے آئے گی بھور کو

جب وصل سے بچھڑ ہو میتدل

اضافہ: سڑا ورق ۳، پھرپوں کا درجن ۶ ارگن، دوالا نکلا ۷، کیوں نوازش کس طرح کشتی، چھڑ بدی کے دن، دو دریا ۱۰، انکھڑی ادھے میاں کام مشکل ہے، مٹانے سے بنا نے کا، لپکا پڑا، کلیلانا، خود پسند اور خود کار ۹، تنیذل، چھپڑی چھیڈی وا چھپڑ کیا ذکر ہے اس بات کا ۱۲، پچھاتی پر مونگ دلنا، منہ تھپتھپانا ۱۳، دریافت نمائے حق و باطل، ریلے کی طرح تم نے بھی اک ٹنگ (قافیہ) نکالا ۱۴، لٹھوں کا بہانا ۱۷ پینے کے بانس ۱۸، نواز شی وہ غزل تہدار پڑھ اور اس زمین میں تو دسلجہ (کذا) یہ غزل ہو جائے پیارے جس کی ٹکا (پیمین کا ۹)، تیلیٹی، ذکر اپنا تو کیا یہ کسی قرم سے نہ ہوگا ۲۱، شو سے بچے ۲۲، نکٹا، وہ کنوٹ ہے میری اس جزو دانش کا ۲۳، یہی کہہ کہہ کے یہ سن تم نے میاں ٹیر کیا ۲۴، الٹ پھیر کیا، سگھڑ بھلائی، مزہ مانگتا ہے دن وہ ہو کڑھائی (کذا) کا، پریت اور رائی، لیوست، جگ ہنسائی ۲۵، کٹ پس کے چراغ پاؤں (کذا) ہے کیا مجھ سے چھڑ (تھپڑ) دینا اس اسپ مادیہ (کذا) کو میرنے ہے دیا جھلکا رجھل یا مسلم قافیہ ۲۷، وازیں ۳۱، مزبیار ۳۲، ایک ہی لاٹھی ہانکا ۳۳، یہیں جہاز بگ ہم نے بھی لگان کیا ۳۶، مسیان کیا، چھپر بند ۶۱، ایجاد (مذکر)، بیت لے پیر ۶۲، دکھائی دختر رز آج کیا ہی اس نے جو پی پڑا عذاب تو پر ٹھکانہ ہے سب شیشے کی گڑوی پر ۷۳، مٹی محش، لب گزیدن، چلبلا پن ۷۴، ان بن، کہ دو تری سے تم میں لپٹی چھاتی کا گرسل ہوں نہ ٹیکو ہاتھ سے میں بھی

تمنا بجنوری

## غزل

خسرو ہے نذر جنوں عاشقی کے رستے میں
خودی، خودی نہ رہی بے خودی کے رستے میں

خدا بنائے ہیں کیا کیا خودی کے رستے میں
کھلائے عشق نے گل گمرہی کے رستے میں

کھلے نہ ہوش کہ عالم میں کائنات کے راز
جنوں سے درس ملا آگہی کے رستے میں

سنبھل کے منزل ہستی میں شہسوار حیات
مقام موت بھی ہے زندگی کے رستے میں

جمال نیم مسرت ہیں کھو نہ جائے نظر
ہے ظلمت شب غم روشنی کے رستے میں

جنون شوق کی بانہ نگاہیاں، تو یہ
نچھے نہ دیر و حرم بھی کسی کے رستے میں

خبر بھی ہے جو تری جستجو میں نکلے تھے
نثار ہو گئے تجھ پر بھی کے، رستے میں

قدم اٹھائے بھی اٹھتے نہیں کسی جانب
اب آپڑا ہوں عجب بیخودی کے رستے میں

نہ آئے حرف تمنا رضا سے دوست کے ساتھ
غرض کی لاگ نہ ہو بندگی کے رستے میں

کمی کم بخت کا دل ہوں ۱۰۱، دانی (ردیف واؤ)، مٹیا ہوس ۱۰۳، لکھی پڑھی، کنجوس، اٹا پٹا ۱۰۴، راب، کٹ ہونا بگڑنا ۱۰۵، پھپھر ندر ۱۰۶، آ خرشش ۱۰۷، بال ٹیکی پڑتی ہے ۱۰۹، (اڑ) پھچ ۱۶۵ بیاکو (کذا)، مٹھو، لاگو ۱۶۹

حنیف نقوی

# تذکرۂ نکات الشعراء

اردو ادب میں تنقید کی مشورہ کی ابتدا تذکرہ نگاری سے ہوتی ہے۔ آج کی تنقید تذکرہ نویسی کے ارتقاء پذیر مراحل ہی سے گزرتی ہوئی اس مقام بلند تک پہنچی ہے۔ اگرچہ قدیم تذکرہ نگاروں نے زیر بحث شعراء کے محاسن و معائب کلام کی نشان دہی کو بہت معمولی یا ثانوی اہمیت دی ہے اور ان کے تبصرے اور تجزیے تنقید کی نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوتے تاہم ان تبصروں کے پس منظر میں کچھ ایسے غیر واضح اور مبہم نقوش نظر آتے ہیں جنہیں ہم تنقید جدید کا نقطۂ آغاز کہہ سکتے ہیں۔ اردو شعراء کے یہ تذکرے بہت سی خامیوں سے معمور ہیں۔ پھر بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر یہ معرض وجود میں نہ آتے تو شعرائے متقدمین کے فن اور زندگی کے بہت سے گوشے پردۂ تاریکی میں رہ جاتے اور تاریخ ادب کی بہت سی کڑیاں بکھر جاتیں۔ ایسی صورت میں تذکرہ نگاری کی افادیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پیش نظر مصنوں کا موضوع میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء ہے۔ جس طرح میر اردو غزل کی ارتقائی تاریخ میں ایک سنگ میل یا چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح انھیں تذکرہ نگاری میں نہ صرف ایک امتیاز بلکہ اولیت حاصل ہے۔ میر سے پہلے اس وقت نکات الشعراء کا وہ نسخہ ہے جو بابائے اردو مولوی عبدالحق کا مرتبہ اور انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد دکن کا شائع کردہ ہے۔ میر صاحب تذکرے کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

"پوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوال شاعران ایں فن بصفحۂ روزگار باند بنا علیہ ایں تذکرہ مسمی بہ نکات الشواست نگاشتہ می شود" [1]

اردو کے جتنے تذکرے اب تک شائع ہو چکے ہیں یا دریافت کر لئے گئے ہیں، ان سب میں نکات الشعراء قدیم ترین تصنیف ہے۔ اگرچہ مصنف نے کہیں بھی سنہ تصنیف کی وضاحت نہیں کی ہے لیکن ایک داخلی شہادت کے ذریعہ یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ میر صاحب نے آنند رام مخلص کے حال میں لکھا ہے کہ "قریب یک سال است کہ درگذشت" [2] مخلص کا سال وفات ۱۱۶۴ھ ہے۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ نکات الشعراء اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا۔ اس فیصلے کے بعد قائم چاند پوری مؤلف تذکرہ 'محزن نکات' کا یہ ارشاد کہ

"تا ایں آن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نگردیدہ و با ایں زبان ہیچ انسانے از ماجرائے شوق افزائے سخنوران ایں فن سطرے تالیف نرسانیدہ" [3]

---

[1] صفحہ ۱ [2] صفحہ ۹ [3] بحوالہ تذکرہ گلشن ہند صفحہ ۱۲۴ و خزانۂ عامرہ صفحہ ۴۲۵ [4] محزن نکات صفحہ ۱

اس بات کی نمازی کرتا ہے کہ "نکات الشعراء" ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اور اس زمانے میں جبکہ طباعت کی سہولتیں مفقود تھیں، ایک ادیب تک کسی دوسرے ادیب کی تصنیف کا نہ پہنچنا تعجب خیز نہیں لہٰذا اقوام بیکم سوادی یا بددیانتی کا الزام عاید کرنا مناسب نہ ہوگا۔ یہی کیفیت "تذکرہ ریختہ گویاں" مؤلفہ فتح علی گردیزی کی بھی ہے جو ۱۱۷۶ھ میں قائم کے تذکرے سے دو سال قبل مرتب ہوا ہے۔

یہ تذکرہ جو چھوٹے بڑے ایک سو تیس شاعروں کے ذکر، سوانح اور انتخاب کلام پر مشتمل اور درمیانی سائز کے ۱۸۰ صفحات پر محیط ہے، تیر کے عہد شباب کی تخلیق ہے اور دہلی کے دوران قیام میں لکھا گیا ہے۔ ذکورہ شعراء میں اکثریت ایسے شاعروں کی ہے جو شمالی ہند اور خصوصاً دہلی یا بر اعظم مصنف ہندوستان سے متعلق تھے اور مصنف تذکرہ کے احباب و معاصرین اور جانے پہچانے لوگوں میں سے تھے۔ تذکرے کی ابتداء بھی شمالی ہند کے شعراء ہی کے ذکر سے ہوئی ہے۔ اس امتیاز خاص کی وجہ بیان کرتے ہوئے دیباچے میں لکھا ہے کہ دکن سے کوئی "مربوط شاعر" پیدا نہیں ہوا اس لئے تذکرے کا آغاز شعرائے دکن کے نام سے نہیں کیا گیا تاہم ان میں سے بعض شاعروں کا ذکر کیا جائے گا۔ دستور زمانہ کے مطابق میر صاحب نے اہل مطالب کے لئے فارسی زبان ہی کو اپنایا ہے جو تشبیہات و استعارات سے بھرپور ہوتے ہوئے بھی نہایت صاف شگفتہ اور فہم اور دونوں دماغ سے قریب ہے تو افی کی پابندی کا التزام کیا ہے لیکن ان پابندیوں میں آورد نہیں آمد ہے جس کی وجہ سے زور بیان کے لئے کہیں کہیں قواعد کی پابندی سے آزادی بھی حاصل کر لی گئی ہے۔

عام تذکروں کی طرح اس تذکرے میں بھی واضح تنقیدی اشارات تو نہیں ملتے تاہم جس چھوٹے چھوٹے جملوں سے مصنف کی ناقدانہ صلاحیتوں کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ میر کی نظر میں شاعری کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری تھیں اور انھوں نے کس معیار کو سامنے رکھ کر شعراء کو سراہا یا ناقابل اعتنا قرار دیا ہے ان چیزوں کی وضاحت خود انھوں نے کہیں شعوری طور پر اور کہیں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر کر دی ہے۔ تذکرے کے خاتمے پر ریختہ کی جو ان کے الفاظ میں "شریعت بہ طور شعر فارسی بہ زبان اردوئے معلی شاہجہان آباد دہلی" تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ریختہ کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) جس میں ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی زبان میں ہو۔

(۲) نصف مصرعہ فارسی اور نصف ہندی میں ہو۔

(۳) جس میں فارسی کے افعال و الفاظ لائے جائیں۔ یہ قبیح صورت ہے۔

(۴) جس میں فارسی کی ایسی ترکیبیں استعمال کی جائیں جو زبان ریختہ سے مناسبت رکھتی ہوں۔ ایسی ترکیب کا استعمال جائز ہے لیکن اس مناسبت کا اندازہ غیر شاعر نہیں لگا سکتا۔ جو ترکیبیں زبان ریختہ کے لئے نامانوس ہوں ان کا استعمال معیوب ہے مگر اس کا سمجھنا سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے۔ فیلز کا مسلک بھی یہی ہے کہ اگر فارسی کی ترکیبیں گفتگوئے ریختہ کے موافق ہوں تو ان کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۵) ایہام گوئی جس کا رواج زمانۂ قدیم میں عام تھا لیکن اب طبائع اس صنعت کی طرف بہت کم مائل ہیں بشرطیکہ بندش کی شستگی کا خیال رکھا جائے۔

(۶) وہ طرز شاعری جسے ہم نے اختیار کیا ہے اور جو تمام صنائع پر محیط ہے۔ تجنیس، ترصیع، تشبیہ، اضافی، گفتگو، فصاحت، بلاغت اور ابتذال خیال سب اسی فن میں آتے ہیں[۲]۔ اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میر فارسی کی مانوس و شگفتہ تراکیب، صنائع بدائع کے بے تکلف استعمال، فصاحت و بلاغت، اضافی بیان اور شستگی و بندش کو لوازمات شاعری تصور کرتے تھے انھوں نے شاعر کے لئے ذوق سلیم کی اہمیت پر بھی زور

---

[۲] نکات الشعراء ص ۹ ۔ ص ۱۷۹ و ۱۸۰

دیا ہے۔ شاعری ان کے نزدیک اکتسابی فن نہیں، وہبی عطیہ ہے۔ بلیز نظری رحمان کے کوئی شخص کامیاب شاعر نہیں بن سکتا۔ فارسی تراکیب کے استعمال کے سلسلے میں شاعر اور غیر شاعر کی تفریق انھیں اشارات کی حامل ہے

میر شاعری کو محض "دلیل" کی داستانوں تک محدود رکھنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ عبدالحی "تاباں" کی شاعری کے متعلق ان کی یہ رائے کہ "ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است۔ اما بسیار رنگین می گفت"[1]، ضمناً اسی رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔ صحتِ الفاظ اور صحتِ محاورات و امثال کا خیال رکھنا بھی ان کی نظر میں ضروری تھا۔ چنانچہ میر سجاد اکبر آبادی کے ایک شعر پر جس میں "کانٹوں میں گھسیٹنا" کے بجائے "کانٹوں میں اینچنا" نظم ہوا ہے اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "در مثل تصرف جائز نیست"[2]۔ شیخ محمد حاتم کا ایک شعر ہے ؎

دیکھ طور اس دور کا حاتم نے کی ترک شراب
یاد کر کر سبزہ زاروں کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

میر اس شعر کی ایک ترکیب "سبزہ زاروں" پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں کہ دریں لفظ "تامل کردن ضرور است زیرا کہ آشنائے گوش ایں ہمچو ان نیست"[3]۔ محمد حسین کلیم نے قصیدہ "روضۃ الشعراء" میں میرزا جملہ[4] کا نام "جان جاں" کے بجائے "جانِ جاناں" موزوں کیا ہے۔ اس تصرف کے متعلق میر صاحب کا ارشاد ہے کہ "چوں اکثر عوام نام مرزا از غلطی جان جاناں می گویند، شاعر ملکور نظر بر شہرت ہمچنیں موزوں کردہ اگرچہ نمی بایست کہ گفتگوئے ما با خواص است"[5]۔ آخری جملہ اس نقطۂ نظر کا حامل ہے کہ شعر خواص یا بہ الفاظ دیگر یارانِ نکتہ داں کے سمجھنے کی چیز ہے۔ یہ کہ غلط الہام کا استعمال جائز ہے مگر اس سے احتراز کرنا بہتر ہے۔

میر کے خیال میں تو الہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو شعرائے اخفائے حال کے لئے وضع کر لی ہے ورنہ متداول اشعار سرقہ ہی کی

[1] صفحہ ۱۰۰ [2] صفحہ ۶۶ [3] صفحہ ۷۸ [4] صفحہ ۸۰
[5] صفحہ ۸۴



بدلی ہوئی شکل ہوتے ہیں۔ چنانچہ یقین کے ذکر میں رقمطراز ہیں کہ "اکثر شاعرانِ ریختہ را مبتذل بندیا فتہ ام۔ بیگویند و تواردی تامند گویا ایں شعر استاد در حق ایشان است ؎

ہر چہ گویند بے محل گویند
در تواردِ غزلِ غزلی گویند"[1]

تذکرہ نگار یا نقاد کا سب سے پہلا اور خوش گوار فرض انصاف، غیر جانب داری اور فراخ دلی ہے۔ ان بنیادی لوازم و خصوصیات کی روشنی میں میر کا سب سے بڑا کمال وہ منصفانہ اور بے لاگ فیصلے ہیں جو انھوں نے شعراء کے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے صادر فرمائے ہیں۔ اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس میر صاحب نے اس تذکرے میں بڑی رواداری، انصاف پسندی اور خود فراموشی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی نازک مزاجی ضرب المثل ہے۔ اپنی عام زندگی میں وہ نہایت آشفتہ طبع، زود رنج، خود بین اور خود پرست انسان تھے، اسی وجہ سے اکثر معاصرین سے ان کی چشمکیں چلتی رہتی تھیں لیکن "نکات الشعراء" میں اکثر ایسے مقامات آئے ہیں جہاں انھوں نے ذاتیات سے بلند ہو کر حقیقت کی ترجمانی کی ہے اور صدائے انا کو پس پشت ڈال کر شعور کی آواز پر لبیک کہا ہے۔

میر صاحب کے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ سراج الدین علی خاں آرزو ان کی پہلی بیوی کے بھائی اور میر دوسری بیوی کی اولاد تھے۔ غالباً اسی بنا پر دونوں کے تعلقات ہمیشہ ناخوش گوار رہے۔ اس رنجش باہمی کی تفصیل "ذکر میر" کے اوراق میں طی ہے۔ والد کے انتقال کے بعد دہلی پہنچنے پر جن حالات سے میر کو دوچار ہونا پڑا ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"جولوگ درویش (والد) کی زندگی میں میری خاکِ پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے، انھوں نے یکبارگی مجھ سے آنکھیں پھیر لیں۔ تا چار پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کا منت پذیر ہوا۔ یعنی کچھ دن ان کے پاس

[1] صفحہ ۸۴

رہا اور شعر کے بعض مصاحبوں سے کچھ کہتا ہیں پڑ جیں۔
جب ہیں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب کا خط پہنچا کہ
میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے، ہر گز اس کی تربیت ہیں
سی نہ کی جائے۔ وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیا دار
شخص تھا اپنے بھتیجے کے لکھنے پر میرے درپے ہو گیا
جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلا وجہ بڑا بھلا کہنا شروع
کر دیتے اور طرح طرح سے تکلیف پہنچانے کی کوشش
کرتے۔ میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی
دشمن سے ہوتا ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:-

"اگر ان کی دشمنی کی تفصیل بیان کروں تو ایک دفتر
ہو جائے[1]"

اب آرزو کی شخصیت کا وہ مرقع دیکھئے جو نکات الشعراء میں پیش کیا گیا ہے:

"شاعر زبردست، قادر سخن، عالم فاضل، تاحال
ہیچ ایشاں بہ ہندوستان چنیں نشاں بہم نرسیدہ
بلکہ بحث دوایران می رود، شہرۂ آفاق در سخن فہمی
طاق..... حاصل کمالات اوشاں از حیزۂ بیان
بیرون است۔ ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ
ہم شاگردان آں بزرگوار ند۔ گاہے برائے تفنن طبع
دو سہ شعر ریختہ فرمودہ ایں فن بے اعتبار را کہ ماحتہ
کردہ ایم، اعتبار دادہ اند"[2]

دیکھئے یہاں تمام ذاتی اختلافات اور خانگی معاملات کو بالائے طاق رکھ کر انصاف کی بات کہہ دی۔ اگر کوئی شخص اس تعریف و توصیف اور اعتراف کمال کو تصنع یا لفاظی سے تعبیر کرے تو درست نہ ہوگا دونوں بیانات میں اختلافات کا سبب ان کتابوں کی بنیادی حیثیت کا اختلاف ہے جن سے وہ متعلق ہیں۔ "ذکر میر" میر کی آپ بیتی

[1] بحوالہ "انتخاب کلام میر" مرتبہ عبدالحق صفحہ ۲۱۷
[2] صفحہ ۳

ہے جہاں انھوں نے آرزو کی شخصیت کے اخلاقی پہلو اور کردار کی کمزوریوں سے بحث کی ہے۔ "نکات الشعراء" ایک ادبی تصنیف ہے اس لئے اس میں ان کے کمالاتِ فن اور علمی و ادبی افضلیت کی وضاحت کی گئی ہے۔

میر کے معاصرین میں سودا بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اپنے ایک شعر میں میر نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

طرفہ ہوتا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یہ نہ سودا کچھ ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

سودا جیسے علامۂ وقت اور باکمال شخص کی ذات پر جہاں یہ کاظلاق حد سے بڑھی ہوئی انانیت کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ اس قسم کی مبالغہ آمیز تعلّیاں ابتداء ہی سے ایک روایت کی طرح اردو و فارسی غزل گو شعراء کی سرشت میں داخل رہی ہیں۔ سودا بہرحال ایک عظیم فن کار ہے اور میر کو بھی اس کی فن کاری اور ملک الشعرائی کا اعتراف ہے۔ منقولۂ بالا شعر ایک شاعر کے خود ستائیل کی صدائے بازگشت تھا۔ اب ایک تذکرہ نگار کی زبانی اسی سودا کی قدر و قیمت اور فنی عظمت کا بیان سنیئے:

"سرآمد شعرائے ہندی او است، بسیار خوشگو است
..... در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ
بہ مصرع برجستہ اش را سرو آزاد بندہ، پیش فکر
عالیش طبع عالی شعر سنجیدہ بیان ریختہ چیرہ
ملک الشعرائی ریختہ او را شاید....."[1]

عبدالحئی تاباں کے موضوعِ فکر سے میر کو اتفاق نہیں پھر بھی ان کی رنگین نگاری کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس سلسلے میں ان کا قول پہلے ہی نقل کیا جا چکا ہے۔ چند جملے اور ملاحظہ فرمایئے:

"تا حال دفتر شعراء ہیچ اوشاعر خوش ظاہر
[illegible]
بہ شہزادہ استاد (سودا) اورا تلمذ شاگردی

[1] صفحہ ۱۳۱

او نبود ..... از چندے بسبب کم اختلاطی ایں ہمچیدان گدورتے بمیاں آمدہ بود - الحق مہلت نداد کہ تلافیش کردہ اید ....." [1]

آخری جملہ جس احساس پشیمانی کا آئینہ دار ہے وہ میر کی بلندی کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ نکات الشعراء میں اس قسم کی بے لاگ رائے زنی کی مثالیں محمد دو نہیں بلکہ بہت موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباسات میں بھی آپ کو اسی جذبے کی کارفرمائی نظر آئے گی۔

(۱) سید عبدالولی عزلت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"مشق شعر فارسی ہم کردہ اند لیکن مزاج او شاں بیلان ریختہ بسیار دارد ..... فیجہ تمام بریختن دارد اند اسالیب کلام شاں واقع ی گردد کہ بہرۂ بسیار از اندوہ مندی دارند، با ایں ہمہ کمال ایں فن در وسعت مشرب ہم رسانیدہ اند کہ در ہر رنگ چوں آب می آمیزند" [2]

(۲) محمد حسین کلیم:- طرزش بر کے نامانیست - اکثر بہ زبان بیدل حرف می زند۔ در فہم شعر تہم دارد ..... لیچ روان او مانند سیل رواں است و فکر رسالیش آں سوئے آسماں ..... اگرچہ کلیم در فارسی گزشتہ است امّا کلیم ریختہ پیش فیضی ایں است ....." [3]

(۳) شیخ محمد حاتم: "مردیست جاہل و متکلم و مقطع وضع دیر آشنا، فتانہ دارد۔" [4]

(۴) یکرو: "ہمچیدان فن ریختہ بود لیکن خود را خود ہمہ داں ی شمرد۔" [5]

(۵) فضلی "شاعر خوبے بود۔" [6]

(۶) محمد علی حشمت "اکثر بر شعر ما مردماں اعتراضات بیجا ی کردہ و جواب یا ہواب ی یافت در شعر ریختہ کہ بسیار پا جیانہ ی گفت، پسیار دارد ..... حاصل عجب ہنگامہ پرداز ے بود در ایں ایام ہمچو دیگے ہم بہم نمی رسد ....." [7]

(۷) شہاب الدین ثاقب "در ہمہ چیز دست دارد؛ یا ہیچ نمی داند ....." [8]

(۸) محمد محسن محسن:- "ذہنش بیار مناسب وسیلہ اش خیلے درست معلوم ی شود۔ مصرع ریختہ بر مشورتِ من موزوں ی گند۔ سخنش نام ضرب المثلیست سالگی پسیدہ باشد۔ خوب تواند گفت انشاء اللہ" [9]

میر سجاد اکبرآبادی اس زمانے میں کم عمر اور نوسخن شاعر تھے۔ ساتھ ہی میر سے ان کے تعلقات بھی خوشگوار نہ تھے۔ اس کے باوجود ان کا ایک شعر میر صاحب کے لئے تواجد کا سبب ہی گیا تھا جس کو انھوں نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

"ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فیقراز دیدن ایں شعر تواجد دست بہم ی دہد از بسکہ از خواندن ایں شعر خلقے بری دارم، ی خواہم کہ بصد جا بنویسم"

مذکورہ شعر درج ذیل ہے ؎

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے
جو یہ لحشق تری تو بس ڈوبی

اپنے ہم عصر اور ہم تخلص شاعر محمد میر میر (سوز) کے متعلق ان کا یہ قول کہ

"ہر چند طرز جلوہ دارد لیکن از خوشگوئی کردن تخلص نصف دم از دخوش است" [10]

کسی حد تک منصفانہ مزاجی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔

میر صاحب نے اپنے نقل کردہ اشعار میں کہیں کہیں اصلاحیں بھی کردی ہیں، یہ اصلاحیں جن کی بدولت صرف ایک معمولی سے تغیر و تبدل کے بعد اشعار کی معنوی حیثیت پہلے سے بلند تر ہو گئی ہے، ان کی نکتہ رسی اور دقیقہ نگاہی کی عکاس ہیں۔ ادائے خیال کے لئے

---

[1] صفحہ ۱۰۲ [2] صفحہ ۹۲ [3] صفحہ ۲۲ [4] صفحہ ۷۵
[5] صفحہ ۷۹ [6] صفحہ ۹۸

[7] صفحہ ۱۶۷ [8] صفحہ ۹۹ [9] صفحہ ۱۳۹ [10] صفحہ ۱۵۱، ۱۷۲

موزوں اور برمحل الفاظ کا انتخاب کمال شاعری کی دلیل ہے۔ لیکن یہ کمال ہر شخص کا حصہ نہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تمام شاعر جن کے اشعار میں تعرّف کیا گیا ہے اس حقیقت سے نا آشنا اور اس جوہر سے بے بہرہ تھے۔ البتہ ان کی نظریں اس مقام تک رسائی حاصل نہ کر سکیں، جہاں پہنچنے میں میرؔ کی دُور رس نگاہیں کامیاب نظر آتی ہیں۔ چند مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں

(۱) انعام اللہ خاں یقینی نے کہا ہے ؎

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

میرؔ کے خیال میں اگر 'خوش نصیبی' کے بجائے 'خوش معاشی' کہا جاتا تو شعر بہت 'بامزہ' ہو جاتا[1]

(۲) میر سجّاد کا ایک شعر ہے ؎

بے تکلف ہو سبھوں سے وہ ملے ہے سجّاد
دختر رز بھی عجب طرح کی مستانی ہے

میر صاحب کہتے ہیں کہ اگر میرا شعر ہوتا تو مصرع اوّل اس طرح موزوں کرتا ع بے تکلف ہو پنٹ سر پہ چڑھے ہے سجّاد[2]

(۳) مصطفےٰ خاں یکرنگ کہتے ہیں ؎

پرچ کے جو سو مارا حب نے
راستی ہے گی دار کی صورت

میر صاحب فرماتے ہیں کہ باعتماد فیز "پرچ" کے بجائے حرف "حق" اولیٰ ہے[3]

(۴) یکرنگ ہی کا ایک اور شعر ہے ؎

اس کو مت بلو جھو سبھی اور دل کی طرح
مصطفےٰ خاں آشنا یکرنگ ہے

اگر یہ شعر میر صاحب کا ہوتا تو وہ اپنے حسب الارشاد پیش مصرع اس طرح نظم کرتے ؎

مت تلون اس میں سمجھے آپ سا[4]

(۵) آبرو کا ایک مطلع ہے ؎

نہیں تارے بھرے ہیں فلک کے نقطے
اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر صاحب کی رائے ہے کہ اگر "اس قدر" کے بجائے "کس قدر" کہا جاتا تو شعر آسمان پر پہنچ جاتا[5]

اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اصلاح شدہ شعروں کی ہیئت و معنویت میں اصل اشعار سے زیادہ بلندی اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان اصلاحات سے میر کا مقصد شعراء کی تذلیل کا اظہار یا ان کے فن کی تنقیص نہیں۔ ان کے مشورے ایک تعمیری اور اصلاحی جذبے پر مبنی ہیں۔ ان کا مطمح نظر حریفانہ یا معاندانہ خود نمائی نہ تھی، ورنہ وہ ہر شاعر کے کلام سے قابلِ اعتراض اشعار انتخاب کر کے اس کی کوتاہیوں کا مذاق اڑا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ دوسری خصوصیات کے علاوہ اس خصوصیت سے میر کی دیانتداری اور متانت کا ثبوت ملتا ہے۔

اس تذکرے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ میر کو اردو ادب کی تاریخ میں چند انکشافات کا فخر بھی حاصل ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ ایسی دو ایک باتیں لکھی ہیں جن کے متعلق ان کے ساتھ چلے بغیر کسی صحیح فیصلے تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ 'نکات الشعراء' کی اہمیت کا یہ پہلو کبھی نظر انداز نہ کیا جا سکے گا کہ وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں اردو کے قدیم شاعر سعدی کے تو کر میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:

"آنچہ بعضے ایں را شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گمان بردہ اند خطاست"[6]

میر کے اس قول فیصل سے قائم چاند پوری کے مندرجہ ذیل خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ:

"اتفاق جمہور بر آنست کہ یوں حضرت شیخ سعدی شیرازی در ہنگام سیاحت بہ طرف گجرات تشریف آوردند یک دو غزل ریختہ ہم در آنجا بیات برسبیل تفنن لطبع

---

[1] صفحہ ۸۰ [2] صفحہ ۱۷ صفحہ ۲۰ صفحہ ۲۳

[3] صفحہ ۱۱ [4] صفحہ ۱۰۳

ارشاد فرمودند....." [1]

یہ حقیقت بھی اسی تذکرے سے بے نقاب ہوتی ہے کہ مرزا مظہر کا نام شہرتِ عام کے برخلاف "جانِ جاں" تھا۔ میر نے اس دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"پدر او مرزا جان نام داشت۔ از فرط شفقت مرزا جان جاں می گفتند ازیں سبب بہ ہمیں اسم موسوم است۔"

پھر یقین کے ذکر میں اس حقیقت کی مزید تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اکثر عوام از غلطی نام مرزا جان جاناں می گویند....."

لیکن اس نام سے موسوم ہونے کا جو سبب بتایا گیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ اصل وجہ تسمیہ کا علم حضرت مظہر کے خلیفہ شاہ نسیم اللہ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ:

"چوں خبر ولادت آں حضرت بہ سمع مبارک عالم گیر رسید، فرمود کہ پسر جان پدری باشد۔ چوں نام والدش مرزا جان است، نام پیرشش را جان جان مقرر کردم۔" [2]

"نکات الشعرا" کی ورق گردانی سے ایسی ہی کچھ اور باتیں بھی منظرِ عام پر آتی ہیں جو چنداں اہم نہیں لیکن ان کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے مثلاً ولی کو سب سے پہلے "باشندۂ اورنگ آباد" [3] اسی تذکرے میں لکھا گیا ہے یا میر کے متعلق خواجہ ناصر عندلیب کی یہ پیشینگوئی کہ "میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد" [4] جو مصنف کے سوانح حیات کا ایک جز رہی ہے، مصنف نے خود فخریہ انداز میں بیان کی ہے اور اس کی تکمیل پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"الحمد للہ والمنۃ کہ حرف آں مرسلسلۂ خدا پرستاں مؤثر افتاد۔"

اس تذکرے سے اس زمانہ کی ادبی سرگرمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ میر نے کئی جگہ ایک "مجلس ریختہ" کا ذکر کیا ہے۔ یہ مجلس ہر ماہ کی پندرھویں تاریخ کو انھیں کے یہاں ہوا کرتی تھی۔ تذکرے کی تصنیف سے چار پانچ سال قبل اس جلسے کی جائے انعقاد جعفر علی خاں ذکی کا مکان تھا، اس کے بعد خواجہ میر درد کی رہائش گاہ اس اجتماع کے لئے انتخاب کر لی گئی تھی۔ آخر میں خواجہ صاحب کے اصرار پر میر نے اس مقصد کے لئے اپنے مکان کے استعمال کی تجویز منظور کر لی تھی۔ اس کے علاوہ میر سجاد اکبر آبادی، علی نقی کافر، حافظ حلیم اور بعض دوسرے لوگوں کے یہاں بھی اس قسم کی مجلسیں منعقد ہوتی رہتی تھیں جن میں میر بھی شریک ہوتے تھے۔ ان مجالس کے لئے "نکات الشعراء" میں ایک جگہ لفظ "مراخۃ" استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ اس نہ ملنے میں 'مشاعرہ' کے وزن پر ایسی ادبی محافل کے لئے وضع کر لیا گیا تھا جن میں شعراء اپنا رنگینۂ کلام سناتے تھے مشاعرہ کا لفظ ان مجلسوں کے لئے کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر کے عہد میں 'مشاعرہ' کی اصطلاح صرف فارسی غزل سرائی کی مجلسوں کے لئے مخصوص تھی۔

اشرف الدین علی خاں پیام کے درج ذیل قطعہ بنام شاکر جو عام طور سے میر سے منسوب کئے جاتے ہیں اور عبدالمنان بیدل عظیم آبادی نے "اشارِ میر" میں ان کے "بتذلل اور غیر فطری کلام" کی مثال میں نقل بھی کر دئے ہیں، آپ نے ضرور سنے ہوں گے ؎

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے ۔۔۔ کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا ۔۔۔ ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا

"نکات الشعراء" میں پیام کے نام سے ان اشعار کی موجودگی اس اختلافِ انتساب کے سلسلے میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

"نکات الشعراء" کی تصنیف کے دوران میں کچھ ایسی منزلیں بھی آئی ہیں جہاں میر اپنی راہیں قطعیت کے ساتھ متعین نہیں کر سکے ہیں۔ ایسے مقامات پر ان کے فیصلے بڑے دلچسپ اور مشکوک نظر آتے ہیں۔ الہام اللہ خاں یقین کے ملکۂ شعر گوئی سے بے بہرہ ہونے کے متعلق ان کے ساتھ ایک معتبر واقعہ بھی تھا جسے وہ خود ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:-

"میاں شہاب الدین ثاقب نقل می کرد کہ من محض برائے امتحان نماز و روزہ ترک کردم، من غزل

---

[1] مجموعہ نکات صفحہ ۱ ۔۔۔ [2] معمولاتِ مظہری صفحہ ۶
[3] صفحہ ۸۹ ۔۔۔ [4] صفحہ ۵۰

بانعرام رسانیدم واز دو معرعے موزوں نشدہ.....!؟ [1]

لیکن اس کے باوجود ان کے بارے میں اس سے زیادہ نہ لکھ سکے کہ :

" مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر او را شتر گفتہ می دہد و وارث شترہائے ریختہ خود گردانیدہ ، از قبول کردن این معنی بندہ را خندہ می آید کہ ہمہ چیز بوارث می رسد الا شتر.....

بعد از ملاقات این قدر خود معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد۔ شاید از ہمیں راہ مردماں گمان نا موزونیت در حق او داشتہ باشند۔ مجھے بریں اتفاق وارند کہ شاعری او خالی از نقص نیست کہ شاعر این قسم کم فہم نمی باشد۔" [2]

خدا معلوم اظہار خیال میں شکوک و شبہات کی یہ آمیزش کسی شوری تذبذب کا نتیجہ ہے یا یقین کی نااہلیت پر پردہ ڈالنے کے لئے مصلحتاً اپنایا گیا ہے۔ میری نظر میں دوسری وجہ زیادہ اہم ہے۔ میر حسن نے بھی اپنے تذکرے میں یقین کی موزوں طبعی سے محرومی کا ایک واقعہ جو سودا نے ان سے بیان کیا تھا ، نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن سودا اور میر سوز یقین کے ہاں گئے اور آزمائش کے لئے ایک مصرع طرح دیا لیکن باوجود اصرار کے وہ ایک شعر نہ کہہ سکے۔

بندہ یا رب آقا کے ذکر میں ان کا ایک شعر نقل کرتے ہوئے یہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ :

" این معنی را در دیوان میر عبدالحی تاباں مرحوم بہ تغیر ردیف یا بی الفاظ مطالعہ کردہ ام ۔ لعن غالب آں است کہ این شعر از تاباں مذکور است چرا کہ او از مدت مشق سخن می کرد و این نو مشق است۔" [3]

راقم اور تاباں کے اشعار متوارد باہم مضمون تو ضرور ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ راقم نے سرقہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں تاباں کی کہنہ مشقی کے مقابلے میں راقم کی نوآموزی کی دلیل کافی نہیں۔ بعض اوقات نو مشق شاعر بھی پرانے اور نامور الکلام شاعروں سے زیادہ اچھے اور بلند اشعار کہہ لیتے ہیں۔ " نکات الشعراء

[1] صفحہ ۸۳ [2] صفحہ ۸۱، ۸۲ [3] صفحہ ۱۴۳

ہی سے زیر بحث دونوں اشعار نقل کئے جاتے ہیں تاکہ ناظرین ان کے اختلاف کا اندازہ کر سکیں ؎

بخدا تو چاہیئے اے شوخ مجھ پہ یاں تک کر
کہ سب کہیں مجھے ، رحمت تری دفا کو (تاباں)
یاں تک قبول خاطر کیجے تری جفا کو
تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو (راقم)

اس تذکرے پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ میر صاحب نے تحقیق و تدقیق کو زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے اپنے قلم کی جولانیاں ذاتی علم یا سید صاحب (سید عبدالولی عزلت) کی بیاض تک محدود رکھی ہیں۔ انھوں نے بعض شعراء کے مختصر سوانح حیات حتیٰ کہ ان کے ناموں کے متعلق حصول معلومات کی زحمت اٹھانے کے مقابلے میں عدم واقفیت کے اظہار کو ترجیح دی ہے۔ چناں چہ ولی کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

" احوالش کما ینبغی معلوم من نیست۔" [1]

مصطفےٰ خاں یکرنگ کے ذکر کا یہ اختصار بھی اسی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔

یکرنگ شاعر ریختہ ، معاصر میاں آبرو ، می گویند کہ بسیار پریشان اختلاط و آشنائے مدوست بود بندہ از احوال او خوب اطلاع ندارم۔" [2]

محمد فقیہ درد مند کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

" ہر چند کہ یک ملاقات با او کردہ ام لیکن خوب از احوالش مطلع نیستم ۔ این قدر دانم کہ نظر یافتہ مرزا مظہر مسلور است ....." [3]

حبیب کے متعلق فرماتے ہیں :

" احوالش معلوم نیست ، از بیاض سید صاحب مذکور (شعرے) نوشتہ شد۔" [4]

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ ایجاز و اختصار سے کام

[1] صفحہ ۹۰ [2] صفحہ ۱۸ [3] صفحہ ۱۱۷ [4] صفحہ ۱۰۴

ے کہ صرف تخلص کے بعد ایک یا دو شعر نقل کر دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہ کوتاہیاں جو صرف تساہل پسندی کا نتیجہ کہی جا سکتی ہیں، ایک تذکرہ نگار کی شان کے خلاف ہیں، لیکن ان کی موجودگی کے باوجود "نکات الشعراء" ایک عظیم ادبی تخلیق ہے۔ چند خامیوں کی وجہ سے اس کی تاریخی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ کسی ادیب یا مصنف سے یہ توقع رکھنا کہ وہ فروگذاشتوں کا مرتکب نہ ہو یا حقیقت سے سرمو تجاوز نہ کرے، اس کی ادراکی استعداد سمجھنے کے برابر ہے۔ میر کے کلام میں بھی استفہام موجود ہیں پھر بھی اس کی عظمت اور ابدیت میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح 'نکات الشعراء' بھی ایک نقشِ دوام کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

رازیزدانی

# غزل

قدم قدم پہ حجابِ نظامِ عالم ہے
جمالِ یار، یکس کی نظر سے برہم ہے

وہ اعتبار ہماری نگاہ پر کم ہے
جس اعتبار کے قابل نظامِ عالم ہے

نشاط و گریہ مطرب ہے جو بھی عالم ہے
صدائے نغمہ ہے لَے میں نہ شورِ ماتم ہے

فریبِ دل نے محبت میں کھائے ہیں کیا کیا
ہر اک فریب پر اب تک یقینِ محکم ہے

کلی کو پھول بنانا بھی ہے پریشانی
بہار سے بھی عروسِ جمال برہم ہے

اسی سے ذوقِ لطافت کی داد کیوں چاہو
مجھے خبر ہو کہ پھولوں کی زندگی کم ہے

نثارِ جلوہ دل و دیں، ذرا نقاب اٹھا
وہ ایک لمحہ سہی، ایک لمحہ کیا کم ہے

وہ شمع طور میں ہو یا چراغِ بزم میں ہو
جہاں جہاں ہے تجلی، نظر سے برہم ہے

شمیمِ غنچہ و گل، رنگِ لالہ، نغمۂ موج
ترے جمال کی ہر شرح خود ہی مبہم ہے

وہ رقصِ شعلہ، وہ سوز و گداز پروانہ
جدھر چراغ ہیں روشن، عجیب عالم ہے

اُن آنسوؤں کی حقیقت کو کون سمجھے گا
کہ جن میں موت نہیں، زندگی کا ماتم ہے

حدودِ دیر و حرم سے گزر چکا شاید
جلالِ طور کو بے حیسرم، اس نگاہ کی خیر

کہ اب اجازتِ سجدہ ہے اور پیہم ہے
تری نگاہ تو میری نظر سے برہم ہے

حیات و آزاد میر نہیں زمانے میں
مگر تمام زمانے کو موت کا غم ہے

اختر باندوی

# بہاروں کو سلام

سفیرِ جشنِ طرب، اے نویدِ فصلِ بہار — سکونِ دردِ جگر، راحتِ دلِ بیمار
قرارِ خاطرِ بے تاب، وجہِ صبر و قرار — بصد خلوص بصد عزّ و افتخار سلام

مرے وطن کی بہارو تمہیں ہزار سلام

کلی کلی کے ہے دل میں شگفتگی کی اُمنگ — جو دل ہے سوچ کے حیران تو آنکھ دیکھ کے دنگ
یہ جشنِ عہدِ مسرت یہ لطف رامش و رنگ — فروغِ لالہ و گل جلوۂ بہار سلام

مرے وطن کی بہارو تمہیں ہزار سلام

نجات اہلِ گلستاں نے پائی خاروں سے — زہے نصیب ملا امن فتنہ کاروں سے
زمینِ ہند ملاتی ہے آنکھ تاروں سے — وطن کی پاک زمیں تجھ پہ بے شمار سلام

مرے وطن کی بہارو تمہیں ہزار سلام

نہیں وطن میں وہ اب امتیازِ پست و بلند — نہیں ہے کوئی بھی درماندگی کے واسطے بند
اب اپنی اپنی خوشی ہے اب اپنی اپنی پسند — نظامِ ہند کے آئینِ باوقار سلام

مرے وطن کی بہارو تمہیں ہزار سلام

اٹھا چکے ہیں کلستاں سے اب خزاں کے علم — کہ آ گیا ہے گلوں کے نکھار کا موسم
خوشا نصیب کہ پھر کا بہار کا پرچم — نشانِ اوجِ وطن نازشِ بہار سلام

مرے وطن کی بہارو تمہیں ہزار سلام

سلام اُن پہ جو ہوئے جواہر دار و رسن — سلام اُن پہ منائی جنہوں نے رسمِ کہن
سلام اُن پہ ہوئے جو شہیدِ راہِ وطن — مرے وطن کے شہیدانِ جاں نثار سلام

مرے وطن کی بہارو تمہیں ہزار سلام

# ہمارے نئے صدر

بارہ سال تک ملک کے سب سے بڑے عہدے پر فائز رہنے کے بعد ڈاکٹر راجندر پرساد ۱۳ - مئی کو اس سے دست بردار ہوئے اور اسی دن ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن نے نئے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا - ڈاکٹر پرساد بہار کے ضلع سارن کے زیرادی گاؤں کے ایک کسان خاندان میں پیدا ہوئے تھے - اب تقریباً پندرہ سال تک عوامی زندگی کی اعلیٰ ترین اور مشکل ترین ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد اپنے 'صداقت آشرم' میں واپس پہونچ گئے ہیں - ڈاکٹر رادھا کرشنن نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر راجندر پرساد جنگ، بھرت، مہاویر اور بدھ کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں - جنک راج رشی تھے اور آزادانہ عمل ان کا طرۂ امتیاز تھا - بھرت کی فرض شناسی بے مثال ہے - مہاویر نے یہ تعلیم دی کہ جس مذہب میں اخلاقی قدروں سے روگردانی کی جائے وہ مذہب نہیں کہلا سکتا - بدھ رحمدلی کا نمونہ تھے - 'بودھ' حاصل کرنے کے بعد وہ پینتالیس سال تک انسانیت کی خدمت انجام دیتے رہے ـــ ڈاکٹر پرساد میں یہ ساری خوبیاں نظر آتی ہیں - سادگی، وقار اور معقولیت پسندی ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات ہیں - خواہ کسان ہو یا راجہ، ملکی ہو یا غیر ملکی، جو کوئی بھی صدر جمہوریہ کی حیثیت سے ڈاکٹر پرساد سے ملا، وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ ہندوستان اور ہندوستانی کلچر کا نشان ہیں -

ہمارے نئے صدر چھوٹی عمر سے ہی ہندوستانی کلچر کی ہر اس چیز کے دلدادہ رہے ہیں جس میں گہرائی، بلندی اور استقلال پایا جاتا ہے - انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ہم ہندوستانی صرف کلچر کے امانت دار نہیں بلکہ ہمیں روحانیت کا ایک سرچشمہ بھی ورثہ میں ملا ہے، جس سے بڑی جان دار اور تخلیقی قوتوں کے سوتے بہہ نکلے ہیں اور جو صدیوں سے فاتحانہ طور پر بہتا چلا آرہا ہے - ۱۹۰۸ء میں جبکہ ان کی عمر صرف بیس سال تھی ان کی کتاب Ethics of Vedanta (ویدانتی اخلاقیات) شائع ہوئی جس میں ان کی آئندہ تحریروں کی بعض جھلکیاں ملتی ہیں - اس کتاب کے ذریعہ نظام ویدانت کے خلاف اس اعتراض کا جواب دینا مقصود تھا کہ یہ نظام دوسری دنیا سے متعلق ہے اور اس میں اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں - درحقیقت وہ ساری عمر ہندوستانی فکر و خیال کی بہترین ترجمانی اور ہندوستانی کلچر کی نمائندگی کرتے رہے ہیں - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف ہندوستانی مکاتیب فکر میں ہم آہنگی پیدا کی بلکہ مشرقی و مغربی رجحانات میں بھی امتزاج پیدا کیا - آپ کے باب میں یہاں تک کہا جاسکتا ہے، چونکہ وہ دنیا کے فلسفیانہ اور مذہبی خیالات سے پوری طرح واقف ہیں، اس لئے ان کے نزدیک مشرق و مغرب، ماضی و حال کی کوئی تخصیص نہیں - ان کے سامنے ایک ایسی انسانیت کے

فکر و خیال کی دنیا ہے جو اُبھرتی آ رہی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر محدود یا منقسم نہیں بلکہ ہمہ گیر اور مربوط ہے۔ وہ فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھتے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں ایک جسم کامل کے اعضائے رئیسہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور یہ خود انسانی زندگی ہے جو بڑی رنگا رنگ اور مالا مال ہے۔ وہ مذہب یا فلسفہ کے کسی ایک نظام سے وابستہ ہو کر نہیں رہ گئے۔ وہ ہمیشہ زندگی کے حقائق اور سچائیوں کے مستند متلاشی رہے۔ ان کے عقائد ادراک یا علم پر قائم ہیں، نہ کہ صرف فکر و خیال اور منطق پر۔ ان کا فلسفۂ اخلاق زندگی کی ارتقا پذیر خواہش اور شعور پر مبنی ہے جو بلند تر فکر، وسیع تر زندگی اور پُر مسرت تر بقا کے لئے سرگرم عمل ہے۔

فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات کے متعلق ان کے غیر تقلیدی نظریے اور ادراک یا علم نے "پرستھان ترائی" کی تشریحات لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس میں شامل ہیں اپنشد، برہم سوتر اور بھاگوت گیتا اگرچہ یہ تشریحات انگریزی زبان میں ہیں پھر بھی ہندوستانی نمونوں کے نزدیک ان کا عظیم ترین کارنامہ ہیں۔ اپنی کی بدولت وہ آچاریہ کے رتبے کو پہنچے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جو شنکر، مادھو اور رامانج کو حاصل تھا۔ وہی شخص آچاریہ یعنی استاد کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے جو ان کتب مقدسہ کی بنیاد پر ایک مربوط نظام فکر قائم کرتا ہے۔ فلسفہ اور مذہبیات کے ایک عظیم تخلیقی مصنف کی حیثیت سے دنیا کے علماء و فضلا میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہندوستان میں جن لوگوں نے ہندوستانی فکر و خیال کی ترجمانی کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی صف میں بھی ڈاکٹر رادھا کرشنن کا مرتبہ بلند و محفوظ ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن ۱۸۸۸ء میں ایک تقلید پرست متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی جنم بھومی تروتنی (Tiru tani) اور تروپتی (Tirupati) میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہ دونوں مقدس مقامات ہیں اور وہ وہاں سے لوگ یہاں زیارت کے لئے آتے ہیں۔ مگر تقلید پرستی سے انھیں کبھی کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ اور یہ ماحول آزاد اور فکر و خیال کی دنیا کی طرف قدم بڑھانے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکا۔ مسیحی اداروں میں ان کی تعلیم بڑی مفید ثابت ہوئی کیونکہ ایک تو انھیں مسیحیت کا تقریبی مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ دوسرے انھیں ایک چیلنج قبول کرنا پڑا — ہندوستانی فکر اور ثقافت کے خلاف جو اعتراضات کئے جاتے تھے ان کے پیش نظر انھوں نے ہندو مذہب کا گہرا مطالعہ کیا، اور اس طرح انھوں نے ہندوستان کی روح اور اس کے فلسفہ و مذہب کے زندۂ جاوید سرچشمہ کا پتہ لگایا جو بہت سی بے معنی اور مردہ رسمیات کے خس و خاشاک میں دب کے رہ گیا تھا۔ ٹیگور کی تحریروں نے ان کے خیالات کو تقویت پہنچائی۔

۱۹۱۸ء میں انھوں نے اپنی کتاب Philosophy of Rabindra Nath Tagore شائع کی۔ ٹیگور کو یہ کتاب بہت پسند آئی۔ انھوں نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تعریف میں جو کچھ لکھا وہ کئی اعتبار سے اہم ہے، شاعر اعظم نے لکھا تھا — "آپ کی مستعدی اور ژرف نگاہی نے مجھے متحیر کر دیا۔ زبان کا ادبی حسن سونے پر سہاگہ ہے جس کی سب سے بڑی خوب صورتی یہ ہے کہ الفاظ کے جھمیلوں اور علمیت کے اظہار محض جیسی رعایتوں سے پاک ہے —" ان الفاظ میں شاعر اعظم نے ان کے اسلوب نگارشی اور اس کی خوبیوں کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں ہی ان کا انداز تحریر ترقی کر کے اس منزل پر پہونچ گیا تھا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اب بھی جو کچھ لکھتے یا کہتے ہیں، اس میں بھی نحوی بدستور قائم ہے۔ آسان لکھنا مشکل ہے اور آسان اور مؤثر انداز میں لکھنا اور بھی دشوار ہے، خاص کر جبکہ فلسفیانہ مسائل پر مؤثر انداز میں لکھنا ہو۔ لیکن ڈاکٹر رادھا کرشنن اس میدان میں بھی نمایاں طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسی کامیابی حاصل کرنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اُلجھے ہوئے مسائل اور انتہائی دقیق موضوعات سے متعلق اُن کی تحریروں میں بھی ایک ادبی سحر انگیزی پائی جاتی ہے جس سے ہم مبہوت ہو کر

رہ جاتے ہیں۔ ان کے اکثر جملے مدتوں ہمارے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں اور اپنے "اثر و نفوذ کے باعث ہمارے دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "مذہب کا مقصد معرفت حق ہے۔" "مذہب عقلی بنیادوں پر زندگی گزارنے کا دوسرا نام ہے۔" "فکر متوازن کامیاب عمل اور صحیح سماجی اداروں کے ذریعہ مذہب کا اظہار ہونا چاہیئے۔" "سچے دل سے ہی خدا کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔" اور "سچائی کو پہچاننے کے لئے علم کی ضرورت نہیں بلکہ پیار کا دل چاہیئے۔" فلسفہ اور مذہب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی ان کی تحریریں ایسے ہی اثر و نفوذ کی حامل ہیں جیسے ان کے اس قول میں کسی اضافے کی کیا گنجائش ہے: "آمریت ایک لوگوں کا ہتھیار ہے۔" یا "حقیقی جمہوریت وہ ہے جس میں انسانی عظمت کی قدر کی جاتی ہے۔" انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ اپنے موضوع اور بیان کے اعتبار سے کلاسیکی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

Indian Philosophy, An Idealist View of Life,
Religion of Religion in Contemporary Philosophy,
Gautama the Buddha, Religion & Society.

یہ سب کتابیں ہر لائبریری کی زینت ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے لوگوں کی تخلیقی قوت کی نشوونما کے پس پشت وجدانی لطیفیت کا سراغ لگانا مشکل ہوتا ہے۔

بہر حال آپ کے دل کے اندرونی گوشوں سے جو چند کنی باتیں باہر آپائی ہیں ان سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ "مظاہر کے پس پشت ایک ان دیکھی دنیا" پر ان کا مستقل ایمان ہے جس کو دیکھنے سے زیادہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جو ذہن کے مقابلہ میں دل کی آنکھ سے زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ انتہائی عقلیت پسند فلسفیوں میں شامل ہیں لیکن تصوف کا ایک باریک ان دیکھا پردہ ان کے فلسفہ کے پورے تانے بانے پر چھایا ہوا ہے کیونکہ اس کی بنیاد ادراک بالقلب پر قائم ہے۔ ان کی ذات میں ہمیں ایک جعفری سے زیادہ اپنشد کے روشن ضمیر کی صفات ملتی ہیں گو وہ کسی بڑے سے بڑے جعفری سے کم نہیں۔

انھیں اپنی زندگی میں مشکلوں، آزمائشوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ایک غیبی قوت پر ان کا ہمیشہ بھروسہ رہا جس نے ان کی مدد کی۔ یہی غیبی قوت انسانوں اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتی ہے۔ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے وہ جلد ہی آکسفورڈ اور بنارس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے۔ اس کے بعد انھوں نے یونیورسٹی تعلیم سے متعلق کمیشن کی صدارت کی اب ان کی شہرت دور دور تک پہونچ چکی تھی۔ ہمارے وزیر اعظم نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے انھیں روس میں ہندوستانی سفیر کے عہدے کے لئے منتخب کر لیا۔ سفیر کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جو مارشل اسٹالین سے براہ راست بات چیت کر سکتے تھے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد وہ دس سال تک نائب صدر کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ راجیہ سبھا کے چیئرمین کی حیثیت سے وہ اس کا کام نہایت ہوشیاری، حاضر جوابی، مزاح اور چابکدستی کے ساتھ انجام دیتے رہے جس کے باعث انھیں کبھی "رولنگ" دینے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اسی زمانے میں آپ مختلف ممالک کے دورے پر بھی گئے، جہاں آپ نے انتہائی لیاقت اور دانشمندی کے ساتھ ہندوستان کا نقطۂ نظر پیش کیا جس سے مخالف ذہن بھی قائل ہو گئے۔ لیکن ان مصروفیات کے باوجود ان کے مطالعہ اور تصنیف کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ پڑی۔ انھوں نے ہندوؤں کی کتب مقدسہ کی تشریح مکمل کی۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔ "میری اصلی زندگی تو یہی ہے، باقی سب کچھ جھاگ کی طرح ہے۔" انہی کے ایما سے ہارورڈ یونیورسٹی نے دنیا کے مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک عجیب و غریب ادارہ قائم کیا جہاں تمام مذاہب کے لوگ مشترکہ زندگی گزارتے ہیں۔

اب ڈاکٹر رادھا کرشنن کو ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں نے بھاری کثرت رائے سے صدر منتخب کیا ہے۔ کل ۴۰۹ ممبروں نے انتخاب میں حصہ لیا۔ ان میں سے

۲۹۳۰ نے ان کے حق میں رائے دی۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کی عمر اب ستر سال سے زیادہ ہو گئی ہے مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ وہ سیدھے اور تیز چلتے ہیں۔ ایک لمبا کوٹ پہنتے ہیں۔ وہ شرافت اور وقار کی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے پُر رونق چہرے پر ہلکی مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ ان کے سر پر ایک سفید صافہ ہوتا ہے جس کے نیچے وہ دماغ ہے جو کسی حد بندی اور رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا اور آزادی کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔ اور انسانی زندگی کی حقیقت اور انسانی دل چسپی کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ جہاں کہیں جاتے ہیں، وسیع علم اور دانش مندی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ فطرتِ انسانی کی تمام اعلیٰ و افضل باتوں کے دل دادہ ہیں اور نجی، چھوٹی اور رکیک باتوں سے متنفر۔

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ جو شخص ایسی عظیم کتابوں کا مصنف ہے اور جس کے کندھوں پر حکومت کی اتنی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ ہے وہ اتنی سیدھی سادی زندگی گزارتا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن بہت ہی سادہ انسان ہیں۔ وہ صبح چھ بجے اُٹھ جاتے ہیں۔ روزانہ صبح کو آل انڈیا ریڈیو کا 'ونڈا' پروگرام سنتے ہیں جس میں ملک کے تمام علاقوں کے بھجنی گیت سنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ رات کے نو بجے خبریں سننا کبھی نہیں بھولتے۔

وہ دن بھر ملاقاتیوں، سرکاری کاموں اور کانفرنسوں میں مصروف رہتے ہیں، بس رات کو نو بجے کے بعد انھیں پڑھنے لکھنے اور غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پھر رات کے گیارہ بجے وہ سو جاتے ہیں۔ ان کا کھانا بہت سادہ ہوتا ہے یعنی چند چمچے چاول، دو تین ٹوسٹ، بسکٹ، ترکاریوں کا شوربہ، پھل اور کافی۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا سرکاری خرچ بہت معمولی ہے۔ قانونی اور رسمی طور پر انھیں بتیس سیکڑ بڑی اور دوسرا الاؤنس رکھنے کا اختیار حاصل ہے اتنا خرچ انھوں نے کبھی نہیں رکھا۔ کسی نے اُن سے پوچھا کہ جب آپ ملک سے باہر جاتے ہیں تو اپنے بڑھاپے کے پیشِ نظر سیکرٹریوں اور خدمت گاروں کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے۔ انھوں نے اس کا جواب دیا۔ "ہم لوگ زیادہ شور مچاتے ہیں۔ مجھ جیسے لوگ جہاں بھی جاتے ہیں ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے، خواہ یہ ماسکو ہو یا پیرس، لندن ہو یا واشنگٹن۔"

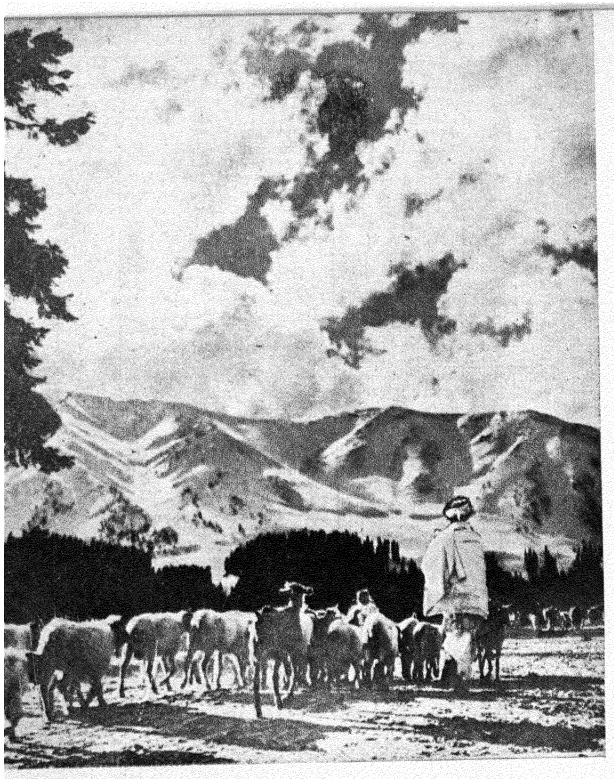
صدر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ان کے نزدیک جو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوں گی ان کا اندازہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی اس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے اسمبلی کو پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے پہلی رسمی طور پر کی تھی۔ اس وقت تک ان کے انتخاب کا بھی باقاعدہ اعلان کیا جا چکا تھا۔ انھوں نے جمہوریت کی بہت دل چسپ تعریف پیش کی تھی — "ہو سکتا ہے کہ دوسرا آدمی زیادہ اچھا اور زیادہ صحیح ہو۔ ایک سچے جمہوریت پسند کا یہی نقطۂ نظر ہونا چاہیئے۔ اس نقطۂ نظر سے انکساری، قوتِ برداشت اور صبر و استقلال پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔" انھوں نے کہا کہ "ہندوستان میں ساری برائیاں غریبی، اور اقتصادی و سماجی زندگی میں یکساں مواقع کی عدم موجودگی سے پیدا ہوئی ہیں۔" انھوں نے بتایا "ہم ایک عظیم کلچر کے وارث ہیں، لیکن ہمیں نئے زمانے کے ساتھ چلنا چاہیئے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کا چیلنج قبول کرنا چاہیئے۔ البتہ ہم اپنی روحانیت کا رشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیں جو ہمارے کلچر میں سب سے زیادہ دیرپا ہے۔"

---

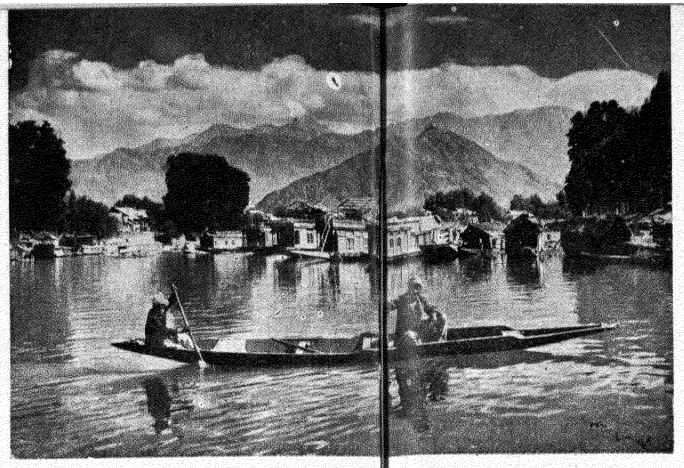


صدرِ جمہوریۂ ہند ڈاکٹر سرو پلّی رادھا کرشنن

# برسات کی بہاریں



گھر کی اُور



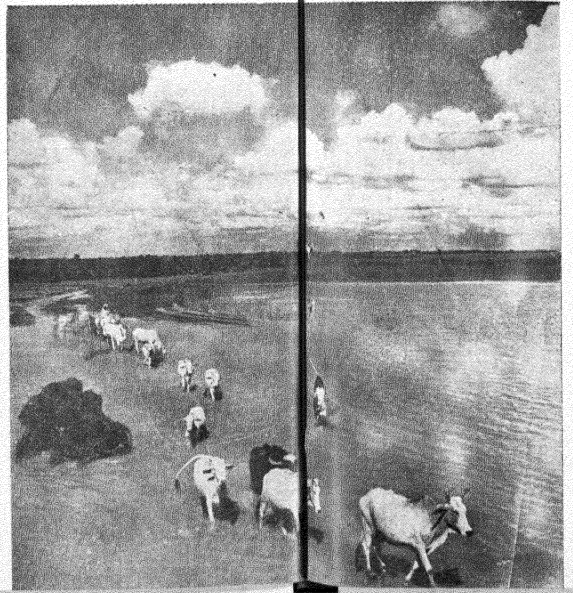
خاموش فضا



بمبئی میں برسات

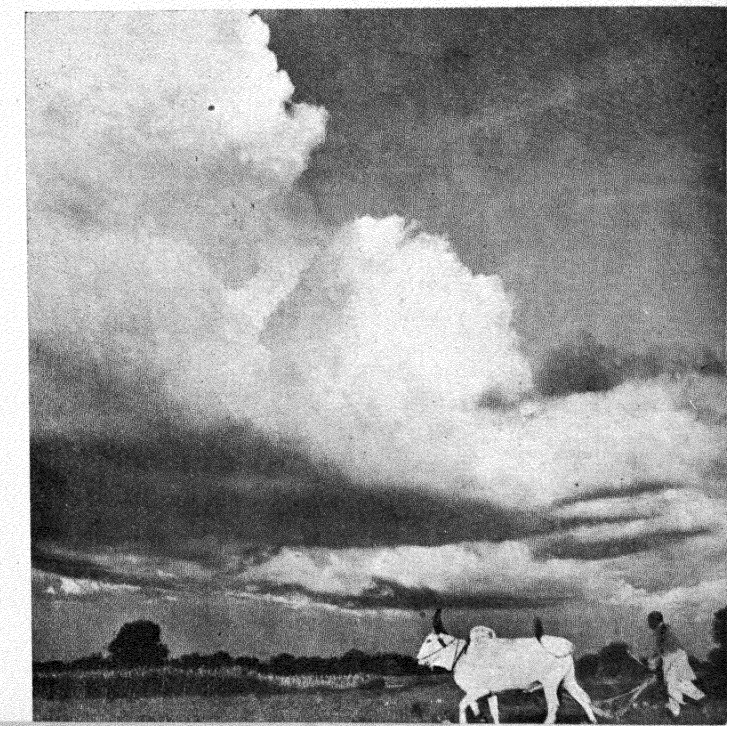


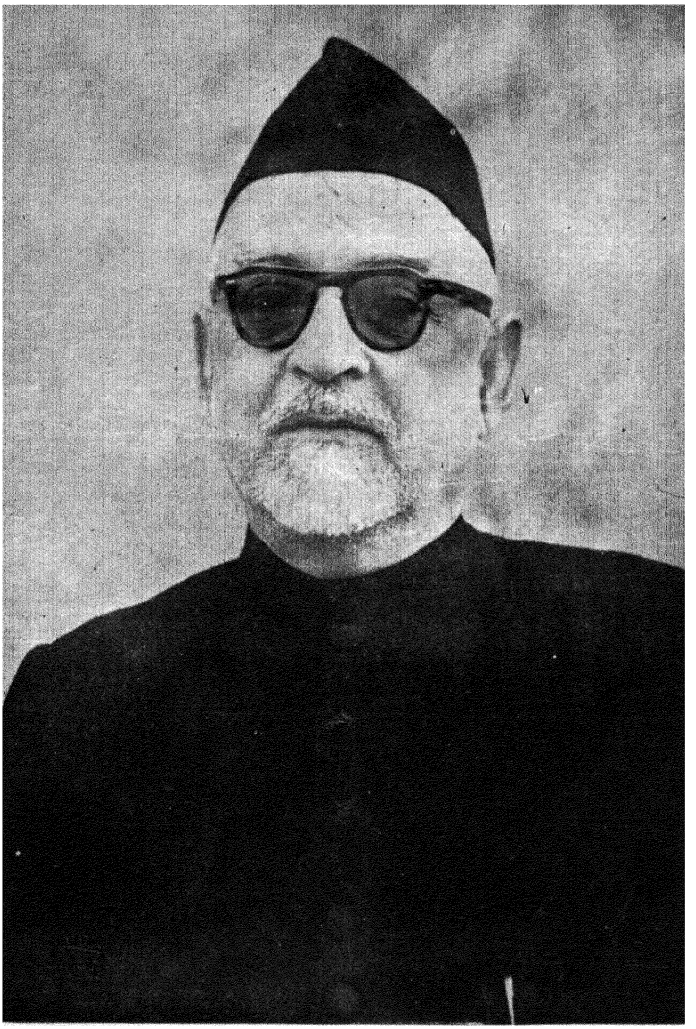
امنڈتے بادل



جل تھل

گھنگھور گھٹا





نائب صدرِ جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین

# ڈاکٹر ذاکر حسین

## ہمارے نائب صدر جمہوریہ

۱۹۲۵ء میں جب میں غازی آباد آیا تو میرے مقابل مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل کا مکان تھا۔ جو یوں تو منظم بھی کہتے تھے اور مولانا حالی سے اصلاح بھی لی تھی مگر ان کا اصل میدان نثر تھا۔ جب کوئی مضمون لکھتے تو رسالہ میں بھیجنے سے پہلے مجھے بلا کر سناتے۔ کبھی میرا ان سے اتفاق ہوتا کبھی اختلاف، رفتہ رفتہ ربط ضبط بڑھتا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں جب میں جیل سے رہا ہو کر آیا تو ایک روز ایک مضمون سنانے کے بعد وہ کہنے لگے — چلئے ذاکر صاحب سے ایک روز آپ کی ملاقات کرا لائیں۔

میں نے ذاکر صاحب کو ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ کے چلے میں سنتا تھا مگر ان سے تعارف نہ تھا۔ یحییٰ تنہا صاحب کی تجویز پر خوشی خوشی اور دوسرے یا تیسرے دن ذاکر صاحب سے ملنے ہم دونوں غازی آباد سے دلی آئے۔ میرے ذہن میں ذاکر صاحب کے گھرانے کا جو تصور تھا اس سے بالکل مختلف پایا۔ وہ ایک چٹائی پر بیٹھے تھے۔ سامنے ایک ڈسک پر قلم، دوات کاغذ اور چند فائلیں تھیں پاس ہی ایک حقہ بھی رکھی تھی۔ میں اس سادگی پر مرا تو نہیں لیکن مرعوب ضرور ہوا۔ پانچ سال پہلے میں نے ذاکر صاحب کی جو تقریر سنی تھی وہ کچھ اتنی سی تھی۔ کیوں کہ اس زمانے تک لاؤڈ اسپیکر رائج نہ ہوا تھا۔ ایک تو ذاکر صاحب کی آواز میں باوجود بھاری ہونے کے بھاری پن کے مقابلہ میں لکھنویت زیادہ ہے، دوسرے اس زمانے تک شروع کے جلسے کے باہر دلی میں مجھ سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ اس لئے بیٹھنے کی جگہ ایسی ملی جو سنیما گھروں کی نشستوں کے اعتبار سے باوقار اور جلسہ گاہوں کی نشستوں کے لحاظ سے بے وقار تھی۔ بہرحال اس وقت میں نے ذاکر صاحب کا دھیما سا لہجہ دیکھا اور ہلکی سی آواز سنی۔ انہیں قریب سے دیکھنے اور بات کرنے کا موقع تنہا صاحب کی معیت میں حاصل ہوا۔ میں ان کے چند جملوں سے ہی مرعوب ہو گیا۔ جب انھوں نے تنہا صاحب سے میرے متعلق یہ سنا کہ یہ ستیہ گرہ کی تحریک میں تین دفعہ جیل جا چکے ہیں تو انھوں نے جیل کے ساتھیوں کے بارے میں میرے تاثرات پوچھے۔ میں نے جو کچھ کہا انھوں نے غور سے سنا اور تائید بھی کی۔ تفصیل سے نہ تو لکھنے کی گنجائش ہے اور نہ مصلحت لیکن میں یہ خیال لے کر آیا تھا جو بیتیس بتیس سال بعد آج بھی قائم ہے کہ ہنگامی حالات کے مقابلے میں تعمیری کاموں میں جان کھپانا زیادہ مشکل ہے ؎

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ذاکر صاحب انھیں خاموش قربانی کرنے والوں میں سے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر جب جرمنی گئے تو وہاں سے معاشیات کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے۔ یہاں جامعہ عثمانیہ میں انھیں چھ سو روپے کی جگہ مل رہی تھی اُسے قبول نہ کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

میں تین سو روپے مہینے پر کام کرنے لگے۔ جامعہ کی آمدنی کم ہوئی تو تنخواہ تین سو سے دو سو کر لی اور کم ہوئی تو دو سو سے ڈیڑھ سو پھر سوا اور پھر پھر تو روپے مہینے پر لیسر کرنے لگے۔ اقتصادی یا معاشی اعتبار سے یہ ترقی معکوس تھی لیکن اخلاقی اعتبار سے یہ سونا کندن بن رہا تھا

سے می نگرد و سنیرہ تا درخم نیوشد آنرا کے
خواہی دانت روشن شود از تک عمل باید ترا

اس جوش میں بعض ظرف سے باہر آجاتے ہیں لیکن ذاکر صاحب ایسے نہیں ہیں۔ یہ جوش جو ابال کر نم کے باہر کر دیتا ہے اکثر لوگوں میں پایا جاتا ہے جو اپنی قربانی یا ایثار کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں لیکن جس نے اُسے زندگی کا جزو لاینفک قرار دے لیا ہو وہ کس بات پر ناز کرے گا

خویشاں چاکی عشاق از ذوق فنا باشد
الف در سینۂ گندم ز شوق آسیا باشد

یہ بات سینۂ ذاکر صاحب میں بھی ہے۔ ان کے نالے کے پابند ہے یا آزاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ وہ نالہ کرتے ہی نہیں اُن میں ذاکریت کم ہے حسینیت زیادہ۔

ذاکر صاحب کا وطن فرخ آباد کا قصبہ قائم گنج ہے۔ آفریدی پٹھانوں کا ایک خاندان اس قصبہ میں آ بسا تھا۔ یہ کوئی دو سو برس کی بات ہے۔ پچھلی صدی میں اسی خاندان میں علام حسین خاں صاحب ہوئے جو ذاکر صاحب کے دادا تھے اور ایک یا ہمت بیٹا ہی ہونے سے ساتھ ساتھ فقر و دولت بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کا مکان بن رہا تھا تو کسی مزدور کو کامل یا بے عمل دیکھ کر انھوں نے سخت گیری کی۔ اس نے ان کے مرشد سے فریاد کی۔ جب یہ مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے حکم دیا کہ مقبرا جاکر فلاں سادھو سے ملو تمھاری یہ خطا صاف ہو جائے گی یہ مقبرا پہنچے اُس ہستی سے ملے اور اشیرواد لے کر واپس آئے۔ ان کے مرشد کی یہ دعا تھی کہ تمھارا یہ مکان بابرکت ثابت ہوگا اور تم پھلو پھولو گے کاش وہ آج اس عالم آب و گل میں ہوتے اور یہ دیکھتے کہ اُن کا پوتا نائب صدر جمہوریۂ ہند ہو گیا ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ

فرخ بالا کمن کہ اورنگ زیبی ہنرے

غلام حسین خاں صاحب کے دو صاحبزادے تھے۔ علما حسین خاں اور فدا حسین خاں۔ چونکہ مورثِ اعلیٰ حسین خاں صاحب تھے اس لئے اس خاندان کے ہر فرد کے نام کے آخر میں حسین خاں ہوتا ہے۔ یہی فدا حسین خاں ذاکر صاحب کے والد ماجد تھے جو قائم گنج سے گئے تو تھے حیدرآباد اپنے بھائی کے ساتھ تجارت کرنے، لیکن وہاں کے ادبی ماحول میں تعلیم کا شوق ہوا۔ وکالت پاس کی اور وہیں وکالت کرنے لگے۔ ایک کوٹھی حیدرآباد میں بنوائی اور ایک اپنے وطن قائم گنج میں۔ وہیں حیدرآباد میں ۱۸۹۷ء میں ذاکر صاحب کا جنم ہوا۔

ابھی ذاکر صاحب کی تعلیم شروع ہی ہوئی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کا خاندان قائم گنج واپس آ گیا۔ مڈل تک تعلیم یہیں حاصل کی۔ پھر اٹاوہ کے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

یہ سات بھائی تھے۔ سب ذہین، سب ادبی ماحول میں پلے۔ بڑے بھائی مظفر حسین خاں کا عین عالم جوانی میں انتقال ہو گیا۔ یہ سب سے بڑے تھے۔ ذاکر صاحب سے بڑے عابد حسین خاں تھے اور زاہد حسین خاں جو ذاکر صاحب کے بعد پیدا ہوئے۔ یہ بھی جوانی میں ہی گزر گئے۔ جعفر حسین خاں بچپن میں ہی چل بسے۔ اب یہ تین بھائی ہیں۔ سب سے بڑے ذاکر صاحب ان سے چھوٹے یوسف حسین خاں جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر رہے اور آج کل علی گڑھ یونیورسٹی میں پروائس چانسلر ہیں اور سب سے چھوٹے محمود حسین خاں جو جامعہ کراچی میں پروفیسر ہیں۔

جب جنگ تری کی دیلنان شروع ہوئی تو ذاکر صاحب اٹاوہ ہائی اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ انھوں نے ترکوں کی امداد کے لئے چندہ کیا بلکہ چندہ کو معمول بنا لیا۔ ہر ہفتہ جلسہ کرتے ٹوپی کو جھولی بنا کر چندہ جمع کرتے اور قریب کے ڈاک خانہ سے رقم روانہ کر دیتے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مسجدوں میں تقریریں بھی کی۔ یوں تو پندرہ سال کی عمر میں تقریر کرنا اب کوئی بڑی بات نہیں لیکن ان میں سے بیشتر تقریریں روٹی یا ماسٹروں کی رٹائی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن اب سے پچاس برس پہلے پندرہ سال کی عمر کے لڑکے کا مسجد میں برجستہ تقریر کرنا حیرت انگیز تھا۔ اس کی دوسری مثال صرف مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات میں ملتی ہے۔

۱۹۱۳ء میں ذاکر صاحب ایم ۔ اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں ایم ۔ اے پاس کرکے ۱۹۲۰ء میں جرمنی چلے گئے۔ ایم ۔ اے او کالج نے ان کی تعلیم ختم ہوتے ہوتے مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلی تھی جیسے ہندو کالج سے ہندو یونیورسٹی بن گئی تھی۔ ذاکر صاحب کی اس کالج کی تعلیم کے دوران ہی پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد رانچی میں اور علی برادران چھندواڑہ میں نظر بند ہوئے۔ کانگریس لیگ معاہدہ لکھنؤ میں ہوا۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اصلاحات کا خاکہ مرتب کرنے ہندوستان آئے۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ ہندوستان میں نئی سیاسی اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ ستیہ گرہ کی تحریک چلی، پنجاب کا خونیں باب ہوا، خلافت کی تحریک چلی اور مہاتما گاندھی اور علی برادران ملک کی ترجمان کہلانے لگے۔ انھیں مولانا محمد علی نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی۔ علی گڑھ کی فضا سے راس نہ آئی آخر خواجہ عبدالمجید، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری میں خط و کتابت کے بعد یہ طے پایا کہ جامعہ کو دہلی لایا جائے۔ یہاں اس کا انتظامی بار تو حکیم اجمل خاں نے اور ان کے بعد ڈاکٹر انصاری نے اپنے کندھوں پر لیا اور انتظامات کا بار ڈاکٹر ذاکر حسین نے اٹھایا۔ اگر ان سے کم درجے کی ہمت کا آدمی ہوتا تو یہ دشواریوں سے جامعہ کو دوچار ہونا پڑا ہے، بھاگ کھڑا ہوتا۔ مگر وہاں ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو اپنی تنخواہ پتی سو سے گھٹاتے گھٹاتے پھر تر و پیر کرے۔

۱۹۳۱ء کے بعد جامعہ میں میرا آنا جانا شروع ہوگیا۔ ذاکر صاحب کے بعد ڈاکٹر عابد حسین، مولانا شفیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عبداللطیف، جناب حامد علی خاں، جناب محمود علی خاں، جناب عبدالواحد سندھی، پروفیسر عاقل، ڈاکٹر علیم، مولانا اسلم جیراج پوری، جناب شفیع الدین تیرآپا جان، جناب برکت علی، ڈاکٹر سلامت اللہ، جناب سعید انصاری، جناب غلام ربانی تاباں سبھی سے ملاقات ہوئی، اور یہ تعلق اس وقت اور بھی گہرا ہوگیا جب میرا بڑا لڑکا جامعہ میں ۱۹۳۶ء میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کیلئے داخل ہوا لیکن بنیاد ذاکر صاحب کی ملاقات سے ہی پڑی تھی۔ جب تک ذاکر صاحب اور جامعہ ملیہ قرول باغ میں رہے میرا آنا جانا زیادہ رہا۔ جب سے جامعہ کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا مینیہ اوکھلا کی عمارت میں چلا گیا، سال میں صرف چند بار کا آنا جانا رہ گیا۔ لیکن جب میں ذاکر صاحب سے ملتا تو معلوم ہوتا کہ جیسے روح کو تازگی حاصل ہوگئی ہے

خنک باد گردون دنی فجنی بہ نشستیت گاہ و دست
بہ نشینیں با عاشقان زار بودن ہم خوش است

میں ذاکر صاحب کو انھیں عاشقانِ زار میں سے سمجھتا ہوں۔ جب میرا بڑا لڑکا جامعہ کے کالج میں پڑھ رہا تھا اسی زمانے میں ذاکر صاحب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا کر بھیج دیا گیا وہی مسلم یونیورسٹی جس سے الگ ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی تھی

کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھا ہے

بات یہ ہے کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد صورت حال بالکل اور ہوگئی تھی۔ ایسے یونیورسٹی کو توڑنے کا نہیں بلکہ اسے بچانے کا سوال تھا اور اس عمل میں ذاکر صاحب سے بہتر کوئی اور انسان نہ مل سکتا تھا۔ جو ایک طرف تو طلبا کے مزاج کی اصلاح کرے دوسری طرف یونیورسٹی کی ساکھ قائم کرے۔ جب میں نے ذاکر صاحب کو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے پر مبارک باد کا خط بھیجا تو ان کا جواب آیا کہ "معلوم نہیں میرے مقدر کمند سے کہاں تک اس بار کے متحمل ہوں گے، حقیقت یہ ہے کہ اور کسی کے کمند سے اس بارِ امانت کو کھینچنے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور حکومت نے یہ قرعۂ فال ٹھیک ہی ڈالا، مگر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ان کی قوتِ تخلیق کا امتحان تھا تو مسلم یونیورسٹی میں قوتِ تعمیر کا اور قوتِ تخلیق کا امتحان تو دونوں ہی جگہ تھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک ملک میں اور علی گڑھ میں جو کچھ ہوا اس کا ردِ عمل بھلا ذاکر صاحب کے علاوہ کون کرسکتا تھا۔ ان کی روشنیٔ طبع ان کے لئے چاہے بلا ہو مگر دوسروں کے لئے رحمت ہی ہوتی ہے۔ جامعہ ملیہ پر بھی یہی صادق آتا تھا اور مسلم یونیورسٹی پر بھی کہ

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

مجھ سے مسلم یونیورسٹی کی سینٹ کے ایک بڑے باوقار ممبر کہتے تھے کہ ذاکر صاحب کے دور میں یونیورسٹی میں جمہوری دور بالکل

ختم ہوگیا ہے۔ وہ اپنی طرف سے ہمیں بحث کا پورا موقع دیتے ہیں لیکن ہم سب پر اللہ کا جادو کچھ ایسا چل گیا ہے کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہم لوگ ان کی عقل و بصیرت سے اتنے مرعوب ہو گئے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی بات سمجھ میں آجاتی ہے اور آمنا و صدقنا کہہ کر اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ خارجی اور داخلی حالات نے جو کچھ اثر ڈالا تھا ذاکر صاحب نے اس کو زائل کر کے نیا ماحول پیدا کیا۔ خزاں رسیدہ چمن میں پھر بہار آئی

دشت از و پُر سبزہ و دامن پُر از گوہر شدہ

۱۹۵۶ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر ذاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا مگر فلک کی گردش اگر اتنی تو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی اور اگر سیدھی تو بھی۔ یعنی جس طرح مولانا شفیق الرحمٰن قدوائی کو بلا درخواست قدرے جبری طور پر وزیر بنا دیا گیا تھا اسی طرح

آنچہ بہ تقدیر ہم می رسد
ورنہ تو سستی نمی رسد

کے مصداق ذاکر صاحب کو بہار کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس مدت میں چند بار راشٹرپتی بھون میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا کیونکہ وہ گورنروں کی کانفرنس میں تشریف لاتے تھے۔ مگر ایک بار جامعہ کے جلسے میں تھوڑے وقت کلکتی سے بات ہوئی قاعدے کی رُو سے ان کی نشست راشٹرپتی کے برابر رکھی گئی تھی لیکن وہ چیف گسٹ وہاں بیٹھ کر ہم لوگوں میں آبیٹھے۔ ہر ایک سے اس کا حال پوچھا۔ اور کچھ مناسب ہوا تو گفتگو کی۔ میرے بڑے لڑکے کا حال پوچھا جو اُن کا طالب علم رہ چکا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ذاکر صاحب کو کہیں بٹھا دیجئے مگر وہ ذاکر صاحب ہی رہیں گے۔ یہ اس دور میں بڑی بات ہے جب

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اب ذاکر صاحب گورنر سے آپ راشٹرپتی یعنی نائب صدر جمہوریہ بلند ہو گئے ہیں۔ اب بھی وہ ذاکر صاحب ہی رہیں گے۔ عام طور پر وہ سخت باتیں نہیں کہتے مگر جامعہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ۱۹۴۶ء میں انھوں نے فرمایا:

"استاد میں اہل قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حکمران جبر کرتے ہیں اور یہ صبر کرتا ہے۔ وہ مجبور کر کے ایک راہ پر چلاتے ہیں یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے۔ ایک کے وسائل میں تشدد اور زبردستی ہے دوسرے کے محبت اور خدمت۔ ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے دوسرے کا شوق سے۔ ایک حکم دیتا ہے دوسرا مشورہ۔ وہ غلام بناتا ہے یہ ساتھی۔"

قدرت کا عجیب کھیل ہے کہ ذاکر صاحب معلموں کی صف سے حکمرانوں کی صف میں آگئے ہیں

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بہ کجا

ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک سیاسی ایوان میں سیاست دانوں کے معلم ہو کر بیٹھیں گے کیوں کہ آپ راشٹرپتی راجیہ سبھا کا صدر بھی ہوتا ہے۔

بنیادی طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب معلم ہیں اس لئے ان سے ذرا سنجھل کر بات کرنی چاہیئے۔ ایک بار وہ ڈاکٹر شراف کے سپتال میں گئے جہاں وہ آنکھ کے علاج کے لئے آئے تھے۔ میں بھی اسی تعویذ میں گیا تھا۔ میں نے پوچھا،

"آپ کی آنکھوں کا کیا حال ہے؟"

فرمایا — "اچھا ہے۔"

میں نے پھر دریافت کیا کہ "پھر آپ یہاں کیسے تشریف لائے ہیں؟"

جواب دیا — "اچھا" تو نسبتی لفظ ہے۔"

میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔

ایک بار جامعہ کے میلے میں ملاقات ہوئی۔ میں نے چلتے چلتے

ان سے عرض کیا

"اگر آپ کے پاس وقت ہو تو کچھ عرض کروں۔"

فرمایا — "وقت تو نہیں ہے مگر فرمائیے۔"

بھلا اس "مگر" کے بعد عرض کرنے کی جرأت کسے تھی۔

میں نے ذاکر صاحب کو بچوں میں بھی بولتے سنا ہے اور عالموں کے جلسوں میں بھی، ہر جگہ ان کی تقریر مناسب حال ہوتی ہے۔ ایک بار قرول باغ میں جامعہ کے جلسہ میں وہ تقریر کر رہے تھے ایک بدخط لڑکے کی کاپی اُٹھا کر کہنے لگے — "یہ آپ کا لکھا ہے۔ جب آپ بڑے ہوں گے تب آپ کی شادی ہوگی۔ پھر آپ کے لڑکے ہوں گے، پوتے ہوں گے اور وہ اس بات پر ہنسیں گے کہ ہمارے باپ یا دادا ایسا لکھا کرتے تھے۔"

مجھے ٹھیک ٹھیک الفاظ یاد نہیں مگر کچھ اسی طرح کی بات تھی۔ بچے اسی شوق سے ان کی تقریر سنتے تھے جیسے کوئی کہانی سُن رہے ہیں۔ میں نے ذاکر صاحب کے کئی مضامین اور مقالے پڑھے ہیں لیکن بچوں کے لئے لکھی ہوئی کہانی "الّو خاں کی بکری" کا تیر دل پر پڑا اثر پڑا ہے۔ میں نے بچوں کو ستیہ گرہ کی تحریک ذہن نشین کرانے والی اس سے بہتر کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ ریڈیو پر میں نے ذاکر صاحب کی جو تقریریں سنیں ان میں سے حضرت حسینؓ اور ہندوستانی زبان کے متعلق تقریریں میرے لئے بڑی بصیرت افروز تھیں۔ فلاں کی کتاب کا ترجمہ ذاکر صاحب نے کیا ہے وہ اس شان کا ہے کہ ترجمہ بالکل نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے مختلف یونی ورسٹیوں میں جو خطبات پڑھے ہیں وہ اگر لکھ کر کے شائع کئے جائیں تو بڑی مفید کتاب بن سکتی ہے۔ ہندوستان کے ایک معلّم کا اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ ذاکر صاحب معلّموں کی بین الاقوامی کانفرنس کے صدر رہ چکے ہیں۔ ہمانتا گاندھی نے جب ہندوستان کے انہاب تعلیم میں تبدیلی کرنی چاہی تو ایک کمیٹی مقرر کی جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین اور ممبروں میں آچاریہ نرینجن دیو، کاکا کالیلکر، خواجہ غلام السیدین اور مسٹر شری آریہ نائکم تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس رپورٹ پر عمل درآمد کہاں تک ہوا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس رپورٹ نے ہمارے طریقۂ تعلیم میں انقلابی تبدیلی تجویز کی۔ ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے ذاکر صاحب یونیسکو کے بھی ایک ممتاز رکن رہ چکے ہیں۔ ایک بار پانچ تقریریں میں نے فرمایا کہ کوئی ایک صاحب تھے (افسوس نے نہ نام لیا نہ یہ بتایا کہ وہ کس ملک کے نمایندے تھے) جو ہر موضوع پر بولنا چاہتے تھے اور ان کی تقریر نہ ہماری سمجھ میں آتی نہ سامعین کے، اور رپورٹر بیچارے تو ان کے کھڑے ہوتے ہی سہم جاتے تھے۔

۱۹۴۱ء کی بات ہے کہ جناب رما جیدرنا تھ شیدا لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کر کے آئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اردو کے کسی موضوع پر ڈاکٹریٹ حاصل کریں۔ اس سلسلے میں وہ میرے ساتھ بعض چند اصحاب سے ملے اُن میں ذاکر صاحب بھی تھے۔ جب میں ذاکر صاحب کے دروازے پر پہنچا تو ایک ٹاٹ کا پردہ ٹنگا ہوا تھا۔ جس کا نچلا حصّہ ہوا کی شدّت سے کچھ مجروح بھی ہو چکا تھا۔ دیوار کی اینٹوں پر استر کاری بالکل نہ تھی۔ شیدا صاحب کو تعجب ہوا کہ یہی ذاکر صاحب کا مکان ہے۔ میں نے کہا۔ جی ہاں یہی ہے۔ میں نے دستک دی تو ذاکر صاحب نے اندر بلا لیا۔ دیکھا تو ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور سامنے کی چارپائی پر ایک بکرا اطمینان سے بیٹھا ہوا ہم خدوخال کے عالم میں ہے۔ معلوم نہیں سگ اصحاب کہف کی طرح اس میں انسانیت کہاں تک آئی تھی مگر میں نے اس منظر کو دیکھ کر قدرے تعجب کا اظہار کیا تو فرمایا کہ

"جی ہاں آج کل اور لوگ تو گھر میں ہیں نہیں یہی ساتھی ہیں۔"

شیدا صاحب نے جب عرض مطلب کیا تو ذاکر صاحب بولے "میں اردو کا ماہر نہیں ہوں۔ اس بارے میں تو ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے بات کیجئے۔"

ہم لوگوں کے اصرار کرنے پر انھوں نے اردو الفاظ کے مادہ کی تحقیق کا موضوع بتایا

ذاکر صاحب جیسے مشغول انسان بہت کم ہوں گے مگر پھر بھی وہ مطالعہ کا وقت نکال لیتے ہیں۔ انھیں صرف ادب سے ہی دلچسپی نہیں ہے بلکہ تصویروں اور پکے گانے سے بھی۔ میں نے ذاکر صاحب کو کئی مشاعروں میں دیکھا ہے۔ ان کے داد دینے کا

طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی اچھا شعر پڑھا جاتا ہے تو شاعر کی طرف آنکھ پھیر کر دیکھتے ہیں۔ اور اگر شعر بہت اچھا ہو تو گھورنے لگتے ہیں۔ جگر کے غزل پڑھتے وقت میں نے اکثر ان کی یہ کیفیت دیکھی ہے۔ ایک بار شعراء کی ایک ٹولی جامعہ نگر سے اوکھلا جانے لگی تو میری درخواست پر جگر صاحب بھی جانے کو تیار ہوئے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ انھیں نہ لے جانا چاہئے مگر اکثریت کی رائے یہی ہوئی کہ جگر صاحب کو لے جایا جائے۔ آخر جگر صاحب گئے اور ہم لوگوں کو ذاکر صاحب کی بات کی حقیقت کا اس وقت اعتراف کرنا پڑا جب وہاں پہنچ کر ہم لوگ تو دریا کی روانی کا لطف لینے لگے اور جگر صاحب نے شان بے اعتنائی سے فرمایا

"یہاں دیکھنے کی بات کیا ہے؟"

ذاکر صاحب میں کچھ اس طرح کی عجیب باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو گاندھی جی یا دنیا کے اور بڑے انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً مکان میں قفل لگا ہوا ہے اور ذاکر صاحب اس میں بند ہیں۔ باہر سے ایک صاحب رپورٹ سنا رہے ہیں اور ذاکر صاحب ایک چھوٹے سے سن رہے ہیں اور نوٹ لے رہے ہیں۔

کبھی کبھی ذاکر صاحب کو بھی اچھے جواب دینے والے مل جاتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے ذاکر صاحب اکثر یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ آپ بھی داڑھی رکھئے۔ عابد صاحب ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ آخر جب ذاکر صاحب نے زیادہ اصرار کیا تو عابد صاحب نے پوچھا کہ آپ اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے کچھ ایسی بات کہی کہ

آپ جمالیات کے ماہر ہیں۔ تنوع میں ہی تو لطف زندگی ہے۔ کبھی گل مچھے رکھ لئے، کبھی فرنچ کٹ داڑھی رکھ لی کبھی آدھی مونچھیں رکھیں، کبھی پوری، جب تو کچھ بات ہے۔ یہ کیا کہ چہرہ صفاچٹ، نہ داڑھی نہ مونچھ۔ اس یکسانی میں کیا لطف ہے۔ عابد صاحب نے عربی میں جواب دیا۔ جس کے الفاظ مجھے یاد نہیں لیکن ترجمہ یہ ہے کہ حق کا راستہ ایک ہے اور باطل کے مختلف۔

ذاکر صاحب اس جواب باصواب سے لاجواب ہوگئے۔

کبھی کبھی ذاکر صاحب کو غصہ بھی آجاتا ہے۔ جامعہ میں کچھ لوگوں نے جو ذاکر صاحب سے بے تکلف تھے اس جانب توجہ دلائی تو فرمایا

"آپ جانتے نہیں میں نسل سے آفریدی پٹھان ہوں۔"

ذاکر صاحب کی زندگی جس طرح علمیت سے پُر ہے اسی طرح لطیفوں سے بھی۔ مگر اس مختصر سے مضمون میں صرف چند جھلکیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ذاکر صاحب یوں تو صاحب نظر اور صاحب دل ہیں لیکن ان کی آنکھوں میں بھی تطہیر رہی ہے اور دل کی بھی۔ شاید اس دنیا کے ہولناک مناظر کسی صاحب نظر کی نظر کو اور بے تکے واقعات کسی اہل دل کے دل کو معمول پر نہ رہنے دیں گے۔

---

## ضروری گزارش

۱۔ مضمون، صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھا ہوا ہونا چاہئے۔

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جب ان کے ہمراہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے۔

محبوب اللہ مجیب

# مغلوں کا سامانِ آرائش

کسی مخصوص تمدن کا تصور کرتے ہی ذہن میں اس کے سارے اجزا ابھرنے لگتے ہیں اور خصوصاً وہ تمدن اور کلچر جو مغلوں کا مرہونِ منت ہے اور جس کا خاکہ ذہن میں تیار ہوتے ہی ہزاروں طرح کے خیال آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں، کیوں کہ کسی قوم کا مخصوص کلچر ہی دوسری قوم سے تفریق کا باعث بنتا ہے۔ یہاں تک کہ مغل قوم اور عرب قوم میں بھی یہی ایک چیز تفریق کا باعث بنتی ہے۔ اور اس میں بھی تفریق در تفریق ہے، کیوں کہ ہر قوم مختلف طبقوں میں تقسیم ہے اور ہر طبقے کا ایک مختلف اور مخصوص لباس ہے۔ مغول طبقے کا جو طرزِ پوشاک ہے وہ متوسط اور نچلے طبقے سے بالکل الگ ہوگا۔ اس طرح یہ تفریق در تفریق کا سلسلہ سماج کے اوپری ڈھانچے سے لے کر بالکل نیچے تک پھیلا ہوا ہے۔

سرِدست مغل تمدن زیرِ بحث ہے۔ لہٰذا ہمیں مغل تمدن کا جائزہ لینے سے پہلے پس منظر کے ان عوامل کا بھی خیال رکھنا ہے جس نے اس تمدن کی پشت پناہی کی ہے کیوں کہ اس کلچر کے پسِ پشت ایک بڑی روایت ہے اور وہ روایت مغلوں کی اپنی روایت ہے، دوسرے معنوں میں جسے ہم ایرانی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جوں ہی اس مخصوص کلچر، تہذیب و تمدن کے علمبرداروں نے اپنے وطن کو الوداع کہا اور دوسرے ملکوں پر جہاں بانی کی غرض سے مسلط ہوئے۔ وہاں رہ کر انھوں نے اس ملک کو کچھ اپنی چیزیں دیں اور ان سے کچھ نئی چیزیں لیں۔ یہ چیز خصوصاً مغل تہذیب کے ساتھ زیادہ رہی۔ اس تہذیب کے ہر پہلو نے دوسری تہذیب سے ہمیشہ اثر دیں بوقلموں اور رکھا فن تعمیرات ہو کہ فنِ موسیقی اور ادب ہو کہ فن مصوری۔ ہر طور انھوں نے فنونِ لطیفہ کے ہر پہلو کو متاثر کیا اور اس سے متاثر ہوئے۔

یہ سرسری جائزہ تو خارجی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اب ہم داخلی زندگی کی طرف آتے ہیں۔ داخلی زندگی میں طرزِ رہائش اور طرزِ لباس آتا ہے۔ بابر نے سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ڈالی اور جلد ہی صدائے اجل کو لبیک کہا۔ اس کے بعد ہمایوں تخت پر بیٹھا اور اس کی ساری زندگی مشکلات میں کٹی۔ ان بادشاہوں کو اتنا موقعہ نہ مل سکا کہ یہ ہندوستانی تہذیب کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے لہٰذا یہ اس تہذیبی لین دین سے محروم رہے مگر اکبر کا زمانہ کئی حیثیتوں سے بڑا اہم ہے۔ مغلوں کا مخصوص لباس 'جامہ' تھا اور راجپوتوں کا مخصوص لباس 'تکہ چپیر' لیکن اکبر کے اختراعی ذہن نے دونوں لباسوں کو بہت قریب کر دیا اور اس سے ایک نیا لباس پیدا ہو گیا۔

مغلوں کے زمانے میں کچھ مخصوص لباس تھے جو بہت عام

تھے۔ مثلاً شاہ عبیدہ، شست خط، دوتاہی اور غدر وغیرہ۔ اس میں سے غدر کی بناوٹ بالکل تیا جیسی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ غدر کی بناوٹ تیا سے کچھ لمبائی اور چوڑائی میں مختلف تھی۔ جاڑوں کے ایام میں ایک دبیز قسم کا لباس استعمال ہوتا تھا جسے قلمی کہتے تھے۔ اس لباس سے اوور کوٹ کا پورا پورا کام لیا جاتا تھا۔ چوں کہ ملکوں کی زندگی میں نفاست کو کافی دخل تھا لہٰذا اس لباس میں بھی خاص طور سے زری کا کام ہوتا تھا۔[1]

اس سلسلے میں ایک بیسہ لباس بھی قابل ذکر ہے اور اس کا نام ہے البقچہ۔ یہ ایک لبادے کی شکل کا لباس تھا جو خاص طور سے جامہ اور پیشوازہ کے اوپر پہنا جاتا تھا اور اس کا اوپری حصہ نہایت خوب صورت ڈھنگ سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس لباس کے بارے کی طرف مختلف جانوروں کی رنگ برنگی تصاویر ہوا کرتی تھیں جس کو مشاق قسم کے درزی بنایا کرتے تھے۔[2]

بارش کے دنوں میں چکن نام کا کپڑا جسم کے بچاؤ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ جسے موم جامہ، صوف یا سقرلات سے تیار کرتے تھے۔ سردی کے دنوں میں کاندھے پر چادر ڈال کر چلنے کا عام رواج تھا اور کشمیری شالیں اس مقصد کے لئے خاص طور سے استعمال کی جاتی تھیں۔

## بابر اور ہمایوں کے زمانے کے لباس

ان شہنشاہوں کے زمانے میں لباس بجنسہٖ اُسی طرح رہا جس طرح کہ اپنے سابقہ لائے تھے۔ ایشیائے کوچک میں وہ لباس جو روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتے تھے۔ ان میں جامہ، فرجی، پیشوازہ، شلوار اور البقچہ قابل ذکر ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس سلسلے میں ہماری مدد نہیں کر پاتے کہ آیا ان کے علاوہ بھی کوئی لباس استعمال ہوتا تھا یا نہیں۔ لیکن جہاں تک اکبر کے دورِ حکومت کا تعلق ہے اس کے زمانے میں زندگی کے مختلف شعبوں میں تجربے کئے گئے۔ مختلف مذاہب میں ایک دوسرے سے بیگانگی کی کیفیت کو یگانگی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مشترک قدروں کی اہمیت کو جلا بخشی گئی اور یہی نہیں بلکہ سامان آرائش و زیبائش میں بھی اس بات کا خیال رکھا گیا کہ اگر روح ایرانی ہو تو جسم ہندوستانی، اور اگر جسم ایرانی ہو تو روح ہندوستانی۔ مثال کے طور پر یہ بتلا دینا ضروری ہے جیسا کہ اوپر کی سطروں میں جامہ اور تنکچہیہ کا ذکر کیا گیا ہے جامہ وہ جو مغل پہنا کرتے تھے اور تنکچہیہ وہ جو راجپوت استعمال کرتے تھے۔ لیکن اکبر نے ان دونوں سے کچھ چیزیں مستعار لے کر ایک تیسرے لباس کی ایجاد کی۔ مانسٹریٹ جو ایک پرتگیزی سیاح تھا اس نے بھی اکبر کے زمانے کے مختلف لباسوں کا اپنے سفرنامے میں تذکرہ کیا ہے۔

جہانگیر کے زمانے میں بھی اکبر کے زمانے کے سارے لباس استعمال کئے جاتے تھے لیکن کچھ مخصوص لباس جہانگیر خود اپنے لئے وقف کر رکھے تھے، اور یہ حکم شاہی تھا کہ اسے سوائے شہنشاہ کے اور کوئی شخص استعمال نہیں کر سکتا جب تک کہ بادشاہ خود اُسے کسی خاص موقعے پر اس مخصوص لباس سے نوازے۔

جہانگیر کے بعد ہندوستان کے تخت پر ایک باوقار شہنشاہ آتا ہے جس کی زندگی ہمہ نفاست اور ہمہ دل فریبی ہے۔ جس کی عظمت کا نمونہ فلک بوس قلعوں کی پختہ و بلند دیواریں اور جس کا نام تاج محل جیسا روح پرور و جاں افروز۔ اسی لئے ایک نفاست پسند شہنشاہ سے جس طرح کی اُمید کی جاتی تھی، اُسی طرح ہوا۔ لیکن ایک بیک، جب وہ اپنی زندگی میں ایک عظیم المیہ سے دوچار ہوا اس وقت سے اس کی حیات کی رفتار مدھم ہو گئی۔ ذیقعدہ کے مہینے میں ممتاز محل نے صدائے اجل کو لبیک کہا اور شاہجہان کے لئے یہ مہینہ ماتم کدہ بن گیا۔ اس مہینے میں وہ سوائے سفید کپڑوں کے اور کوئی کپڑا استعمال نہیں کرتا تھا اور یہ حد کا دن تو ہمیشہ کے لئے اُسے سوگوار بنا

---

[1] مغل طرز زندگی (انگریزی) ڈاکٹر انصاری

کیا کیوں کہ بدھ کے دن ممتاز محل کا انتقال ہوا تھا۔ لہٰذا بدھ کے دن تو وہ خاص طور سے سفید لباس ہی استعمال کیا کرتا تھا۔

اورنگ زیب کے زمانے میں خاص تغیر ہوا۔ ۱۴ جنوری ۱۶۶۹ء کے فرمان کے مطابق زربفت کا لباس قانوناً بند کر دیا گیا۔ لیکن اس کا استعمال ختم نہیں ہوا۔ بادشاہ خود سادہ کپڑوں کو ترجیح دیا کرتا تھا اور منوچی کے بیان کے مطابق اورنگ زیب کے کپڑوں کی قیمت دس روپے سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔

اکبر سے پہلے سر کو ڈھانکنے کے لئے دو طرح کی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ چوں کہ سر کے بال منڈوانے کا عام رواج تھا۔ اس لئے اس طرح کی ٹوپی یا سر کو ڈھانکنے کی چیز استعمال میں لائی گئی۔ مثلاً ہمایوں کے زمانے میں 'تاج عزت' اور 'خاصہ تاج' کا عام رواج تھا۔ 'تاج عزت' کی شکل بالکل انگریزی کے (دی) جیسی تھی[1] اور خاصہ تاج بادشاہ کی عطا کردہ ٹوپی کا نام جو اپنا مخصوص رنگ رکھتی تھی لیکن پیتیرے والا ڈیلے کے بیان کے مطابق اکبر بال رکھنا پسند کرتا تھا اس لئے اس نے ٹوپی کی اس شکل کو ترجیح دی جو اس کے بالوں کو خوب صورتی سے چھپا لے۔ لہٰذا وہ کلاہ بڑے بہتر ڈھنگ سے تیار کرتا تھا جس میں سونے اور چاندی کا کام ہوتا تھا اور کلاہ میں طرّے کی موجودگی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ جہانگیر اپنے سرپوش میں ہیرے اور جواہرات کا استعمال ضرور کرتا تھا۔ اس کے سرپوش کے دونوں طرف قیمتی ہیرے ٹکے رہتے تھے اور بیچ میں طرّہ ہوتا تھا۔ شاہجہان کے زمانے میں بھی کم و بیش سرپوش کی بناوٹ یہی رہی لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں لباسوں کی طرح سرپوش میں بھی ہیرے اور جواہرات کا استعمال منع کر دیا گیا۔

---

[1] 'مغل طرز زندگی' (انگریزی) ڈاکٹر انصاری

بابر اور ہمایوں کے بارے میں تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے استعمال میں ہیرے اور زیورات ہوتے تھے یا نہیں، لیکن جہاں تک اکبر کا تعلق ہے اُسے ہیروں سے اور مختلف قسم کے زیورات سے خاص دلچسپی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں جہانگیر کا مذاق اکبر سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ مانسریٹ جس نے اس کے عہد حکومت کے سارے حالات قلمبند کئے ہیں لکھتا ہے کہ اس کے گلے میں ہمیشہ قیمتی جواہرات کی مالائیں پڑی رہتی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی دونوں کہنیاں قیمتی موتیوں سے گھری رہتی تھیں۔ ہاکنس اور پیٹری کے بیان کے مطابق اس کی ہر انگلی میں انگوٹھیاں ہوتی تھیں جن میں بیش بہا نگینے جڑا کرتے تھے۔ چوں کہ اکبر شیخ سلیم چشتی رح کے معتقدوں میں سے تھا اس لئے اس نے بھی یہی جہانگیر کے کانوں میں اس روایت کے تحت چھلے ڈال دئے تھے۔ لہٰذا وہ کانوں کے چھلے دائمی حیثیت میں تبدیل ہو گئے اور اس کے کانوں میں ہمیشہ چھلے پڑے رہتے تھے۔ پیٹری نے اس سلسلے میں جہانگیر کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جہانگیر کی طرح دنیا میں کوئی شہنشاہ نہیں ہے جو اتنے بیش قیمت موتیوں اور جواہرات سے اپنے کو مزین کر سکے۔

اورنگ زیب نے جہاں ساری غیر ضروری چیزوں کو خیرباد کہا وہاں ہیروں اور جواہرات کے استعمال سے بھی احتراز کیا۔ لیکن ان سب چیزوں کے ساتھ کچھ روایات کا دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اس سے بالکل نہ بچ سکا اور شاہی دستار میں ایک بیش قیمت پتھر کو جگہ دینی پڑی۔ بہت سی چیزوں کی حیثیت ذاتی ہوا کرتی ہے۔ سو وہ کچھ اورنگ زیب کے ساتھ بھی رہیں لیکن اس کے لڑکے جواہرات کا استعمال کرتے تھے جس میں وہ قطعاً مخل نہیں ہوا۔

کچھ مشروع ہی سے مشرق کی سرزمین میں تعاست کو بڑا دخل رہا ہے اور تمام وہ عمل جو اس سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتے تھے، ان کو کام میں لایا گیا۔ چناں چہ اس سلسلے

میں خوشبو کا استعمال کرنا بھی آتا ہے۔ اکبر کو عطر و بغیرہ کا بڑا شوق تھا چناں چہ اس نے الگ سے ہی ایک شعبے کی بنیاد ڈالی جس کا "خوشبو خانہ" نام رکھا۔ جس میں مختلف قسم کی خوشبوئیں تیار کی جاتی تھیں۔ اس کے زمانے میں مختلف قسم کے عطروں کے حوالے ملتے ہیں جیسے "سنتاگ، ارگجہ، گلگونہ اور رو یہ" وغیرہ۔ اکبر کے بعد جہانگیر کا دور حکومت آتا ہے۔ اس شہنشاہ کو بھی اپنے باپ ہی کی طرح عطروں کا بڑا شوق تھا۔ اس کے علاوہ نور جہاں خوشبوؤں کے بارے میں کافی معلومات رکھتی تھی۔ اس نے کئی قسم کے عطر بھی ایجاد کئے اور یہاں تک کہ ایک عطر کا نام "عطر جہانگیری" بھی پڑ گیا۔ شاہجہان کو بھی عطر سے خاص لگاؤ رہا اور اس نے اس کے استعمال کی ہمت افزائی کی۔

مختصراً ہم نے اُن شہنشاہوں کی زندگی کے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی ہے جن کا وقار اور جن کی عظمت آج بھی اپنی جگہ پر مستحکم ہے۔ عموماً لوگ ایسی چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن کسی قوم، افراد یا شخصیت کے بارے میں جاننے کے لئے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ کیونکہ کسی قوم کے افراد کی شخصیت کا صحیح تجزیہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب حیات کا کوئی شعبہ بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

لہٰذا لباس اور زیورات کے بارے میں جو مواد فراہم کیا گیا ہے اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کے توسط سے ان شہنشاہوں کے وقار، ان کی وضع اور ان کی تہذیب کا صحیح طور سے اندازہ لگا سکیں۔

---

لہٰ مغلوں کی تہذیبی زندگی (انگریزی) ڈائرہ چوپڑہ


# فنِ تعمیر نمبر

آج کل کا ماہ اگست ۱۹۶۲ء کا شمارہ 'فنِ تعمیر' نمبر ہوگا

دیدہ زیب سرورق اور خوبصورت رنگین و سادہ تصاویر سے مزین یہ خصوصی شمارہ ۸۸ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ہندوستانی فنِ تعمیر کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات سے متعلق دلچسپ اور پُر از معلومات مضامین شاملِ اشاعت ہوں گے۔

**قیمت صرف ایک روپیہ** — یہ شمارہ خریداروں کو سالانہ چندے ہی میں ملے گا۔

آج ہی خریدار بن جائیے تاکہ آپ بھی یہ شمارہ سالانہ چندے ہی میں حاصل کر سکیں

آج کل کا سالانہ چندہ صرف سات روپے ہے

ایجنٹ حضرات زائد کاپیوں کے لئے ابھی سے آرڈر بھیج دیں

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن ادارۂ سیکرٹریٹ دہلی ۶

# غدّاری

سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دن کے ڈھائی بجے بھی سورج ڈھلنے کے ذرا بعد کی سی تاریکی پھیل گئی تھی۔ ساری فضا پر موت کا سا سکوت اور جمود طاری تھا، نہ کہیں سے کسی چڑے کی آواز آ رہی تھی نہ درخت کا ایک بھی پتہ ہل رہا تھا۔

ہر وقت ریڈیو آن رکھنے والی اور اس پر نشر ہونے والے گانوں کی دھن پر زور سے گانے والی پڑوس کی مس آرتی شاہ بھی شاید چیڑوں کی طرح دبکی ہوئی تھی۔

"اف یہ سکوت، یہ کرب ناک سکوت، یہ اذیت بخش خاموشی ....."

مینا اس سکوت سے اکتا گئی تھی۔ "یہ سکوت کیوں؟ کیوں....؟"

اس نے اٹھ کر کمرے کی بڑی کھڑکی کھول دی اور اس کی سلاخیں پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے کے باہر بھی کمرے کے اندر کا سا سکوت تھا، کرب تھا، اذیت تھی، جمود تھا۔

"یہ سکوت کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں؟ .... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں کوئی بُری خبر سننے والی ہوں..... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں کوئی بُری بات سننے والی ہوں .... لیکن مجھے کوئی بُری بات نہیں سننی چاہیے..... نہیں... نہیں"

کھڑکی کی سلاخیں چھوڑ کر وہ واپس لوٹی اور جیسے نڈھال سی ہو کر صوفے پر گر گئی۔ پھر اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں اور بند آنکھوں کی تاریک دنیا میں اُسے جانے کیا کچھ اس طرح صاف صاف اور واضح طور پر نظر آنے لگا کہ اس نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔

اس نے اٹھ کر اپنے کمرے کا ریڈیو آن کر دیا۔

"تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم ....

"نہیں.... نہیں..... نہیں..... وہ پاگلوں کی طرح چلائی اور اس نے ریڈیو بند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ذہن میں گونجتا رہا۔ تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم ....

یہ پڑوس کی مس آرتی شاہ کے ریڈیو کی آواز نہیں تھی، یہ کسی کے گانے کی آواز نہیں تھی، لیکن مینا جیسے بالکل واضح طور پر سُن رہی تھی — تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم.....

پھر وہ صوفے پر گر سی گئی اور اس نے آنکھیں میچ لیں۔

کلاس روم میں میز پر چاٹنگلے کے تین بندر رکھے ہوئے تھے ایک نے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپا رکھی تھیں۔ دوسرے نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسی ہوئی تھیں اور تیسرے نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

"بچو! کیا تم جانتے ہو یہ بندر کیا کہہ رہے ہیں؟" مینا نے پوچھا۔

"یہ کچھ بھی نہیں کہہ رہے ہیں دیدی!" ایک چھوٹے سے بچے نے کہا۔ "ایک تو یہ بندر ہیں۔ پھر بچے کے بندر ہوتے ہیں

بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اور پھر یہ تو کھلونے ہیں۔"

"ہاں یہ کھلونے ہیں۔" مینا مسکرائی۔ "پر یہ بولتے ہیں۔۔۔۔"

"کیا پنچ پنچ یہ بولتے ہیں۔" ایک بچی کھڑی ہو کر چائنا کلے کے بندروں کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں ہاں یہ بول رہے ہیں۔" مینا ہنسنے لگی۔ "ہی تو میں تمھیں بتا رہی ہوں۔ بیٹھ جاؤ۔"

وہ بچی بیٹھ گئی تو مینا پھر کہنے لگی۔

"یہ چھوٹے موٹے کے بندر، یہ چائنا کلے کے بنے ہوئے بندر جنھیں تم کھلونے سمجھ رہے ہو — بچو یہ اتنے پتے کی بات کہہ رہے ہیں کہ گاندھی جی بھی ان سے سبق سیکھا کرتے تھے۔"

"پنچ پنچ دیدی؟" کسی بچے نے بے تابی سے پوچھا۔

"پنچ پنچ۔" مینا کہنے لگی۔ "دیکھو اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندر کہہ رہا ہے کہ کوئی بُری چیز نہ دیکھو — اور اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی ہیں گویا کہہ رہا ہے کہ کوئی بُری بات نہ سنو اور اس تیسرے بندر نے اپنا منہ بند کیا ہوا ہے اور اس طرح بتلا رہا ہے کہ کوئی بُری بات نہ کہو۔"

"واہ ۔۔۔۔ واہ ۔۔۔۔ واہ" کئی بچے اور بچیاں تالیاں پیٹنے لگے۔ تب ہی ایک بچے نے اُٹھ کر کسی قدر ملال کے ساتھ کہا۔

"پر دیدی! میں نے تو آج ایک بہت بُری چیز دیکھی ہے!"

اور مینا گھبرا سی گئی۔

دوسرت نے کہا

"اور دیدی! میں نے ایک بہت ہی بُری بات سُنی ہے۔"

اور مینا بوکھلا سی گئی۔

اور تیسرے نے کہا

"دیدی جی! میں نے اسکم کو ایک بُری بات کہہ دی ہے۔"

اور مینا سر تھام کر کُرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک تو وہ اپنے آپ کو بالکل ہی گم سُم سی محسوس کرتی رہی۔ پھر جیسے ہمت کر کے اس نے پہلے بچے سے پوچھا۔

"کون سی بُری چیز دیکھی ہے تم نے؟"

"دیدی! آج اسکول آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک ہوٹل کے پاس دو آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک مرغ تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک چمک دار چھری تھی۔ پھر اس نے مرغ کی گردن پر چھری چلا کر مرغ کو سڑک پر چھوڑ دیا اور مرغ دیدی کچھ اس طرح تڑپنے لگا کہ میں کیسے بتاؤں۔ کتنی بُری چیز تھی دیدی! میرا بس چلتا تو میں اس آدمی کی گردن کاٹ دیتا!"

"نہیں نہیں، بُری بات نہیں بولا کرتے۔" مینا جلدی سے بولی اور دوسرے بچے کی طرف متوجہ ہو گئی — "تم نے کون سی بُری بات سنی ہے؟"

"دیدی! گھر پر پڑھانے کو آنے والے ماسٹر جی نے مجھے بتایا کہ جہاں جنگ ہوتی ہے وہاں سیکڑوں اور ہزاروں آدمی مارے جاتے ہیں — یہ کتنی بُری بات ہے۔"

"ہاں یہ ایک بُری بات ہے۔" مینا بولی "لیکن جنگ میں پنچ پنچ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ تم اپنے ماسٹر جی سے کہنا کہ بچوں کو جنگ کی نہیں، امن کی باتیں سنانی چاہئیں۔"

اور آخر میں وہ تیسرے بچے کی طرف مخاطب ہوئی۔

"تم نے اسلم کو کون سی بُری بات کہہ دی ہے؟"

"دیدی! میں نے اُسے گالی دے دی ہے۔" اس بچے نے کہا۔

"یہ تو بہت ہی بُری بات ہے۔" مینا اسے سمجھانے لگی۔ "اچھے بچے کبھی کسی کو گالی نہیں دیا کرتے۔ تمھیں اسلم سے معافی مانگنی چاہئیے اور آیندہ پھر کبھی کسی کو گالی نہیں دینی چاہئیے۔"

اور پھر گھنٹی بج گئی۔

اور مینا نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔

یں ان چھوٹے چھوٹے بچوں سے ڈر کیوں رہی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ بڑی بے بسی سے سوچنے لگی۔۔۔۔ "شاید میں یہ سمجھ رہی تھی کہ انھوں نے میری کوئی بُری بات دیکھی تھی! — شاید انھوں نے میرے بارے میں کوئی بُری بات سُنی تھی۔ شاید اس ننھے سے

جگدیش نے اسلم سے میری بہت ہی بڑی بات کہی تھی! — "ہنہ" وہ مسکرانے لگی — "گلی مائنڈڈ آلویز سپیشلشس لیکن میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ آخر میرا قصور کیا ہے؟ ....."

وہ دیر تک کھڑکی سے باہر کچھ اس طرح دیکھتی رہی جیسے کوئی کھڑکی کی دوسری طرف آکر اسے بتائے گا کہ اس کا جرم کیا ہے اس کا گناہ کیا ہے، اس کا قصور کیا ہے؟

مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ جیسے میں خود کوئی بہت ہی بری چیز دیکھوں گی، جیسے میں خود کوئی بہت ہی بری بات سنوں گی اور جیسے میں خود کسی کو کوئی بری بات کہہ دوں گی ..... مجھے کیوں ایسا لگتا ہے؟ میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟ ..... مجھے ساری کائنات پر کسی لاش کا شک کیوں ہو رہا ہے؟ ..... یہ تاریکی کیوں؟ یہ سکوت کیوں یہ جمود کیوں؟ — اُف یہ بے پناہ تاریکی ....."

مینا کی لالٹین لمحے میں آتے ہی سب سے پہلے لائٹ آن کی — پھر اس نے پوچھا:

"یہ آپ اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہیں؟"

"سکینہ —" مینا ہنس پڑی — "کیا تو سمجھتی ہے کہ ساری دنیا روشن ہو گئی؟"

"ہمیں دنیا سے کیا لینا ہے" سکینہ بولی — "یہ کمرہ تو روشن ہو گیا ہے، ساری دنیا کا ٹھیکہ ہم نے ہی کیا لے رکھا ہے؟"

"ہاں — ساری دنیا کا ٹھیکہ ..." مینا زور سے ہنس پڑی "ساری دنیا کو روشن کرنے کے لئے اپنا گھر جلا دینے کا ٹھیکہ بھی ہمارا ہی ہے —"

"اچھا تو آپ پھر نیاز صاحب کے بارے میں سوچ رہی ہیں" سکینہ نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے نیاز صاحب کے بارے میں سوچنا گناہ ہو — "میں کہتی ہوں آپ کا دماغ خراب ہو جائے گا — اس طرح سوچنے سے دنیا میں روزانہ لاکھوں شادیاں ہوتی ہیں، کروڑوں چوڑیاں ٹوٹتی ہیں، لاکھوں سہاگ اُجڑتے ہیں، کتنی جدائیاں ہوتی ہیں، کتنے طلاق ہوتے ہیں، کتنی جنمیں جنم لیتی ہیں"

"اور خودکشیاں؟" مینا مسکرائی

"آپ نے تو قسم کھائی ہوئی ہے بابا کی دلہن دیکھے بغیر مرنے والی نہیں؟" سکینہ بولی —

"ہاں مجھے جینا ہے، مجھے جینا چاہیئے —" مینا نے ٹھنڈی سانس لی — "مجھے جینا ہی پڑے گا —"

"آپ کو نیاز صاحب کے بارے میں ہرگز نہیں سوچنا چاہیئے" سکینہ کہنے لگی — "نہیں تو آپ کا جینا دوبھر ہو جائے گا — اور پھر قبل از مرگ واویلا — یہ سوچنا ہی فضول ہے کہ آپ کو طلاق مل جائے گی — نیاز صاحب اپنا ارادہ بدل بھی تو سکتے ہیں —"

"یقین کرو سکینہ میں یہ سب کچھ ہرگز نہیں سوچ رہی تھی —" مینا کہنے لگی — "سچ ہوتی ہے تو پھر شام تو ہو گی ہی، پھر شام کے بارے میں سوچنا کیا، نیاز صاحب اپنا ارادہ نہیں بدل سکتے — یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے — انہیں اچھی طرح یقین ہو چکا ہے کہ شادی سے پہلے میں پرویز سے محبت کرتی رہی تھی اور یہ بات غلط بھی تو نہیں ہے — رونا ہے تو صرف اس بات کا کہ شادی کے بعد میں نے پرویز کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں — سکینہ! میں نے اپنی ساری نیا اپنی ساری کائنات، اپنی تمام تر خوشیاں، اپنا دل، اپنی روح سب کچھ میں نے شادی کے بعد نیاز صاحب کے قدموں میں ڈال دئے ..... سب کچھ سکینہ سب کچھ — لیکن میں ان سے اونی سا بھروسہ بھی نہ لے سکی سکینہ، کچھ بھی نہیں —"

"اب تو بات صاف ہو گئی کہ آپ انہیں کے بارے میں سوچ رہی تھیں" سکینہ نے اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو —

"نہیں —" مینا نے کراہتی ہوئی سی آواز سے کہا — "ہرگز نہیں — میں جانے کیوں میں ڈر رہی ہوں سکینہ، میرے دل کی دھڑکنیں جانے کیوں بہت تیز ہو گئی ہیں — مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی بری خبر سننے والی ہوں ..... سکینہ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے —"

"اور اسی لئے آپ اسکول چھوڑ کر آ گئیں؟" سکینہ کہے گی —

میں یہ سمجھ رہی تھی کہ آسمان کو ابر آلود ہوتا دیکھ کر آپ آ گئیں کہ یہاں اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر بوندوں کی ٹپ ٹپ سنیں گی جو آپ کے خیال میں دنیا کی بہترین موسیقی ہے۔"

"ایسے نہیں کہو۔" مینا نے کہا۔ "تھی۔ وہ زمانے بیت گئے، وہ زندگی مجھ سے روٹھ گئی۔ سکینہ، اب نہ میں وہ ہوں، نہ وہ بوندیں ہیں، نہ وہ ....."

"چھوڑیئے ان باتوں کو۔" سکینہ بولی۔ "ان باتوں میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ چائے لاؤں؟ پھر آپ کو رضیہ کے ہاں بھی تو جانا ہے۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی سکینہ!" مینا بولی۔ "اب میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"صبح تو آپ کہہ رہی تھیں۔" سکینہ نے کہا۔ "پھر آپ نے ....."

مینا زور سے ہنس پڑی، پھر کہنے لگی

"نیاز صاحب جانتے ہیں کہ شادی سے پہلے مجھے پردیز سے بے پناہ محبت تھی۔ کسی کافر کو اس حقیقت سے انکار ہے، لیکن تم یہ سن کر چونک اٹھو گی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اب میرے تعلقات رضیہ کے خاوند زیدی صاحب سے بھی ٹھیک ویسے ہی ہیں جیسے ....."

"یہ سب کچھ بکواس ہے!" سکینہ نے غصے سے کہا۔ "اور آپ ان باتوں کو سوچتی ہیں یہ بھی بکواس ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ جب آپ کو یقین ہے کہ نیاز صاحب آپ کو طلاق دے کر ہی دم لیں گے تو پھر چلا کر کہہ دیجئے کہ ہاں۔ آپ کو زیدی صاحب سے محبت ہے۔"

"چائے لے آؤ۔" مینا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں اور سکینہ چلی گئی۔

اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوئے بازوؤں سے رضیہ نے مینا کو گلے سے لگا لیا اور مینا سسکیاں لینے لگی۔ دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹی رہیں اور جب وہ الگ ہوئیں تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ رضیہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

"میں نہیں کیا سمجھوں؟ بہنی، زندگی، زندگی کی بہار"

"شاعری مت کرو۔" مینا نے کہا۔ "یہ تم جیسی موٹی تازی لڑکی کے بس کا روگ نہیں، چلو ہم بیٹھ کر چائے پئیں۔"

"مینا، ہم کتنے دنوں پر ملی ہیں؟ اُف جیسے چٹ پٹ بیت گئے جیسے صدیاں بیت گئیں....."

"بکواس ہے۔" مینا نے کہا۔ "ہم صرف سات مہینوں تک ایک دوسرے سے جدا رہے۔"

"اری کم بخت تو کبھی تو سنجیدہ ہو۔" رضیہ بولی

"چل چل۔" مینا کہنے لگی۔ "زیدی صاحب کی بیوی اور کسی کو سنجیدگی کا سبق پڑھائے؟"

"لیکن میں ان کی طرح غیر سنجیدہ نہیں۔" رضیہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں گئی" مینا نے کہا۔ "لیکن اب چل، بیٹھ کر باتیں کریں۔ میں نے بیرے کو خط دیا ہے اب تک چائے نہیں پی۔"

اور سکینہ چائے لے کر آ گئی۔

لیکن مینا بدستور برسوں پیچھے چھوڑی ہوئی دنیا میں بھٹکتی رہی۔

"سکینہ، رضیہ میری زندگی ہے، میری زندگی کی بہار ہے۔ میری سہیلی ہے، میری بہن ہے۔ اچھا سکینہ ایک بات تو بتاؤ۔ ایک شادی شدہ عورت کی سب سے پیاری چیز کیا ہوتی ہے؟"

"ہسبینڈ!" سکینہ نے کہا اور اس کے سامنے بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

"ہاں ہسبینڈ!" مینا مسکرانے لگی۔ "لیکن ایک بات بتاؤں تمہیں، ایسی بات جو دنیا میں نہ کبھی ہوئی نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ سکینہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب نکاح کے بعد نیاز صاحب اور ان کے گھر والوں نے مجھے ناپسند کر دیا تھا کہ انہیں میری اور پردیز کی محبت کا علم ہو گیا تھا۔ ان دنوں میری کیا حالت ہو گئی تھی سکینہ یہ میں بتا نہیں سکتی، اور وہی وہ زمانہ تھا جب میں خون تھوکنے لگی تھی اور پھر خود کشی کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ اور تب ہی سکینہ! رضیہ نے اپنا ہسبینڈ مجھے پانچ منٹ کو دے دینے کی پیش کش کی تھی....."

"کیا سچ؟" سکینہ چونک سی گئی۔

" ہاں — " مینا کہنے لگی — " اس نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ پردیز سے تو تمہاری شادی ہو نہیں سکتی۔ وہ بیلے لوگ ہیں — نیاز صاحب کے گھر والے تجھے ناپسند کرتے ہیں، طلاق ہو جائے گی اور تو اپنی زندگی تباہ کرے گی — لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ مینا تو ہمارے ساتھ رہے گی۔ تو زیدی صاحب کی بیوی بن کر رہے گی تو ....."

مینا کی آواز بھیگ گئی۔ اس نے پیالی اٹھا کر چائے کا ایک گھونٹ لیا اور اُسے ایسا لگا جیسے وہ چائے کا گھونٹ نہیں تھا کوئی نہایت تیز سی چیز — کوئی زہر!

وہ پھر برسوں پیچھے چھوڑی ہوئی دنیا میں واپس چلی گئی۔ جہاں ضیہ اُسے سمجھا رہی تھی۔

" ڈارلنگ! یہ سب کچھ بکواس ہے کہ محبت بس ایک سے ہوتی ہے اور یہ کہ عورت سب کچھ گوارا کر سکتی ہے لیکن اپنے خاوند کی محبت کا بٹوارا برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بھی اوکے پتلوں کی بات ہے کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ ان ہنگاموں سے دُور میں، میں تجھے ایک پُرسکون دنیا دوں گی۔ میرا ہی جیسا نیز سنجیدہ، ہنسوڑ اور کھلنڈرا خاوند دوں گی، تیری محبت دوں گی اور وہ سب کچھ آدھا بانٹ کر دے، دوں جو میرے پاس ہے ....."

یکایک مینا ہنسنے لگی اور سکینہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرا کر بولی

" کیا بات ہے؟ "

" سکینہ — اس کم بخت نے زیدی صاحب سے اپنے خیال کا تذکرہ کیا تو وہ چونک گئے۔" مینا ہنستے ہنستے کہنے لگی۔ " میں جانتی تھی زیدی صاحب کو رضیہ سے بے پناہ محبت تھی — بے پناہ وحشت تھی اس محبت میں وہ اس کم بخت کی پوجا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ اور میں بتاؤں تجھے جس وقت رضیہ نے مجھے بتایا کہ — یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا، تو وہ کم بخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور روتے روتے بے حال ہو گئی۔"

یہ سب کچھ بتاتے ہوئے مینا ہنستے ہنستے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

اور سکینہ بھی مُسکرا مُسکرا کر لوٹ پوٹ ہونے لگی تھی۔

اور بارش ہو رہی تھی۔

موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی۔

سکینہ نے ریڈیو آن کر دیا

تمھاری ادا یوں میں کہاں اور ہماری کرے ناکوئے

گڑ گڑ ہیلیاں مخ کریا اور ٹرڈو لکھیں ڈوگ ....."

" نہیں — نہیں — نہیں ....." مینا تیزی سے اُٹھی اور اس نے ریڈیو بند کر دیا۔ اس لاجستھانی لوک گیت کا مطلب تھا کہ میں تو تمھارا انتظار کر رہی ہوں لیکن میرا انتظار کوئی نہیں کرتا۔ بار بار ہیلیاں، کھے کریتی ہیں اور لوگ مڑ مڑ کر میری حالت دیکھتے ہیں — " نہیں نہیں نہیں ..... یہ غلط ہے سکینہ ..... یہ غلط ہے۔ اس نالائق لڑکی کو بھی میرا انتظار ہے۔ رضیہ میری راہ دیکھ رہی ہوگی — میں جاؤں گی سکینہ — میں اس کے پاس ضرور جاؤں گی، ابھی اسی وقت۔"

" اس موسلا دھار بارش میں؟ " سکینہ نے پوچھا۔

ہاں، ہاں، ہاں!" مینا نے چائے کی پیالی ٹیبل کے سے انداز میں میز پر رکھی اور کپڑوں کی الماری کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ آپ ہی آپ کہنے لگی — " نہیں کپڑے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بیری انھیں حماقتوں نے تو نیاز صاحب کو اور بھی مشکوک کر دیا ہے، بھلا رضیہ کے پاس جانے کے لئے کپڑے بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ — " وہ مسکراتی ہوئی سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔

اور بارش کچھ اس طرح ہو رہی تھی جیسے ساری دنیا کو غرقاب کر کے دم لے گی۔

ہاتھ میں لپ اسٹک اُٹھا کر مینا نے پھر میز پر رکھ دیا۔

" نہیں اس کی بھی ضرورت نہیں۔" وہ پھر مسکرائی — " میری انھیں حماقتوں نے تو نیاز صاحب کو اور بھی مشکوک کر دیا ہے؟

سکینہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی — سُن رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

مینا نے چھتری اُٹھائی اور بارش کے اس اتھاہ طوفان میں کود پڑی۔

لیکن ابھی وہ کچھ ہی دُور گئی تھی کہ نیاز جیپ آتا ہوا جاگا آ رہا تھا۔ اس کے پاس پہنچ کر نیاز نے کہا۔

"بیٹھو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"آپ جو کچھ کہیں گے میں جانتی ہوں۔" مینا بولی۔ "لیکن آپ جو کچھ کہیں گے وہ کوئی ایسی بُری بات نہیں جس سے میں گھبرا رہی ہوں۔ میں رضیہ کے پاس جا رہی ہوں۔ جانے کیوں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ میں رضیہ کے پاس۔۔۔۔"

وہ آگے بڑھنے لگی لیکن نیاز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم جو کچھ سمجھ رہی ہو وہ سب کچھ نہیں کہوں گا۔" نیاز نے کہا۔ "میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف تمہارا سہاگ ہے اور دوسری طرف رضیہ۔ کسی ایک کو پسند کر لو۔"

مینا کو یک لخت ایسا لگا جیسے بارش کے اس اتھاہ طوفان میں بھی وہ شعلوں کے بیچ کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر شعلوں کے بیچ کھڑی رہی اور پھر نیاز کے ساتھ کچھ اس طرح چلنے لگی جیسے تھا۔ کی گائے! اس وقت اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے رضیہ کے ساتھ بہت بڑی غداری کی ہو!"

اس کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی!

---

حرمت الاکرام

# غزل

ہجومِ درد میں جینے کا اہتمام ہوا
نہ کوئی کام سہی، یہ تو ایک کام ہوا

حیات کی کوئی منزل نہیں نصیب قیام
یہ کس نے تم کو بتایا، سفر تمام ہوا

فسانے کتنے سُنائے مری خموشی نے
ملی زباں تو بیں بیگانۂ کلام ہوا

کھلا جو دل پہ تری چشمِ التفات کا راز
تو فرض مجھ پہ خود اپنا بھی احترام ہوا

عطائے نیم نگاہی جسے کہیں وہ سرور
ہماری روح میں پل کر نظمِ دوام ہوا

وہ ایک فاصلہ جو تھا نگاہ سے دل تک
خوشا نصیب کہ وہ فاصلہ تمام ہوا

جہاں سے طولِ سفر کا سراغ دل کو ملا
وہیں سے قافلہ کچھ اور تیز گام ہوا

تھی پہلے وجہِ گلہ تمنائے کلام مگر
مرے سکوت کا افسانہ اور عام ہوا

دماغ و دل کی کشاکش کا سلسلہ تھا طویل
کسے خبر ہے کہ دل کب اسیرِ دام ہوا

رواں ہے پھر سوئے گردوں یہ قافلہ حرمت
ابھی فسانۂ آدم کہاں تمام ہوا

غلام ربانی

# ہیروں کا شہر

دامودر ندی، دامودر قراۃ اور گنگا کی وادی دنیا میں اپنی زرخیزی کے لئے مشہور ہیں۔ یہ خطّے وہ ہیں جہاں انسانی تہذیب نے جنم لیا اور پھلی پھولی۔ دریا پانی کی شکل میں خدا کی رحمت ہوتے ہیں، جہاں سے گزر جاتے ہیں، اس علاقہ کو سرسبز اور شاداب بنا دیتے ہیں اور زرخیز ہو جاتی ہے زرخیزی میں وادیٔ کرشنا دنیا کے کسی علاقے سے کم نہیں بلکہ یہ وادی فزوں تر کہی جا سکتی ہے کہ پیداوار میں دنیا کا کوئی خطہ اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اس جگہ غلّہ کی کثرت تھی یہاں ہیرے بکھرے ہوئے تھے۔ مارکوپولو اور دوسرے سیاح یہاں کی ہیرے کی کانیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ الف لیلہ میں سندباد جہازی کے سفر کا قصہ یہیں سے لیا گیا ہے۔ ایک اطالوی سیاح نکولو دی کاؤنٹ نے پندرھویں صدی میں اس وادی کو دیکھا تھا وہ لکھتا ہے:

"یہاں کے پہاڑی علاقوں میں سانپوں کی کثرت ہے۔ لوگ بیلوں کو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر لے جاتے ہیں اور وہاں ان کو کاٹ ڈالتے ہیں اور تازہ گوشت کے لوتھڑے کھٹوں میں ادھر اُدھر پھینک دیتے ہیں۔ ہیرے ان میں چپٹ جاتے ہیں، پھر گدھ ان کو کھانے کے لئے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور کسی محفوظ جگہ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اس کے بعد لوگ وہاں پہونچتے ہیں اور ہیرے اکٹھے کر کے لے آتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد کی صدی میں کئی فرنگی سیاح یہاں آئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وادیٔ کرشنا میں جگہ جگہ ہیرے کی کانیں ہیں ان کا رقبہ ۲۱۰ میل لمبا اور ۹۵ میل چوڑا ہے جس میں کڈپا، بلاری، کرنول، کرشنا اور گوداوری کے ضلعے شامل ہیں۔ اس علاقہ پر سلاطین قطب شاہی اور راجاؤں وجیانگر کی حکومت تھی۔ مگر یہ کانیں گولکنڈہ ہی کے نام سے مشہور تھیں چنانچہ یورپین ان کو "گولکنڈہ مائینز" کہا جاتا تھا۔ گولکنڈہ کی کانیں ہیروں سے پٹی پڑی تھیں اور ان کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ساری دنیا کے لئے ہیرے فراہم کرنے کو کافی تھیں۔

یہ کانیں ٹھیکہ پر دی جاتی تھیں۔ ٹھیکہ دار تین لاکھ پیگوڈا (تقریباً سوا لاکھ پونڈ) بادشاہ کو دیتا تھا۔ گول کنڈہ کے فرمانرواؤں نے کان کنی کے لئے چند مقامات مخصوص کر رکھے تھے۔ ہر جگہ کھدائی کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ ان بادشاہوں کو اندیشہ تھا کہ ہیروں کی کثرت کہیں ان کے ملک پر تباہی نہ لائے اور دنیا کے مغل شہنشاہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔

رائل مارشل آف انگلینڈ نے ۱۶۷۷ء میں ایک مقالہ رائل سوسائٹی کے سامنے پڑھا تھا۔ اس میں گول کنڈہ کی کانوں کا ذکر ہے۔ یہ مضمون بہت دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔ اس میں

گول کنڈہ کی کانوں کا حال بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے یہاں صرف ایک کان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لکھا ہے:

"..... بہال ایک کان کرور ہے۔ یہ بہت پرانی اور مشہور ہے اور حال ہی میں قطب شاہوں کے قبضہ میں آئی ہے۔ اس میں اکثر قسم کے ہیرے نکلتے ہیں۔ سامنے سنٹر پرسس پہلے جب یہ کان ہمارے حکومت کے تحت تھی تو کئی لوگوں کو یہاں کھدائی کی اجازت دی گئی تھی۔ ایک پرتگیز گوا سے یہاں آیا، اس نے اپنی ساری رقم جو ایک لاکھ پگوڈا کے قریب تھی، کھدائی پر خرچ کر دی۔ اس کے بعد اپنا سارا اثاثہ جو ساتھ لایا تھا، بیچ کر خرچ کر دیا یہاں تک کہ اپنے پہننے کے کپڑے بھی بیچ ڈالے اور آخری دن کی مزدوری پر لگ گئے۔ جب اس کے پاس کچھ نہیں رہا تو اس نے زہر کا پیالہ تیار کیا اور دل میں ٹھان لی کہ اگر آج رات تک کچھ نہ ملا تو وہ پیر کے ساتھ اپنی زندگی بھی ختم کر دوں گا۔ یہ سوچ اسی تاجر کو مزدوری کے پاس ایک بہت بڑا ہیرا ملا۔ اس خوشی کی یاد گار میں اس نے ایک بڑا پتھر ذبح کیا اور اس پتھر پر یہاں میں ایک کتبہ کندہ کر دیا جو اب تک موجود ہے۔ کتبہ کی عبارت کا مطلب یہ ہے:

"اپنے بیوی بچوں کو بیچ دو اور جو کچھ تمہارے پاس ہے سب بیچ دو۔ اپنے کپڑے بھی بیچ ڈالو۔ تم خود بھی بک جاؤ اور غلام بن جاؤ لیکن کسی نہ کسی طرح رند ہیرا حاصل کرو۔ گول کنڈہ جاؤ اور کرناٹک کی طرف دوڑو۔ وہاں کانوں میں تلاش کرو۔ ایک دن آئے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے..."

گول کنڈہ کی کانوں کے بارے میں زیادہ تر حالات موسیو تھیونیر نے اپنے سفرنامے میں لکھے ہیں۔ تھیونیر ایک فرانسیسی جوہری تھا۔ ہیروں کی تلاش اس نے یہاں کے چھ سفر کئے اور رامل کوٹا کی کان دیکھی۔ قیم تلگو میں رامل کوٹا کے معنی "جواہرات کا قلعہ" ہیں وہ گئی کلور بھی گیا۔ یہ وہ مشہور کان تھی جس سے دنیا کا سب سے بڑا ہیرا "کوہ نور" نکلا تھا۔ رامل کوٹا کرنول سے ۱۸ میل جنوب مغرب میں ہے۔ تھیونیر نے یہاں ہیرے نکالنے کا طریقہ دیکھا تھا۔ لکھتا ہے:

"..... وہ جگہ جہاں ہیرے نکلتے ہیں، ریتلی زمین سے گھری ہوئی ہے۔ جگہ جگہ جنگل ہیں جن میں چٹانوں کی کثرت ہے۔ ان چٹانوں میں رگیں ہیں جو ایک انگلی اور بعض اس سے زیادہ چوڑی ہیں۔ کان کھودنے والے لوہے کی لمبی لمبی سلاخیں سی اپنے پاس رکھتے ہیں جو سرے پر سے مڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کو وہ رگوں میں گھسا کر اندر کی ریت اور مٹی نکالتے ہیں۔ اس مٹی کو کشتیوں میں بھر لیتے ہیں۔ یہی وہ مٹی ہوتی ہے جس میں سے بعد کو ہیرے نکلتے ہیں۔ یہ رگیں ہمیشہ سیدھی نہیں ہوتیں۔ بعض اوپر کو چڑھتی ہیں اور بعض نیچے کو جاتی ہیں۔ یہ لوگ چٹانوں کو توڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جس سمت میں رگیں جاتی ہیں، ان کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ ان کو کھودنے کے بعد اندر کی ریت اور مٹی نکال لیتے ہیں اس کو دو تین مرتبہ دھوتے ہیں اس عمل سے یہ پتا ہے کہ جو ہیرے اس میں ہوتے ہیں وہ دکھلائی دے جاتے ہیں۔ لیکن ایک وقت یہ ہے کہ چٹانوں کے اندر کی مٹی نکالتے وقت مزدور احتیاط سے کام نہیں کرتے، وہ سلاخوں کو اس زور سے مارتے ہیں کہ اکثر ہیرے ٹوٹ جاتے ہیں

"....."

بارش سے جو مٹی بہہ کر کسی جگہ اکٹھی ہو جاتی ہے اس میں بھی ہیرے ہوتے ہیں۔ ان کے نکالنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہیں

اس نے یہ عمل دیکھا تھا، اس کا بیان ہے :

"..... بستی سے کوئی ڈیڑھ میل پر اونچے پہاڑ ہیں، جو جلیبہ کی شکل میں ہیں۔ سب سے پہلے انس جگہ کا انتخاب کرتے ہیں، جہاں کام کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے برابر ایک اور جگہ صاف کرتے ہیں، اس کے گرد دو دو فٹ اونچی دیوار بناتے ہیں۔ اس کی جڑ میں دو دو فٹ کے فصل سے سوراخ بنا دیتے ہیں، جن سے پانی نکل سکے۔ پھر کان کا مالک پروہت کو بلاتا ہے وہ پوجا کے لئے ایک مورتی لاتا ہے۔ استھان کے بعد مالک کی طرف سے کمانے کا انتظام ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد پروہت مالک کو اشیرواد دیتا ہے اور اس کی ہمت بندھاتا ہے۔ اس کے بعد کام شروع ہوتا ہے۔ مرد کھدائی کا کام کرتے ہیں۔ عورتیں اور بچے مٹی اٹھا اٹھا کر اس جگہ لے جاتے ہیں جو اس کے برابر پہلے سے تیار کی جاتی ہے۔ کھدائی دس فٹ سے چودہ فٹ کی گہرائی تک ہوتی ہے لیکن پانی نکل آئے تو آگے کی توقع نہیں رہتی۔

جب کھدی ہوئی تمام مٹی اپنی جگہ پر پہونچ جاتی ہے تو مرد، عورتیں اور بچے سب مل پڑتے ہیں اور مٹکے اور گھڑے بھر بھر کے کھدان کا پانی اس مٹی پر ڈالتے ہیں جو انہوں نے اکٹھی کی ہے۔ مٹی پانی ڈالنے سے نرم ہو جاتی ہے، اس کو دو ایک دن کے لئے اسی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر سوراخوں کو، جو پانی کے نکاس کے لئے بنائے گئے ہیں، کھول دیتے ہیں۔ اس پر اور پانی ڈالتے ہیں تاکہ مٹی پانی کے ساتھ نکل جائے پھر اس کو یونہی چھوڑ دیتے ہیں اور وہ دھوپ میں سوکھ جاتی ہے۔ ان کے پاس چھاج کی طرح ایک ٹوکرا ہوتا ہے۔ مٹی کو اس میں ڈال کر پھٹکتے ہیں، جس سے باریک گرد اڑ جاتی ہے اور موٹے دانے اور ریزے رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کو زمین پر پھیلا دیتے ہیں اور سب مل کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کا ایک ایک سوٹا ہوتا ہے جس سے اس مٹی کو کوٹتے ہیں۔ پھر اس مٹی کو ٹوکروں میں بھر لیتے ہیں اور پہلے کی طرح ایک دفعہ اور اس کو پھٹکتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو پھیلا دیتے ہیں اور اس میں سے ہیرے چن لیتے ہیں۔ ..."

سولھویں اور سترھویں صدی میں گولکنڈہ کی کانیں اپنی پیداوار کی انتہا کو پہونچ گئی تھیں۔ یہاں ایسا بھی ہوا ہے کہ کانوں میں سے گاڑیاں بھر بھر کے ہیرے نکالے گئے ہیں۔ شہروں میں جس طرح سبزی منڈی یا غلہ کی منڈی ہوتی ہے۔ گول کنڈہ میں ہیرا منڈی تھی[1] یہاں جواہرات کا بیوپار ہوتا تھا۔ ٹیورنیر لکھتا ہے :

"..... یہاں ایک بڑے تماشے کی بات ہے بہت سے لڑکے جن کی عمر دس سال سے سولہ سال تک کی ہوتی ہے دہشر کے اندر چوک میں ایک درخت کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کے پاس ہیرے تولنے کے باٹ تھیلیوں میں کمر سے پر لٹکتے رہتے ہیں۔ اور ایک تھیلی وہ بھی میں اڑی رہتی ہے جس میں پانچ چھ سو طلائی پیسے گڑے ہوتے ہیں۔ یہ لڑکے وہاں بیٹھ کر ہیرے بیچنے والوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں جب کوئی بیچنے والا آتا ہے تو وہ ان بچوں میں سے ہر بچے کو جسے سب کا افسر سمجھنا چاہیئے، ہیرا دکھا دیتا ہے۔ وہ اسے دیکھتا ہے اور پھر اپنے ہمجولی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اس طرح وہ ہیرا دست بدست سب لڑکوں کے پاس ہوتا ہوا آتا ہے اور آخر میں پھر اس

---

[1] ظفر گول کنڈہ میں یہ مقام اب تک ہیرا منڈی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے برابر ہیرا خانہ ہے۔

بڑے لڑکے کے پاس آجاتا ہے۔

اب وہ بڑا لڑکا قیمت پوچھتا ہے اور سب کی سنائے سے اس کا سودا ہو جاتا ہے شام کو یہ سب لڑکے ان پتھروں کو گنتے ہیں جو انھوں نے دن بھر میں خریدے ہیں اور پرکھ کر انھیں ان کی آب و تاب وزن اور صفائی کے لحاظ سے الگ الگ رکھتے ہیں پھر ان کی قیمت لگاتے ہیں اور بڑے سوداگروں کے پاس لے جاتے ہیں۔ اب جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ ان سب لڑکوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہر چند ان کی عمر چھوٹی ہوتی ہے مگر ان کو جواہرات کی پرکھ اس بلا کی ہوتی ہے کہ ان کے خرید سے ہوئے پتھروں کو دوسرے ذرا غور سے لیتے ہیں ....."

گول کنڈہ میں جواہرات کی یہ کثرت قطب شاہیوں کے دم تک رہی۔ ان کی حکومت کے خاتمہ پر یہاں کی کانوں کا بھی خاتمہ ہو گیا یہ ایک معما ہے اور اب تک کسی نے نہیں بتایا کہ ان کانوں کے ہیرے ایک دم کس طرح غائب ہو گئے۔ جن مقامات سے کوہ نور اور دریائے نور جیسے ہیرے نکلے، وہ کانیں انیسویں صدی میں آ کر آباد ہوا اور شیکہ پر دی جانے لگیں۔ لیکن یہ ہمسا شکل ہے کہ ان مقامات کے ہیرے بالکل ختم ہو گئے۔ اب تک ایسا ہوتا ہے کہ بارش کے بعد کبھی کبھار کسی کسان کو ہیرا مل جاتا ہے۔

---

## لسانی اقلیتوں کو مادری زبان میں تعلیم

گزشتہ چار برس میں تمام ریاستوں میں لسانی اقلیتوں کو پرائمری تعلیم کے مرحلے تک مادری زبان میں تعلیم دینے سے متعلق سہولتوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۵۰ (اے) کے مطابق ہر ایک ریاست اور ہر ایک مقامی ادارہ یہ کوشش کرے گا کہ لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو پرائمری تعلیم کے مرحلے تک ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

۵۹-۱۹۵۸ء میں ریاست آسام میں ان اقلیتوں کے بچوں کو بنگالی، ہندی، کھاسی، لوشائی، گارو، منیپالی اور منی پوری زبانوں میں تعلیم دینے والے اسکولوں کی تعداد ۱۰۰۱ تھی۔ ۵۹-۱۹۵۸ء میں مذکورہ بالا قسم کے طلبا کی تعداد بڑھ کر ۱۹۲۳۷ تک پہنچ گئی جبکہ ۵۶-۱۹۵۵ء میں وہ ۱۷۶۱۳۶ تھی۔

بہار میں ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۹۴۵۰ اسکولوں میں ۳۸۸۶۱۱ طلبا ہندی، بنگالی، اڑیا، میتھلی اور سنتالی زبانوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ان طلبا کی تعداد صرف ۲۶۴۳۱۷ تھی۔

اڑیسہ میں ۱۲۵۶ اسکولوں میں تیلگو، ہندی، اردو، بنگالی اور گجراتی میں تعلیم دی جا رہی ہے۔ وہاں ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۴۴۹۱۸ طلبا تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر اس وقت ان کی تعداد ۳۱۱۴۶ ہے۔

مغربی بنگال میں بھی متعدد اسکولوں میں اسی قسم کے طلبا کو ہندی، اردو، نیپالی، تیلگو، تمتی، گجراتی، اوڑیا اور تامل زبانوں میں تعلیم کی سہولتیں میسر تھیں۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد ۹۹۷۶۱ تھی مگر ۶۱-۱۹۶۰ء میں وہ ۱۰۸۴۴۸ تک پہنچ گئی۔ اسی طرح اسکولوں کی تعداد بھی ۱۰۸۶ سے بڑھ کر ۱۱۱۶ ہو گئی۔

# ڈال ڈال کے پات

## دہلی کے رسائل

— عبدالسلام خورشید

دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر سپرنگر نے ۱۸۳۵ء میں "قران السعدین" کے نام سے ایک علمی ہفت روزہ جاری کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی وساطت سے مسٹر سپرنگر کی ایک کتاب سے متعلقہ اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

"۱۸۳۵ء میں میں نے دلی میں پہلی میگزین کی طرز پر ایک باتصویر موقت رسالے کی بنا ڈالی۔ اس کا نام قران السعدین تھا۔ گویا مشرقی اور مغربی مشتری اور زہرہ تھے، جن کا قران اس رسالے میں ہوا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی۔ گیارہ برس بعد جب میں ہندوستان سے رخصت ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے۔"

[ دلی کالج میگزین، قدیم دلی کالج نمبر، صفحہ ۱۳۶ ]

دلی کالج کی مطبوعات چار تھیں۔ ایک ہفت روزہ "قران السعدین" اور تین رسالے "فوائد الناظرین" "محب ہند" اور "تحفۃ الحذاق" ان مطبوعات کی نگرانی کے لئے یہ طریق کار مقرر تھا۔

"عربی کے شعبے میں جو مولوی مقرر تھے، ان کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ان رسائل میں شائع ہونے والے سارے مواد کی جانچ پڑتال کریں۔ اور وہ مجاز تھے کہ جس مضمون یا اطلاع کو قابل اعتراض سمجھتے، اسے حذف کر دیتے۔ طباعت کے بعد اخبار کی ایک کاپی لوکل کمیٹی کے ہر ممبر کے پاس بھیجی جاتی تھی۔ تینوں رسالوں کی ایک ایک کاپی کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر ٹیلر کی خدمت میں روانہ کر دی جاتی تھی۔"

[ ہسٹری آف جرنلزم ان انڈیا۔ نٹ راجن۔ صفحہ ۵۰ ]

مسٹر رام چندر نے ۱۸۳۵ء میں "فوائد الناظرین" کے نام سے ایک پندرہ روزہ علمی اخبار جاری کیا اور جب محسوس کیا کہ اس میں خبریں بھی چھاپنی چاہئیں تو خبریں بھی شامل کر دیں۔ لیکن اخبار کا علمی رنگ قائم رہا۔ صدیقی نے ۱۸۳۸ء کے ایک شمارے کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شمارے میں کل چار ہزار چھ سو تئیس الفاظ کا مواد موجود ہے۔ اس میں تین سو ستر الفاظ کا ایک اشتہار ہے۔ دو ہزار آٹھ سو اکیس الفاظ پر مشتمل تین مضامین شامل ہیں اور باقی مواد خبروں پر مشتمل ہے۔ مضامین کے عنوان یہ ہیں:

۱۔ کرۂ زمین کا حال، حال آغا محمد شاہ ایران کا، اور حال مروارید یعنی موتی کا۔ "موخر الذکر مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مروارید اور صدف یعنی سیپی ایک ہی مادہ سے پیدا ہوتی ہیں مگر مروارید کی پیدائش میں رائیں مختلف ہیں، بعضوں کے نزدیک مروارید ایک مادۂ منجمد ہے اور مادہ یا تو نشوت کے اندر یا گوشت کے باہر ملا ہوا بالمعنی صدف سے اس طرح سے جم ہو کر منجمد ہوتا ہے کہ بظاہر صدف میں کوئی رخنہ پایا نہیں جاتا اور بعضوں کے

نزدیک صدف میں اتفاقیہ یا بہ سبب خراش کیڑوں کے سوراخ ہو جاتا ہے۔ اس سبب سے جو مادہ کہ جسم جانور سے صدف کی پیدائش کے واسطے نکلتا ہے، قریب گوشت کے جمع ہو کے موتی بن جاتا ہے۔"

[ فوائد الناظرین، ۱۳ نومبر ۱۸۳۸ء ]

یکم ستمبر ۱۸۴۷ء کو ماسٹر رام چندر نے ایک علمی اور ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ اس کا نام 'خیر خواہ ہند' تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس نام کا ایک ماہنامہ پہلے نکل رہا ہے تو انھوں نے دوسرے شمارے سے اس کا نام 'محب ہند' رکھ دیا۔ اس رسالے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے 'فوائد الناظرین' میں لکھا،

"اہل دانش نے اس کی بڑی قدر کی۔ انشاء اللہ اس میں مضامین ہر دم ایسے چھپیں گے کہ جو خلقت ہند کو مفید ہوں گے، اور تواریخ ہر دو یار کی مثل ہندوستان، فرنگستان، ایران، افغانستان وغیرہ کے اور مضامین پند و نصائح درج ہوں گے۔ اور باتیں علم اخلاق اور علم طبی اور علم ہیئت کی مفصل بیان کی جائیں گی تاکہ ہر ایک کی فہمید میں آسکیں۔ اور حال پارلیمنٹ کا اور تجویزیں اور اصلاحیں حکام انگلستان کی اور عجیب و غریب حالات اور اشعار بڑے بڑے استادوں کے، حتی المقدور مع تصویرات ان کی لکھے جائیں گے اس رسالے میں تصویرات بادشاہوں کے اور نقشہ جات مکانات وغیرہ کے، جہاں کہیں جیسی تصویریں مزور ہوں گی، مندرج ہوں گی۔ صفحے اس رسالے کے پچاس ہوتے ہیں اور قیمت اس کی روپیہ ماہواری یعنی فی جلد ایک روپیہ۔

صاحبان علم و دولت پر واضح ہو کہ یہ رسالہ مثل اور پرچہ اخبارات کے نہ ہوگا کہ بعد دیکھنے کے وہ کچھ کام کا نہیں رہتا ہے۔ بلکہ یہ مثل نایاب کتاب کے رہے گا۔"

[ 'فوائد الناظرین'، ستمبر ۱۸۴۷ء
بحوالہ سین لعل ]

( اردو نامہ، کراچی )

## قمر غریب ——— کرشن موہن

کوئل کے یہ میٹھے گیت، جوبن کی رُت یہ ساون
باغوں کا یہ روپ سہل، یہ نکھرے البیلے بن
جاگ اُٹھی ہے دل میں پریت، سندر پیتے میت
گاتے ہیں جیون سنگیت، رت ہے کتنی من موہن
نازک تن کی مادکتا، چنچل من کی کوملتا
رگ رگ میں سنگیت کی لے، یہ سندرتا یہ جوبن
پھر کب لوٹ کے آئیں گے، یہ رنگیں دن یہ راتیں
ہاتھ نہیں آتا ہے کبھی گزرا سمے، بیتا جیون
آ اپنا سپنا دیکھیں، چاہت کی لیلا کھیلیں
آ فرصت ہے پیار کریں، چھوڑ بھی دے شرمیلا پن
سوچ بچار میں وقت نہ کھو، پچھتاوے کا بیج نہ بو
دل کی چنچلتا سے بدل سوچ بچار کا پیاسن
تن کی پیاس نہ بجھنے دے، من کی آس نہ مٹنے دے
جینے میں کچھ لطف نہیں، ہو نہ اگر تن من کی لگن

( ہماری زبان، علی گڑھ )

# ہندوستانی ڈراما

( از :- ڈاکٹر صفدر آہ )

ڈاکٹر صفدر آہ دنیائے ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ گراں مایہ تصنیف ڈراما کے میدان میں ان کے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ فاضل مصنف نے اس تصنیف کو نصابی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈرامے کی تاریخ اور مغربی و ہندوستانی فنِ ڈراما سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں مصنف نے اداکاری سے بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں ڈراما اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر ہے۔

صفحات :- ۳۴۷ — قیمت :- تین روپے ۷۵ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

# باہر کے مُلکوں میں آج کل کی ایجنسیاں

برما۔ منشی فتح محمد ۱۳۹۔ اسٹریٹ نمبر ۴۳۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۲۔ رنگون

بحرین۔ سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۵۔ بحرین

سنگاپور۔ کمیشن آف انڈیا۔ ۱۳۱ گرینج روڈ، سنگاپور

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی



Edited and published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed By The Model Press Private Ltd., Naya Bazar, Delhi-6.

Regd. No. D-509